مولانا الطاف حسین حالیؒ

آئینہ ادب ○ چوک مینار ○ انار کلی لاہور

حیاتِ جاوید

جس میں

عالی جناب جوّادُالدولہ عارفِ جنگ ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں (غُفِرَ لہٗ، ۱۳۱۵ھ)

کی زندگی کے حالات اور اُن کی سرکاری، مُلکی، قومی اور مذہبی خدمات

مفصّل بیان کی گئی ہیں

تالیفِ لطیف

مولانا الطاف حسین صاحب حالی مرحوم

(طبعِ جدید)

آئینۂ ادب، چوک مینار، انارکلی، لاہور

تعداد: گیارہ سو

۱۹۶۶ء

قیمت: دس روپے پچاس پیسے، اعلیٰ سترہ روپے پچاس پیسے

اہتمام

م، ع، سلام - آئینۂ ادب چوک مینار

انار کلی لاہور

(اشرف پریس لاہور میں طبع ہوئی)

بشکریۂ اکاڈیمی پنجاب لاہور

سر سید احمد خاں

مولانا الطاف حسین حالی

مَیں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب مَیں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو مَیں اُس کے اُس حصّے کی جو نیلا نیلا سیاہ رُو ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا مگر اُن ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہُوں جو اُس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اُس تمام سیاہ رُو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

اے صاحبو کیا تُم اپنی قوم میں اِس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو تمہاری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے، اپنی قوم کو معزّز اور دُوسری قوموں کی آنکھ میں باعزّت بنا سکتے ہو۔

سیّد احمد خاں

حرفِ دل

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم مسیحا رشک می آرد ز درمانے کہ من دارم

ز کفرِ من چہ می خواہی ز ایمانم چہ می پرسی ہماں یک جرعۂ عشق ہست، ایمانے کہ من دارم

خدا دارم دلے بریاں ز عشقِ مصطفیٰ دارم نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلعِ خورشید دارد با ہمہ شوکت ہزاراں مطلع ما دارد گریبانے کہ من دارم

ز برہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ

نہ دارد ہیچ واعظ ہم چو برہانے کہ من دارم

سیّد احمد خاں

فہرستِ مضامینِ حیاتِ جاوید

حصۂ اوّل

مضمون	صفحہ

دُوسرا حِصّہ

سرسید کی لائف، اُنکی تصنیفات اور اُن کے کاموں پر ریویو

مُلکی و قومی خدمات

فیضانِ سیّدِ مرحوم

اُسی کی عُمر بھر کی کوششوں کا ماحَصَل سمجھو
اثر جس عام بیداری کے ملّت میں نمایاں ہیں

اُسی کی پُرہنر شیرازہ بندی کے تصدّق میں
مجزّا نسخۂ ملّت کے اوراقِ پریشاں ہیں

حضورِ سرورِ کون و مکاں سے اُس کو ترکے میں
ملا وُہ دردِ مُضمَر قوم کے سب جس پہ درماں ہیں

جگایا اُس نے ہم سوتے ہوؤں کو خوابِ غفلت سے
وُہ غفلت بستیاں جس سے ہوئی قوموں کی ویراں ہیں

ریاضِ قوم کو ازبسکہ سینچا اُس نے اشکوں سے
بہاریں اس کی رشکِ رونقِ گُلزارِ رضواں ہیں

وُہ خود تو خُلد میں ہے کارنامے اُس کے سب لیکن
مہ و خورشید کے مانند تاباں اور درخشاں ہیں

علی گڈھ میں کیا قائم وُہ دار العلم سیّد نے
ثنا خواں ہیں پرائے جس کے اپنے جس پہ نازاں ہیں

ظفر علی خاں

حیاتِ جاوید پر ایک نظر

اُردو میں سوانح نگاری بہت سے اہلِ قلم نے کی ہے۔ مگر ان میں شاید کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا۔ جس کے پاس سوانح نگار کا دل ہو ـــــــ سوانح نگار کا دِل صرف حالی کے حصّے میں آیا ہے۔

سرسید احمد خاں، جن کی لائف "حیاتِ جاوید" کا موضوع ہے، ایک جامع الحیثیات شخص تھے۔ ان کی زندگی بڑے بڑے ہنگاموں کا مرکز اور بڑی بڑی مہمات کا منبع تھی۔ پس اس "ایک سر و ہزار سودا" زندگی کی جزئیات کا فراہم کرنا اور ان کو ایک "سوانح عمری" کے سانچے میں ڈھال دینا کوئی آسان کام نہیں تھا! یہ بارِ گراں مولانا الطاف حسین حالی نے اُٹھایا۔ اور اس کی نازک ذمہ داریوں سے بڑی کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے۔ چنانچہ سوانح نگاری کے فن میں حیاتِ جاوید پہلی منظم اور کامیاب کوشش ہے۔

حالی کی "حیاتِ جاوید" سے پہلے کرنل گراہم نے سرسید کی ایک سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی تھی۔ اِسی طرح حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی کی تحریک سے منشی سراج الدین احمد مالک چودھویں صدی نے بھی "لائف" کے لئے کچھ مواد جمع کیا تھا۔ مگر یہ سب کوششیں کسی حد تک ناکام اور نا تمام تھیں۔ گراہم صاحب کی کتاب ایک مکمل یا گرانی ہونے کا دعوٰے نہیں کر سکتی۔ اور منشی سراج الدین تو اپنی تصنیف کو شائع بھی نہ کروا سکے۔ یہ فخر خوش نصیب حالی کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ وُہ سرسید کے پہلے (اور شاید آخری) کامیاب سوانح نگار کہلائیں۔

حالی کے دِل میں "حیاتِ جاوید" مرتب کرنے کا خیال سب سے پہلے اُس وقت پیدا ہوُا جب سرسید علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ اگرچہ اُن کا حال ابھی تک پہلی رات کے چاند کا سا تھا" کہ "کسی نے دیکھا کسی نے دیکھا ہی نہیں"، تاہم مُلک میں اُن کی خدمات کی قدر پیدا ہو چلی تھی اور لوگوں میں ان کے کام کی اہمیّت کا کچھ نہ کچھ احساس ہو چکا تھا۔ اِسی خیال کے ماتحت مولانا

حالی نے کچھ سوالات مرتب کئے اور جواب کے لئے سرسید کے پاس بھیجے۔ مگر اُنہوں نے "حیات" کا خیال پسند نہ کیا۔ یُوں بھی سرسید سے جب اُن کی حیات قلم بند کرنے کا تذکرہ ہوتا تھا۔ تو وُہ کہا کرتے تھے :۔

"میری لائف میں سوا اِس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوّے اُڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے، اور رکھا ہی کیا ہے"۔

اِس کے علاوہ بعض دُوسرے لوگوں نے بھی یہی رائے دی کہ سرسیّد کی حیات کی تدوین اُن کی زندگی میں مناسب نہیں۔ چنانچہ بالفعل یہ ارادہ موقوف ہو گیا۔ مگر اس کی لگن اُن کے دِل میں ہمیشہ موجود رہی اور آخر کار اسی غرض سے اُنہوں نے ۹۲ء ۱۸ء میں چند ماہ کے لئے علی گڑھ ہی میں قیام کر لیا تا کہ اُس وسیع ذخیرۂ معلومات سے جو وہاں موجود تھا، پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا جائے اور اس کے علاوہ خود "حیات" کے موضوع (یعنی سرسید کو) بھی زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ مل جائے۔

مولانا حالی نے ان سب مآخذ اور مصادر سے فائدہ اُٹھایا ——— اور سرسیّد کی "حیات" بڑی ذمہ داری سے مرتب کی ——— اور حق یہ ہے کہ حالی ہر لحاظ سے سرسید کے سوانح نگار بننے کے اہل بھی تھے۔ سوانح نگاری میں باقی اصناف کی طرح اہلیت اور مناسبت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی ایسا شخص حقیقی سوانح نگار نہیں بن سکتا۔ جس کے مزاج اور طبیعت میں بشریت کے بُنیادی خصائص اور انسانیت کے تمام پہلوؤں سے ہمدردی کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو۔ سوانح نگاری اعلیٰ سطح پر پہنچ کر تنقید، بے لاگ صداقت اور سچے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مگر سوانح نگاری کی تحریک اصولاً اُنس، شفقت اور احساسِ محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی وُہ جذبۂ محرکہ ہے جو سوانح نگار کو موضوع کے انتخاب پر مائل کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس انتخاب کی تہ میں وہ شفقت اور محبت ضرور کار فرما ہوتی ہے۔ جو اُسے سوانح عمری کے ہیرو سے ہوتی ہے۔ ورنہ "حیات" پر قلم اُٹھانے کی تحریک ہی نہیں ہو سکتی۔ حالی اِس وصف سے پُورے طور پر متصف تھے۔

حالی نے "حیاتِ جاوید" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "اگرچہ قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر "مزدوروں" کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے ——— یہاں اُنہوں نے اپنی مشہورِ عام مُنکسر المزاجی سے کام لے کر اپنے آپ کو (بحیثیت سوانح نگار) "مزدور" قرار دیا ہے حالانکہ حالی نرے مزدور نہ تھے۔ ایک معنی پرست قدر دان دوست بھی تھے۔ سچ یہ ہے کہ سوانح نگاری نری "مزدوری" نہیں، نہ یہ نرا علمی کام ہے۔ سوانح نگاری کی مہم محض علمی قابلیت کے سہارے سر نہیں کی جاسکتی ——— یہ وُہ فن ہے جس کی تکمیل کے لئے صرف محنت اور محض علمی لیاقت کافی نہیں۔ اِس کے لئے جذبۂ ہمدردی اور اُنس و محبّت کی ضرورت ہے جو ہیرو کی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود اُس کی عظمت اور شرف و فضیلت کو بھی دیکھ سکے ——— !
کون نہیں جانتا کہ جانسن کے قدر دانوں اور دوستوں میں علم و فضل والے لوگوں کی کمی نہ تھی۔ مگر اِن میں باسول کے سوا ایسا کوئی نہ نکلا جو جانسن سے سچی محبّت کی اِس انتہا تک پہنچا ہوا ہو، جس تک اِس کا یہ حقیقی سوانح نگار پہنچ سکا۔ جانسن کے مزاج کی سختی اور تُندی تیزی ——— اور اس کی انتہا پسندی ——— غرض اُس کی سب کمزوریاں اُس پر روشن تھیں۔ مگر ان سے اُس کے اُنس میں کبھی کمی پیدا نہیں ہوئی ——— وُہ برابر جانسن کی زندگی میں دِل چسپی لیتا رہا اور اس کو خلوت اور جلوت ——— زندگی کے سب درباروں اور بازاروں میں بغور دیکھتا رہا ——— اور آخر کار اپنی اِس "دلچسپی" اور "مستقل مزاجی" کے طفیل وہ اپنی سوانح عمری کے "شخص" کو اس کے اصلی اور حقیقی رُوپ میں دیکھنے اور دکھانے میں کامیاب ہُوا۔

باسول کی یہ کامیابی محض "مزدوری" نہ تھی ——— نہ اِس کو ہم محض "کان کنی" سے تعبیر کر سکتے ہیں جیسا کہ مولانا حالی نے اپنی سوانح نگاری کے متعلق لکھا ہے :۔

"جوہریوں سے بازار بھرا پڑا ہے مگر کان کھودنے والے مفقود ہیں"

یہ بھی درحقیقت حالی کا انکسار ہے کہ وُہ اپنے کام کو "کان کنی" قرار دیتے ہیں ۔ کیونکہ "حیاتِ جاوید" کے لکھنے والے نے کان کنی تو ضرور کی ہے۔ مگر وہ ایسا کان کن ہے۔ جو جوہرِ محبّت کی تلاش میں یہ مشقّت برداشت کرتا رہا۔ وہ کان کن بھی ہے۔ اور علم و فن کے بازار کا جوہری بھی۔ وہ مزدور بھی ہے اور کان کن بھی ہے، جوہر شناس بھی ہے اور گوہر فروش بھی۔

کان کھودنے والے تو بے شمار مل جاتے ہیں مگر جوہر شناس بہت کم ہوتے ہیں۔ کسی جوہر کی تلاش کرنے والا معنی اور قیمت کا شناسا ہوتا ہے۔ سوانح عمری میں بھی معنی اور قیمت کا احساس وہ اوّلیں جذبۂ محرکہ ہے۔ جس کے زیرِ اثر کوئی شخص کان کنی کی مشقت برداشت کرنے کے لئے آمادۂ عمل ہوتا ہے ورنہ محض کان کنی نہ مفید ہے، نہ اس کے لئے کوئی شخص اپنے آپ کو مصائب میں مُبتلا کرتا ہے —— سوانح نگاری کی وادی میں قدم رکھنے والے کو جس جوہر کی تلاش ہوتی ہے، اس کی قدر و قیمت مادی عظمت کے نُقطۂ نظر سے معیّن نہیں ہوتی بلکہ اس کا معیار بہت بڑی حد تک جذباتی اور معنوی ہوتا ہے۔ لٹن سٹریچی نے ملکہ وکٹوریہ کی زندگی کو اس لئے اپنا موضوع نہیں بنایا تھا کہ اس ملکہ کے زمانے میں انگریزی فتوحات کا دائرہ وسیع ہُوا بلکہ اس لئے کہ مصنّف کو اس "عورت" کے پردے میں۔ ایک عجیب و غریب انسان نظر آیا —— جس کی "انسانیت" کے رنگارنگ اور دلچسپ رُوپ مصنّف کی معنوی اور جذباتی دُنیا کے لئے توجّہ اور کشش کا باعث ہوئے۔

سوانح نگار انسانیت کے جن پہلوؤں سے متاثر ہوتا ہے، اُن کی تہہ میں زندگی کی کوئی عظیم "قدر" ضرور پنہاں ہوتی ہے۔ سوانح نگار پہلے پہل "اِسی قدر" کی وجہ سے اپنے ہیرو سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اس سے مانوس ہوتا جاتا ہے۔ تاآنکہ اس کی زندگی کے بُرے سے بُرے رُخ بھی اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ مگر ہیرو سے اس کی محبّت بدستور باقی رہتی ہے —— وُہ انسان اور انسانیت کا دلدادہ ہے، اس کے سب پہلوؤں کا، اُس کے سب رُخوں کا!

ایک سوانح نگار سچّی انسانیت کا جویا ہوتا ہے —— اور ایک بہت بڑی حد تک خود بھی اسی "انسانیت" سے متصف ہوتا ہے۔ سوانح نگار کی فطرت کا بڑا جوہر اس کی اپنی انسانیت اور حوصلہ مندی ہے —— اسی حوصلہ مندی سے اِس میں قلب و نظر کی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اسی حوصلہ مندی سے وُہ انسان کے فضائل کی قدر دانی کے قابل ہو کر اس کی کمزوریوں کو سمجھنے اور معاف کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اور سب سے آخر میں یہ کہ سوانح نگار بہر حال ایک مشفق ہمدرد، ایک شفیق دوست اور ایک حوصلہ مند رفیق اور قدردان ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ یہ نہیں

ہے تو اُسے سوانح عمری لکھنے کی نہ تحریک ہو سکتی ہے نہ وُہ اس کا اہل ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو اس میں کچھ شُبہ نہیں رہتا کہ مولانا حالی ایک حقیقی سوانح نگار کی تمام صفات سے متصف تھے اور قدرت کی طرف سے ایک ایسا دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ جس میں شریفانہ جذبات، جوہر شناسی، سلامتِ مزاج اور اُنس و محبت کے احساسات بدرجۂ اتم موجود تھے ــــــ انہی اوصاف کی بنا پر اہلِ بصیرت کی بارگاہ سے اُنہیں خوش صفات حالی کا خطاب عطا ہوا ہے۔ اور یہ وُہ خطاب ہے جو بالواسطہ اس امر کا اعتراف بھی ہے کہ وہ طبعاً اِن سب لیاقتوں کے مالک تھے۔ جن کی موجودگی سوانح نگاری کی بنیادی شرائط میں داخل ہے۔

"حیاتِ جاوید" کی قدر و قیمت کے متعلق بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے سب پہلوؤں پر منصفانہ نظر ڈالی جائے۔ اس بحث پر براہِ راست قلم اُٹھانے سے پہلے اِس اہم سوال کا جواب ضروری ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کی "حیات" کے شرائط اور اوصاف کیا ہیں؟ اس کا مفصل جواب فن کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہاں صرف ایک دو ماہرین کی آراء کا تذکرہ کافی ہوگا۔ ایڈمنڈ گوس نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بیاگرافی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :-

Biography is a faithful portrait of a soul in its adventures through life.

اس تعریف کا تجزیہ کرنے سے سوانح عمری کے بنیادی اصول خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حیات میں موضوع کی ہو بہو تصویر آنی چاہیئے۔ جو حقیقت اور صداقت پر مبنی ہو۔ دوم۔ موضوع کی زندگی کی مکمل تصویر ہو اور سوم سوانح عمری نفسِ انسانی (Soul) کے ان تمام افکار و حوادث اور ہنگاموں کا مرقع ہونا چاہیئے جن سے سوانح عمری کے ہیرو کو گزرنا پڑا۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "حیات" میں مظاہر کی نقاشی کے ساتھ ساتھ موضوع کی داخلی شخصیت کو بھی بہ تمام و کمال پیش کرنا چاہیئے تاکہ "حیات" کسی شخص کی مکمل، حقیقی اور پُر معنی سرگزشت بن سکے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حیاتِ جاوید میں یہ سب اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اِس کے لئے ہمیں سب سے پہلے مصنف کے نصب العین پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ حیاتِ جاوید کے دیباچے میں حالی نے اپنا نصب العین یُوں بیان کیا ہے :۔

"اگرچہ ہندوستان میں ہیرو کے عیب و خطا کا معلوم ہونا اِس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وُہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بیاگرافی ریڈیکل طریقے سے لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اِس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چُنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دیوانِ ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے، اِس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں، اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی بیاگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی . . . لیکن ہم کو اِس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے . . . . . ایسے شخص کی لائف چُپ چاپ کیسے لکھی جا سکتی ہے ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھیک بجا کے دیکھا جائے۔

وُہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نُکتہ چینی کی بُنیاد ڈالی ہے۔ اِس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے۔ اور نُکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ دیا جائے۔"

اِس اقتباس سے یہ بات واضح ہے کہ مولانا حالی ریڈیکل طریقے کی بیاگرافی کے تقاضوں سے اچھی طرح باخبر تھے اور جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے وُہ سرسید کی حیات میں ان تقاضوں کو پُورا کرنے کے لئے ہمہ تن آمادہ تھے اور چاہتے تھے۔ کہ سب سے پہلے اُنہی کی لائف میں اِس کی پیروی کی جائے اور نُکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے۔"

اب رہا اِس پر عمل ——؟ سو اُس کے متعلق یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ مولانا حالی نے اپنی بعض "مجبوریوں" کے باوجود ایک خاص حد تک اس اخلاقی جرأت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ جس کی غایت یہ ہے کہ حیات کے "موضوع" (ہیرو) کی زندگی کی اصل تصویر سامنے آجائے۔ اور

ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ حیات کے ہیرو نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز میں کہاں کہاں ٹھوکر کھائی اور کن کن موقعوں پر اس کا قدم صراطِ مستقیم پر رہا۔

اِس سلسلے میں اوّلیں بات یہ ہے کہ حالی اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود ایک دیانتدار سوانح نگار تھے۔ ان کا سرسید کے ''اختلافی'' مشن میں شریک ہونا، ان کی جملہ تحریکات میں ان کی ہم نوائی کرنا اور سب سے زیادہ، ان کا ایک مختلف فیہ موضوع کو اپنی تصنیف کا موضوع بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں بے خوفی، صداقت اور دیانتداری کے اوصاف موجود تھے۔ اگرچہ اُنہیں یہ اعتراف ہے کہ ان کا ماحول ''کریٹیکل بیاگرافی'' کے صحیح اصول کی قدر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

حیات جاوید کے کریٹیکل ہونے کے خلاف سب سے بڑے معترض حالی کے فاضل دوست اور نامور معاصر شبلی ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ حیات جاوید ''سرسید کی یک رُخی تصویر ہے۔'' انہوں نے اس کے اندازِ تحریر کو ''مدلل مداحی'' قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ حیات جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل'' ——— یا ان اعتراضات پر اصولی بحث آ گئی ہے۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے سے پہلے یہ بلا تکلف تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ہم شبلی کے اِس خیال سے ''پوری طرح'' متفق نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمارے نزدیک اُن کی آواز ایک فریق کی آواز ہے۔ سرسیّد کے زمانے کی جملہ نزاعات میں ہم اُن کو ایک فریق خیال کرتے ہیں کیونکہ وہ سرسیّد کے عقائد اور خیالات کے خلاف ایک دوسرے نقطۂ نظر کے مسلّم علمبردار اور ترجمان تھے۔ اِس لئے ان کی رائے اس معاملے میں بہرحال ایک جانبدار شخص کی رائے ہے ——— اِس کے علاوہ اُن کا لب و لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت اور اُن کی تنقید اعتدال سے متجاوز معلوم ہوتی ہے۔

اِس میں کچھ شبہ نہیں کہ حالی نے بعض متنازعہ فیہ معاملات میں سرسیّد کے متعلق وہ رائے ظاہر نہیں کی جو مولانا شبلی اور اُن کے ہم خیال لوگوں کی ہے۔ اِسی طرح یہ بھی درست ہے کہ بعض ایسے امور میں بھی جن میں خود مولانا حالی سرسیّد کے ہم خیال نہ تھے، اُنہوں نے سرسید کو حق بجانب قرار دیا ہے (مثلاً ٹرسٹی بل کا قضیہ یا مذہب میں معقولات کے تصرف کا عقیدہ، وغیرہ وغیرہ) مگر اس کے باوجود ہم حیاتِ جاوید کو مدلل مداحی اور کتاب المناقب کہنے کے لئے تیار نہیں۔ مولانا شبلی کا یہ اعتراض بظاہر اس عقیدے پر مبنی ہے کہ حیات کے ہیرو کے اعمال و

افعال پر "نکتہ چینی" کرنا سوانح نگار کے لازمی فرائض میں داخل ہے۔ یہ غلط فہمی نہ صرف شبلی کے دماغ میں تھی بلکہ خود حالی بھی اِس میں مُبتلا تھے۔ چُنانچہ اُنہوں نے دیباچے میں خود یہ اصول قائم کیا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بُنیاد ڈالی ہے، "مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔" در اصل حالی پر سب اعتراضات کا سر چشمہ یہی ہے۔ اور اسی سے ان کے طریقِ کار کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک سوانح نگار کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ اپنے "ہیرو" کی حیات کی ہو بہو مصوّری کرے اور ہو بہو مصوّری کا مطلب یہ ہے کہ ہیرو کے اعمال و افعال میں سے (جہاں تک اُسے معلوم ہیں) کوئی عمل اور فعل نظر انداز نہ ہونے پائے۔ اِسی طرح جہاں تک اس کے بس میں ہے، وہ ہیرو کے اعمال کے محرّکات کا صحیح جائزہ لے اور اس معاملے میں وہ کسی تفصیل کو پوشیدہ نہ رکھے۔ فقط ہو بہو مصوّری کے اِس عمل میں نکتہ چینی، نہ صرف یہ کہ حد درجہ نامناسب ہے بلکہ ہماری رائے میں صحیح سوانح نگاری کے خلاف بھی ہے۔ سوانح نگار سب کچھ ہو سکتا ہے مگر نکتہ چین نہیں ہو سکتا۔ اُس کا فرض اسی قدر ہے کہ ہیرو کے متعلق اُسے جو کچھ معلوم ہو یا اُس کے اعمال کے متعلق اُس کا جو دیانت دارانہ خیال ہو، اِس کو بلا کم و کاست ظاہر کر دے۔ بس اس سے آگے بڑھ کر نکتہ چین یا معترض بن جانا، سوانح نگاری کی بُنیادی شرائط کے منافی ہے۔

اب ہمارے سامنے بڑا سوال یہ ہے کہ حالی نے اپنے ہیرو کے تمام اعمال و افعال، (جہاں تک اُنہیں معلوم ہوئے اور جس طرح اُن کی نظر میں آئے) حیاتِ جاوید میں پیش کیے ہیں یا نہیں؟ جہاں تک ہمارا اندازہ ہے حالی نے سر سیّد کی زندگی کی کوئی اہم تفصیل نظر انداز نہیں کی۔ اُنہوں نے اپنے ہیرو کے متعلق وہ باتیں بھی لکھ دی ہیں جو شبلی اپنے اِسی طرح کے ہیرو کے متعلق کبھی لکھنا گوارا نہ کرتے۔ مثلاً انگریزوں سے ان کے میل جول کی سرگزشت، "گردن مروڑی مُرغی" کا جائز ہونا، مغربی تمدّن کے متعلق ان کا انتہا پسندانہ نظریہ، مذہبی اجتہادات میں ان کی بے راہ روی، وغیرہ وغیرہ ——— ان سب واقعات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی نظر انداز نہیں ہوئیں اور پڑھنے والے کو کہیں

بھی یہ شُبہ نہیں ہوتا کہ سوانح نگار نے کہیں Fact یا امرِ واقعہ کو دانستہ چھُپا دیا ہے۔ یا گھٹا بڑھا دیا ہے۔ یہ حالی کی دیانت داری ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہیرو کے جُملہ افعال و اعمال کو (جہاں تک ان کی نظر میں تھے) دُنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے اور کسی موقعہ پر کسی "پر معنی" امرِ واقعہ کے اِخفا کی کوشش نہیں کی۔

اب رہا سرسید کے اعمال کے متعلق رائے کا سوال سو اس معاملے میں ہم سوانح نگار کو "آزادیٔ رائے" کا حق دینے پر مجبور ہیں۔ ہم اِس سے یہ مطالبہ کرنے میں کسی طرح حق بجانب نہیں کہ وہ بھی اپنے ہیرو کے اعمال و افعال کے محرکات اور ان کے عیب و صواب کے متعلق وہی رائے قائم کرے جو مثلاً کسی مخالف نکتہ چین یا معترض کی رائے ہے سوانح نگار کو آزادی سے سوچنے اور رائے قائم کرنے کا بہر حال حق حاصل ہے شبلی کی تنقید کا نشانہ سب سے زیادہ یہی محرکاتِ افعال ہیں جن میں حالی اُن سے متفق نہیں ــــــ اور حق یہ ہے کہ ہمیں اِس معاملے میں شبلی کے اختلاف پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اگر اعتراض ہے تو اِس پر کہ وہ حالی کو دیانت دارانہ اختلاف کا حق دینے کے لئے آمادہ معلوم نہیں ہوتے! یہ شبلی کی زیادتی ہے! اگر اس کے باوجود حیاتِ جاوید "کتاب المناقب" ہے تو ہم کہیں گے اس معنی میں ہر سوانح عمری (اچھی سوانح عمری بھی) کتاب المناقب ہوتی ہے۔ اِس لئے کہ سوانح عمری کی بُنیاد ہی ہمدردی اور شفقت پر قائم ہے۔ اِس کا سرچشمۂ تحریک ہی وہ روحانی اتحاد، وہ جذبِ صفات اور وہ ذہنی مماثلت ہے جو ایک سوانح نگار کو اُس "مزدوری" یا کان کنی پر مجبور کرتی ہے۔ جس سے بعض اوقات لعل و گوہر تو ہاتھ نہیں آتے۔ سنگ و خشت ہی سے تواضع ہوتی ہے ــــــ جیسا کہ حالی پر شبلی کی سنگ باری سے ثابت ہو سکتا ہے۔ یا جیسا کہ ان کے بعد بھی کبھی کبھی کچھ دیکھنے میں آتا ہے ــــ مثلاً ہمارے اپنے زمانے کے ایک خوش بیان نقاد نے لکھا ہے "اردو سوانح عمری ابھی تک مدلل مدحت طرازی سے آگے نہیں بڑھی"!

غالب نے فرہاد پر تعریض کرتے ہوئے لکھا تھا۔

عشق مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

حالی پر ہمارے ان بزرگوں اور دوستوں کی تعریفیں کچھ کم دلدوز نہیں، حالانکہ حق یہ ہے کہ سوانح نگاری مزدوری عشرت گہہ خسرو نہیں بلکہ بقولِ غالب "شہادت گہہ اُلفت" میں قدم رکھنا ہے۔ غرض اُلفت سوانح نگاری کا بنیادی جذبہ ہے۔ اِس میں خواہ مخواہ نکتہ چین بننا سوانح عمری کو برباد کرنا ہے۔ اِس لئے اِس بنا پر حالی پر معترض ہونا اصولاً درست نہیں، البتہ ان پر اعتراض اُن کی اُن تاویلات کی وجہ سے کیا جا سکتا ہے، جن کے ذریعے اُنہوں نے سرسید کے بعض اختلافی کاموں کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِن موقعوں پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے ہیرو کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے مصنف بیتابی کا اظہار کر رہا ہے۔ اِن موقعوں پر ان کا اندازِ بیان معذرت آمیز ہو جاتا ہے۔ جس سے معترض کو کچھ کہنے کی جرأت ہو جاتی ہے —— مگر ہم مولانا حالی کی اِس کمزوری سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تقریباً ہر موقعہ پر اُنہوں نے تاویل کے ساتھ ساتھ سیّد صاحب کی طبعی کمزوریوں کا تذکرہ ضرور کیا ہے۔ مثلاً ڈسٹی بِل کے قضیئے میں حالی نے اُن کے ایک "نہ پیدا شُدہ" رُجحان کا برملا تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ آخری زمانے میں اُن کی طبیعت اِس حد تک "ڈسپاٹک" ہو گئی تھی کہ "اب جو آپ کے قلم سے ناں نکل گئی تو خُدا ہی ہے جو اس کی جگہ ہاں نکلے۔" یہ حالی کی دیانت داری کی ایک واضح مثال ہے۔

گزشتہ صفحات میں مولانا حالی کی سوانح نگارانہ دیانت داری کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اِس کے باوجود ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ مولانا حالی کو ان کے انکسار اور معذرت آمیز اندازِ بیان نے (بحیثیت سوانح نگار) بڑا نقصان پہنچایا ہے —— ان کی تاویلوں کے متعلق (جیسا کہ پہلے بیان ہُوا) یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ اعمال و افعال کے محرّکات کے بارے میں رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر معذرت آمیز انداز، اور حد سے بڑھی ہوئی مُنکسر المزاجی سے جو بدگمانیاں پَیدا ہوتی ہیں ان کا علاج کچھ نہیں۔ اِسی سے معترضوں کو بہت کچھ کہنے کا موقعہ ملا ہے۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وُہ بدخُو ہو گا
نبضِ خس سے تپشِ شُعلۂ سوزاں سمجھا

ہمارا خیال ہے کہ حیاتِ جاوید کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ نہیں کہ اِس میں

سرسید کی زندگی کو صحیح اور جامع انداز میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ یہ ہے اس کی ترتیب کے وقت سوانح نگاری کے جن اصولوں کا اعلان ہُوا ہے، اُن کی صحیح اہمیت بلکہ ماہیت سمجھی ہی نہیں گئی ۔ اِس کی وجہ سے دیباچے میں (اور کتاب کے متن میں بھی) یکے بعد دیگرے مصنّف کو پے در پے معذرت آمیز بیانات دینے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں حیاتِ جاوید کی شُہرت کو شبلی کے قلم سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا حالی کے اس دیباچے سے پہنچا ہے ، جو حیاتِ جاوید کے شروع میں ہے۔ اِس دیباچے کی بُنیادی کمزوری یہ ہے کہ اس میں ایک طرف بہت اعلیٰ اور بلند اصولوں کا اعلان ہُوا ہے اور دُوسری طرف عُذر معذرت کی حد درجہ کمزور لَے سے اپنی اصولوں کی تردید کی گئی ہے جس سے حالی کے طریقِ کار کے علاوہ اُن کے فنّی تصوّر کے متعلق بہت بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مَیں نے معذرت کی جس لَے کی طرف ابھی اشارہ کیا ہے۔ اِس کی ایک مثال درج ذیل ہے۔ حیاتِ جاوید کے دیباچے میں لکھا ہے:-

> "اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اِس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ کیونکہ سچ میں اور صرف سچ میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

ہمارے خیال میں اِس قضیئے کے ہر دو حصّے اگر غلط نہیں تو بے محل ضرور ہیں۔ سوانح عمری کے ہیرو کو سچّا ثابت کرنا یا اِس کو معصوم ثابت کرنا (ہر چند کہ دونوں باتیں درست بھی ہو سکتی ہیں) کِسی سوانح نگار کے مقاصد میں شامل نہیں۔ اِسی طرح سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ہیرو کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

ہمارے خیال میں یہی حالی کے نظریے اور تصوّر کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ اِس غلطی کا اصلی سبب یہ ہے کہ حالی "بیاگرافی، یعنی ہو بہو مصوّری" کے اصول کی ماہیت کے متعلق بے خبری میں تھے۔ وہ سوانح نگاری کے مغربی اصولوں سے واقف تو معلوم ہوتے ہیں مگر انہوں نے

مغربی اصولوں کو مناسب نقد و جرح کے بغیر صحیح اور درست تسلیم کر لیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے، "سوانح عمری" میں کسی کو کچھ "ثابت کرنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوانح عمری تو سراپا "کچھ ہونے" کا نام ہے۔ سرسید ایک سچے آدمی تھے، اس کا اعلان بالکل بجا اور درست، مگر مولانا حالی کی طرف سے سرسید کی سچائی کا یقین دلانا یہ ایک ایسی بات ہے جس پر بجا طور پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ درحقیقت "سچا کر دکھانے" اور سچائی کے یقین دلانے کی اسی کوشش کے سبب شبلی کو اس کڑی تنقید کا موقعہ ملا ہے کہ حیاتِ جاوید سوانح نگاری نہیں "وکالت" ——— یا "مدلل مداحی" ہے۔

حالی کے نقطۂ نظر میں اس رجحان کی موجودگی کے دو اسباب ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ بھی اس دور کے اکثر مصنفین کی طرح ادب اور فن کی اخلاقی بنیاد اور نصب العین کے نہ صرف قائل ہیں، بلکہ اس کے مبلغ بھی ہیں۔ چنانچہ مقدمۂ شعر و شاعری میں انہوں نے شاعری کو مقاصدِ اجتماعی اور اخلاقِ قومی کا پاسبان اور ترجمان قرار دیا ہے۔ اِس ہمہ گیر تصور کے ماتحت سوانح عمری میں بھی اخلاقی مقصد ان کے پیش نظر ہے ان کے نزدیک سوانح عمری کے ہیرو کے لئے لازمی ہے کہ وہ اخلاقِ اجتماعی کے نقطۂ نظر سے بلند سیرت کا حامل ہو ——— یہی وجہ ہے کہ سرسید کی حیات میں انہوں نے اس کو "ثابت کرنے" اور "یقین دلانے" کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں کچھ عرصے سے مغرب کے متعلق ایمان بلکہ ایمان الغیب کا جذبہ اِس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ہم مقام اور ماحول، تہذیب اور تمدن کے مخصوص تقاضوں سے یکسر چشم پوشی کرتے ہوئے زندگی اور ادب اور فن کے مغربی اصولوں کو کچھ اِس طرح اپنا لیتے ہیں کہ ہم اپنی تنقیدوں میں مخصوص مزاج اور مخصوص حالات کے عنصر کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہی چیز ہم سوانح نگاری کے معاملے میں بھی دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ضروری نہیں کہ سوانح نگاری کے سب مغربی اصول مشرقی ماحول اور مزاج و طبیعت کے مطابق ہوں۔ مثلاً مغرب میں سوانح نگاری کا فن واقعیت کے جن واشگاف اور بے نقاب مظاہر و مناظر کا مرقع سمجھا جاتا ہے، کیا ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ مشرق کی سنجیدہ مزاج اور "حیادار" تہذیب اپنی سوانح عمریوں میں ان کی معمولی جھلک بھی دکھانے کی جرأت کرے گی؟ ہماری زبان میں اعمال نامہ ایک نہایت

روشن خیال، تعلیم یافتہ آدمی کی سوانح عمری ہے، جو آپ بیتی بھی ہے۔ اور "بقلمِ خود" ہونے کی وجہ سے دِل شکنی اور دِل آزاری کے خدشے سے بھی پاک ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اَوراق میں مصنّف واقعیت کا وہ انداز پیدا نہیں کر سکا جو مغربی تصوّر کے ماتحت ضروری تھا۔ "اعمال نامہ" کے صفحات ہیں، مصنّف کے جدید الخیال ہونے کے باوجود مشرقی حیا داری اور شرافت کے آئین و قوانین کی بڑی پاسداری ہے۔ چنانچہ سر رضا کا قلم "اقبالِ جُرم" یا "عذرِ گناہ" کی حدوں کے قریب قریب پہنچ کر رُک جاتا ہے ــــ مشرقی وضع داری کے آداب دامن پکڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں:۔ باادب، بالحاظ ــــ اِس سے آگے قلم کو آنکھیں بند کر لینی ہوں گی! قدم روک دینے ہوں گے! یہاں سے مشرق کی سرزمین شروع ہوتی ہے۔

حالیؔ نے اپنے دیباچے میں مغرب کی کریٹیکل بیاگرافی کے بہت گُن گائے ہیں۔ مگر سرسیّد کی زندگی لکھتے وقت حالیؔ کی مشرقی تہذیب، اُن کی کریٹیکل سوانح نگاری کی راہ میں اکثر حائل ہوتی رہی۔ ہمیں حالیؔ کی اِن مُشکلات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اِن کا مشرقی لب و لہجہ اور ان کی انتہا درجے کی مُنکسر المزاجی! اس کے سبب انہوں نے تاویل اور مدحت طرازی کا الزام خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا ہے۔ انہوں نے سرسیّد کے اعمال و افعال کے متعلق جو معذرت آمیز لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ اِس کی بنا پر مہدی حسن کو یہ کہنا پڑا تھا کہ "حیاتِ جاوید، ایک شریف انسان کے قلم سے ایک شریف تر انسان کی سرگذشت ہے"۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ حالیؔ نے اپنے ہی بنائے ہوئے اصول کی بعض موقعوں پر خلاف ورزی کی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اُنھوں نے یہ سب کچھ مشرقی آئین شرافت کی پاسداری میں کیا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ سوانح نگاری کا وُہ مغربی طریقہ جس کا مقصد ہیرو کے عیوب کو اُچھالنا اور اُس کی بشریت کے پست پہلوؤں کو اُبھار کر اس پر فخر کرنا ہے، ہرگز ہرگز مستحسن نہیں ــــ سوانح نگاری کو انسانی شرافتوں اور فضیلتوں کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ خطا کاری تو فطرتِ انسانی کی عام اور بُنیادی چیز ہے۔ اس کو اُبھار کر دکھانے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تسلیم شدہ ہے کہ ہر انسان میں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں، مگر کارنامے انجام دینے والا آدمی کبھی کبھی نمودار ہوتا ہے۔ اِس لئے فضائل اور کارناموں کا سچّا تذکرہ عیوب کے تذکرے سے زیادہ حیات بخش اور وسیلۂ ترقی بن سکتا

ہے۔ مشرقی طریقۂ سوانح نگاری ادھورا سہی، مگر اس میں رفعت کی کچھ زیادہ شان نظر آتی ہے۔ انسانی بوالعجبیوں کا معاملہ البتہ قدرے مختلف ہے۔ ہمارا یہ خیال بیاگرافی کے مسلّم مغربی اصولوں کے خلاف ہے۔ مگر کوئی مہذب اور شرافتوں کا دلدادہ سوانح نگار انسانی عیوب کی داستان سرائی میں لطف نہیں لے سکتا۔ اور یہ وُہ نتیجہ ہے جس تک اغماض کے شاکی شبلی بھی آخر پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ ایک مقالے میں (جو مناقب عمرؓ بن عبدالعزیز پر لکھا ہے) اس کا صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقے سے بالکل آشنا نہ تھے ۔۔۔۔ یہ طریقہ ہماری ہاں کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے۔ اُردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے۔ لیکن یہ طریقہ قدیم طریقے سے بہت زیادہ قابلِ اعتراض بلکہ خطرناک ہے۔ قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا۔ لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور دغابازی ہے۔ جو واقعہ نگاری سے بہ مراحل دُور ہے۔" مقالات جلد ۴۔ تنقیدی ص ۵

اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کے سب سے بڑے معترض شبلی کو آخر کار اپنے خیال سے رجوع کرنا پڑا کیونکہ اُنہیں اپنے سابقہ نظریے میں اور مشرقی مزاج کے تقاضوں میں آخر بُعد اور تضاد نظر آ گیا۔ جس کے سبب وہ کریٹیکل بیاگرافی کو واقعہ نگاری سے بہ مراحل دُور سمجھنے لگے تھے ـــــ اِس صورت میں حالی کی تقصیر قابلِ معافی ہو جاتی ہے!

ہمارے مورخ سوانح نگار (شبلی) نے حیاتِ جاوید کو جہاں "یک رُخی تصویر" قرار دیا تھا وہاں یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ یہ "غیر مکمل" بھی ہے۔ اس کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ حیاتِ جاوید یک رُخی ہو تو ہو مگر غیر مکمل نہیں، بلکہ ہماری رائے یہ ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ مفصل ہے۔ کیونکہ اس میں سرسیّد کی زندگی کے خارجی واقعات اتنی تفصیل سے موجود ہیں کہ ان پر اضافہ ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ سرسیّد کی لائف ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ایک ہنگامہ خیز صدی کی تاریخ بھی ہے۔ ابتدائی خاندانی حالات سے لے کر یوم وفات تک ہمارا مصنف ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنے ہیرو کے ساتھ ساتھ گھومتا نظر آتا ہے ـــــ وہ سرسیّد کی حد درجہ مصروف زندگی کے کسی کارآمد لمحے میں اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ سیّد صاحب ساداتِ دہلی

کے جس معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، اُس گھرانے کی روایات، ایّامِ طفلی کے واقعات اور اشرافِ شہر کے رسم و رواج، جن میں ان کی پرورش ہوئی ـــــ یہ سب امور اس سلاست اور صفائی کے ساتھ لکھے ہیں کہ اِن تحریروں کے بین السطور میں سرسید کی عظمت کے ابتدائی نقوش صاف صاف اُبھر آئے ہیں۔ اِس کے بعد اُن کے لڑکپن کی شوخیاں، ان کے عنفوانِ شباب کی رنگیں مزاجی، ان کی جوانی کی لغزشیں، سب ایک ایک کر کے سامنے لائی گئی ہیں۔ پھر اس زمانے کی مجلسی زندگی اور عیش و نشاط کی مجالس کی عمدہ تفصیل دی گئی ہے۔ اور اِس دَورِ حیات کے متعلق سرسید کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہم بھی اِس رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے"۔ ـــــ لیکن دفعتہً بڑے بھائی کا انتقال ہو جاتا ہے، اِس سے سیّد صاحب کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اب طبیعت کی شوخی اور طرّاری مولویّت (مقصدیّت) اور زُہد (= بے غرضی) میں بدلنے لگتی ہے ـــــ حالی کے بیان کا یہ حصّہ اتنا مؤثر اور خیال انگیز ہے، کہ پڑھنے والا آغازِ کار ہی سے سرسیّد کے مُستقبل کے بارے میں بڑی توقعات پیدا کر لیتا ہے۔ اِس کے بعد مصنّف سیّد صاحب کی زندگی کے ہر دَور کے متعلق نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات جزئیات بیان کرتا چلا جاتا ہے اور ان کی شخصیّت کے تدریجی ارتقاء کا حال نہایت خوبی سے قارئین کے سامنے رکھتا جاتا ہے۔ زندگی کی اِس پہلی منزل کے بعد ملازمت شروع ہوتی ہے۔ اِس حیثیت سے "حیات" کا ہیرو فتح پور، دہلی، رہتک، بجنور، غازی پور، بنارس اور علی گڑھ کے ماحول میں سرگرمِ عمل دکھایا گیا ہے ـــــ ان ملازمتوں کے دَوران میں تصنیفی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے، اور عملی زندگی کے منزل بہ منزل سفر کے ساتھ علمی زندگی کی عہد بہ عہد ترقی بھی نمایاں کی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جامِ جم، اِنتخاب الاخوین اور تحفۂ حسن سے شروع ہو کر، اُردو کا یہ بلند پایہ مصنّف اور مفکّر، خطباتِ احمدیہ اور تفسیر القرآن کے عظیم کارناموں تک پہنچتا ہے ـــــ اور اس طرح ہمیں اِس رازِ سربستہ کا پتہ چلتا ہے کہ پچھلی صدی کی یہ سب سے متنازع فیہ شخصیت کیونکر ان ذہنی انقلابات سے دوچار ہوئی، جن کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم اکثر اس اہم ذہنی تغیّر کا صحیح

جائزہ نہیں لے سکتے جو سرسید کے زیرِ اثر ہندوستان میں رُونما ہُوا۔

اِن تصریحات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حیاتِ جاوید سرسیدؔ کے مظاہرِ حیات کے سلسلے میں "مکمّل" کتاب ہے۔ اِس میں سرسیّد اپنی عظیم وجسیم بزرگانہ شخصیت سمیت جلوہ گر ہیں۔ بسم اللہ کی تقریب ہوتی ہے، تعلیم و تربیت کے مراحل طے ہو رہے ہیں۔ کنکوے اُڑائے جا رہے ہیں، کبڈیاں اور گیڑیاں کھیلی جا رہی ہیں۔ ایک "تلخ" رقاصہ کے "برشیریں" پر گرم گرم نظریں ڈالی جا رہی ہیں، چُہلیں، گپ بازی، شوخی —— طرّاری۔ عیش و کامرانی کا دَور دَورہ ہے۔ دفعتہً بھائی کا انتقال ہو جاتا ہے! اب تصویر کا دُوسرا رُخ سامنے آجاتا ہے۔ آثار الصنادید کی ترتیب کی مہم درپیش ہے۔ وہی کبڈیاں کھیلنے والا، پُرانی عمارتوں کے کتبے پڑھنے کے لئے چھینکوں پر لٹک رہا ہے۔ اِس خطرناک ہمّت کو دیکھ کر مولانا صہبائی گھبرا اُٹھتے ہیں۔ اُن کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ مگر اولوالعزم سیّد احمد خاں مٹتی ہوئی عظمت کے مدھم نقوش کو اُجاگر کرنے پر تُلا ہوا ہے —— اب غدر کے خُونی معرکے درپیش ہیں۔ بجنور میں بلوے ہو رہے ہیں۔ آئندہ کا سیاست داں آگ اور خُون کی اِس خوف ناک ہولی میں مستقبل کے اُفق پر ایک سنجیدہ نظر ڈالتا ہے —— اور مُلک کے عام رُخ کے خلاف ایک اور مسلک اختیار کرتا ہے۔ انگریزوں کی جانیں بچاتا ہے محمود خاں کی "نامحمود" حرکتوں پر لے دے کرتا ہے۔ اِس سے اُلجھتا ہے اُس سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ اُس کی کوششوں سے فساد کی آگ کہیں بجھ جاتی ہے، کہیں نہیں بجھتی! تا آنکہ اقبال مند فرنگی کا ڈُوبا ہُوا ستارہ پھر چمکنے لگتا ہے اور اس گم گشتہ اور بازیافتہ عروج کے خُونیں پرچم کے نیچے صدہا مظلوم بے گُناہوں کی گردنیں کٹنے لگتی ہیں —— فرنگیوں کے ہوا خواہ مگر مُلک کے غم گسار اور دردمند صدر الصدور سے یہ منظر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ اب اس کے دِن اور راتیں غم خواری و غم گساری میں کٹتی ہیں۔ کبھی ہیڈن فارن سکرٹری حکومت ہند سے مباحثے ہو رہے ہیں کبھی ہنٹر کی مسلم کُش کتاب کا جواب لکھا جا رہا ہے۔ کبھی "وفادارانِ دَولت انگلشیہ" کی فہرستیں تیار ہو کر ان کے کارنامے شائع ہو رہے ہیں کبھی مجاہد یا یوں کہیے عافیت پسند مگر بدنام بیرو کاروں کی صفائی دی جا رہی ہے —— اِسی طرح پردے اُٹھتے جاتے ہیں، نقاب کُھلتے جاتے ہیں مُلکی سیاست کا قافلہ "دھیرے دھیرے" نہیں،

نہایت تیزی سے چل رہا ہے —— سرسید بھی ایک قافلے کے سالار ہیں۔ مگر ایسے قافلے کے جس کے متعلق "تیری کون سی کل سیدھی" کی پھبتی بجا معلوم ہوتی ہے —— ملازمت سے الگ ہونے کے بعد وہ کام جو خطباتِ احمدیہ وغیرہ کے ذریعے شروع کیا گیا تھا، نقطۂ تکمیل کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ اور تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور تعلیم کی اشاعت کے ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں۔ مولوی امداد العلی اور مولوی علی بخش خاں سے معارضے، مباحثے، علی گڑھ کے لئے چندہ، زندہ دلانِ پنجاب کے جلسوں میں ہنگامہ خیز تقریریں، کالج کی عمارتوں میں دلچسپی اور عام کامیابی۔ اب جوانی کا آفتاب ڈھل گیا ہے اور قوئے مضمحل ہیں۔ سید محمود اُن کے فرزند رشید اُن کے مزاج پر غالب ہیں۔ ٹرسٹیوں میں ناراضگی پھیل رہی ہے۔ مولوی سمیع اللہ —— یار وفادار سے تُو تُو میں میں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ پیری اور یہ پریشانیاں۔ آخر پائے ہمت لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اور قوی ہیکل سرسید مرض الموت کی گرفت میں ہے۔ پھر کبھی نہ خموش ہونے والی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں "کہ اب وُہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چُپ رہنا ہوگا۔ اِس لئے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں" تا آنکہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو یہ تابناک شعلہ، آتشِ خاموش کی طرح بجھ کر رہ جاتا ہے۔ کلُّ مَن عَلیھا فَان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام!

سرسید کی یہ داستانِ حیات، حیاتِ جاوید میں بڑی جامعیت اور بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے —— اور اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ہم اس کو کسی معنی میں "غیر مکمل" نہیں کہہ سکتے۔

حیاتِ جاوید کا حصہ اول سرسید کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ اِس میں سوانح کا خاتمہ خوب ہے۔ زندگی کی آخری گھڑیاں ہیں۔ بیماری کے بعد ہذیان کی حالت طاری ہوتی ہے مگر کامل بے حواسی سے پہلے برابر ان کی زبان پر حسبی اللہ نعم الوکیل نعم المولےٰ ونعم النصیر —— آیاتِ قرآنی جاری ہیں۔ پھر ہذیان کا غلبہ ہو جاتا ہے —— اور آخر اس انجمن کی یہ شمع رات کے دس بجے —— سحر ہونے سے

پہلے ہی گُل ہو جاتی ہے ــــ

حیاتِ جاوید میں بیان کی وہ سب خصوصیات پائی جاتی ہیں جو مولانا حالی کے اُسلوب سے مخصوص ہیں۔ حالی کی سیرت کا ایک شاندار رُخ جو اُن کے اُسلوب میں بھی نمایاں ہے، یہ ہے کہ وُہ اپنی ذات کی بہت کم نمائش کرتے ہیں۔ سرسید کی حیات میں، جن کے ساتھ اُنہوں نے عُمر کا بہت ساحصّہ بسر کیا تھا، اِس امر کی بڑی گنجائش تھی کہ ان کے نام کے ساتھ ساتھ اپنے نام کو بھی اُچھالنے کی کوشش کرتے اور ان کے کارناموں کی داستانِ فخر میں اپنی کلاہِ افتخار پر بھی کوئی طرّہ لگاتے۔ مگر اُنہوں نے ایسا نہیں کیا ــــ اِس طویل و عریض سرگزشت میں اپنی ذات کو کنارے پر رکھا ہے ــــ یہاں تک کہ جہاں ان کی شخصیت نے سرسید کی رہبری اور مدد بھی کی ہے وہاں بھی مُنکسر المزاجی سے اپنا نام دبی زبان سے ہی لیا ہے ــــ یہ غیر شخصی انداز ان کی سب تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ مگر حیاتِ جاوید میں اِس کی جلوہ گری کچھ زیادہ ہے اس لئے کہ یہاں غیر شخصی ہونے کے لئے مصنّف کو بڑی قُربانی کرنی پڑی ہے۔

مولانا حالی کی سلامتِ طبع اور اعتدالِ مزاج کے ثبوت کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں لیکن اگر اس کے لئے کسی ثبوت و شہادت کی ضرورت ہو تو اس کے لئے حیاتِ جاوید سے بڑھ کر گواہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اِس میں حالی کے قلم نے شرافت کا بلند ترین معیار پیش کیا ہے۔ اُن کو اِس بات کی بڑی احتیاط ہے کہ اُن کی زبان سے کوئی ایسی بات بھُول کر بھی نہ نکلنے پائے۔ جس سے کسی کی دِل آزاری ہوتی ہو۔ یہی کی یہ شرافت اُن کی دریا دلی اور طبعی فیاضی کی دلیل ہے۔ اُنہوں نے اِس فیاضی، میں ہمیشہ اپنے پاس سے کچھ دیا ہے، چھینا کچھ نہیں بقولِ عُرفی ؎

عدیلِ ہمّتِ ساقی است فطرتِ عُرفی
کہ حاتمِ دگران و گدائے خویشتن است

اُردو کے اِنشا پردازوں میں اِس معاملے میں اگر کوئی اُن کے ساتھ شریک ہے۔ تو وُہ مدیرِ "مخزن"، شیخ سر عبدالقادر ہیں جن کا مہذّب اور شریفانہ لب و لہجہ ان کے اُسلوب میں

اِس طرح لُطف دیتا ہے جس طرح دُودھ کے شربت میں شیرینی ہوتی ہے۔ حیاتِ جاوید ایک متنازع فیہ شخصیت کی سرگزشتِ حیات ہے۔ جس میں سرسیّد سے اختلاف کرنے والوں کے خلاف تلخی اور تُندی کا اظہار ہو سکتا تھا۔ مگر حالؔی نے سبھی کی "دِل جوئی" اور "دِل نوازی" کی ہے۔ اُن کے قلم نے سب کو "آبِ زلال" ہی بخشا ہے ——— بادہ شرابِ تلخ کے نہ گاہک ہیں نہ سوداگر ——— یہ جنس اُن کے نامور معاصر شبلؔی کے پاس فراوانی سے ہے ——— ! حالؔی نے حیاتِ جاوید میں شبلؔی کے مضمون "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" پر جو اظہارِ رائے کیا ہے اِس سے بھی جذبۂ عقیدت ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اور شبلؔی پر ہی کیا موقوف ہے، اُنہوں نے تو ہر معاملے میں حافظؔ کا ہم نوا بن کر یہی پیغام دیا ہے کہ

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

حالؔی کے بیان میں سبک روی اور اعتدال پر قائم رہنے کا رُجحان قاری کے لئے حظ اور مسرّت کا ایک بڑا ذریعہ ہے ——— اِس سے پڑھنے والوں میں "شرافتوں" کی بزرگی کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اور طبیعت میں ایک ایسی رفعت پیدا ہوتی ہے کہ پڑھنے والا کچھ یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کائنات کے اِس حصّے میں جسے انسانوں کی بستی کہا جاتا ہے خُدا نے کچھ ایسے انسان بھی بھیجے ہیں جو اُن فرشتوں کی یادگار ہیں جنہوں نے ازل کے روز خُدا کے رُوبرو "نحن نسبّح" کہہ کر اپنی معصومیت کا مدعیانہ اعلان کیا تھا۔ یہ وُہ اِنسان ہیں جو ان فرشتوں کی اُس بدگمانی کی عملی تردید کے لئے دُنیا میں بھیجے گئے ہیں کہ انسان تو محض شر و فساد کے نمائندے ہیں اور اُن میں نیکی اور پاکیزگی کا کوئی عنصر موجود نہیں - حالؔی بالیقین اِنہی فرشتوں میں سے ایک ہیں !

حالؔی کے اُسلوبِ بیان کی اِس خصوصیت کا یہ بالکل قُدرتی نتیجہ ہے کہ اُن کی تحریروں میں جوشِ بیان کی خاصی کمی ہے ——— یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جذبات سے معرّیٰ ہیں ۔ کیونکہ ان کی غزل اور ان کے مسدّس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وُہ احساس اور جذبے کی اُن دولتوں سے مالا مال ہیں جو ایک شاعر کو ودیعت ہوتی ہیں ——— اِس کے باوجود ان کی نثر کو پڑھ کر بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا قلب زندگی کی سب

حالتوں میں "یک رنگ" سا رہتا ہے۔ اُن کے یہاں جزر ہی جزر ہے مد نہیں۔ اُن کی دُنیا میں گرمیوں کی وہ دوپہر کبھی نہیں آتی ——— ان کے نظامِ زندگی میں نہ گھری تاریکی ہے نہ چُندھیا دینے والی روشنی۔ مدھم روشنی اور "مِلگجا" اندھیرا ——— ان کے یہاں نہ قہقہے ہیں نہ فریادیں ——— ایک دردمند آدمی کا میٹھا میٹھا تبسم ہے اور بس ——— غرض زندگی کی شدید حالتوں کا احساس تو ہوتا ہوگا۔ مگر اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ دیکھئے کہ غدرِ دہلی ——— یا ۱۸۵۷ء سے زیادہ ہولناک موقعہ اور وحشت انگیز سماں کون سا ہوگا۔ کم از کم حالی کی زندگی میں یہ قیامت ایک ہی دفعہ برپا ہوئی ——— مگر حیاتِ جاوید میں اِس ہنگامۂ محشر کا جب ذکر کرتے ہیں تو اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے دِل میں مصنف کی "سرد مزاجی" ——— بلکہ "بے حسی" کا نقش بیٹھتا جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حالی بے حس آدمی نہ تھے۔ مگر اُن کے بیان میں بے حسی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اب حیاتِ جاوید میں سرسیّد کے اِنتقال کا موقعہ دیکھئے! جس سرسیّد کی "مدلّل مداحی" کا الزام اُن کی گردن پر لگ چکا ہے، اسی سرسیّد کی وفات کا حال لکھتے وقت کچھ ایسی بے رنگی اختیار کی ہے کہ "دو پھول بھی نہ وُہ سرِ تُربت چڑھا سکے" کا مضمون خود بخود ذہن میں آجاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ماتمی تقریریں، مرثیئے، لوگوں کی رائیں اور خیالات یہ سب کچھ بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مگر اس طرح کہ گویا ایک وقائع نگار لکھ رہا ہے ——— اِس میں ہمیں غم زدہ حالی کہیں نظر نہیں آتے ——— جو مدّتوں پہلے اِسی "پیرِ دیرینہ سال" (سرسیّد) کی ایک نگاہ پر دل نثار کرچکے تھے، ——— وہ دِل جو خوب رُو جوانوں پر کبھی متوجہ نہ ہُوا تھا، کبھی نہ مائل ہُوا تھا ؂

آں دل کہ رم نمودے از خوب رُو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

حالی کی تحریروں میں اِس "خنکی" کا سبب "دِل سردی" نہیں بلکہ یہ چیز ہے کہ وُہ اپنی فطرت کے اعتبار سے دھیمی کیفیتوں کے دِل دادہ آدمی ہیں۔ شدید جذبات ان کی غزل میں بھی نہیں، اُن کا سوزِ دِل شعلوں کی صُورت کبھی اختیار نہیں کرتا۔ وُہ دھیمی آنچ کے خوگر ہیں۔ وہاں بھی اعتدال اور نرم روی اُن کی شان اور اُن کا شیوہ ہیں۔ اُن کی آہیں

نالہ وشیون اور فریاد وفغاں کی لَے اختیار نہیں کرتیں ۔ وُہ زیادہ سے زیادہ زیرِ لبی کی حد تک پہنچتی ہیں۔ وُہ غالبؔ کے شاگرد سہی مگر وُہ آشفتگی اور جُنون کا وُہ تماشا نہیں دکھاتے کہ غالبؔ کی طرح صحرا میں سر پھوڑنے کے لئے دیوار کی تلاش کرتے پھریں ـــــ اُن کے جذبات کی تندی بھی اِس دھیمی کیفیّت کی حامل ہوتی ہے جو مثلاً اِن اشعار میں ہے ؎

جس دل کو قیدِ ہستیٔ دُنیا سے ننگ تھا ۔۔۔ وُہ دِل اسیرِ حلقۂ زُلفِ بُتاں ہے اب

لغزش نہ ہو، بلا ہے حسینوں کا التفات ۔۔۔ اے دِل سنبھل وُہ دُشمنِ دیں مہرباں ہے اب

حالیؔ تُم اور مُلازمتِ پیرِ مَے فروش ۔۔۔ وُہ علم وُہ دیں کدھر ہے وُہ تقوےٰ کہاں ہے اب

غرض یہ ہے کہ حالیؔ شدید اور پُرجوش حالتوں اور کیفیّتوں کے اظہار کے لئے موزوں مزاج اور طبیعت ہی سے یکسر محروم ہیں ۔ اِس پر ایک اور سبب کا اضافہ یُوں ہوگیا کہ سرسیّد کی عقلی تحریک جذبات کو عقل کے تابعِ فرمان بنانے کے حق میں تھی۔ یہ زمانہ شدید جذباتی اظہارات کا زمانہ نہ تھا بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ زمانہ اصولاً نثر کا زمانہ تھا ـــــ اور نثر بھی وہ جو علمی ضرورتوں اور دماغی تقاضوں کو پُورا کرنے کے لئے وقف ہوئی۔ اِس فضا میں حالیؔ کی طبیعت کا اور بھی مدّھم اور دھیما ہو جانا بالکل قُدرتی امر ہے۔ اُن کا شاعری کو اصلاح کے سانچے میں ڈھالنا اور اس پر منطقی اور علمی قیود کا عائد کرنا ـــــ اور اس (جنونِ ہوشیاری) کو ایک علم بنا کر پیش کرنا، یہ سب کچھ اِسی فضا کے زیرِ اثر تھا۔ پس اِن حالات میں اگر حالیؔ کا قلم سرسیّد کے غم میں ’’دو آنسو،، بھی نہ بہا سکے یا اُن کے سینے سے فریاد نہ سہی ایک آہ بھی ایسی نہ نِکل سکے جس سے اُن کے دل کے ہنگاموں کا احساس ہو سکے، تو یہ ہمارے لئے کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں رہتی۔

حیاتِ جاوید کو اِس لحاظ سے حالیؔ کے اُسلوب کا شاہکار کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اُن کے قلم نے بڑی ہمہ گیری اور قُدرت اور وسیع تصرّف کا ثبوت پیش کیا ہے کتاب میں عملی دُنیا کی عام باتوں کے علاوہ سرسیّد کے علمی کارناموں کا بھی تفصیلی تذکرہ ہے۔ اِن میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، سیرت، فلسفۂ اخلاق، تاریخ، سوانح،

جُغرافیہ، صحفِ سماوی، السنۂ قدیم وحال، غرض نکرۂ مطالعہ کے درجنوں موقعے آئے ہیں۔ اِن سب میں حالی کا قلم اُسی ہمواری اور سہولت کے ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔ جس سے وہ خالص سوانحی حصّے میں رواں ہوا ہے۔ وہی سادگی، وہی پاکیزگی، وہی متانت، وہی لطیف نکتہ سنجی جو اور تحریروں کا خاصّہ ہے۔ اُن کی علمی تحریریں بھی اِسی وصفِ خاص سے متصف ہیں ـــــ اُن کی عبارت میدانوں میں بہنے والے کسی نرم سیر دریا کی طرح ہے کہ راستے کی سب منزلوں کو یک رنگ ہمواری کے ساتھ طے کرتا جاتا ہے۔ اور سطح پر معمولی شکن بھی پیدا نہیں ہوتے۔

اگرچہ یہ خیال کچھ زیادہ غلط نہیں کہ طرزِ بیان میں حالی، اپنے پیر و مُرشد سرسیّد سے بعض امور میں مماثلت رکھتے ہیں، مگر اِس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اُن کے اور سرسیّد کے طرزِ بیان میں کچھ فرق نہیں۔ ـــــ حالی کو سرسیّد کے اُسلوبِ بیان کا مقلد کہنا ایک زیادتی ہے۔ البتّہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حالی کے ہاں سرسیّد کے بیان کی زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ شستہ و رفتہ صورت ملتی ہے ـــــ سرسیّد کی تحریروں میں ناہموار ترکیبیں اور ناگوار الفاظ عام ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر ہمیشہ مطلب پر رہتی ہے۔ وُہ کہنے کے انداز کا خاص خیال نہیں رکھتے ـــــ مگر حالی کے یہاں "سطح" کی صفائی کی بڑی نگہداشت ہے۔ ناگوار لفظوں اور ترکیبوں سے عموماً بچتے ہیں ـــــ حیاتِ جاوید جیسی ضخیم کتاب میں (میرے ذوق کے مطابق) متنافر الفاظ چار پانچ ـــــ سے زیادہ نہیں۔ عربی کی عبارتیں اور جملے بھی اُردو عبارتوں میں یُوں چسپاں ہیں کہ پرچین کاری کا ایک نادر نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔

حیاتِ جاوید میں بیانیہ نگاری کا وہ اُسلوب پایا جاتا ہے کہ اگر اس کا حصّہ دوم حصّہ اوّل سے مُختلف نہ ہوتا تو مَیں اِس کو سچّا ناول یا حقیقی داستان کہہ دینے میں کوئی حجاب محسوس نہ کرتا ـــــ اور اگر سچ پُوچھئے تو حیات اِس سے الگ ہے بھی کیا؟ اگر ایک ناول کسی فرضی شخصیّت کی سرگزشت دل ہے تو ایک حیات یا سوانح عمری بھی اِس لحاظ سے ناول ہی ہے کہ اس کا ہیرو ایک تاریخی حقیقت یا ایک امرِ واقعہ ہے ـــــ خیال یا مفروضہ نہیں ـــــ اِس

لئے ناول اور سوانح عمری (ماسوا چند اتفاقات کے) ایک دوسرے کے متوازی، ہی چلتے ہیں ـــــ زندگی اور اس کے افکار و حوادث، دونوں کا مواد اور موضوع ہیں۔ دونوں میں شخصیت کی تصویر منتہا اور مقصد ہے ـــــ اس شخصیت کی تصویر جس کے انتخاب میں مصنف کی آنکھ نے کوئی معنی دیکھ پایا ہے اسی معنی، کی مفصل باز آفرینی، دونوں کا نصب العین، دونوں کی غایت ہے۔ پس اس لحاظ سے دونوں میں بڑی مماثلت ہے اور یہ مماثلت اس لئے بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کہ دونوں میں اظہار کا انداز بیانیہ ہے حیاتِ جاوید میں حالی کا بیانیہ نذیر احمد کے اس بیانیہ سے زیادہ رواں ہے، جس کا اظہار مثلاً ابن الوقت میں ہوا ہے۔ دونوں میں اس حد تک مماثلت بھی ہے کہ دونوں کے بیان میں واقعاتی حصّہ کم اور مصنف کی اپنی رائے کا حصّہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ موضوع کے اشخاص کی بات کم اور ان کے متعلق مصنف کے عقائد اور خیالات زیادہ آجاتے ہیں۔ اگر نذیر احمد کے ناول علمی مقالے بن کر رہ جاتے ہیں تو حالی کی سوانح عمریاں خصوصاً حیاتِ جاوید سوانح پر ایک تبصرے کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

حیاتِ جاوید میں حالی کی بیانیہ نگاری پر ایک اور چیز بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ وہ سوانح نویسی کا توسیعی تصور ہے۔ سر سید کی زندگی کی سرگزشت ایک معنی میں ہندوستان، خصوصاً مسلمانانِ ہندوستان کی تقریباً ایک صدی کی تاریخ کے مرادف ہے۔ اس وجہ سے سر سید کو اُن کے اصلی مقام پر دکھانے اور اُن کے کارناموں کی حقیقی اہمیت جتانے کے لئے کچھ ضروری سا ہو جاتا ہے کہ تصویر کے ارد گرد چوکھٹا ضرور لگا یا جائے بلکہ تصویر کے اندر کے خط و خال نمایاں کرنے کے لئے واقعات میں ماحول کا رنگ بھی بھر دیا جائے۔ اس خیال کے ماتحت حالی کا میدانِ عمل بڑا وسیع ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس توسیع کی وجہ سے اُنہیں مختلف واقعات کے پس منظر پر نظر ڈالنی پڑتی ہے، اور مختلف واقعات کے اسباب اور حکمتوں اور مصلحتوں سے بحث کرنی پڑ جاتی ہے ـــــ یہ طریقِ کار اپنی جگہ مفید سہی مگر اس سے بیانیہ کی ہمواری میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ بیانیہ کے اندر بحث و استدلال کا رنگ

پیدا ہو جاتا ہے اور واقعات سے زیادہ واقعات کے پس منظر اور پس منظر سے متعلق مختلف اشخاص اور اُن کا ذہن و فکر سامنے آجاتا ہے۔ یہ طریقہ اُس وقت اور بھی بیانیہ کے لئے سنگِ راہ بن جاتا ہے، جب حالیؔ اپنے دعوے کی تائید میں اقتباسات پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ایک ایک جزئی بات کی تائید میں کئی کئی اقتباسات یکے بعد دیگرے لائے جاتے ہیں ـــــ یہ سب کچھ وہ اِس ارادے کے ماتحت کرتے ہیں کہ سرسیدؔ کی ہر بات میں خلوص اور سچائی ثابت کی جائے کیونکہ

"اِس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اَوروں کو بھی اِس کا یقین دلائیں کہ سرسیّد کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا"

اِس کوشش کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بیانیہ بار بار رُک رہا ہے۔ کہانی کا تسلسل بار بار ٹوٹتا ہے اور سلسلہ ہموار نہیں رہتا۔ دھاگے پر گرہیں پڑتی جاتی ہیں اور نگاہیں رُک رُک جاتی ہیں۔ یہ ساری تکلیف سوانح عمری کے توسیعی تصوّر کے علاوہ سچّا ثابت کرنے کے لئے اضطراب کی وجہ سے بھی ہے۔ اضطراب کا یہ رنگ یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ سعدیؔ میں زیادہ نمایاں نہیں ہُوا۔ اِسی وجہ سے یہ تشریحی طرزِ بیان اُن کتابوں میں کچھ زیادہ نہیں کھٹکتا۔ حیاتِ جاوید ہی میں اِس کی زیادہ نمائش ہے۔

اِس تشریحی طرزِ بیان کے ساتھ ساتھ حیاتِ جاوید میں اضطراب کی کیفیت کچھ اس وجہ سے بھی پیدا ہو گئی ہے کہ حالیؔ سوانح عمری کے یادگاری یا تبلیغی مقصد کی گرفت سے کاملاً آزاد نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ اُن کا دعوےٰ یہ ہے کہ وہ سرسیّد کی حیات میں کریٹکل بیاگرافی کے اصولوں پر عمل پیرا ہوں گے۔ مگر یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ حیاتِ جاوید کی ترتیب میں یہ جذبہ بڑی شدّت کے ساتھ کار فرما تھا کہ اس کے ذریعے ایک ایسا "نمونہ" ہاتھ آجائے جو قوم کی مشکلات میں رہبری کر سکے۔

"سرسیّد احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں اُنہیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ

میں نہیں پا سکتے۔"

سرسید احمد خاں کی زندگی بلاشبہ کئی پہلوؤں سے بے بہا زندگی تھی۔ اور کئی باتوں میں نمونہ بن سکتی تھی۔ مگر اس کو عملی طور پر نمونہ بنانے کی خواہش سے سوانح عمری کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ تو پہنچا، ایک بڑا نقصان اس سے زیادہ یہ ہُوا کہ حیات کے بیانیہ کے اندر جُملہ ہائے معترضہ بار بار کچھ اس طرح دخیل ہو جاتے ہیں کہ اُن سے قومی ترقی کی ترغیب ضرور ہوتی ہے، مگر بیانیہ کی روانی میں ناقابلِ تلافی خلل واقع ہو جاتا ہے —— شبلی کی طرح حالی کی حیاتِ جاوید میں بھی یہ تبلیغی اور ترغیبی آواز بار بار سُنائی دیتی ہے —— اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ سارے دَور کی رسم ہے جس میں سارا ادب (بلکہ ایک لحاظ سے دین کی مروّجہ اقدار کو) زندگی کی مادّی منفعتوں پر قُربان کیا جا رہا تھا۔ اس لئے خطابت کا یہ عنصر صرف حالی تک محدود نہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حیاتِ جاوید جن چند اسباب سے ایک معیاری سوانح عمری نہیں بن سکی، اُن میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں ایسا ترغیبی مواد موجود ہے جس کا سوانح عمری سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے علاوہ اس ترغیبی مواد کو سوانح عمری میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس سے بیانیہ کی خوبصورتی میں بہت کچھ نقص واقع ہوا ہے اگرچہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ حالی کی ترغیبی آواز میں شبلی کی آواز کی سی شدت اور سختی نہیں۔ حالی یہاں بھی نرم اور معتدل ہی ہیں۔

حیاتِ جاوید کو اُردو کی دو یا تین اعلیٰ سوانح عمریوں میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ مگر اس پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ حالی کی دوسری دو سوانح عمریاں (یعنی حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب)، حیاتِ جاوید کے مقابلے میں زیادہ پڑھی جاتی ہیں۔ جس سے بعض اہل الرائے نے یہ قیاس کیا ہے کہ حیاتِ جاوید رُتبے میں دوسری دو سوانح عمریوں سے کمتر ہے۔ جہاں تک راقم نے اس پر غور کیا ہے یہ قیاس درست نہیں معلوم ہوتا۔ سوانح عمری کی کڑی شرائط کی رُو سے حیاتِ جاوید یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی دونوں سے بہتر ہے۔ یادگارِ غالب ایک عُمدہ تصنیف ہونے کے باوجود عمدہ سوانح عمری نہیں۔ اور حیاتِ سعدی عُمدہ سوانح عمری تو یقیناً نہیں مگر اوّل درجے کی معیاری کتاب بھی وہ ہے یا نہیں۔ —— یہ

سوال ابھی قابلِ غور رہے۔ یادگارِ غالبؔ اور حیاتِ سعدیؔ دونوں اِس لئے زیادہ پڑھی جاتی ہیں کہ حیاتِ جاویدؔ کے مقابلے میں مختصر ہیں۔ اِس کے علاوہ اِن دونوں سوانح عمریوں کا ایک اور خوشنمار رنگ ایسا ہے جو حیاتِ جاویدؔ میں ذرا پھیکا ہے یعنی بیان میں خیال کی رنگ آمیزی کا ایک خاص انداز جو حالیؔ کی تقریباً سب تصانیف میں پایا جاتا ہے اور بڑا لُطف دیتا ہے۔ یہ خاص رنگ اُن کی تشبیہوں اور تمثیلوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ قیاسِ تمثیلی حالیؔ کا خاص حربہ ہے۔ اُن کے ذہن کو مماثلتوں کے اظہار میں اور اُن کو اپنی منطق کے تابع بنانے کے لئے اِس خاص طریقے سے بڑا اُنس ہے۔ اور حیاتِ سعدیؔ اور مقدمہ شعر و شاعری میں اُنہوں نے اس کی بڑی نمائش کی ہے۔ حیاتِ جاوید میں یہ عنصر ذرا کم ہے۔ اگرچہ اُن کی طبیعت نے اپنے اِس پُر لطف مشغلے کو اس میں بھی ترک نہیں کیا ہے۔ صرف دیباچے کی عبارت پر ہی نظر ڈال لی جائے تو اس قسم کی تمثیلوں کے سلسلے مضمون کے اندر سے یُوں سر اُٹھاتے ہوئے نظر آئیں گے، جس طرح میدانوں میں چلنے والا جُوں جُوں پہاڑ کے دامن کی طرف بڑھتا جاتا ہے، پہاڑ کی سرسبز چوٹیاں ایک ایک کر کے اُس کی نظروں کے سامنے اُبھر آتی ہیں۔ مثلاً یہ عبارت ملاحظہ ہو۔

> ایسی بیاگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اِس کے سوا وہ اُنہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اِس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دُوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے۔ اُن کو سب نے بھلا جانا کیونکہ اُن کو کسی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھُولے کیونکہ اُنہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔"

سرسیّد کے طرزِ تحریر کے متعلق لکھتے ہیں۔

> "جس طرح تلوار کا کاٹ درحقیقت اس کی باڑھ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے، اسی طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلّم کی سچائی اور اس کے نڈر دِل اور بے لاگ زبان میں ہے۔"

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں :-

"یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے جیسی سچائی اور راست بازی۔ وہ مثل شاعروں اور انشاپردازوں کے اپنے کلام کی بنیاد الفاظ کی شستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اُس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے۔ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو گھبراہٹ کے عالم میں بے ساختہ ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں ... "

ان سب اقتباسات میں تمثیلات ہیں یعنی ایسی تشبیہات ہیں جن میں مماثلت کی اس کی انتہائی حدوں تک تشریح کی گئی ہے گویا مماثلتوں کا تصور ہی نہیں، ان کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ اندازِ بیان شبلی کے اندازِ بیان کی عین ضد ہے۔ شبلی ایسے موقعوں پر استعارات اور کنایات کا دامن تھامتے ہیں کیونکہ استعارے کی فطری خاصیت یہ ہے کہ وہ محض اشارے سے مطلوبہ خیال کا تصور دلا سکتا ہے۔ اِس میں الفاظ کی بچت ہوتی ہے مگر تصویر کی جزئیات کو سمجھنے اور سمیٹنے کا کام قاری کے اپنے خیال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اِس معاملے میں حالی شبلی سے زیادہ آزاد کی طرف مائل ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اپنے خیال کی مکمل تصویر آفرینی کے عادی ہیں۔

حالی کی تصویر آفرینی کا انداز سرسید سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے یہ گمان گزرتا ہے کہ حالی سرسید کے مقلد ہیں۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ سرسید اور حالی کی تصویر آفرینی میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ سرسید کی تمثیلوں میں منطقی صداقت موجود ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس حالی کی تمثیلات میں صرف منطق کی نمائش ہوتی ہے۔ ان کی تمثیل کی ساری جزئیات منطق کے سانچے میں سما نہیں سکتیں اُن میں ایک مغالطہ ہوتا ہے۔ اُن کی "شاعرانہ منطق" تو بالکل ٹھیک مگر "عقلی منطق" کی چولیں ڈھیلی ہوتی ہیں اِس لئے ان کے بیان کے اِس پہلو کی سرسید کے بیان سے صرف نمائشی مماثلت ہے حقیقی نہیں۔ اِسی تفاوت کی بنا پر حالی کے بیان میں سرسید کے بیان کے برعکس شعریت زیادہ ہے اور خیال کو لطف اندوز ہونے کے زیادہ موقعے مل جاتے ہیں۔ یہ شعریت حیاتِ جاوید میں بھی ہے

اور دُوسری کتابوں میں بھی ہے۔ مگر حیاتِ جاوید میں یادگار وغیرہ کے مقابلے میں ذرا کم ہے۔ اِس لئے پڑھنے والے کو اس میں خیالی مسرّت ذرا کم حاصل ہوتی ہے۔

حیاتِ جاوید میں اُسلوبِ بیان کی باقی خصوصیات وہی ہیں جو عموماً حالی سے منسوب ہیں۔ فقرے سادہ مگر طویل، بیان منطقیانہ اور مدلّل، تحریر سے صداقت خلوص۔ ہمدردی اور یک رنگی ظاہر ہو رہی ہے۔ ہر ہر پیراگراف میں حالی کی شخصیت جھلک دکھا رہی ہے۔ مصنّف کو اپنے موضوع کے متعلق جو گہری واقفیت ہے اِس کا راز ہر ہر سطر سے آشکارا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنّف اپنی مصنفانہ ذمہ داریوں کے پیشِ نظر مواد کے بے پایاں دفتروں کو انتخاب کی قینچی سے کترتے ہوئے غمزدہ ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ کاش ——— کتاب کا دامن ذرا اور وسیع ہوتا تا کہ عقیدت کے سارے پھُول اِس میں بھر جاتے تفصیل اور جامعیّت کے لئے مصنّف کا اضطراب حاشیہ در حاشیہ سے ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ حالی کی نثر میں آہنگ کی ایک عجیب شان ہے۔ اُن کی عبارتوں کا آہنگ اُن کی "دلیلوں" کے تابع ہے۔ یعنی اُن کے ہر پیراگراف میں ایک "معلوماتی دعوےٰ" ہوتا ہے۔ پیراگراف کے سارے فقرے اِس دعوے کی دلیل ہوتے ہیں۔ اِس کے لئے حالی فقروں کو کچھ اِس طرح مرتب کرتے ہیں کہ خیال پیچھے ہٹ جائے اور آگے عقل بڑھ آئے اور بڑے سکون کے عالم میں وہ بات سمجھ لے جو پیش کی جا رہی ہے۔ اِس لئے ان کی عبارتوں میں رنش پاروں میں، پُرسکون روانی ہوتی ہے۔ دماغ کو ان کے پڑھنے سے بہت تسکین حاصل ہوتی ہے۔ خیال کی دُنیا میں ہل چل کم پیدا ہوتی ہے۔ شبلی اور آزاد کی طرح جھٹکے اور "جوار بھاٹا" کی سی کیفیتیں شاذ ہیں۔ اُن کی تحریروں میں موسمِ برشگال کے ندی نالے کم ہیں کہ اُٹھے تو ہر چیز خس و خاشاک کی طرح بہا ڈالی۔ خشک ہوئے تو اتنے بے آب کہ تا حدِّ نگاہ پانی کی بُوند نظر نہ آئی۔ ایک جوئے نرم سیر ہے جو چلتی رہتی ہے، بہتی رہتی ہے کبھی نہیں رُکتی۔ اِس تبصرے کو ختم کرنے سے پہلے ایک آخری بات کہنی ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حیاتِ جاوید پر شبلی کی تنقیدوں کے بعد یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ حیاتِ جاوید

سوانح عمری کے اعتبار سے معیاری کتاب نہیں۔ اسی طرح یہ بھی توقع تھی کہ حالی کے بعد سوانح عمریوں پر قلم اُٹھانے والے شبلی کے انتقادات سے متنبہ ہو کر حیات نویسی کا کوئی ایسا معیار قائم کریں گے، جس پر فن اور تنقید کو انگشت نمائی کا کوئی موقعہ نہ ملے گا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حیاتِ جاوید کے بعد جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں وُہ اِس معیار پر بھی نہ پہنچ سکیں، جو حالی قائم کر چکے تھے۔ اِس لئے یہ خیال بیجا نہیں کہ اُردو کا بہترین سوانح نگار ہونے کا فخر ابھی تک حالی ہی کو حاصل ہے۔ اور اُردو کی جامع ترین سوانح عمری اُن کی حیاتِ جاوید ہی ہے ——— بلاشبہ حیاتِ شبلی فخر کا یہ تاج حیاتِ جاوید سے چھیننا چاہتی ہے۔ مگر ان دونوں سوانح عمریوں کے امتیازی اوصاف اِس قدر یکساں اور مساوی معلوم ہوتے ہیں کہ انصاف اِس بحث میں خاموشی کو گویائی پر ترجیح دینا مناسب خیال کرتا ہے اور قارئین سے معذرت خواہ ہو کر رُخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہے ۔

سیّد عبداللہ

سرسیّد احمد خاں پر ایک نظر

ہندوستان میں مسلمانوں کا آفتابِ اقبال، اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کی وفات کے ساتھ ہی غروب ہو گیا تھا۔ اور اگرچہ شفقِ زوال کی سُرخی کم و بیش نصف صدی تک مشرق کے دُھندلکوں کو تابشِ جمال بخشتی رہی لیکن اُنیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے وہ بیشتر شمعیں بھی گُل ہو گئیں جو اس غروبِ عظیم کے بعد ظُلمستانِ ہند میں جا بجا روشن ہو گئی تھیں، دکن میں سلطنتِ خداداد، بنگال میں نظامتِ شرقی اور اودھ میں وزارتِ عالیہ کے انتزاع کے بعد وہ چراغِ سحَر بھی ایک آخری ہچکی لے کر بُجھ گیا، جس کی جھلملاتی ہوئی روشنی سے قلعۂ معلیٰ کے در و دیوار ایک عرصے تک اپنی نمودِ چند روزِ مستعار لیتے رہے تھے۔ اب ہر طرف ایک ظُلمتِ بے پایاں، ایک تاریکیٔ بے نہایت مسلّط تھی کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ عمیق تر اور شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سیاہ بختیٔ ملّت اور تاریکیٔ ابد میں اب کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ لیکن یکایک غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور توفیقِ الٰہی کی ایک ننھی سی کرن سینۂ ظلمت کو چیرتی ہوئی اس مردِ مجاہد کے نہاں خانۂ دل تک پہنچ گئی جسے اُس وقت کے چند لوگ سیّد احمد خاں کے نام سے جانتے تھے اور جو بظاہر حکومتِ انگریزی کے صوبائی محکمۂ عدالت میں ایک معمولی سی اسامی پر مامور تھا۔ لیکن جسے حقیقت میں قضا و قدر کے دربار سے اِس منصبِ عالی پر فائز کر دیا گیا تھا جو خُداوندِ جلّ و علیٰ کے محض چند مُنتخب اور برگزیدہ بندوں کے لئے ازل سے مخصوص ہے۔ یہ منصب، رُشد و ہدایت اور ایثار و خدمت کا وہ منصبِ جلیل تھا جو عالمِ انسانیت کے عظیم رہبروں میں سے بہت کم اکابر کو ارزانی ہوتا ہے۔ سیّد احمد خاں مرحوم انہی اکابر میں سے ایک فردِ عظیم تھے اور اس میں کس کو کلام ہے کہ جس لمحے انہیں یہ سعادتِ عظمیٰ نصیب ہوئی، اُسی لمحے اُن کی قوم کے مقدّر کا ستارہ چمک اُٹھا اور اس کی ضوفشانیوں سے ان کی زندگی ہی

میں اِس برِّ عظیم کا گوشہ گوشہ مُتنبر ہوگیا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ایک دن یہی ستارہ اُس مملکتِ خداداد کے مطلع پر چمکے گا جو اُن کے خواب کی تعبیر بن کر معرضِ وجود میں آئے گی اور مشیّتِ ایزدی کے وہ تقاضے پُورے کرے گی، جن کی تکمیل کے لئے بارگاہِ الٰہی سے سیّد مبرور کو مامور کیا گیا تھا۔

پس ماندہ و درماندہ اقوام کی رہبری یا زندہ و پائندہ ملل کی سرفرازی کے لئے فطرت گاہے گاہے جن رہبروں کو بروئے کار لاتی ہے، ان میں سے بیشتر اِن تحریکوں سے اپنا سرمایۂ قیادت حاصل کرتے ہیں جو ان ایّام میں ان اقوام و ملل کے شعور و لاشعور پر چھا رہی ہوتی ہیں ——— رہبرانِ عالم کی اکثریت اِسی صنفِ قیادت سے تعلق رکھتی ہے۔ قائدین کی ایک اور قسم ایسے اکابر پر مُشتمل ہوتی ہے جو حالات کے تصادم اور اجتماعی حوادث کی پیداوار ہوتے ہیں۔ تاریخ عالم میں ایسے اکابر کی بھی کوئی کمی نہیں۔ لیکن قائدین کی ایک تیسری قسم بھی ہے اور یہ اصنافِ قیادت میں سب سے نایاب ہے۔ اِس نوع کے قائدین کسی تحریک یا تصادم سے وجود میں نہیں آتے بلکہ خود ایسی تحریکوں کو معرضِ وجود میں لاتے ہیں، جو ایک عرصۂ دراز تک ان کے دل و دماغ اور ان کے شعور و لاشعور میں تربیت پا کر بلوغ کو پہنچتی ہیں۔ انبیائے کرام کا ایک طبقہ ایسے ہی قائدین سے تعلّق رکھتا ہے اور انبیاء کے بعد اُن عظیم انسانوں کا درجہ ہے جو سالہا سال تک معرضِ گمنامی میں رہ کر قدم بقدم اپنی منزل کی طرف بڑھتے اور اسی پیش قدمی کے دوران میں اپنے مقصد کو نکھارتے اور اپنے نصب العین کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ تا آں کہ ایک مقامِ موعود پر پہنچ کر ان کی تحریک ان کے منبعِ شخصیت سے ایک سیلِ رواں کی طرح بہہ نکلتی ہے اور موانع کو خس و خاشاک کے مانند اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی منزلِ مقصود کی طرف رواں ہو جاتی ہے۔ سیّد مرحوم قائدین کے اِسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

نوجوانی کے پُرشور زمانے سے گزر کر جب اُنہوں نے زندگی کی اُس منزل میں قدم رکھا جب ایک ذہین انسان اپنے گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کرتا ہے تو اپنے چاروں طرف ایک یاس انگیز سکوت اور ایک مرگ آسا جمود کو مسلّط پایا ——— زندگی کے

آپ ساکن پر کسی خفیف سی جنبش کے آثار بھی نہیں تھے۔ حرکت سے عاری فضا میں تعفن پیدا ہو چکا تھا۔ ان کی قوم ایک ناامیدیٔ جاوید اور ایک حزنِ بے حساب میں گرفتار تھی۔ قریب قریب ہر شخص کا دل ایک جاں فرسا احساسِ بے کسی و نارسائی میں ڈوب چکا تھا۔ حیرت و یاس کا ایک ابرِ محیط تھا کہ حدِ نگاہ تک گھرا کھڑا تھا اور اس کے عالمگیر سائے سے کوئی فرار ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اِدھر ملک کے نئے حاکم سید کی قوم سے سخت بدظن ہو چکے تھے اور ازبسکہ وہ ملکی سیادت کے اعتبار سے اسی قوم کے وارث تھے۔ اس لئے اُسے کچلنے اور پس ماندہ رکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے تھے۔ تیسری طرف برادرانِ وطن انگریزوں اور مسلمانوں کی مخالفت باہم اور انگریزی تعلیم و تہذیب سے مسلمانوں کی بیزاری سے فائدہ اُٹھا کر انگریز سے قریب اور نظم و نسقِ ملک میں دخیل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ان سب پر مستزاد مسلمان عوام کی وہ جہالت تھی جو انہیں دُنیا و مافیہا کی طرف متوجہ ہونے اور اپنی انفرادی و اجتماعی ترقی کی کوشش کرنے سے روکتی تھی۔ اور جسے تنگ نظر پیشوایانِ مذہب قرنوں سے قرنوں تر کرنے میں شب و روز مصروف تھے۔

سید نے زندگی میں قدم رکھتے ہی ان عناصرِ چہارگانہ کا شدید احساس کیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُنہوں نے آغاز ہی سے قوم کے مرض کی تشخیص کر کے اِس کے علاج کا منصوبہ تیار کر لیا تھا، لیکن اِس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی، علمی، روحانی اور اخلاقی زوال کے شدید احساس کے ساتھ اس کے استیصال، اور استیصال کے وسائل و ذرائع کا ایک دُھندلا سا خاکہ ان کی چشمِ حقیقت نگر کے سامنے ضرور آ گیا تھا۔ مرورِ ایام اور فکر و عمل کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس خاکے کے نقوش نکھرتے اور رنگین ہوتے چلے گئے۔ تا آنکہ اپنی زندگی کی پچاس منزلیں طے کرنے کے بعد وہ مقصدِ عظیم اپنی پوری تابانیوں اور جلوہ سامانیوں، اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات، اور اپنے جملہ عواقب اور مضمرات کے ساتھ ان کے بالکل سامنے آ گیا، اور انہوں نے صاف صاف دیکھ لیا کہ وہ اِسی مقصد کے حصول کے لئے مامور کئے گئے ہیں ——— چنانچہ یہیں سے ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی نشاۃ الثانیہ کے خواب کی تعبیر کا آغاز ہوتا ہے اور سید کی زندگی کے کامل تیس برس اِس کی

تکمیل کی مساعی میں بسر ہو جاتے ہیں۔ یہ ۱۸۶۶ء کا واقعہ ہے۔ سر سید ابھی ملازمت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور بنارس میں جج سمال کاز کورٹ کے عہدے پر متمکن تھے۔ لیکن اس معمولی سے عہدے تک پہنچتے پہنچتے، وہ بہت سے ایسے بڑے بڑے کام کر چکے تھے، جنہیں آل انڈیا حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً سائنٹیفک سوسائٹی اور برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کا قیام۔ مراد آباد میں ایک مرکزی یتیم خانے اور غازی پور میں علوم مشرقی و مغربی کے ایک جدید مدرسے کا آغاز، اسبابِ بغاوتِ ہند کی تالیف اور اس کے سلسلے میں حکومتِ ہند کے جلیل القدر اراکین سے مردانہ وار مقابلہ، اور متعدد بلند پایہ تصانیف کی اشاعت اور یہ سب کچھ اُنہوں نے سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں اور پابندیوں کے باوجود کر ڈالا تھا۔

بُنیادی طور پر اگرچہ وہ مُسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مُنہمک رہتے تھے اور اپنی توجہ کا بیشتر حصّہ اس دور کے تعصّبات کے استیصال اور روشن خیالی کے فروغ پر صرف کرتے تھے، لیکن اجتماعی طور پر وہ ہمیشہ مُلکی انداز میں سوچتے تھے اور اپنے تعلیمی اور تہذیبی پروگرام میں اُنہوں نے اب تک ہندو اور مُسلمان کا سوال پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ انگریزی تعلیم کے بارے میں جہاں انہیں مُسلمانوں سے یہ شکایت تھی کہ وہ اُسے مذہبی طور پر نقصان رساں سمجھتے ہیں، وہاں ہندوؤں سے یہ گلہ تھا کہ وہ اسے محض حصولِ ملازمت کے لئے حاصل کرتے ہیں۔ سر سیّد اپنے وقت کے بہت بڑے لبرل تھے۔ فکر میں لبرل، تصوّر میں لبرل، رُجحان میں لبرل، عمل میں لبرل، روزمرّہ کی زندگی میں لبرل تعلیم میں لبرل، مذہب میں لبرل، سیاست میں لبرل اور زندگی کے معاملات میں لبرل۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ایک بڑا خُوں ریز ہنگامہ اور ایک ہنگامہ پرور انقلاب دیکھا اور اس کے اسباب و نتائج پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور و خوض کیا تھا۔ اور آخر کار اِس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ سارا فساد حاکم و محکوم کے باہمی تعصب اور تنگ نظری کا نتیجہ تھا۔ وہ آخر دم تک اِس بات پر اڑے رہے کہ انگریز جس ہنگامے کو غدر کا نام دیتے ہیں وہ درحقیقت محض SEPOY MUTINY تھا جو افسروں کی حماقت اور ماتحتوں کی جہالت کے باعث پیدا ہو گیا تھا اور اپنی لپیٹ میں ہندوستان بھر کو لے کر انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر گیا تھا۔ پھر اسی اندازِ نظر سے انہوں نے تیس برس تک اقوامِ ہند

خصوصاً مسلمانوں کے زوال اور اقوامِ فرنگ خصوصاً انگریزوں کے عروج کے اسباب پر غور کیا اور ایسے نتائج مرتب کئے جو وقتی طور پر نہ انگریزوں کو پسند آئے اور نہ ان کے اپنے اہلِ ملک اور اہلِ قوم کو۔ لیکن ازبسکہ ان کی فکر بسیط "لبرلزم" یعنی روشن خیالی کی بنیادوں پر قائم تھی اور کسی قسم کے تعصّب کو اس میں ذرہ برابر دخل نہیں تھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ دلوں پر سے ضد اور ہٹ دھرمی کا رنگ دھلتا چلا گیا اور جو بات وہ پورے خلوص اور ایمانداری سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر شروع میں کہتے تھے، وہی آخر میں منظور و مقبولِ خاص و عام ہو گئی۔

غدر کے ہنگامے سے اُنہیں بہت بڑے ذاتی نقصانات پہنچے تھے، ان کی والدہ بھوک اور پیاس کی تکالیف کی تاب نہ لا کر انہیں ایام میں فوت ہو گئی تھیں۔ اور ان کے آبائی مناصب بھی سلطنت کی تبدیلی کے باعث یک قلم ختم ہو گئے تھے۔ مسلمان رؤسا عام طور پر انگریزی حکومت کے معتوب تھے۔ دار و رسن کی کارفرمائیاں اور جائدادوں اور جاگیروں کی ضبطیاں بہت بڑے پیمانے پر جاری تھیں۔ لیکن جب دار و گیر کی خاک ذرا بیٹھی تو سر سید نے لمحے بھر کا توقف گوارا نہ کیا اور اپنا سارا ذاتی وقت خوف زدہ مسلمانوں کی تسکین قلب اور مغرور حاکموں کی اصلاحِ نفس میں صرف کرنے لگے۔ اسی زمانے میں انہوں نے بغاوتِ ہند کے اسباب پر ایک جامع رسالہ لکھا اور اُسے حکومتِ ہند کی مخالفت اور ملازمت کی پابندیوں اور مجبوریوں کے باوجود برٹش پارلیمنٹ کے ایک ایک رُکن تک پہنچا دیا۔ سید کے اس اقدام سے نہ صرف ان کی ملازمت بلکہ اُن کی آبرو بھی خطرے میں تھی۔ مگر اس مردِ روشن دماغ نے کہ جسے اس کے دشمن اس کی زندگی بھر انگریز دوستی اور انگریز پرستی کا طعنہ دیتے رہے، اس خطرے کے متعلق پروا نہیں کی اور برابر اپنے موقف پر قائم رہا۔ حکومتِ ہند کے فارن سکرٹری ایک عرصے تک اس آگ میں جلتے بھُنتے رہے جو اس رسالے کے مضامین نے اُن کے تن بدن میں لگا دی تھی۔ لیکن ازبسکہ یہ آتش صداقت کے مقدس مجمر سے نکلی تھی۔ اس لئے سر سیسل بیڈن کچھ مدت کے بعد خود بخود ٹھنڈے ہو کر رہ گئے اور آخر سید مبرور کے حلقۂ معتقدین میں بھی داخل ہو گئے۔

اسی طرح جب غدر کی بقیۃ السیف آبادی کے یتامیٰ کی تربیت و تنظیم کا سوال سامنے آیا

اور عیسائی مشنریوں نے چاہا کہ ان کی ایک تعداد مسیحی مشن کی تحویل میں دے دی جائے تو سرسیّد اس تجویز کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہوگئے اور جب تک ہندو یتامیٰ ہندوؤں کے اور مسلمان یتامیٰ مسلمانوں کے حوالے نہیں کردیئے گئے، انہوں نے خواب وخور اپنے اوپر حرام رکھا۔ سرسیّد انگریز کی تنظیمی، اخلاقی، اور سیاسی اہلیتوں کے معترف تھے اور اہلِ ہند میں یہی خوبیاں کہ کشور آرائی کا زیور ہیں، پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہاں کے باشندوں کو کسی قیمت پر بھی بدمذہب بنانا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ مذہبی خیالات میں اصلاح و تطہیر کے قائل ضرور تھے مگر مذہب سے تنفّر پیدا کرنے کے ہرگز روادار نہیں تھے۔ اگرچہ یہاں بھی ان کی لبرل اِزم بار بار اِن کا دامن کھینچتی اور انہیں روشِ عام سے ہٹ کر سچائی کا پُرخطر راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں انہیں انجیل اور قرآن کی تطبیق کا خیال آیا اور اس خیال نے ایسا زور پکڑا کہ اُنہوں نے عبرانی زبان سیکھی اور انجیلِ مقدّس کی ایک تفسیر لکھنی شروع کی جس سے انجیل اور قرآن کے مُشترک مطالب کی تفہیم میں آسانی ہو۔ تبیّن الکلام کی تالیف اور اشاعت کہ یہی اس تفسیر کا نام تھا، بہت بڑا کام تھا۔ اِس کام کے لئے انہوں نے اپنے ذاتی خرچ سے ایک مطبع قائم کیا اور ایک عرصے تک اِس کام میں شب و روز مصروف رہے۔ ذرا غور کیا جائے تو یہ اقدام بھی اُن کی صداقت پرستی اور انسان دوستی کا ایک غیر مبہم ثبوت تھا۔ وہ اگر ایک طرف مسلمان علماء کا وہ تعصب دُور کرنا چاہتے تھے جو انہیں انجیلِ مقدّس کے مروّجہ نسخوں سے پیدا ہو چکا تھا تو دوسری جانب وہ مسیحی علماء کو افاداتِ قرآنی سے قریب تر لانا چاہتے تھے۔

اِس اثنا میں دوسری طرف چند ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ سیّد نے انگریز کے ساتھ جو رشتۂ مواخات قائم کیا تھا، ایسا معلوم ہونے لگا کہ بس اب ٹوٹا کہ ٹوٹا۔ سرسیّد قومی عزت کے بارے میں نہایت ذکی الحس تھے اور جب کبھی وہ دیکھتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کی تحقیر کرتے ہیں تو وہ تمام مصالح اور مفادات کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ ایسے مواقع کے نتائج ہمیشہ سرسیّد کے حق میں نکلے۔ اور انگریز نے بار بار یہ محسوس کیا کہ اہلِ ہند، خصوصاً مسلمان، قومی عزت کا سودا کسی قیمت پر بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور ان کا تعاون اور ان کی دوستی اسی وقت تک قائم ہے جب تک اُن کی آبرو اور ان کے قومی افتخار کو ٹھیس نہیں

لگتی۔

آج ہمیں یہ باتیں چنداں تعجب خیز معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن آج سے کم و بیش ایک صدی پہلے جب ہندوستان کامل طور پر شکست کھا کر فرنگ کے زیرِ نگیں آ چکا تھا، یہ اندازِ فکر اور طرزِ عمل یقیناً حیرت انگیز تھا۔

اب ہم ۱۸۶۶ء کے واقعے کی طرف لوٹتے ہیں۔ جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں، سر سید نے اس وقت تک جتنے قومی امور اور پبلک خدمات انجام دی تھیں، ان کی سطح فرقہ دارانہ مفاد سے بلند تر تھی وہ بیشتر امور میں، خصوصاً اصلاح و ترقی کے ایسے منصوبوں کی تکمیل کے سلسلے میں، جو مسلمانوں کے لئے مذہبی حیثیت نہیں رکھتے تھے، ہمیشہ قومی پیمانے پر سوچتے، اور سوچنے کے بعد اسی انداز سے اُن پر عمل کرتے بقولِ مولانا حالیؔ:۔

> "وہ اِس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے مل جل کر رہیں، کسی طرح ممکن نہیں۔"

"چنانچہ ان کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی ایک جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔"

"انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مستفید ہوتے تھے، تاریخِ ہند کی وہ کتابیں یا اُن کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقے پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی بُرائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ، نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔ اِس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت بن جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط، دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے۔ وہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل نہ رہے۔ اِس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دِل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ بھی باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا۔ جو عزت اور جاہ و منصب اور امورِ سلطنت میں شرکت، تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی، مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت، بے پروائی یا افلاس کے سبب اِس سے محروم تھے۔ اور واقعہ ستّادن نے

ان کو اور بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت چاؤ اور اُمنگیں بھری ہوئی تھیں، مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اس سے دست و گریباں ہو جائے۔

"اُردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی اور فارسی کے صرف کسی قدر اسماء شامل ہیں، اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بُنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

"چنانچہ مُلک کے سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہُوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی خط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو، جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

"سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ ساتھ چلنا، اور دونوں قوموں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ انہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپئر سے، جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سُن رہے تھے، آخر اُنہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا:۔

"اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے، جو زندہ رہے گا۔ وہ دیکھے گا۔"

(سید صاحب کے ملہمانہ الفاظ قابلِ غور ہیں)

"انہوں نے کہا: "اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔" میں نے کہا: مجھے بھی نہایت افسوس ہے، مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

تو یہ وہ موڑ ہے جہاں سے سرسید کا کاروانِ خیال اور سلسلۂ عمل ایک نئی شاہراہ

اختیار کرتا ہے اور دائیں بائیں دیکھے بغیر اس مقصود کا رُخ کر لیتا ہے جس کا نام فلاحِ اسلامیانِ ہند ہے۔ وہ زندگی کی پچاس منزلیں طے کر چکے تھے اور سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں اور پابندیوں کے باوجود بڑے بڑے اہم، مُلک گیر امورِ خیر انجام دے چکے تھے۔ انہیں اپنی اِس دُھن میں شب و روز محنت کرنی پڑتی تھی اور اُن کی زندگی کٹھن مہمات کا ایک سلسلۂ طویل بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن جب اپنی قوم کی فنا و بقا کا مسئلہ اپنی پُوری وُسعت اور شدّت کے ساتھ ان کے سامنے آیا تو ان کے لئے ایک نئی زندگی اور نئی توانائی کا پیغام بھی ساتھ لایا۔ اب سے ان کی زندگی کا ہر لمحہ قوم کے لئے وقف ہو گیا۔ وہ راتوں کو اُٹھ کر ٹہلتے اور سوچتے تھے اور دن بھر مختلف النوع مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ اب اُن کی ساری توجہ صرف ایک نُقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی، اور جیسا کہ مَیں نے ابھی عرض کیا یہ مرکزی نُقطہ اسلامیانِ ہند کی مادّی اور روحانی فلاح تھی۔

ان کے دائرۂ فکر و عمل نے ایک بے پناہ ہمہ گیری اختیار کر لی اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جسے ان کی توجہ عالیہ کا حِصّہ نہ ملا ہو۔

درحقیقت سیّد کے رُوپ میں قوم کو ایک جن مل گیا تھا جو اس کے لئے چشم زدن میں ہر وہ کام کر دیتا تھا جو برسوں میں ثروت و حکومت کے سہارے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہیں غیروں کے حملوں کی روک تھام کی جا رہی ہے۔ کہیں اپنوں کے دماغ سے اوہام کے جالے صاف کئے جا رہے ہیں۔ کہیں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں معماروں اور باغبانوں کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ کہیں نئے تصوّرات کی تحصیل، اور اپنے اعتقادات کے تحفّظ کے لئے سات سمندروں کے سفر کئے جا رہے ہیں۔ کہیں مُلک کی مجالس قانون سازمیں قومی مفاد کے حصول کے لئے تگ و دو کی جا رہی ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ خطباتِ احمدیہ اور تہذیب الاخلاق اور تفسیر القرآن کے ذریعہ اذہان کی روشنی اور اخلاق کی بلندی کا سامان بھی فراہم ہو رہا ہے۔ غرضیکہ ترقّی و تربیت کا ایک معرکۂ عظیم ہے۔ جس کے مختلف محاذوں پر بہ یک وقت یورش بھی جاری ہے اور دفاع بھی، اور بُڈھا سپہ سالار ایک ہاتھ میں دُوربین اور دُوسرے میں شمشیرِ عمل لئے ہر مورچے پر مثلِ برق پہنچتا اور مثالِ ابر گرجتا

ہے۔

سیدِ مرحوم جب انگلستان سے مراجعت فرمائے علی گڑھ ہوئے ہیں اور مدرستہ العلوم کی بُنیاد رکھی گئی ہے، اِسی زمانے میں رؤسائے علی گڑھ نے اُنہیں ایک ایڈریس پیش کیا۔ اِس ایڈریس کے جواب میں اُنہوں نے جو کلمات کہے، اُن میں سے چند آپ کے مُلاحظہ کے لئے پیش کرتا ہوں، تاکہ آپ اُن کے اندازِ فکر اور رُجحانِ طبیعت کا ذرا سا اندازہ کرلیں۔ فرمایا:۔

"ہاں یہ سچ ہے کہ مَیں نے اپنے اُس قدیم نامی اور پُرانے شہر کو (دہلی سے مُراد ہے) جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین پر پڑی ہیں، اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں، جس کی مٹّی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ مَیں بنا ہُوں اور پھر اسی میں میری خاک مِل جائے گی، صرف مدرستہ العلوم کی محبّت اور اپنی قوم کی بھلائی کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مُسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے' مَیں نے صِرف اِس خیال سے کہ کون سی راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دُور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب مَیں نے کوئی عُمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا۔ جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھُول دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، مجھُ کو ہمیشہ اپنا مُلک اور اپنی قوم یاد آئی، اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟"

یہی وہ اندازِ نظر تھا جو عُمر بھر سیدِ مبرور کی فکر کی راہنمائی اور عمل کی تربیت میں کارفرما رہا۔ وہ سراپا تعمیر و تہذیب تھے اور دُنیا کے بہت کم ایسے لیڈر پیدا کئے ہیں۔ جن کا اندازِ فکر اور اندازِ عمل دونوں میں تعمیر و تہذیب کی کیفیت اِس شدّت سے پائی جائے۔ اسلامیانِ ہند کی یہ بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اپنے ابتلائے عظیم کے آغاز ہی میں ایک بے مثال رہبر میسّر آگیا جس نے اپنی حیرت انگیز تعمیری صلاحیتوں سے کام لے کر ان کے لئے ایک قلیل عرصے میں ایک مامن مضبوط تیار کردیا جو پُورے پچھتّر برس تک نہ صرف ان کی تعلیم، بلکہ

ان کی ثقافت، اور ان کے کلچر، ان کے عزائم اور ان کے مقاصد، اور ان کی تمناؤں اور ان کی آرزوؤں اور آخر میں ان کی سیاست اور ان کی قیادت کا مرکز بھی بنا رہا۔

سید مرحوم نے بظاہر ایک مدرسۃ العلوم کا اجرا کیا تھا جس میں مسلمان نوجوان تربیت پاکر، جوہرِ اسلام اور جوہرِ انسانیت دونوں سے متصف ہو جائیں، لیکن ان کی نظر اس کے ذرا آگے بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ جب اپنے دل کے انتہائی عمیق گوشوں میں جھانکتے تھے تو انہیں وہاں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی ننھی سی قندیل بھی روشن نظر آتی تھی اور وہ جلدی سے اِس گوشے کو ڈھانک دیتے تھے کہ ان کے پیشِ نظر کاموں کی عملی حیثیت، تخیّلی کیفیت اختیار نہ کرلے۔ لیکن لاریب اُن کے لاشعور میں ہمیشہ یہ جذبہ متلاطم رہا کہ جس قوم کو وہ آہستہ آہستہ جگا رہے ہیں، جب وہ جاگ اُٹھے تو پھر سے اپنا کھویا مقام بھی حاصل کرلے۔
اگر ان کی نگارشات کو ذرا ژرف نگاہی سے دیکھا جائے تو ان میں جا بجا ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے اسلامیانِ ہند کے مُستقبل اور اس کے امکانات کے متعلق ان کا نُقطۂ نگاہ صاف مترشح ہوتا ہے۔ آج سے اسّی پچاسی برس بیشتر ڈاکٹر ہنٹر نے "ہمارے ہندوستانی مُسلمان" کے عنوان سے جو کتاب لکھی تھی، اِس میں حکومت برطانیہ کو ان کی طرف سے خُوب خُوب بدظن کیا گیا تھا۔ سرسیّد کا مشن عین اس کے مخالف تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ انگریز مسلمانوں کی وفاداری پر مطلق شک نہ کریں۔ لیکن دیکھئے اِس عالم میں بھی وہ دِل کی بات کہنے سے گریز نہیں کرتے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے حاشئے میں یہ سوال کیا تھا کہ "اے علماء و محققانِ شرعِ اسلام! تمہاری اِس معاملے میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مُسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضے میں ہو تو اس مُلک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اس غنیم کی مدد کرنی جائز ہے یا نہیں"؟

اِس سوال کے جواب میں سرسیّد نے پہلے ایک اصولی بحث کی ہے اور پھر آخر میں صاف کہہ دیا ہے کہ:

"کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے مُلکی ہنگامے میں کُل قوم کا کیا حال ہوگا؟ مَیں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مُسلمان وہی کریں گے جو ان کی پولیٹکل حالت

ان سے کروائے گی"۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ جواب آج سے اسّی برس پہلے دیا گیا تھا جب ہندوستان میں مُلکی آزادی کا تصوّر بھی رُونما نہیں ہُوا تھا۔ اِسے سیّد کا کمالِ نظر کہیئے یا خلوصِ نیّت، بہر حال جو بات انہوں نے کم وبیش ایک صدی پیشتر کہی تھی وہ عین مین اُسی طرح پیش آئی اور اس کا نتیجہ جو برآمد ہُوا وہ خدا کے فضل سے سیّد مرحوم کے منشاء کے عین مطابق اور اُن کی رُوحِ پُرفتوح کے لئے باعثِ صد ہزار تہنیت و تبریک ہے۔

مَیں کہہ رہا تھا کہ بظاہر انھوں نے محض ایک مدرستہ العلوم کی بُنیاد رکھی تھی جس کا بدیہی مقصد یہی تھا کہ ہندوستان کے مُسلم نوجوان اِس میں ایک خاص نہج کی تعلیم و تربیت حاصل کریں اور جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں تو وہ دُنیوی اور رُوحانی دونوں اعتبارات سے ایک کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن جیسا کہ مَیں نے عرض کیا، سرسیّد کی نگاہ اِس سے کچھ آگے بھی گئی تھی۔ وہ علی گڑھ کو مُسلم لیڈر شپ کے لئے ایک زندہ و پائندہ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ اکثر زعماء کے اپنے اپنے پروگرام ہوتے ہیں جن پر وُہ عمل کرتے ہیں۔ کوئی اقتصادی بہتری کو اپنا موضوعِ عمل بناتا ہے، کوئی سیاسی ترقّی پر نظر رکھتا ہے، کوئی سماجی اصلاح پر زور دیتا ہے۔ لیکن سرسیّد کی دُور بینی نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائیں گے اُس کے جاری رہنے اور فروغ پانے اور محیطِ کُل ہو جانے کی ایک ہی صُورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ پروگراموں کی بجائے پروگرام بنانے والے پیدا کریں جو اپنے اپنے حالات کے مطابق اِس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں، جو انہوں نے ملّتِ اسلامیۂ ہندیہ کی فلاحِ عام کے لئے تیار کیا تھا۔ میری ناچیز رائے میں یہی ان کا مُنتہائے نظر تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کو اُنھوں نے اِس نمونے پر تیار کیا کہ وہ مسلمانانِ ہندوستان کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا اور بیداری اور رہبری کی جو لہریں یہاں سے مُنتشر ہوئیں وہ برِعظیم ہند کے ہر گوشے میں پہنچ کر اثر آفریں ثابت ہوئیں۔

مَیں نے یونیورسٹی سے پہلے کا علی گڑھ دیکھا ہے اور مَیں سمجھتا ہُوں کہ اُس کی زندگی اور اُس کا ماحول ایک خاص حد تک اپنے بانی کے منشا کے مطابق تھا اور لیڈر شپ کے

عناصر کی تیاری اور نشر کا کام بھی حُسن و خوبی سے ہو رہا تھا۔ مگر یہ اُس زمانے کی بات ہے جب سرسیّد کی رُوح اُس کے قالب میں جاری تھی اور وہ ڈگریاں بنانے کی فیکٹری نہیں بنا تھا۔

سرسیّد کی رہبری کا یہ پہلو دُنیا کی لیڈر شپ کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ وہ قوم کے متوسط طبقے کے ہر اُس فرد کو جو علی گڑھ میں تعلیم پانے کے لئے آتا اُس کے اپنے حلقۂ اثر میں ایک نئے لے کا انسان بنانا چاہتے تھے۔ مدرستہ العلوم کے تعلیمی ماحول میں شرافت، ضبطِ نفس، ایثار، اتحاد، یکجہتی اور سب سے بڑھ کر روشن خیالی جسے میں "لبرلزم" کے وسیع تر لفظ سے پکارنا چاہتا ہوں، بڑی تیزی سے پھُولتی پھلتی اور نوجوانوں کی طبائع پر اپنا رنگ جماتی تھی۔ پھر جب یہ نوجوان اِس تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو کر اپنے اپنے دیار و امصار میں جاتے تھے تو وہ روشنی کے چلتے پھرتے مینار بن جاتے تھے اور حسنِ خیال اور حُسنِ عمل اُن کی زندگی کا اسلوب قرار پاتا تھا۔ اُن میں سے ہر فرد اسلامی اخوت کی تصویر، کشادہ دلی کا مرقع اور ہمدردی کا مجسمہ ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جس میدان کو اپنا میدانِ عمل بناتا تھا اُسے اس کی سخت کوشی اور اہلیتِ تنظیم گُل و گلزار بنا دیتی تھی۔ سیدِ مرحوم کی نگاہ میں اسلامیانِ ہند کا مُستقبل اِسی نوع کی لیڈر شپ پر منحصر تھا اور اسی لئے انھوں نے اس کی تخلیق کو اپنے تعلیمی منصوبے کا محور قرار دیا اور باقی کرنے کے کام خود اُس کی صوابدید اور اہلیت پر چھوڑ دیئے۔

میری ناقص رائے میں لیڈر شپ کی اس تاسیس و تخلیق کے بعد ملّت کی حیاتِ ثانیہ کا جو خواب سرسیّد نے دیکھا تھا اقبال کے تخیّل اور جناح کے تدبّر کے طفیل وہ آخر کار پُورا ہو کر رہا۔ آج ہم اِس مملکت میں ایک باوقار اور آزاد زندگی اِس طرح بسر کر رہے ہیں گویا یہ ہمارا پیدائشی حق ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ اگر سرسیّد قومی وحدت اور قومی ہستی کی وہ بُنیاد اُستوار نہ کرتے جس پر تحریکِ علی گڑھ کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی اور قومی احساس اور روشن خیالی کی وہ شمع روشن نہ کرتے جو آج سے کم و بیش پون صدی پیشتر انھوں نے روشن کی، اور ہمیں مُلّا کے پنجے اور ذہنی استبداد سے نجات دلا کر زندگی کی صحیح اقدار سے روشناس نہ کراتے تو

آج ظلمتانِ ہند میں ہم اُسی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرتے جس طرح نیم وحشی قبائل وسطی ہند کے جنگلوں میں اب بھی کھاتے پھرتے ہیں۔

ہمیں سرسید کا ترکہ اور علی گڑھ کی روایات ورثے میں ملی ہیں اور یہ روایات شائستگی، بلند فطری، توازن اور روشن خیالی کی روایات ہیں۔ لیکن جہاں سرسید نے ایک حد درجہ یاس آفریں ماحول میں کام شروع کیا تھا اور سرمایہ کے لحاظ سے محض صفر سے آغاز کیا تھا، وہاں ہم نے ایک خاورستانِ امید اور ایک شہرستانِ لازوال ترکے میں پایا ہے۔ زندگی کی تعمیر کا مصالحہ ہمارے ہر طرف بکھرا پڑا ہے۔ آؤ کہ اس مصالحے سے ایک قصر زرنگار تعمیر کریں، ایک ایسا قصر، جو سید اعظم کے خوابِ زریں کی ہو بہو تعبیر ہو اور جس کی رفعت عقدِ ثریا اور رنگینی گردشِ ایام پر خندہ زن ہو۔ آؤ کہ اسلام کی علمی روایات کو از سر نو زندہ کریں اور سطحیت اور فراریت سے کنارہ کش ہو کر اس مملکت میں معارف پروری اور عمل پیرائی اور سخت کوشی کے بلند ترین معیار قائم کریں۔ بہار آچکی ہے، فضا زمزمۂ بلبل سے لبریز ہے۔ اے بادہ کشو تم کہاں ہو؟

بیا تا گُل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

صلاح الدین احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

دیباچہ طبعِ ثانی

سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف کا پہلا ایڈیشن جس کا حجم ہزار صفحے سے کم نہ تھا سالِ گزشتہ میں شائع ہُوا تھا۔ اور باوجودیکہ اس کی قیمت گراں سمجھی گئی تھی سالِ حال کے ختم ہونے سے پہلے اس کی جس قدر جلدیں چھپوائی گئی تھیں تقریباً سب فروخت ہو گئیں۔ اگرچہ فروخت ہو گئیں۔ اگرچہ ایک ایسے وسیع مُلک میں جیسا کہ ہندوستان ہے ایک ہزار جلد کا دو ڈیڑھ برس کے اندر فروخت ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن خاصکر اس کتاب کا اس قدر بک جانا توقع کے بالکل خلاف ہے، نہ اس کے مضمون سے عام اہلِ وطن کو چنداں دلچسپی تھی نہ مُلک میں مسلسل اشتہاروں کے ذریعے سے اس کا اعلان کیا گیا تھا اور نہ قومی اخباروں نے اس سے نوٹس لیا تھا، صرف ایک اخبار میں اس پر کچھ ریمارک کیا گیا تھا سو اس میں کتاب کے نقائص کے سوا اس کی کوئی خوبی ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ پس اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو سوا اس کے کہ سرسید کی وفات کے بعد اُن کی خدمات قوم میں زیادہ وقعت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی ہیں۔ ان کے مذہبی خیالات اور اصلاحات سے جو عموماً وحشت پھیلی ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے اور کوئی وجہ ان کی لائف کے اس قدر مقبول ہونے خیال میں نہیں آتی ہم نے اس کتاب میں جس طرح سرسید کی مُلکی و قومی خدمات مفصل بیان کی ہیں اسی طرح ان کی تمام رائیں اور خیالات

اور عقائد جو مذہب سے علاقہ رکھتے تھے بے کم و کاست پبلک کے سامنے رکھ دیئے ہیں، یہاں تک کہ جو کچھ انھوں نے اپنے ہم خیال دوستوں کو پرائیویٹ خطوں میں مذہب کے متعلق لکھا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں رکھا۔ ان کی تفسیر میں جس کے نام سے لوگ بھڑکتے تھے شاید ہی کوئی مہتم بالشان مقام ایسا ہوگا جس کا ذکر اجمالاً یا تفصیلاً اس کتاب میں نہ کیا گیا ہو۔ باوجود ان تمام باتوں کے جو لوگ فی الجملہ استطاعت رکھتے تھے انھوں نے بہت شوق سے اِس کتاب کو خریدا ہے۔ اور جو لوگ کم استطاعت ہیں وہ نہایت بے تابی کے ساتھ اس کے مطالعے کے آرزومند ہیں۔

الغرض پبلک کا اِس کی طرف اِس قدر گرویدہ ہونا سخت متقاضی تھا کہ کتاب مذکور کا جہاں تک ممکن ہو ایک سستا ایڈیشن بہت جلد شائع کیا جائے جس کو عام شائقین آسانی سے خرید سکیں۔ سو اِسی غرض سے ہم نے یہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

اِس ایڈیشن کی قیمت گھٹانے کے لئے سوا اس کے کہ انڈکس اور ضمیمے آخر کتاب سے حذف کر دیئے گئے ہیں یا مسطر میں سطروں کی تعداد کسی قدر بڑھا دی گئی ہے یا بعض مقامات میں سے غیر ضروری عبارتیں کم کر دی گئی ہیں۔ کاغذ اور کتابت اور چھپائی کی حیثیت میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔ صحت میں بھی تا بمقدور کوتاہی نہیں کی گئی۔ اِس کے سوا سر سیّد کی تصویر خاص لندن کی چھپی ہوئی جو اُن کی زندگی میں اِسی مطلب کے لئے راقم نے ولایت سے منگوائی تھی اور ایک خاص وجہ سے پہلے ایڈیشن میں نہیں لگائی گئی ہے اب کام میں لائی گئی ہے۔

اگرچہ عام قومی اخباروں میں جیسا کہ اُوپر ذکر کیا گیا اِس کتاب کے عیوب و صواب سے کچھ بحث نہیں کی گئی، مگر بعض نامور میگزینوں میں مثل معارف، دلگداز اور افسر کے، شاید مصنّف کا دِل بڑھانے کے لئے اِس پر عمدہ ریمارکس کئے گئے ہیں۔ سو ان کی اِس خاص عنایت کا ہم دِل سے شکریہ ادا کرتے ہیں و اٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

الطاف حسین حالؔی

مقام پانی پت۔ ۱۵، دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبعِ اوّل

سرسید احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں انھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے مطابق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاتے۔ اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانش مند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے براہِ راست کچھ رہبری نہیں کرسکتے۔ ہم کو اب دُنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشورکُشائی کے لئے درکار ہیں ہمارے لئے بے سُود ہوں گی۔ ہمارے اسلاف میں علماء و حکماء اور مصنّفین کی بھی کچھ کمی نہیں ہے مگر وہ بھی آج ہمارے لئے قابلِ تقلید نمونے نہیں بن سکتے۔ ان کو خُدا نے ایسے وقت میں پیدا کیا تھا جب کہا جاتا تھا کہ علمؔ اور لوگوں کا کام ہے اور باورچی گری اور لوگوں کا۔[1] مگر ہمارے زمانے میں دونوں کام ایک ہی شخص کو کرنے پڑتے ہیں۔ اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی فکر اور خلجان خلل انداز نہ تھا۔ وہ معاش کی طرف سے فارغ البال تھے وہ قوم کی خدمت کرتے تھے۔ اور سلطنت اُن کی خدمت کرتی تھی۔ لیکن ہماری حالت ایسی نہیں ہے۔ ہم کو دائیں ہاتھ سے پیٹ کا دھندا کرنا پڑتا ہے اور بائیں سے کسی دُوسرے کام کا ارادہ کرنا۔ ہمارے عرفاء و مشائخ کی پاکیزہ زندگی بھی، ہم دُنیا داروں کی موجودہ حالت سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی وہ ہم کو اپنے اپنے قدح کی خبر منانے

---

[1] یہ ایک عربی مثل کا ترجمہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔ للعلمِ رجالٌ و للثرید رجالٌ۔

سکھاتی ہے۔ مگر ہماری خیر اب اِس میں ہے کہ سب مل کر ایک دُوسرے کی خیر منائیں۔ پس اِس وقت ہمارے سلف کے کارنامے ہم کو براہِ راست اس کے سوا کوئی سبق نہیں دے سکتے کہ بزرگوں کی بڑائی پر فخر کرو اور اِس شعر کے مصداق بنو ؎

ان افتخرت باباءٍ مضوا سلفا قُلنا صَدقتَ ولکن بئس مَاولدوا

(یعنی اگر تم کو اپنے بڑوں پر فخر ہے تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایسے ہی تھے مگر اولاد بُری چھوڑ گئے)

ہم یہ نہیں کہتے کہ سلف صالح کے حالات ہماری قوم کے لئے بالکل فائدہ مند نہیں ہیں ان کی بائیوگرافی میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو قومی زندگی کے لئے بمنزلہ ارکان وعناصر کے ہیں۔ محنت، صبر، استقلال، غیرت، دلیری، اولوالعزمی اور عالی حوصلگی سب کچھ ان کے کارناموں میں موجود ہے۔ مگر جن مہمات میں انھوں نے ان ہتیاروں سے کام لیا تھا ہماری مہمات ان سے بالکل جُدا گانہ ہیں جو شاید ان کو کبھی پیش نہیں آئیں۔ جن آلات سے انھوں نے مُلک فتح کئے تھے ہم کو انہی آلات سے دِل فتح کرنے ہیں۔ جو عزت و آبرو انھوں نے اپنی قوم کی سلطنت میں حاصِل کی تھی وہ ہم کو غیر قوموں کی حکومت میں حاصِل کرنی ہے۔ ان کے زمانہ میں سلطنت کے سوا کسی کو مصالح عامہ میں دخل نہ تھا اِس لئے اُن کو مُلک اور قوم کی بہبودی کے لئے ہاتھ پاؤں ہلانے کی مطلق ضرورت نہ تھی مگر ہمارے زمانہ کا حال بالکل اس کے برخلاف ہے۔ ہمارے زمانے میں قوموں کی مَوت اور زندگی خود قوموں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہیں اپنے تئیں بنائیں اور چاہے بگاڑیں۔ چاہیں جئیں اور چاہیں مر جائیں سلطنت کا کام صرف اُن کی حیات و ممات کا رجسٹر رکھنا اور زِندوں کو زِندوں کے گھاٹ اور مُردوں کو مُردوں کے گھاٹ اُتار دینا ہے اور بس۔ ہمارے اسلاف نے اِسلام کا دَور دَورہ دیکھا تھا جب کہ غیر مذہب والوں کو بھی اِس کا اتباع کرنا پڑتا تھا اور اِس کے خلاف کوئی دم نہ مار سکتا تھا اِس لئے ان کو دین کی حمایت کرنے کی صرف اسی قدر ضرورت تھی جس قدر کہ صُلح کے زمانے میں فوج رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ہم کو وہ زمانہ ملا ہے کہ بادشاہ اور رعیّت دونوں کے مذہب پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ آزادی نے گونگوں تک کو

گویا کر دیا ہے۔ مذہب کا بدلنا کپڑوں کے بدلنے بھی آسان ہو گیا ہے۔ اِدھر کرسچن سلطنت کی مقناطیسی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے، اُدھر سائنس مذہب کا نقش لوگوں کے دِلوں سے مٹانا چاہتا ہے جب کہ ہماری حالت سلف کی حالت سے اِس قدر بدلی ہوئی ہے تو ان کی بائیوگرافی ہماری مُشکلات پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی ہمّت سے ہماری ہمّت اور ان کی دلیری سے ہماری دلیری بڑھتی ہے مگر یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی ہمّت اور دلیری سے کیا کام لیا تھا اور ہم کو اِس سے کیا کام لینا چاہیئے۔ جس قدر تیمورؔ[1] کا ایک چیونٹی سے شاہانہ عزم و استقلال سیکھنا عجیب معلوم ہوتا ہے اِس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ تیمور کی لائف سے چیونٹی کا سا عزم و استقلال سیکھا جائے۔ پس اگرچہ زمانۂ سلف کے مشاہیر بلکہ مجاہیل کی بائیوگرافی بھی مُنفعت سے خالی نہیں لیکن اِس میں ہمارے لئے کوئی ایسی صاف اور کھُلی شاہراہ موجود نہیں ہے جس پر ہم آنکھیں بند کر کے اپنی دُشوار گزار منزل طے کرتے چلے جائیں۔

البتہ سر سیدؔ کی لائف ہمارے لئے ایک ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی یہ کٹھن منزل جو تنگنانے دُنیا میں ظاہرا اُس کی سب سے آخری منزل ہے آسانی کے ساتھ طے ہو جائے اس بزرگ کی لائف ہم کو نصیحت کرتی ہے کہ زمانے کی مخالفت سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تاکہ دُنیا میں آرام سے رہو اور عزّت سے زندگی بسر کرو۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیّت بننے میں کوشش کرو تاکہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔ وہ بتاتی ہے کہ کوئی قوم محکوم ہونے کی حالت میں کیونکر قومی عزّت حاصل کر سکتی ہے اور ایک شائستہ گورنمنٹ میں کیونکر اس کا رسُوخ و اعتبار بڑھ سکتا ہے۔ وہ جس طرح ہم کو آزادیٔ رائے کی تعلیم دیتی ہے

---

[1] تیمور نے ایک چیونٹی کو دیکھا کہ اناج کا دانہ جو اس سے سنبھل نہ سکتا تھا لے کر بار بار دیوار پر چڑھتی تھی اور پھر گر پڑتی تھی اِسی طرح سترِّیا اسّی دفعہ چڑھی اور گری آخر ایک دفعہ دیوار کی منڈیر پر جا پہنچی۔ تیمور اپنے تزک میں لکھتا ہے کہ اس دن سے میں نے کبھی کسی مُشکل یا سختی میں ہمّت نہیں ہاری۔

اسی طرح یہ بھی سکھاتی ہے کہ ہم کیونکر اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک طرف ہم کو خودداری اور سیلف ریسپکٹ کی تاکید کرتی ہے۔ اور غلامانہ خوشامد سے نفرت دلاتی ہے اور دوسری طرف حکمران قوم کا ادب اور اُس کی بزرگداشت ہمارے دلوں پر نقش کرتی ہے وہ ہم کو خبردار کرتی ہے کہ قومی تنزل سے مذہب کو کیا صدمہ پہنچتا ہے اور اس کا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے اور مذہب کے متہم ہونے سے قوم کن آفتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اُس کا علاج کیا ہے۔ وہ ہم کو اسلام کے وہ اعلیٰ اصول یاد دلاتی ہے جن کو قرونِ اولیٰ کے بعد قوم نے بالکل فراموش کر دیا تھا اور جن کا مطلب یہ تھا کہ قوم اور وطن کی محبت کو جزوِ ایمان جانو اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو۔ وہ ہم کو سبق دیتی ہے۔ کہ قوم کی حقیقی خیر خواہی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ بہت سے کام اُن کی عقل اور عادت، اور مرضی کے خلاف نہ کئے جائیں اور ان کی مخالفت کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت نہ کیا جائے۔ وہ ہم کو آگاہ کرتی ہے کہ اگر دُنیا میں بڑا بننا چاہو تو حرص۔ طمع، خود غرضی، جھوٹ، آرام طلبی اور عیش و عشرت سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤ۔ وہ ہم کو یقین دلاتی ہے کہ تھوڑی سی تعلیم اور بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے ایسے عظیم الشان کام انجام کر سکتی ہیں جو بڑے بڑے حکیموں اور مدبّروں سے انجام نہیں ہو سکتے۔ وہ ہم کو تعصبات سے متنفر کرتی ہے، غیر قوموں کے ساتھ حسنِ معاشرت سکھاتی ہے، دوستوں کے ساتھ، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا یہودی، خلوص اور سچائی سے ملنا بتاتی ہے۔ وہ ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور جو کچھ کہو اس کو کر دکھاؤ۔ وہ بہ آواز بلند کہتی ہے کہ وقت کی قدر کرو، ڈیوٹی کا خیال رکھو، ایک لمحہ بے کار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مر جاؤ۔

تعجب کی بات ہے کہ ایسی قابلِ فخر بائیوگرافی جس کا لکھنا مسلمانوں کا نہایت ضروری فرض تھا۔ اُس کے لکھنے کا خیال سب سے پہلے ایک شریف انگلشمین کو آیا۔ کرنل گریہم نے سرسیّد کی لائف اُن کی وفات سے تیرہ برس پہلے انگریزی میں لکھ کر شائع کر دی اور اس ضروری کام میں سبقت کرنے کا فخر مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اگرچہ صاحب ممدوح کے ہم دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے باوجود غیر قوم ہونے کے ہمارے واجب التعظیم لیڈر کی ایسی

قدر کی اور اُن کی بائیوگرافی کی سب سے پہلے بُنیاد ڈالی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اِس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرافی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لکھنے کا حق ایک آدھ مصنّف سے ادا ہو سکے۔ چُنانچہ کرنل گرہیم کی کتاب پر ایک انگریزی اخبار میں یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "وہ ایک مکمّل بائیوگرافی ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتی"۔ ہم کو پہلے بھی یہی امید تھی اور اب جب کہ سرسیّد کی وفات نے ایک حیرت انگیز غلغلہ تمام ہندوستان میں ڈال دیا ہے وہ امید یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ جس قدر زیادہ زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر سرسیّد کے کاموں کی زیادہ قدر اور اُن کے حالات کی زیادہ چھان بین ہوتی جائے گی، متعدد لوگ اُن کی بائیوگرافی لکھنے پر قلم اُٹھائیں گے اور صدیوں تک اِس ہیرو کا راگ ہندوستان میں گایا جائے گا۔

راقم کو سرسیّد کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اُس وقت پیدا ہُوا تھا جبکہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بُنیاد ڈال چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت مخالفتوں کے بہت تیزی کے ساتھ ترقّی کرتا جاتا تھا اور اُسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق میں سرسیّد کی دلنشیں تحریریں جیسی کہ اُردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں، شائع ہو رہی تھیں۔ اگرچہ سرسیّد نے اپنی زندگی عام بھلائی کے کاموں میں مدّت سے وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک اُن کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا۔ لیکن مدرسۃ العلوم اور تہذیب الاخلاق نے ان کی کوششوں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح سب پر روشن کر دیا۔ اگرچہ قوم میں عموماً مخالفت پھیلی ہوئی تھی مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سرسیّد کے کارناموں کو نہایت عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میرے دل میں بھی اُن کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی۔ اُسی وقت سے مَیں نے کچھ نوٹ اُن کی لائف کے متعلق قلمبند کرنے شروع کئے اور کم و بیش سَو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسیّد کے پاس بمقام علی گڈھ اِس غرض سے بھیجے کہ اُن کے جواب مُختصر طور پر لکھ دیں مگر وہ کاپی اُن کے پاس یُوں ہی پڑی رہی، کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ مِلا۔ مَیں نے یہ بھی چاہا کہ برس چھ مہینے خود علی گڑھ میں جا کر رہوں جہاں اس کام کے لئے قیام کرنا نہایت ضروری تھا مگر ملازمت کے تعلّق کی وجہ سے یہ موقع بھی نہ

مِل سکا۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہوئی کہ سرسیّد کی زندگی میں اُن کی لائف لکھنی مناسب نہیں اِس کی جو وجوہات انھوں نے اُس وقت بیان کیں وہ مجھے بھی معقول معلوم ہوئیں۔ ان اسباب سے آخرکار یہ ارادہ موقوف کر دیا گیا۔

کچھ دنوں بعد سرسیّد کے نہایت خالص و مُخلص دوست آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہُوا کہ یہ معزز لائف جہاں تک جلد ممکن ہو اُردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جائے چُنانچہ اُن کی تحریک سے میرے دوست منشی سراج الدین احمد مالک و مہتمم چودھویں صدی سرسیّد کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ اُنھوں نے بڑی کوشش سے اِس کے لئے میٹریل جمع کیا اور ایک خاص حد تک اِس کو ترتیب دے کر حاجی صاحب کو دے دیا۔ کئی برس تک مسوّدہ رکھا رہا مگر اُس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔

چونکہ کرنل گریہم اور منشی سراج الدین سرسیّد کی زندگی ہی میں اُن کی لائف لکھنے کی راہ نکال چکے تھے۔ میرے دِل میں پھر ایک ولولہ اُٹھا۔ مَیں نے خیال کیا کہ اگرچہ قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر مردِ مَیدان کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے۔ خُدا کے فضل سے ایسے لوگوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو سرسیّد کے کاموں کی دِل سے قدر کرتے ہیں، اُن کی خدمات کی داد دیتے ہیں، اُن کی بائیوگرافی کو قوم کے حق میں مفید سمجھتے ہیں اور اگر کوئی اُن کی بائیوگرافی لکھے تو اُس پر نُکتہ چینی کی اعلیٰ لیاقت رکھتے ہیں۔ مگر اِس کا لکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ جوہریوں سے بازار بھرا پڑا ہے۔ مگر کان کھودنے والے مفقود ہیں۔ ایسی حالت میں اِس ضروری کام کو لیت و لعل میں ڈالنا اور اُس وقت کا انتظار کرنا جو معلوم نہیں کہ اوّل ہم کو پیش آئے یا سرسیّد کو ٹھیک نہیں ہے، جس طرح ہو سکے اِس کام کو اُن کی زندگی ہی میں پُورا کر لینا چاہیئے تاکہ جب کبھی موقع آئے، اِس کو فوراً شائع کر دیا جائے۔

اِن خیالات سے مَیں نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیئے چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اِسی غرض سے مَیں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا جہاں پر سرسیّد اور اُن کی لائف لکھنے کا تمام سامان موجود تھا اور اُس کے بعد کئی دفعہ اُسی کام کے لئے وہاں جا جا کر ٹھیرا۔ مَیں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کا شُکرگزار ہوں کہ جس وقت اُن کو میرا یہ ارادہ

معلوم ہُوا اُنہوں نے وہ تمام مسوّدات جو منشی سراج الدین نے مرتب کئے تھے میرے حوالے کر دیئے اور اپنے دوست منشی سراج الدین کا بھی ممنون ہوں کہ اُن کے مسوّدات سے میں نے فائدہ اُٹھایا ہے۔

اگرچہ سر سیّد کی لائف کا لکھنا بظاہر ایک آسان کام معلوم ہوتا ہے کیونکہ سنہ ستاون سے لے کر اخیر تک جو کچھ انہوں نے کیا وہ سب چھاپے کے ذریعے سے مشتہر ہو گیا ہے اور سنہ ستاون سے پہلے کے حالات بھی معتبر ذریعوں سے معلوم ہو گئے ہیں۔ مگر درحقیقت اُن کی تمام سوانح عمری کا سمیٹنا نہایت دُشوار کام ہے۔ اُن کی زندگی ایسے اہم واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ نہ کسی واقعہ کو سرسری سمجھ کر چھوڑا ہی جا سکتا ہے اور نہ ہر ایک واقعہ کو مفصّل بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوست نے بالکل سچ کہا۔ کہ جس قدر سر سیّد کی زندگی میں اُن کے مخالف یا موافق لکھا گیا ہے اور جس قدر اُن کی وفات پر اطراف ہندوستان میں رنج و ماتم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اگر صرف اُسی کو جمع کیا جائے تو متعدد ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص سر سیّد کی لائف ایک آدھ جلد میں ختم کرنی چاہتا ہے۔ اس کو کیسا مُشکل کام کرنا ہے۔ اِس سے بھی زیادہ سخت مُشکل جو بائیوگرافی کے مضمون سے علاقہ رکھتی ہے، یہ ہے کہ سر سیّد کی ذات میں اِس قدر مُختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اُس کی شان اور اُس کے درجہ کے موافق گُفتگو کرنا ایک ایسا کام ہے جس کا پُورا پُورا حق وہی مصنّف ادا کر سکتا ہے جو خود بھی سر سیّد کے برابر جامع حیثیات ہو۔ مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، گورنمنٹ، پالٹیکس، لٹریچر، پبلک سپیکنگ، انجینئرنگ، آرکیولوجی وغیرہ کس کس بات کو بیان کیا جائے؟ اور کس کس حیثیت پر گُفتگو کی جائے؟ لیکن خُدا کا شُکر ہے کہ ہم نے کام کی مُشکلات دیکھ کر جی نہیں چھوڑا اور اِس عربی مثل کے موافق کہ مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ، سر سیّد کی لائف پُوری یا ادھوری جیسی کہ ہم سے بن آئی قوم کے لئے مرتب کر دی ہے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آئندہ مصنّفوں کے لئے کم سے کم ایک داغ بیل ضرور ڈال دی ہے جس کی حدود میں وہ ایک وسیع اور عالی شان عمارت آسانی سے تیار کر سکتے ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور تمام فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کریٹکل طریقہ سے لکھی جائے، اِس کی خوبیوں کے ساتھ اِس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ اور اُس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چُنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اِس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمّع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اِس کے سوا وہ اُنہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ جنہوں نے اس موج خیز اور پُرآشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اُترے۔ ان کو سب نے بھلا جانا۔ کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھُولے کیونکہ اُنہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اِس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علماء مفسرین کو للکارا ہے، اماموں اور مُجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکّے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے۔ تو دُوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پالٹیکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے۔ تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چُپ چاپ کیونکر لکھی جاسکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اُس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھونک بجا کے دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نُکتہ چینی کی بُنیاد ڈالی ہے۔ اِس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اُس کی پیروی کی جائے اور نُکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسیّد کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعوی ہے اور نہ اُس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں، لیکن اِس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اَوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسیّد کا

کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ اُن کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کُرید کی جاتی ہے اُسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ کتاب بہ نظرِ سہولیت دو حصّوں پر تقسیم کی گئی ہے پہلے حصّے میں سرسیّد کی زندگی کے تمام واقعات اور اُن کے کام ابتدا سے اخیر تک ترتیب وار بقیدِ تاریخ بیان کئے گئے ہیں۔ اور دُوسرے حصّے میں اُن کی تمام لائف اور اُن کے ورکس پر ریویو کیا گیا ہے۔ سرسیّد کی زندگی کا زیادہ نمایاں حصّہ جو غدر کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اُس کے متعلق زیادہ تر حالات علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور تصانیفِ احمدیہ سے لئے گئے ہیں اور بہت سی اطلاعیں سرسیّد کی دوستوں کی زبانی یا خود سرسیّد کے خطوط سے جو انہوں نے اپنے دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھے، یا سرکاری رپورٹوں، انگریزی اخباروں اور بعض مدبرانِ سلطنت کی تحریروں سے جن میں سرسیّد کا ذکر کیا گیا ہے اور بعض اور معتبر ذریعوں سے جن کی ہر ایک موقع پر تصریح کر دی گئی ہے، حاصل ہوئی ہیں۔

غدر سے پہلے کے حالات کسی قدر اُن کی قدیم تصنیفات سے جو غدر سے پہلے لکھی جا چکی تھیں یا سیرت فریدیہ سے جو حال ہی میں اُنہوں نے اپنے نانا کے حالات پر لکھی تھی یا اُن کے بعض رشتہ داروں کی زبانی اور زیادہ تر ایک مختصر تذکرہ سے جو مخدومی خان بہادر[1] غلام نبی خاں مرحوم نے ۱۸۹۴ء میں راقم کی درخواست پر میرٹھ سے ایک رسالہ کی حیثیت میں خود لکھوا کر بھیجا تھا اور خاص کر خاندان، بچپن اور تعلیم کے حالات خود سرسیّد مرحوم کی زبانی لکھے

---

[1] خان بہادر غلام نبی خاں مرحوم رئیس میرٹھ غدر سے تین چار برس پہلے رُہتک میں سررشتہ دار کلکٹری تھے اور سرسیّد وہاں قائم مقام صدر امین ہو کر گئے تھے۔ وہاں دونوں صاحبوں میں بہت اتحاد ہو گیا تھا اور ایک مدّت تک دونوں ایک ہی مکان میں رہے تھے۔ اس زمانے کے حالات خان بہادر نے قلمبند کر کے راقم کے پاس بھیجے تھے۔ خان بہادر وہی بزرگ ہیں جو غدر کے بعد ایک مدّت دراز تک پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور سب آرڈینیٹ جج اور بعد پنشن لینے کے بہاولپور میں مشیر مال رہے۔ ۱۲

گئے۔ اِس کے سوا کرنل گریہم کی کتاب اور منشی سراج الدین احمد کے مسودات سے بھی جا بجا مدد لی گئی ہے اور اُن رسالوں اور اخباروں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ جو خاص کر سرسید کی مخالفت کی غرض سے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً جاری ہوئے اور سرسید کے اخلاق و عادات وغیرہ کے متعلق کچھ اپنی خاص واقفیت سے اور کچھ اُن کے قدیم دوستوں کے بیانات سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے۔

اگرچہ اِس میں شک نہیں کہ سرسید کی لائف اگر اُن کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جس کی وہ مستحق تھی، اِس کو حاصل ہونی دشوار تھی۔ مگر ایک خاص وجہ سے ہم کو اِس بات کا افسوس رہ گیا کہ وہ سرسید کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ اوّل اوّل تو جب کبھی سرسید کے سامنے اُن کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوّے اُڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے، اور رکھا ہی کیا ہے؟ مگر آخر میں جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے، ان کو اس بات کے دریافت کرنے کا زیادہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی اخیر بائیوگرافی میں کیا لکھا جا رہا ہے اور اسی لئے وہ اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے چالیس برس مذہب کی حمایت میں بسر کئے ہوں اور سوائے تکفیر و تضلیل کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو اُس سے زیادہ کون شخص اِس بات کے دیکھنے کا خواہشمند ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اُس کی مذہبی تصنیفات پر نظرِ انصاف سے بحث کرے۔ پس اگر ہم یہ جانتے کہ سرسید کا ناگزیر وقت قریب آ پہنچا ہے تو کم سے کم جو کچھ ہم نے اُن کی مذہبی خدمات کی نسبت لکھا تھا وہ ضرور اُن کی نظر سے گذران دیتے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ جو دائمی سرور اور رُوحانی خوشی مرنے کے بعد اُن کو اپنی خالص اور بے ریا خدمات کے صلے میں حاصل ہوئی ہو گی اُس نے دُنیا کی ناچیز و حقیر قدر دانیوں سے اُن کو ابدالآباد تک مستغنی کر دیا ہو گا۔

اب ہم دیباچہ کو ختم کر کے لائف لکھنی شروع کرتے ہیں اور ناظرین کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ کتاب کے مطالعہ کے وقت اِس بات کا خیال رکھیں کہ دُنیا میں بڑے سے

بڑے آدمیوں کی زندگی بظاہر اسی طرح شروع ہوتی ہے جس طرح عام آدمیوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اُس میں کوئی کرشمہ ایسا صاف اور صریح نظر نہیں آتا جس سے اُن کی آئندہ زندگی کی عظمت کا سُراغ لگ سکے۔ لیکن جب اُن کی اعلیٰ قابلیتوں کے جوہر بتدریج اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ معمولی باتیں اُن کی ابتدائی حالت میں ناچیز اور کم وزن نظر آتی تھیں وہی اُن کی آئندہ ترقیات کی بُنیاد تھیں۔ پس اِس معزز لائف کی وہ عظمت جس کی طرف دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے، آغازِ کتاب میں ڈھونڈنی نہیں چاہیئے بلکہ اُس موقع کا منتظر رہنا چاہیئے جہاں سرسید کی ترقی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ جو کچھ اُن سے چالیس برس بعد ظہور میں آیا وہ اس کے لئے بچپن ہی سے تیار ہو رہے تھے۔

سرسیّد اہلِ مغرب کی نظر میں

(۱)

"حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مُستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سرسیّد احمد خاں اس کے مُستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دُنیا میں بڑے آدمی اکثر گذرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز لیاقتیں اور اوصاف مجتمع ہوں۔ وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشیل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا۔ اُس کا اثر اس عالم کا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دِل اُکسائے بلکہ وہ علانیہ دُنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لئے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اس کی دُنیا مخالف ہو تو ساری دُنیا سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مِل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا، نہ دَولت تھی، باوجود اس کے ہندوستان میں مُسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہُوا۔ یہ وُہ رُتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہُوا۔"

(پروفیسر آرنلڈ)

(۲)

مایُوسی کے اِس اندھیرے میں مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کو روشنی میں لے جائے اور ان کی شکستہ دُنیا کی تعمیر نو کرے۔ یہ شخص سرسیّد احمد خاں کی شکل میں ظاہر ہُوا۔

جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے اِس عظیم رہنما کی عظمت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ وہ سادگی، سچائی، بلند دماغی، مقصد کی مضبوطی، جذبِ دِل کی گہرائی، اور ذاتی کشش جیسی خصوصیات کے مالک تھے۔ اُن کی کوشش تھی کہ ان کا فرقہ جدید تعلیم حاصل کرے۔ اِس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ اپنے کام میں لگ گئے اور سترہ سال کی محنت کے بعد ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کی زمین پر محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کھولنے میں کامیاب ہوگئے جس نے ۱۹۲۲ء میں اُن کی امیدوں کے مطابق ایک یونیورسٹی کی شکل اختیار کرلی۔ اُنہوں نے کالج کی رسمِ افتتاح کے وقت اعلان کیا تھا کہ اُن کو ایسے اشخاص بنانے تھے جو فراخ دِل، بلند نظری اور پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دیں۔ اُن کو اپنے مقاصد میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی اُن کا اُٹھایا ہُوا خمیر پھیل چکا ہے اور آج اِس مکتبِ خیال کے کتنے ہی لوگ ہیں، جنھوں نے جدید باتوں کو اپنایا ہے اور ماضی کی اہم چیزوں سے بھی رشتہ قائم رکھا ہے۔ جو تمام لوگ اِس مکتبِ خیال میں شامل ہیں، جو اسلام کو مغربی علوم، اخلاقیات اور معاشیات کے قریب لانے کے لئے کام کر رہے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ یہ دکھا رہے ہیں کہ اِسلام ایک محدود اور غیر ترقی پسند عقیدہ نہیں ہے بلکہ عالمگیر اپیل ہے اور عملی دُنیا سے ہم آہنگ ہونے کی قوت رکھتا ہے"۔

(ایچ۔اے۔آر۔گِب)

(۳)

یونیورسٹی میں سب سے پہلے مَیں نے اُس کے بانی سرسیّد احمد خاں کا مزار دیکھا۔ ایک سفید مقبرہ جس کی جالیوں پر گلاب کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اُنہیں یہ ادارہ قائم کئے ایک تہائی صدی گذر چکی ہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں سرسیّد اور اُن کے مقاصد کو بھی سمجھنا ہے۔ اگرچہ آج اُن کے نقادوں کی تعداد اُن کے مدّاحوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ لیکن اِس سے پتا چلتا ہے کہ اُن کا اثر کتنا گہرا رہا ہوگا اور اب بھی ہے۔

" سرسیّد نے اپنی اس زمانے کی تحریروں میں کھُلّم کھُلا برطانوی حکومت پر تنقید کی ہے۔ دُوسری طرف اُس کے اچھے اثرات کو بھی تسلیم کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ حکومت اپنے محکوموں کے حالات سے بہت کم واقفیت رکھتی ہے۔ اور ہندوستان کے باشندوں سے اتنا بھی تعاون نہیں کرتی جتنا اِس سے پہلے مُسلم حکومت نے کیا تھا۔ یہ حکومت احساسِ برتری کا شکار ہے۔

سرسیّد احمد کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اِسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اُس نے جو لہریں اُٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں، خواہ وہ ہمیشہ اِس سمت میں نہ ہوں جو سرسیّد پسند کرتے۔"

(خالدہ ادیب خانم)

(۴)

"سرسیّد کے کردار کا ایک نمایاں پہلو تھا اُن کی مکمل بے خوفی۔ اُن کی صاف گوئی بعض اوقات تشویش ناک ہو جاتی تھی۔ اُن کا مخاطب خواہ وائسرائے ہو یا کوئی مغلوب الغضب مُلّا یا عیسائی مشنری یا اخباری نمائندہ، وہ وہی کہتے تھے جو واقعی اُن کے دِل میں ہوتا تھا۔ بدنامی، مخالفت، گالیاں، جان لینے کی دھمکیاں، کوئی چیز بھی اُن کو اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ انھوں نے مکمل غیر جانب داری سے انگریز افراد کو اُن کی بے نیازی اور اپنے ہم وطنوں کو اُن کی تنگ نظری پر ملامت کی۔ غدر کے اسباب پر ان کی کتاب صاف گوئی کی ایسی ہی مثال ہے، جیسا پیغمبرِ اسلام کی زندگی پر ان کا مقالہ۔ صرف ایسا ہی نڈر شخص "سلف گورنمنٹ" (SELF-Govt.) کے بارے میں ایسے "کڑوے جُملے" بول سکتا تھا۔ سرسیّد احمد کسی ایک جماعت کے نہیں تھے۔ آج کے رہنما علی گڈھ کی اِس عظیم شخصیت کی بے غرضی اور خلوص سے بہت اچھا سبق لے سکتے ہیں۔"

(ایچ۔ جی۔ رالنسن)

(۵)

"اُنیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ شخصیت سرسیّد احمد خاں کی تھی۔ غدر کے دب جانے کے بعد مسلمانوں نے انگریزوں کے ہاتھوں سب سے زیادہ مصیبت اُٹھائی۔ اچھے اچھے خاندان تباہ ہو گئے اور شمالی ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں مسلمانوں کی حالت بڑی مایوس کُن ہو گئی۔ جہالت اِس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمان سب فرقوں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ جس شخص نے اِس مایوسی کا طلسم توڑا وہ سرسیّد احمد خاں تھا۔ سرسیّد جیسا دیوقامت اِنسان ہی اِن مُشکلات پر اِس طرح قابو پا سکتا تھا۔ راستے سے ایسی دُشواریوں کو ہٹانا اور فنڈ جمع کرنا ایک عظیم اِنسانی کام تھا۔ (سی۔ ایف۔ اینڈریوز)

(۶)

"سرسید نے توہمات اور تنگ نظری کی مخالفت کی..... اپنے خیالات کی وجہ سے سرسید کو بہت پریشانی اُٹھانا پڑی۔ لیکن کوئی دھمکی اُن کی ہمت کو دھیما نہ کر سکتی تھی۔ آخر کار اُن کی سنجیدہ شخصیت مخالفتوں اور غلط فہمیوں پر چھا گئی۔ اور زندگی کے آخری دنوں میں اُن کا زبردست اثر رہا۔ جب وہ علی گڑھ کالج کی مسجد میں اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچا ئے گئے تو اُن کے ایک پُرانے دوست نے مجھ سے کہا :۔

دُوسرے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں۔ لیکن ایک پُوری قوم کو تنزل سے بچا لینا ایک پیغمبر کا کام ہے؛ میرے خیال میں یہ رائے سرسید کی شخصیت اور اُن کے کام کا صحیح اعتراف ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مَیں اُن سے زیادہ بڑے آدمی سے کبھی نہیں ملا"۔

(سر تھیوڈور موریسن)

(بہ شکریہ علی گڑھ میگزین) شہناز ہاشمی

پہلا باب

تاریخ ولادت اور خاندان

سیّد احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہوئے[1]۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں۔ اُن کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہے۔ اور جیسا کہ شجرۂ نسب مندرجۂ خطبات احمدیہ سے پایا جاتا ہے اُن کے سلسلۂ نسب میں سب سے اخیر امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا علیہم السلام ہیں اور اسی لئے وہ اپنے تئیں تقوی سید کہتے تھے۔

جس زمانے میں کہ بنی فاطمہ کو بنی امیہ اور بنی عباس کے ظلم و ستم سے عرب اور عراق عرب میں رہنا دشوار ہو گیا تھا اور اسی لئے اکثر سادات کے خاندان وطنِ مالوف چھوڑ کر دُور دُور دراز ملکوں میں جا رہے تھے۔ اسی پُرآشوب زمانے میں کسی وقت سرسید کے اجداد بھی دامغان میں جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے، چلے آئے تھے اور آخرکار ہرات میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ غالباً اُن کے بزرگ ہندوستان میں پہلے پہل شاہجہاں کے عہد میں آئے ہیں اور اس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک اُن کو اس سلسلۂ عُلیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا ہے۔

سید محمد دوست جو کہ سرسید سے پانچ پُشت اُوپر ہیں، دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ مع اپنی جمعیت کے ایک مورچے پر متعین تھے۔ جب اس مورچے کو اُنھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے ان کو یکّہ بہادر کا خطاب دیا تھا اس کے بعد وہ اپنے وطن ہرات کو چلے گئے اور پھر ہندوستان واپس نہیں آئے۔ مگر ان کے بیٹے سید بُرہان نے وہاں سے آ کر دلّی میں

---

[1] مہدی قلی خاں وزیر فرخ سیر نے اپنی وزارت کے زمانے میں تراہہ بہرام خاں کے قریب ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دیوان خانہ، فیل خانہ اور اصطبل وغیرہ متعدد مکانات تھے۔ اس کو سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد نے خرید لیا تھا اور اب تک وہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی حویلی کے ایک حصے میں جو خاص پورہ کہلاتا تھا سید احمد خاں پیدا ہوئے تھے۔

سکونت اختیار کی۔ سید برہان کے بیٹے سید عماد اور اُن کے دو بیٹے سید ہادی اور سید مہدی تھے۔ سید ہادی جو کہ سر سید کے دادا تھے ان کو عزیز الدین عالمگیر ثانی نے سنہ ۲ جلوس مطابق ۱۱۶۹ھ میں خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار و دو اسپہ و سہ اسپہ اور اُن کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب اور قباد علی خاں کا خطاب ملا تھا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ مگر جواد علی خاں بدستور دلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر کا زمانہ ختم ہوا اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے تو سر سید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ اور اضافہ کیا گیا اور عہدۂ احتساب لشکر در صوبۂ شاہجہان آباد اور ۱۵ سنہ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۱۸۸ھ میں عہدۂ قضائے لشکر عنایت ہوا۔ اور ۱۰ ارشعبان سنہ ۔۔۔ھ کو انھوں نے دنیا سے رحلت کی۔ سر سید کہتے تھے کہ "سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور اُن کا پورا دیوان اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔"

سید ہادی کے بیٹے یعنی سر سید کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت کے آدمی تھے۔ اگرچہ شاہ عالم کے زمانے میں اور ان کے بعد اکبر شاہ کے زمانے میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں ان کے والد کا تھا وہی درجہ میر متقی کا بھی رہا مگر چونکہ بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب دے اس کے لوازمات بھی دے سکے، اس لئے جب سید ہادی کے بعد اُن کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا۔ مگر چونکہ ان کو اکبر بادشاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لئے شاہ عالم کے انتقال کے بعد اُن کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ مثمن برج سے پیوستہ جو مکان خواب گاہ کے نام سے مشہور تھا اور جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا میر متقی برابر وہاں جاتے تھے۔ سر سید کہتے تھے کہ "میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اس دربار میں گیا ہوں۔"

میر متقی کے آبائی سلسلے میں میر قطبی کے سوا جو مجذوب ہو گئے تھے اور جن کے لوگ بہت معتقد تھے اور کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ اُن کی ننھیال خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ میر متقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب اُس کے گوشۂ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کئی دفعہ نادر گردی اور مرہٹہ گردی میں لُٹ چکا تھا اور اس کے اکثر حصے منہدم ہو گئے تھے۔ دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے اُن میں رہتے تھے اور دن کو جامع مسجد کے شرقی دروازے پر جو مکانات ہیں اُن میں بیٹھتے تھے۔

اُس زمانے میں شرفائے دہلی تیراکی اور تیر اندازی کو ایک جوہر شرافت جانتے تھے۔ میر متقی کو ان دونوں فنون میں کمال حاصل تھا۔ اکثر مرشد زادے اور شریف زادے ان دونوں فنون میں اُن کے شاگرد تھے۔ خود

سرسید نے بھی تیراکی اور تیراندازی اُن سے سیکھی تھی۔ سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں جو قطعِ نظر
تیراندازی کے تیر اور کمانیں بنانے میں نہایت مشّاق تھے، میر متقی ہی کے شاگرد تھے۔

میر متقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بےفکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سرسید اور اُن کی اولاد میں
اب تک موجود تھا۔ اُن کو حضرت شاہ غلام علی سے جن کی خانقاہ دلّی میں مشہور ہے بیعت تھی اور شاہ صاحب اُن پر
بدرجۂ شفقت رکھتے تھے۔ ہر روز بعد حلقے کے ایک مُرید جس کو حکم دے رکھا تھا میر متقی کی زنانی ڈیوڑھی پر آتا اور سب
چھوٹے بڑوں کی خیر و عافیت پوچھ کر شاہ صاحب سے جاکر عرض کر دیتا۔ اور جب میر متقی یا ان کے گھر میں کوئی اور بیمار
ہو جاتا تو مرزا غفور بیگ صاحب خورجوی کو جو شاہ صاحب کے خلیفہ اور مریدانِ خاص میں سے تھے اور خود مرزا
مظہر جانِ جاناں سے اکتساب کر چکے تھے، سلبِ مرض کے لئے اُن کے مکان پر بھیجتے اور وہ ہمیشہ جب تک کہ بیمار
کو صحت نہ ہوتی برابر آتے تھے۔

جو خاص عنایت شاہ صاحب کو میر متقی کے حال پر تھی، اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے
شدّتِ مرض میں مرزا صاحب کی قبر کے پاس اپنے لئے قبر کھُدوانے کا حکم دیا تو میر متقی نے عرض کیا کہ میری آرزو یہ ہے
کہ ٹھیک آپ کی پائنتی میری قبر ہو۔ چنانچہ ان کے لئے بھی سرداب تیار ہوا اور بعد انتقال کے جو ۱۵ رجب سنہ ۱۲۵۱ھ میں
واقع ہوا، اُسی سرداب میں شاہ صاحب کی پائنتی مدفون ہوئے۔

میر متقی کے والد سید ہادی اور خواجہ فرید الدین احمد سے جن کا ذکر عنقریب آئے گا بہت رسم و راہ تھی۔ میر متقی
بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے اور خواجہ فرید بھی اُن کے حال پر بہت مہربانی
کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے اپنی بیٹی عزیز النسا بیگم کی شادی میر متقی
سے کردی۔ اب میر متقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اٹھ کر مہدی قلی خاں والی حویلی میں جو خواجہ فرید نے خریدلی تھی
آرہے۔

میر متقی نہایت وضع دار اور راست باز آدمی تھے۔ معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی مرزا شمس الدین
تھے جن کی طرف سے بادشاہ کے دل میں نہایت رنج اور کچھ تہمات متعلق بہ دعوئ سلطنت تھے۔ اتفاق یہ کہ میر متقی
کو مرزا شمس الدین سے بھی نہایت خلوص تھا اور وہ اُن کے ہاں برابر آتے جاتے تھے۔ مرزا شمس الدین بھی اُن کی
بہت عزت کرتے تھے۔ اُن کو اپنی مسند کے برابر بٹھاتے تھے اور خاص اپنا بھنڈا پینے کو عنایت کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے
لوگوں کی دراندازی سے ایک بار ان کو مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کیا۔ میر متقی نے ہاتھ باندھ کر کہا کیا حضور

کو فدوی کی جاں نثاری میں کچھ تردّد ہوا ہے؟ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا نہیں نہیں۔ میر متقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقے کو چھوڑ کر مفت میں کیوں رُوسیاہی لوں۔ بادشاہ نے پھر کبھی اُن سے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

اکبر شاہ کے اخیر زمانے میں وزارت کے اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ میں جو بادشاہ کے چہیتے بیٹے تھے، چلے گئے تھے اور اس لئے راجا سوہن لال جو مرزا سلیم کی سرکار میں دیوان تھے وزارت کا کام کرنے لگے تھے۔ چوں کہ میر متقی کی راجا سوہن لال سے موافقت نہ تھی اس لئے انھوں نے دربار کا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اکثر ضروری موقعوں پر سرسید جایا کرتے تھے۔ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور تمام سینا دربار کی بدل گئی تو میر متقی کا دربار میں جانا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ مگر جو تنخواہ قلعے سے مقرر تھی وہ اور نوروز کو بادشاہ کی طرف سے سنہری روپہلی چھلّوں کے آنے کی رسم اور اسی قسم کی اور اعزازی رسمیں ان کی وفات تک بدستور جاری رہیں۔

سرسید کی ننھیال سرسید کی ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ سیرتِ فریدیہ میں جو خود سرسید نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین کے حالات میں لکھی ہے مندرج ہے۔ یہاں ہم اس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سرسید نے سیرتِ فریدیہ لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی، اخذ کر کے لکھتے ہیں۔

سرسید کے نانا خواجہ فریدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں، اول اُن کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوانِ تجارت دلّی میں آئے تھے، جو کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے اور اُنھوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن کے بیٹے خواجہ اشرف تھے جن کے آٹھ بیٹے ہوئے۔ ازاں جملہ دو شخصیتوں نے مختلف حیثیتوں سے بہت امتیاز حاصل کیا تھا۔ اوّل خواجہ نجیب الدین جو نواحِ دہلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ کے پیرووں کا پیدا ہو گیا تھا، شاہ فدا حسین اس فرقے میں ابتدائی عمر سے داخل ہو گئے تھے اور رسول شاہ کے جانشین مولوی محمد حنیف کے چیلے بن گئے تھے۔ شاہ فدا حسین نے تمام درسی کتابیں اپنے مرشد مولوی محمد حنیف سے پڑھیں۔ اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں۔ وہ خاصکر حقائق و معارف میں بڑی دست گاہ رکھتے تھے۔ "فصوص الحکم" "فتوحاتِ مکیہ" اور دیگر تصنیفاتِ شیخ اکبر اور دیگر قائلینِ وحدتِ وجود کی بہت خوبی سے پڑھاتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی کہ چار ابرو کا صفایا کئے، ایک عرقچی باندھے اور سارے بدن پر بھبوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرے سے باہر نکلتے تو تہمد گھٹنوں تک لپیٹ لیتے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے۔ ایک بار اکبر شاہ نے

اُن کے پاس آنا چاہا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کردیا۔ سرسید کہتے تھے کہ وہ نہایت خوش خلق اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو جو اُن کی بھتیجی تھیں اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اس کا لطف میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلّی میں اُن کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے تھے اور ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکیے میں جو چیلی باغ کہلاتا ہے اُن کا ڈھیر ہے۔"

دوسرے سرسید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ بااقبال، لائق، دانش مند، صاحبِ علم و فضل اور خاصکر ریاضیات میں وحیدِ عصر تھے انھوں نے لکھنؤ جاکر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ آصف الدّولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل اور تکمیل کی تھی۔ خواجہ فرید ریاضی میں مجسطی اور رسائل متوسطات جو اُن کے نام سے مشہور ہیں نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے۔ اور زیچ اور آلاتِ رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے اور خود آلاتِ رصد پر قادر تھے۔ بہت سے لوگوں نے اُن سے ریاضی کی تحصیل کی اور اس میں کمال بہم پہنچایا اور نامور ہوئے۔ ازاں جملہ مولوی کرامت علی[1]، مولوی رجب علی خاں[2]، خواجہ محمد ناصر جان[3] اور حکیم رستم علی خاں اُن کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ خود اُن کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنونِ ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے انھیں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب طالب علمی کے ارادے سے پہلی ہی بار میرا دلّی جانا ہوا اس وقت زین العابدین خاں زندہ تھے اور دلّی میں اُن کی ریاضی دانی اور فنونِ ریاضی میں سے خاصکر موسیقی کے علم و عمل کی بہت شہرت تھی۔

سرسیّد کہتے تھے کہ خواجہ فرید کے تصنیف کئے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ہیئات اور آلاتِ رصد کے باب میں تھے جو ایامِ غدر میں ضائع ہو گئے۔ مگر ان میں سے تین رسالے خود انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیرِ اعظم ریاست پٹیالہ کی عنایت سے دست یاب ہوئے ہیں۔ جن کو مدرستہ العلوم کے کتب خانہ میں داخل کردیا ہے۔

---

[1] یعنی مولوی کرامت علی خلف مولوی حیات علی جو دلّی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدرآباد چلے گئے تھے [2] یعنی ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں جنہوں نے پنجاب گورنمنٹ میں نہایت رسوخ پایا تھا [3] یہ حضرت خواجہ میر درد کے سجادہ نشین تھے۔

انھیں میں ایک رسالہ ہے "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار"۔ اس کے دیباچہ[1] میں انھوں نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کی اعلیٰ درجے کی ذہانت اور ریاضی کے ساتھ جو ان کی فطری مناسبت تھی اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

---

[1] سیرتِ فریدیہ جس میں سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید کا حال لکھا ہے؛ اس میں یہ دیباچہ بھی نقل کیا ہے۔ چونکہ اس کا مضمون دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ اُردو زبان میں اس مقام پر لکھ دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کتبِ ریاضی کے کسی حاشیے میں میری نظر سے گزرا تھا کہ "آلاتِ ریاضی میں سے ایک آلہ تھا جس کو پرکارِ متناسبہ کہتے تھے۔ اس سے اکثر اعمالِ نجومی اور بعض اشکالِ ہندسی اور مسائلِ حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے مگر چونکہ اب وہ آلہ مفقود ہے اس لئے علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا۔" اس کے سوا میں نے اپنے بعض اساتذہ سے بھی ایسا ہی سُنا تھا۔ اس آلے کے دیکھنے کا مجھے کمال اشتیاق تھا جس ریاضی دان سے اس کا ذکر کرتا وہ لاعلمی بیان کرتا تھا اور اکثر یہ کہتے تھے کہ اس معمولی پرکار کے سوا جو دائرہ کھینچنے اور خطوں کے ماپنے میں استعمال ہوتا ہے اور کوئی پرکار نہیں ہے۔ جب ۱۲۱۲ھ میں میرا لکھنؤ جانا ہوا وہاں جنرل مارٹین اور مسٹر گور اوسلی سے ملاقات ہوئی، اُن کے پاس میں نے ایک عجیب آلہ پیتل اور لوہے کا بنا ہوا دیکھا۔ میں نے اس کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا یہ پرکارِ تقسیم ہے۔ اس سے خطوط و دوائر و سطوح و اجسامِ مختلفہ کی تقسیم آسانی سے ہو جاتی ہے۔ یہ آلہ جنرل مارٹین کا تھا۔ میں نے ان سے مستعار لے لیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ پرکارِ متناسبہ یہی ہے۔ چونکہ مسٹر گور اوسلی نے اس آلے سے چاروں عمل مذکورہ بالا میرے سامنے کئے تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ دیکھیں اس سے کوئی عملِ نجومی بھی استخراج ہوتا ہے یا نہیں۔ آخر جب اس سے کوئی عمل نہ ہو سکا میں نے سمجھا کہ یہ پرکارِ متناسبہ نہیں ہے۔ مگر چند روز غور کرنے کے بعد میں نے اصول کے موافق اس کے بنانے کا طریقہ ذہن نشین کر کے ویسے ہی ایک پرکار چاندی کا تیار کیا۔ مسٹر گور اوسلی نے اس کو مجھ سے لے کر نواب سعادت علی خاں کی خدمت میں پیش کیا اور نہایت تعجب ظاہر کیا کہ اکثر لوگ اس پرکار کے طرزِ عمل سے بھی واقف نہیں ہیں، چہ جائیکہ ایسا پرکار خود بنا لینا کہ ولایت میں ہر شخص نہیں بنا سکتا۔ سر گور اوسلی نے کہا کہ مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ پرکاروں کے گنج میں ایک آلہ ایسا بھی ہے جس سے یہ پرکار تیار ہوتا ہے مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کس طرح تیار ہوتا ہے۔ تم نے بغیر اس آلہ کے یہ پرکار بنا لیا۔ چونکہ میں نے کبھی گنج پرکار نہ دیکھا تھا میں نے اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سر گور اوسلی نے اپنے بکس میں سے گنج نکال کر وہ آلہ مجھ کو دکھایا اس پر بہت سے خطوط اور ہندسے کندہ تھے۔ میں نے ان کا حال پوچھا۔ انھوں نے دو تین عمل کر کے دکھلائے اور کہا میں اس سے زیادہ نہیں جانتا لیکن میں نے سُنا ہے کہ اس سے بہت سے اعمال ہندسی اور حسابی اور اکثر اعمالِ نجومی ہو سکتے ہیں۔ مگر میں، بلکہ مہندسوں کے سوا کوئی انگریز نہیں جانتا۔ خواجہ فرید لکھتے ہیں کہ وہ گنج چونکہ نہایت عمدہ اور نفیس تھا، گو میرا جی بہت للچایا مگر میں نے اس کو مستعار مانگنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد میں نے کئی پرکارِ تقسیم پیتل کے

(بقیہ صفحہ آئندہ)

خواجہ فرید لکھنؤ کے پہلے سفر میں دو تین برس وہاں رہ کر ریاضی کی تکمیل کے بعد دلّی واپس چلے آئے تھے۔ یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں وہ پھر لکھنؤ گئے۔ ان کے جانے کے بعد اُسی سال آصف الدّولہ نے قضا کی اور سعادت علی خاں اُن کے جانشین ہوئے۔ اسی زمانے میں مدرسۂ کلکتہ کے لئے جس کو انگریزوں نے قائم کیا تھا ایک سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت ہوئی اور لکھنؤ کے یورپین عہدہ داروں کی سفارش سے خواجہ فرید اس عہدے پر بمشاہرہ سات سو روپے (چہرہ شاہی) مقرر ہو کر کلکتے چلے گئے۔

اس کے بعد مارکوئس آف ولزلی کو جو اس زمانے میں گورنر جنرل تھے ایک خاص مقصد کے لئے جس کی تفصیل سیرت فریدیہ میں درج ہے ایران میں سفارت بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ ۱۸۰۱ء میں مسٹر لوٹ کا اور اُن کے ساتھ خواجہ فرید کا بھیجنا تجویز ہوا۔ مگر راہ میں مسٹر لوٹ بیمار ہو کر واپس چلے آئے اور گورنر جنرل کے حکم سے اکیلے خواجہ فرید بطور مستقل سفیر کے بوشہر ہوتے ہوئے طہران میں پہنچے اور فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں حاضر ہوئے اور مقاصد سفارت کو جن میں سب سے زیادہ اہم یہ امر تھا کہ ایران کی طرف سے ہندوستان میں بجائے حاجی خلیل خاں مقتول کے دوسرا سفیر بھیجا جائے بخوبی انجام دیا اور محمد نبی خاں کا ایران کی طرف سے ہندوستان میں بھیجا جانا تجویز ہو گیا۔

اس کے بعد گورنمنٹ انگریزی نے خواجہ فرید کو آوا واقع برما میں ایک پولیٹیکل معاملہ طے کرنے کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تیار کر کے اور انگریزی ہندسوں کی جگہ فارسی ہندسے کندہ کر کے اپنے دوستوں کو دیئے۔ چند روز کے بعد میرا کلکتے جانا ہوا۔ وہاں جا کر میں نے ایک گنج پرکار خریدا جس میں وہ آلہ مطلوبہ بھی تھا۔ میں نے نہایت کوشش اور فکر و غور سے اس کے اعمال دریافت کئے اور عمل استخراج ظل اور اکثر اعمال نجومی اور ہندسی نکالے۔ اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ پرکار متناسبہ جو کبھی عرب و عجم میں مروّج تھا وہ یہی ہے اور اب یورپ کے سوا کہیں اس کا رواج نہیں رہا۔

چونکہ اس تحقیقات اور تفتیش میں مسودے بہت سے جمع ہو گئے، میں نے ان سب کو مرتّب اور صاف کر کے اس رسالے کی صورت میں جمع کر دیا۔"

اس رسالے کا ترجمہ سر سیّد نے اُردو میں کر دیا ہے۔ اور اس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کر دی ہیں۔ یہ ترجمہ بھی اُن کی تصانیف کی فہرست میں شامل ہے۔

بطور ایجنٹ کے مقرر کر کے بھیجا۔ وہاں سے آنے کے بعد جب کہ ملک بندیل کھنڈ فتح ہو چکا تھا پرگنات اگاسی وغیرہ میں جو اب ضلع باندہ میں شامل ہیں، ان کی مالگزاری وصول کرنے کے لئے عہدۂ تحصیلداری پر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں تحصیل داروں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ کُل مال گزاری میں سے کچھ فی صد حق التحصیل ملتا تھا۔ جب یہ انتظام نہ رہا اور زمانۂ حال کے موافق تحصیل دار مقرر ہونے لگے تو وہ اس عہدے سے کنارہ کش ہو کر بارہ تیرہ برس بعد دلّی واپس آئے مگر چند روز رہ کر پھر کلکتے چلے گئے۔

۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو کلکتّے سے بلا کر خلعتِ وزارت اور خطاب دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا۔ انھوں نے ایامِ وزارت میں اس وجہ سے کہ بادشاہ بہت قرض دار ہو گئے تھے قرضہ ادا کرنے اور آمدنی و خرچ برابر کرنے میں بہت کوشش کی۔ شاہزادوں اور بیگمات اور عملۂ شاہی کی تنخواہوں میں سے دس فی صد تنخواہ کم کر دی۔ بڑا خاصہ[1] اور چھوٹا خاصہ جن میں زرِ کثیر صرف ہوتا تھا اور بعضے اور غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کر دئے۔ اس کے سوا دیوانِ عام کی تلنبے کی چھت جو شاہ عالم کے زمانے میں بھاؤ مرہٹہ نے سنہری ملمع کے سبب خالص سونے کی سمجھ کر اکھڑوا ڈالی تھی اور وہ اس وقت سے اکھڑی پڑی تھی اس کا سونا الگ اور تانبا الگ کر کے جتنا تانبا نکلا اُس کے شاہی ٹکسال میں پیسے بنوا ڈالے اور سونا فروخت کر دیا۔ ان تدبیروں سے کئی لاکھ روپے کا قرضہ ادا کیا گیا۔ اب آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا۔ اور سب کی تنخواہیں جو کئی کئی مہینے بعد ملتی تھیں ماہ بہ ماہ ملنے لگیں۔ لیکن قلعے میں اس سے عام ناراضی پھیل گئی اور آخر کار ان کو عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ اور وہ پھر کلکتّے چلے گئے۔

ایک بار پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتے سے بلا کر عہدۂ وزارت پر مامور کیا مگر اس دفعہ بھی چند وجوہات سے تین یا ساڑھے تین برس وزارت کا کام سر انجام دے کر بصلاح جرنیل اخترلونی کے جو دلّی میں ریذیڈنٹ تھے آخر کار استعفا دے دیا۔ دوسری بار وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد

---

1 بڑا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو تمام طازموں، عہدہ داروں، خاصوں اور باری داروں کو بادشاہ کی طرف سے ہر روز دونوں وقت دیا جاتا تھا۔ چھوٹا خاصہ وہ کھانا کہلاتا تھا جو ہر روز تیار ہو کر محل میں بھیجا جاتا تھا اور دربار کی امیر یا حکیم جو اپنی باری یا کسی اور ضرورت سے قلعے میں رہ جاتے تھے ان کو محل سے بھیجا جاتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے معقول سفر خرچ اور اپنا معتمد بھیج کر خواجہ فرید کو لاہور بلایا۔ مگر جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا وہ اپنی بڑی بیٹی یعنی سرسید کی والدہ کے سمجھانے سے لاہور نہیں گئے اور سفر خرچ واپس کر دیا۔ اور پھر اخیر وقت تک باوجودیکہ قلعہ کی طرف سے ایک دفعہ پھر بلاوا ہوا انھوں نے کوئی تعلق اختیار نہیں کیا اور ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات اس جملے سے کہ: "جا بہ بہشت یافتم" بے کم و کاست نکلتی ہے۔

دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد ایک حکیم مشرب یا صوفی منش آدمی تھے۔ ایک زمانے میں وہ بھی اپنے بھائی شاہ فدا حسین کی طرح رسول شاہیوں میں داخل ہو گئے تھے اور منگا شاہ جو رسول شاہ کے ایک ممتاز چیلے تھے ان کے مرید ہو گئے تھے۔ چونکہ اس طریقے میں ضرور نہیں ہے کہ خواہ مخواہ چار ابرو کا صفایا کریں بلکہ دنیادار اور متاہل لوگ بھی اس طریقے میں داخل ہوتے ہیں اس لئے دبیر الدولہ نے مرنے سے دو برس پہلے تک کبھی داڑھی مونچھ نہیں منڈوائی۔ مگر مرنے سے دو برس پہلے ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیروی کرنی ہی چاہیے۔ آخر ایک دن چار ابرو کا صفایا کرا دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور لوگوں نے بہت کچھ طعن و تعریض کی، مگر انھوں نے اس کی کچھ پروانہ کی لیکن ایک دفعہ کے سوا پھر کبھی ایسا نہیں کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ جب انتقال ہوا تو ان کی داڑھی کسی قدر بڑھی ہوئی تھی۔

دبیر الدولہ کے دو بیٹے تھے جو سرسید کے ماموں ہوتے تھے۔ بڑے وحید الدین خاں جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ یہ بعد فتح دہلی کے فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے نماز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے نواب زین العابدین خاں جن کو ان کے والد کی وفات کے بعد دبیر الدولہ کا خطاب بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجے کی دستگاہ تھی۔ یہ تمام آلاتِ رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ انھوں نے ایک بہت بڑے قطر کا برنجی کرہ اور برنجی اصطرلاب نہایت عمدہ بنایا تھا نیز بہت سے آلات جن کی تفصیل سیرتِ فریدیہ میں مندرج ہے ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے موجود تھے۔ ان میں ایجاد و اختراع کا بڑا ملکہ تھا۔ انھوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کئے تھے۔ اور اس باب میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ جو غدر میں ضائع ہو گیا۔

سرسید کی والدہ کا حال جو سیرتِ فریدیہ میں لکھا ہے یا ہم نے دلی میں سرسید کے رشتہ داروں سے یا خود سرسید سے سنا ہے، چونکہ اس کو سرسید کی تربیت اور ان کے اخلاق و عادات بلکہ ان کے

تمام واقعات زندگی میں بہت بڑا دخل ہے اس لئے ہم اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سرسید کے والد میر متقی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ایک نہایت آزاد منش آدمی تھے خصوصاً جب سے شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہو گئے تھے اُن کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ سرسید سے ایک دفعہ اُن کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو اُنھوں نے جواب دیا کہ میری تمام سرگزشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم

سرسیدؔ کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں، اُن میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ مگر اولاد کی تربیت کا اُن میں خداداد ملکہ تھا۔ سرسیدؔ کہتے تھے "جب میں ان کو سبق سنا آیا ہوں سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں بندھی رکھی تھیں اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر ان سوت کی لڑوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔"

سرسید لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور بڈھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو بھی خبر ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی۔ انھوں نے کہا "دیکھو آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں، میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف فرمائیں۔ انھوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کروں گی۔ جب میں نے ڈیوڑھی میں جا کر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور

معاف ہوا۔"

سرسید کی والدہ کی دانش مندی اور دور اندیشی ذیل کی حکایت سے بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ سرسید کہتے تھے کہ "جب دبیرالدولہ نے وزارت سے دوسری بار استعفا دے دیا تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور ایک معقول رقم سفر خرچ کے لئے ان کے پاس بھیجی اور لاہور بلایا۔ سارا کنبہ چاہتا تھا کہ وہ منظور کرلیں مگر ان کی بڑی بیٹی یعنی میری والدہ نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام سے بسر کریں اور اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی آپ کے آرام و آسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عمل داری میں جانا اور اس سلطنت کے اختیارات لینے اور ہم سب کا انگریزی عمل داری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس ضعیفی کے زمانے میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے آپ لاہور کا ارادہ کریں۔" دبیرالدولہ کے دل پر اُن کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفر خرچ واپس کر دیا۔ اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

سرسید کا بیان ہے کہ "میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینے تک یہی حال رہا۔ جب اُن کا انتقال ہو گیا سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ انھوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلے ہی پر بیٹھی رہیں۔ انھیں دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام سامان شادی کا ہو چکا تھا صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہے تھے جب یہ حادثہ ہم پر گزرا تو ان لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرانا چاہی۔ میری والدہ نے جب یہ سنا تو اس واقعے کے تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور کہا میں شادی میں آئی ہوں، ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور شادی ملتوی کرنے سے تمھارا بڑا نقصان ہوگا جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو جب کہ میں خود تمھارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

سرسید کہتے تھے: "جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فی صد کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی جاتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسنِ انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں۔

کئی جوان لڑکیوں کا اُن کی امداد سے نکاح ہوا۔ اکثر پردہ نشین عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں ان کی پوشیدہ خبر گیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں ان کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح کو برا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں۔ غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلے سے اُن کی امداد کرتیں۔ بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کر لیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہ ان کے گھر برابر جاتیں اور ان کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔

سرسید کہتے تھے کہ میری تمام ننھیال کو شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی۔ شاہ صاحب کے ہاں منت اور نذر و نیاز کا کہیں پتا نہ تھا۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لے جاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے۔ یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ انھوں نے خود کوئی منت یا نذر و نیاز کبھی نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر اُن کو مطلق اعتقاد نہ تھا لیکن اگر کوئی کرتا تو اس کو منع بھی نہ کرتیں۔ اور یہ کہتیں کہ اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کو یقین ہو جائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا۔ سرسید کا بیان ہے کہ میری ننھیال والے اگرچہ عام توہمات میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبدالعزیزؒ کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اُس پر سب اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ اور اُن کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندسہ یا حرف سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا۔ اور جس بچے کو دیا جاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈے پہنائے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتے، اور کھانے میں انڈا یا مرغی ہوتی تو وہ بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

سرسید کہتے تھے کہ "اس زمانے میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا۔ البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے مگر میں ان دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی تو نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت مالی بھی اس کے کہ متوفی اپنی زندگی

میں کچھ مال کسی کارِ خیر کے لئے کسی کے سپرد کر جائیے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں۔"

سرسید کا بیان ہے کہ "جب میں دلی میں منصف تھا تو میری والدہ کی نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضرور ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جایا کرتا تھا۔"

سرسید کی والدہ جیسی سمجھ دار اور دانش مند تھیں اس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ سرسید کا بیان ہے کہ مسماۃ زبین ایک لاوارث بڑھیا تھی۔ میری والدہ اس کی خبر گیری کرتیں۔ جب میں دلی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زبین دونوں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک سی تھی۔ حکیم نے والدہ کے لئے کسی قدر افاقے کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا تجویز کیا مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اس معجون کو تیار کرا کے والدہ کے پاس لے گیا اور اُن سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ اُنھوں نے لے لی مگر اس خیال سے کہ یہ زبین کو بھی مفید ہو گی لیکن اس کو کون بنوا کے دے گا، انھوں نے خود اس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زبین کو کھلاتی رہیں۔ زبین کو اس سے بہت فائدہ ہوا مگر والدہ بھی بغیر اس معجون کے استعمال کے اچھی ہو گئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ دیا۔ وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا۔ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زبین ہی نے کھائی مگر خدا نے دونوں کو صحت عطا کی۔"

سرسید کہتے تھے کہ "میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف خاں میں بہت دوستی تھی۔ ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی حکیم صاحب کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ مگر بھائی کے انتقال کے بعد ایک دفعہ حکیم صاحب کچھ مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا۔ مگر میں بدستور اُن کے ہاں جاتا رہا۔ اور مدت تک میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن آخر کو میں نے بھی ان کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ جب والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا، اور مجھ سے کہا کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات آپ کرتے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتے تو نہ ملیں مگر تم بدستور ملتے رہو۔"

سرسید نے اس کا ہم سے ذکر کیا کہ "جب میں صدر امین تھا تو اس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک

کیا تھا اور ایک سخت مواخذے سے اس کو بچایا تھا مگر ایک مدت کے بعد اس نے درپردہ میرے ساتھ بُرائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اس کو کافی سزا مل سکتی تھی میرے ہاتھ آگئی اور اتفاق سے اس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُس کے پھانسنے کی فکر میں تھا میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو، اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دُنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے۔" اُن کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور امید ہے کہ کبھی نہ آئے گا۔ بلکہ انہی کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اس سے میرا بدلا لے۔"

سرسید کی بہن صفیۃ النسا بیگم تھی جن کا انتقال دسمبر ۱۸۹۲ء میں جب کہ سرسید محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے دلی میں موجود تھے کچھ کم نوّے برس کی عمر میں ہوا عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور اُن کے گھر میں کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور ان سے پڑھتی تھیں۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی مگر وضع اس کے خلاف تھی۔ اکثر ان کے والد کے ملنے والے ان سے کہتے کہ بیٹے کو سمجھاؤ اپنی وضع درست کرے اور داڑھی نہ منڈایا کرے۔ وہ یہ جواب دیتے کہ عمر کا تقاضا ہے جو اس کا دل چاہے کر لینے دو کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائے گا۔ آخر ایک مدت کے بعد ان کا طریقہ خود بخود بدل گیا۔ داڑھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے۔ یہاں تک کہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی ترک نہ ہوتی تھی اور قرآن مجید کی تلاوت بہت کرنے لگے۔

وہ ہنگام ضلع فتحپور میں منصف تھے۔ ۱۸۴۵ء میں سرسید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے اور سید محمد خاں ہنگام سے دسہرہ کی تعطیل میں دلی آئے وہاں اس وقت بخار کی فصل تھی سید محمد خاں کو بخار آنے لگا تعطیل کے بعد جب سرسید جانے لگے تو رخصت کے وقت اُن کے بھائی نے ایسے

کلمات کہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں ہے۔ اس کے بعد فی الواقع اُن کا مرض بڑھنے لگا۔ وہ اُسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے اور وہاں اپنی قبر کے لئے خود جگہ تجویز کی۔ ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہے تم کیوں اس خیال میں پڑتے ہو مگر ان کو مرنے کا یقین ہو گیا تھا جب قبر تیار ہو گئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے اور قبر میں اتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا۔ وہاں سے آکر دوسرے دن کفن کے لئے کپڑا منگوایا اور اس کو سلوا کر پہنا اور بہت پسند کیا۔ اب مرض اور بھی زیادہ ہو گیا۔ ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کو جو اُس وقت خانقاہ میں سجادہ نشین تھے بلوایا اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔ مفتی صدر الدین خاں نے جو سرسید کو ان کی تعزیت کا خط بھیجا تھا اس میں یہ شعر درج تھا ؎

"قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند"

سرسید کے خاندان کا حال جس قدر کہ ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اس کو قدرے ضرورت سے زیادہ خیال کریں لیکن بائیوگرافی کا اصل مقصد جو ہیرو کے اخلاق و عادات و خیالات کا دُنیا پر روشن کرنا ہے وہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ ہیرو میں یہ اخلاق و عادات اور خیالات کہاں سے آئے اور اُن کی بنیاد اس میں کیونکر پڑی؟ انسان میں کچھ خصلتیں جبلّی ہوتی ہیں جو آباؤ اجداد سے بطور میراث کے اُس کو پہنچتی ہیں اور زیادہ تر وہ اخلاق و عادات ہوتے ہیں جو بچپن میں نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان کی سوسائٹی سے اکتساب کرتا ہے اور جو رفتہ رفتہ اس درجے تک پہنچ جاتے ہیں جن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے لیکن آدمی اپنی جبلّت سے نہیں ٹل سکتا۔ پس ہیرو کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا اور اس سوسائٹی کا حال جس میں اُس نے نشوونما پائی درحقیقت ہیرو کے اخلاق و عادات پر ایک ایسی روشنی ڈالتا ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سرسید کا بچپن

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی بہن صفیۃ النسا بیگم اور ان کے بھائی سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک اُن کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔ سرسید

سے چند مہینے پہلے اُن کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا۔ سرسید کو اوّل حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسید کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندرست پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے تھے کہ جب ان کے نانا دوسری بار کلکتہ سے دلی میں آئے اور ان کو پہلی ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔"

سرسید کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ ان کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے ان کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جاسکے نہیں پائی جاتی تھی یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طبّاع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں سرسید میں کوئی اس قسم کا صریحی امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے اُن کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمک دار معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جس قدر آگے بڑھتے جائیے اُسی قدر اس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اسی لئے بعض حکما کی یہ رائے ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو کر سکتا ہے۔

الغرض جب سرسید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی، شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمدؐ رکھا تھا اور ان کا نام احمد رکھا۔ سرسید کے دادا ان کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کر چکے تھے اور یہ اور ان کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "شاہ صاحب کو بھی ہم سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہّل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متّقی کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔

سرسید کو مسماۃ ماں بی بی نے جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ ان کے گھرانے کی تھی پالا تھا اس لئے ان کو ماں بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب ماں بی بی کا انتقال ہوا۔ اُن کا بیان ہے کہ مجھے خوب یاد ہے کہ ماں بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسے کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ

مرگئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے، بہت اچھے مکان میں رہتی ہے، بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گزرتی ہے، تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو اُن کے کہنے کا پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے ـــــــ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا مان بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے انھوں نے پوچھا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا مان بی بی کے پاس بھیج دوں؟ میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔"

بچپن میں نہ تو سر سید پر ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ اُن کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود اُن کے ماموں، ان کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لئے کافی تھے۔ اس لئے اُن کو نوکروں اور اجلافوں کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جلنے اور اُن کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اُن کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لئے سب لڑکے جو کھیل کھیلتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ ان کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کرسکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی جس میں وہ اور ان کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اس کا چوک اور اُس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کے لئے کافی تھیں۔ ابتدا میں وہ اکثر گیند بلا، کبڈی، گیڑیاں، آنکھ مچولی، چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیڑیاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے مگر ان کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

سر سید کہتے تھے کہ "کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے چینید معلوم ہوتی اس کو برا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا۔ چینید کرنا بے ایمانی کی بات ہے۔ کبھی چینید مت کرو اور جو چینید کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔"

اُن کا بیان تھا "باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جُدا حویلی بنائی اور وہاں آرہیں تو باوجودیکہ اِس حویلی میں اور ناناصاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی، جب کبھی میں اُن کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اِسی لئے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔"

سرسید اپنے کھیل کُود کے زمانے میں بہت مستعد، چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جو اِستنجا کر رہا تھا چپکے چپکے اس کے پیچھے جا کر چت کر دیا اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لے کر مجھے مارنے کو دوڑا۔ کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرادی۔ اسی طرح میں ایک بار شطرنج کھیلتے میں اپنے ایک رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا۔ میرے مکے سے اس کی ہاتھ کی انگلی اُتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یونہی لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔

سرسید لکھتے ہیں کہ میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے۔ ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں، ناناصاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے۔ ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانے میں کھاتے تھے، زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور میری چھوٹی خالہ کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے پاؤں کا دھبا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبا کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا اس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا اُن کو سبق سُنانے جاتے تھے۔

جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھرک دیتے۔

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پر جاکر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا مغل اور مرزا طغل بہت نامی اور سربرآوردہ تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا مغرب کے وقت سب تیراک زینت المساجد میں جمع ہو جاتے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔

تیر اندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے اپنے والد اور ماموں کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیر اندازی ہوتی تھی، یاد نہیں مگر جب دوبارہ تیر اندازی کا چرچا ہوا تو وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہوگیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیر اندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانے میں تیر اندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہوگئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جاکر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا: "مچھلی کے جائے کو کون پیرنا سکھائے"۔ یہ جلسہ برسوں تک رہا اور پھر موقوف ہوگیا۔

اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسید کے دل میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ اپنے

والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے۔ اور شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ: "مرزا صاحب کے عُرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ اُن کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپے کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مُرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہوگئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت! میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں؟" شاہ صاحب نے فرمایا "نہیں نہیں تمھارے سوا کوئی نہیں لے سکتا" میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ روپیہ اٹھالاؤ، میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھالیا۔

دلی سے سات کوس کے فاصلے پر مغلپور ایک جاٹوں کا گاؤں ہے۔ وہاں سرسید کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر ان کے والد مغلپور جاتے تو ان کو اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور ایک ایک ہفتہ گاؤں میں رہتے۔ سرسید کہتے تھے کہ اس عمر میں گاؤں میں جاکر رہنا جنگل میں پھرنا، عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جاٹنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزا دیتا تھا۔

سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال تاریخِ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔ مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجودیکہ اُن کی عمر کم تھی دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر قلعے چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اُٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا، مگر پھر بھی دیر ہوگئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدے کے موافق اوّل دربار میں جاکر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اُٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے پوچھا کہ

"تمھارا بیٹا ہے ؟" انھوں نے کہا: "حضور کا خانہ زاد"۔ بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے۔ مگر جب تسبیح خانے میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ تسبیح خانے میں بھی ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اس چبوترے پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتیٔ جواہر لانے کا حکم دیا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا۔ اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ لوگوں نے کہا آداب بجا لاؤ۔ میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں، میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاص ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ سرسید کہتے تھے کہ اس زمانے میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہو گی۔ تقریباً انہی دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمو سماج کے بانی تھے ان کو اکبر شاہ نے کلکتے سے بلایا تھا تاکہ اضافۂ پنشن بادشاہی کے لئے اُن کو لندن بھیجا جائے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے۔ سرسید نے لندن جانے سے پہلے اُن کو متعدد دفعہ دربارِ شاہی میں دیکھا تھا۔

سرسید کی تعلیم سرسید کہتے تھے کہ مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے۔ اور بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول کی آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔ سرسید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لئے انھوں نے کبھی کہا تھا پڑھا:

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرارِ یزدانی ز فیضِ نقشبندِ وقت جانِ جانِ جانانی

سرسید کہتے تھے کہ شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے، الاماشاء اللہ صرف میرے والد پر جو عنایت درجے کی شفقت تھی اس لئے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔

بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔ سرسید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔ قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے جنھوں نے اُن کے ماموؤں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری، آمدنامہ وغیرہ پڑھیں۔ جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہوگیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔ انھوں نے فارسی میں گلستاں بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی، اور مطول ما انا قلت تک پڑھی۔ مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔ اس کے بعد ان کو اپنا خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں ان کی ننھیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں، تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیئات میں شرح چغمنی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی۔ کیونکہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہوگیا تھا۔ چنانچہ آلات رصد برجندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ اعمال اصطرلاب، رسالہ صنعت اصطرلاب، ربع مجیب، ربع مقنطر، ہلزون، جریب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔ اسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے طب کی ابتدائی کتابیں مثلاً قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی، امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک اُن کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر

اٹھارہ اُنیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطورِ خود کتابوں کے مطالعے کا برابر شوق رہا اور دلّی میں جو اہلِ علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ اُن سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۶ء میں جب کہ وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلّی کی منصفی پر آئے اُس وقت جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا انھوں نے تحصیلِ علم میں ترقی کی۔

عنفوانِ شباب

سرسید کا عنفوانِ شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلّی میں بسنت کے میلے جو موسمِ بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے۔ خود اُن کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر جو نسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلا ہوتا تھا اُس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔

اس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلّی میں تھے۔ ان کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائفیں زرد لباس پہن کر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اس حوض میں زرد پانی ہی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اس میں جھڑاں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے۔ اور طوائفیں باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں۔ سرسید کہتے تھے کہ میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اس جلسے میں شریک ہوتا تھا۔

خود سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر بڑے بڑے نامی گوّیے دھرپت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔ میر ناصر احمد جو دلّی میں مشہور بین بجانے والے تھے وہ آتے تھے گانا ہوتا تھا اور بین بجتی تھی۔ اسی طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اس میں بھی بڑے بڑے نامی گوّیے آتے تھے۔ دھرپت اور خیال گاتے تھے اور میر ناصر احمد جو اسی خاندان میں بیعت تھے بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں سرسید اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت وضعدار تھے۔ جتا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز دھرپت اور خیال گانے اور بین بجانے میں مشہور تھی وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس جن سے ان کی دوستی تھی بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویے بہادر خاں ستارن اور میر ناصر احمد خاں سب جمع ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میرے ماموں نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسے میں جاتے تھے۔ میں بھی بارہا اُن کے ہمراہ گیا ہوں"۔

جب وہ نوکر ہو کر آگرہ گئے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے کہ صدر دیوانی عدالت آگرہ میں موجود ہے اور وہاں منشی امیر علی خاں، مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی، مولوی محمد شفیع اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی وکیلوں اور عہدہ داروں کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل، مرنج و مرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ مستی اور خوشی میں گزارنے والے تھے۔ تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نور افشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کرتے تھے۔ سرسید نے بھی ان جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں اور ان میں شریک ہوئے تھے۔

سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی ان کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی۔ مگر سنا ہے کہ اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش بسیار تلخ است"۔ سرسید نے یہ مصرع پڑھا۔ "گرچہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد"۔

سرسید کا مذکورۂ بالا جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اگرچہ اُس وقت تک دلی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیاں باقی تھیں لیکن چونکہ ان کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لئے ان کی سوسائٹی میں ان خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادبار کا پیش خیمہ سمجھنا چاہئے۔ طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں۔ بے فکر امیر زادے عیاشی اور لہو و لعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے

تھے اور خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ سرسید سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے، پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تئیں نہ بچا سکے لیکن جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے باوجود غایت دل بستگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی، سرسید نے جس حیرت انگیز طریقے سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ گویا یہ شعر اس وقت اُن کے حسبِ حال تھا:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

مولانا جلال الدین رُومی کے سامنے ایک زاہد کی اس طرح تعریف کی گئی کہ اس نے تمام عمر میں کسی بُرے کام کا ارتکاب نہیں کیا۔ مولانا نے یہ سُن کر فرمایا "کاش کردے وگذشتے"، یعنی بہ نسبت اس کے کہ آدمی عمر بھر کوئی بُرا کام نہ کرے اور ایک حالت پر ٹھیرا رہے۔ یہ بہت بہتر ہے کہ وہ بُرے کام کا ارتکاب کر کے حالتِ موجودہ سے ترقی کر جائے۔ مولانا کا یہ ارشاد جیسا سرسید کے حال پر منطبق ہوتا ہے اس سے بہتر شاید ہی اس کا کوئی مصداق ہو سکے۔

منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلیٔ حالت کے باعث ہوئے سب سے بڑا سبب سرسید کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اس کی نظیر دی جاتی تھی۔ سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو اگر سید وہاں نہ ہو تو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے۔ ایسا ہی حال سرسید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اُچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا۔ سر گُھٹوا لیا، داڑھی چھوڑ دی، پائنچے متشرع کر لئے، کُرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقیٔ انسانی کا سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لئے اس مرحلے کا طے کرنا نہایت ضرور ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

حُور و جنت جلوہ بر زاہد کند در راہِ دوست
اَندک اَندک عشق در کار آورد بیگانہ را

سرسید نے بھی اپنی ایک تحریر میں نوجوانی کی اس لغزش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ قوم کی غفلت و بدمستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے جب زاہدِ خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جو صوفی تھے تو رُومی سے برتر تھے، اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خوار!"

مگر سرسید کے بعض نہایت ثقہ رشتہ داروں سے سُنا گیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانے میں کیا اس سے معدودے چند کے سوا کوئی متنفس واقف نہیں ہوا۔ وہ خود اسی معاملے کے متعلق اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں: "وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا، اس زمانے کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اُس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر برملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اس زمانے کے اشراف نوجوانوں کا عملدرآمد اِس مقولے پر تھا کہ "اپنے جسم کے زخم کو ڈھانپے رکھو تاکہ لوگ اُسے دیکھ کر نفرت نہ کریں" یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گو انسان سے کوئی بُرائی ہو مگر اس برائی کا بُرا ہونا دل سے نہیں جاتا اور انسان کے لئے یہی رستہ بُرائی سے نکلنے کا ہے۔

دوسرا باب

سنہ ۱۸۳۸ء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک

ملازمت، تالیفِ رسائلِ مذہبی تاریخی و علمی، خطاب بادشاہی، ترتیب آثار الصنادید
ترتیب تاریخ ضلع بجنور۔ تصحیح و تکمیلِ آئینِ اکبری

ملازمت

سنہ ۱۸۳۸ء میں جب کہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا اُن کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی۔ قلعہ سے اُن کے والد کو کئی جگہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ ان کے والد اور راجہ سوہن لال میں اَن بَن تھی اور ان کی زندگی ہی میں اُن کی تنخواہ میں کاٹ پھانس ہونے لگی تھی، اب انتقال کے بعد قلعہ کی آمدنی میں سے صرف کچھ قدرے قلیل تو سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہوگئیں۔ اور چند ملکیں جو معافی کی تھیں وہ بھی بہ سبب عینِ حیات ہونے کے ضبط ہوگئیں۔ اس لئے سرسید کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ہرچند ان کے رشتہ دار قلعہ سے قطعِ تعلق کرنے پر راضی نہ تھے مگر انھوں نے قلعہ کا سہارا ایک قلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی کی نوکری اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں سے اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کارروائی سے اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ اُن کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت دلّی میں صدر امین تھے۔ اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں اُن کو کام سیکھنے کی اجازت دیں۔ اُنھوں نے خوشی سے اجازت دے دی اور سرسید نے وہاں کام سیکھنا شروع کردیا۔ چند مہینے ان کو کام سیکھتے گزرے تھے کہ مولوی خلیل اللہ نے ان کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلے کے لئے صدر امینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کردیا۔

سرسید کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گزرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو کہ آخر کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلّی میں جج ہو کر آئے۔ سرسید کو وہ پہلے سے جانتے تھے اس لئے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی۔ اُنھوں نے اِن کو عدالت سیشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا۔ لیکن انھوں نے

اس کام کو مشکل جان کر انکار کیا۔ ہر چند صاحب جج نے بہت اصرار اور دل دہی کی کہ کچھ تردّد کی بات نہیں ہے ہم تم سے بہ سہولت کام لیں گے اور ہر ایک بات بتاتے رہیں گے، مگر سرسیّد نے کہا کہ جس بات کی میں اپنے میں قابلیت نہیں پاتا اس کو کیونکر قبول کرسکتا ہوں۔ غرضیکہ بدستور صدر امینی میں کام کرتے رہے۔ اتفاق سے انہیں دنوں میں مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور چلتے وقت سرسید کو ایک چھٹی کے ذریعے سے اپنے جانشین مسٹر لینیڈزی کے سپرد کر گئے۔ لیکن ابھی مسٹر لینیڈزی سرسیّد کو کوئی عہدہ دینے نہیں پائے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے ان کو آگرہ میں بلا لیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اس پر مقرر کر دیا۔

یہاں سرسیّد نے بہت جلد قوانینِ مال سے واقفیت حاصل کر لی۔ اس وقت کمشنری آگرہ کے ماتحت چند ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا اور بندوبست ہی کے متعلق بہت سا کام کمشنری میں تھا۔ سرسید نے ترتیبِ دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔

انہیں دنوں میں اُنھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی تھی جس کا نام "جامِ جم" رکھا تھا اور جون ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں امیر تیمور صاحبقراں سے ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے تینتالیس بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا ہے۔

اسی زمانے میں اُنھوں نے قوانینِ دیوانی متعلقۂ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدۂ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو۔ جب وہ خلاصہ تیار ہو چکا تو صاحب کمشنر نے اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسیّد کے لئے عہدۂ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اس پر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی ہو سیّد احمد خاں کو اس پر مقرر کیا جائے۔ لیکن ابھی یہ عہدہ ان کو ملنے نہ پایا تھا کہ عہدۂ منصفی کے لئے قواعدِ امتحان جاری ہو گئے۔ صاحب کمشنر نے ان کو امتحان دینے کی ہدایت کی۔ اُنھوں نے خود بھی امتحان دینے کی تیاری کی اور اپنے بڑے بھائی سیّد محمد خاں اور ماموں زاد بھائی حاتم علی خاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا۔ سیّد محمد خاں نے پہلی دفعہ قانون کی طرف بہت کم توجہ کی تھی اس لئے وہ دوسرے سال امتحان میں پاس ہوئے۔ مگر سرسیّد اور حاتم علی خاں

نے پہلی ہی بار امتحان دے کر ڈپلوما حاصل کر لیا۔

امتحان کے بعد سرسید نے وہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بھائی کا نام بھی اس میں شامل کر کے اُس کا نام "انتخاب الاخوین" رکھا جس کو اس زمانے کے بعض ظریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے دم الاخوین کہتے تھے۔ خان بہادر منشی غلام نبی خاں اور میرے بھائی مرحوم کہتے تھے کہ یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لئے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبے میں شائع ہو گیا۔ لوگوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے اُمیدوار اِسی کی بدولت منصف ہو گئے۔ ۱۸۸۴ء میں انجمنِ اسلامیہ لاہور نے جو سرسید کو اڈریس دی تھی اُس میں بھی سرسید کے اس احسان کا ذکر کیا تھا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور ۲۴۔ دسمبر کو وہ مین پوری کے منصف مقرر ہو گئے مگر ۱۔ جنوری ۱۸۴۲ء کو وہاں سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری آ گئے۔ یہ آگرہ کے قریب ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے۔ جلال الدین اکبر کے مُرشد شاہ سلیم چشتی اسی شہر میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے مدت تک یہ شہر اکبر کا دار السلطنت رہا ہے اور یہاں کی قدیم شاہی عمارتیں اب تک اس زمانہ کی یادگار ہیں۔ سرسید اس شہر میں چار برس تک منصف رہے۔ فتحپور میں جہاں اکبر کی خواب گاہ تھی حُسنِ اتفاق سے وہی عالی شان مکان سرسید کو رہنے کے لئے ملا تھا۔ یہ چاروں برس اِسی مکان میں گزرے۔

رسائلِ مذہبی وغیرہ

اس زمانے میں سرسید نے تین رسالے تالیف یا طبع کرائے ہیں:
(۱) جلاء القلوب بذکر المحبوب مؤلفہ ۱۲۵۵ھ۔ یہ مختصر رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں اس لئے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے شائع تھے ان میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں۔ سرسید نے اس رسالے میں اس زمانے کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں پر اکتفا کیا تھا۔ (۲) "تحفہ حسن"[1] مؤلفہ ۱۲۶۰ھ یہ ترجمہ ہے "تحفۂ اثنا عشریہ" کے بابِ دہم اور بابِ دوازدہم کا۔ باب دہم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبر پر کرتے ہیں اور بابِ دوازدہم میں تولّا اور تبرّا کا بیان ہے (۳) تسہیل فی جر الثقیل

---

[1] اس ترجمے کے سوا کبھی سرسید نے کوئی کتاب یا رسالہ یا آرٹیکل ایسا نہیں لکھا جس سے شیعوں پر اعتراض کرنا یا اُن کے اعتراض کا جواب دینا مقصود ہو۔

مطبوعہ ۱۸۴۴ء یہ اُردو ترجمہ ہے بوعلی نام ایک عالم کے ترجمۂ فارسی موسوم بہ معیار العقول کا جو ابو ذرمینی کے عربی رسالے سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس رسالے میں مصنف نے جرِ ثقیل کے پانچ اصول بیان کئے ہیں یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے اور جن چیزوں کا دبانا یا پکڑنا دشوار ہو اُن کے دبانے یا پکڑنے کے لئے پانچ کلیں بتائی ہیں اور ان کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

خطابِ بادشاہی

اسی زمانے میں بہادر شاہ نے سرسید کو اُن کا موروثی خطاب عنایت کیا۔ ۱۸۴۲ء میں جب وہ مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور میں آئے تو چند روز کے لئے بتقریبِ رخصت یا لتعطیل دلی آئے تھے۔ اس زمانے میں حکیم احسن اللہ خاں بادشاہ کے ہاں نیابت کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے سرسید کی تقریب کی کہ اُن کے دادا کا خطاب اُن کو ملنا چاہئے بادشاہ نے منظور کر لیا۔ اگرچہ سرسید کے دادا کا خطاب صرف جوّاد الدولہ تھا اور یہی خطاب لکھ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا مگر بادشاہ نے اس میں عارف جنگ کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے جوّاد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا خطاب سرسید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسبِ قاعدہ ادا کی گئیں۔

۱۸۔ فروری ۱۸۴۶ء کو سرسید فتحپور سیکری سے دلی تبدیل ہو گئے۔ انھیں دنوں میں اُن کے بڑے بھائی کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا اور ان کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت گزرا تھا اس لئے انھوں نے خود درخواست کر کے اپنی بدلی کرائی تھی۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک جب تک کہ وہ مستقل صدر امین مقرر نہیں ہوئے دلی ہی میں رہے۔ اس عرصے میں صرف دو دفعہ یعنی ایک بار ۱۸۵۰ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدرِ امین مقرر ہو کر رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔

جس وقت وہ فتحپور سے بدل کر دلی میں آئے تھے اُس وقت اُن کی عمر انتیس برس کی تھی۔ یہاں آ کر اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیاً ہو گئی تھیں اُن کو از سرِ نو غور اور توجہ سے پڑھئے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے اُن سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا۔ اور کچھ فقہ میں مثل قدوری و شرحِ وقایہ اور اصولِ فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور

کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقاماتِ حریری سے چند مقالے اور سبعۂ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے، حدیث پڑھنی شروع کی مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے استاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔

آثار الصنادید

اسی زمانہ میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے اُن کو عمارات، شہر اور نواحِ شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ میں اپنی کُل تنخواہ والدہ کو دیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لئے مجھ کو دے دیتی تھیں باقی میرے تمام اخراجات اُن کے ذمے تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھیں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلاتی تھیں کھا لیتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اُن کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی ہوتی تھی۔ اُن کے بڑے بھائی کا انتقال ہوچکا تھا جس سے سو روپے ماہوار کی آمدنی کم ہوگئی تھی۔ قلعہ کی تنخواہیں تقریباً بالکل بند ہوگئی تھیں۔ باپ کی ملک بھی بہ سبب حینِ حیات ہونے کے ضبط ہوگئی تھی۔ کرایہ کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ صرف سرسید کی تنخواہ کے سو روپے ماہوار تھے اور سارے کُنبے کا خرچ تھا۔ سرسید ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے۔ لہٰذا اُن کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو اُن کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر زیادہ تر سرسید خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری رہ کر بند ہوگیا۔ مگر عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور عجلت کے ساتھ برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عماراتِ بیرونِ شہر کی تحقیقات کے لئے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر

ہوگئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہوسکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہوگئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے اُن سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت بنائی کیوں گئی تھی؟ اور اس سے کیا مقصود تھا۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لئے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض قدیم عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہوگئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طُول و ارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورتِ حال قلم بند کرنی، کتبوں کے چربے اُتارنے اور ہر ایک کتبے کو بعینہٖ اس کے اصلی خط میں دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصوّر سے کھنچوانا اور اس طرح کچھ اُوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ قطب صاحب کی لاٹ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاسکتے تھے، اُن کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلّیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے متوازی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربہ اُتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے اُن کا رنگ متغیر ہوجاتا تھا۔ سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی۔

وَیَصْعَدُ حَتّیٰ یَظُنَّ الْوَرَیٰ
بِاَنَّ لَہٗ حَاجَۃً فِی السَّمَآءِ

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان پر کچھ کام ہے)

باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپ کر تیار ہوگیا۔ اس اڈیشن میں چار باب تھے۔ پہلا باب عماراتِ بیرونِ شہر کے بیان میں، دوسرا باب لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے بیان میں۔ تیسرا باب خاص شہر شاہجہان آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں، چوتھا باب دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں جو سرسید سے کچھ پہلے یا اُن کے زمانے میں

موجود تھے۔ پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ اور نقشہ اس کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان اور اُن کے نقشے اور کتبے درج ہیں۔ تیسرے باب میں تقریباً ستر حویلیوں مندروں، مسجدوں، بازاروں، باولیوں اور کنوؤں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں اوّل کسی قدر اُن شہروں، قلعوں اور محلّوں وغیرہ کا بیان ہے جو سمت ۱۲۰۰ بکرمی سے لے کر آج تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا اور زبانِ اردو کا ذکر ہے۔ پھر مشاہیرِ دہلی کا حال لکھا ہے جس میں ۱۲۰ مشائخ علماء، فقراء، مجاذیب، اطباء، قراء، شعراء، خوش نویس، مصوّر، موسیقی داں وغیرہ کا بیان ہے۔ اگرچہ اس اڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفاتِ باردہ کے سبب آج کل کے مذاق کے مطابق بہت پھیکی اور بے مزا ہو گئی تھی، اور اس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسریں اور فروگزاشتیں رہ گئی تھیں مگر مضمون کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔ اوّل کے تین باب دیکھ کر سرزمینِ دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کو دُنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے اور پچھلے باب سے دِلّی کا اخیر جھمکڑا آنکھوں کے روبرو آجاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ جس شہر میں پچاس ساٹھ برس پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ، اہلِ علم اور اہلِ ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

الغرض یہ ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اسی زمانے میں مسٹر ابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہان آباد ولایت جاتے تھے، وہ ایک نسخہ آثار الصنادید کا ساتھ لے گئے اور وہاں جا کر اس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبرانِ سوسائٹی نے اس کو بہت پسند کیا اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کے بعض ممبروں نے رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ جب مسٹر رابرٹس ولایت سے واپس آئے تو انھوں نے سرسید کی شرکت سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا۔ اُس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو کسریں پہلے اڈیشن میں رہ گئی ہیں اُن کی درستی اور اصلاح کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے کتاب پر نظرِ ثانی کر کے اس کو از سرِ نو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اضافہ یا اصلاح انھوں نے پہلے اڈیشن میں کیا ہے اس کا مفصل ذکر طبعِ ثانی کے دیباچے میں مندرج ہے۔ بڑی خوبی اس نئے اڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے اڈیشن کے نہایت

سادگی ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفاتِ بارِدہ سے بالکل پاک ہے! اس اڈیشن کے لئے سرسید نے نقشے بھی از سرِ نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے۔ مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہو گیا اور وہ سب نقشے تلف ہو گئے۔ کچھ نقشے جو باب ملے ہیں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ البتہ چوتھا باب جس میں دلی کے مشاہیر کا حال لکھا ہے تھا وہ اس اڈیشن میں نہیں ہے۔ اس ترمیم و اصلاح کے باعث دراصل مسٹر اڈورڈ ٹامس ہوئے تھے جو اس وقت دلی میں سشن جج تھے اُن کو پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا انہیں کے کہنے سے سرسید نے آثار الصنادید کو از سرِ نو مرتب کیا تھا۔

یہ اڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا۔ مگر نہ اس اڈیشن سے اور نہ پہلے اڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا کچھ فائدہ ہوا۔ دوسرے اڈیشن کے تمام نسخے غدر میں تلف ہو گئے۔ اور پہلے اڈیشن میں بھی ایک شخص کی بدعہدی کے سبب جو اس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا سراسر نقصان رہا۔

مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہو گئی۔ پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں۔ لیکن فرانس کے مشہور اورنٹیلسٹ موسیو گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمے کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں اوّل مسٹر رین ہولڈ راسٹ سکریٹری سوسائٹی موصوف کی چٹھی مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۴ء سرسید کے نام اس مضمون کی پہنچی کہ "یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور بہ اتفاقِ رائے چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہو گئے ہیں" اس کے بعد جو ڈپلوما سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا اس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے:

لندن ۴ جولائی ۱۸۶۴ء

گریٹ برٹین اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے زیرِ سرپرستی ہر موسٹ اکسلنٹ

مجسٹی وکٹوریہ آج کی تاریخ سرسید احمد خاں کو اِس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے ساتھ نامزد کیا۔ جس کی سند میں یہ ڈپلوما اُن کو ارسال کیا جاتا ہے۔

دستخط

ایڈورڈ کول بروک	پریسیڈنٹ
ایچ۔ راٹسن	ڈائریکٹر
رین ہولڈ راسٹ	سکریٹری

رسائلِ مذہبی وغیرہ اسی زمانہ میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے آثار الصنادید کے علاوہ اُنھوں نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱: فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مترجمہ ۱۸۴۶ء۔ یہ رسالہ ترجمہ ہے اُن فارسی مسودات کا جو سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ نے پرکار متناسبہ کے اعمال پر (جو اُنھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے تھے) فارسی میں قلم بند کئے تھے۔ یہ مسوّدات سرسید کے ہاتھ آگئے تھے۔ اُنھوں نے دو انگریز عالموں کے کہنے سے اُن مسودات کا ترجمہ اُردو میں کیا اور اس میں مثالیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔ ۲: قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین مورخہ ۱۸۴۸ء اس رسالے میں قدیم خیالات کے موافق سرسید نے زمین کی حرکت کو جس کا اب تمام یورپ قائل ہے غلط ثابت کرنا چاہا تھا لیکن ایک مدت سے حرکتِ زمین کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اس کو یقینی جانتے تھے۔ ۳: کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۸۴۵ء۔ یہ رسالہ پیری مُریدی اور بیعت کے طریقۂ مروجہ کے برخلاف لکھا ہے۔ ۴: راہِ سنّت در ردِّ بدعت مؤلفہ ۱۸۵۰ء۔ یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانے میں اہلِ بدعت کے برخلاف متبعینِ سنت کی تائید میں لکھا ہے۔ ۵: نمیقہ: در بیانِ مسئلۂ تصوّرِ شیخ مرقومہ ۱۸۵۲ء یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا اصلی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصوّرِ شیخ مصطلحِ مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبتِ خدا و محبتِ رسولؐ و ابوابِ رحمتِ الٰہی بتایا ہے۔ ۶: سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۲ء یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست اُن راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دہلی میں پانچ ہزار برس سے نوبت بہ نوبت فرماں روا ہوتے چلے آئے۔ اس میں راجہ یدھشٹر سے لے کر ملکہ معظمہ قیصرہ

ہند تک ۲۰۲ فرماں رواؤں کا نام، باپ کا نام، سنِ جلوس، دارالسلطنت اور یہ کہ اس کا عہد کس زمانے میں تھا، بہایت تحقیق اور جاں فشانی سے لکھا ہے۔ اصل میں یہ وہی فہرست ہے جو آثارالصنادید کے دوسرے اڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے اسی کو کسی قدر اصلاح کے بعد علیٰحدہ چھاپ کر اس کا نام سلسلۃ الملوک رکھ دیا گیا ہے۔ ۷، آغازِ کیمیائے سعادت کے چند اوراق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۲ء بس اس کے سوا دلی کی منصفی کے زمانے میں سرسید نے اور کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لکھا۔

دلی سے بجنور کو تبدیل ہونا

سرسید دلی میں جب کہ آثارالصنادید کو ترتیب دے رہے تھے درجۂ اول کے منصف ہو گئے تھے اور اب اُن کا نمبر صدر امینی کا تھا لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ اُس وقت دلی میں بزمِ تمام اہلِ کمال اور اہلِ علم موجود تھے اور مسلمانوں کی سوسائٹی میں کسی قدر جان باقی تھی اور کچھ عمارتوں کی تحقیقات کے ذوق و شوق میں وہ دلی سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک آدھ بار جو اُن کو قائم مقام صدرامین مقرر کر کے کہیں باہر بھیجا جاتا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ رہتک میں جب وہ قائم مقام صدرامین ہو کر گئے تو اس کا سبب یہ تھا کہ وہ چند روز کے لئے ایک خاص کام پر بھیجے گئے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ آثارالصنادید کا دوسرا ایڈیشن بھی نکال چکے تھے اتفاق سے سٹر ایڈورڈ طامس جو دلی میں جج رہ چکے تھے اور جن کے ایماء سے آثارالصنادید کی دوبارہ اصلاح کی گئی تھی کہیں سے آگرے میں وارد ہوئے اور صدر بورڈ کے حکام سے ملنے کو بورڈ میں چلے گئے۔ اس وقت بجنور کی صدرامینی خالی تھی۔ اور صدرامینی کے امیدواروں کی فہرست بورڈ میں پیش تھی۔ طامس صاحب نے سرسید کا نام یاد دلایا۔ بورڈ کے ممبروں نے کہا کہ وہ دلی سے باہر جانا نہیں چاہتے اس لئے ان کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ طامس صاحب نے کہا کہ وہ قدیم عماراتِ دہلی کی تحقیقات میں مصروف تھے، سو وہ کام ختم ہو گیا ہے، اب اُن کو دلی سے باہر جانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اور ایک چٹھی سرسید کو لکھی کہ تم کو بجنور میں صدر امینی پر بھیجنے کی تجویز ہو گئی ہے اب تم ہرگز انکار نہ کرنا۔ اس لئے سرسید کو لاچار دلی چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدرامین مقرر ہو کر دلی سے بجنور تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو برس ان کو گزرے تھے کہ غدر ہو گیا۔

اس تھوڑے سے عرصہ میں انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی کے علاوہ فرصت کے وقتوں میں دو کام نہایت محنت کے کئے جو قابلِ ذکر ہیں ایک ضلع بجنور کی تاریخ کا مرتب کرنا۔ دوسرے آئینِ اکبری کی تصحیح اور تکمیل۔

ضلع بجنور کی تاریخ جس زمانے میں سرسیّد بجنور تبدیل ہو کر گئے انہیں دنوں ایک سرکلر محکمۂ صدر بورڈ سے تمام صاحبانِ ضلع کے نام اس مضمون کا جاری ہوا تھا کہ جس ضلع کا بندوبست ختم ہو جائے اس ضلع کی ایک مفصّل تاریخ لکھوائی جائے۔ یہ سرکلر پہلے سے صاحب کلکٹر کے دفتر میں آیا ہوا تھا مگر ابھی تک اس پر کچھ عمل درآمد نہیں ہوا تھا۔ ایک روز صاحب کلکٹر نے سرسیّد سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا اس ضلع کی تاریخ میں لکھوں گا۔ صاحب کلکٹر بہت خوش ہوئے اور محکمۂ بندوبست میں حکم بھیج دیا کہ جس پرگنہ یا گاؤں کے کاغذات صدر امین صاحب طلب کریں فوراً ان کے پاس بھیج دئے جائیں۔ اور اسی طرح تمام تحصیلداروں کو ہدایت کی گئی کہ جس قانون گو یا پٹواری کو وہ بلائیں یا جو کاغذات وہ منگوائیں ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ سرسیّد نے یہ تاریخ بھی اپنی جبلّی عادت کے موافق نہایت تحقیق و کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی۔ ان کا بیان ہے کہ "گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی، مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانے کے ایسے کاغذات نکلے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔" ان سب کاغذات کی نقلیں اپنے اپنے موقع پر اس تاریخ میں درج تھیں۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو صاحب کلکٹر نے اس کو ملاحظے کے لئے صدر بورڈ میں بھیج دیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرے میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔ مسٹر شیکسپیئر کلکٹر ضلع بجنور اسی تاریخ کی نسبت اپنی چٹھی مورخہ ۵۔ جون ۱۸۵۸ء میں لکھتے ہیں کہ "سیّد احمد خاں ان باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جو ان کے خاص کام سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ چنانچہ انہوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت میرے پاس موجود ہوتی تو بہت کار آمد ہوتی۔ مگر غالب ہے کہ آگرے میں بباعثِ غدر تلف ہو گئی ہو گی۔"

اسی تاریخ میں سرسیّد نے ایک لمبی بحث سنِ فصلی کے متعلق لکھی تھی۔ اور جو غلطی سنِ فصلی

اور سنِ عملی میں فرق نہ کرنے اور دونوں کو ایک سمجھنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے تبیلی آتی تھی، اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا اور جو مشکلات کہ اس غلطی سے لازم آتی تھیں ان کو جتایا تھا۔ گو یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ گورنمنٹ نے سرسید کی اسی تحریر پر لحاظ کرکے اس غلطی کی اصلاح کی، کیونکہ وہ تاریخ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گئی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ صدر بورڈ کا ایک سرکلر ۱۸۶۰ء میں اور دوسرا ۱۸۶۱ء میں بہ منظوری گورنمنٹ جاری ہوا۔ جن کی رُو سے علاوہ سنِ فصلی اور سنِ حسابی کے ایک اور سنہ مالی کے نام سے مقرر کیا گیا جو بالکل سنِ عملی کے مطابق ہے اور جس سے وہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں جو سرسید نے اپنی تاریخ میں جتائی تھیں۔ کچھ تعجب نہیں ہے کہ جو کچھ سرسید نے تاریخ بجنور میں اس امر کے متعلق لکھا تھا۔ وہ بورڈ کے کسی ممبر کے ذہن میں محفوظ رہا ہو اور غدر کے دو تین برس بعد اسی بنا پر سنِ مالی مقرر کیا گیا ہو۔ سرسید نے اسی سنہ فصلی کے مضمون پر ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت مفید اور مفصل لیکچر سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں دیا تھا جو ۸ جون ۱۸۶۶ء کے اخبار میں درج ہے۔ اس لیکچر میں انہوں نے تقریباً وہ تمام خیالات ظاہر کئے ہیں جو سنِ فصلی کے متعلق تاریخ بجنور میں تحریر کئے تھے۔

آئینِ اکبری کی تصحیح

جب سرسید دلّی میں منصف تھے تو حاجی قطب الدین مرحوم نے جو دلّی کے ایک مشہور تاجر تھے ان سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ آئینِ اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اس کو چھپوا دوں اور اس کے معاوضے میں آئینِ اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سولہ سو روپے کے آپ کی نذر کر دوں گا۔ سرسید نے منصفی دہلی کی حالت میں وہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔ مگر چونکہ ایسے مفید اور دشوار کاموں میں ان کا جی بہت لگتا تھا، بجنور پہنچ کر انھوں نے یہ کام شروع کیا۔

آئینِ اکبری اول تو زبان اور طرزِ بیان کے اعتبار سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی۔ دوسرے جس قسم کے مضامین اس میں بیان کئے گئے ہیں فارسی لٹریچر میں اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے اس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا۔ پھر آئینِ اکبری کے نسخے کاتبوں کے ہاتھوں سے اکثر مسخ ہو گئے تھے اس لئے اس کا صحیح کرنا بہت دشوار تھا۔ سرسید نے اوّل جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک

نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں ان کی جابجا تشریح کی۔ اس زمانہ کے اوزان اور نقود کی اس زمانے کے اوزان ونقود سے مطابقت کی جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دئے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے ان کو اور کتابوں سے تحقیق کرکے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں خود مصنف نے غلطی کی تھی اس کو بہت کوشش سے تحقیق کرکے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حروف لکھے ہوئے تھے ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں وہ آئین کے انگریزی ترجمے کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ آخر میں اپنی طرف سے اس لئے اضافہ کیا کہ اس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ جائے۔ جہاں آئین میں سکوں کا بیان ہے وہاں چند ورق بطور حاشیہ کے اپنی طرف سے بڑھائے اور اکبر کے زمانے کے جس قدر سکے ابوالفضل نے بیان کئے تھے ان میں سے ہر ایک سکے کی دو دو تصویریں دے کر دونوں طرف جو عبارت یا الفاظ کندہ تھے۔ ان کو دکھایا اور اکبر ہی کے زمانے کے آٹھ سکے سونے اور چاندی کے ان کے علاوہ اور نشان دئے اس کے سوا اور بہت سی مفید باتیں اضافہ کیں۔

پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں۔ سرسید نے نہایت محنت وجانفشانی اور حسنِ اہتمام سے بے شمار تصویریں دلی کے لائق مصوروں سے کھچوا کر کتاب میں اپنے اپنے موقعے پر داخل کیں۔ مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس پچپن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرقعے کھچوائے جن میں مختلف کاریگر اپنے اپنے آلات اور ظروف اور اوزار لئے ہوئے جدا جدا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح فلزات کے متعلق ترازوئے ہوائی اور ترازوئے آبی کی تصویر، شکار اور یورش کے موقع پر خیمہ گاہِ بادشاہی کی تصویر، آئینِ چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آتش پرستی اور اس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئینِ شکوہ سلطنت کے متعلق تمام سامانِ تزک واحتشام کی تصویریں، فیل خانہ اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں کی کشتی کی تصویریں، علیٰ ہذا القیاس، تمام پھلدار اور پھولدار درختوں کی اور ہر ایک درخت کے ساتھ اس کی شاخ اور برگ وثمر یا پھول اور پتے کی تصویریں، اوراق گنجفۂ قدیم اور گنجفۂ مخترعۂ اکبری کی تصویریں اور تمام ہتھیاروں اور زیوروں کی تصویریں اور ان کے سوا اور بہت سی

تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں۔ چنانچہ مسٹر ایچ بلاک مین پرنسپل کلکتہ کالج نے سنہ ۱۸۷۳ء میں آئین کا جو ازسرِنو ترجمہ کرکے چھاپا ہے، اس میں انہی تصویروں کی نقل لی ہے جو سرسید نے فارسی آئینِ اکبری میں داخل کی تھیں۔

پہلی اور تیسری دو جلدیں اس طرح صحیح اور درست کرکے مطبع میں چھپنے کو بھیج دی گئیں، مگر دوسری جلد کی تصحیح میں یہ مشکل پیش آئی کہ ابوالفضل نے آئینِ خراج کے متعلق جو تمام ہندوستان کا محاصل لکھا تھا وہ حصہ تمام نسخوں میں مختلف پایا گیا۔ اور کوئی ذریعہ اس کی تصحیح کا نہ تھا۔ اتفاق سے دلی میں سرسید کے نانا نواب دبیر الدولہ کے وقت کی ایک کتاب نکل آئی جس میں سلطنتِ مغلیہ کے کل بادشاہوں کے عہد کا محاصل نہایت مفصل اور صحیح طور پر درج تھا۔ اس کتاب سے تمام محاصل جو اکبر کے زمانہ کا تھا نقل کرکے دوسری جلد بھی مکمل کی گئی اور ایک دیباچہ جو گویا آئینِ اکبری پر مفصل ریویو تھا، تحریر کرکے دوسری جلد کے ساتھ دلّی میں چھپنے کو بھیجا۔ لیکن افسوس کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہوگیا اور اس کے جس قدر فرمے چھپ چکے تھے وہ اور تمام مسودہ اور دیباچہ سب تلف ہوگئے۔ اب اس آئینِ اکبری کی جو سرسید نے تصحیح کی تھی صرف پہلی اور تیسری جلدیں مطبوعہ سنہ ۱۲۷۲ھ کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

دلی کے جن نامور لوگوں کی تقریظیں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں انہوں نے آئینِ اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریظیں لکھی تھیں مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی کی تقریظ چھپی ہے۔ مرزا غالب کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے وہ کلیاتِ غالب میں موجود ہے۔ مگر آئینِ اکبری میں سرسید نے اس کو قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریظ میں مرزا نے ظاہر کیا ہے کہ ابوالفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اس کی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ؎

مژدہ یاراں کہ ایں دیریں کتاب — یافت از اقبالِ سید فتح باب

دیدہ بینا آمد و بازو قوی — کہنگی پوشید تشریفِ نوی

دیں کہ در تصحیحِ آئیں رائے اوست — ننگ دعاے ہمتِ والائے اوست

اس کے بعد بہت سے اشعار اس مضمون کے لکھے ہیں کہ تعریف کے قابل انگریزوں کے آئین و ایجاد و اختراع ہیں نہ کہ اکبر اور ابوالفضل کے۔ اور مثیلاً انگریزوں کے بہت سے ایجادات بیان کئے ہیں۔ جب یہ تقریظ مرزا نے سرسید کو بھیجی انھوں نے اس کو مرزا کے پاس واپس بھیج دیا۔ اور لکھا

کہ ایسی تقریظ مجھے درکار[1] نہیں۔ ایک عربی تقریظ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کی بھی ہے۔ مگر وہ بھی شاید دیر میں پہنچنے کے سبب چھپنے نہیں پائی۔ انھوں نے بھی اپنی تقریظ کے آخر میں ایک فارسی شعر ایسا لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بھی آئینِ اکبری کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔

مگر اہل یورپ اس کتاب کو ہندوستان کی تاریخوں میں ایک بے نظیر کتاب سمجھتے ہیں ۱۷۷۶ء سے اہل فرانس اور انگریز اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اس وقت سے ۱۸۷۳ء تک اس کے متعدد ترجمے اور خلاصے فرنچ اور انگلش میں ہو چکے ہیں۔ مسٹر ایچ بلاک مین جنھوں نے ۱۸۷۳ء میں انگریزی میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ کتاب مسلمانوں کی تاریخوں میں جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ یہ فی الواقع اس سلطنت کی جو ۱۵۹۰ء کے قریب تھی ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ اور نقشہ جات ہیں جن میں اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات اور واقعات درج ہیں جن کے لئے ہم اس زمانے میں ایڈمنسٹریشن رپورٹوں نقشوں اور گزیٹروں کی طرف

---

[1] سرسید کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان میں لے آیا۔ ظاہراً جب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہو گیا تھا اور اسی لئے مرزا نے مراد آباد آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھڑی میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے۔ سرسید نے کہا کہ آپ خاطر جمع رکھئے میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے مرزا صاحب نے کہا بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھڑی میں لے جا کر بوتل دکھا دی آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی نے تم نے کوٹھڑی میں لا رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے ؎

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند　　چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند

سرسید ہنس کر چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی رفع ہو گئی مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دلی چلے گئے۔

بجوہر کہتے ہیں۔

پس سرسید کا ایک ایسی نادرالوجود کتاب کی تصحیح و تہذیب میں کوشش بلیغ کرکے اس کو از سرِ نو زندہ کرنا صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی فضول کام نہ تھا بلکہ فی الحقیقت پبلک پر ایک بہت بڑا احسان تھا اور مسلمانوں کے ایک نامور مصنّف اور نامور بادشاہ کے کارنامے کو دُنیا کے سامنے ایک دل نشین صورت میں پیش کرنا تھا۔

غدر سے پہلے صرف سوا دو برس سرسیّد کا بجنور میں رہنا ہُوا۔ اسی قلیل عرصہ میں مذکورہ بالا کاموں کے سوا اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ وہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مفید کام کرتے رہے چونکہ ان کی طبیعت کو تعمیر کے کام سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا اس لئے صاحب کلکٹر نے کمیٹی رفاہِ عام کا تمام کام ان کے سپرد کر دیا تھا۔ وہی اس کی رپورٹ لکھتے تھے اور وہی ضروری کاموں کے لئے روپیہ منگواتے تھے۔ اور ہر ایک کام کی خود نگرانی کرتے تھے۔ منجملہ اور کاموں کے ایک مفید کام انھوں نے یہ کیا کہ بجنور کی آبادی کے متصل شارعِ عام کے بیچوں بیچ مدت سے ایک نہایت چوڑا چکلا گڑھا پڑا ہوا تھا۔ اسی رستے سے تمام گاڑیاں گھوڑے، پیدل اور سوار گزرتے تھے۔ بعض اوقات گاڑیاں وغیرہ اُلٹ جاتی تھیں۔ بیلوں کو نقصان پہنچتے تھے۔ برسات میں پانی بھر جاتا تھا جس سے طرح طرح کی تکلیفیں لوگوں کو ہوتی تھیں۔ مدت سے یہ گڑھا چلا آتا تھا مگر کسی کو کچھ خیال نہ تھا۔ سرسید نے خاص اپنے اہتمام سے وہاں ایک پُل بندھوایا اور بجنور سے دارانگر تک ایک سڑک بنوا دی جس سے مسافروں کو بہت آسانی ہوگئی۔

★

تیسرا باب

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۸ء تک

ایامِ غدر کی خدمات اور واقعات، مراد آباد کی تبدیلی اور تاریخ سرکشی بجنور کی اشاعت، مراد آباد میں مدرسہ قائم کرنا، رسالۂ اسبابِ بغاوت لکھ کر اور چھپوا کر ولایت بھیجنا، ملکۂ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ، ایک میگزین موسوم بہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" اردو اور انگریزی میں نکالنا، تحقیقِ لفظِ نصاریٰ پر ایک مختصر رسالہ لکھنا، انتظامِ قحط ضلع مراد آباد، تصحیح تاریخ فیروز شاہی، تفسیرِ توریت و انجیل، بی بی کا انتقال، غازی پور کی تبدیلی، غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا، غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا، علی گڑھ کی تبدیلی، برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کرنا، اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیوں کا قائم کرانا، سائنٹفک سوسائٹی اخبار کا علی گڑھ سے نکلنا۔ دیسی یونیورسٹی کے لئے تحریک، بنارس کی تبدیلی، اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت، رسالۂ طعامِ اہلِ کتاب، بسلسلۂ جہاز بیٹھنے بموجب اصولِ مذہب یہ میرے نزدیک ہے۔

★

ایامِ غدر کا بیان جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے نام پر ایک سیاہ دھبہ چھوڑا ہے اور جو ہندوستان کی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا اور سرسید کے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کرنے والا تھا۔ وہ سرسید کو بجنور میں دیکھنا پڑا۔ اُن کو اِس ضلع میں دو برس اور چار مہینے گزرے تھے کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲ کو یہ خبر بجنور میں پہنچ گئی۔ وہاں اس وقت بیس یورپین اور یورشین عورتوں اور بچوں کمیت تھے۔ سرسید نے اس موقع پر اپنا پہلا فرض یہ قرار دے لیا تھا کہ جب تک دم میں دم باقی ہے اِن بیس جانوں کے بچانے میں جہاں تک ممکن ہو کوشش کی جائے۔ جو واقعات اور مصائب وہاں پیش آئے وہ نہایت درد انگیز ہیں۔ اور سرسید کی تاریخ سرکشی بجنور میں مفصل مذکور ہیں۔ ان کی تفصیل دوبارہ لکھنی گویا ان مصیبتوں کا پھر یاد دلانا اور رنج کو دوبالا کرنا ہے۔ ؎

مَصَائبِ اُخریٰ ذِکرنِلکَ المَصَائب

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے اس خطرناک موقع پر نہایت دلیری اور جوانمردی سے تمام مصیبت کے زمانے میں یورپین حاکموں کا جو وہاں موجود تھے، ساتھ دیا۔ ہر ایک نازک وقت میں ان کے ساتھ شریک اور گورنمنٹ کی وفاداری اور خیرخواہی میں شب و روز مستعد اور سرگرم رہے۔ جو لوگ گورنمنٹ کے خیرخواہ تھے اپنی مستعدی اور سرگرمی سے اُن کے دل بڑھائے اور جن کی نیتوں میں تزلزل اور تذبذب پایا ان کو نیک صلاحیں دیں اور جہاں تک ممکن تھا، اُن کے خیالات کی اصلاح کی اور جیسا اُس زمانے کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں، کہ خود یورپین افسروں نے اقرار کیا ہے صرف سرسید ہی کی حسنِ تدبیر، دانائی اور نیک دلی سے تمام یورپین، اور عیسائی مرد اور عورتیں اور بچے صحیح و سالم وہاں سے نکل کر رڑکی میں پہنچ گئے۔

مسٹر شیکسپیر جو اس زمانے میں بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے گو کہ سرسید کو باعتبار عہدے کی ان سے کچھ تعلق نہ تھا مسٹر شیکسپیر اور مسز شیکسپیر سے ان کی بہت راہ و رسم تھی۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شیکسپیر بہت گھبرائیں۔ سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا، تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اُس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں"۔ مسز شیکسپیر ہمیشہ سرسید کی اس شریفانہ تقریر کے شکرگذار رہے۔

سرسید کا یہ کہنا صرف زبانی نہ تھا بلکہ انہوں نے اپنے افعال سے اس قول کو سچ کر دکھایا تھا۔ وہ تمام رات مسلح مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرہ دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں اور بچوں کی ڈھارس بندھواتے تھے۔ ساری رات کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی۔ پلٹن نمبر ۲۹ کی تلنگوں کی ایک کمپنی سہارنپور سے بطور بدلی کے مرادآباد کو جاتی تھی۔ جب وہ بجنور میں پہنچی تو صوبہ دار اور کچھ تلنگے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر گئے۔ سرسید سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ کمپنی بگڑ کر آئی ہے اور کچھ تلنگے اور صوبے دار بہ ارادۂ فساد کلکٹر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سرسید کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کی خیر نہیں۔ وہ اسی وقت مسلح ہو کر کوٹھی کو روانہ ہو گئے اور اپنے صغیرسن بھتیجے[1] کو جو تنہا چچا کے پاس تھا چلتے وقت اپنے آدمی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں مارا جاؤں تو لڑکے کو

---

[1] یعنی سید محمد احمد خاں سب جج سیتاپور حال پنشنر

کسی امن کی جگہ پہنچا دیجئے۔ مگر کوٹھی پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمپنی مذکور بدلی پر مراد آباد جاتی تھی۔

وہ رات جب کہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین اور یوریشین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے، اور ایک جماعتِ کثیر جو بظاہر ان کی حفاظت کے لئے فراہم ہوئی تھی ان کی نیتیں بگڑ گئی تھیں اور کچھ فوج اور توپ خانہ باغیوں کا ان کی کمک کے لئے مراد آباد سے عنقریب آنے والا تھا نہایت سخت تھی۔ اس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہہ نہ تھا۔ ایسے نازک وقت میں سرسید تنہا اس خودسر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جو ان کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا؟ بہتر یہ ہے کہ ان کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو اور تم ملک کے مالک بن جاؤ۔ ایسے ٹیڑھے وقت میں سرسید کے ہوش و حواس بالکل بجا اور درست رہے، اور محمود خاں سے ایسی عمدہ گفتگو کی اور اس معاملے کے متعلق تمام نشیب و فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اس نے فوراً منظور کر لیا۔ اور سب انگریزوں کو اسی رات اس خونخوار مجمع سے نکال کر رڑکی روانہ کر دیا۔ اس موقع پر کلکٹر کی طرف سے جو تحریر سرسید نے لکھ کر نواب محمود خاں کو دی تھی اگر وہ اس کے موافق عملدرآمد کرتا تو اس کو کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا۔ بلکہ انگریزی تسلّط ہو جانے کے بعد ضرور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو اور خیر خواہوں کے ساتھ ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اس نے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد کچھ لحاظ نہ کیا۔

انگریزوں کے رڑکی روانہ ہو جانے کے بعد سرسید اور ان کے دوست میر تراب علی جو اس زمانے میں بجنور میں تحصیلدار تھے اسی رات کو لبی کوٹلہ جو بجنور سے چھ سات کوس ہے چلے گئے مگر نواب نے سوار بھیج کر ان کو وہاں سے بلایا۔ مجبوراً ان کو پھر بجنور میں آنا اور نواب سے ملنا پڑا اور ڈپٹی رحمت خاں بھی ہلدور سے آ پہنچے۔ نواب کی خواہش تھی کہ یہ لوگ جب مجھ سے ملنے آئیں تو نذریں پیش کریں۔ مگر انہوں نے نذریں پیش نہیں کیں۔ نواب نے مکدّر ہو کر ان کو رخصت کر دیا۔ اور کہا کہ بدستور بجنور میں اپنا اپنا کام کرو۔ سرسید نے دیوانی کا کام اسی طرح جس طرح کہ انگریزوں کے سامنے کرتے تھے کرنا شروع کیا۔ جو رپورٹیں اور روبکاریاں صاحب جج کے ہاں بھیجنے کے قابل ہوتی تھیں ان کی نسبت علی الاعلان کچہری میں یہ حکم تحریر کرتے رہے کہ بحضور صاحب جج بہادر بھیجی جائیں۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ عوام کو یہ خیال ہو کہ سرکارِ انگریزی کا تسلط اور عملداری بدستور قائم ہے۔ مگر محمود خاں کو یہ امر ناگوار گزرتا تھا۔ محمود خاں نے پھر ایک روز رات کے وقت سرسید احمد کو بلایا۔ اس وقت نواب اور اس کا بھانجا

جو اس کے مزاج پر بہت حاوی تھا دونوں موجود تھے۔ انہوں نے سرسید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں، تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ اور ہم سے اس بات پر حلف کر لو۔ جو جاگیر چاہو نسلاً بعد نسلٍ ہم سے ٹھیرا لو اور ہم سے حلف لے لو کہ ہم وہ جاگیر ہمیشہ بحال رکھیں گے۔ سرسید کو اوّل تو جواب دینے میں تامّل ہوا۔ مگر آخر کار ان سے صاف کہہ دیا کہ "میں اس بات پر بلا شبہہ حلف کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بد خواہی نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے تو میں تمہارا شریک نہیں ہوں۔" سرسید نے قسم یاد کر کے نواب سے کہا کہ "میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لئے کہتا ہوں آپ اس ارادے کو دل سے نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے، تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عملداری نہ کر سکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں اگر بالفرض انگریز جاتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں۔ آپ کی نوابی کو کوئی نہیں چھینتا۔ اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ خیر خواہِ سرکار بنے رہیں گے اور سرکار آپ کی نہایت قدر کرے گی۔ اگر آپ مجھ کو انتظام میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو صاحب کلکٹر سے اجازت منگا لیجئے اور یہ اقرار کر لیجئے کہ کوئی کام جب تک کہ اس کی منظوری صاحب کلکٹر سے نہ منگا لیں ہرگز نہ کریں۔" مگر نواب نے اس کو منظور نہیں کیا بلکہ وہ ناراض ہوا اور چیں بہ جبیں ہو کر سرسید کو رخصت کیا۔ اور ہر طرح ان کی اور ان کے ساتھیوں کی برائی کے درپے ہو گیا۔ جس مکان میں سرسید رہتے تھے اس کو بہ جبر چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا۔ جو اسباب سرسید کا اس میں بند تھا وہ سب افسروں نے لے لیا۔ اسی طرح میر تراب علی کا گھوڑا بہ جبر چھین لیا۔

انھیں دنوں ایک شخص منیر خاں نامی مع جمیعت چار سو آدمی کے نگینہ سے بجنور میں آیا اور سرسید، میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہوا۔ ان کو بجبر و تحکم طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہو گے تو بہتر نہ ہوگا۔ سرسید اور میر تراب علی اس کے پاس گئے۔ منیر خاں نے سرسید سے مسئلہ جہاد کے بارے میں گفتگو کی۔ انہوں نے نہایت سنجیدگی سے اس کو سمجھایا کہ شرع کے بموجب ہرگز جہاد نہیں ہے۔ اس نے ان کو تو رخصت کیا اور مولوی علیم اللہ رئیسِ بجنور کے پاس خود جا کر یہی مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے بڑی دلیری سے اس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت سی دلیلوں سے اس کو قائل کیا کہ مذہب کی رُو

سے جہاد نہیں ہے۔ اس روز مولوی علیم اللہ قتل ہوتے ہوتے بچے۔ دوسرے دن منیر خاں دلی چلا گیا۔

سرسید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اسی عرصے میں ہلدور کے چودھریوں نے ایک انبوہِ کثیر جمع کر کے محمود خاں کی فوج پر حملہ کیا اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔ سرسید نے اس کی مفصل کیفیت اسپیشل کمشنر میرٹھ کو لکھ بھیجی۔ وہاں سے حکم آ گیا کہ تم سرکار کی طرف سے ضلع کا انتظام کرو اور ڈپٹی رحمت خاں اور میر تراب علی کو اپنے ساتھ شریک کر لو۔ انہوں نے ایک مہینے تک بہت اچھا انتظام رکھا۔ مگر باوجود سخت ممانعت اور روک تھام کے ہلدور کے چودھری نے نگینے پر حملہ کر کے کچھ آدمی مار ڈالے اور کچھ محلے لوٹ لئے۔ اب نواب محمود خاں کے گرد پھر ایک جمعیتِ کثیر جمع ہو گئی۔ نواب نے بجنور پر حملہ کیا اور چودھری شکست کھا کر بھاگے۔ چونکہ سرسید کو نواب کی طرف سے تہدید تھا وہ بھی ہلدور چلے گئے۔ مگر نواب نے ہلدور پر بھی حملہ کیا اور چودھریوں کو شکست دے کر ہلدور کے بہت سے مکانات جلا دئے۔ سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں رات کو ہلدور سے پیادہ پا اس ارادے سے نکلے کہ میرٹھ چلے جائیں۔ رستے میں موضع بلانہ کی سرحد پر دو ہزار گنوار مسلح ان کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادہ سے دوڑے، مگر بخشی نامی ایک پٹھان نے ان کو بچایا۔ جب وہاں سے چاند پور پہنچے تو کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتیاروں سے ان کو گھیر لیا۔ یہاں تک کہ میر صادق علی خاں رئیسِ چاند پور وہاں پہنچے اور سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں کو اس انبوہ سے نکال کر اپنے مکان پر لے گئے۔ دوسرے روز میر صادق علی نے خود ساتھ ہو کر ان کو موضع بچھولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسید نے بھبڑاؤں پہنچ کر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان پر جو ان کے دوست تھے مقام کیا اور اپنی مفصل سرگزشت حکامِ انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔ جس وقت وہ میرٹھ میں پہنچے ہیں ان کے پاس چھ پیسے اور ایک پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا۔

میرٹھ میں ان کے پہنچنے اور بیمار ہونے کا حال سن کر مسٹر کری کرافٹ ولسن جو وہاں کے جج اور اسپیشل کمشنر تھے ان کو دیکھنے آئے اور سرسید سے کہا کہ "تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی۔

مگر جب تم کو اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور سرکار کی نہایت طرفداری کے سبب تمام ہندوؤں نے جو ضلع میں نامی چودھری اور بڑے رئیس تھے کمال خوشی اور آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے اوپر حاکم بننا قبول کیا۔ بلکہ خود درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ۔ سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال تو کر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے رہے۔ اس کے صلے میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشتہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کے لئے بھی رکھی جائے تو کم ہے۔"

کچھ اوپر پانچ مہینے سرسید کو میرٹھ ٹھہرنا پڑا۔ میرٹھ میں ان کو معلوم ہوا کہ دلّی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔ جب دلّی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہو چکا تو شہر کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ چھوڑ کر چل دئے تھے اور سرسید کا کنبا بھی جب کہ ان کے ماموں وحید الدین خاں اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں سپاہیوں کے ہاتھ سے مارے گئے سلطان نظام الدین چلا گیا تھا۔ مگر ان کی والدہ اور خالہ دلّی ہی میں رہیں لیکن جب ان کا گھر سارا لٹ گیا تو وہ حویلی کو چھوڑ کر حلوہ خانہ کی ایک کوٹھڑی میں جہاں زیبن نامی ایک لاوارث بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں اور آٹھ دن نہایت تکلیف سے اس کوٹھڑی میں بسر کئے۔ اس عرصے میں سرسید بھی وہاں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں۔ دو دن سے پانی بھی ہو چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی۔ سرسید کہتے تھے کہ جب میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انہوں نے کواڑ کھول دیے اور پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ "ہیں تم یہاں کیوں چلے آئے؟ یہاں تو لوگوں کو مار ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گذرے گی گذر جائے گی۔" میں نے کہا "آپ خاطر جمع رکھئے میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دلّی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔" تب اُن کی خاطر جمع ہوئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش کو نکلا۔ کنوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے پانی نکالا جا سکے اور چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ میں سیدھا قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہی زیبن بڑھیا

سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی۔ پھر اُٹھا نہ گیا۔ میں نے اس کے آبخورے میں پانی دیا اور کہا کہ پانی پی لے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورے کا پانی اپنی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں۔ اُن کے لئے پانی لے جاؤں گی، اور اسی لئے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا، میرے پاس پانی بہت ہے تُو پانی پی لے۔ پھر آبخورے میں پانی دیا۔ وہ پانی پی کر لیٹ گئی۔ میں دوڑا ہؤا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جاؤں۔ باہر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ زبین مری پڑی ہے۔ پھر سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کئے کہیں سواری نہ ملی۔ آخر قلعہ کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے وہ مجھ کو مل جائے۔ میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور والدہ اور خالہ کو بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔ میرٹھ میں منشی الطاف حسین مرحوم سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو سرسید کے قدیم دوست تھے ان کے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفرا کا بہت غلبہ ہو گیا تھا۔ کوئی دوا یا غذا پچتی نہ تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہ کر یکم ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۴ھ کو میرٹھ ہی میں انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "ان کے انتقال سے چند روز پہلے تمام کنبے کی عورتیں اور مرد اور بچے جو مختلف مقامات میں تھے سب ان کے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ مرتے وقت بہت خوش تھیں۔"

الغرض ۱۶ فروری ۱۸۵۸ء کو سکریٹری گورنمنٹ کی چٹھی مسٹر شیکسپیئر کے نام پہنچی کہ تم مع عملہ ضلع بجنور رڑکی کو روانہ ہو جاؤ اور رڑکی میں انتظام رہیلکھنڈ کیلئے فوج کے لام باندھنے کا حکم بھیجا گیا چنانچہ مسٹر شیکسپیئر اس فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سرسید اور تمام عملہ جو وہاں موجود تھا اور چند رئیسانِ ضلع بجنور سب اُن کے ہمراہ آ گئے۔

بجنور سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جیسا کہ اوپر مذکور ہؤا بہت لڑائیاں اور خانہ جنگیاں ہوتی تھیں کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملے کئے اور کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر اور آخر کو محمود خاں سب پر غالب آگیا تھا۔ اس لئے کچھ ہندو رئیس نواب سے شکست کھا کر میرٹھ چلے

آئے تھے اور کچھ نواب نے قید کر لئے تھے۔ پس جب انگریزی فوج رڑکی میں پہنچ لی اور روہیلکھنڈ پر چڑھائی کرنے کو تیار ہوئی تو وہاں یہ بحث پیش آئی کہ ضلع بجنور میں جو کہ روہیلکھنڈ کا سب سے پہلا ضلع ہے اور جہاں سب سے پہلے فوج جانے والی ہے کون لوگ باغی تصور کئے جائیں۔ مسلمانوں کی نسبت اس وقت نہ تو حکامِ ضلع کا خیال اچھا تھا اور نہ افسرانِ فوج کا۔ اور ہندو رئیس جنھوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی اور جو اپنی باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیرخواہی کے لباس میں ظاہر کرنا چاہتے تھے اور ان میں سے کسی قدر وہاں موجود بھی تھے، وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ مسلمانوں کے ان حملوں میں شریک تھے جو انہوں نے ہندو رئیسوں پر کئے وہ سب باغی قرار دیے جائیں۔ اگر اس وقت یہی فیصلہ ہو جاتا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔

سرسید نے مسٹر شیکسپیئر اور بعض افسرانِ فوج سے اس باب میں گفتگو کی اور کہا کہ "سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلے کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کئے قانون کی رُو سے ان کی نسبت جو کچھ ہو سو ہو مگر ان کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بروقت داخل ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار نہیں دینا چاہیئے۔" اس پر بہت بحث ہوئی اور آخر یہ بات قرار پا گئی کہ جو لوگ سرکاری فوج کے مقابلے میں آئیں وہی باغی قرار دئے جائیں لیکن بدنصیبی سے آم سوت، نجیب آباد اور نگینے پر احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں وغیرہ نے خفیف خفیف مقابلے کر کے ہزاروں کو لڑائی میں قتل کرایا اور تمام ضلع کی طرف سے سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا۔

اگرچہ جو لوگ ضلع بجنور میں اپنی بغاوت کا پورا پورا ثبوت دے چکے تھے اور سرکار سے کھلم کھلا بے وفائی کر چکے تھے سرسید نے ان کی حمایت ہرگز نہیں کی۔ لیکن جو لوگ کسی مجبوری یا دباؤ کے سبب باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لئے مجرم ٹھہر گئے تھے۔ یا جنہوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا مگر وہ کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا۔ مگر وہ کسی گروہ کو سرکار کے برخلاف نہیں سمجھتے تھے یا جن لوگوں نے سرسید کو ذاتی طور پر تکلیف پہنچائی تھی اور سرکار کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی جہاں تک ممکن ہوا ان کی بریت میں کوشش کی اور ان کی صفائی کرائی۔ ایک تحریر میں جو نواب محسن الملک نے

لکھوائی[1] اور مولانا نذیر احمد نے جو خاص بجنور کے رئیس ہیں اپنے قلم سے لکھی اور جو کہ گویا ان دونوں نامور اور معزز شخصوں کے خیالات کا مجموعہ ہے اس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں:۔

"سید احمد خاں کو سرکارِ انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا اور وہاں کے ہندو مسلمانوں کی خانہ جنگیاں یادگارِ غدر ہیں۔ اس عمومِ بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجے کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کر دیں۔ عودِ تسلط کے بعد اس ضلع کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مٹھی میں تھی۔ اگر ان کے سے اختیارات کسی دوسرے کو دیتے تو بجنور کے حصے میں قیامت آگئی ہوتی۔ مگر یہ معاملہ فہم منصف مزاج، نرم دل، نیک طینت آدمی اس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں، مخالفت اور جہالت میں حملہ اور حفاظت میں اور سید احمد خاں کی بدولت بجنور ہی ایک ضلع تھا جو عواقب و تبعاتِ[2] غدر سے محفوظ رہا۔"

سرسید کی رائے جو اس وقت عام رعایائے ضلع بجنور کی نسبت تھی اور جس پر حکامِ ضلع کو پورا بھروسہ تھا وہ تاریخِ سرکشیِ بجنور میں انہوں نے صاف صاف لکھ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ضلع بجنور کے لوگوں کا میری رائے میں یہ حال تھا کہ ان لڑائیوں میں نواب کے ساتھ ہو کر چودھریوں سے لڑنے کو سرکار سے لڑنا یا برخلاف سرکار کے لڑائی کرنی نہیں سمجھتے تھے۔ سب کے خیال میں چودھریوں کا اور نواب کا مقابلہ تھا۔ جس میں گویا سرکار بیچ میں سے علیحدہ تھی۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ جو لوگ چودھری صاحبوں کے ساتھ ان لڑائیوں میں شریک تھے۔ وہ اپنے تئیں چودھری صاحبوں کا حامی سمجھتے تھے۔ سرکارِ انگریزی سب کے دلوں سے الگ تھی"۔ سرسید ہی کی رائے کا یہ نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع

---

[1] آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں نے ۱۸۹۸ء میں سرسید کی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک خط نواب محسن الملک کے نام حیدرآباد بھیجا تھا۔ اس زمانے میں محسن الملک بیمار تھے۔ انھوں نے شمس العلما مولوی نذیر احمد سے اس کا جواب لکھوا کر بھیجا تھا جو علی گڑھ گزٹ میں چھپ گیا تھا اس تحریر میں سرسید کی نسبت دونوں کے خیالات مندرج ہیں۔

[2] عواقب و تبعاتِ غدر سے وہ نتائج مراد ہیں جو اکثر اضلاعِ ہندوستان میں انگریزی تسلط کے بعد باشندگانِ اضلاع کو بھگتنے پڑے کیونکہ بجنور میں سوا ان لوگوں کے جو باہم خانہ جنگیوں میں یا سرکاری فوج کے مقابلے میں مارے گئے یا فتح کے بعد فوراً بغاوت کے جرم میں سزایاب ہوئے پھر بہت ہی کم لوگوں سے تعرض کیا گیا۔

کے عام باشندوں سے بہت کم مواخذہ کیا گیا۔

خدماتِ غدر کا صلہ جو شخص سرسید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہوگا وہ اس بات کو بہ آسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری ان سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اِس نازک وقت میں ان سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ مگر گورنمنٹ نے خود اُن کی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپے ماہوار کی پولیٹکل پنشن دو نسلوں تک مقرّر کی۔

میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسانِ چاند پور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر میں برآمد ہوئی تھی سرکار نے ضبط کر لیا تھا اور جس طرح کہ دیگر خیر خواہانِ سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئی تھیں، مسٹر شیکسپیئر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ منجملہ تعلقہ چاند پور کے ایک معقول جائداد سید احمد خاں کو بعوض خدماتِ ایامِ غدر کے ملنی چاہیئے۔ مگر جب انہوں نے سرسید سے اس بات میں امتزاج کیا تو انہوں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ مسٹر شیکسپیئر نے اس قاعدہ کے موافق کہ کسی کو اس کی نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن نہیں مل سکتی تھی سرسید سے کہا کہ نقد پنشن بہت قلیل مقرر ہوگی۔ انہوں نے کہا جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے مگر مجھ کو یہ جائداد لینی ہرگز منظور نہیں۔ اس واقعہ کو اسی تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدر آباد میں لکھی تھی اس طرح بیان کیا ہے کہ "سید احمد خاں کو حسنِ خدماتِ غدر کے صلے میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا تجویز کیا تھا۔ مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اس کے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی ان کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔"

خود سرسید نے بھی اپنے ایک لیکچر میں جو ۲۷- دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں مدرسۃ العلوم کے تاریخی حالات پر دیا تھا اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "غدر میں جو حال انگریزوں اور اُن کے بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان

برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا، جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے مرحوم دوست مسٹر شیکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم، اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہان آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا، تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق اس دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے[1] اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزّت پائے گی اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں، نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑے اس کے دُور کرنے میں ہمّت باندھنا قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

مراد آباد کی تبدیلی

اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے صدر الصدوری کے عہدے پر ترقّی پا کر مراد آباد آ گئے اور ۱۸۵۹ء میں وہیں جب کہ باغیوں کی جائداد منضبطہ کے متعلق عذر داریاں ہونے لگیں اور ان کی سماعت و تحقیقات کے متعلق ایک اسپشل کمیشن بیٹھا۔ اس میں دو یورپین ممبر ایک کمشنر روہیل کھنڈ، دوسرے جج مراد آباد اور ایک

---

[1] غدر کے بعد سرسید کا ارادہ مصمّم ہو گیا تھا کہ پنشن لے کر مصر میں جا کر سکونت اختیار کریں۔

ہندوستانی ممبر یعنی سرسید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدے کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ نے یہ نہایت دانائی کی تھی کہ اکثر اضلاع میں منضبطہ جائداد کی تحقیقات کے لئے جو اسپیشل کمیشن مقرر کئے گئے تھے اُن میں یورپین افسروں کے ساتھ ایک ایک ہندوستانی ممبر بھی شامل کر دیا تھا۔ کیونکہ جائدادیں اکثر ادنیٰ ادنیٰ شبہہ پر ضبط ہو گئی تھیں اور انگریزی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف سے عموماً بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے خصوصاً ضلع مراد آباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا اور انگریز افسروں کا یہاں اعتدال پر رہنا دشوار تھا۔ اگرچہ سرسید نے اپنی زبان سے کمیشن مذکور کی کارروائی کے متعلق کبھی ہمارے سامنے کچھ بیان نہیں کیا۔ لیکن مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا گیا ہے کہ سرسید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے عذرداریوں کی تحقیقات نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ جائدادیں جس طرح ضلع مراد آباد میں واگزاشت ہوئیں ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئیں۔

ایک بہت بڑا فائدہ سرسید کے مراد آباد میں ہونے سے خاص کر مسلمانوں کو یہ پہنچا کہ مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد جو روہیل کھنڈ کے ایک مشہور عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے انہوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لئے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا۔ مگر اتفاق سے باغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی اور انہوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس کر ان سب کو قتل کر ڈالا۔ مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثۂ عظیم اُن کے مکان میں گزرا تھا اور ان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار اُن مظلوموں کے ساتھ نہیں مارا گیا تھا، سرکاری تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام ضلع کو ان کی تلاش در پیش تھی اور ان کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ اُن کی ضرور سازش تھی ورنہ اُن کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے۔ مگر سرسید کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور انہوں نے نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ ان کو یا ان کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کے لئے صاحبِ ضلع سے، باوجودیکہ وہ نہایت افروختہ تھے بڑی دلیری کے

ساتھ گفتگو کی اور یہ کہا کہ میں مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں لیکن جب تک کہ آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ اُن سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا۔ اس وقت تک میں ان کو بلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آخر صاحبِ ضلع نے ان سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم ضابطہ کی تحقیقات تو ضرور کریں گے۔ لیکن چونکہ تمھارے نزدیک وہ بے قصور ہیں بعد ضابطہ کی کارروائی کے ان کو بری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بُلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور ضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیے گئے۔

تاریخِ سرکشیٔ بجنور — مراد آباد ہی میں سرسیّد نے تاریخِ سرکشیٔ بجنور چھاپ کر شائع کی۔ اس تاریخ میں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعاتِ غدر جو ضلع بجنور میں گزرے بقیدِ تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ تمام خط و کتابت جو کہ وہ حکامِ ضلع کے ساتھ رڑکی میں کرتے تھے اور وہ تمام تحریریں جو انہوں نے نواب محمود خاں اور چودھریوں کے نام یا نواب اور چودھریوں نے ان کے نام یا آپس میں ایک دوسرے کے نام بھیجیں اور اس کے سوا بہت سی تحریرات جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی تھیں لفظ بہ لفظ اس کتاب میں درج ہیں۔ ان میں سے بہت سی تحریریں اور اکثر یادداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتدا سے اخیر تک اس کتاب کے لئے میٹریل جمع کرتے رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب کہ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ انگریزی عملداری بالکل اٹھ گئی تھی۔ لوگوں کے گھر بار لُٹ رہے تھے اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے۔ وہ ان کاغذات اور یادداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔ اس سے دو باتیں بخوبی ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انگریزی عملداری کے پھر قائم ہو جانے کا ان کو کامل یقین تھا۔ دوسرے یہ کہ ضلع کی اِس خوف ناک حالت میں بدحواسی یا خوف و ہراس نے ان کی طبیعت میں مطلق راہ نہیں پائی۔

اِس کتاب میں غدر کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے بلا رو رعایت اور بے کم و کاست لکھے گئے ہیں۔ جن مسلمانوں نے باوجود متواتر فہمائشوں، نصیحتوں اور تمام نشیب و فراز سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ کے احسانات کے بے وفائی کی تھی اور اس سے مقابلے کے ساتھ پیش آئے تھے، ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دئے ہیں اور باوجودیکہ ہندو چودھریوں یا ان کے

ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے بری تھے اس لئے اس الزام سے ان کی برئیت کی ہے۔ مگر جو کچھ انہوں نے مسلمانوں پر تشدد اور سختیاں کی تھیں ان کو بھی اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ غرضکہ واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصّبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

مدرسۂ مراد آباد اس کے بعد انہوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا۔ کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت پر رہا۔ مگر جب اسٹریچی صاحب وہاں کلکٹر ہو کر آئے اور انہوں نے ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا اسی تحصیلی مدرسے میں اس فارسی مدرسے کے طلبا بھی داخل ہو گئے۔

رائے دربابِ تعلیم انہیں دنوں میں انہوں نے ایک رائے تعلیم کے باب میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ کر شائع کی جس میں گورنمنٹ کے ورنیکلر اسکولوں پر سخت اعتراض تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا سرکار کو مشورہ دیا تھا۔ ہم اس مضمون سے دو تین فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"گذشتہ چند سالوں سے گورنمنٹ نے جو انتظام رعایائے ہندوستان کا کیا ہے سب سے اوّل اس میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ آیا فی نفسہٖ وہ انتظام ایسا ہے یا نہیں؟ کہ رعایا کا اس سے ناراض ہونا اور خواہ نخواہ بدگمانی کرنا ضرور ہو۔ ہماری رائے یہ ہے کہ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے تو جو اس قوم کی زبان ہے اُسی میں اس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہوگی اور دوسری زبان کے لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچے گا۔ بظاہر اس کی نظیریں بھی موجود تھیں کیونکہ تمام اہلِ یورپ اور اہلِ عرب نے اپنی ہی زبانوں میں علم سیکھے ہیں۔ مگر یہ رائے غلط تھی۔ کُل زبانوں پر ایسا خیال کر لینا صحیح نہیں ہے بلکہ ہم کو چاہیئے کہ اس بات پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اس زبان کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہو۔

ہمیشہ تعلیم سے مقصود یہ رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں ان کو سمجھنے کی، برائی بھلائی جاننے کی اور عجائبِ قدرت

الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔ اس کے اخلاق درست ہوں، معاملاتِ معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امورِ معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ "ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امورِ معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر، تو ایسا ہی جانیے"۔

"سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے وہ تربیت کے لئے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیتِ اہلِ ہند کا ہے۔ اردو زبان جس کے ذریعہ سے اکثر جگہ تعلیم ہوتی ہے اس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو۔ کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں، اُس زبان کی نسبت ہم کو اوّل یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ اگر یہ نہ ہوں تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہٖ اس قابل ہے یا نہیں کہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں۔ کیونکہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے، مگر دوسری بات لاعلاج ہے۔ تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اس میں علوم پڑھنے سے جودتِ طبع، حدتِ ذہن، سلامتِ فکر، ملکۂ عالی، قوتِ ناطقہ، پختگیِ تقریر اور ترتیبِ دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو زبان میں کوئی ایسی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ تعلیم کو جو درحقیقت تربیتِ انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے بالکل بدل دے اور اُس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو"۔

میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے۔ اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے بے جا ہی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے۔ اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اُس میں ہو سکتی ہے"۔

یہاں ان فقروں کے نقل کرنے سے ہمارا صرف یہ مدعا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو دیسی زبان کی تعلیم پر ترجیح دینے کی نسبت جو کچھ سرسید کی رائے اُس زمانے میں تھی۔

یہی رائے اب سے ۲۶ برس پہلے تھی۔ مگر ۲۶ برس کے تجربے سے اُن کو اس قدر ضرور معلوم ہوا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہندوستان

مراد آباد ہی میں سر سید نے گورنمنٹ کی، ملک کی اور خاص کر اپنی قوم کی وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو ان کے اور بڑے بڑے کاموں کی طرح ہمیشہ یادگار رہے گی۔ وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے جب مراد آباد میں پہنچے تو ان کی تباہی و بربادی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ ان کی نظر سے گزرا جس سے ایک اور چوٹ ان کے دل پر لگی۔ گورنمنٹ کا غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندو خیر خواہیِ سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لئے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ اُن کا مسلمان ہونا ہی اُن کے مجرم ٹھہرانے کے لئے کافی تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ بے قاعدہ رعایت یا ہمدردی کرنا سرکاری عہدہ داروں کی قدرت سے باہر تھا، اس لئے سر سید اپنے منصب کے لحاظ سے کوئی سلوک ان کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے مراد آباد میں آنے سے کسی قدر ان ناگفتہ بہ بے اعتدالیوں کا انسداد ہوا جو خاص مراد آباد میں بعض ناخدا ترس لوگ سرکار کی خیر خواہی کے پردے میں کیا کرتے تھے۔ کیونکہ حُسنِ اتفاق سے انہیں دنوں میں الکزینڈر شیکسپیئر صاحب مراد آباد کے کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے اور ان کو سر سید کی رائے اور مشورے پر پورا اعتماد تھا۔ مگر سر سید اسی پر قانع نہ تھے بلکہ وہ اس فکر میں تھے کہ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک عام بدگمانی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے وہ کس طرح رفع کی جائے۔

زمانہ نہایت نازک تھا۔ خیالات ظاہر کرنے کی آزادی مطلق نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو، اس کو ایسا کام کرنا جس سے اپنے دل برے ہوں اور بھی زیادہ دشوار تھا۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنا مخالف خیال کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب پہلے ہی سے موجود تھے۔ انگریز ہندوستانیوں کی عادت، طبیعت اور طرز خیالات سے ناواقف تھے۔ ملک کی حکومت انھوں نے مسلمانوں سے

لی تھی اور انھیں کو اپنا حریف اور سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے اور بدقسمتی سے بقول سرسید کے بھُس بھری ہوئی مُردہ کھال دلی میں موجود تھی مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی۔ اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔

سرسید کو اس بات کا دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ انگریزوں کا یہ سمجھنا کہ غدر ایک ملکی بغاوت تھی اور اس کی بنیاد انگلش گورنمنٹ کی حکومت اٹھا دینے کے لئے کسی سازش پر تھی محض غلط ہے اور اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ جیسے باغی ملک کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ اُن کے نزدیک نہ یہ ملکی بغاوت تھی نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی۔ وہ بھی نہ بہ ارادۂ بغاوت بلکہ بہ سببِ جہالت اور مذہبی توہمات کے۔ چنانچہ سر ولیم کے نے بھی جو بغاوت کے بعد انڈیا آفس میں انڈر سیکرٹری تھے نہایت انصاف سے اس ہنگامہ کو "سپاہیانہ وار" سے تعبیر کیا ہے۔ اور لارڈ لارنس نے بھی آخر کو یہی فیصلہ کیا کہ صرف کارتوس کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ تھا نہ کوئی عام سازش تھی نہ ملکی بغاوت۔

اس بنا پر اُنھوں نے مراد آباد میں آکر اسبابِ بغاوتِ ہند پر ایک رسالہ لکھا تھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو جن پر سارا جھگڑا انگریزوں کی بدگمانی کا تھا بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ پوست کندہ بیان کئے ہیں۔ اور جو اسباب کہ عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزین تھے ان کی تردید کی ہے اور ان کو غلط بتایا ہے۔

یہ رسالہ غالباً انھوں نے مراد آباد میں پہنچتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اس کے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرائیں اردو ہی میں اس کو مطبع مفصلیٹ گزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیج دیا اور ۱۸۵۹ء میں اس کی پانسو جلدیں چھپ کر ان کے پاس پہنچ گئیں جب سرسید نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید

کے نہایت دوست تھے انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا "میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیرخواہی سمجھتا ہوں پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ رائے شنکر داس نے جب سرسید کی آمادگی بدرجۂ غایت دیکھی اور ان کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو گئے۔ سرسید نے اول دو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی، تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹل فریر نے جو کونسل میں ممبر تھے اس کے مضمون کو محض خیرخواہی پر محمول کیا۔ مگر مسٹر سسل بیڈن نے جو اس وقت فارن سیکریٹری تھے، اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی، اور یہ رائے ظاہر کی کہ "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسبِ ضابطہ بازپرس ہونی چاہئے اور جواب لینا چاہئے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے تو سخت سزا دینی چاہیے" لیکن چونکہ اور کوئی ممبران کا ہم رائے نہ تھا اس لئے ان کی اسپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔

۱۸۶۰ء میں جب کہ لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سرسید بھی اس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر سسل بیڈن فارن سیکریٹری گورنمنٹ انڈیا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے۔ اور اسی نے اسبابِ بغاوت پر وہ مضمون لکھا ہے تو سرسید سے ملے۔ اور علیحدہ لے جا کر اپنی نہایت رنجش ظاہر کی اور بہت دیر تک تیز گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے کہا "اگر تم گورنمنٹ کی خیرخواہی کے لئے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے" سرسید نے کہا۔ میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے۔ اور کچھ کم پانسو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں۔ جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بسبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لئے وہ میری باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جس طرح میں نے اس کو ہندوستان میں شائع

نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے۔ اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔" مسٹر بیڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا اور انہوں نے کئی بار سرسید سے پوچھا کہ کیا فی الواقع اس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں شائع نہیں ہؤا۔ جب ان کا اطمینان ہو گیا پھر انہوں نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا اور اس کے بعد سرسید کے دوست اور حامی و مددگار رہے۔

اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے۔ انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہؤا اور اس پر متعدد بحثیں ہوئیں۔ گورنمنٹ انڈیا میں بھی اس کا ترجمہ ہؤا۔ پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا۔ مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا۔ لیکن اسی زمانے میں ایک مدبر حاکم نے اشاعت کی نظر سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ جس کو کرنل گریہم نے جو سرسید کے بڑے دوست ہیں پورا کیا اور ۱۸۷۳ء میں چھپ کر شائع ہؤا۔ اس کتاب کی نسبت مدبران سلطنت وغیرہ کی رائیں اور جو نتائج اس سے پیدا ہوئے وہ دوسرے حصے میں لکھے جائیں گے۔ چونکہ یہ رسالہ آج تک عام طور پر شائع نہیں ہؤا اور نہ امید ہے کہ آئندہ شائع ہو، اس لئے ہم نے رسالہ کو بجنسہٖ بطور ضمیمہ کے کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا ہے کیونکہ جس قدر اس تحریر سے سرسید کا ایک عمدہ مدبر سلطنت اور ملک اور گورنمنٹ کا خیرخواہ ہونا ثابت ہوتا ہے اس سے زیادہ گورنمنٹ کی حق پسندی، انصاف اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ملتا ہے۔ جس نے اس غیظ و غضب اور ناراضی کے زمانہ میں نہایت ٹھنڈے دل سے شکایتوں کو سنا، ان پر غور کیا۔ اور جو شکایتیں اور اعتراض صحیح معلوم ہوئے ان کا فوراً تدارک کیا۔

ملکۂ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ ادا کرنا

سرسید ابھی اپنی کتاب اسباب بغاوت کو ختم کرنے نہیں پائے تھے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار معافی اور امن و امان کا مشتہر ہؤا۔ اس اشتہار کے مشتہر ہونے پر سرسید نے مرادآباد کے مسلمانوں کو مطلع کیا۔ کہ ملکۂ معظمہ کے اس عنایت و مہربانی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تمام مسلمانوں نے خوشی سے قبول کیا اور اس غرض کے لئے سب کا ایک جگہ جمع ہونا قرار پایا۔ شہر کے متصل ایک مشہور درگاہ شاہ بلاقی صاحب کی ہے اس کام کے لئے وہ جگہ تجویز ہوئی۔ شہر کے مسلمانوں نے آپس میں چندہ کیا۔ اور ۲۸ جولائی

۱۸۵۹ء کو قریب پندرہ ہزار مسلمانوں کے وہاں جمع ہوئے۔ غریبوں اور مسکینوں کو عمدہ کھانا تقسیم کیا گیا۔ عصر کے وقت سب لوگوں نے شاہ بلاقی صاحب کی مسجد میں نماز پڑھی۔ نمازیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ مسجد کے باہر میدان تک جماعتیں کھڑی ہوئی تھیں۔

نماز کے بعد سرسید نے صحنِ مسجد میں ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اُردو زبان میں ایک مناجات پڑھی جس میں نہ شاندار الفاظ ہیں نہ رنگینی ہے، نہ تصنع ہے محض سیدھے سادے الفاظ اور بے ساختہ جملے ہیں۔ مگر اس کے ہر جملے اور فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے اس شخص کے دل میں ایک عجیب بے چینی پیدا کر رکھی تھی۔ جو کسی طرح کم نہ ہوتی تھی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی اور گویا اس بات کی خبر دیتی تھی کہ وہ سرسید کو اخیر دم تک اس چپک سے خالی نہ رہنے دے گی۔ ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مناجات کو بجنسہٖ اس مقام پر نقل کر دیں، کیونکہ اس کے الفاظ سے سرسید کے دل کی اصلی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

مناجات

"اے خدا تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے۔ اے خدا اصل بادشاہت اور حقیقی سلطنت تجھی کو سزاوار ہے۔ اے خدا مالک الملک تو ہی ہے جس کو تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو تو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ اے خدا سارا عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل تیرے ہاتھ میں ہیں۔ جس طرف تو چاہتا ہے ان کو پھیرتا ہے اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت اور رحمت سے خالی نہیں۔ تیرے کام میں کسی کو چون و چرا کی قدرت نہیں۔ اے خدا ہم تیرے عاجز بندے سراسر تیرے گنہگار ہیں۔ اے خدا ہماری شامتِ اعمال نے ہم کو گناہ کے دریا میں سر تک ڈبو دیا ہے۔ اے خدا ہم تیرے ہر وقت تقصیروار ہیں۔ جب تک تیری مدد نہ ہو ایک دم گناہ سے پاک نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخشنے والا نہیں۔ اے خدا تیرے سوا ہم گناہ میں ڈوبے ہوؤں کا کوئی ترانے والا نہیں۔ ہم نہایت عاجزی اور کمالِ انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے تجھ سے چاہتے ہیں اے خدا تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت لے گئی ہے۔ اپنی رحمتِ کاملہ سے ہمارے

گناہ معاف کر۔ اے خدا جس طرح تیری حکمت سے میلا کپڑا میل سے پاک ہوتا ہے اسی طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی ناپاکی سے پاک کر۔ اے خدا اپنی بے انتہا رحمت سے ہمارے دل کو تمام بُرائیوں اور ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں صاف کر۔ اے خدا ہمارے دل کے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدس کی تائید سے قوی کر۔ تیرے سوا ہمارا حقیقی ماوا اور اصلی ملجا اور کوئی نہیں۔ آمین!

الٰہی: ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔ الٰہی ہماری شامتِ اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک کے اعمال کی سزا اور جزا کا ایک دن بیشک آنے والا ہے جس کا تُو نے اپنے سچے نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے اور اُس دن تیری رحمت اور تیرے فضل کے سوا کسی کو چھٹکارا نہیں۔ کیونکہ تیرے آگے سب گنہ گار ہیں۔ مگر ان پچھلے دو برسوں میں جو تیری نگاہِ قہر آلود تیرے عاجز بندوں کی طرف ہوئی وہ بیشک ہماری شامتِ اعمال کا ظاہری نتیجہ تھا۔ الٰہی ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ الٰہی ہم اپنے گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتے ہیں۔ الٰہی تُو ہمارے گناہ سب معاف کر۔ آمین!

الٰہی! یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گذرا کہ انسان اور حیوان اور تمام چرند و پرند، بلکہ شجر و حجر کسی کو چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص اپنی جان و مال اور آبرو پر مطمئن نہ تھا۔ ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان کو گویا اُلٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الٰہی تو نے اپنے فضل و کرم سے ان تمام فسادوں اور آفتوں کو دُور کیا۔ الٰہی تُو نے پھر اپنے عاجز بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسائش ان بدبخت برسوں سے پہلے تو نے اپنے بندوں کو دی تھی، پھر وہی امن و آسائش تُو نے اپنے بندوں کو نصیب کی۔ الٰہی تیرے اس رحم کا دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ الٰہی تُو ہمارے اس شکرانے کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے اپنے فضل و کرم سے قبول کر۔ آمین!

الٰہی! تیرا ایک بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک تو نے اپنے ان بندوں کو جن کو تو نے خطۂ ہندوستان میں جگہ دی ہے اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بہ سبب نہ ہونے ان حاکموں کے ہماری شامتِ اعمال ہمارے پیش آئی اب تُو نے

اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلط کئے۔ تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں تو اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول کر۔ آمین!

الٰہی! جو بھلائی کہ تیرے بندے کو کسی تیرے بندے سے پہنچتی ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہے اور اس تیرے بندے کا شکر ادا کرنا درحقیقت تیرا ہی شکر ادا کرنا ہے۔ سب کے دلوں کا حال تجھ پر روشن ہے کیونکہ تُو دانائے نہاں و آشکارا ہے۔ اہلِ ہند جو اس اتفاقیہ آفت میں گرفتار ہو گئے تھے ان پر رحم کرنا تو نے ہی ہمارے حکام کے دل میں ڈالا۔ تیرے ہی القا سے کوئن وکٹوریا دام سلطنتہا نے پُر رحم اشتہار معافی جاری کیا۔ ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی جان سے ملکہ کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ آمین!

الٰہی! ہماری ملکہ وکٹوریہ ہو اور جہان ہو۔ تمام اہلِ ہند ناظمِ کشورِ ہند وائسرائے لارڈ کیننگ دام اقبالہٗ کا یہ رحم اور احسان کبھی دل سے نہیں بھولیں گے۔ جس نے تمام اصل حالاتِ فساد پر غور کر کے اس پُر رحم اشتہار کے جاری ہونے کی صلاح دی۔ اس کی مستحکم رائے کسی طرح اس معاملے میں نہیں ڈگمگائی جس سے تمام رعایا نے امن پایا۔ تمام اہلِ ہند اس کے اس احسان کے بندے اور دل و جان سے اس کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تُو ہماری دعا قبول کر۔ آمین۔ الٰہی دُنیا ہو اور ہمارا وائسرائے لارڈ کیننگ ہو۔

الٰہی! اہلِ ہند رحم کے اس سے بہت زیادہ خواہش مند ہیں جتنا ایک پیاسا نہایت گرمی کی شدت اور آفتاب کی تیزی اور دھوپ کی تپش اور ریتے کے جنگل میں پانی کی آرزو رکھتا ہے۔ جس حاکم کو دیکھتے ہیں کہ اس کی رحم کی نظر ہے اس کو دل سے پیار کرتے ہیں اور اس کا دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تمام اہلِ ہند جانتے ہیں کہ اصل حالاتِ فساد پر غور کر کے نہایت رحم کی نگاہ سے اہلِ ہند کو مسٹر ریڈ ممبر صدر بورڈ نے دیکھا ہے اس لئے ان کا شکر ادا کرتے ہیں اور دل سے ان کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی تُو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ ہمارا مسٹر ریڈ ہمیشہ سلامت رہے۔

اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے امن و امان اور چین چان اور تمام رعایائے ہند کو اطاعتِ گورنمنٹ سے سرخروئی دے اور ہمارے حکام اپنی رعایا اور خدا کے بندوں پر مہربان رہیں۔ آمین! صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین وآخر دعوانا ان

الحمد للہ رب العالمین ۔

رسائل موسوم بہ لائل محمدنز اوف انڈیا

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاص کر مسلمانوں کی بھلائی کے لئے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی ۔ رسالۂ اسبابِ بغاوت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا انہوں نے محض گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے لکھا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک اس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام اور افسر اور خود ہندوستان کے باشندے کیا ہندو اور کیا مسلمان مطلع نہیں ہوئے اور جو نتائج اس پر مترتب ہوئے وہ پارلیمنٹ کے مباحثوں کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج ظاہر ہوتے رہے ۔ اس لئے سرسید کے دل کی بے چینی اور درد میں کچھ اضافہ نہ ہوا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بغاوت پر جتنے آرٹیکل، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کے برخلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں۔ ان کی بے چینی اور زیادہ ہوتی تھی۔ مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ ان کو بالذّات اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے ۔ کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی اور سب سے بڑا اور عام لزام جو اُن پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا، کہ مسلمانوں کے مذہب کی رُو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لئے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے ۔

برخلاف اس کے سرسید نے نہایت تحقیقات اور چھان بین سے بے شمار شہادتیں اس بات کی بہم پہنچائی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیر خواہی میں جانبازی اور جاں نثاری کے کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظہور میں نہیں آئے اور مذکورہ بالا تینوں الزام جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے وہ فی الواقع انگریزوں کی غلط فہمی پر مبنی تھے ۔ اسی بنا پر انہوں نے ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جو پارہ پارہ کر کے وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپوائی جائے اور ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں شائع کی جائے ۔

اس کتاب کا موضوع یہ قرار دیا تھا کہ اطرافِ ہندوستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیر خواہیاں اور انگریزوں کی حمایت کے لئے جانبازیاں کی ہیں، ان میں سے ہر شخص کا حال مفصّل اور مشرّح نہایت صحت کے ساتھ قلم بند کیا جائے ۔ اور ہر شخص کے متعلق گورنمنٹ، حکّام اور افسروں

کی تمام چٹھیاں اور سرٹیفکیٹ بہم پہنچا کہ اس کی سرگزشت کی ذیل میں نقل کی جائیں اور جو کچھ ان کی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے جاگیر یا پنشن یا انعام یا خلعت وغیرہ عنایت کیا ہو وہ سب بیان کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کے لئے بے انتہا سامان اور میٹریل درکار تھا جس کا جمع کرنا وقت سے خالی نہ تھا۔ پھر اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اُجرت بھی اس زمانے میں نہایت گراں تھی اور ٹائپ کے چھاپے کا خرچ بھی بہ نسبت پتھر کے چھاپے کے زیادہ تھا۔ اس لئے سرسید نے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ جس خیر خواہ مسلمان کا حال جتنے صفحوں پر چھپے اس قدر صفحوں کے چھاپے وغیرہ کی لاگت وہی شخص ادا کرے۔ مگر افسوس ہے کہ معدودے چند کے سوا کسی نے اس تدبیر کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین نمبر بہ قدر ۲۷۲ صفحے کے چھپ کر رہ گئے۔ ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ جاری ہوا۔ اور ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

پہلے نمبر کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے۔ "سچ ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت ذلیل و درماندہ کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں انسان کا فضل و کمال، عقل و ہنر، علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا بایا پٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی کام اس کا اعتبار کے لائق نہیں رہتا۔ کسی شخص کو اس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا۔ جو کام انسان سے برا سرزد ہوتا ہے وہ تو برا ہی ہے۔ مگر اس کمبخت وقت کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ اس کا اچھا کام بھی برائی اور ظاہر داری پر محمول ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم میں اچھے برے سب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ جو ایک مثل مشہور ہے کہ "ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرے" یہ خاص ایسے ہی برے وقت کے لئے کہی گئی ہے اس کم بخت وقت کا یہ خاصا ہے کہ اگر ایک آدمی بھی برا کام کرے تو ساری قوم کی قوم رسوا اور بدنام ہو جاتی ہے۔ گو اسی قوم میں صدہا آدمیوں نے اچھے کام کئے ہوں۔ مگر ان خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جن لوگوں پر بدبختی کے دن نہیں ہوتے ان کا برا کام بھی آنکھوں میں نہیں کھٹکتا۔ ان میں سے ہزاروں نے کیسے ہی برے کام کئے ہوں مگر ان کی برائی پر کسی کو دھیان نہیں ہوتا یہ بدبختی کا زمانہ وہ ہے جو ۵۸۔۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گزرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں نازل نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، گو وہ رام دین اور ماتا دین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔

ہر بلائے کز آسماں آید | گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پرسد | خانۂ مسلماں کجا باشد

"اس گزشتہ زمانے کے حالات پر میں نے بھی بہت غور کیا اور جو اصلی حالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں ان پر میں یقین رکھتا ہوں اور اسی سبب سے میرا دل خوش ہے کہ بالفعل جو ایک غوغا مسلمانوں کی بُرائی اور مفسدہ اور بدذاتی کا چاروں طرف پھیل رہا ہے یہ بالکل مٹ جائے گا۔ اگرچہ کچھ کچھ حالات فساد کے کھلتے چلے ہیں مگر روز بروز اور کھلتے جائیں گے اور جب اصلی حال بالکل روشن ہو جائے گا تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جائیں گی اور تحقیق ہو جائے گا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی رو سے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یگانگت کر سکتی ہے تو مسلمان ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ مگر ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بد ذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانہ میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔ مگر میں اس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا اور کوئی ایسا ہو جس نے خالص سرکار کی خیر خواہی میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کھوئی ہو۔ زبانی بات چیت کی خیر خواہیاں جتلا دینے اور جھوٹے سچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی ہو اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل و جان سے جاں نثاری کو حاضر رہا ہو۔

"جن مسلمانوں نے سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی میں ان کا طرف دار نہیں ہوں میں ان سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور ان کو حد سے زیادہ بُرا جانتا ہوں۔ کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیئے تھا۔ جو اہلِ کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں نبیوں پر ایمان لائے ہیں۔ خدا کے دیئے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں، جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔ پس اس ہنگامے میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا، وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہیئے تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا اس نے علاوہ نمک حرامی

اور گورنمنٹ کی ناشکری کی جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے بھی برخلاف کیا۔ اس لئے بلاشبہہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ ان سے ناراض ہوا جائے۔ مگر عموماً اخباروں اور بغاوت کی کتابوں میں جو رائے ان کی نسبت چھاپی جاتی ہے اس میں اور میری رائے میں اتنا فرق ہے کہ جو تمہید اور جو بنا اور جو منشا کہ وہ لوگ ان کی نسبت لگاتے ہیں میں ان کو قبول نہیں کرتا اور کچھ شک نہیں کہ میں اپنی رائے کو بہت درستی اور انصاف سے کام میں لایا ہوں۔"

"اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور و غل ہو رہا ہے مگر مسلمانوں کو کسی طرح رنجیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف ہے ہماری گورنمنٹ نے اصلی حالاتِ فساد پر بخوبی غور کیا ہے اور یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے جو تم اخباروں یا بغاوت کی کتابوں میں دیکھتے ہو۔ پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ ہے تو پھر اس شور و غوغا کا ان کو کیا غم ہے۔

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من

"ہم جو یہ بات لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدر دان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت اور آبرو کی، انعام و اکرام اور جاگیر اور پنشن سے نہال کر دیا ہے۔ ترقی عہدہ اور افزونی مراتب سے سرافراز کیا ہے پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں، اور دل و جان سے اپنی گورنمنٹ کے شکر گزار اور ثناخواں رہیں۔"

"مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو خیر خواہیاں کیں ان کا ذکر اخباروں میں بہت کم چھپا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں ان میں تو اس کا ذکر ہی نہیں۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ اس رسالے میں لکھنا شروع کروں اور جن مسلمانوں نے علی الخصوص مسلمان ملازمانِ گورنمنٹ نے جو جو خیر خواہیاں گورنمنٹ کی کی ہیں ان کا بیان جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لکھوں، اور جو انعام و اکرام ہماری منصف و قدردان گورنمنٹ نے بعض اس کے مسلمانوں کو دیئے وہ سب بیان کر دوں تاکہ گورنمنٹ کی سخاوت اور منصفی اور قدر دانی زیادہ تر مشہور ہو۔ اور تمام رعایا اپنے ہمقوموں کے ساتھ گورنمنٹ کی مروت اور سلوک اور رعایت اور قدر دانی دیکھ کر اس کی دل سے شکر گزار ہو اور ہر ایک کو یہ حوصلہ پیدا ہو کہ جس طرح ہمارے ہم قوموں نے گورنمنٹ کی رفاقت سے عزت اور نیک نامی حاصل کی اسی طرح ہم بھی

حاصل کریں اور یہ بھی جان لیں کہ ہماری گورنمنٹ ہمیشہ اپنی مطیع رعایا پر دل سے مہربان اور ان کی قدر و منزلت کرنے کو تیار ہے۔"

"مگر چونکہ مسلمان خیر خواہ بہت کثرت سے ہیں اور ان کی رپورٹیں بھی بہت لمبی لمبی ہیں اس لئے ان سب کا ایک کتاب میں جمع کرنا اور چھاپنا خالی از دقت نہ تھا۔ اس واسطے یہ تجویز کی ہے کہ مناسب مناسب وقت پر چند لوگوں کا حال مختصر مختصر رسالوں میں چھاپا جائے۔"

"جو لوگ بسبب تعصّب یا عدم واقفیّت کے حالاتِ ملکی سے یا جو اصول سیاستِ مدن کے ہیں ان پر صحیح رائے تہ پہنچنے کے سبب میری رائے کے برخلاف ہیں، وہ لوگ میری اس رائے کو دیکھ کر حبّ الوطنی کا الزام مجھ پر لگائیں گے۔ ہاں یہ بات تو مجبوری کی ہے کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور میں بلاشبہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں ہی کا ذکرِ خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں۔ پھر ناانصفی سے جو کوئی چاہے یہ الزام مجھ پر لگائے مگر جو لوگ انصاف دوست ہیں وہ خیال کریں گے کہ ان حالات و واقعات کی تحریر میں میں نے کسی جگہ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ جس مسلمان کی خیر خواہی کا ذکر لکھا ہے اس کے ساتھ بجنسہٖ حکامِ متعہد کی رپورٹیں جو ان کے حق میں ہوئیں اور سرٹیفکیٹ جو ان کو دئے گئے اور گورنمنٹ سے جو انعام و اکرام ان کو ملے وہ سب لفظ بہ لفظ اس میں مندرج ہیں۔ جو میری اس تحریر پر گواہ عادل ہیں اور تمام متعصّبوں کو الزام لگانے سے بند کرتے ہیں۔"

اس کے بعد سرسیّد نے اوّل اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میری خدمات بہ مقابلہ بڑے بڑے خیر خواہ مسلمانوں کے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ اور اس لئے وہ ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر صرف اس امید پر جو انگریز مسلمانوں سے بدگمان ہیں وہ مؤلف کو گورنمنٹ کا خیر خواہ سمجھ کر ان تحریرات کو توجہ کے قابل سمجھیں۔ سب سے پہلے اپنا اور میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کا حال لکھا ہے اور تینوں رسالوں میں تقریباً سترہ یا اٹھارہ شخصوں کا نہایت مفصّل حال درج کیا ہے۔ جن میں سے بعضے خود بھی مارے گئے اور ان کے ساتھ دس دس بارہ بارہ آدمی ان کے کٹیے۔ کے بھی باغیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ دوسرے رسالے میں خیر خواہانِ سرکار کے ذکر کے علاوہ ایک لمبی بحث ان تینوں الزاموں کے متعلق بھی کی ہے جو عموماً مسلمانوں اور ان کے مذہب پر لگائے جاتے تھے اور قرآن، حدیث اور فقہ کے حوالوں سے نہایت صفائی کے ساتھ ان کو غلط اور محض بے اصل و بے بنیاد ثابت کیا ہے۔ تیسرے رسالے میں لانس لٹ اڈلبسن نام ایک قدیم عیسائی مصنّف کی کتاب سے جو اس نے ۱۶۷۹ء میں اسلام کے ابتدائی حالات پر لکھی تھی۔ ایک

عہد نامہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے عیسائیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا اس میں ان کی قوم کو تقریباً مسلمانوں ہی کے برابر حقوق دئے تھے۔ اور مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ اس پر ہمیشہ کاربند رہیں۔ ورنہ وہ خدا سے منحرف سمجھے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ رسالے مسلمانوں کی معمولی بے پروائی اور کم ہمتی سے صرف تین نمبروں سے آگے نہ چل سکے۔ اگر یہ تذکرہ مکمّل ہو جاتا تو مسلمانوں کے حق میں نہایت مفید اور بکار آمد چیز ہوتی اور ان دعووں کا ایک عملی اور قطعی ثبوت ہوتا جن کے ثابت کرنے کے لئے اصولِ اسلام کے موافق دلیلیں اور شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔

تحقیقِ لفظِ نصاریٰ

سرسیّد مراد آباد ہی میں تھے کہ ان کو معلوم ہوا کہ بعض اضلاع میں مسلمانوں کی بعض تحریریں ایّامِ غدر کی ایسی پیش ہوئیں جن میں انگریزوں کو لفظِ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا۔ حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور ان کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو ان کی قسمت میں لکھی تھیں۔ اس وقت جیسا کہ سرسیّد نے لکھا ہے مسلمانوں کی ہر ایک بات بُرے پہلو پر ڈھالی جاتی تھی۔ انگریزوں نے جو بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصاریٰ کا لفظ دیکھا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسیٰؑ کو حقارت سے ناصری (یعنی قریۂ ناصرہ کا رہنے والا) کہتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سرسیّد نے اس غلطی کے رفع کرنے کو فوراً ایک مختصر رسالہ تحقیقِ لفظِ نصاریٰ میں لکھا اور اس کو اردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اس کے مضمون سے مطلع کیا۔ ہم کو اس کتاب کے لکھتے وقت وہ رسالہ دست یاب نہیں ہوا۔ مگر جو کچھ سرسیّد نے بیان کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہے اس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ ناصرہ سے کیونکہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے کہا من انصاری

---

[1] غدر کے چند سال بعد دلّی میں بھی ایک اسی قسم کا اشتباہ پیدا ہوا تھا۔ دلّی کالج کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک ایڈریس کے مسوّدہ میں عیسائی کی جگہ ترسا کا لفظ لکھ دیا تھا جو فارسی میں راہب کو کہتے ہیں۔ کالج کے ایک یورپین افسر نے اس کو حقارت کا لفظ سمجھا اور نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس لفظ کو مسوّدے میں سے کٹوا دیا۔

إِلَى اللّٰہِ" تو حواریوں نے کہا "نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰہِ" اور اسی لئے حواریوں کی پیروی کرنے والوں کو اسی صفت کے ساتھ جس کی حواریوں نے حامی بھری تھی موصوف کیا گیا ہے۔ اور ان پر نصاریٰ کا اطلاق کیا گیا ہے، قرآن میں کہیں قریۂ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا اور نہ کہیں حضرتِ عیسیٰ کو ناصری کہا گیا ہے۔ اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی آنحضرتؐ کے زمانے میں خود اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ (یعنی اے محمدؐ تو پائے گا اہلِ کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست اُن کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں۔)

جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے اس رسالے کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار میں یہ لکھا گیا تھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اس کا جواب یہ دیا اور لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی۔

انتظامِ قحطِ ضلع مرادآباد

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاعِ شمال و مغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا۔ اُس وقت سر سید مرادآباد ہی میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان اسٹریچی نے جو اس وقت وہاں کلکٹر تھے اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سر سید کے سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر قطعِ نظر لیاقت اور سلیقۂ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سر سید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستانیوں کے لئے ایک عمدہ مثال ہے۔ سر سید کے ایک قدیم دوست خود مرادآباد کے رہنے والے جو اس وقت وہاں ملازم تھے، ان کا خیال ہے کہ سید احمد کو جو اس قدر عزت اور نیک نامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی یہ اُسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں اُن سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانے کے حُسنِ انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ بیماروں کے لئے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھا۔ بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا۔ زچاؤں اور شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لئے مسلمان اور ہندوؤں کے لئے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ جو ہندو اپنے سوا کسی کا پکا نہیں کھاتے تھے ان کے لئے علیحدہ چوکے بنے ہوئے تھے۔ شہر کی پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانے میں نہیں آسکتی تھیں اُن کے پاس سوت کاتنے کے لئے آٹھ آٹھ آنے فی اسم اور ایک

ایک پٹاری روئی کے گاؤں کی میر محلوں کی معرفت بھیج دی جاتی تھی۔ جب سوت کت کر آجاتا تھا تو اور روئی اور کاتنے کی اجرت بھیج دیتے تھے۔ سرسید کے مراد آبادی دوست بیان کرتے ہیں کہ اس زمانے کی عورتیں جو اب تک جیتی ہیں وہ سید احمد خاں کو اب تک دعائیں دیتی ہیں۔

سرسید صبح شام دونوں وقت بلاناغہ محتاج خانے میں خود جاتے تھے، ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے۔ جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاتی تھی جن کے دست جاری ہوتے تھے اور کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے ان کو سرسید خود اپنی گود میں اٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے جاکر لٹا دیتے تھے ان کے کپڑے بدلوانے تھے، سر منڈواتے تھے ہاتھ منہ دھلواتے تھے اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جیکشن داس صاحب سی ایس آئی کی جو آخر کو سرسید کے نہایت گہرے دوست ہو گئے اس وقت تک ان سے ملاقات نہ تھی۔ ان کا بیان ہے کہ:

"جب سرسید نے رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالنا شروع کیا تو اس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان کو کچھ ہمدردی نہیں ہے اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیر خواہوں کے تذکرے میں نکالا جائے۔ انہیں دنوں میرا مراد آباد جانا ہوا، محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا وہاں سرسید سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نے ان فقروں کا ذکر کیا جن سے ان کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے معذرت کی اور اپنی قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔ خیر یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آرہے تھے اس کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہو گیا اور مجھے حیرت ہوئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے؟ وہ دن ہے اور آج کا دن ان کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی اور اب جو کچھ میرا اور ان کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔"

محتاج خانے میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھپنے سے پہلے بٹ جاتا تھا۔ مگر جو بھلے مانس علانیہ محتاج خانے میں آنے سے شرماتے تھے ان کو عام اجازت تھی کہ رات کو اندھیرے میں آکر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کے لئے ہر ایک جنس عمدہ اور اول درجہ کی منگوائی جاتی تھی۔ کھانے کے سوا ان کے لئے ضروری کپڑا بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اچھے انتظام کے جس قدر کم روپیہ ضلع مراد آباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں نہیں ہوا۔ سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عورت اور مرد محتاج خانے میں کام کے لائق تھے سب سے کام لیا جاتا تھا۔ بان اور رسیاں بٹتے تھے، سوت کاتتے تھے، سڑکوں پر کام کرتے تھے اور طرح طرح کے کام جو اُن سے ہو سکتے تھے کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کے کام کی اُجرت سے ہر روز ایک رقمِ کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانے میں صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانے کے علاوہ خود سرسید اپنی ذات سے اور نیز ان کی نیک بی بی جو اُن سے بھی زیادہ خدا ترس تھیں غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ ان کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔

جب اس محتاج خانے کی رپورٹ اسٹریچی صاحب نے گورنمنٹ میں بھیجی تو یہ انتظام ایسا پسند آیا کہ اور اضلاع کے حکام کو بھی ایسا ہی انتظام کرنے کی ہدایت ہوئی اور اسٹریچی صاحب کا نہایت شکریہ اور تعریف کی گئی۔ مگر اسٹریچی صاحب نے صاف لکھ بھیجا کہ یہ تمام کارروائی سید احمد خاں سب جج نے کی ہے۔ اگر شکریہ اور تعریف کا مستحق ہے تو سید احمد خاں ہے۔

سرسید کو جب اسٹریچی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سرسید نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئیں گے ان میں جتنے مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے وہ ہندوؤں کو سپرد کئے جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندو مسلمانوں کے سوا کسی مشنری کو نہیں لینے دئے مگر حسبِ ہدایت اسٹریچی صاحب کے جو بچہ جس کے سپرد کرتے تھے اس سے ایک اقرار نامہ لکھوا لیتے تھے کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنائیں گے۔ ہوشیار ہونے کے بعد جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ جان اسٹریچی مراد آباد سے بدل گئے اور مسٹر پاور اُن کی جگہ آئے۔ مشنریوں نے اسٹریچی صاحب کے سامنے تو دم نہیں مارا مگر اُن کے جاتے ہی مسٹر پاور سے سرسید کی شکایت کی اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو مسلمانوں کو دئے گئے ہیں وہ واپس لئے جائیں۔ اس زمانے میں مسٹر الیگزنڈر شیکسپیر جو سرسید کے نہایت دوست تھے مراد آباد میں جج تھے انہوں نے سرسید کو ہر چند سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیاں خاص تمہارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں

لی جائیں گی۔ مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ مگر سرسید نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ "میں نے اسی شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمے لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنریوں کو نہیں دیئے جائیں گے اور اسٹریچی صاحب گورنمنٹ میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے۔ پس اس کے خلاف کیوں کر ہو سکتا ہے۔ مجھے جس طرح یہ گوارا نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنریوں کو دیا جائے اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک چمار کا بچہ ان کو دیا جائے۔

مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس معاملے پر غور کرنے کے لئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ چونکہ اس زمانہ میں ہندوستانی حد سے زیادہ ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سرسید اور ایک دو اور ممبروں کے سوا تمام کمیٹی کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کئے گئے ہیں وہ واپس لے لئے جائیں کیونکہ ان پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ ان کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ آخر کار کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہو گئی اور تمام لاوارث بچے ہندو مسلمانوں سے واپس لے کر مشنریوں کو دلوائے گئے۔ سرسید کے ہاں بھی چار پانچ لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں اور ان کی بی بی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں۔ سرسید نے پہلے اس سے کہ کوئی ان سے مانگنے آئے فوراً ان کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا۔ جاتے ہوئے وہ بچے زار و قطار روتے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر مجبوراً ان کو بھیجنا پڑا۔

سرسید کہتے تھے کہ اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ لے کر کسی صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور ان کو تعلیم دی جائے۔ لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

مراد آباد ہی میں انھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضیائے برنی کی تصحیح کی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو اس نایاب کتاب کا چھاپنا منظور تھا۔ اس نے سرسید سے تاریخ مذکور کا ایک صحیح نسخہ نقل کے واسطے طلب کیا تھا۔ انھوں نے بہت جستجو سے اس کا ایک نسخہ اس غرض کے لئے خریدا اور سوسائٹی سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجوں گا۔ چنانچہ اس کی تصحیح کے لئے ایک نسخہ کتب خانۂ شاہ دہلی کا، دوسرا وہ نسخہ جو مسٹر الیٹ نے تاریخ

ہندوستان لکھنے وقت بہم پہنچایا تھا، تیسرا نسخہ مسٹر ایڈورڈ ٹامس سے اور چوتھا بنارس سے بڑی تلاش اور تجسس سے بہم پہنچا کر اپنی کتاب صحیح کی اور اس سے یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپ کر شائع کی۔

یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاء الدین برنی (یعنی بلند شہر کا رہنے والا) بڑا فاضل اور راست بیانی میں ضرب المثل ہے۔ سرسید نے اس کی تصحیح کے وقت اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں اُن تمام تاریخوں کا جو شاہانِ ہند کے حال میں اس تاریخ سے پہلے اور خاص فیروز شاہ کے حال میں اس کے بعد لکھی گئی ہیں اور نیز ضیاء الدین برنی کا حال درج ہے۔ یہ دیباچہ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں چھپا ہوا موجود ہے۔

تبیین الکلام

۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جابجا مباحثے ہونے لگے۔ اس وقت سرسید کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں۔ چنانچہ غدر سے پہلے بجنور میں انہوں نے کچھ کچھ بطور یادداشت کے لکھا بھی تھا اور اپنے بھتیجے سید محمد احمد خاں کو جو اس وقت صغیر سن تھے، جو کچھ لکھتے تھے بطور سبق کے پڑھاتے جاتے تھے۔

دفعتہً غدر ہو گیا اور وہ تمام یادداشتیں جاتی رہیں۔ غدر کے بعد جب اطمینان ہوا تو اس خیال نے دوسری صورت میں ظہور کیا۔ جس کا ذکر دوسرے حصّے میں کیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ ذہن میں آیا کہ اس کام کے لئے اوّل عیسائی مذہب اور بائیبل کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے اور جو کچھ بائیبل پر موافق یا مخالف لکھا گیا ہے اس سے واقفیت حاصل کرنی ضرور ہے۔ ان کو یہ بھی خیال تھا کہ اب تک جس قدر مباحثے یا مناظرے ہندوستان میں پادریوں کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بغیر ان تمام باتوں کی واقفیت کے ہوئے ہیں۔ اعجازِ عیسوی وغیرہ میں جو تحریفِ لفظی ہونے کا دعوے کیا گیا تھا، اس سے سرسید کو اختلاف تھا۔ نسخ کے متعلق جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں نزاع تھا اس کو وہ محض نزاعِ لفظی سمجھتے تھے۔ بہت سی باتیں جو عیسائی لوگ بائیبل سے اصولِ اسلام کے خلاف نکالتے تھے ان کو سرسید عیسائیوں کی غلط فہمی سے منسوب کرتے تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کی تحقیقات اور تصفیہ کے لئے بہت کچھ سامان درکار تھا اتفاق سے انہی دنوں

میں غدر کے زمانے کی چڑھی ہوئی تنخواہوں کا اور جو اسباب بجنور میں لٹ گیا تھا اس کے معاوضے کا بہت سا روپیہ سرسید کو سرکار سے ملا۔ اوّل انہوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں، بائیبل کی تفسیریں اور یونی ٹیرین مذہب کی کتابیں خریدیں اور نیز لامذہبیوں کی کتابیں جو بائیبل کے خلاف لکھی گئی تھیں وہ بھی بہم پہنچائیں۔ ایک انگریزی خواں کو جو ان کتابوں کے ضروری مقالات ترجمہ کر کے سناتا تھا اور کتبِ احادیث و تفسیر وغیرہ سے سندیں بہم پہنچانے کے لئے ایک عربی داں عالم کو نوکر رکھا اور بائیبل کے متعلق جو علم و تحقیقات اور اطلاع مذکورہ بالا ذریعوں سے حاصل ہوئی اس کو اوّل دس مقدموں اور دو تتموں میں بیان کیا۔ اس کے بعد بائیبل کی تفسیر لکھنے اور قرآن و حدیث سے اس کی تطبیق کرنے کا ارادہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اصولِ اسلام اور اصولِ اہلِ کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع ہو جائیں اور مسلمان جو موجودہ بائیبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اس میں تحریفِ لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے ان کو بائیبل اور اس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا بالکل یقین ہو گیا تھا کہ بائیبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہو سکتی ہے۔

یہ کام نہایت مشکل تھا اور سلف میں کسی نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نہ کسی کو پہلے اس زمانے کی سی ضرورتیں پیش آئی تھیں اور نہ اگلے زمانے میں آج کل کا سا سامان اور میٹیریل میسر آسکتا تھا۔ بایں ہمہ یہ کام دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ انہوں نے صرف اس تفسیر کے چھاپنے کو کئی ہزار روپے کا پریس رڑکی سے منگوایا اور اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ ابھی کام شروع نہیں ہونے پایا تھا کہ ان کی بدلی غازی پور کی ہو گئی۔ وہ تمام سامان اپنے ساتھ غازی پور لے گئے اور وہاں اس کام میں نہایت سرگرمی اور توجہ کے ساتھ مصروف ہوئے۔

غازی پور میں انہوں نے سالم نام ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اس سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ غازی پور کے ضلع میں جو مولوی عنایت رسول صاحب چریاکوٹی ایک بہت بڑے عالم عربی اور عبرانی کے ہیں ان کی اعانت سے سرسید کے ارادے کو اور بھی زیادہ تقویت ہوئی۔ الغرض عہدِ عتیق میں سے کتابِ پیدائش کے گیارھویں باب تک اور عہدِ جدید میں سے انجیل متی کے پانچویں باب تک تفسیر اسی التزام کے ساتھ جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا، لکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ چھپتی بھی گئی۔

جو کچھ سرسید لکھتے تھے اس کا ترجمہ انگریزی میں ایک یورپین جس کو سو روپے ماہوار تنخواہ دیتے تھے ہر روز دو گھنٹے کرتا تھا۔ وہ ترجمہ بھی اردو کے ساتھ چھپتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری خط میں اور اس کا اردو ترجمہ اور انگریزی ترجمہ اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ دوسرے کالم میں اسی مضمون کی کوئی آیتِ قرآنی یا حدیث اور اس کا ترجمہ اردو اور انگریزی اس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔

اس کتاب میں تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں بڑی محنت اور تحقیق اور تلاش سے لکھے ہیں جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لئے نہایت عمدہ اور قیمتی اطلاعیں مندرج ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت تمہید ہیں اس مذہبی تنافر کے دُور کرنے کی جو دونوں قوموں کے تعصب، لاعلمی اور ایک دوسرے کے مذہب سے ناواقفیت کے سبب طرفین کے دلوں میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اور بمنزلہ بنیاد کے ہیں، ایک ایسی تفسیر کے لئے جو بائیبل پر اصولِ اسلام کے موافق لکھی جائے۔

ان مقدموں میں دکھایا گیا ہے کہ اہلِ اسلام کے نزدیک بھی انبیاء کا معصوم ہونا ویسا ہی ضروری ہے جیسا اہلِ کتاب کے نزدیک ضروری ہے۔ اور اہلِ اسلام بھی تمام اگلے نبیوں اور ان کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا ویسا ہی ضروریاتِ دین سے سمجھتے ہیں جیسے اہلِ کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جن اگلی کتابوں اور صحیفوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے یہی کتابیں آنحضرت صلعم کے زمانے میں موجود تھیں۔ اور آج ان کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا عقلی معیار مسلمانوں کے نزدیک بھی وہی امر قرار پا سکتا ہے جو عیسائیوں کے ہاں قرار پایا ہے۔ نیز محققین و اکابرِ اسلام مثل امام اسمٰعیل بخاری، امام فخر الدین رازی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہم کے اقوال سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح عیسائی کتبِ مقدسہ میں تحریفِ لفظی کے قائل نہیں ہیں اور جس قسم کی تحریف کو عیسائی محققوں نے تسلیم کیا ہے، صرف اسی قسم کی تحریف آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی سے کتبِ مقدسہ میں پائی جاتی ہے۔ پھر جس قدر کوششیں یہودی اور عیسائی عالموں اور بزرگوں نے عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی حفاظت تنقید اور تصحیح میں ابتدا سے آج تک کی ہیں ان کی تمام ہسٹری اور جو نتائج ان کوششوں پر مترتب ہوئے وہ مفصل بیان کئے ہیں۔ پھر ترجموں کا حال اور یہ کہ اختلافِ تراجم سے اصل بائیبل کا محرّف ہونا لازم نہیں آتا، نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ پھر نسخ کی بابت جو نزاع مسلمانوں اور عیسائیوں میں تھا اس کو محض نزاعِ لفظی پر محمول کیا ہے اور اس طرح اس بُعدِ بعید کو جو علمائے فریقین کے تعصب یا لاعلمی اور ناواقفیت سے اسلام اور اصلی

عیسائیت کے اصول میں پایا جاتا تھا اس کو بہت کچھ رفع کیا ہے۔ اس کے بعد ایک دیباچہ عہدِ عتیق پر اور دوسرا کتاب پیدائش پر لکھا ہے پھر تفسیر شروع کی ہے۔

یہ تفسیر اس لحاظ سے کہ اس میں تحریف لفظی کا انکار کیا گیا تھا اور نیز اس لئے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان نے اس کے لکھنے پر توجہ نہیں کی، موجودہ علمائے اسلام کے خلاف تھی اور اس وجہ سے کہ وہ اسلام اور خالص عیسائیت میں اتحاد ثابت کرتی تھی اور موجودہ عیسائیت کو جس کی بنیاد تثلیث، کفارہ اور تکذیبِ خاتم النبیینؐ پر ہے غلط ٹھیراتی ہے، عیسائیوں کے بر خلاف تھی۔ نیز اس کے لکھنے، ترتیب دینے اور چھپوانے میں بے انتہا محنت اور روپیہ صرف ہوتا تھا اور کتاب کے بکنے کی بالکل امید نہ تھی ان وجوہات سے وہ آگے نہ چل سکی۔ اگرچہ اس بات کا افسوس ہے کہ یہ تفسیر پوری نہ ہو سکی اور سرسید کا ایک نہایت مفید اور ضروری کام ادھورا رہ گیا تھا، مگر جو مقاصد اس تفسیر کے ذریعے سے بیان کرنے منظور تھے ان میں سے بعضے اہم اور ضروری مقصد خطباتِ احمدیہ میں کمال شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گئے ہیں۔ جیسے انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت، یا مسئلہ تعددِ ازدواج یا مسئلہ طلاق وغیرہ۔

عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مخاصمانہ طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اسلام کو بدستور ظلم، خونریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لئے مناظرے کا طریقہ جاری رکھنا ضروری تھا اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ مناظرے کے مخاصمانہ طریقے کو چھوڑ کر آشتی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ ضرور اسلام ہی ہو سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لئے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ توریت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے اور جو امور فی الواقع دونوں مذہبوں میں مابہ الاجتماع یا مابہ الافتراق ہیں ان کو اپنی اپنی جگہ صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح وہ بیگانگی اور وحشت جو دونوں

قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے ، رفع ہو جائے سید احمد خاں پہلے شخص ہیں جن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ، مگر چونکہ اس کا پورا کرنا بغیر قوم کی تائید کے ان کی طاقت اور بوتے سے باہر تھا اس لئے وہ اپنے منصوبے کو پورا نہ کر سکے ۔ مگر جو نمونہ ان کے زبردست ہاتھوں سے تیار ہو گیا ہے ، اس کے موافق اس تفسیر کا پورا کرنا اب ویسا مشکل نہیں رہا جیسا ابتدا میں نظر آتا تھا ۔

جان میولس آرنلڈ نے اپنی کتاب قرآن اینڈ بائیبل مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں سرسید کی ایک چٹھی چھاپی ہے جو انہوں نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد کے متعلق مصنف موصوف کی چٹھی کے جواب میں ان کے پاس بھیجی تھی ۔ چونکہ اس چٹھی سے تفسیر مذکور کے لکھنے کا اصل منشا اور اس کی نسبت مسلمانوں اور عیسائیوں کے خیالات جو اس وقت تھے اور خود سرسید کا اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنا اور لوگوں کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کرنا بخوبی واضح ہوتا ہے ، اس لئے یہاں اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔

وہ جان میولسن آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ "بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی ۔ خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آباؤ اجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا ۔ مگر جو امر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بے کار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے اس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑے اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل بُرے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا"

"جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ بآسانی یہ خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیل مقدس کی تفسیر لکھنا ، اس کی تائید کرنا اور اس کو آسمانی کتاب ماننا ہو تو اس کی حالت اور منزلت اس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہوگی ؟ بلاشبہ اس سے سب لوگ متنفر ہوں گے اور اس کو بُرا کہیں گے ۔ یہی حالت میری ہوئی ۔ اس کام کے شروع میں میرے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہوا ۔ مگر میں نے ان کی بے جا تضحیک بے بنیاد دھمکیوں اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اس بات کے کہنے میں جس کو میں حق سمجھتا تھا کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا ۔ جو انعام کہ مجھ کو عیسائیوں سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس

سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھ کو دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا اوّل حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہوگیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآن پاک اور دیگر مستند کتابوں کی بنا پر تھا۔ بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیلِ مقدس پر اعتقاد رکھنے اور اس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہوگئے اور بہت سے توہمات اور خیالاتِ فاسدہ جو ان کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہوگئے۔ جیسا کہ آپ کو ذیل کے فقرات سے معلوم ہوگا کہ جن کو میں ایک بڑے مولوی[1] کے خط سے، جو میرے نام تھا نقل کرتا ہوں :- میں نے آپ کی تفسیر کو پڑھا اور میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ بلاشک وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانے میں آپ ایک ایسے شخص ہیں جو راہِ راست کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ کی تصنیف ہر سر شیفہ کو پڑھی جاتی ہے۔ اور اس کے قابلِ تعریف فقروں کو پڑھنے سے خدا کا شکر اور آپ کے واسطے دعا دل سے نکلتی ہے۔"

"بائیبل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اس سے بہت بد اعتقاد ہوگئے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کی طرف مصر میں جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا۔ عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں لکھی۔ لیکن میں برخلاف ان کے کہتا ہوں کہ خود بائیبل سے ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں۔ اس بنا پر مجھ کو امید ہے کہ میری تفسیر کا دوسرا حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کا تعصب بائیبل کے ساتھ بہت کم ہو جائے گا"[2]۔

بایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے کہ میں انجیل میں اس مسئلے کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہبِ اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لئے مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش

---

[1] غالباً یہ خط مولانا محمد فصیح مرحوم غازی پوری یا مولوی تراب علی مرحوم کا تھا۔

[2] اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کام سرسید نے اس تفسیر لکھنے کے بعد عام مسلمانوں کے جہالات کے برخلاف کئے وہ سب پہلے ہی ان کے مکنونِ خاطر تھے۔

کردں - میں حق پر ہوں اور اُس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے رُوبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش اُن چند رسالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی جو میں نے اِس باب میں لکھے ہیں اور جن کو اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نے آپ کے نام پر اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہے، جس کا قبول کرنا میری عزت افزائی کا باعث ہوگا۔ دوسرا حصہ جب تیار ہو جائے گا آپ کی خدمت میں ارسال ہوگا۔"

"یقیناً میں بھی بائیبل کا اُتنا ہی طرفدار اور مؤید ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا قصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنسر د کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصّوں میں جب ان کا موقع آئے جواب دُوں۔"

جان میولسن آرنلڈ سر سید کی یہ چٹھی اپنی کتاب میں نقل کر کے اس پر یہ ریمارک کرتے ہیں کہ "اگر یہ خیالات عام ہو جائیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلتے جاتے ہیں تو ان کی وجہ سے وہ نہ صرف وفادار ہو جائیں گے بلکہ رفتہ رفتہ وہ دشمنی جو اسلام کے پھیلنے سے قوموں میں ہو گئی ہے دُور ہو جائے گی۔ یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے جیسا کہ اب تک خیال تھا، واجب التعظیم بیان کرتی ہے اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے۔ اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں، جس نگاہ سے وہ قرآن کو دیکھتے ہیں۔"

اس کے بعد جان میولسن آرنلڈ نے ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس پر بے انتہا ہنسی آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اگر یہ کام مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ انجیل صحیح ہے تو (نعوذ باللہ)، قرآن ضرور جھوٹا ہے۔" معلوم نہیں کہ یہ نتیجہ انہوں نے کہاں سے نکالا؟ اگر وہ ذرا غور اور امعانِ نظر کو کام فرماتے تو یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالتے بلکہ یہ کہتے کہ اگر انجیل اور قرآن میں مطابقت ثابت ہو گئی تو مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو موجودہ عیسائی مذہب بالکل غلط اور انجیل کے برخلاف ہے۔ سولہ برس کا عرصہ ہوا کہ مصر میں ایک عیسائی عالم نے جس کا نام کرسٹو فر جبارہ تھے اور جو وہاں کے مشہور عیسائی اخبار "شہادۃ الحق" کا ایڈیٹر ہے، مذاہبِ ثلاثہ یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی آسمانی کتابوں پر غور کر کے یہ رائے قرار دی تھی کہ فی الحقیقت

تینوں مذہبوں اور تینوں کتابوں کی توفیق اور تطبیق ہو سکتی ہے اور ان میں کوئی اصلی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام وحدۃ الادیان، و وحدۃ الایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن ہے۔ اس کتاب میں اس نے تینوں فرقوں کے مذہبی عقائد میں توفیق اور تطبیق کی ہے اور اس کی رائے ہے کہ عموماً اختلاف غلط فہمی سے ہوا ہے۔ اُس نے اِس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے، اس لئے عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ مسلمانوں کے عمدہ عقیدہ توحید کو نہ مانیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اور بائبل کی مطابقت کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب کا جس کی بنیاد تثلیث پر ہے بالکل خاتمہ ہو جائے۔

آج کل ایک اور اخبار موسوم بہ اتحادِ اسلامی موسیو کلافیل، ایک فرنچ بیرسٹر نے مصر میں جاری کیا ہے جس کا ایک کالم عربی میں اور دوسرا اسی مضمون کا فرنچ میں ہوتا ہے اور جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں جو مذہبی اور پولیٹیکل غلط فہمیاں مدت سے چلی آتی ہیں اور جنھوں نے ان کے سوشل اور پولیٹیکل تعلقات میں تلخی پیدا کر دی ہے ان کو رفع کیا جائے اور اسی لئے اس نے اخبارِ مذکور کو ایسی دو زبانوں میں شائع کیا ہے جو تقریباً دنیا کے تمام حصوں میں کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ پس جو ضرورت کہ اس فرانسیسی عالم کو اب محسوس ہوئی ہے اس کو سرسید نے ۳۵ برس پہلے ذہن نشین کر لیا تھا اور یہ بات ایک ہندوستانی مسلمان کیلئے جس نے ایک قدیم اسلامی دارالخلافہ کی سوسائٹی میں نشو و نما اور پرانے اسکول میں تعلیم پائی ہو کچھ کم تعجب انگیز نہیں۔

فرانس کا مشہور اورنٹیلسٹ گارساں دتاسی جس نے اردو لٹریچر کی تحقیقات میں عمر صرف کی تھی وہ ۱۸۶۳ء کے لیکچر میں سرسید کی اِس تفسیر کی بابت لکھتا ہے "ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں وہ سید احمد خاں کی تصنیف ہے جو زمانۂ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور مصنف ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جس کی کتاب آثار الصنادید کا میں نے پیرس کے ایشیاٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے اس کتاب (یعنی تبیین الکلام) کے عنقریب چھپنے کی پہلے خبر دی تھی اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا ہوں کہ اس کا پہلا حصہ چھپ گیا ہے جس کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے۔ جو مصنف نے مہربانی کر کے مجھے ہدیۃً بھیجی ہے اس کتاب سے صرف یہی نہیں سمجھا جاتا کہ سید

احمد خاں کو قرآن شریف اور ہماری کتبِ مقدسہ کا پورا پورا علم ہے بلکہ بہت سی ایشیائی تصنیفات اور طرفہ تر یہ کہ بہت سی یورپین تصانیف سے ان کو پوری پوری واقفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کو اُنھوں نے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ اس قدر یورپ کی تصانیف تک ان کو کس طرح رسائی حاصل ہوئی۔ حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے اور میں اپنے تئیں مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ کتاب اس زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی مبسوط اور مکمل بحث کی ہو۔"

بی بی کا انتقال

۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بی بی کا انتقال مراد آباد میں ہو گیا جنہوں نے سید حامد اور سید محمود دو بیٹے اور ایک بیٹی صغیر سن چھوڑی تھی۔ اُس وقت سرسید کی عمر چوالیس برس کی تھی۔ اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھے۔ ان کے دوست نہایت اصرار کرتے تھے کہ دوسری شادی کر لو اور نیز تقاضائے سن بھی یہی تھا۔ مگر جو تعلق کہ ان کو بی بی کے ساتھ ان کی زندگی میں تھا اس کے نباہ کا خیال اور صغیر سن اولاد کی پرورش کا خیال اور سب سے زیادہ وہ بڑے بڑے ارادے جن کی دھن اُس زمانے میں ان کو لگی ہوئی تھی اس امر سے مانع رہے اور اپنی تمام باقی زندگی محض تجرد میں کمال عفت و پارسائی کے ساتھ گزار دی اور اپنے تمام قویٰ اور اپنی عمر کا افضل ترین حصہ قومی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔

غازی پور کی بدلی اور اوّل وہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا

۱۲، مئی ۱۸۶۲ء کو سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ انتظام قحط کے بعد ان کو ایک بہت بڑا یتیم خانہ کھولنے کا خیال ہوا تھا اور قحط سے پہلے وہ متعدد تدبیریں ملک اور قوم کی بھلائی کی کر چکے تھے۔ مگر بہت جلد ان کے دل سے یہ سب خیالات محو ہو گئے۔ ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اُس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں۔ باوجودیکہ

؎ یہ شخص پیرس کی یونیورسٹی میں اردو لٹریچر کا پروفیسر تھا۔ اور ہمیشہ اسی سبجیکٹ پر لیکچر دیا کرتا تھا۔

وہ غازی پور میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبئین الکلام کی ترتیب اور اس کے چھپوانے کے اہتمام میں، جو نہایت سخت کام تھا، صرف کرتے تھے، اسی حالت میں انہوں نے ایک اور تدبیر اپنے ہموطنوں کی بھلائی کی سوچی۔ انہوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا۔ کیونکہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لئے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لئے جو اس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی جن اعلیٰ عہدوں کے لئے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملکۂ معظمہ کے اشتہار میں ان کے ملنے کی ہندوستانیوں کو امید دلائی گئی تھی، مگر ابھی تک عملی طور پر ان وعدوں کا چنداں ظہور نہیں ہوا تھا۔

سرسید کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے نفرت اور وحشت کرتے ہیں اور ہندو جو انگریزی تعلیم کو محض نوکری کے لئے ضروری سمجھتے ہیں دونوں کے دل میں انگریزی کا نقش جمانے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت ان کے دل میں پیدا ہو۔ اس کے علاوہ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور ربط و اتحاد پیدا ہو۔ جس کا نہ ہونا انگریزوں اور ہندوستانیوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہو چکا تھا اور یہ تمام مقصد بغیر اس کے کہ ایک علمی سوسائٹی قائم کی جائے جس کے ممبر انگریز اور ہندوستانی ہوں اور جو سائنس اور انگلش لٹریچر کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا سکے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۸۶۳ء میں انہوں نے ایک تحریر اس عنوان سے "التماس بخدمت ساکنانِ ہند در بابِ ترقیٔ تعلیم اہلِ ہند" چھاپ کر مشتہر کی جس کا خلاصۂ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے ایک مجلس مقرر کرنی چاہئے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ اس کے بعد وہ عملی طور پر لوگوں کو ادھر مائل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ غرض کہ اسی سنہ میں سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم ہو گئی۔ تمام قواعد منضبط کئے گئے۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے انہوں نے سوسائٹی کا پیٹرن ہونا منظور کیا اور ڈرمنڈ صاحب لیفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ صاحب

لیفٹننٹ گورنر پنجاب وائس پیٹرن قرار پائے اور دور دراز صوبوں کے بہت سے رئیس اور ذی عزّت ہندو اور مسلمانوں نے اس کی ممبری قبول کی اور غازی پور میں ترجمے کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔

سرسید نے جو اس سوسائٹی کے آنریری سیکرٹری قرار پائے تھے اور در حقیقت وہی اس کا ہیولیٰ اور وہی اس کی صورت تھے، سوسائٹی کے اغراض اور مقاصد مشتہر کرنے اور اس کے ساتھ پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کلکتے کا سفر اختیار کیا اور ۲۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مجلس مذاکرہ علمیہ میں ایک لمبا لیکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے مقاصد پر دیا۔ جو اُن کی اردو اسپیچوں اور لیکچروں کے ساتھ چھپ گیا ہے اور کلکتے سے آتے جاتے جس شہر میں ان کا گزر ہوا وہاں سوسائٹی کا چرچا کیا۔

غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا

اسی سنہ میں انھوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی فکر کی۔ اگرچہ ضلع غازی پور کے اکثر ہندو مسلمان رئیسوں کی خود یہ خواہش تھی کہ غازی پور میں ایک مدرسہ قائم ہو، لیکن اوّل تو کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ مدرسے کے انتظام اور حفاظتِ زرِ چندہ کی طرف سے لوگوں کو مطمئن کرے، دوسرے مسلمان عموماً انگریزی کے نام سے بدکتے تھے۔ سرسید نے ان دونوں مشکلوں کو حل کیا اور تھوڑا تھوڑا چندہ جمع ہونے لگا۔ اس مدرسے کی عمارت اور اس کے قیام کے لئے اسّی ہزار کا تخمینہ ہوا تھا۔ جب چندے کی مقدار سترہ ہزار ہوئی تو اوّل مدرسہ کے لئے ایک مکان بننا تجویز ہوا اور ۱۸۶۴ء میں ایک عام مجمع میں جس میں ہندوستانی اور تمام ضلع کے حکام شریک تھے اس کی بُنیاد کا پتھر رکھا گیا اور تعمیر شروع ہو گئی۔

اس موقع پر سرسید نے ایک لمبی اسپیچ دی تھی جو ان کی اسپیچوں اور لیکچروں کے ساتھ چھپ گئی ہے۔ یہاں ہم صرف وہ جملے جو بُنیاد کا پتھر رکھے جانے کے بعد ان کی زبان سے نکلے تھے نقل کرتے ہیں: "اے خدا کے بندو! خدا کی مناجات کرو، خدا کے نام کی مدح کرو۔ خدا کا نام اس دم سے ابد تک مبارک ہوئے۔ آفتاب کے مطلع سے لے کر اُس کے مغرب تک خدا کا نام ممدوح ہو۔ ہمارا خدا غریبوں کو خاک سے اٹھا لیتا ہے، محتاجوں کو کوڑے پر سے اٹھا کر بلند کرتا ہے۔ ہم کو اپنے خدا سے محبت رکھنی چاہیئے۔ اس نے ہماری آواز سنی، اس نے ہماری غریبی اور درماندگی پر نظر کی۔ سو جب تک ہم جیتے ہیں ہمارا بدن اور ہماری جان اور ہمارا دِل اور مرنے کے بعد ہماری رُوح خدا کی ستائش کرے گی۔

"اے خدا! ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ تو نے ہمارے دلوں

کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے۔ بیشک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے پھیرتا ہے۔ ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا جو صرف ہمارے ہی لئے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں ان کے لئے ایک روشنی ہے۔ تیرے سوا کسی کا مقدور نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا۔ اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پہ رکھا ہے تیری مخلوق کے فائدے کے لئے رکھا ہے تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے آغاز کیا ہے اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

یہ مدرسہ بھی مثل مدرسۃ العلوم کے محض قومی چندے سے سیلف ہیلپ کے اصول پر قائم کیا گیا تھا اور اس کی ابتدائی کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ایک بڑا کالج بنانے کا ارادہ تھا۔ راجہ ہردیو نرائن سنگھ اس کے وزٹر اور پیٹرن قرار دئے گئے تھے۔ متعدد کمیٹیاں اس کے انتظام کے لئے قرار پائی تھیں۔ انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا اس میں انتظام کیا گیا تھا۔ اگر سرسید کا وہاں چند سال اور قیام رہتا تو کچھ عجب نہیں کہ وہ کالج کے درجے تک پہنچ جاتا۔ مگر اسی سال یعنی ۱۸۶۴ء میں ان کی تبدیلی علی گڑھ کی ہوگئی۔ بایں ہمہ اس کی بنیاد ایسے مستحکم اصول پر رکھی گئی تھی کہ وہ مدرسہ آج تک وکٹوریہ اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اس میں برابر ہوتی ہے۔

غازی پور سے علی گڑھ میں تبدیل ہونا

۱۸۶۴ء میں سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ میں جس کی عزت اور شہرت خدا تعالیٰ نے ان کی ذات سے وابستہ کی تھی، آ گئے۔ چونکہ غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا اسلئے سوسائٹی کا تمام سامان اور سٹاف وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے اور مسٹر ولیم جنکسن بریلی جو اس زمانے میں علی گڑھ کے جج تھے سوسائٹی کے پریذیڈنٹ قرار پائے۔ ان کی توجہ سے سوسائٹی کے کاروبار کو نہایت ترقی ہوئی۔ ہندوستانی اور یورپین ممبروں کی تعداد بڑھ گئی اور سوسائٹی کے لئے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی جو اس وقت تک ایک عالیشان عمارت، دلکشا چمن اور وسیع احاطے کی صورت میں موجود ہے اور تقریباً بیس ہزار کی لاگت سے خاص سرسید کے زیر اہتمام

اور نگرانی میں تعمیر ہوا ہے۔ اس کی بنیاد کا پتھر آنریبل ڈرمنڈ لیفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کے ہاتھ سے رکھوایا گیا۔ چنانچہ دو کتبے ہز آنر اور مسٹر بریملی جج علیگڑھ کے نام کے اس کے سب سے بڑے ہال میں اب تک لگے ہوئے ہیں۔

۱۴۔ فروری ۱۸۶۶ء کو مسٹر ولیمس کمشنر میرٹھ کے ہاتھ سے اس کے افتتاح کی رسم ادا ہوئی۔ صاحب ممدوح نے افتتاح کے وقت جو تقریر کی تھی اس کے چند جملے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ: "سید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ کام انہیں کا ہے اور وہی اس جلسے کے بڑی ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لئے ہم سب جمع ہوئے ہیں، وہی بانی ہیں۔ اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اس کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب ان کی مدد کریں اور ان کا شکریہ بھی ادا کریں۔ اے خدا اس انسٹیٹیوٹ کو سرسبز کر۔"

اس مکان میں ہر مہینے متعدد جلسے ہوتے تھے اور مختلف مضامین پر جن سے لوگوں کو نئی نئی اطلاعیں حاصل ہوتی تھیں لیکچر دئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لیکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔ مترجم، مولوی، پریس مین، چپراسی اور مالی وغیرہ تقریباً پانچ سو روپے ماہوار کے تنخواہ دار سوسائٹی میں ملازم تھے۔[۱] چند برس کے عرصے میں بہت سی مفید کتابیں سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کر کے چھاپیں مثلاً الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رولن کی تاریخ مصر قدیم، تاریخ یونان قدیم، اسکاٹ برن کا رسالہ علم فلاحت، ہیبئیر کا رسالہ سیاست مدن، سرجان میلکم کی تاریخ ایران، ریورنڈ ایکسوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ وغیرہ۔ اس کے سوا اخبار بھی مدت تک بہت کثرت سے اس سوسائٹی میں آتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں اٹھارہ اخبار

---

[۱] عملۂ ترجمہ ۲۴۵ روپے ماہوار اور عملۂ مطبع ۲۲۴ روپے ماہوار پاتا تھا اور درستی و انتظام مکان سوسائٹی کے لئے ۱۰ روپے ماہوار مقرر تھا (سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۳۔ ستمبر ۱۸۶۷ء۔ جلد ۲)

اور بیگزین اور پچیس اخبار اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کے ہندوستان اور ممالکِ غیر سے یہاں آتے تھے۔

سرسید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقت سوسائٹی کا دارو مدار تھا، علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے اور طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو انہوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیین الکلام کے چھاپنے کو خریدا تھا۔ اور سوسائٹی کی تمام روئدادیں اور تمام انگریزی و اردو کاغذات ابتدا سے اسی پریس میں چھپتے تھے۔ جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہوگئی، تو کل سامان پریس کا ایک عام جلسے میں سوسائٹی کو مفت دے دیا۔ چنانچہ جارج ہنری لارنس نے جو اس جلسے میں چیئرمین تھے، سرسید کی نسبت یہ الفاظ کہے کہ۔ "اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض تھا ہے مگر اب اس احسان کو اس عالی شان عطیے نے اور زیادہ کر دیا ہے۔" نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بھوپال نے جب یہ سنا کہ سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں انہوں نے بطورِ اظہارِ خوشنودی ایک الماس کی انگوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ خاص سرسید کے واسطے بھیجی، سرسید نے جلسۂ عام میں وہ انگوٹھی سوسائٹی کے اخراجات کے لئے سوسائٹی کو دے دی۔
اس کے سوا انھوں نے محض سوسائٹی کی امداد کے لئے کلکٹری اور فوجداری کے مختاروں کو قانون پر لیکچر دینا اختیار کیا۔ اور فیس جو اُن سے وصول ہوتی رہی وہ سوسائٹی کی نظر کرتے رہے۔

۳۰- دسمبر ۱۸۶۵ء کو انہوں نے سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ شمال مغرب میں یہ درخواست بھیجی کہ سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ اضلاعِ شمال مغرب کے طریقۂ کشت کاری پر کتابیں تالیف کرے۔ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرتی رہے تو سوسائٹی اس معاوضے میں کتابیں دیا کرے گی اور کتابوں کی تالیف کرنا سرسید نے خود اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی سے پانسو روپے سالانہ کی کتابیں خریدنی منظور کر لیں۔ مگر یہ کتابیں لکھی نہیں گئیں، صرف مضامین کی طولانی فہرست جو سرسید نے سوسائٹی میں پیش کی تھی وہ سوسائٹی اخبار کے پرچہ نمبر ۳۲ جلد اول میں درج ہے۔ اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا اور اگر سرسید اس کے سرانجام کرنے میں مصروف ہو جاتے تو ان کو مدت تک کسی اور کام کی فرصت نہ ملتی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے بہت سے رئیس ضلع علی گڑھ اور اس کے نواح کے اور چند یورپین افسر سوسائٹی کے مکان میں

جمع ہوئے اور سرسید نے ایک لمبی اسپیچ دی۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ "ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بڑی دِقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ اوف ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امور کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لئے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیئے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کر سکیں اور جس طرح اُن انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاعِ شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعے سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔"

اس تجویز کو تمام حاضرین نے پسند فرمایا اور اُسی وقت ذی معزز ہندو اور مسلمان اس کے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام "علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن" رکھا گیا۔

اس ایسوسی ایشن نے چند مفید کام جب تک کہ سرسید علی گڑھ میں رہے انجام دئے۔ مدّت تک اس کی خط وکتابت انگلستان کی ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے ساتھ رہی۔ اس نے گورنمنٹ ہند کو ایک نہایت مفصّل عرضداشت بھیج کر مسافرانِ ریل کی ان تکلیفوں کے تدارک کی طرف متوجہ کیا جو ابتدا میں ان کو حد سے زیادہ اُٹھانی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس عرضداشت پر بہت سی شکایتیں رفع کی گئیں۔ نیز اس نے گورنمنٹ کو اِس طرف توجّہ دلائی کہ جس قانون کی رُو سے کتابوں کی روانگی کا محصول دوچند کیا گیا ہے، اس سے ہندوستان کی علمی ترقی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اس لئے ایک آنہ فی دس تولہ محصول جو بک پیکٹوں پر لیا جاتا ہے بجائے اس کے آدھ آنہ فی دس تولہ مقرر کیا جائے۔ اسی طرح بعض اور مفید تحریکیں اس کی طرف سے ہوئیں۔ مگر ۱۸۶۷ء میں جب سرسید کی تبدیلی بنارس کو ہوگئی اُسی وقت اس ایسوسی ایشن کا خاتمہ ہوگیا۔

اضلاعِ شمال مغرب میں کمیٹیاں قائم ہوئی

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید کی تحریک سے زمینداران علی گڑھ نے ایک درخواست گورنمنٹ میں بھیجی کہ جب کہ علاوہ جمع مال گزاری کے ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم کے ہم سے لیا جاتا ہے تو قرین انصاف یہ ہے کہ انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکامِ ضلع اور افسرانِ سررشتۂ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں۔ نواب لیفٹننٹ گورنر نے اوّل امتحاناً ضلع علی گڑھ اور اٹاوہ میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر ہونا منظور کیا اور آخرکار تمام اضلاعِ شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر ہو گئیں۔

پھر جب معلوم ہوا کہ کمیٹی میں ہندوستانی ممبروں کا عدم اور وجود برابر ہے اور یورپین حاکموں اور افسروں کے سامنے وہ آزادی اور دلیری سے کہیں ان کے خلاف دم نہیں مار سکتے تو ۱۸۷۲ء میں سرسید نے ایک یادداشت لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "جس غرض سے کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ ان کے قیام سے پوری نہیں ہوئی۔ کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں۔ جن کو شکست دینا وہ اپنا قدرتی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں ان موم کی مورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میڈم ٹساڈ کی نمائش گاہ میں تھیں۔"

اگرچہ ۱۸۸۳ء میں ایجوکیشنل کمیٹیوں کے قواعد ترمیم ہو کر از سر نو جاری کئے گئے مگر چونکہ ان سے بھی ہندوستانیوں کی مداخلت کو کچھ وسعت نہ ہوئی تو سرسید نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے ان شکایتوں کا پھر اعادہ کیا اور کہا کہ جن مقاصد کے واسطے کمیٹیوں کے تقرر کی ضرورت تھی وہ حاصل نہیں ہوئے اور اپنی رائے کے موافق کمیشن میں بہت سی ایسی اصلاحیں پیش کیں جن سے ورنیکلر تعلیم کے موجودہ انتظام کی اصلاح کی جا سکے۔

سائنٹی فک سوسائٹی سے اخبار نکالنا

۱۸۶۶ء میں سرسید نے سائنٹی فک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ان کے اخیر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا پھر ہفتے میں دوبارہ نکلنے لگا۔ اِس اخبار کا اڈیٹوریل اہتمام ابتدا سے اخیر تک سوائے اُن ایام کے جب کہ سرسید علی گڑھ میں نہیں رہے انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بہ سبب اس کے کہ مدرسے کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا ان کو اس میں کسی بڑے آرٹیکل کا موقع کم ملتا تھا مگر تعلیم کے متعلق یا خاص اپنے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی

مہتم بالشان واقعہ پیش آتا تھا اور وہ ہمیشہ اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ۔

اوّل اوّل سرسید زیادہ تر اس میں پولٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے اس لئے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے ۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے ۔ اس لئے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے ۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا ۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے ۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آج تک کوئی پرچہ ہندوستان میں اس اخبار کے سوا ایسا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں

اس میں سوشل ، اخلاقی ، علمی اور پولٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے ۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ ان لیڈنگ آرٹیکلوں کے جو وہ خود لکھتے تھے انگریزی اخبارات سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملاتِ ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے ۔ ہندوستان کے طریقِ معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لیکچر سوسائٹی میں دیئے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے ۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اوّل اوّل کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی پولٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی دیسی اخبار نے حاصل نہیں کیا ۔

جو ماٹو اس نے اپنے لئے اختیار کیا تھا اس کو ہمیشہ اپنا نصب العین رکھا ۔ وہ ہمیشہ نہایت

کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا اور اس کی خیر خواہی اور وفاداری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ اس کی آواز ہمارے عام دیسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی۔ بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اس کی آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اس کو غور سے سنا جاتا تھا۔ اور اس کا سبب اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ اس کا لکھنے والا اور اہتمام کرنے والا سید احمد خاں تھا۔ گورنمنٹ اور حکام اس بات کو تسلیم کئے ہوئے تھے کہ علی گڑھ کا اخبار تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور سمجھدار مسلمانوں کے خیالات کا آرگن ہے۔ کتاب "پِلرز آف دی انڈین ایمپائر" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خاص موقع پر لکھتا ہے کہ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے دو سال کے مضامین جمع کئے جائیں تو ہندوستان کے معزز مسلمانوں کی رائے کا اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں ایک عجیب اور مفید مجموعہ نسبت جنگ روم و رُوس اور رُوس و افغانستان اور رُوس و ہندوستان کے بن جائے گا۔" اسی کتاب میں علی گڑھ گزٹ کی وقعت اور اعتبار کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "علی گڑھ گزٹ جس کے ایڈیٹر سید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے۔" اس کے بعد اخبار کے بعض مضامین کا خلاصہ لکھ کر خاص مُلکی معاملات پر مسلمانوں کی رائے کا موازنہ کیا ہے۔

جس قدر مضامین ۱۸۶۶ء سے اخیر تک اس اخبار میں خاص سرسید کے قلم سے لکھے ہوئے نکلے اگر ان کو ایک جگہ فراہم کیا جائے تو بلا مبالغہ چند ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھیراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنی طرزِ تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دل آزاری روا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لئے جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی غیر قوم کے عہدہ دار کی ترقی سے ناراضی یا ناخوشی ظاہر نہیں کی۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہل کاروں پر زہر نہیں اگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔ وہ جس طرح اپنی

قوم کے اکابر اور نامور لوگوں کے مرنے پر افسوس کرتا رہا اسی طرح غیر قوموں کے مشہور اور نامور لوگوں کی وفات پر ہمیشہ اس میں دردناک اور افسوس ناک مضامین نکلتے رہے۔ باوجودیکہ وہ گورنمنٹ اور اس کے مدبروں پر اکثر نکتہ چینی کرتا تھا۔ مگر اعتدال اور ادب اور تہذیب کو جو ایک محکوم قوم کا زیور ہے اس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اس نے برخلاف اپنے ہمعصروں کے جن کی زبان درازی سے اوّل لارڈ لٹن کے زمانے میں اور اب لارڈ ایلگن کے عہد میں ان کی آزادی چھین لی گئی، اپنے معتدل رویے سے سب پر ظاہر کر دیا کہ سچی آزادی اپنی آزادی کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھتا ہے نہ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت اس کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھتا۔

ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اس کی باقاعدگی، جو اکثر دیسی اخباروں میں مفقود ہے اور اس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بے اصل قصوں اور بے سروپا خبروں سے مبرا دیکھا گیا۔ اس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔ کبھی کوئی خبر کسی نامعتبر کاغذ سے (الاماشاءاللہ) اس میں نہیں لی گئی۔ دنیا کے ہر ایک بڑے واقعہ کی نسبت شروع سے اخیر تک اس میں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار درج ہوتی تھیں جن سے اس واقعہ کی ایک مختصر ہسٹری بقید تاریخ مرتب ہو سکتی تھی۔ اس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ تینتیس برس برابر جاری رہا۔ اس عرصے میں شاید ہی کوئی نمبر ایسا ہو گا جو اپنی تاریخِ معین پر نہ نکلا ہو۔ باوجودیکہ چندے کی آمدنی سوسائٹی میں مدت سے بالکل نہیں رہی تھی اور اس لئے پچھلے برسوں میں وہ کئی ہزار کی مقروض ہو گئی تھی۔ مگر سرسید نے جس طرح ہو سکا اخبار کو کبھی بند ہونے نہیں دیا۔

بنارس کی تبدیلی

۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید عہدہ جج اسمال کاز کورٹ پر ترقی پا کر علی گڑھ سے بنارس چلے گئے یہاں سے چلتے وقت وہ تمام کاروبار سوسائٹی کے راجہ جیکشن داس سی۔ ایس۔ آئی کو کہ وہ اس وقت علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کر گئے انہوں نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے سوسائٹی کے کام انجام دئے اور سوسائٹی کی جو عمارتیں سرسیّد کے زمانے میں پوری نہیں ہوئی تھیں اُن کو پورا کیا۔

سرسید بنارس میں بھی سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ کو برابر تقویت دیتے رہے اور ان کے مفید آرٹیکل اور مضامین اسی طرح سوسائٹی کے اخبار میں برابر چھپتے رہے۔ اگرچہ سرسید کا تعلق ملازمت

کے اخیر زمانے یعنی جولائی ۱۸۶۷ء تک بنارس کے ساتھ رہا، لیکن چونکہ وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت چلے گئے، اس لئے پہلی بار بنارس میں ان کا قیام ایک برس اور ساڑھے سات مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔ ان کے اس قلیل زمانے کے بھی چند کام قابلِ ذکر ہیں۔

ورنیکلر یونیورسٹی کے لئے تحریک

یکم اگست ۱۸۶۷ء کو جب کہ سرسید علی گڑھ ہی میں تھے انہوں نے ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاعِ شمال مغرب کی طرف سے وائسرائے و گورنر جنرل کشورِ ہند کی خدمت میں بھیجی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا (۱) یہ کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے (۲) یہ کہ دیسی زبان میں انہیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں (۳) جو سندیں انگریزی خوان طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بموجب تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں وہی سندیں اُن طلبا کو عطا ہوا کریں جو انہیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں (۴) یہ کہ یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمال مغربی اضلاع میں ایک جُدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ انجام دے گی۔

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے بڑی توجہ ظاہر کی۔ چنانچہ جو چٹھی سکریٹری گورنمنٹ ہند کی مؤرخہ ۵۔ ستمبر ۱۸۶۷ء سرسید کے نام بمقام بنارس موصول ہوئی اُس میں لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل اور تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے ان تمام کوششوں کی قدر کریں گی جو ایسی سوسائٹیاں جیسی کہ آپ کی ہے یا خاص خاص آدمی اس مقصد (یعنی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے) کو ترقی دینے کے لئے کریں گے جو آپ کی سوسائٹی کو اور گورنمنٹ کو برابر منظور رہے۔" اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ ہو جائیں بلکہ علوم وفنون کے وسیع دائرے میں طلبہ کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس مقصد کے لئے کافی ذخیرہ دیسی زبان میں اب تک موجود نہیں ہے اس لئے کچھ عرصے تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعے سے یہ بات حاصل کرنی ہوگی۔ اسی

چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل ان تدبیروں سے خاص طور پر رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو علی گڑھ کی سائنٹیفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو دیسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے اختیار کی ہیں۔

اس چٹھی کے آنے سے بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی جن میں تین نامور آدمی دلی کے بھی تھے۔ ماسٹر پیارے لال، مولوی ذکار اللہ اور پنڈت دھرم نارائن اور جب ان لوگوں کی آمادگی گورنمنٹ ہند کو معلوم ہوئی تو اس نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی۔ اس کے بعد وزیر ہند کی چٹھی مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۶۸ء بنام گورنر جنرل کشور ہند صادر ہوئی جس میں ایسوسی ایشن کی تجویزوں سے پسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کا چرچا شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں بہت پھیل گیا تھا اور وہ لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپریل ۱۸۶۸ء میں اسی یونیورسٹی کے متعلق دہلی سوسائٹی میں جب کہ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب بھی وہاں موجود تھے، ایک مباحثہ ہوا اور گورنمنٹ پنجاب میں اس مضمون کا ایک میموریل بھیجا گیا کہ "یہ یونیورسٹی لاہور میں اور ترجمہ کرنے اور کتابیں بنانے کے لئے ایک کمیٹی دہلی میں قائم کی جائے اور اگر دونوں صوبوں کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے تو اس کا مقام دلی ہونا چاہیے۔

اوّل اوّل سرسید بہت سرگرمی کے ساتھ اپنی عادت کے موافق اس یونیورسٹی کے قیام کی تدبیروں میں مصروف رہے۔ گورنمنٹ ہند میں انھوں نے اطلاع دی کہ ترجمہ کا بوجھ سوسائٹی اپنے اوپر گوارا کرتی ہے مگر گورنمنٹ سے یہ درخواست کرتی ہے کہ جو روپیہ وہ اشاعت تعلیم کی غرض سے ہندوستان میں خرچ کرتی ہے اس میں سے اگر کسی قدر مناسب ہوا کرے تو سوسائٹی کی اعانت اور تقویت کرے یہ بھی لکھا کہ سوسائٹی صرف یونیورسٹی کے کورس کا ترجمہ نہیں بلکہ علوم و فنون کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتی ہے اور امید ہے کہ اگر کاپی رائٹ کا ایکٹ ۲۰، ۱۸۴۷ء سوسائٹی کے مقصد میں حارج ہو تو اس قانون کی ترمیم کی جائے اور اگر نہ ہو تو اس کی تشریح کی جائے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا۔ اور انگریزی کو صرف بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ سرسید نے بنارس

انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں جو اِسی معاملے پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ "مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاعِ شمال مغرب، نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھلائی جائے۔ بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اس کے ساتھ ایک اور سررشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعہ سے بکثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں۔ پس یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو۔" اس کے بعد اپریل ۱۸۶۹ء میں جب کہ نواب لیفٹننٹ گورنر بھی بنارس انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھے سرسید نے پھر اسی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑہا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے۔"

غالباً زیادہ تر اِسی وجہ سے کہ گورنمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا، سرسید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہوگا۔ مگر اس کے سوا خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ سرسید نے اسی باب میں جب مسٹر پیرسن انسپکٹر مدارس حلقۂ راولپنڈی سے رائے دریافت کی تو انہوں نے اِس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں۔ اِس تحریر سے ضرور اُن کے ارادہ میں تزلزل واقع ہوا ہوگا۔ پھر انہیں دنوں میں ان کو سفرِ انگلستان کا خیال پیدا ہوگیا۔ جس میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں اور ان کا حل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ اِن وجوہ سے سرسید اور اُن کے ساتھ جتنے آمین کہنے والے تھے سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔ جو موانع اِس یونیورسٹی کے قائم ہونے میں پیش آئے اگر ان میں سے کوئی امر پیش نہ آتا تو بھی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی تھی۔ ہندوستانیوں کے اختلافات ضرور اس میں رخنہ ڈالتے۔ دہلی سوسائٹی کے ممبر یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا مقام دلی ہونا چاہیئے اور سائنٹی فک سوسائٹی اور بنارس اِنسٹی ٹیوٹ کی ضرور یہ خواہش ہوتی کہ اس کا مقام شمال مغربی اضلاع کا کوئی شہر ہو۔ اس کے سوا اردو زبان کے

مخالفوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کردی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لئے اردو زبان اور ہندوؤں کے لئے ہندی زبان مخصوص کی جائے۔ ا در باوجود تسلیم کرنے اس بات کے کہ ہندی زبان سرِدست ترجمے کی قابلیت نہیں رکھتی، اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اس کی ترقی میں کوشش کرکے اس کو ترجمے کے لائق بنایا جائے۔ اگر یہ اصرار زیادہ بڑھتا اور ضرور بڑھتا تو گورنمنٹ آخر کار یہ ضرور فیصلہ کرتی کہ کیوں اندھا نیوتا دے اور کیوں دو بلائے۔

سوسائٹی کی امداد کی ایک خاص تدبیر

۱۸۶۷ء میں سرسید بتقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علی گڑھ میں آئے اور ضلع علی گڑھ کے زمینداروں پر اس بات کا اظہار کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے اور اس کی شرائط واجب العرض میں بوقت بندوبست کے درج ہو جائیں تاکہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے وارثوں میں سے کوئی عذر نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کے جلسے میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع اُن کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کرکے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعے سے روانہ کر دئے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۷ء بنام سرسید کے موصول ہوئی اس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔

ہومیوپیتھک علاج کی حمایت

غالباً بنارس ہی میں پہنچ کر اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقے سے بہتر کوئی طریقہ علاج کا فائدہ اور بے خطر نہیں ہے اور جیسا کہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو تجویز ملک کے لئے مفید سمجھی اس کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، انھوں نے ہومیوپیتھک

علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا اسی ۱۸۶۷ء میں انہوں نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور ہندوستانیوں کو اس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریذیڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکریٹری سرسید قرار پائے اور کمیٹی کی تجویز سے ۲۵ ستمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں ایک شفاخانہ بنام "ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہوسپٹل" کھولا گیا۔ سرسید نے ہر طریقے سے جو اُن کے اختیار میں تھا لوگوں کو اس ڈسپنسری کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے بعضے اپنے دوستوں کو جو کسی مرض مزمن میں مبتلا تھے بنارس میں بلانے کے لئے خط لکھے اور جو وہاں نہ پہنچ سکے ان کے لئے دوائیں بھجوائیں۔ اس طرح اس شفاخانہ کا چرچہ چند دن میں نزدیک و دور ہو گیا۔ پائیونیر کے پرچہ مؤرخہ ۴ دسمبر ۱۸۶۷ء میں اس شفاخانہ کی نسبت یہ چھپا تھا کہ "پہلے ہی مہینے میں پانسو سولہ بیمار معالجے کے لئے ہوسپٹل میں آئے۔ حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقہ علاج سے مطلق واقف نہ تھا۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۶۷ء کو سرسید نے ایک طول طویل لیکچر ہومیوپیتھک طبابت کی تاریخ اور اس کے اصول پر اور اس بات پر کہ یہ طریقۂ علاج تمام طریقوں سے زیادہ مفید اور بے خطر ہے کمیٹی کے عام جلسے میں دیا اور ۱۸۶۸ء میں ایک رسالہ ہیضے کے علاج پر موجب اصول ہومیوپیتھک کے لکھا۔ یہ لیکچر اور یہ رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت

سرسید ہمیشہ سے جیسا کہ اُن کی مذکورہ بالا ملکی خدمات سے ظاہر ہوتا ہے اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے مل جل کر رہیں کسی طرح ممکن نہیں۔ چنانچہ اُن کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔

انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مستفید ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا ان کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقے پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی بُرائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں، دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔ اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت

اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے وہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی نہ رہے اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ تمام ہندوستان میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا۔ جو عزت اور جاہ و منصب اور امورِ سلطنت میں شرکت، تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی، مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے اور واقعہ ۱۸۵۷ء نے ان کو اور بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غالب پارٹی اپنے اقتدار کا، جو اُس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ اور اُمنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اسی بہانے سے کہ دریا میں خاک کیوں اڑاتے ہو اس سے دست و گریباں ہو جائے۔ اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی اور فارسی کے صرف کسی قدر اسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی

کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

غرضکہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لئے کمیٹیاں مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں قائم تھیں۔

یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ انھیں دنوں میں لیفٹیننٹ گورنر بنگال بھاگلپور کی سائنٹیفک سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرف سے ان کو ایڈریس ایسی اردو میں دیا گیا جس میں عبارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل کئے گئے تھے اور اس کا سمجھنا ایک ایسے یورپین حاکم کو جو ہمیشہ بنگالہ میں رہا ہو آسان نہ تھا۔ بہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس طرح بنگالہ میں بنگلہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہو گیا ہے اسی طرح صوبۂ بہار میں بہاری زبان اور کیتھی حرف جاری کئے جائیں۔ چونکہ ہز آنر ایڈریس کے بہت کم الفاظ سمجھے تھے۔ انہوں نے کہا جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا ہے یہ ہرگز ملکی زبان نہیں ہے اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انہوں نے چند روز بعد حکم دے دیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتھی حروف اور جو زبان کیتھی حرفوں میں لکھی جاتی ہے جاری ہو۔ ہرچند مسلمانوں نے اور بہت سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی رہے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور ان کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہونے لگیں۔ الہ آباد کی صدر مجلس میں چند جلسے اس مسئلے کی تحریک کے لئے منعقد ہوئے۔ اور آخر کار مجلس کے سکریٹری بابو سرودا پرشاد سنڈیال نے اس باب میں سرسید سے خط و کتابت شروع

کی سکریٹری کی متعدد چھٹیاں آئیں اور سرسید بطور اختلاف رائے کے ہر ایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشتہر ہوتا رہا۔ آخر سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل شائع کئے۔ الہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر بے شمار ہندوؤں کے دستخط تھے گورنمنٹ میں بھیجیں۔ سُنا گیا ہے کہ مسٹر کیمسن ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی مگر کمیٹی کو کامیابی نہ ہوئی اور غالباً سرجان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اِس بنا پر نامنظور ہوگئی کہ فارسی خط اور اردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ تھی۔

۱۸۸۲ء میں جب کہ سرسید وائسرائے کی لیجسلیٹیو کونسل میں ممبر تھے ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کئے گئے۔ چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایتِ اردو قائم کی۔ اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجے۔ مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقے سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کی مصالحِ ملکی وابستہ ہیں۔ پس اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دُنیا سے رحلت کی حضور مسر انیٹونی میکڈانل لیفٹننٹ گورنر اضلاعِ شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک بار میموریل اس غرض سے گزرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب ایک سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقشِ دیوار بن گئے تھے، مگر اسی حالت میں انہوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد

ہیں اردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے۔ اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے، اس لئے وہ اپنے ہندو دوستوں کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ جس طرح وہ ہندوستانیوں کے انگریزی لباس اور انگریزی طرزِ معیشت پر انگریزوں کے اعتراضات کو ہمیشہ ان کی تنگ دلی اور غرور پر محمول کرتے تھے اور کبھی ان کے اعتراضوں کا جواب دینے سے نہ چوکتے تھے، اسی طرح انہوں نے اردو زبان کی مخالفت پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو ادا کئے بغیر نہیں رہے۔ وہ اپنے آرٹکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ غالباً اس وقت ان کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبے کے ہز آنر لیفٹننٹ گورنر بہادر اس زمانے میں جب کہ صوبۂ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بعوض اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ اور معاون اس تجویز کے تھے پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پرانے مردہ مضمون کے اٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظرِ عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے میموریل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح پر دلیلیں پیش کیں۔ اگرچہ اس وقت ہز آنر نے کورٹ کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مگر جو کچھ انہوں نے میموریل کے جواب میں فرمایا اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ آئندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔ چنانچہ سرسید کے انتقال کے بعد اپریل سنہ ۱۹۰۰ء میں وہ مشہور ریزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر انٹونی میکڈانل کا عہدِ حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا۔

اس بات کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں بہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے، مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں اردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں۔ خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اور اسی بنا پر ۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تامل بھی ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہے۔ یہ صوبہ ان دو شہروں سے گھرا ہوا ہے۔ جو

اردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں یعنی دلی اور لکھنؤ۔ اس صوبے کے ہندو عموماً اردو سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرتِ تعصب وہ ذاتِ شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ "من بجہنم لیکن تختۂ یاراں تباہ گردد"۔ فرانس کے مشہور اورنیٹلسٹ گارساں دتاسی جنھوں نے اردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اسی متنازعہ فیہ مسئلے کی نسبت اپنے ایک لیکچر میں لکھتے ہیں کہ "ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے"۔ اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوالِ سلطنت کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن ہم کو اطمینان رکھنا چاہئے۔ کیونکہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے وہی آگے چل کر ان کو یہ سبق دے گی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔

رسالہ احکامِ طعامِ اہلِ کتاب

۱۸۶۶ء میں سرسید کے پاس ایک سوال بطور استفتا کے آیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو، کھانا پینا درست ہے؟ یا نہیں؟ سرسید نے اس کا جواب آیات و احادیث کے حوالے سے لکھ کر دیا کہ جائز ہے اور ہندوستان کے سوا تمام دنیا کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ یہ جواب ۱۴ ستمبر ۱۸۶۶ء کے سوسائٹی کے اخبار میں چھپا۔ اس پر ایک سید صاحب نے ایڈیٹر کے نام لکھنؤ سے ایک چٹھی لکھی اور سرسید کے جواب پر نہایت خوشی ظاہر کی۔ اور لکھا کہ "میں اس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا"۔ اس کے جواب میں سرسید نے لکھا کہ "میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہبِ معلومہ سے اعلیٰ، عمدہ اور سچا یقین کیا ہے اور اسی سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ اور ہو اور کرتا کچھ اور ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ اس لئے

میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سؤر یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ تامل نہیں کرتا۔ میرے انگریز دوست میرے ہاں مہمان ہوتے ہیں اور میں اُن کے ہاں مہمان ہوتا ہوں اور ہم اور وہ ایک میز اور ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ جس چیز پر ہم کو خدا سے شرم نہیں اس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے سے بہت پہلے سرسید نے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا پرہیز چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ "بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے۔ رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اُترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے؟ میں نے کہا یہاں چائے کہاں؟ انہوں نے کہا ہمارے ساتھ بوتل میں بنی ہوئی موجود ہے۔ میں نے کہا بہت بہتر۔ غرضکہ ہم نے چاہ پی اور ایک آدھ توس کھایا۔ وہاں سے چل کر نگینہ میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے، میں بھی جا کر جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار سے جو نماز میں شریک تھے پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں۔ پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان کو سمجھایا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور ان کے ساتھ کھانا درست ہے۔ اُن لوگوں نے میری اس روز کی تقریر کو نہایت تعجب سے سُنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم بھی کھانا یہیں کھا لو اور خانساماں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا۔"

اگرچہ سرسید انگریزوں کے ساتھ مدت سے کھانے پینے لگے تھے لیکن ابھی تک اُن کو مسلمانوں میں اس خیال کے زیادہ پھیلانے کا کچھ خیال نہیں تھا۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ رسم و رواج کی قیدیں ایک آدمی کے اٹھا دینے سے نہیں اٹھتیں اور مسلمانوں کا انگریزوں سے خوف اور وحشت کرنا اور انگریزوں کا مسلمانوں سے بدگمان اور متنفر ہونا اس وقت تک موقوف نہ ہوگا جب تک کہ دونوں قوموں میں میل جول اور ربط و ضبط نہ ہو اور ہر ایک قوم کو دوسری قوم کے اصلی خیالات بلا واسطہ

معلوم کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس لئے انھوں نے ایک بسوط اور مفصل تحریر ۱۸۶۸ء میں بنام "رسالہ احکام طعامِ اہلِ کتاب" بنارس میں لکھ کر شائع کی جس میں آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی اور روایاتِ فقہی سے اور خاص کر شاہ عبدالعزیز کے فتوے جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود ان کے ساتھ انہیں کے ہاتھ کا پکا ہوا انہیں کے برتنوں میں اور انہیں کا ذبیحہ جس طرح کہ انھوں نے کیا ہو کھانا درست ہے، صرف سؤر اور شراب حرام ہے۔

اس رسالہ میں ان تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علمائے اسلام مواکلتِ اہلِ کتاب پر کرتے تھے اور جن شبہات کی وجہ سے مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں کی ہر ایک کھانے پینے کی چیز اور ان کے ساتھ کھانے پینے سے اجتناب تھا، نہایت شافی طور پر جو ایک منصف مزاج آدمی کی تسلی کے لئے کافی و وافی ہے، لکھا ہے۔ جب یہ رسالہ چھپا تو اول اوّل بہت شور و غل ہوا۔ سرسید کو کرشان کہا گیا۔ اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کیا گیا۔ ان کے رسالہ کے جواب لکھے گئے۔ بعضوں نے اس باب میں کوشش کی کہ سرسید کے ساتھ سب مسلمان کھانا پینا چھوڑ دیں۔ مگر بقول سرسید کے وہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک بگولا اٹھا اور خاک اڑا کر چلا گیا پھر مطلع صاف ہو گیا۔ اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے ہاں جا کر اور ان کو اپنے ہاں بلا کر ساتھ کھانے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تقوی اور طہارت پر بدستور قائم ہیں۔

چوتھا باب

سنہ ۱۸۶۹ء سے سنہ ۱۸۷۰ء تک

سفرِ انگلستان، سفرنامہ، لندن کے عمائد سے ملنا، جلسۂ سنٹونین سوسائٹی آف سول انجینرس میں شریک ہونا۔ سی، ایس، آئی کا خطاب اور تمغا ملنا، ملکۂ معظمہ کی لیوی میں شریک ہونا، پرنس آف ویلز کی لیوی میں بلایا جانا، ایتھینیم کلب کی ممبری، کیمبرج یونیورسٹی میں جا کر وہاں کے طریقۂ تعلیم و تربیت پر غور کرنا، تعلیم ہندوستان پر پمفلٹ لکھنا، خطباتِ احمدیہ لکھ کر شائع کرنا۔ جان ڈیون پورٹ کی کتاب چھپوا کر شائع کرنا۔

سر سید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ بہبودی کے لئے ضروری سمجھا تھا ان کے لئے انگلستان کا سفر کرنا ضروری تھا۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہوگا۔ اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک ان دونوں تدبیروں میں برابر سرگرم رہے مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے ان کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے کے لئے جس کا اُن کو حد سے زیادہ خیال تھا بہت سی ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں اور صرف برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں مل سکتی ہیں مگر اس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا۔ اوّل تو ایک ایسا شخص جس کی آمدنی ہمیشہ خرچ سے شرمندہ رہے اس کو ولایت جانا اور وہاں جا کر اپنے تمام مقاصد پورے کرنے کے لئے ایک مدت تک قیام کرنا بہت مشکل تھا۔ پھر جیسا کہ آج کل ہندوستانی مسافروں کا انگلستان تک برابر تانتا بندھا ہوا ہے اس زمانہ میں یہ حال نہ تھا۔ ہندوستانی اس دُور و دراز سفر سے ہچکچاتے تھے اور بمبئی اور

بنگال کے متعدد آدمیوں کے سوا کسی نے یہ سفر اختیار نہیں کیا تھا۔

حسنِ اتفاق سے انہیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لئے علاوہ تین ہزار روپیہ خرچ آمد و رفت کے نئے چھ چھ ہزار سالانہ کی نو اسکالرشپیں چند صوبوں کے واسطے منظور کی تھیں خوش قسمتی سے گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے اپنے صوبے کی اسکالرشپ کے لئے سید محمود کا انتخاب کیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لئے کافی نہ تھا مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سرسید کے ارادے کو بہت تقویت ہوئی بلکہ انہوں نے فوراً ولایت جانے کی دل میں ٹھان لی جس نیت اور جس ارادے سے انہوں نے سید محمود کے ساتھ خود ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا وہ کسی قدر ان کی درخواستِ رخصت سے جو پندرہ فروری ۱۸۶۹ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپی تھی معلوم ہوتا ہے۔ درخواست کا مضمون یہ ہے۔

"یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہلِ یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط وضبط کو ترقی دی جائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہئے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولتمند، طاقت ور اور دانا ہیں اور اُن مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفا خانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔"

"پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جاکر اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نظیر قائم کردوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ اُمید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے ان کو مطلع کرکے ان کو بھی فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں اُن کو بھی سکھاؤں اور اُن کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں۔"

مولوی سید مہدی علی خاں اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادے کو پورا نہ کر سکتا۔ انہوں نے اپنے کتبخانے کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ انہوں نے بارہا مجھ سے اس بارے میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ "میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذاتِ خود اصول و طرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔"

الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے۔ اُن کے ساتھ دونوں بیٹے سید حامد مرحوم اور سید محمود اور تیسرے مرزا خداداد بیگ اور چوتھا ان کا قدیم خدمت گار چھجو، یہ چار آدمی تھے۔ بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات انہوں نے بطور ایک سفرنامہ کے نہایت عمدگی سے بیان کئے ہیں جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپ گئے ہیں۔

سفرنامہ اس سفرنامے میں ہر ایک دلچسپ حال جو اثنائے راہ میں ان کو پیش آیا ہے قلم بند کیا ہے اور سفر کی ضروریات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں اور وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے اُن کے دل میں گذرے ہیں ان کو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے۔ جابجا ایشیا اور یورپ کی سوشل اور مورل حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کئے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

جس دُھن میں سرسید نے یہ سفر اختیار کیا تھا اُس کا ثبوت اِس سفرنامے میں نہایت وضاحت کے ساتھ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے والا وطن اور قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی میں شور ربور ہے۔ بمبئی میں پہنچ کر کہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اخلاق، نام و نمود پر مرنے، جھوٹی شیخی کرنے، مفید تعلیم پر متوجہ نہ ہونے اور لکھروں پر مدّرس نوکر رکھنے پر افسوس کرتا ہے اور پارسیوں کی عمدہ حالت سے ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ کہیں پارسیوں کے صاف اردو بولنے پر حیران ہوتا ہے اور ان لوگوں پر تعجب کرتا ہے جو اردو کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں مانتے۔ کہیں گجراتی زبان کی کچھ عبارت نقل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس میں بھی فارسی اور عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں اور پھر سوال کرتا ہے کہ الہ آباد ایسوسی ایشن کون کون سی زبان سے عربی الفاظ نکال کر قدیم بھاشا جاری کرے گی؟ مصر کی ریل کی تعریف کر کے

افسوس کرتا ہے کہ ریل کا تمام سامان فرانس اور انگلستان کا بنا ہوا ہے۔ مصریوں کی کوئی چیز بنائی ہوئی نہیں۔ مسٹر ڈینس فٹز پیٹرک سے جہاز میں ملتا ہے اور پنجاب کی طرزِ حکومت کے ذکر میں اس کو ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ بتاتا ہے اور دلی کو قانونی اضلاع میں سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنے کو غدر کی سزاؤں میں سے ایک سزا قرار دیتا ہے۔ فرانس کے نامور انجینئر ایم۔ ڈی۔ لیسپس سے جس نے نہر سویز نکالی ہے، جہاز میں ملنے پر بے انتہا خوشی اور فخر ظاہر کرتا ہے اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ جب انگریزوں نے اس کو ایڈریس دیتے وقت کہا کہ اس نہر کا نام نہر لیسپس رکھنا زیبا ہے تو ایم، ڈی لیسپس نے جواب دیا کہ میرا فخر اس میں ہے کہ اس کا نام نہرِ فرانس رکھا جائے۔ وہاں اس کی وطن پرستی پر ہزار ہزار آفرین کرتا ہے۔ اور اپنی قوم پر نفرین کہ ان کا نام سوائے حسد البغض التشقق اور جھوٹی شیخی کرنے کے کچھ نہیں اور اس لئے وہ بدبختی اور ذلت میں گرفتار ہیں۔ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جس آبنائے پر محبِ وطن "گیری بالڈی" کا گھر ہے وہاں سے جہاز رات کو گزرا اور اس جھونس کے جھونپڑے کی جو شہنشاہوں کے محلوں سے زیادہ ادب اور تعظیم کے قابل ہے، زیارت میسّر نہ آئی۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبی کا ذکر کرتے وقت روضہ تاج گنج اور قطب کی لاٹ کو یاد کرتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ وارسیل کے شہنشاہی محل میں حوض اور نہریں اور فوارے اور درختوں کی موزونیت دیکھ کر قلعۂ دہلی کی نہر ماہ بہیج اور مہتاب باغ کا حوض جس کے کناروں سے کبھی تین سو ساٹھ فوارے چھوٹتے تھے اور ساون بھادوں کی کیفیت یاد کرتا ہے۔ وارسیل میں تصویروں کا عالم دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ مگر الجزائر کے محاربات کی تصویروں میں ایک مرقع دیکھ کر اس کے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے جس کی وجہ سے وہ فرانس اور اس کی بہادری اور سویلزیشن کو قابلِ نفرین سمجھتا ہے۔ اس نے ایک تصویر دیکھی ہے کہ سید عبدالقادر جزائری کی عورتیں گرفتار ہیں۔ فرانسیسی سپاہیوں نے ان کے اونٹ بٹھا کر کجاوے کو گرا دیا ہے اور عورتیں اس میں سے نکل پڑی ہیں اور ان کے بدن پر سے کپڑا ہٹ گیا ہے۔ سپاہی سنگینیں اٹھائے ہوئے اور ان کی نوکیں عورتوں کی طرف کئے ہوئے کہ گویا اب ماریں گے، اردگرد کھڑے ہیں۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک غیرت مند مسلمان کے لئے ان عورتوں کا ایسی بے کسی کے عالم میں دیکھنا آنکھوں سے خون ٹپکانے کے لئے کافی ہے اور کہتا ہے کہ اس تصویر کو فرنچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورت کا کپڑا تصویر میں بدن سے ہٹا ہوا بنانا فرانس کے لئے قابلِ شرم ہے اور اس کی شائستگی کو دھبا لگاتا ہے۔

پھر کہتا ہے کہ اس تصویر سے امام عبدالقادر کی حقارت نہیں ہوتی، بلکہ اس کی ویسی ہی عزت دل میں پیدا ہوتی ہے جیسی الجزائر کی بادشاہت کے زمانہ میں تھی۔ وہ بیس برس تک تنِ تنہا فرانس جیسی سلطنت سے نہایت بہادری اور سچائی سے بغیر دغا اور فریب کے لڑتا رہا۔ اور شکست کے بعد جن شرطوں پر صلح کی ان کو اخیر عمر تک نباہ دیا پھر ایک دوسرے موقع کی تصویر دیکھتا ہے۔ جس میں نپولین امام عبدالقادر کو قید سے چھوڑ رہا ہے اور اس کی ماں سے جو باہر جھنے کا پورا پردہ دار لباس پہنے کھڑی ہے مصافحہ کر رہا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر نپولین کی فیاضی، دانائی اور ہمت کی تعریف کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ لندن پہنچتا ہے اور اپنے سفرنامے کے خاتمے پر ہندوستان کے تمام سنی شیعہ اور ہندوؤں کو آگاہ کرتا ہے کہ سب ہندوستانی اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ یہ سفر طے کر سکتے ہیں۔ پھر اپنے جان پہچان انگریزوں کی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کلفٹن کے لٹکواں پل کے بننے کی تاریخ بیان کرتا ہے جو مدت سے ناتمام پڑا تھا اور جس کو سول انجنیرس انسٹی ٹیوٹ کے ممبروں نے ایک ممبر کی بدنامی کے خیال سے باہم اتفاق کر کے اپنی فیاضی سے بنا دیا۔ پھر اپنے ہموطنوں کی طرف مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے ہم وطنوں! بتاؤ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم، جو حیوانوں کی طرح اپنی خود غرضیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کو بھی وہی پڑھائے۔ ہماری مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔ پھر ایک رصدگاہ کا ذکر لکھ کر کہ ایک عورت اس کا تمام کام انجام دیتی ہے اپنے ملک کے مدعیانِ علم و فلسفہ و منطق کو شرمندہ کرتا ہے۔

یہ سفرنامہ بہت دلچسپ طریقے سے لکھنا شروع ہوا تھا۔ مگر جب اس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنی شروع ہوئی اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صداؤں سے زیادہ آشنا نہ تھے، اس لئے انہوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا بند کر دیا۔ مگر زمانہ بآوازِ بلند کہہ رہا تھا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

لندن کے عمائد سے ملنا الغرض سرسید ممبئی سے چھبیس دن میں لندن پہنچے اور میکلن برگ اسکوائر میں ایک مکان کرائے پر لے کر ٹھہرے اور اپنے دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروت اور خلق سے ان کے ساتھ پیش آئے، جیسے کہ وہ ہمیشہ

ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر ان کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے اور ہفتے میں ایک بار ہمیشہ ان سے ملنے کو آتے تھے۔ انہوں نے ہی سرسید کو لندن کے اکثر امراء و مشاہیر سے ملوایا تھا۔ لارڈ اسٹینلی آف ایلڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرسید سے ملتے رہتے تھے۔ سرجان ولیم کے انڈر سکریٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرسید کو زیادہ خصوصیت ہو گئی تھی۔ ملکۂ معظمہ کے سمدھی ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے اور سائنٹی فِک سوسائٹی علی گڑھ کے پیٹرن بھی تھے وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک سے ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے بھی جو ملکۂ معظمہ کے داماد ہیں اُن کو ملایا۔

جلسہ سول انجینئرس سوسائٹی میں شریک ہونا

سرسید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز ان کاموں میں جن کے لئے یہ سفر اختیار کیا تھا مصروف رہے۔ بایں ہمہ ان کو اکثر خاص خاص تقریبوں میں بلایا جاتا تھا اور اُن کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۳ رجون ۱۸۶۹ء کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۱۴ار جولائی کو سمتھوہین سوسائٹی آف سول انجینئرس کے عظیم الشان جلسے میں اور اس کے بعد جو اسی کے متعلق گرینچ میں ڈنر ہوا اس میں شریک ہوئے۔ اس جلسے کی کیفیت ڈیلی نیوز مورخہ ۱۴ار جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پن نے جو سوسائٹی مذکور کے پریذیڈنٹ تھے سرسید کو اس جلسے میں شریک ہونے کے لئے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقتِ معیّن پر میرے اسٹیمر میں جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے موجود ہوگا آئیں۔ مگر خود لارڈ لارنس سرسید کے مکان پر آتے اور ان کو اپنے ساتھ سوار کرا کے لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے۔ اسٹیمر میں جاکر حاضری کھائی اور ٹیمز کے کنارے پر بڑے بڑے کارخانے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گرینچ میں جاکر ڈنر کھایا۔ اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجینئر شریک ہوئے۔ کھانے میں گو ذبائح جیسا کہ ڈنر مذکور کی مینو[1] میں مندرج ہے یہ تھی کہ تیس طرح

---

[1] مینو ایک خوبصورت چھپا ہوا کاغذ ہوتا ہے جس پر ڈنر کے تمام کھانوں کی تفصیل ہوتی ہے اور کھانے کے وقت ہر مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس ڈنر کا مینو سرسید کے کاغذات میں اب تک موجود ہے جس میں تیس کھانوں کے نام لکھے ہیں۔

کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے۔ خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجینیروں نے جو اس جلسے میں شریک تھے کھانے کے بعد اسپیچیں دیں اور سالِ گزشتہ کی مختلف ترقیات کا جو انجینیرنگ میں ہوئیں، ذکر کیا۔ سب کے بعد پریذیڈنٹ نے اسپیچ دی اور آخرکار روائی میں لارڈ لارنس اور سرسید کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔ اس کے شکریے میں لارڈ لارنس نے بھی تقریر کی اور سرسید کے پاس ایک ترجمان کو اس غرض سے بٹھا دیا کہ جلسے کی تمام کارروائی کو اُن کو اردو میں سمجھاتا جائے۔ لارڈ لارنس کے بعد سرسید اٹھے۔ ایک ایسے جلسے میں جہاں انگلستان کے نامور انجینیر جمع ہوں اور جلسے کا موضوع انجینیرنگ کے سوا کوئی مضمون نہ ہو سرسید کو گفتگو کرنا نہایت دشوار تھا۔ باوجود اس کے ڈیلی نیوز نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ سید احمد خاں کی اسپیچ شاندار اور دلچسپ تھی۔ پریذیڈنٹ نے لارڈ لارنس کو سیویر آف انڈیا کہا تھا۔ سرسید نے ان کو فادر آف انڈیا کہہ کر یاد کیا۔ سرسید کی اسپیچ کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب و داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے ذریعے ہیں۔ مثلاً تعلیم، ہتھیار اور عدل و انصاف وغیرہ۔ مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انہیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت ہوئی ہے جن کو ان سے کام پڑا ہے یا جن کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن وہ چیز جس نے خاص و عام سب کے دل میں انگلش گورنمنٹ کی عظمت پیدا کی ہے وہ فنِ انجینیری کے نتائج ہیں۔ جیسے ریل، بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گزرتی ہے۔ ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود انگریزی سلطنت کا رعب و داب اور اس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے۔"

اس پر جلسے میں نہایت زور سے چیرز دی گئیں اور جب لارڈ لارنس نے اس کو انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا تو پہلے سے بھی زیادہ چیرز کا غل ہوا۔ سرسید کہتے ہیں کہ میرا ارادہ اسپیچ کرنے کا پہلے سے نہ تھا۔ مگر چونکہ میری نسبت ایسے الفاظ کہے گئے تھے جن کا شکریہ ادا کرنا ضرور تھا اس لئے مجھ کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔

خطاب اور تمغہ ملنا ۶۔ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا آفس میں ڈیوک آف آرگائل کے ہاتھ سے ان کو سی، ایس آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ اس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی۔ تاریخِ معیّن پر سرسید انڈیا آفس میں گئے۔ وہاں سر جان ڈبلیو کے انڈر سکریٹری وزیر ہند آئے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر اُن کو اپنے ہمراہ اس کمرے میں لے گئے جہاں ڈیوک آف آرگائل اُن کے منتظر تھے۔ ڈیوک کھڑے ہو کر چند قدم آگے بڑھے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر پھر اپنے بیٹے مارکوئس

آف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغہ اپنے ہاتھ سے پہنایا اور مبارکباد کہہ کر سرسید کو رخصت کیا۔ اسی روز چار اور شخصوں کو بھی یہی تمغہ ملنے والا تھا۔ جب سب کو تمغے مل چکے تو ڈیوک موصوف نے سرسید کو کھانے پر بلایا۔ جہاں بہت سے معزز لوگ اور پارلیمنٹ کے ممبر آئے تھے۔ سرسید کو اس موقع پر ڈیوک کے برابر بائیں جانب جگہ دی گئی تھی۔

لطیفہ جس زمانہ میں سرسید کو ولایت میں سی، ایس، آئی کا خطاب ملا اس کے کچھ دنوں بعد راجہ جیکشن داس کو بھی خطاب ہندوستان میں بمقام علی گڑھ ملا تھا اور اس کے تمام مراسم سوسائٹی کے بڑے ہال میں عمل میں آئے تھے۔ جب جلسہ برخاست ہوا اور راجہ صاحب کے تمام دوست ان کو مبارکباد دینے لگے، سوسائٹی کا ایک ملازم ہر ایک کی زبان سے سی، ایس، آئی کا لفظ سنتا تھا اور نہایت تعجب کرتا تھا۔ باہر آکر اور نوکروں سے کہنے لگا: "ارے یار و عجب تماشا ہے سید احمد خاں تو خیر لندن گئے تھے وہاں جاکر عیسائی ہوئے کسی نے جانا کسی نے نہ جانا، ان راجہ صاحب کو کیا ہوا تھا۔ ہندوستان ہی میں بھرے جلسے کے اندر عیسائی بن گئے۔ لوگوں کی زبان سے جو بار بار سی، ایس، آئی کا لفظ نکلتا تھا وہ اس کو عیسائی سمجھتا تھا۔

ملکہ معظمہ کی لوی وغیرہ میں جانا ۶، نومبر ۱۸۶۹ء کو ملکہ معظمہ کے ہاتھ سے بلیک فرائر زبرج، ہالبورن اور ایڈکٹ کے افتتاح کا جلسہ ہونے والا تھا۔ جلسے کی انتظامی کمیٹی نے سرسید کو بھی خاص طور پر وہاں مدعو کیا تھا۔ سرسید کہتے ہیں کہ یہ جلسہ نہایت شان و شوکت کا تھا۔

پھر ۱۱، مارچ ۱۸۷۰ء کو ملکہ معظمہ کی لوی میں ان کو بلایا گیا۔ سرسید کہتے ہیں کہ حسبِ معمول لوی کے محل میں مجھ کو اور درباریوں کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر سامنے جاکر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملاکر اور رعایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں لیتیں اس وقت تک ملکہ معظمہ کھڑی رہتیں ہیں۔

پرنس اوف ویلز کی لوی میں جانا اس کے بعد ۱۸۷۰ء کو پرنس آف ویلز کی لوی میں ان کو شریک کیا گیا۔ یہ لوی صرف فوجی افسروں کے لئے تھی۔

کسی سویلین کو اس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ مگر چونکہ سرسید ولایت سے جلد واپس آنے والے تھے اور ممکن نہ تھا کہ ان کو پھر پرنس آف ویلز کی کسی لوی میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے اس لئے ان کو خاص اجازت لوی میں شریک ہونے کی مل گئی تھی۔

اتھینیم کلب کی ممبری

لندن کی علمی مجلسوں میں بھی سرسید شریک ہوتے رہے۔ لندن جانے سے پہلے جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر ہو چکا ہے وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو چکے تھے۔ جب لندن میں گئے تو اس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ چارلس ڈکنس کی آخری ریڈنگ پر بھی میں وہاں موجود تھا۔ لیکن سب سے بڑا امتیاز جو ان کو لندن میں ایک علمی حیثیت سے ملا وہ اتھینیم کلب کا آنریری ممبر مقرر ہونا تھا۔ یہ کلب لندن میں سب سے زیادہ نامی اور معزز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کلب معزز خیال نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص جو مشہور مصنف یا کسی دوسرے کمال علمی میں ممتاز نہ ہو وہ اس کلب میں ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بارہ سو تک محدود ہے۔ سیکڑوں آدمی درخواستیں دے دے کر یہاں کی ممبری کے امیدوار رہتے ہیں۔ سرسید کہتے تھے کہ ۱۸۶۹ء میں جب کہ میں وہاں موجود تھا تین ہزار سے زیادہ امیدوار وں کا نام درج رجسٹر تھا اور دس دس بارہ بارہ برس امیدواری پر گزر گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو شخص اس کلب کا ممبر مقرر ہوتا ہے اس کے دوست اس کو مبارکباد کی چٹھیاں لکھتے ہیں۔ اور اس کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر اکثر خطابوں کے ملنے پر بھی نہیں ہوتا۔

غرضکہ سرسید خاص قاعدے سے جو نامور اور مشہور باکمال لوگوں کے لئے مقرر ہے۔ دو دفعہ اتھینیم کلب کے آنریری ممبر مقرر ہوئے اور جب تک لندن میں رہے اس کے ممبر رہے۔ اس کلب کی ممبری کی تحریک مسٹر ایڈورڈ ٹامس نے کی تھی جو سرسید کی منصفی کے زمانے میں دلی کے جج تھے اور جنھوں نے ان کو آثار الصنادید کو دوبارہ لکھنے اور ترمیم کرنے کی صلاح دی تھی۔

کیمبرج یونیورسٹی میں جانا

آثار الصنادید کا مترجم گارساں دتاسی جو فرانس کے مشہور مستشرقین[1] میں سے تھا وہ بھی لندن ہی میں سرسید سے خط و کتابت اور شوقِ ملاقات رکھتا تھا۔ مگر یہ تمام اعزاز و امتیاز اور خاطر مدارات جن کا ہندوستان سے چلتے وقت سرسید کو سان گمان بھی نہ تھا یہ سب ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔ ان کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان

[1] زمانۂ حال کی عربی میں اورینٹلسٹ کو مستشرق کہتے ہیں۔

کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا۔ تعلیمِ نسواں کو غور سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا اُس کو نگاہ میں رکھا۔ اگرچہ انگریزی زبان کی ناواقفیت سے ضرور ہے کہ ان کو ہر ایک بات کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں سخت دِقتیں اٹھانی پڑی ہوں گی اور شاید ان کو پوری واقفیت حاصل نہ ہو سکی ہو۔ مگر جو نتیجے اِس ادھوری واقفیت سے ہندوستان میں ظاہر ہوئے وہ بلکہ ان کا عشر عشیر آج تک اُن ہندوستانیوں کی پوری واقفیت سے بھی ظہور میں نہیں آیا جو ولایت سے اعلیٰ درجے کی تعلیم پا کر آئے ہیں۔

اِنگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا

انگلستان کے طریقہ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سر سید نے لندن ہی میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی اور طرزِ تمدّن اور حسنِ معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب، جیسا کہ ان کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے، ملاحظہ کئے اور جہاں تک ممکن تھا اپنی معلومات کو وسعت دی۔ یورپ کے طرزِ معاشرت کو دیکھا۔ وہاں کے اُمراء کے محل اور مکانات اور طرزِ ماندو بُود پر نظر کی۔ عجائب خانوں اور کتب خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کئے۔ انجینیری کے عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بننا، انجینیروں اور عالموں کی سوسائٹیاں، عام کاریگروں اور اہلِ حرفہ کے کام اور عموماً اہلِ انگلستان کے علمی ذوق شوق اور علمی ترقیات کو دیکھا۔ جس سرگرمی کے ساتھ اہلِ مذہب　　　مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ پڑوسیوں اور مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں یہ سب کچھ دیکھا۔ اُن کے عیبوں سے قطعِ نظر کی اور اُن کی خوبیوں کو چُنا اور یہ سب کچھ ایک تماشائی کی طرح سیر تماشے اور دل لگی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دِلسوزی، غیرت اور عبرت کی نظر سے دیکھا اور انگلستان کی حالت کو

---

[1] زمانۂ حال کی عربی میں اورنٹیلسٹ کو مستشرق کہتے ہیں۔

اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے دردِ دل کو بڑھایا اور اس درد کو دوسروں کے دلوں میں درد پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا۔ وہ مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں ولایت سے لکھتے ہیں۔ "میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسے میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں پوچھا کہ کہو لندن بہشت ہے، اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔"

ان کا ارادہ تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کی حالت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اس کو اپنے سفرنامے میں مفصل بیان کر کے اہلِ وطن کو خبردار کریں۔ مگر اہلِ وطن نے اس کو برداشت نہ کیا۔ وہ اپنی پستی کی دردانگیز داستان نہ سن سکے اور اس لئے جو سلسلہ سرسید نے اپنے سفر کے حالات کا لکھنا شروع کیا تھا وہ منقطع ہو گیا۔ بایں ہمہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سفر کے جستہ جستہ حالات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے اور جب کبھی موقع ملا انھوں نے کوئی نہ کوئی بات اہلِ وطن کے کان میں ڈال دی۔

۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کو انھوں نے ایک لمبی تحریر سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس میں چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر بیان کئے تھے اور یورپ کی ترقی اور اپنے ملک کے ادبار اور تنزل کی مثالیں پیش کر کے اہلِ وطن کو غیرت دلائی تھی۔ جب اس تحریر کا نتیجہ بجز اس کے کہ لوگ برافروختہ ہوں اور برا بھلا کہیں کچھ حاصل نہ ہوا تو ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۷۰ء کو ایک دوسری تحریر بعنوان "عذر از طرف گنہگار سید احمد" ہندستان میں بھیجی۔ پھر ایک اور تحریر بعنوان "عرضداشت سید احمد بخدمتِ اہلِ وطن" اخبار میں چھپنے کے لئے روانہ کی۔ ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں سرسید کو اہلِ وطن کی بھلائی کا کس قدر خیال تھا۔ گو ان تحریروں سے ملک و قوم کے کانوں پر جوں نہیں چلی، مگر درحقیقت یہ سب تمہیدیں تھیں ان کارروائیوں کی جو آخر کار ہندوستان میں پہنچ کر سرسید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں۔

خطباتِ احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا

ان سب باتوں کے سوا سرسید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور

انگریزی میں اس کا ترجمہ کرا کر شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاص کر سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں اسلام کی حقیقت اور بانیٔ اسلام کے کیریکٹر کو ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ سر ولیم میور کی کتاب کی نسبت اکثر انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کے متعلق جو ٹھیک اطلاعیں سر ولیم نے اہلِ یورپ کو دی ہیں وہ پہلے کسی دوسرے ذریعے سے اُن کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر درحقیقت یہ کتاب صرف عیسائیوں ہی کو اسلام اور بانیٔ اسلام کی طرف سے گمراہ کرنے والی نہ تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی تھی۔

اس کتاب کے مضامین کی تفصیل اور جو دقتیں سر سید کو اُس کے لکھنے اور چھپوانے میں پیش آئیں اور جس جوش اور اُمنگ سے انہوں نے یہ کتاب لکھی اور جو رائیں انگریزوں نے اس پر دیں یہ سب امور ہم دوسرے حصے میں بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ ولایت میں سر سید نے کتاب کی لاگت بڑھ جانے کے خوف سے صرف اپنی اُردو یادداشتوں کا خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کرا کے چھپوایا تھا۔ مگر ہندوستان میں پہنچنے کے بعد انہوں نے اس کو اردو میں بھی اپنی پوری یادداشتوں سے از سرِ نو مرتب کر کے تصانیف احمدیہ کے ساتھ بڑی تقطیع پر ٹائپ میں چھپوایا تھا۔ جس میں ہر ایک مضمون بہ نسبت انگریزی کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ مگر چونکہ اس کی جلدیں کم چھپوائی گئی تھیں اس لئے اس کی زیادہ اشاعت نہیں ہو سکی۔ خطباتِ احمدیہ لکھنے کے سوا انہوں نے ولایت ہی میں اور بھی اسلام کی بیش قیمت خدمتیں انجام دی ہیں جن کا ذکر دوسرے حصے میں کیا جائے گا۔

سچ یہ ہے کہ سر سید نے جس تحریر کے ذریعے سے ولایت جانے کیلئے گورنمنٹ سے اجازت چاہی تھی، جو کچھ اس تحریر میں لکھا تھا اس سے بہت زیادہ اپنے ارادوں کو پورا کر کے دکھایا۔ وہ لندن سے نہایت قیمتی اطلاعیں لے کر ہندوستان میں آئے جن سے انہوں نے ملک اور قوم کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ شمالی ہندوستان میں ان سے پہلے ظاہرا کسی ہندو یا مسلمان نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے ولایت نہیں بھیجا تھا۔ غالباً سید محمود شمالی ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جو ولایت سے بیرسٹری کا ڈپلوما لے کر آئے محض انہیں کی ریس سے اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو اپنی اولاد کے ولایت بھیجنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور انہیں کی دیکھا دیکھی ولایت جانے والے دیسی طالب علموں کا ہندوستان سے انگلستان تک تانتا بندھ گیا جس زمانے میں سر سید ولایت گئے انہیں دنوں میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار

علی گڑھ میں چھپا تھا کہ "سید احمد خاں کے ولایت جانے سے ہندوستانیوں کے واسطے ایک عمدہ مثال قابلِ تقلید قائم ہو گئی ہے۔ چنانچہ کلکتہ کے ایک نوجوان مسلمان سید امیر علی (جو اب آنریبل سید امیر علی سی، ایس، آئی بیرسٹرایٹ لا اور جج ہائیکورٹ کلکتہ ہیں)، لندن روانہ ہوئے ہیں اور بہت سے ولایت جانے کو تیار ہو رہے ہیں"۔ سید امیر علی نے صرف ولایت کا سفر کرنے ہی میں سرسید کی تقلید نہیں کی بلکہ اسلام کی خدمت کرنے میں اور اس کی خوبیاں یورپین قوموں پر ظاہر کرنے میں بھی سرسید کا پورا پورا اِتّباع کیا ہے۔ اُن کی دو باوقعت کتابیں "لائف آف محمدؐ" اور "اسپرٹ آف اسلام" جو انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں اس دعوے کی شاہد ہیں۔

نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کو لکھتے ہیں کہ "سید احمد خاں ولایت گئے، مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اُس قوم کی جو اِس وقت تمام اقوامِ روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انھیں کے گھروں اور انھیں کے ملک میں دیکھیں۔ اور جو کچھ کہ وہاں دیکھا ہے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت جا کر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامیٔ دینِ اسلام کتب خانے میں بیٹھا ہوا خطباتِ احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے"۔

الغرض سرسید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو مع سید حامد مرحوم کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ اُن کی روانگی کے بعد ایک لمبا مضمون ہندوستان کے ایک مسلمان مقیم لندن سید عبداللہ نام نے اخبار ہوم ورڈمیل مؤرخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۷۰ء میں سرسید کی نسبت چھپوایا تھا۔ جو سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۱ نومبر ۱۸۷۰ء میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں لکھے جاتے ہیں۔ "جن انگریزوں سے یہاں (یعنی انگلستان میں) ملاقات ہوئی اُن پر ان کی عام لیاقت کا اور اِس بات کا کہ جن شخصوں نے اُن سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی اُن سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا، بہت عمدہ اثر ہوا۔ یہاں کے بہت سے مدبّرانِ سلطنت کی رائے ہے کہ اگر ہم ایک ایسے لئیق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے، جیسے کہ سید احمد خاں ہیں، نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی لیاقت کی نسبت ہماری

رائے ہمیشہ ضعیف اور ربودی (رپوؤر) ہوتی - اس مضمون کے لکھنے سے میری یہ غرض ہے کہ ہندستان کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو ہندوستانی تربیت یافتہ اور مہذّب ہوتا ہے اُس کی اہلِ یورپ کیسی قدر و منزلت کرتے ہیں - سیّد احمد خاں کی بدولت اِس بات کا ثبوت حاصل ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوئی ہے کہ اِس ملک میں ہندوستان کے ایک شریف آدمی کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے اور اعلیٰ درجے کے انگریز اس سے بڑی محبّت اور تواضع اور تکریم سے پیش آتے ہیں"۔

پانچواں باب

ولایت سے واپس آنا - تہذیب الاخلاق جاری کرنا - کمیٹی خواستگارِ ترقیِ تعلیم مسلمانان، کمیٹی خزنۃ البضاعۃ، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو ابتدائی مدرسہ علی گڑھ میں قائم کرنا - کالج فونڈیشن اسٹون - چندہ وصول کرنے کی تدبیریں - عماراتِ کالج - کالج کلاس قائم ہوئی - تفسیر القرآن -

---

ولایت سے ہندوستان میں واپس آنا

۲ اکتوبر سنہ ۱۸۷۰ء کو سرسید مع سید حامد مرحوم کے ولایت سے بمبئی پہنچے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج لیا - یہاں آتے ہی انہوں نے اس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی جس کے لئے درحقیقت ولایت کا سفر اختیار کیا تھا مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ جو انہوں نے ولایت جانے سے پہلے باندھا تھا، اس کے پورا کرنے میں ظاہرا اُن کو دو سخت مزاحمتیں نظر آتی تھیں - اوّل مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی تعلیم سے اُن کی نفرت اور ایجوکیشن کے مفہوم سے ناواقفیت - اس مزاحمت کے دُور کرنے کے لئے انہوں نے ولایت پہنچتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی - سفر کے حالات اور متعدد آرٹیکل جو انہوں نے لندن سے لکھ کر بھیجے اور سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئے اُن میں طرح طرح سے مسلمانوں کو غیرت دلائی تھی اور جابجا اُن کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا تھا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت بیان کی تھی - لیکن ان تحریروں کا اثر مسلمانوں پر کچھ نہیں ہُوا - دوسری مزاحمت ان کو یہ معلوم ہوتی تھی کہ ان کا ارادہ، جیسا کہ آگے مفصل بیان کیا جائے گا، فی الواقع ہندوستان میں پہنچ کر ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا کیونکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم سے ہندوستانیوں میں حقیقی لیاقت پیدا ہونے کی ان کو ہرگز امید نہ تھی - اس لئے ضرور تھا کہ گورنمنٹ کے طریقۂ تعلیم کو مسلمانوں کے لئے ناکافی اور ہندوستان کے ایجوکیشنل سسٹم کو غیر مفید قرار دیا جائے - چنانچہ اسی بنا پر انہوں نے ولایت میں

ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا جس کا عنوان "ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیمی پر اعتراضات" تھا۔ مگر چونکہ اس میں سرسید نے اپنی ذاتی رائے لکھی تھی اس لئے اس سے بھی کسی نتیجے کے پیدا ہونے کی امید نہ تھی۔ ان دونوں رکاوٹوں کے دُور کرنے کے لئے انھوں نے ہندوستان میں پہنچ کر دو بڑے بڑے کام ایک ساتھ شروع کئے۔

تہذیب الاخلاق اوّل مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لئے پرچہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ انھوں نے اس پرچے کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا۔ کیونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اس کا نام اور ربیل چھپتی تھی اُس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔ الغرض سرسید اور ان کے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ہر ممبر سے تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لئے ساٹھ روپیے سالانہ اور عام خریداروں سے ساڑھے چار روپے سالانہ لینا قرار پایا تھا۔ یکم شوال ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا پہلا نمبر شائع ہوا اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے رمضان ۱۲۹۳ھ یعنی پورے چھ برس تک برابر نکلتا رہا اور ہمیشہ اس کے ایڈیٹر اور مینجر خود سرسید رہے۔ چونکہ یہ پرچہ کوئی تجارتی نہ تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی کے لئے جاری کیا گیا اس لئے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اسی کی ترقی میں صرف کی جاتی تھی۔ اس کی اخیر جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور ماٹو کے یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا۔

"حُبُّ القَومِ مِنَ الاِیمانِ فَمَن یَسعیٰ فی اعزازِ قومہٖ اِنّما یسعیٰ فی اعزازِ دینہٖ"۔

تہذیب الاخلاق ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تقریباً ویسا ہی پرچہ تھا جیسے اسٹیل اور اڈیسن نے دو میگزین یعنی "ٹیٹلر" اور "اسپکٹیٹر" نوبت بہ نوبت لندن میں نکالے تھے اور ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۳ء تک جاری رہے۔ ان دونوں پرچوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان سے انگریزوں کے اخلاق، عادات، رسم و رواج اور قومی خیالات پر بہت بڑا اثر ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت انگلستان کی حالت کیا بہ اعتبار علوم و فنون اور کیا بہ اعتبار اخلاق و معاشرت کے آجکل کی حالت سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھی۔ مگر مذہبی خیالات اس عام ریفارمیشن کی بدولت جو لُوتھر اور کالون نے کی، بہت کچھ اصلاح پا چکے تھے۔ اس لئے ان دونوں پرچوں میں مذہبی جھگڑا بہت کم ہوتی تھی اور اسی وجہ سے وہاں

ان پرچوں کی کچھ مخالفت نہیں ہوئی۔ اس میں مذہبی بحث کرنی لازم آپڑتی تھی۔ کیونکہ جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں۔ اگرچہ اس پرچے میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ سرسید مذہب کے سوا اخلاق و معاشرت و تمدن پر بھی اکثر مضامین لکھتے تھے۔ مگر پچھلے دونوں شخص زیادہ تر مذہب پر لکھنے والے تھے۔

اس پرچے کے دو تین ہی نمبر نکلنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اس کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اس مدرسے سے بھی جس کو سرسید قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سوءِ ظن پیدا ہونے لگا۔ بہت سے اخباروں میں مخالفانہ مضمون چھپنے لگے اور چند پرچے جن میں سے کانپور کا نور الآفاق اور نور الانوار زیادہ مشہور تھا تہذیب الاخلاق کے توڑ پر جاری کئے گئے۔ رسالہ اشاعۃ السنّہ جو خاص اہلِ حدیث کی تائید کے لئے جاری ہوا تھا اس میں بھی تہذیب الاخلاق کے برخلاف مضمون نکلنے لگے اور سرسید کی تکفیر کے فتوے جابجا لکھے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے ساتھ ان کے دوست اور اعوان و انصار بھی نیچری بلکہ کرسٹان کہلانے لگے۔

لطیفہ جب محسن الملک سید مہدی علی خاں کے چند مضمون نہایت دھوم دھام سے اس پرچے میں شائع ہوئے تو کسی سُنّی صاحب نے ان کے چچا سے جن کا تمام خاندان محسن الملک کے سوا اثنا عشری ہے جا کر کہا کہ آپ کے لئے رونے کا مقام ہے کہ مہدی علی خاں کرسٹان ہو گئے۔ انھوں نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ میاں اب تم کو رونا چاہیئے۔ ہم تو اسی دن رو چکے تھے جب اس نے باپ دادا کا طریقہ چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کیا تھا۔

بایں ہمہ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتدبہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا جو اس پرچے کا ویسا ہی دل دادہ تھا جیسے انگلستان والے ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کے دل دادہ تھے۔ وہ اس کے مضامین پر وجد کرتے تھے۔ اور تاریخ معین پر اس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے اور اس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے۔ جو نتائج اس پرچے سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے ان کو دوسرے حصے میں بیان کیا جائے گا۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا جانا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہراً ان کی مخالفت کم ہوتی۔ بلکہ شاید نہ ہوتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی اور رجوع تحریک

چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ان کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے اور اسلام پر جو عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے۔ اس کے سوا یورپ کی سویلیزیشن کے اصول و فروغ سے اور اُن اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے اُن کو نفرت دلائی جائے۔ اخلاق و عادات میں بسبب قومی تنزل کے جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ بیان کی جائیں۔ علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے۔ جہاں تک اس میں غلطی ہو اس کو ظاہر کیا جائے۔ علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے، ان کی اصلی اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دُنیا میں ان سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے اُن کی طرف رغبت دلائی جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں ان کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن ان سے پاک ثابت کیا جائے مسلمانوں کے دلوں میں ان کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے۔ ان کی قدیم علمی اور عملی ترقیات ان کو یاد دلائی جائیں۔ اور اس طرح قوم کے مُردہ دلوں کو از سر نو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے۔ ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لئے سر سید اور ان کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کر کے لکھا اور اخلاق و معاشرت و ترقی و تمدن کے متعلق یورپ کے مصنفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکا اپنی زبان میں بیان کئے۔

چونکہ یہ پرچہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام خیالات کے برخلاف تھی اور ان کے کان میں وہ صدائیں پہنچاتا تھا جو انھوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں، اس لئے اوّل اوّل لوگ اس سے بہت بھڑکے مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں اس کا اثر پھیل گیا۔ ان پڑھ مسلمان جن کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں پڑھے لکھوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے وہ تو یہ بھی نہ جانتے تھے کہ تہذیب الاخلاق کس جانور کا نام ہے۔ مولویوں اور واعظوں پر بھی اس

کا متنفر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اس کو نہ صرف مذہب کے حق میں، بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مضر جانتے تھے۔ امرا تک اس کی رسائی ہونا سخت دشوار تھی کیونکہ ان کو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا ہی مشکل تھا جیسا کہ مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اسی لئے تہذیب الاخلاق کا اثر صرف متوسط درجے کے لوگوں میں محدود رہا جو نہ محض جاہل تھے اور نہ جامع علومِ عقلیہ و نقلیہ اور مقدور کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے نہ اعلیٰ درجے میں۔ پھر خاص کر دِلی اور لکھنؤ اور ان کے نواح میں جہاں مسلمانوں کی قدیم شائستگی کے کچھ دھندلے نشان باقی تھے اس کا اثر بہت کم ہوا۔ باوجود اس کے، چونکہ اس کی آواز زمانے کی گونج کے موافق تھی اس نے توقع سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔

زیادہ تر اس کے مقبول ہونے کا سبب یہ تھا کہ اس کے مضامین کا جزوِ اعظم سرسیّد کی دل نشین تحریریں اور سیّد مہدی علی خاں کے دل کش آرٹیکل تھے۔ سرسیّد کی تحریر کی نسبت یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس کے دیکھنے کے بعد آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سیّد مہدی علی خاں کی تحریروں پر بھی لوگ سر دھنتے تھے۔ اِس کے سوا اُس میں ہر ایک بات نرمی اور سنجیدگی سے، برخلاف اس قدیم دل آزار طریقے کے جو مسلمانوں کے مناظرات اور مجادلات میں جاری تھا، بیان کی جاتی تھی کسی شخص کی طرف روئے سخن بہت کم ہوتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ قوم کی عام حالت پر بطورِ دل سوزی کے نہ بطورِ طعن و تعریض کے گفتگو کی جاتی تھی۔ اس میں ظرافت بھی ہوتی تھی مگر نہ ایسی کہ کسی کو ناگوار گزرے۔ اس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت ضرورت کے سوا کبھی نہ دیئے جاتے تھے۔ اور اس لئے مناظرے کے بے مزہ ردّ و بدل اور جواب ردِّ جواب و کدِّ جواب و حدِّ جواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا۔ کیونکہ اس کے جاری کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ جو بات سچ معلوم ہو وہ لوگوں کے کان میں ڈال دی جائے نہ یہ کہ ان سے زبردستی منوائی جائے۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں درج نہیں ہوتی تھیں مگر مدرسۃ العلوم کے متعلق کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کی روئدادیں اور تمام حالات اس میں کئی برس تک برابر چھپتے رہے اس لئے مدرسۃ العلوم کو اس سے بہت تقویت پہنچی۔ اِدھر تو اس کے مضامین لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر رہے تھے اور اُدھر چندے کی روز افزوں ترقی، بانیانِ کالج کی سرگرمی اور سرسیّد کی کوششوں

کے عملی نتائج اس کے ذریعے سے دریافت ہوتے تھے اور اس لئے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا جاتا تھا۔

۱۸۷۶ء میں جب سرسیّد پنشن لے کر علی گڑھ میں آگئے تو ان کو ہمہ تن مدرسہ کی تکمیل، اس کی عمارتیں تیار کرنے اور طرح طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس کے سوا اُن کے وہ دوست جو تہذیب الاخلاق کے سرگرم معاون تھے وہ زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نیز تہذیب الاخلاق اپنا کام بہت کچھ کر چکا تھا اور مسلمانوں میں جس قدر کہ اُبال آنے کی قابلیت تھی، اس قدر اُبال پیدا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے اس کو بند کرنا پڑا اور یکم رمضان ۱۲۹۳ھ کے پرچے پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ چھ برس کے عرصے میں ۲۲۶ مضمون تہذیب الاخلاق میں چھپے جن میں سے چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون صرف سرسیّد کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی اور لوگوں کے۔

جن لوگوں کو تہذیب الاخلاق کا چسکا لگ گیا تھا اُن کو اس کا بند ہونا شاق گزرا اور اُن کی طرف سے برابر تحریکیں ہوتی رہیں کہ اس کو پھر جاری کیا جائے آخر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ میں دوسری بار جاری کیا گیا جو دو برس پانچ مہینے جاری رہ کر بند ہو گیا۔ اس دفعہ چونکہ سرسیّد کی توجہ زیادہ تر تفسیر لکھنے کی طرف مصروف رہی اور ان کے سرگرم معاونوں کو اس میں مدد دینے کی فرصت یا موقع نہ تھا اس لئے اس میں پہلے کی بہ نسبت عمدہ مضامین کم نکلے۔ اب کی بار کل ۷۰ مضمون چھپے جن کے لکھنے والے مختلف آٹھ شخص تھے۔ ازاں جملہ ۲۲ مضمون سرسیّد کے اور باقی اور لوگوں کے تھے۔ شوال ۱۳۱۱ھ میں سرسیّد نے نواب محسن الملک کی تحریک سے اس کو پھر جاری کیا مگر اس دفعہ اس کا دار و مدار بالکل سرسیّد کی ذات پر رہا اور لوگوں نے اس میں بہت کم مدد دی آخر تین برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔

کمیٹی خواستگارِ ترقیٔ تعلیم مسلماناں

تہذیب الاخلاق ہی کے ساتھ سرسیّد نے دوسرا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی ترقیٔ تعلیم پر غور کرنے کے لئے انہوں نے ایک دوسری کمیٹی بنارس ہی میں قائم کی۔ وہ لندن ہی سے ایک اشتہار تدابیر ترقیٔ تعلیم مسلماناں کی نسبت اردو اور انگریزی میں چھپوا کر اپنے آنے سے پہلے مولوی سیّد مہدی علی خاں کے پاس جو اُس زمانے میں مرزاپور میں تحصیلدار تھے اشاعت کی غرض سے بھیج چکے تھے۔ مگر انہوں نے اس کی تمام کاپیاں ایک صندوق میں ڈال دیں اور معمولی اشتہاروں کی طرح اس کی اشاعت کو محض بے سُود خیال

کیا۔ جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور مولوی صاحب سے ملے تو انہوں نے تمام اشتہار سرسید کے سامنے رکھ دیئے اور یہ کہا کہ ہر شخص سید احمد خاں نہیں ہے جو اس کام کو کر سکے۔ اب سرسید نے خود اس کام کو شروع کیا۔ وہی اشتہار جس کا عنوان یہ تھا "التماس بخدمتِ اہلِ اسلام وحکام ہند درباب ترقی تعلیمِ مسلمانانِ ہندوستان" جہاں جہاں مناسب سمجھا بھیجا اور اخبار کے ذریعے سے بھی اس کو شائع کیا۔ خلاصہ اس التماس کا یہ تھا کہ انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں اور مسلمان ان سے مستفید نہیں ہوتے اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے اب تک بیان کئے ہیں ان پر کافی بھروسہ نہیں ہو سکتا اور بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ درحقیقت وہی اصلی اسباب ہیں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصلی جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے۔ اور مسلمانوں کو اس مسئلے پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لئے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔ جب چندہ بقدرِ ضرورت جمع ہو جائے اس وقت چندہ دہندگان میں سے ممبر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے۔"

اس چندے میں سب سے پہلے سرسید نے ایک رقم اپنی طرف سے پیش کی۔ اور باتفاق مولوی مہدی علی خاں کے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ دسمبر ۱۸۶۹ء میں یہ اشتہار جاری ہوا تھا اسی مہینے میں ایک ہزار ایک سو دو روپیہ جمع ہو گیا۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا۔ نواب کلب علی خاں رئیس رامپور، کنور وزیر علی خاں مرحوم رئیس وانپور ضلع بلند شہر اور سر ولیم میور لیفٹننٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ ظاہر کی تھی۔ الغرض ۲۶ دسمبر کو بمقام بنارس "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانانِ ہندوستان" منعقد ہوگئی جس کے سیکرٹری سرسید قرار پائے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لئے کم پڑھتے ہیں۔ علوم قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے۔ اور علوم جدیدہ کیوں رواج نہیں پاتے اور جب یہ موانع ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عملدرآمد کرنے میں کوشش کرے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ "جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لئے جلسہ قرار پایا تھا اس سے ایک روز پہلے میں پہنچ گیا

تھا۔ رات کو سرسید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے
متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے
سرسید کو ان کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں ان کو دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے
میں ٹہل رہے ہیں اور زار زار قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے
کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ "اس سے زیادہ کیا مصیبت
ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔"
پھر آپ ہی کہنے لگے کہ "جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری
رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی کہ دیکھئے کل کے جلسے کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں
چلتی ہے یا نہیں؟" نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ "سرسید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر
گزری اس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں۔"

اسی تاریخ انعامی اشتہار جس میں تین انعام پانسو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپے کے مقرر ہوئے
تھے جاری کیا گیا اور میعادِ معین تک ۳۲ مضمون مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے سکریٹری کے پاس پہنچے۔
مولوی مہدی علی خاں کا مضمون سب سے عمدہ تھا۔ مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے
خارج رکھا گیا اور پہلا مولوی سید اشرف علی ایم۔ اے کو جو اس زمانہ میں بنارس کالج کے طالب علم تھے،
دوسرا نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین کو اور تیسرا مولوی عبدالودود کو ملا۔ سرسید نے ان مضامین سے
ایک عمدہ رپورٹ اردو اور انگریزی میں تیار کی، جس میں تمام رسالوں کا خلاصہ کر کے ان سے
مفصلہ ذیل نتائج استخراج کئے تھے (۱) ہندوستان کے سمجھدار مسلمان ان تعصبات کو جو پُرانے خیال کے مسلمان
انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق میں مضر جانتے ہیں (۲) مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس
میں بمقابلہ ہندو طالب علموں کے جتنی ہونی چاہیئے اس سے بہت کم ہے (۳) جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس
میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے ان میں سے کچھ ناواجب اور اکثر واجبی ہیں اور سرکاری طریقۂ تعلیم مسلمانوں
کی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں ہے (۴) اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لئے اپنے طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی
کر دے تو بھی ان کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں (۵) مسلمانوں کو اپنے علومِ قدیمہ کے محفوظ رکھنے،
علومِ جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لئے

اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کا فکر آپ خود کریں۔ اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی اسکیم اور طریقہ تعلیم بھی مندرج تھا جو سرسید نے کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔

مسلمانوں کی ترقی کے موانع جو سرسید نے اس رپورٹ میں تمام رسالوں سے استنباط کر کے لکھے تھے اُن کی نسبت شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ "ایجوکیشن کمیشن نے بھی ۱۸۸۲ء میں تمام ہندوستان کے معتبر گواہوں کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کے وہی موانع تسلیم کئے ہیں جو سرسید نے ۱۸۷۲ء میں اپنی رپورٹ میں درج کئے تھے۔"

اس رپورٹ کی ایک ایک جلد گورنمنٹ ہند اور تمام لوکل گورنمنٹوں میں بھی بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ مدراس، بنگال اور بمبئی کی لوکل گورنمنٹوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو جو تدبیریں و کارروائیاں اب تک کی تھیں اُن کے تمام کاغذات سکریٹری کے پاس بھیج دئے اور گورنمنٹ شمال مغرب نے اس رپورٹ کی کچھ جلدیں تعلیمی کمیٹیوں کو تقسیم کرنے کی غرض سے طلب کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوشش سے کالج مجوزہ قائم ہوگیا تو گورنمنٹ علوم دنیوی کی تعلیم کے لئے بموجب قواعد گرانٹ اِن ایڈ کے اس مدرسہ کو مدد دے گی۔ اس کے بعد سکریٹری گورنمنٹ ہند کی چٹھی مورخہ ۹ ؍ اگست ۱۸۷۲ء اس مضمون کی پہنچی کہ "نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاسِ کونسل کو تجویز مندرجہ رپورٹ کمیٹی خواستگارِ ترقی کی اطلاع سے جو بابت قائم کرنے اینگلو اورنٹیل کالج کے ہے، نہایت خوشی ہوئی ہے اور وہ دل سے امید رکھتے ہیں کہ اس تجویز میں جیسی کامیابی ہونی چاہئے ویسی ہی ہوگی۔ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تدبیر اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ اس میں مدد دے اور سید احمد خاں بہادر اور ان صاحبوں کی کوششیں جو اس عمدہ کام میں شریک ہیں نہایت تحسین و آفرین کے قابل ہیں۔" ان دونوں چٹھیوں کے آنے سے کمیٹی کو حد سے زیادہ تقویت ہوئی۔

کمیٹی خزنۃ البضاعۃ

ایک دوسری کمیٹی اس غرض سے کہ قیام مدرسۂ مجوزہ کے لئے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے مقرر کی گئی جس کا نام کمیٹی "خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین" رکھا گیا اور اس کے لائف سکریٹری سرسید قرار پائے اور یہ ٹھیرا کہ جب تک مدرسہ قائم کرنے کے لائق سرمایہ جمع نہ ہو جائے تب تک اس کمیٹی کا مقام وہیں رہے جہاں لائف سکریٹری کا قیام ہو۔ چنانچہ جب تک مدرسہ علی گڑھ میں قائم نہ ہو لیا تب تک کمیٹی مذکور کا دفتر بنارس

ہی میں رہا جہاں سرسید جج اسمال کاز کورٹ تھے۔

جولائی ۱۸۷۱ء میں سرسید نے کمیٹی خواستگارِ تعلیم کی طرف سے ایک اشتہار جاری کیا جس میں مسلمانوں سے پوچھا گیا تھا کہ مدرسۃ العلوم کون سے شہر میں قائم کیا جائے۔ اس اشتہار کے جاری کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ بعضے لوگ جو پرامیسری نوٹ خریدنے کے برخلاف تھے، چندہ اس شرط سے دیتے تھے کہ ہمارے روپیہ سے جائداد خریدی جائے۔ پس تاوقتیکہ مدرسہ کے لئے کوئی جگہ قرار نہ پائے جائداد نہیں خریدی جاسکتی تھی۔ کیونکہ جائداد کا مقامِ مدرسہ کے قریب خریدا جانا ضروری تھا۔ اس اشتہار پر مختلف رائیں لوگوں نے ظاہر کیں مگر سب سے زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی جنھوں نے علی گڑھ کو ترجیح دی تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ سرسید نے مدت سے ارادہ کر رکھا ہے کہ پنشن لینے کے بعد دلی کی سکونت ترک کر کے علی گڑھ میں بود و باش اختیار کریں۔ کیونکہ غدر کے بعد دلی کے مسلمانوں کی جو حالت ہوگئی تھی وہ ان سے دیکھی نہیں جاسکتی تھی۔ ان کو پنجاب کی طرزِ حکومت پر بھی اعتراض تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے پنجاب کے ایک جلیل القدر حاکم سے صاف کہہ دیا تھا کہ دلی کو شمال مغربی اضلاع سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنا انھیں سزاؤں میں سے ایک سزا ہے جو فتح دہلی کے بعد اہلِ دلی کو دی گئیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کی تعلیم کا جو اعلیٰ منصوبہ سرسید نے دلی میں باندھا تھا، اس کا دلی میں پورا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

کمیٹی کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ہوئی کہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے بعض شرائط کے ساتھ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی شاخ میں اسکالرشپ دینے کے لئے دس ہزار روپیہ اپنی جیبِ خاص سے دینے کا وعدہ فرمایا۔ اور سر ولیم میور لیفٹیننٹ اضلاعِ شمال مغرب نے ایک ہزار روپے کا چندہ اور اسی طرح مسٹر اسپیکی جج ہائیکورٹ الٰہ آباد نے ایک معقول رقم مدرسہ کے لئے عنایت کی۔ ان عطیوں نے سرسید کی کوششوں میں جان ڈال دی اور کمیٹی کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ جب اس طرح سے چندے میں ترقی ہونے لگی تو سرسید نے کمیٹی میں تحریک کی کہ کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کی بموجب ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۶۰ء کے رجسٹری ہوجانی چاہئے۔ ورنہ تمام جائداد اور پرامیسری نوٹ سکریٹری کے یعنی میرے نام سے خریدے جائیں گے اور میرے اور میرے وارثوں کے نام منتقل ہوسکیں گے۔ چنانچہ کمیٹی مذکورہ کی رجسٹری حسبِ ضابطہ عمل میں آئی اور تمام مسلمانوں کو چھاپے کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ جو سرمایہ مدرسۃ العلوم کے لئے جمع کیا گیا ہے یا آئندہ جمع

ہوگا اس کی حفاظت کے لئے یہ انتظام کیا گیا ہے۔

فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم انتظام وسلسلۂ تعلیم کی جو ولایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا انتظام اور طریقۂ تعلیم دیکھ کر مرتب کی تھی مجوزہ کالج کے لئے پیش کی۔ موجودہ ممبروں نے اس کو پسند کیا اور منظوری کے لئے اس کی کاپیاں چھپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی گئیں اور نیز لوکل گورنمنٹوں اور گورنمنٹ ہند میں بھی اس کی نقلیں ارسال کی گئیں تاکہ اگر گورنمنٹ اس اسکیم کو پسند کرے تو گرانٹ اِن ایڈ سے حسب وعدہ امداد کرے۔ نیز ایک استفتا مع اس اسکیم کے علمائے وقت کے پاس بھیجا گیا جس میں اُن سے پوچھا گیا تھا کہ جس مدرسے میں اس اسکیم کے موافق تعلیم دی جائے گی اس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں۔

جب یہ استفتا شائع ہوا تو کانپور سے مولوی امداد العلی صاحب نے جو اس وقت وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے ایک دوسرا استفتا شائع کیا جس میں بنارس کے استفتا کو غلط اور دھوکا دینے والا بتایا تھا اور لکھا تھا کہ جو لوگ مدرسۃ العلوم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔ یہ پہلی مخالفت تھی جو علانیہ مدرسۃ العلوم کے ساتھ کی گئی۔ اس کے بعد دھڑا دھڑ مخالفتیں ہونی شروع ہوئیں۔ بعضوں نے مشہور کیا کہ مدرسے میں سید احمد خاں کا بُت اور اُن کے معاونوں کی تصویریں قدِ آدم یا نصف قدِ آدم رکھی جائیں گی۔ بعضے کہتے تھے کہ وہاں شیعوں کے مذہب کی کتابیں بھی پڑھائی جائیں گی اور اس طرح باطل کی اعانت کی جائے گی۔ بعضے کہتے تھے کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال ہوں اس کے قائم کئے ہوئے مدرسے میں چندہ دینا یا اس میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا مسلمان کا کام نہیں۔ بعض کا یہ اعتراض تھا کہ جو روپیہ چندے سے جمع ہوگا وہ سُود میں لگایا جائے گا اور اس کے پرامیسری نوٹ خریدے جائیں گے اور مدرسے میں لڑکوں کو انگریزی لباس پہننا پڑے گا۔ بعض کہتے تھے یہ تمام شور و غل سید احمد خاں کے دم تک ہے۔ اس کے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو سرانجام کر سکے اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کو سُن کر تہہ دار آدمیوں کے دل بھی افسردہ ہو جاتے تھے۔ یہ تمام باتیں اخباروں میں شائع ہوتی تھیں۔ چند دیسی اخبار ہمیشہ سرسید اور مدرسۃ العلوم کے خلاف مضمون لکھتے تھے ایک آدھ مضمون انڈین آبزرور میں بھی مدرسے کے خلاف نہایت سخت لکھا گیا تھا، مگر اودھ اخبار، پنجابی اخبار، اردو گائڈ، پٹیالہ اخبار اور انگریزی اخباروں میں پایونیر ہمیشہ مدرسے کی تائید کرتے تھے۔

جب اس قسم کی مخالفتیں ہونے لگیں اور اتفاق سے انہیں ایام میں چندے کی آمدنی سُست پڑ گئی تو سرسید کے دوست مایوس ہونے لگے۔ انہوں نے دوستوں کی ہمت بندھوانے اور مسلمانوں کے دل سے غلط خیالات اور مخالفوں کے اعتراض رفع کرنے کے لئے ایک نہایت مفصل مضمون تہذیب الاخلاق میں چھاپا اور دیگر اخبارات سے بھی اس کے شائع کرنے کی درخواست کی۔ اس کے اخیر کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں: "اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف کاغذ کے گھوڑے دوڑانے سے کام چلے بلکہ ہماری کمیٹی کے ممبروں کو خود شہر بہ شہر اور ضلع بہ ضلع دَورہ کرنے، اسپیچیں کرنے اور لوگوں کے دلوں کو جوش میں لانے کا وقت ہے۔ اس کام کے لئے علاوہ فرصت کے روپیہ بھی درکار ہے کہ بدوں خرچ کے دورہ نہیں ہو سکتا۔ کمیٹی کی تھیلی میں جو گیا پھر نہیں نکلتا۔ پس دَورہ کرنے کا وقت، اس کی محنت اور اس کا خرچ سب ہم کو اپنی گرہ سے کرنا ہے۔ اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کریں گے۔ اگر زندہ ہیں اور خدا کو بھی منظور ہے تو اپنے مخالفوں کو دکھائیں گے کہ خدا نے کیا کیا اور اگر اس میں آنکھ بند ہو گئی اور لحد میں جا سوئے تو یہ امید رکھیں گے کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"۔

اب سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لئے زیادہ کوشش کرنی شروع کی۔ جہاں جہاں ان کے دوست اور مددگار تھے وہاں اس غرض کے لئے سب کمیٹیاں قائم کیں جیسے مرزا پور، علی گڑھ، کانگڑہ، پٹیالہ وغیرہ اور خود سرسید نے مع اپنے دوستوں کے اسی مطلب کے لئے پٹنہ، لاہور، گورکھ پور وغیرہ کا سفر کیا اور ہر ایک مقام پر نہایت زبردست اسپیچیں اور لیکچر دئے تمام سب کمیٹیوں نے توقع سے زیادہ چندہ جمع کیا اور سرسید کے ہر ایک سفر میں معتد بہ کامیابی ہوئی۔ انہیں دنوں میں سرسید نے ایک سرکلر بحیثیت سکریٹری ہونے کے انگلستان کو بھی روانہ کیا تھا جس میں اپنے یورپین دوستوں سے درخواست کی تھی کہ وہاں بھی مدرسۃ العلوم کے لئے چندہ جمع کرنے کے واسطے ایک کمیٹی قائم کی جائے۔ اور لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل ہندوستان لارڈ اسٹینلی آوف ایلڈرلی، سر بارٹل فریئر، سر چارلس ٹریولین اور ایڈورڈ ٹامس وغیرہم کے نام پرائیویٹ چٹھیاں روانہ کی تھیں کہ اس کمیٹی کے قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس تحریک کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ اس مقام پر ایک لطیفہ ذکر کرنے کے لائق ہے۔

جب دوسری بار سید محمود دفعتاً انگلستان کو گئے اور کیمبرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو

معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے اور آجکل یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ چرچ متعلقہ ٹرینٹی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت عظیم الشان عمارت از سرِ نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے اپنے دوست سے بر سبیل تذکرہ یہ کہا کہ اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ ان کی ضرورتوں سے زیادہ بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرسۃ العلوم ہی کی امداد کے لئے دے دیں۔ ان کے دوست نے کہا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟ سید محمود نے کہا چھ کروڑ۔ وہ سُن کر نہایت متعجب ہوا اور یہ کہا کہ جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہیں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے اُن کی اعانت کرنی گناہ ہے اُن کو تباہ ہونے دو۔"

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

۱۸۷۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے جو ہندوستان کے مدبران سلطنت میں شمار ہوتے ہیں ایک کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر لکھ کر شائع کی جس کا نام " اور انڈین مسلمانز" تھا اس کتاب میں انہوں نے اپنی دانست میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی۔ نیز وہابیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں۔ پس گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہئے۔ اس کتاب کے عنوان کی عبارت یہ تھی:۔ "کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان کے ملکۂ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟" آگے چل کر انہوں نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ " اس بیان سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زہر آمیز نصیحتوں کو نہایت ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزی طبیعت سے اپنی شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھیرا کر بغاوت کے بڑے فرض سے بچ جاتے ہیں"۔ پھر اس کے بعد لکھا تھا "ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لئے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں"۔ پس اگرچہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے شروع میں یہ ظاہر کیا تھا کہ " اس کتاب کے مطالب صرف بنگالہ کے مسلمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ میں صرف انہی سے زیادہ واقف ہوں" لیکن جو فقرے ان کی کتاب کے اوپر نقل کئے گئے اُن سے صاف پایا جاتا ہے کہ انہوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے گورنمنٹ کو بدگمان

اور غیر مطمئن کرنا چاہا تھا۔

جس زمانے میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ انگریزوں کو ابھی تک فراموش نہیں ہوا تھا۔ دوسرے بنگالہ کے وہابیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا، تیسرے انہیں دنوں میں مسٹر نارمن چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اس پر اور طرّہ ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا ہو گا؟ اور مسلمانوں کی طرف سے ان کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہو گا۔

سر سید اپنے ریویو میں لکھتے ہیں کہ "میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو مسلمانوں کا بڑا دوست ہے نہایت شوق سے دیکھنی شروع کی تھی مگر افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے پڑھنے سے بڑی مایوسی ہوئی اور بے اختیار منہ سے نکلا کہ خدا مجھ کو میرے دوستوں سے بچائے۔" انھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اوّل سے آخر تک اور وہابیت کے اصول مشرح بیان کئے ہیں اور صاف اقرار کیا ہے کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں۔ بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہو گا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا، بلا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا۔ انہوں نے جہاد کے مسئلے کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اس کی نسبت تھیں اُن کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں اور شریعتِ اسلام کی رُو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت، اور نہ کسی قسم کا فساد۔ اُن کو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کے زیرِ حکومت اسی اطاعت و فرمانبرداری سے از رُوئے مذہبِ اسلام کے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرتِ اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ کے زیرِ حکومت رہے تھے۔

سر سید کے ریویو نے تمام انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا۔ اس زمانے میں حافظ احمد حسن مرحوم وکیل ٹونک لندن میں تھے جب انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر

---

[1] اس باب کے اختتام پر نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔

ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور بُرے خیالات مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں، انھوں نے تمام ریویو پانیر کے پرچوں سے نقل کرا کے سید الطور پمفلٹ کے چھپوا دیا اور لندن میں جا بجا تقسیم کر دیا۔ سُنا ہے کہ جب وہ لندن سے آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن کے لوگوں کی طبیعتوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جیسے جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو کچھ انھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

ہندوستان میں جب یہ ریویو پانیر کے ذریعے سے شائع ہوا، انہیں دنوں میں پانیر مورخہ ۲۳ جون ۱۸۷۲ء میں ایک مبسوط آرٹیکل جو کسی بڑے لائق عربی دان انگریز کا لکھا ہوا تھا اور جس کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ وہ سر ولیم میور کا لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے برخلاف گویا سرسید کی تائید میں چھپا اور پانیر سے سوسائٹی اخبار میں نقل ہوا۔ اس آرٹیکل میں نہایت عالمانہ لیاقت سے ڈاکٹر ہنٹر کے شبہات کا جواب دیا گیا تھا۔ اور سرسید کی تائید کی گئی تھی۔ اس کے آخر کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو، موحد ہو اور اس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ در پردہ تخریب سلطنت کی فکریں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے محض تہمت ہے اور ہم اس وقت بہت سے ایسے آدمی نشان دے سکتے ہیں جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ ان سے زیادہ سرکار کا خیر خواہ اور معتمد کوئی نہیں۔ باایں ہمہ وہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر وہابی کہتے ہیں اور سرکار نے بے سوچے سمجھے ان کو معتمد علیہ نہیں گردانا، بلکہ غدر کے زمانے میں جب کہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی ان کی وفاداری کا سونا اسی طرح سے تایا گیا اور وہ خیر خواہیٔ سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ جہاد کا وعظ کہتے ہوتے اور بغاوت وہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ ان سے ظہور میں آیا یہ کیونکر ظہور میں آتا۔ ہم ڈاکٹر ہنٹر کی آگاہی کے لئے ان لوگوں کے چال چلن کو پیش کرتے ہیں۔"

اس کے ایک مدت کے بعد انڈین آبزرور مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۷۳ء میں خود اس کے یورپین ایڈیٹر کا ایک زبردست آرٹیکل سرسید کے ریویو پر نکلا جو درحقیقت ہندوستان کے یورپین حکام اور افسروں کی رائے کا آئینہ تھا۔ ہم اس آرٹیکل کے چند مقام یہاں بجنسہ نقل کئے دیتے ہیں تاکہ اچھی طرح

معلوم ہو جائے کہ اس ریویو نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا تھا اور تاکہ ہندوستانیوں پر ظاہر ہو جائے کہ انگریز سچی بات کے قبول کرتے ہیں کس قدر غیر متعصب اور منصف مزاج ہوتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اس گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سروکار رکھتے ہیں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب متعلقہ مسلمانانِ ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت، بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہنا اچھا ہے کہ اس کے لچر و پوچ ہونے کی بابت بالاتفاق تصفیہ کر دیا ہے۔ جہاں تک ہم کو لٹریچر میں مداخلت ہے اس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کو لاثانی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے سوا ہم نہیں جانتے کہ کسی مصنف نے دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو۔ جس کسی کو کچھ بھی علم ان باتوں کا ہوگا جن کی بحث اس کتاب میں ہے وہ ایک ہی نظر میں یہ معلوم کرلے گا کہ ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کے مذہب کی نسبت اور خاص کر وہابیوں کے مذہب کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتے اور شمال مغرب کی سرحد کے لوگوں کی حالت سے بالکل بھی واقف نہیں۔ یہاں تک کہ جو قومیں اس میں بستی ہیں اُن کے نام تک نہیں جانتے اور امورات سلطنت کی پیچیدہ باتوں کی نسبت اور اس بات کی نسبت کہ سیدؒ احمد[1] کے زمانے میں سکھ اور افغانوں کے باہم کیا معاملہ تھا نہایت دھندلے خیالات کے سوا انہوں نے کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور جب سے ملک پنجاب گورنمنٹ انگلشیہ کے قبضے میں آیا ہے اس کے بعد کی سرحدی تاریخ سے بھی ناواقف ہیں اور جو مسلمان خاص بنگالہ کی حد سے باہر رہتے ہیں ان کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔ بلکہ جب ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں ایک غلطی سے دوسری غلطی میں پڑتے ہیں اور جب وہ اپنے خیال اور قیاس کو اکبر کے زمانے کے حالات کے تذکرے سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ایسی باتیں کرتے ہیں جو ہنسی کے قابل اور بالکل غیر ممکن ہیں۔ اگرچہ وہ دارالسلام اور دارالحرب کی بحث ایک مکتّہ کے مولوی کی سی فصاحت اور واقفیت کے ساتھ کرتے ہیں، تاہم ان کے مباحثے کے ہر حصے کی مانند ان باتوں کا علم بھی اُن کو ان مہمل اور بے صرفہ خیالات سے کچھ بڑھ کر نہیں ہے جو ہر ایسے تعلیم یافتہ شخص کے ہوتے ہیں جس نے کچھ ہسٹری پڑھی ہو۔"

---

[1] سید احمد شہید بریلوی

ہیں کہ وہابی یا پکے مسلمان کے دین کا یہ کوئی جزو نہیں ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ کا مقابلہ کرے اور یہ کہ مسلمان پر جیسا اور غیر مذہب والوں کے ساتھ خاص خاص حالتوں میں جہاد کرنا فرض ہے ویسا ہی عیسائیوں کے ساتھ ہے اور ویسا ہی ہندوؤں کے ساتھ اور یہ کہ مسلمان حکمی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اور مذہب والوں کی مانند تمام بنی آدم کے ساتھ برادرانہ طور پر یگانگت اور اتفاق سے رہیں تو گو اس قسم کے بیانات ہمارے اگلے خیالات کے کیسے ہی مخالف ہوں جب تک کہ ہم کو اس قدر اعلیٰ درجے کی واقفیت نہ ہو کہ ہم سید احمد خاں پر غلطی کا الزام لگا سکیں، اس وقت تک ہم کو ان باتوں کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعصب اور فساد کے مقابلے میں ہم زیادہ احتیاط نہ کریں لیکن اب ایسی باتوں کا خوف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے کیونکہ انگریزوں کے دلوں میں علی العموم اس بات کا یقین ہے کہ مسلمان جس قدر زیادہ ایماندار ہوگا اسی قدر انتظام کا سخت دشمن ہوگا اور اسی قدر اس کا پکا ارادہ ہوگا کہ یا تو وہ اسے توڑے یا خود اس سے ٹوٹ جائے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگ جن کو یہ یقین ہے کہ ہم کسی انگریز کو حق یا ناحق مار ڈالیں تو ہم کو ثواب دائمی ملے گا، گورنمنٹ انگلشیہ کے لئے نہایت دقت کی چیزیں ہیں۔ پس یہ نہایت تسلی اور راحت کی بات ہے کہ ایسی عمدہ سند سے جس کی عمدگی حتی الامکان ثابت ہے یقین دلایا جائے کہ یہ خوف بے بنیاد ہے۔ ہم بھی اس قسم کی باتیں بار بار کہہ چکے ہیں مگر ہم کو امید نہ تھی کہ ایک انگریز اخبار نویس کی رائے اس معاملے میں کچھ معتبر ہوگی"۔

اس کے بعد انڈین آبزرور کے اڈیٹر نے سر سید کے رسالے سے چند فقرے نقل کر کے اُن کی تائید کی ہے اور ایک لمبی بحث کے بعد اپنے آرٹیکل کو اس فقرے پر ختم کیا ہے "ممکن نہیں کہ کوئی بیان اس سے (یعنی سر سید کے بیان سے) زیادہ صاف ہو، اس سے ان لوگوں کو اطمینان ہونا چاہیئے جو بزدل اور وہمی ہیں۔ سید احمد خاں کے مختصر رسالے میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا تذکرہ ہم کرتے اگر ہمارے پاس اس پرچے میں گنجائش ہوتی۔ ہم ایسی کسی کتاب سے واقف نہیں ہیں جس میں ایسی تھوڑی سی جگہ میں مسلمانوں کے خیالات کی نسبت اس قدر زیادہ اطلاع حاصل ہو۔ ہندوستان کے ہر انگریز کو اسے بغور پڑھنا چاہیئے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ بہت پھیلے گی۔ یہ ٹھیک اسی قسم کی کتاب ہے جس کی ضرورت آج کل اُن تمام عام لوگوں کے دلوں کو تسلی اور قرار بخشنے کے لئے ہے جو اپنی ناواقفیت کے سبب سائے سے بھی بھڑکتے ہیں"۔ سر الفرڈ لائل اپنے ایک اسپیچ میں جو سر سید کے بعد محمڈن ایجوکیشنل ریویو

"اسی بڑی ناواقفیت کے باعث ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب میں ایک ایسا وصف ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں یہ کتاب لٹریچر کے کتب خانے میں بے نظیر ہے۔ ہر شخص جس نے سید احمد خاں کی تحریر کو پڑھا ہے ضرور یقین کرے گا کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے اس میں اس معاملے کے اصل حالات کی نسبت کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر کو یہ توقع تھی کہ اپنی فصاحت و بلاغت اور دلفریب عبارت کے ذریعے سے کامیاب ہو جائیں گے۔ مگر ظاہراً انھوں نے ناواقفیت کی گہرائی کی تھاہ دریافت نہیں کی تھی۔ یا غالباً یہ سمجھا تھا کہ جس قدر میں جانتا ہوں اُس سے زیادہ کوئی شخص واقف نہ ہوگا، اس لئے کوئی میری باتوں کی اصلاح نہ کر سکے گا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے میزبان میری کیسی مدارات کریں گے؟ اُن کی اس بات پر ہم سے زیادہ اور کسی کو افسوس نہ ہوگا۔ غالباً ڈاکٹر ہنٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل کو لبھائے گی۔ مگر اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھوئی گئی ہے کہ پھر کبھی میسّر نہ ہوگی۔ کتاب کا پڑھنے والا اُن کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھے بالائے طاق رکھ دیگا اور یہ سمجھے گا کہ قصے کی دلچسپ کتابوں کے مانند ہیں جو اپنی طرز میں نہایت دلفریب ہوتی ہیں، مگر کسی کام کی نہیں۔"

"سید احمد خاں کا چھوٹا سا رسالہ سوائے ڈاکٹر ہنٹر کی تردید کے اور بھی خوبی اور عمدگی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو ہر طرح سے ہمارے اور اپنے ہم مذہبوں کے درمیان ترجمانی کے کام کے لئے بخوبی لائق ہے۔ سید احمد خاں مذہب اسلام کو خاص خدا کا دیا ہوا ہونے پر نہایت پختہ یقین رکھتے ہیں اور ان کو یہ بھی یقین ہے کہ آخر کار اور مذہبوں پر یہی مذہب غالب آئے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دل سے اور نہایت گرم جوشی سے انگریزی عملداری کے معاون ہیں۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ اگر انسان وحشیانہ حالت کی طرف مراجعت نہ کرنی چاہیے تو تبدیلیوں کا ہوتے رہنا نہایت ضرور ہے بغیر کسی استثنا کے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اسلام کو روحانی سلطنت حاصل کرنی ہے تو وہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ ملا جُلا رہے کوئی انگریز اس قسم کی دلیل پر اعتراض نہیں کر سکتا کیونکہ ان کا دعویٰ اس قدر مدلل اور مستند ہے کہ کوئی انگریز ان دلیلوں اور سندوں کا بیسواں حصہ بھی اپنے بیان کی تائید میں پیش نہیں کر سکتا۔ پس اگر سر سید احمد خاں یہ کہتے

میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " اس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے اور بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اتار دیتا "

سرسید کے ریویو پر اور بھی بعض مدبرانِ سلطنت نے کتابیں لکھی ہیں۔ مگر ہم یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ریویو اخبارات میں شائع ہونے کے بعد کتاب کی صورت میں بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپا تھا۔ اس کی پوری پوری کیفیت جب تک کہ وہ اول سے آخر تک نہ پڑھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم بطورِ نمونہ اس کا ایک مختصر مقام اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے تیسرے باب کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ " مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیرخواہی اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہے بلکہ میں اُن کی ذات سے بڑی امید یہی رکھ سکتا ہوں کہ وہ حکومتِ انگریزی کو قبول کرتے میں سرد مہری کریں گے " سرسید اس پر یوں لکھتے ہیں کہ " اگر ڈاکٹر صاحب کو ہم لوگوں کے مسلمان ہونے کے باعث اس قدر مایوسی ہے تو میں اولاً ان سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ قرآنِ شریف کی اس آیت کی طرف توجہ فرمائیں۔

ولتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا - ولتجدن اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا انا نصارى ذالك بان منهم قسيسين ورهبانا وانهم لا يستكبرون (یعنی) اے محمد تم پاؤ گے تمام آدمیوں میں سخت دشمن مومنین کا یہودیوں اور مشرکوں کو، اور پاؤ گے مومنین کا سب سے زیادہ دوست اُن لوگوں کو جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نصاریٰ میں اکثر عالم اور عابد ہیں اور وہ بہت زیادہ گھمنڈ نہیں رکھتے۔)

" دوسرے یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی اُس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان بجز سرد مہری کے قوم حکمراں کی جانب سے اور کچھ سلوک نہیں دیکھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں کی سرد مہری پر متحیر نہ ہونا چاہیئے۔ ہم دونوں قوموں (یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو حضرت عیسیٰ کا یہ قول یاد رکھنا چاہیئے کہ جس سلوک کے تم اور آدمیوں سے متوقع ہو تم کو بھی اسی طرح اُن کے ساتھ سلوک کرنا چاہیئے "

پھر اسی باب کے خاتمہ پر ایک حاشیہ میں ڈاکٹر ہنٹر نے مندرجہ ذیل سوال لکھا تھا۔

سوال: اے علماء و محققانِ شرعِ اسلام تمہاری اِس معاملہ میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہِ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اس غنیم کو مدد دینی جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں سرسید نے اوّل اصولِ اسلام کی رُو سے ایک بہت لمبی تقریر کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "جب تک مذہبی معاملات میں ہم کو ہر قسم کی آزادی ہندوستان میں حاصل ہے، اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں اذان جس قدر بلند آواز میں چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں، شارعِ عام میں دعوتِ اسلام کر سکتے ہیں، پادری جو اعتراض مذہبِ اسلام پر کرتے ہیں اُن کا جواب بلاخوف و خطر دے سکتے ہیں، خود مذہبِ عیسوی پر اعتراض کر سکتے ہیں، اس کے خلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت اور اندیشے کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں مسلمان کر سکتے ہیں، اس وقت تک انگریزی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کئے جائیں گے۔ کیونکہ اُن کا یہ فعل اس پاک معاہدے کو توڑتا ہوگا جو رعایا اور حکّام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔"

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبارِ عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے۔ بلکہ میری دانست میں تو رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے۔ چنانچہ جو ملکی لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں اُن میں باپ بیٹوں سے اور بھائی، بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامے میں کُل قوم کا کیا حال ہوگا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو اُن کی پولیٹیکل حالت اُن سے کروائے گی اور میری دانست میں یہ سخت سوال ہندوؤں سے بھی اسی طرح متعلق ہے جیسا کہ مسلمانوں سے۔ پس اِس لحاظ سے اس کا دریافت کرنا دونوں قوموں سے ضرور ہے۔"

سرسید نے جو کچھ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر لکھا تھا اس کا حال بقدرِ ضرورت ہم نے بیان کر دیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک بڑی بے انصافی اور ناشکری ہوگی اگر اِس مقام پر آنریبل ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر ہنٹر

کے اس شریفانہ برتاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ ان سے ظہور میں آیا۔ اُنھوں نے مدرستہ العلوم کے پختہ بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرہ بنانے کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیبِ خاص سے دیا۔ اور ۱۸۸۲ء میں جب وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریذیڈنٹ تھے کمیشن کے دَورے کے وقت اضلاعِ شمال مغرب میں پہلا اجلاس علی گڑھ میں طلب کیا اور اپنی اخیر اسپیچ محمڈن کالج میں آکر دی جس میں نہایت بشاشت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور ان کی کوششوں کی بے انتہا تعریف کی اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہلپ کی اور موجود ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی،

ابتدائی مدرسہ علی گڑھ میں قائم ہونا

فروری ۱۸۷۳ء میں جو جلسہ صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرستہ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے۔ چنانچہ ۲۱ اگست ۱۸۷۳ء کو علی گڑھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علی گڑھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپیچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ پھر ۱۱ دسمبر ۱۸۷۳ء کو دوسرا جلسہ علی گڑھ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرستہ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اس کے رفع کرنے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علی گڑھ میں قائم کیا جائے۔ جس کے طریقۂ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصولِ اسلام کے برخلاف نہیں ہے۔ اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور بعض علماء اہلِ اسلام نے جو اس جلسے میں شریک تھے طریقۂ تعلیم کو جو سکریٹری نے اس وقت بیان کیا بلا محظور شرعی تسلیم کیا۔ اس جلسے میں اور سب کمیٹیوں کی نسبت چندے کی رقم زیادہ لکھی گئی تھی اور جس شرط پر مدارس ماتحت مختلف مقامات میں جاری کرنے قرار پائے تھے اس کی طرف سے علی گڑھ کی سب کمیٹی نے کافی اطمینان کر دیا تھا۔ اس لئے صدر کمیٹی بنارس نے بھی علی گڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکریٹری سے درخواست کی کہ علی گڑھ میں مدرسہ ماتحت جاری کیا جائے۔ مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری سب کمیٹی نے جو اس وقت علی گڑھ میں سبارڈی نیٹ جج تھے نہایت دلی سعی اور کوشش سے صدر کمیٹی کے مقاصد کو انجام دیا۔ اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو کہ

ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکور پر سرسید بھی بنارس سے علی گڑھ آ گئے اور ایک جلسے میں جس کے صدرِ انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ تھے رسمِ افتتاح[1] عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی۔ تاریخ مذکور سے لے کر اب تک مدرسۃ العلوم کو قائم ہوئے ۲۴ برس کا زمانہ گزرا ہے۔ اس عرصے کے تمام واقعات اور حالات جو مدرسۂ مذکور کے انتظام اور ترقی سے متعلق ہیں ان کے لکھنے کے لئے ایک جدا کتاب کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم یہاں صرف ضروری امور بیان کریں گے جو اس کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔

جس وسیع میدان میں اب محمڈن کالج علی گڑھ اور اس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانے میں یہاں فوج پریڈ کرتی تھی۔ مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی اور اس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے۔ لیکن اب بھی قریب ۷۴ ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسے کے لئے کمیٹی کی طرف سے اسی زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اس وقت ہنری لارنس علی گڑھ میں کلکٹر تھے۔ انہوں نے اس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیج دی

---

[1] افتتاح کے موقع پر مولوی محمد اکبر مرحوم اور مولوی محمد ہاشم نے عربی نظم و نثر لطیف مبارکباد کے اور مولوی صفدر حسین نے فارسی اور اردو میں قطعاتِ تاریخ لکھے تھے۔ چونکہ یہ سب تحریریں طولانی ہیں اس لئے صرف قطعہ تاریخ اردو مرتبہ مولوی صفدر حسین جو مضمون اور مادۂ تاریخ دونوں کے لحاظ سے نہایت عمدہ و لطیف ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے

قطعہ

ہے مدرسہ علی گڑھ میں اک ہوا اسقدر	جس کو کیا ہے جاری اسلامیوں نے مل کر
ہر علم و ہر زباں کی تعلیم ہو گی اس میں	سب مدرسوں سے اچھی سب کالجوں سے بہتر
انگریزی عام ہو گی تعلیم میں مگر ہاں	مذہب کی خاص ہو گی تعلیم اے برادر
تعلیم مذہبی ہی ہے جان مدرسہ کی	ورنہ اثر نہ ہوتا اس کا کسی کے دل پر
تعلیم دنیوی ہے بہرِ معاشِ دنیا	تعلیم مذہبی ہے بہرِ نجاتِ محشر
گر یہ نہ ہو تو وہ ہیچ اور وہ نہ ہو تو یہ کیا	بے اس کے ہے وہ بدتر بے اسکے ہے یہ ابتر

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور سر ولیم میور نے بھی جو اُس زمانے میں لفٹننٹ گورنر تھے اس قطعہ کے دینے کا وعدہ کر لیا۔ مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہ پایا تھا کہ مانٹ گیو صاحب علی گڑھ میں قائمقام کلکٹر ہو گئے۔ اُنہوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لئے دیا جائے۔ اُن کے بعد مسٹر کالون مستقل کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے اُنہوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اس وقت کے تمام یورپین حکام ان کے ہم رائے اور ہم زبان ہو گئے۔ یہ ایسی سخت مزاحمت ہوئی تھی کہ بانیانِ کالج اس کے ملنے سے مایوس ہونے لگے تھے اور قریب تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہو جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے اُسی زمانے میں سر جان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان ہے لفٹننٹ گورنر ہو گئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورے کے دنوں میں علی گڑھ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سر سید بھی بنارس سے علی گڑھ پہنچے اور بہت سی گفت و شنید کے بعد ہز آنر نے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج بنانے کے لئے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے کہ جو عمارت اس میں بنائی جائے اس کے بننے سے پہلے اس کا نقشہ گورنمنٹ کے ملاحظے کے لئے بھیجا جایا کرے۔ اور اگر بالفرض کبھی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہو جائے تو جس قدر عمارات کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہوں گی ان سب پر سرکار کا قبضہ ہو جائے گا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں۔ اور سر جان اسٹریچی نے اس کی منظوری گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطائے اراضی کمیٹی کو عنایت کی اور حسبِ ضابطہ قطعۂ مذکور پر قبضہ دلا دیا گیا۔ مدرسۂ ماتحت کے اِفتتاح سے پہلے یہ زمین

ہے جسم مدرسہ کا انگریزی اور اُس میں — تعلیمِ مذہبی ہے بس جان کے برابر

عیسائی اور مسلماں ہیں مثلِ جسم اور جاں — ثابت کریں گے ہم ہاں اس بات کو مقرر

تھا شرعِ موسوی میں اِفراط حد سے زائد — تھی شرعِ عیسوی میں تفریط حد سے بڑھ کر

شرعِ محمدی نے کی اِعتدال اس میں — اِفراط کو گھٹا کر تفریط کو بڑھا کر

تاریخ بھی لکھی ہے وہ ہم نے جس سے حضرت — ہر بات کو ہماری پڑتا لئے ملا کر

ظاہر میں عیسوی ہے باطن میں ہے وہ ہجری — اے سامعین سنئے لِلّٰہ دل لگا کر

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخِ مدرسہ کی — بولا یہ مُلہمِ غیب۔ اٹھارہ سے پچھتر

۱۲۹۲ھ

کمیٹی کو مل چکی تھی اور جس بنگلے میں اب تک محمڈن ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اس بنگلے میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔

۱۲ نومبر ۱۸۷۵ء کو سر ولیم میور جو اس زمانے میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے مدرسے کے ملاحظے کو آئے اور ایک لمبی اسپیچ دی جس میں کمیٹی کو مبارک باد دینے کے بعد سرسید کی نسبت کہا کہ میں خاص کر اپنے دوست کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے اور ان کے دلی مدعا کا پہلا پھل حاصل ہونے پر اُن کو مبارک باد دیتا ہوں۔

جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی اور مدرسے کو جاری ہوئے ایک سال ہو چکا تو سرسید کو ضروری معلوم ہوا کہ نوکری سے علیحدہ ہو کر مدرسے کی تکمیل میں اطمینان اور کامل توجہ سے کوشش کی جائے۔ کچھ تو سرکاری کاموں کی مصروفیت مدرسے کے کام میں حارج ہوتی تھی اور کچھ وہ اپنی جبلی احتیاط کے سبب سے سرکاری عہدیدار ہونے کی حالت میں چندہ وصول کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ پنشن کا نقشہ تو وہ مدرسے کے جاری ہوتے ہی بھیج چکے تھے۔ جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن کی منظوری بھی آ گئی اور وہ اسی وقت ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ وہ اپنی قدیم کوٹھی جو علی گڑھ میں تھی ولایت جاتے ہوئے رہن کر گئے تھے مگر جب یہ امر طے ہو گیا کہ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں قائم کیا جائے تو سید محمود نے اپنے اور سرسید کے رہنے کے لئے ایک اور کوٹھی خرید لی تھی اور پہلی کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ جب سرسید بنارس سے آئے تو اس کوٹھی کو اپنی ضرورت کے موافق درست کیا اور اس میں سکونت اختیار کی۔

جب وہ بنارس سے آئے تو ضلع علی گڑھ کے رؤسا اور معزز لوگوں نے اُن کو دعوت دی اور ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا، جس میں اضلاع قرب وجوار کے رؤسا بھی شامل تھے۔ اس جلسے میں سرسید کو ایڈریس بھی دیا گیا تھا جس میں ان کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کے لئے ان سے ظہور میں آئے۔ سرسید نے ایک فقرے کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے وہ ہم بجنسہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ ”ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین پر پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ میں بنا ہوں اور جہر

اسی میں میری خاک مل جائے گی ، صرف مدرسۃ العلوم کی محبت اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسانِ علیگڑھ وبلند شہر کی محبت وعنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے ۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو؟ دُور ودراز سفر اختیار کیا ۔ اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی ، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا ، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں ، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے ، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے ، جب کبھی کھیل کود ، عیش و آرام کے جلسے دیکھے ، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں ؟ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا ۔ سب سے اوّل یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ ہی پڑی ہے ۔"

فاؤنڈیشن سٹون کا جلسہ

الغرض سرسیّد علی گڑھ میں آکر ہمہ تن کالج کے کام میں مصروف ہو گئے ۔ کالج کی عمارتوں میں جلد جلد ترقی ہونے لگی ۔ ہندوستان کے اطراف میں چندے کے واسطے زیادہ تحریکیں اور کوششیں ہونے لگیں اور علی گڑھ صرف دار العلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی ، قومی اتحاد ، قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا ۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا ۔ پہلے یہ تجویز ٹھہری تھی کہ لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے یہ رسم ادا کی جائے گی ۔ لیکن لارڈ ممدوح کو کسی خانگی ضرورت کی وجہ سے پیش از وقت ہندوستان کو چھوڑنا پڑا ۔ پھر سر جان اسٹریچی لیفٹیننٹ گورنر شمال مغرب نے اس رسم کے ادا کرنے کا وعدہ کیا ۔ مگر سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے وہ بھی وقتِ معین پر نہ آسکے ۔ آخر لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشورِ ہند کے ہاتھ سے اس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا یہ رسم ادا ہوئی ۔ لارڈ لٹن نے دربار قیصری کے بعد دلّی سے مدرسۃ العلوم میں آنے کا وعدہ کر لیا تھا ۔ چنانچہ ۸ ۔ جنوری ۱۸۷۷ء کو مع لیڈی لٹن کے علی گڑھ تشریف لائے اور سرسیّد کے ہاں مہمان ہوئے ۔ سہ پہر کو وقتِ معین پر مع لیڈی صاحبہ کے فونڈیشن کے موقع پر تشریف لے گئے ۔ اوّل سیّد محمود نے ایڈریس پڑھا اور وائسرائے نے

اس کا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔ پھر سرسید نے بُنیاد کا پتھر رکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ حضورِ ممدوح نے بُنیاد کا پتھر اس موقع پر جہاں اسٹریچی ہال کے صدر مقام میں سنگِ مرمر کا کتبہ بُنیاد کے قریب لگا ہوا ہے اپنے ہاتھ سے رکھا اور فاؤنڈیشن کی تمام رسمیں یورپین قاعدے کے موافق ادا کی گئیں۔

وائسرائے نے علی گڑھ سے چلتے وقت اپنی تصویر اور کئی جلدیں اپنی تصنیفات کی سرسید کو بطور یادگار کے عنایت کیں۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں اُن کو ایک کشتی نقرئی بطور تحفہ اور یادگار کے بھیجی جس پر یہ عبارت کندہ تھی: "بیادگار رکھنے بُنیاد کالج کے بدستِ خاص وائسرائے بتاریخ ۵۔ جنوری ۱۸۷۷ء ونشانِ اعزاز بخشی و دوستی از جانب رابرٹ لارڈ لٹن جی، سی، بی وجی ایم ایس، آئی، اے وائسرائے وگورنر جنرل ہند بمولوی سید احمد خاں صاحب بہادر سی۔ ایس آئی پریذیڈنٹ اینگلو اورینٹل کالج اہلِ اسلام مقام علی گڑھ۔ تاریخ یکم جنوری ۱۸۷۷ء"

سید محمود نے جو اسکیم ۱۰۔ فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی، اس میں انہوں نے صاف اِس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ پس کمیٹی نے انگریزی میں جو اپنا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی" رکھا ہے اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیئے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دار العلوم نام رکھنا چاہیئے۔ اور بجز اس کے کہ گورنمنٹ نگرانِ حال رہے اس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دار العلوم میں نہ ہونی چاہیئے چنانچہ اس اسکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی، اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اس کا جواب یہ آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ اِن ایڈ نہیں دینے کی۔ باوجود اس کے سرسید کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اُن کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطعِ نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اُن کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس دار العلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلو سسٹم جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو مصروف رہنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے

لئے فیلو شپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام
قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لئے بمنزلہ آلہ کے ہو ۔ لیکن قطعِ نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف
قوم کے بھروسے پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، نہ طالب علم اور نہ ان کے مربّی کوئی اس بات پر راضی ہونے
والا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں قطعِ نظر کی جائے اور فی الحقیقت
مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو
فوزِ عظیم سمجھا جائے ۔ الغرض سرسیّد کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی ۔ یونیورسٹی قائم کرنے
کا خیال اُنہوں نے بالکل چھوڑ دیا اور مدرسۃ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں
تجویز کریں ۔ انہوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلّی دے لی ہے

نہ ہو تابِ پرواز اگر آسماں تک
تو واں تک اُڑیں ہو رسائی جہاں تک

چندہ وصول کرنے کی تدبیریں

مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندے کا وصول کرنا تھا جن کی اولاد کی تعلیم کے لئے مدرسہ
قائم کرنا منظور تھا اوّل تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے ۔ دوسرے جس وقت مدرسے کے لئے تحریک
شروع ہوئی اسی کے ساتھ رسالہ تہذیب الاخلاق جاری ہوگیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے
تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے اخباروں اور رسالوں
میں مدرسۃ العلوم کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے اور سرسیّد کی تکفیر کے فتوے شائع کئے جاتے تھے
مولوی وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے ۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ منصبی دباؤ سے
چندہ وصول کیا گیا ہوگا سو یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے ۔ سرسیّد نے مدرسہ قائم ہونے سے ایک ہی برس بعد
ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس سے پہلے جس قدر چندہ ہوا وہ زیادہ تر علی گڑھ ، لاہور ،
پٹنہ ، مرزاپور اور پٹیالہ وغیرہ سے ہوا ۔ بنارس میں جہاں وہ خود سرکاری عہدہ دار تھے ، انہوں نے اپنے
چند ہندو یا مسلمان دوستوں کے سوا کسی سے چندہ مانگنا پسند نہیں کیا ۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خاص کر
مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے ، جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ
نہ ہوتا تھا ، چندہ جمع ہونا نہایت مشکل تھا ۔ میں نے سُنا ہے کہ سرسیّد نے ولایت جانے سے پہلے ایک

روز نواب امّو جان مرحوم سے جو اُن کے قریبی رشتہ دار تھے برسبیلِ تذکرہ یہ کہا کہ کیوں حضرت آپ کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیئے دس لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اُنہوں نے نہایت تعجب سے کہا۔ "تم کیا دیوانوں کی سی باتیں کرتے ہو؟ مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے بھی وصول نہیں ہو سکتے" اِس حکایت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت چندے کی نسبت لوگوں کے کیسے خیالات تھے۔ باوجود اس کے یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ایک شخص کی تحریک یا کوشش سے بیس برس کے عرصے میں سات آٹھ لاکھ کی عمارت تیار ہو گئی اور مدرسے کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسّی ہزار روپیہ سالانہ تک اس میں خرچ ہونے لگا۔ ایک ایرانی سیّاح نے مدرسے کو دیکھ کر خود ہمارے سامنے یہ الفاظ کہے: "واللہ معجزہ می نماید کاریکہ از سلطنت بر نیاید چگونہ از فردِ رعیت سر انجام شدہ" مگر ہم سرسید کی اس کامیابی کو معجزہ نہیں سمجھتے، بلکہ کامیابی کے اسباب پر نظر کرتے ہیں۔ جن پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دانشمند اور راست باز آدمی استقلال اور ہمّت سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آسکتا ہے۔

سرسید نے مدرسے کے کام کو جس لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سمجھدار اور روشن خیال مسلمان اس کی طرف گرویدہ ہو گئے اور سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اس کی طرف اِلتفات ظاہر کرنے لگے اور اُس کے معاون بن گئے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کا اثر ذی مقدور لوگوں پر پڑنے لگا۔ اگرچہ مخالفین چلتی گاڑی میں برابر روڑہ اٹکاتی رہیں۔ مگر کام کی عظمت، اس کی تائید کرنے والوں کا اعتبار اور اُن کی وجاہت اور خود سرسید کا استقلال آہستہ آہستہ ہر ایک کی مخالفت کا مقابلہ کرتا رہا۔ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی سقیم حالت اور انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر ظاہر کرنی شروع کی اور مذہبی توہمات جو تبدیلِ حالت کے سدِّ راہ تھے شیئاً فشیئاً دُور ہونے لگے۔ سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لئے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اُسی کام میں صرف ہوگا سب سے زیادہ فراہمیٔ چندہ کا باعث ہوُا۔

سرسید کی سب سے بڑی تدبیر جس نے کالج کی عظمت کا نقش خاص و عام کے دل پر بٹھا دیا اور جس سے کالج کو بے انتہا مدد پہنچی وہ یہ تھی کہ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتیں تا بمقدور اعلیٰ درجے کے اسکیل پر بنانی تجویز کیں اور عمارات کے بنانے میں نہایت جرأت اور دلیری سے

کام لیا۔ اگر روپے میں کمی ہوئی تو قرض لے لے کر عمارتوں کو پورا کیا۔ اس تدبیر سے ایک طرف تو کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کی قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے۔ حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہونے لگی اور ہر شخص کو اس میں چندہ دینے کی ترغیب ہوئی اور دوسری طرف کرایہ کی آمدنی روز بروز بڑھنی شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ ۲۳ برس کے عرصے میں تقریباً دس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی۔ مگر بڑی بڑی عمارتوں کا بنوانا خود روپے کا محتاج تھا۔ سو اس کے لئے سرسید نے یہ تدبیر نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تخمینہ کر کے اس کو متعدد حصوں میں تقسیم کر دیا اور اشتہار دے دیا کہ فی حصہ اس قدر روپیہ خرچ ہوتا ہے جو شخص اتنا روپیہ دے گا اس کا نام عمارت پر کندہ کرایا جائے گا۔ مثلاً کالج کے بڑے احاطے کی سنگین جالیوں کے لئے فی جالی بیس روپے قرار دیئے اور اس طرح احاطے کا ایک بڑا حصہ تیار ہو گیا۔ یا بورڈنگ ہاؤس کی پختہ بارک کے لئے فی کمرہ پندرہ سو روپیہ مقرر کیا اور اس طرح ایک تعدادِ کثیر پختہ کمروں کی رفتہ رفتہ تیار ہو گئی۔ احاطے کے تین دروازے مقرر کئے اور جو شخص ایک دروازہ بنا دے اسی کے نام سے اس دروازے کو نامزد کرنا تجویز ہوا۔ اسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کر کے فی حصہ پانسو روپے مقرر کیا اور جتنے آدمیوں نے پان پانسو روپے دئے ان سب کے نام اس میں سنگ مرمر پر کندہ کرا دئے۔ اس کے سوا بہت سی عالیشان عمارتیں کالج کے بڑے بڑے محسنوں کی یادگار میں بنانی تجویز کیں۔ جن میں ان کے دوستوں اور ہوا خواہوں نے بطیبِ خاطر چندہ دینا قبول کیا۔ طالب علموں کے رہنے کے لئے بہت سے مکان قرض لے کر بنوائے اور ان کے کرائے کی آمدنی میں سے کسی قدر سود میں لگا دیا اور جب کہیں سے کچھ روپیہ بہم پہنچا فوراً قرضہ ادا کر کے ان کی کُل آمدنی مدرسہ کے تحت میں لے لی۔

صیغۂ تعمیرات کے سوا کالج کے اور اخراجات کے لئے سرسید نے نئے نئے طریقوں سے روپیہ وصول کیا جس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے۔ ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ ہر چند مسلمانوں کی طرف سے مخالفت ہوئی مگر سرسید نے پرواہ نہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا۔

لطیفہ ۔ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز درپیش تھی دو رئیس سرسید کے پاس آئے

اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرسید نے کہا جہاں ہم اپنی ذات کے لئے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لئے بھی ایک ناجائز کام سہی۔ سرسید کے ایک دوست وہاں موجود تھے، انہوں نے کہا "لاٹری کا گناہ درحقیقت رئیسوں اور دولت مندوں پر ہوگا۔ اگر وہ مدرسے کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی۔"

لاٹری کے سوا انہوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔ اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کرکے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دے دیا۔ جب خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انہیں دنوں میں سرسید کا پٹیالے جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپے طلب کئے جس پر انہوں نے ایک معقول رقم اُن کی نذر کی۔ ان کے ایک دوست قبائل کے دور دراز سفر سے علی گڑھ آئے۔ آپ سیادت کے دعوے سے ان کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لئے پہنچے اور وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انہوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کس سے مانگتا ہوں؟ اور کس طرح مانگتا ہوں؟ نمائش گاہِ علی گڑھ میں انہوں نے کتابوں کی دکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لئے دکان پر بیٹھے۔ نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی، پینی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔

پینی ریڈنگ کا جلسہ اس لئے قرار دیا گیا تھا کہ غریب طالب علموں کے وظیفے کے لئے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے۔ جب اس جلسے کی تجویز ٹھہری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے۔ اخباروں میں ہنسی اُڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا "اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں؟" جس وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انہوں نے ایک مؤثر تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

"کون ہے جو آج مجھ کو اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں

وہی جن کا دل چھوٹی شیخی اور چھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لئے نیک نیتی سے کئے جائیں ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے مکر و پندار کے کالے سوت سے بُنے ہوئے تقدّس کے برقعہ کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بدصورتی اور نہ دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرما جائے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور تفریح کا کام سمجھے۔"

"اے رئیسو! اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بُری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے۔ مگر اب انہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لئے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی یہ تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجاتِ تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے بچوں کے اخراجاتِ تعلیم میں مدد پہنچے۔ مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی۔ والنٹیر بنانے چاہے مگر بہت کم بنے اور جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسٹیج پر اس لئے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لئے کچھ کر سکوں"

اس کے بعد سرسید نے کچھ اور تقریر کی اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافہ دو اشعار حسبِ حال جلسے میں پڑھی:

ساقیا برخیز و در دہ جام را	خاک بر سر کُن غمِ ایام را
ساغرِ مے بر کفم نہ تا ز بر	بر کشم ایں دلقِ ازرق فام را
گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں	ما نمی خواہیم ننگ و نام را
بادہ در دہ۔ چند ازیں بادِ غرور	خاک بر سر نفسِ نافرجام را
دُودِ آہِ سینۂ نالانِ من	سوخت ایں افسردگانِ خام را

محرمِ رازِ دلِ شیدائے خود | کس نمی بینم ز خاص و عام را
دلآ رامے مرا خاطر خوش ست | کز دلم یکبارہ برُد آرام را
ننگہ و دیگر بسرو اندر چمن | ہر کہ دید آں سروِ سیم اندام را
قومِ ما اے قومِ ما از بہرِ تو | دادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب | عاقبت روزے بیابی کام را

غرض کہ سرسید نے مدرسے کی خاطر ہر بات کو اپنے نفس پر گوارا کیا۔ ۱۸۸۴ء میں جب پہلی بار انہوں نے لاہور میں لیکچر دیا، جہاں لاہور کے تمام جلیل القدر عہدہ دار اور حاکم اور شہر کے ہندو اور مسلمان رئیس اور ادنیٰ اور اعلیٰ تقریباً دس بارہ ہزار آدمی جمع تھے، تو مذہبی مخالفتوں کا ذکر کر کے انہوں نے کہا کہ "فرض کرو کہ میں ایک بدعقیدہ ہوں۔ مگر اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے لئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچّے پرورش پاتے ہیں، یا آپ کے لئے مسجد بناتے میں جس میں آپ خدائے واحد و ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں چوڑھے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ، سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھ کو بھی اس مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصوّر کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اس کے بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھائیے۔"

مدرسے کے لئے قلیل سے قلیل چندے کو بھی وہ ویسی ہی خوشی اور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے۔ لوگ دو دو آنے اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم چاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے ناچ کی محفل میں اہلِ محفل سے چندہ جمع کیا یہاں تک کہ طوائف اور سازندوں نے بھی مدرسے کی حقیقت سن کر خوشی سے چندہ دیا اور اس طرح سو سوا سو روپیہ جمع ہو گیا۔ انہوں نے سرسیّد کو اطلاع کی کہ ایسا اور ایسا روپیہ ہے۔

اگر کہئے تو بھیج دیا جائے۔ سرسید نے کچھ پس و پیش نہیں کیا اور وہ روپیہ منگوا لیا۔

مدرسے کے لئے انہوں نے لمبے لمبے سفر کئے پٹنہ، گورکھپور، الہ آباد، مرزا پور، لاہور، امرت سر، پٹیالہ، حیدر آباد، تیل گری، بھوپال، جبل پور اور دیگر مقامات میں صرف مدرسے کی دُھن میں گئے۔ لاہور اور حیدر آباد متعدد دفعہ اسی غرض سے جانا ہوا۔ ہزارہا روپیہ ان سفروں میں اُن کا صرف ہوا۔ اگرچہ اُن کے دوست اور رفیق بھی جو اُن کے ہمراہ جاتے تھے اپنا اپنا خرچ اپنی گرہ سے اُٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سرسید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا۔ اس کے سوا ہمیشہ ریزرو گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں اُن کی کمی زیادہ تر سرسید کو پورا کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار اُن کے ایک دوست نے اُن سے کہا کہ آپ ایک بار راجپوتانے کا بھی دورہ کیجئے۔ سرسید نے کہا روپیہ نہیں ہے۔ اُن کے منہ سے نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفر خرچ کمیٹی کو دینا چاہئیے۔ سرسید نے کہا میں اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسے کے لئے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

ایک اور طریقہ انھیں سفروں میں چندہ جمع کرنے کا اُنھوں نے یہ نکالا کہ جو احباب دعوت کرنی چاہتے تھے اُن سے نقد روپیہ لے لیتے تھے اور کالج کے چندے میں جمع کر دیتے تھے۔ جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے لگے تو انہوں نے خان بہادر برکت علی خاں کو ایک خط لکھا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب میری مہمانداری میں صرف کرنا چاہیں ازراہِ عنایت اس کی لاگت نقد عطا فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اس کو کالج کے چندے میں جمع کر دیا ہے۔ اِس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست نے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہوا کہ مدرسۃ العلوم کے کئی مزدوروں کو مزدوری ملی۔ وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ چند دوست بھی ہوں گے۔ پس اگر یہ طریقہ دعوت کا اختیار نہ کیا جائے گا تو جن کے ہاں ٹھیروں گا اُن پر خرچ کثیر پڑ جائے گا اور وہی مثل ہوگی۔ "گدھے کا کھایا کھیت جس کا

پاپ نہ پُن گے۔

حیدر آباد کے پہلے سفر میں جو ۱۸۸۲ء میں سرسید نے کیا تھا جس قدر روپیہ دعوت میں آیا وہ سب انہوں نے چندے میں جمع کر دیا تھا۔ جب وہاں سے واپس آئے تو علی گڑھ میں اُن کے احباب نے فی کس بیس روپے کے حساب سے دو سو بیس روپے اِس لئے جمع کئے کہ سرسید کو شکر گذاری کے طور پر دعوت دی جائے۔ سرسید نے کہا کہ اس کا انتظام میں خود کروں گا۔ وہ سب روپیہ اُن سے لے کر اور بیس روپے اپنے حصّے کے اس میں ملا کر دو سو چالیس رُپے کی دو اسکالر شپیں دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کے لئے مقرّر کر دیں۔ ان کے دوستوں نے کہا آپ نے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا اب ہم آپ سے دعوت لیں گے۔ اس پر مولوی محمد کریم مرحوم نے کہا، سیّد صاحب کی طرف سے میں سب صاحبوں کو دعوت دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دُھوم سے سب کی دعوت کی۔

سیّد محمُود کی شادی میں نواب انتصار جنگ نے سو روپے بطور اظہارِ مسرّت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کئے جائیں۔ اس پر سرسید نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار میں لکھا کہ ہمارے بعض دوست نیوتہ نہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیوتہ لینے کو موجود تھے اگر اس کا روپیہ اسی طرح مدرسۃ العلوم میں خرچ کرنے کو دیا جاتا۔ پھر لکھا کہ بعض دوستوں نے شکایت کی کہ شادی میں دعوتِ ولیمہ نہیں کی۔ مگر ہم نہ جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں۔ اگر دعوتِ ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانچسو روپے لگا سکتے تھے۔ سو ہم نے پانچسو روپیہ مدرسے میں دے دیا۔ پوتے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو ۱۸۹۳ء کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی سرسید نے ایک نہایت عمدہ تقریر کے بعد پانچسو روپے مدرسے کی نذر کئے تھے۔

حیدر آباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈیپوٹیشن لے کر حضورِ نظام میں ایڈریس پیش کرنے کو گئے تھے۔ چونکہ تمام ڈیپوٹیشن سرکارِ عالی کا مہمان تھا۔ سرسید کے دوستوں نے جو کچھ ان کی دعوت میں دیا وہ سب مدرسے کے چندے میں جمع کیا گیا۔ نواب انتصار جنگ نے غالباً ہزار روپے نقد دے دیئے تھے۔ مگر نواب محسن الملک نے بڑی دُھوم کی ایک گارڈن پارٹی دینی چاہی تھی۔ سرسید نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلواؤ۔ محسن الملک نے کہا نقد بھی لیجئے اور پارٹی بھی

ہو تے دیجیے۔ سر سید نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جس قدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دے دو۔" آخر پارٹی موقوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سر سید کی نذر کیا۔

ابتدائے قیامِ مدرسہ کے وقت جس طریقے سے سر سید نے نواب مختار الملک مرحوم کو مدرسۃ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار کے قابل ہے۔ انہوں نے مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعے سے ظاہر کی گئی تھی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ سر سید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگائے حیران اور فکر مند کھڑے ہیں اور اس سے کسی قدر فاصلے پر مختار الملک مع دو صاحبوں کے اِستادہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آرہا ہے جہاز جس میں بہت سے مسافر سوار ہیں اس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے۔ کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں، ان ڈوبتوں کے بچانے کو جہاز کی طرف جارہی ہے۔ اس کی جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں "وَن لَک رُپیز" سر سید اس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ "ناٹ سفی شینٹ" (یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے) ایک فرشتہ آسمان سے اترا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سر سید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سر سید سے کہتا ہے "لُک ایٹ دِس نوبل مین" (یعنی اس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔)

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم، کشتی جہاز والوں کی دستگیری کے لئے جارہی ہے اس سے مدرسۃ العلوم مراد ہے۔ اس کے پھریرے پر جو "ایک لاکھ روپے" کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اس وقت تک مدرسے کے لئے جمع ہوا تھا۔ سر سید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ابھارنے کے لئے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے۔ اس وقت خدا کی طرف سے ان کے دل میں یہ القا ہوتا ہے۔ کہ نواب افتخار الملک سے مدد مانگنی چاہیئے۔ فرشتے کا ان کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید تراب علی خاں مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اس کو دیکھ

کہ بہت متاثر ہوتے رہتا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی میرے دل پر متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خاص جاگیر سے اور اوّل تین سو اور پھر پانسو ماہوار سرکارِ عالی نظام سے مقرر کئے۔ اس کے بعد جب حضورِ نظام نے عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانسو روپے ماہوار کا دو دفعہ کر کے اور اضافہ ہوا اور پھر سنہ ۱۸۹۱ء میں جب سرسید ڈیپوٹیشن لے کر حیدرآباد گئے تو حضورِ نظام نے بجائے ایک ہزار کے دفعتہً دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے مقرر کیا اور اس کی سند سرسید کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجے تک پہنچ گیا۔

غرضکہ اس قسم کی بے شمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسہ کے لئے سرمایہ جمع کیا ہے۔ ولایت سے واپس آکر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے۔ اس عرصے میں برابر ان کو یہی اُدھیڑبُن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور کیونکر مسلمانوں کے لئے اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرستہ العلوم میں مہیا کیا جائے۔ اُن کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا انہوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لئے تھے۔ اولاً انہوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرستہ العلوم کے سوا رفاہِ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا، شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا، اپنے کنبے کے حق داروں کے سوا عموماً مساکین و غربا کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یک قلم موقوف کر دئے اور جہاں تک ہو سکا مدرسے کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں دوستوں سے بھی لیا اور اپنے دل میں ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسے کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو ان کو دوست اور عزیز سمجھا اور اگر دوستوں اور عزیزوں نے پہلو تہی کی تو ان کو سو غیروں کا غیر جانا۔ انہوں نے ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی مقدور آدمی تھے مگر مدرسے کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے صاف یہ کہلا بھیجا کہ بغیر مدرسے کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے جب سے انہوں نے مدرسے کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا، مروّت اور لحاظ کو جو اُن کی جبلّی خصلت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا۔ جن سے بے تکلفی اور خالص دوستی

تھی اکثر اُن کا نام اور اُن کی رقم چندے کی فہرست میں بغیر اُن کے استمزاج کے لکھ دی جاتی تھی اور اُن کو صرف اُس وقت خبر ہوتی تھی جب اُن سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے اور ادھر سے سخت اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر دئے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سر سید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بدلاتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے۔ اس پر سعدی کا ایک شعر یاد آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرے لگ جائیں تاکہ حسب حال ہو جائے۔ سو ایک خدا کے بندے نے مصرعے لگا دئے اور اب شعر کی یہ صورت ہو گئی۔

پیش ازیں سعدیٔ روشن دل و آزاد منش	گفت در باب گدایان سخن از صدق و یقیں
"گر گدا پیش رو لشکرِ اسلام بود	کافر از بیم توقع برود تا درِ چیں"
لیک در نوبت ما کار بجائے برسید	کہ بہ کافر چہ رسد خود بتواں گفت چنیں
گر گدا پیش رو لشکرِ اسلام بود	ہم مسلماں رود از بیم سوالش تا چیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کے لئے چندہ کھولا گیا۔ سر سید نے اپنے قدیم دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندے کا تقاضا کیا۔ انہوں نے بدمزہ ہو کر کہا "صاحب! ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے" سر سید نے کہا "ارے میاں اب کوئی دن میں ہم مر جائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا" یہ الفاظ کچھ اس طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً ادا کیا گیا۔

چندے کے علاوہ جب کبھی ان کو دوستوں سے کچھ اُچک لینے کا موقع ملا انہوں نے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "خانۂ دوستاں بروب و درِ دشمناں بکوب" ایک روز مسٹر تھیوڈر بک کے والد جو سیاحت کے لئے ہندوستان آئے ہوئے تھے، ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اس کے لینے سے انکار کرتے تھے۔ آخر دونوں صاحب سر سید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ سر سید نے بہت

بدمزہ ہو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو روکرنا نہایت بداخلاقی کی بات ہے۔ انہوں نے وہ اشرفی لے لی۔ سرسید نے کہا دیکھوں کس سکّہ کی اشرفی ہے اور اُن سے لے کر مدرسے کے کھاتہ میں جمع کر دی۔ اسی طرح ایک دن سیّد محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپے کی شرط بدی اور یہ ٹھیرا کہ جو ہارے پچاس روپے مدرسے میں دے۔ اتفاق سے سیّد محمود ہار گئے۔ وہ سو روپے کا نوٹ لے کر آئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپے دیجئے اور نوٹ لیجئے۔ انہوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے شرط بدنا جائز بھی نہیں ہے۔ سرسیّد بھی وہیں موجود تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسے میں آتا ہے فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے اور فوراً بکس میں سے پچاس روپے نکال کر سیّد محمودؔ کو دے دیئے اور نوٹ لے لیا۔

اس قسم کے صدہا واقعات روزمرہ گزرتے تھے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو، جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولت مند مسرف یا بخیل، علماء زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں، وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی متصور ہو، کوئی شخص نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ سرسیّد کی طرح اپنے تئیں اس کام میں فنا نہ کر دے اور جو فائدے کہ وہ اپنی عقلمندی، شہرت، لیاقت وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اٹھا سکتا ہے اُن سے آپ دست بردار ہو کر اس کام پر وقف نہ کر دے۔

دوستوں کے علاوہ اجنبی اور انجان آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید ہوتی تھی، شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں اُن کی باری نہ آتی ہو، ورنہ اکثر صاحب سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا، اور اس میں کچھ مسلمان ہی کی خصوصیت نہ تھی۔ بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسیّد نے محض ایک اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلے میں ٹھیرا تھا، چندہ طلب کیا۔ اُس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لئے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسیّد نے کہا بے شک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے

ہاتھ پسارنا پڑتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہوگیا تو انگریزوں کے لئے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ وہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے یہ وہ انگریز یہ سن کر شرمندہ ہوا اور اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سرسید کی نذر کیا۔

سرسید نے مدرسے کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ کوئی سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرستہ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ جو کوششیں بظاہر وہ خاص اپنی ذاتی اغراض کے لئے کرتے تھے ان سے بھی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود ان کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچتا تھا جس قدر کہ مدرستہ العلوم کو پہنچتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے یا پرائے کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے ۔ درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی ملاقات یا دوستی یا وجاہت سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ مدرستہ العلوم کے سوا کسی کو پہنچانا نہیں چاہتے تھے ۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے ایک جلیس سے کہا کہ " تو اوروں کے فائدے کے لئے سفارش مت کیا کہ کیونکہ اس سے تیرے فائدوں میں کمی پڑے گی" اگرچہ یہ نصیحت جن معنوں میں کی گئی تھی اس کو کوئی کریم النفس آدمی قبول نہیں کر سکتا۔ مگر جن معنوں میں سرسید نے اس پر عمل کیا وہ ایک جوانمردانہ خصلت تھی جو سرسید کے سوا کسی میں نہیں دیکھی گئی ۔ وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا بُرا ماننا گوارا کرتے تھے اور جو خوشی لوگوں کی سفارش اور حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے اُس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے ۔ سرسید کے ایک معزز ہم وطن نے ایک رفاہِ عام کے کام میں ان کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر بنانا چاہا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں صلاح و مشورے سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ نہ خود دوں گا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا ۔ اگر اس شرط پر ممبر بنانا منظور ہو تو مجھ کو ممبری سے کوئی انکار نہیں ۔

لطیفہ ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی سرسید سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ تعریف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گزری ہے ۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھ کو یقین ہوگیا کہ

ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی"۔ سرسید نے اس کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس سے مجھ کو کچھ تعلق نہیں ہے اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا"۔

عماراتِ کالج

ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال اور ان کی تفصیل مفصّل طور پر بیان کی جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعۂ زمین کو چند سال میں محض قومی چندے سے گلزار بنا دینا اور سیکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے انہیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر ان کی لائف میں کرنا ضرور ہے لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب محسن الملک کا ارادہ کالج کی مفصّل تاریخ لکھنے کا ہے اور امید ہے کہ اس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا۔ اس لئے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر جو اصول کہ سرسید نے ان عمارات کے بنانے میں محفوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے انہوں نے یہ دشوار کام آسان کیا ہے اور جن مصالح سے وہ برخلاف اکثر ممبرانِ کمیٹی کی رائے کے تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدّم سمجھتے رہے، اُن کو کسی قدر بیان کرنا ضرور ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اُن میں سے بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روادار ہوں۔ کیونکہ ابتدا میں تعلیم ہی کے اخراجات کے لئے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا، چہ جائیکہ لاکھوں روپے کی عمارتیں تیار کرائی جائیں۔ مگر سرسید نے کالج کی ترقی بلکہ اس کا قیام و دوام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ درجے کے اسکیل پر عمارتیں بنائی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کے لئے جس سے عام لوگوں کو اس کی طرف ترغیب ہو۔ ایک مدّتِ دراز درکار ہے اور تعلیم و تربیت کی خوبی کے سمجھنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں میں ہمیشہ معدودے آدمی ہوتے ہیں۔ البتہ عمارات کی شان و شوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فوراً خاص و عام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرسید کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا

فی الواقع کالج کی عظمت کا اقبال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا یہ زیادہ تر اس کی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا۔ خصوصاً گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں جن کی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اس کی وقعت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جب کہ ایجوکیشن کمیشن نے علی گڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا، اس وقت علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ نے جو کمیشن کی لوکل کمیٹی کے ممبر تھے، علی گڑھ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے جواب میں بورڈنگ ہاؤس محمڈن کالج کی پختہ بارک کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ "جس وقت میں نے کمروں کی اس قطار کو دیکھا جو بعد مکمل ہونے کے تمام دنیا میں اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی۔ تو مجھ کو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آئندہ کی نسبت نئی ہمت پیدا نہ ہو" میرے ایک عزیز دوست جو ولایت میں تعلیم پاکر آئے ہیں اُن کا بیان ہے کہ "انگلستان کے نامور سیاح ریورنڈ کینن بارنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کہیں آکسفورڈ یا کیمبرج کے کالجوں کے نمونے کا کالج سوائے محمڈن کالج کے نہیں دیکھا۔

سرسید کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانے کا خیال اس نظر سے بھی ضرور ہونا چاہیے تھا کہ آئندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹی ٹیوشن کا عظم و شان دیکھ کر اس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں برخلاف اہلِ یورپ کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اگلوں نے جو کام ادنیٰ درجے کی حالت میں چھوڑا ہے اس کو اعلیٰ درجے تک پہنچائیں۔ یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں، اُن کو پورا کر دیں۔ ہم ایسے بہت سے مدرسے اور خانقاہیں نشان دے سکتے ہیں جن کے بانی اُن کو ناتمام چھوڑ کر مر گئے اور وہ چند روز میں کھنڈر ہو گئیں۔ لیکن اکثر اوقات عمارت کا عظم و شان اُن ملکوں میں لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس کو جس طرح ہو سکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو اسٹریچی ہال کی نسبت جب کہ وہ بالکل مرتب اور تیار ہو چکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ "جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی ایسے کام کر گزرتے ہیں کہ جو زندوں سے نہیں ہو سکتے" بہرکیف اس انسٹی ٹیوشن کے قائم و

برقرار رہنے کی اگر کچھ اُمید ہوسکتی ہے تو انہیں عمارتوں کی بدولت ہوسکتی ہے جن کی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار کیا ہے کہ اگر (خدانخواستہ) کالج بند ہو جائے تو تمام عمارتیں گورنمنٹ کے قبضے میں چلی جائیں۔

سرسیّد نے اِن عمارتوں میں آئندہ نسلوں کے فخر و مباہات کے لئے ایک نہایت مؤثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور پختہ عمارتوں پر اُن کے بانیوں کے اور کالج کے مُحسنوں، مربّیوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں بڑے اہتمام سے کندہ کرائے ہیں۔ ان میں بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں، کچھ زیرِ تعمیر ہیں، کچھ ناتمام پڑی ہیں اور بہت سی قوم کی فیّاضی کی منتظر ہیں۔ اگر قوم میں کچھ جان باقی ہے تو وہ ضرور ان معزز ناموں اور معزز کتبوں کی لاج رکھے گی۔ اور اس قومی یادگار کو صفحۂ روزگار سے مٹنے نہ دے گی۔ سنا ہے کہ کالج کے احاطے کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کُھدے ہوئے دیکھ کر ایک یورپین افسر نے کہا تھا کہ "یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے گویا کہ مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے۔"

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ان عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو۔ مثلاً اکثر محرابیں سیریسنک اسٹائل پر بنوائی گئی ہیں یا بورڈنگ ہاؤس کے صدر دروازے کی پیشانی پر کھجور کا درخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور ہلال و تاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے مثبت کرایا گیا ہے اکثر انگریزوں کی اسپیچیں جن میں مسلمانوں کو غیرت اور اُن کے اسلاف کی عظمت یاد دلائی گئی ہے جابجا پتھروں پر کندہ کرادی ہیں۔ جن یورپین افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے اُن کی عالی شان یادگاریں بنوائی گئی ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کو آئندہ زمانے میں اس بات پر فخر کرنے کا موقع ملے کہ اُن کے اسلاف اپنے محسنوں کے کیسے شکر گزار اور دل سے قدر کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کے لئے ماہواری یا سالانہ ایک رقم معین ہونی چاہئے کہ اس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پائے۔ بے شک یہ ایک نہایت سلامت روی کی چال تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسیّد نے جو ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے یہ ہرگز ظہور میں نہ آتا اور کالج کی وقعت جو دفعتہً تمام زمانے کے دل میں پیدا ہو گئی، اس کے لئے ایک مدت دراز تک انتظار کرنا پڑتا اور سرسیّد

کے بعد کسی سے یہ اُمید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے چاؤ اور اُمنگ سے سر انجام کرتا جیسے کوئی اپنا محل تیار کرتا ہے۔ حالانکہ سرسیّد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہمیشہ تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کا کام کرتا رہا ہے، اور ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا نادرات سے ہے۔ باوجود اس کے انہوں نے اس قطعۂ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادۃ کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں تمام تمام دوپہر اور تمام تمام دن سخت سے سخت موسموں میں وہ خود مدرسہ پر جا جا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگتراشوں سے کام لیا ہے۔ باوجود اس تن و توش کے وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے، کنویں کھدواتے تھے، ہل چلواتے تھے، روشیں بنواتے تھے، دُور دُور سے ہر قسم کی پود منگواتے تھے جو اُن کے روبرو باغ میں لگوائی جاتی تھی۔ باوجود ان تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام ان کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینئر یا اوورسیئر تھا جس سے اصلاح لی جائے، نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو۔ جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لئے گئے انہوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں، اس لئے سرسیّد کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی تجویز کرنا پڑتا، اور خود ہی اس کے تمام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے، معماروں اور سنگ تراشوں کو خود بیٹھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی اور پھر جب تک وہ کام ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اسی طرح بنتا ہے یا نہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ بعض یورپین انجینئروں نے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کو دیکھ کر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجینئر کی صلاح و مشورے کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ باایں ہمہ ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجینئرنگ کے اصول کے موافق یا طلباء کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو۔ لیکن ہم کو اس قومی انسٹی ٹیوشن کے لئے ایسا انجینئر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لئے روپیہ فراہم کرے، خود ہی عمارت بنوائے، ایک کوڑی تنخواہ کی نہ لے، نہایت دیانتداری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔

بعضے لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیئے تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں ایسی عالیشان عمارتیں بنانی کیا ضرور تھیں۔ بعض کہتے ہیں بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی

ہیں ان کے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی - جس قدر روپیہ آتا جاتا اسی قدر عمارتیں بنتی جاتیں۔ بعضے اور اور اعتراض کرتے ہیں - مگر افسوس ہے کہ نہ انہوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھایا ہے۔ اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھیک مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بنائی ہو۔

مشکلے دارم ز دانش مندِ مجلس باز پرس کار فرمایاں چرا خود کار کمتر می کنند

عمارات کے متعلق اخیر بات جو سر سید کی لائف میں ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سر سید نے باوجود اس کے کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر درحقیقت انہیں کو حاصل تھا ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں ان کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے جب اول ہی اول میں کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی - تو اُن کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسۂ احمدیہ رکھا جائے۔ بلکہ کلکتہ کے ایک اخبار "اردو گائڈ" نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچے میں چھاپ بھی دیا۔ مگر سر سید نے اس کی مخالفت کی اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج اُن کے نام سے موسوم کیا جائے - اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں نے سر سید کی اطلاع اور مرضی کے بغیر ایک عمارت ان کی یادگار میں بنانے کے لئے چندہ کھولا اور کالج کا دروازہ ان کی یادگار میں بنانا اور اس پر سر سید کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا انہوں نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ وصول کرنے کی آپ امید رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں میری اور میرے کاموں کی مطلق وقعت نہیں ہے پس آپ چندہ کس سے وصول کریں گے۔ مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سر سید دو شرطوں پر راضی ہوئے - ایک یہ کہ دروازے کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے اس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کے لئے یہ کالج بنایا ہے - دوسرے یہ کہ جو کتبہ دروازے کے اندرونی جانب لگایا جائے اس پر مولوی سمیع اللہ خاں اور حاجی اسمٰعیل خاں کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے ہیں کندہ کرایا جائے۔ حاجی صاحب نے پہلی شرط تو بہ اکراہ قبول کر لی مگر دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آج تک کہیں ایسا نہیں سُنا گیا کہ خاص شخص کی یادگار میں اوروں کے نام بھی شریک کئے جائیں - سر سید نے کسی طرح نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں - چنانچہ دروازے کے پیش طاق پر چند عربی اشعار کندہ کرائے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں ہے اور اندرونی جانب حاجی محمد اسمٰعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کا نام بھی شامل کیا گیا -

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سر سید کو مجبور کر دیا تھا بڑی وجہ سر سید کے

راضی ہو جانے کی یہ تھی کہ ان کو اپنی یادگار کے حیلے سے احاطۂ بورڈنگ ہاؤس اور کالج کا صدر دروازہ جو ایک نہایت ضروری عمارت تھی اور بورڈنگ ہاؤس کے چھ پختہ کمرے تیار ہوتے نظر آتے تھے جن کا بغیر اس حیلے کے تیار ہونا نہایت دُشوار تھا۔ چنانچہ ۲۶ جون ۱۸۸۹ء کے جلسے "کمیٹی یادگار سرسید احمد خاں" میں مولوی سید فرید الدین احمد خاں نے صاف کہا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس چندے سے بورڈنگ کی ایک ضروری عمارت کا بننا تجویز نہ کرتے تو سید احمد خاں اس کی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض یورپین افسروں نے تحریک کی کہ یہاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فاؤنڈرز ڈے (یعنی بانیِ مدرسہ کی سالگرہ کا دن) بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں ہر سال کالج کے ہوا خواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا کریں اور کچھ تماشے تفریح کے طور پر کئے جایا کریں۔ سرسید نے اس کو بھی منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ "ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے چندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپے سے قائم ہو، اس کے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کی جائے۔ اس لئے میرے نزدیک بجائے فونڈرز ڈے کے فونڈیشن ڈے (یعنی کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اسی تجویز کے موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے کس لئے اپنی یادگار قائم کرنے کی مخالفت کی تھی؟ تمام دُنیا میں خاص کر اُن ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد ان لوگوں کی شکر گذاری کے طور پر جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں اور اس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ناشکری و احسان فراموشی کا دھبّہ نہ لگے اور آئندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیر خواہی کا حوصلہ پیدا ہو۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کرنے سے سرسید لوگوں کو مانع آتے تھے؟۔

اس کا جواب بہت صاف ہے جن ملکوں میں قومی بھلائی کے کام کرنے اور محض قوم کی خیر خواہی

میں اپنی عمریں صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور جہاں ہر زمانے میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی
ہیں، وہاں کبھی ایسے لوگوں پر جو ایسے کام کرتے ہیں خود غرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا۔ بلکہ ادنیٰ سے
لے کر اعلیٰ اور جاہل سے لے کر عالم تک سب دل سے اُن کی عزت کرتے ہیں، ان کا احسان مانتے
ہیں، اُن کو مدد دیتے ہیں اور اُن کی شکر گزاری اور آئندہ نسلوں کا دل بڑھانے کے لئے اُنکی یادگاریں
قائم کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کا حال اس کے برخلاف ہے۔ یہاں ایسی مثالیں کمیاب بلکہ نایاب
ہیں کہ کوئی شخص بے شائبہ غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کر دے، رات دن اسی اُدھیڑ بُن
میں لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لے۔ اس لئے اگر حُسنِ اتفاق سے قرنوں اور صدیوں
کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اس کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ
ظاہر کرتا ہے اُس کا نمونہ قوم میں موجود نہیں ہوتا۔ اس لئے اُس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے رخنے
بند کرنے پڑتے ہیں تاکہ قومی رفاہ کے کام میں خلل واقع نہ ہو اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ کر امداد اور
اعانت سے پہلوتہی نہ کریں۔ چنانچہ ایک آدھ موقع پر جس کا ذکر دوسرے حصے میں کیا جائے گا کسی
وجہ سے جو سر سید اس مصلحت کا لحاظ نہ کر سکے تو نہ صرف ان کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست
اُن کی طرف سے کھٹک گئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔

تعلیم

کالج میں اوّل دو ڈیپارٹمنٹ قائم کئے گئے تھے۔ ایک انگریزی ڈیپارٹمنٹ
جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھایا جانا تجویز ہوا تھا، دوسرا اورنٹیل ڈیپارٹمنٹ
جس کی پڑھائی مقرر کرنی کمیٹی کے اختیار میں تھی اور اُردو میں علوم جدیدہ اور فارسی و عربی
ادب اور علومِ قدیمہ پڑھائے جانے قرار پائے تھے اور انگریزی کے لئے بطور سیکنڈ لینگویج کے
صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لئے سر سید انگلستان سے بڑے بڑے
نامور علماء و فضلاء سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ایک فہرست لکھوا کر اپنے ساتھ لائے تھے جس
میں ہر فن کے علماء نے اپنے اپنے فن کی نہایت مستند اور معتبر کتابیں لکھی تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہندوستان
میں ان کا ترجمہ کرا کے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کی پڑھائی میں داخل کریں۔ مگر سوا اس کے کہ شمس العلماء
مولوی محمد ذکاء اللہ نے اس فہرست کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بطور خود کر دیا اور کوئی نتیجہ اس سے پیدا
نہیں ہوا۔ کچھ عرصے تک دونوں ڈپارٹمنٹ جاری رہے۔ مگر اورنٹیل ڈپارٹمنٹ روز بروز تنزلی کرتا

جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بلا مبالغہ طلباء کی تعداد سے اُستادوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ چونکہ طالبعلموں اور ان کے مربیّوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم میں کوئی امید دنیوی فائدے کی نہ تھی اس لئے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پسند نہ کرتا تھا۔ آخر مجبور ہو کر اسے توڑ دیا گیا۔ مگر انگلش ڈپارٹمنٹ جیسا کہ آگے کسی موقع پر بیان کیا جائے گا روز بروز ترقی کرنے لگا۔

کالج کلاس کا قائم کرنا

۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ابتدائی مدرسہ کھولا گیا تھا اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی۔ نیز اسی سال محمڈن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور ۱۸۸۱ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور ۱۸۸۷ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ اور اسی طرح سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم میں اور نیز قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ الفیلیٹ ہو گیا۔ جو ترقی گزشتہ ۲۳ سال میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اِس کالج نے کی ہے اس کے متعلق مفصّل حالات کالج کی سالانہ رپورٹوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ یہاں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس کالج کی بدولت صوبہ شمال مغرب و اودھ کے مسلمان گریجوئیٹس[1] کی تعداد میں بمقابلہ ہندو گریجوئیٹس کے کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

۱۸۹۵ء میں جو لیکچر آنریبل سید محمود نے ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام علی گڑھ دیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبۂ مذکور کے سوا ہندوستان کے ہر ایک صوبے میں سنہ مذکور تک مسلمان گریجوئیٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوئیٹس کے اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اُس کو صفر سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً بنگال میں جہاں مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان گریجوئیٹس فیصد ۴۵،۹ ہونے چاہئیں وہاں اُن کی تعداد ۳،۴ سے زیادہ نہیں نکلی اسی طرح مدراس میں بجائے ۷،۸ کے صرف ۹ر اور بمبئی میں بجائے ۲۱،۵ کے ۱،۲ اور پنجاب میں بجائے ۵۱،۹ کے ۲۵ فیصد برآمد ہوئی تھی برخلاف اضلاع شمال مغرب و اودھ کے جہاں نسبتہً مسلمان گریجوئیٹس کی تعداد ۱۱،۲ ہونی چاہئے تھی۔

---

[1] صوبہ شمال مغرب و اودھ کے گریجوئیٹس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اُس صوبے کے کسی کالج میں تعلیم پا کر یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہو۔ نہ صرف وہ گریجوئیٹ جو خاص صوبۂ مذکور کے باشندے ہوں کیونکہ اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے پنجاب سے آ کر محمڈن کالج میں تعلیم پائی اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

لیکن معلوم ہوا کہ سنہ مذکور تک اُن کی تعداد ۱۷۶۴ تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ محمڈن کالج نے قطعِ نظر اور فوائد کے جن کا ذکر دوسرے حصے میں کیا جائے گا۔ خاص کر ترقیِ تعلیم کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اس قلیل عرصے میں کچھ کم فائدہ نہیں پہنچایا۔

تفسیر القرآن

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اُسی وقت سے اُن کو اِس بات کی فکر تھی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لئے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے، اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی کا اُن کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر یا فی الحقیقت عقل یا قانونِ قدرت کے خلاف ہو اُس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علم طبیعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلے پر ان کو مل رہا ہے۔ اُن کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالکِ یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے۔ اسی لئے اِن کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جس کو وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۶ء میں کہ یہی زمانہ اُن کے تفسیر شروع کرنے کا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک اسپیچ میں خاص کر مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم اِن دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے اور تبھی ہماری قوم کو عزت ہو گی۔"

لیکن باوجود اس اندیشے کے وہ مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے نہایت ناگزیر اور ضروری جانتے تھے اور اسی کے ساتھ جیسا کہ انہوں نے اپنی اکثر تحریروں اور اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے اُن کو یہ بھی یقین تھا کہ خالص اسلام جس کو وہ ہمیشہ ٹھیٹ اسلام سے تعبیر کرتے تھے اُس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے۔ اُن کا ہمیشہ یہ قول رہا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا مغربی علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک تصوّر کرتے ہیں اور اس لئے مسلمانوں میں اُن کا پھیلنا نہیں چاہتے، وہ درحقیقت اسلام کو بہت بودا اور کمزور مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ انہوں نے ایک موقع پر کہا کہ "یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانے میں سچّا مانا جاتا ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفے کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا۔" البتہ وہ یہ ضرور رکھتے تھے کہ جس مجموعۂ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلے میں قائم نہیں رہ سکتا۔

الغرض اُن کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اُن کا انسداد کیا جائے، لیکن جو طریقہ استدلال کا زمانہ گزشتہ میں یونانی فلسفے کے مقابلے کے لئے ہمارے متکلمین نے اختیار کیا تھا اور جس سے رفتہ رفتہ ایک نیا فلسفہ بنام علم کلام کے پیدا ہو گیا، وہ کسی طرح فلسفۂ حال کے مقابلے میں کچھ کام نہیں دے سکتا تھا کیونکہ برخلاف یونانی فلسفے کے جس کا مدار محض قیاس اور ظن و تخمین پر تھا، فلسفۂ حال کا ہر ایک مسئلہ تجربے اور مشاہدے سے ثابت کیا جاتا ہے۔ پس ضرور تھا کہ جس طرح مسائلِ حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے اسی طرح اُس کے مقابلے کے لئے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔

ہمارے علماء جو فلسفۂ قدیم اور علوم دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلّم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کے لئے کھڑے ہوتے، اُن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یونانی فلسفے کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی

زبان بھی دُنیا میں موجود ہے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ نہ صرف کرسچینٹی یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دُنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے ارادے میں کم و بیش کامیابی حاصل کر سکتے۔ اُن کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدما کی پیروی کے دائرے سے قدم باہر رکھ سکیں اور طعن و ملامت کے خوف اور مرجع خاص و عام بننے کی خواہش نے آزادی کا جوہر ان کی طبیعتوں میں بالکل نہیں چھوڑا۔

بہرکیف سرسید کو اس طرف سے بالکل مایوسی تھی کہ ہمارے مسلّم الثّبوت علماء اس ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے۔ پس انہوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں، اس کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمّے لیا۔ انہوں نے اپنی ایک اسپیچ میں اس معاملے کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصّل طور پر بیان کئے ہیں جن میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا کہ "جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجّت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلاشک اُن کا ایمان اور اُن کا یقین بہ نسبت اُن لوگوں کے جو دلیل و حجّت سے اپنے عقیدے کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے کیونکہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پانے کی اس میں گنجائش ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں اُن کے ایمان کو اپنے اور کسی سے کیوں کہوں، اپنے ایمان سے تو بہت مستحکم جانتا ہوں۔ خدا کے ماننے اور رسولؐ پر یقین کرنے کے لئے ان کو کسی منطقی دلیل اور فلسفی بُرہان کی حاجت نہیں۔ کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و ناقابلِ یقین صحیح یا غلط ان کے سامنے یہ کہہ کر کہ "خدا و رسولؐ نے فرمایا ہے" بیان کی جائے، وہ فوراً اس پر یقین کریں گے۔ پس ایسے لوگ ہماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں اُن کو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا ہوں۔"

"مگر اُن کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لئے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اُس کو بتائے جائیں۔ اور

اس کے دل کے شبہے مٹائے جائیں تاکہ اس کے دل کی تشفی ہو۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو دھکڑ پکڑ ہو اور وہ زبان سے لوگوں کے ڈر یا سوسائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کہا کرے یہی وہ لوگ ہیں جو ہمارے مخاطب ہیں اور جن سے ہم کو بحث ہے۔"

جس زمانے میں خلفائے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی۔ اس وقت مسلمانوں میں فلسفہ یونانی اور علم نے کثرت سے رواج پایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مسائل میں جو اسلام سے متعلق تھے لوگوں کو شبہہ پیدا ہوا۔ کیونکہ جو لوگ ان مسائلِ فلسفہ و علمِ طبیعی کو سچ جانتے تھے اور ان میں اور اسلام کے مسائل میں اختلاف پاتے تھے ان کو اسلام کی نسبت شبہہ پیدا ہوتا تھا۔ وہ زمانہ اسلام پر ایسا سخت تھا کہ اسلام کے سخت سے سخت دشمن کے حملے سے بھی اس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ علماء کو اس وقت اسلام کی حمایت کی ضرورت پڑی اور انہوں نے اس کی حمایت اور نصرت میں کوشش کی۔ خدا ان کی کوششوں کو قبول کرے۔ پس میرا خیال ہے کہ جس زمانے میں اسلام کی ایسی حالت ہو اور اس پر ایسا ہی حملہ ہو، جیسا کہ اس زمانے میں ہوا تھا تو ہم کو بقدر اپنی لیاقت کے ویسی ہی کوشش کرنی چاہیئے۔"

اے دوستو! تم خوب جانتے ہو کہ اس زمانے میں جدید فلسفہ و حکمت نے شیوع پایا ہے۔ جس کے مسائل ان اگلے مسائل سے بالکل مختلف ہیں اور وہ مروجہ اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسے کہ اس زمانے میں تھے۔ مگر اس زمانے کی تحقیقات اور یونانی حکمت کے مسائل میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اس زمانے کے مسائل حکمیہ زیادہ تر عقلی اور قیاسی دلیلوں پر مبنی تھے۔ ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی مسائل کو عقلی براہین سے توڑ دیں اور ان کو تسلیم نہ کریں۔ مگر اس زمانہ میں مسائلِ علم طبیعی تجربہ سے ثابت کئے جاتے ہیں۔ اور وہ دکھلا دیئے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جائیں یا ان تقریروں اور اصولوں سے جو اگلے زمانے کے عالموں نے قرار دیئے ہیں، ہم ان کا مقابلہ کر سکیں۔"

"اس لئے اس زمانے میں ایک جدید علمِ کلام کی حاجت ہے۔ جس سے یا تو ہم علومِ جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھیرا دیں یا اسلامی مسائل کو ان سے مطابق کر دکھائیں۔ اس وقت جو بزرگ اس جلسے میں موجود ہیں میں ان سب سے واقف نہیں ہوں۔ مگر میں یقین کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں، میں سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا ان کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے، وہ سب گنہ گار ہیں اور یقیناً گنہ گار ہیں۔"

"میں ایک شخص ہوں جس کا یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبیعی سے بخوبی واقف ہو، اور اُن تمام اسلامی مسائل پر جو اِس زمانے میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے۔ میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ اسلام پر ہو۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے، اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی اُن کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں، اُسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی طرف سے بدظنی، بے پروائی بلکہ رُوگردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ اُن غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نُورانی چہرے پر لگ گئی ہیں یا نادانستہ لگا دی ہیں۔"

"میں ہرگز اِس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرے پر سے اُن غلطیوں کے سیاہ دھبّوں کے چھڑانے کا دعویٰ کروں۔ یا حمایتِ اسلام کا کام اپنے ذمّے لوں۔ یہ منصب اور یہ فرض دوسرے مقدّس اور باعلم لوگوں کا ہے۔ مگر جب کہ میں مسلمانوں میں اِن علوم کے پھیلانے کا ساعی ہوں جن کی نسبت ابھی ابھی میں نے بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط، جو کچھ میرے امکان میں ہو اُس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اس کے اصلی نورانی چہرے کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہ گار ہوں گا۔"

"اے میرے دوستو! میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھ کو بجز اِس کے جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کر دوں۔ اور کچھ چارۂ کار نہ تھا تو مجھ کو ضرور وہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے۔ اگر میں نے بُرا کیا ہے۔ وہ چاہے گا معاف کرے گا چاہے گا نہ کرے گا۔ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اس کا صلہ کسی بندے سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ بُرا مانتا ہوں جو لوگ میری اِن کوششوں کے سبب بُرا کہتے ہیں، کافر بتلاتے ہیں، میں اُن سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا۔ جو بھلا یا بُرا میرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آئندہ ہو گی خدا سے مجھے امیّد ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔"

الغرض سرسید نے مذکورہ بالا مقصد کے پورا کرنے کے لئے اوّل اسلام کی سچائی ثابت کرنے کا ایک ایسا معیار قرار دیا جو ہر مذہب کی سچائی دریافت کرنے کا پیمانہ قرار پا سکے - یعنی یہ کہ اس میں کوئی بات قانونِ فطرت کے برخلاف نہ ہو - کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا - پس اس کے فعل اور قول میں مطابقت ہونی ضروری ہے -

اس کے بعد انہوں نے اس امر پر غور کی کہ اسلام جس کی نسبت ہمارا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی بات علم و حکمت و صداقت کے برخلاف نہیں اور وہ بالکل قانونِ فطرت کے مطابق ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی حد کیا ہے؟ اور اس کے ثبوت کی بابت ہم کہاں تک ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ اس امر کے متعلق انہوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعے میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزماں کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے، صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو بات مسائلِ فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائلِ حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائلِ حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے - پس انہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ "حسبنا اللہ کتاب اللہ" اپنے جدید علمِ کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا اور اس کے سوا تمام مجموعۂ احادیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آرا اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جواب دہ خود علماء و مفسرین اور فقہاء و مجتہدین ہیں نہ کہ اسلام، اپنی بحث سے خارج کر دیا -

---

[1] سرسید کا دعویٰ اسلام کی حمایت کے موقع پر صرف اس قدر ہے کہ کوئی اعتراض سائنس کی رو سے قرآن مجید پر وارد نہیں ہو سکتا - اس لئے انہوں نے اپنی بحث کا موضوع قرآن مجید کو قرار دیا ہے اور مجموعۂ احادیث وغیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا - لیکن جو لوگ مذہبِ اسلام کا اطلاق مجموعۂ کتاب و سنت (باقی ص — پر)

یہ دونوں اصول ملحوظ رکھ کر سر سید نے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اوّل اوّل جب تک تہذیب الاخلاق جاری رہا کبھی کبھی بلالحاظِ ترتیب کے وہ متفرق آیتوں کی تفسیریں بطور آرٹیکل کے تہذیب الاخلاق میں چھاپتے رہے۔ مگر جب تہذیب الاخلاق کا پرچہ پہلی دفعہ بند ہو گیا اور سر سید سرکاری خدمات سے سبکدوش ہو کر بنارس سے علی گڑھ چلے گئے تو اُنھوں نے ابتدا سے قرآنِ مجید کی تفسیر ترتیب وار لکھنی شروع کی اور اس وقت سے اخیر دم تک جب کبھی ان کو اور کاموں سے فرصت ملی، برابر اُس کے لکھنے میں مصروف رہے اور قریب دو خمس کے تفسیر لکھنی باقی تھی کہ پیامِ اجل آن پہنچا۔

جس اصول پر سر سید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی یہ ایک ایسا مشکل کام تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اس کا خیال بالکل چھوڑ دیتا۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے مگر اُس کی تمام جزئیات کو قانونِ فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً اُس حالت میں جب کہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے سر سید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور باوصف سخت مخالفتوں کے جو قوم کی طرف سے ہوئیں اور زیادہ ہوئے اور ان بے شمار مشکلات کے جو تفسیر لکھتے وقت اُن کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصے میں بحث کریں گے یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سر سید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم اُن کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ اُن کی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

حاشیہ بقیہ صد ۔۔۔ وہ اجماعاً قیاس پر کرتے ہیں اُن کو اسلام کی حمایت کے لئے ضرور ہے کہ وہ اس تمام مجموعے کو سائنس کے حملے سے بچائیں۔ عام اس سے کہ اس کو سائنس کے مسائل پر منطبق کریں یا اُس کے مقابلے میں سائنس کے مسائل کا بطلان ثابت کریں یا ان کو غیر محقق ٹھہرائیں۔ ۱۲

اس تفسیر کے برخلاف اکثر مولویوں نے تفسیریں لکھی ہیں جن میں تفسیر حقانی سب سے زیادہ مشہور ہے مگر اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لکھنے والوں میں سے ایک شخص بھی یہ نہیں سمجھا کہ سید احمد خاں نے کس غرض سے یہ تفسیر لکھی ہے اور کس بنا پر انہوں نے اکثر جگہ تمام مفسرین سے اختلاف کیا ہے جس طرح بعضے چالاک وکیل کسی حیلے سے جج کو فریقِ مخالف پر افروختہ کر کے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گُر نکالا ہے کہ سرسید کو کہیں شیطان کا منکر، فرشتوں کا منکر، کہیں معجزات کا منکر، کہیں نبوت کا منکر، کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دے کر مسلمانوں کو ان سے اور اُن کی تفسیر سے نہایت بدگمان اور متنفر کر دیا ہے۔ اگر یہ لوگ فی الواقع حمایتِ اسلام کی نظر سے سرسید کی تفسیر کا جواب لکھتے تو اُن کو سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ انگریزی تعلیم مذہب کے حق میں فی الواقع کوئی خطرے کی چیز ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو آیا اس کا علاج یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو قوم میں رواج نہ دیا جائے۔ یا یہ کہ تعلیم سے جو شبہات اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں اُن کا جہاں تک ممکن ہو استیصال کیا جائے۔ اس کے بعد اُن کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ سرسید نے جو طریقہ شبہات کے استیصال کا اختیار کیا ہے۔ وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر ٹھیک ہے تو انہوں نے کہاں تک قرآن کی تفسیر اس طریقے کے موافق کی ہے اور کہاں اس سے انحراف کیا ہے اگر طریقہ ٹھیک نہیں ہے تو پھر کون سا طریقہ ہے جس کو اس مقصد کے لئے اختیار کرنا چاہیئے اور کس طرح اُس طریقے سے اُن شبہات کا جو علومِ جدیدہ کے تعلیم یافتہ گروہ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں استیصال کیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے مراتبِ مذکورہ بالا میں سے ایک بات کا بھی اپنی تفسیروں میں لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام ہمت اس بات میں صرف کی ہے کہ سرسید کی نسبت لوگوں کے تعصبات کو اور زیادہ بھڑکائیں تاکہ ان کی تفسیروں کی زیادہ قدر ہو اور لوگ اُن کو بہت بڑا حامیٔ دینِ اسلام کہیں۔

لطیفہ ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لئے سفارش کر دیجئے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام میرے لائق سمجھیں اس کے واسطے سفارش کر دیں"۔

سرسید نے اُن کو لکھ بھیجا کہ "میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے اور وجہِ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا ردّ لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگیِ معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"

(شرح نشان (۱) مطبوعہ صـ۱۳۳)

[1] سُنا ہے کہ جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی، ایک یورپین معزز افسر سے جو اسی کام پر مامور تھا، ریل میں سرسید سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں آگرہ جاتے تھے اور سرسید کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پہ مامور ہے۔ اُس افسر نے اُن سے پوچھا کہ آپ کا کیا مذہب ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہابی مسلمان ہوں۔ پھر اُس نے اُن کا پتہ دریافت کیا۔ اُنہوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا۔ جب ریل آگرہ پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے چلے گئے۔ پھر سرسید مِن صاحب کمشنر آگرہ سے ملنے کو گئے اتفاق سے وہ افسر اُنہیں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور اُن سے ذکر کر چکا تھا کہ اس حُلیے، اور اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھیرا ہُوا ہے اب صاحب کمشنر نے افسر مذکور کو بلا کر کہا کہ لو یہ تمہارے اسامی حاضر ہے۔ جب اس کو یہ معلوم ہُوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا خیر خواہِ سرکار ہے تو اُسے نہایت تعجب ہُوا اور سب بہت دیر تک اس بات پر ہنستے رہے۔

چھٹا باب

سنہ ۱۸۷۸ء سے سنہ ۱۸۹۸ء تک

وائسرائے کی کونسل کی ممبری، ایجوکیشن کمیشن میں شہادت، محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن، محمڈن ایسوسی ایشن علی گڑھ، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ پبلک سروس کمیشن کی ممبری، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، پیٹریاٹک ایسوسی ایشن، کے، سی، ایس، آئی کا تمغہ ملنا، ایل ایل ڈی کی ڈگری، ٹرسٹی بل پر اختلاف، کالج کے روپے میں غبن ہونا، سرسید کی وفات۔

سنہ ۱۸۷۸ء میں سرسید کو لارڈ لٹن نے وائسرائگل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور ان کے بعد دوسری دفعہ لارڈ رپن نے اُن کو ممبری کونسل کے لئے انتخاب کیا۔ قانونی کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کی تحریک جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے سب سے اوّل سرسید ہی نے کی تھی۔ اُنھوں نے اپنے رسالۂ اسبابِ بغاوت میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں ہندوستانیوں کے بھرتی نہ ہونے اور انتظامِ سلطنت سے بالکل بے خبر رہنے کو قرار دیا تھا۔ پس جس عزت و امتیاز کا دروازہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے لئے کھولا تھا اس کا استحقاق فی الواقع سرسید سے زیادہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ بمبئی گزٹ میں اُن کے انتخاب کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "گورنمنٹ اُن نقائص کو پورا کرنے کے لئے جو سید احمد خاں نے اسبابِ بغاوت میں ظاہر کئے تھے غافل نہیں تھی۔ خود اس کو لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کا ممبری کے لئے منتخب اور نامزد کرنا اس بات کی عمدہ ضمانت تھی کہ گورنمنٹ اپنی رعایا کے ایک عمدہ حصے کی ضروریات اور خواہشات سے آگاہ ہو۔"

ہندوستانیوں میں سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ہندوستان

کی بھلائی کے لئے قانون بنایا۔ وہ چار برس متّصل وائسرائگل کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصے میں اُنہوں نے دو مسوّدے کونسل میں پیش کئے۔ چیچک کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرّر کا قانون۔ یہ دونوں مسوّدے پاس ہو گئے اور اُس سے آج تک ان کے موافق ہندوستان کے اکثر حصّوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔

قانون ٹیکہ چیچک

چیچک کے ٹیکے کا قانون جس کا مسوّدہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کونسل میں پیش ہُوا اس غرض سے بنایا گیا تھا کہ ٹیکے کا قاعدہ اضلاعِ شمال مغرب، اودھ، ممالک متوسّط، برٹش برما، آسام، اجمیر اور کورگ میں اور نیز فوجی چھاؤنیوں میں لازمی کر دیا جائے۔ چونکہ ایسا جبری قانون جاری کرنے سے رعایا کی شخصی آزادی میں ایک نوع کی مداخلت کرنی پائی جاتی تھی۔ اس لئے سرسید نے مسوّدہ پیش کرتے وقت جو اس پر ایک لمبا ریمارک کیا تھا اُس میں اس قانون کے جاری کرنے کی ضرورت بہت خوبی سے ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ شخصی آزادی کی رعایت اس مضرت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چیچک کے متعدی ہونے سے اوروں کو پہنچتی ہے۔ اور نیز چیچک کا ضرر بالخصوص ان بے گناہ بچوں کو پہنچتا ہے جو اپنی جانوں کی خود حفاظت نہیں کر سکتے۔ پس ٹیکے کے لازمی کر دینے سے جس طرح بڑی عمر کے آدمی ہمسایوں کی بے پروائی کے مضر نتائج سے محفوظ رہیں گے۔ اسی طرح معصوم بچوں کی جانوں کی حفاظت ان کے والدین کی بے وقوفی کے نتائج سے عمل میں آوے گی۔ پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جس طرح پہلے زمانے میں لوگ ٹیکے سے ڈرتے تھے، اب ایسا حال نہیں رہا۔ اب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی موجود ہو گئی ہے جو ٹیکے کا لازمی ہونا پسند کرتے ہیں۔

مع ذالک ٹیکا لگانے کے قواعد میں جہاں تک کہ ممکن تھا، ہر طرح آسانی اور نرمی کا لحاظ رکھا ہے۔ اول لوکل سیلف گورنمنٹوں کو اس میں اختیار دیا گیا ہے کہ جس میونسپلٹی سے مناسب سمجھیں اس کو متعلق کریں۔ اس کے سوا ٹیکا لگانے والوں کو اور بہت طرح سے آسانیاں دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ بچوں کے مکانوں پر جا کر ٹیکا لگایا جاتے۔ میونسپل کمشنروں میں سے کوئی ممبر خود جا کر اپنے سامنے ٹیکہ لگواتے۔ پولیس کی دست اندازی جہاں تک ممکن ہو نہ ہونے پائے۔ اطفالِ غیر محفوظ کی تحقیقات اور اُن کے رجسٹر کی ترتیب میونسپل کمشنروں اور سپرنٹنڈنٹ ڈسپنسریوں سے متعلق رہے

تاکہ بچوں اور ان کے مربیوں کو مجسٹریٹ کے رُو برو جبراً حاضر کرانے کی ضرورت نہ رہے۔ کسی بچے کے بازو سے مادہ نہ لیا جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو۔ حیوانی مادے سے ٹیکا لگایا جائے اور قانون کی خلاف ورزی کی سزائیں صرف جرمانے تک محدود رہیں۔

باوجود ان سب باتوں کے یہ بل اختلافِ رائے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خصوصاً نواب لفٹیننٹ گورنر پنجاب اس کے سخت مخالف تھے۔ مگر کونسل کے اکثر لیجسلیٹو ممبر اس سے اتفاق رکھتے تھے۔ آخر ایک آدھ دفعہ کی جزوی ترمیم کے بعد ۱۸۷۹ء میں پاس ہو گیا۔

قانونِ تقررِ قاضیاں

قاضیوں کے تقرر کا قانون بھی ۱۸۸۰ء میں کسی قدر اختلاف کے بعد مجارٹی سے پاس ہو گیا۔ اس قانون کے بنانے کا منشا یہ تھا کہ عہدۂ قضا کی حیثیت جو اہلِ اسلام کے عہد میں ایک جج یا مجسٹریٹ کے برابر تھی۔ انگریزی عملداری میں باقی نہ رہی تھی۔ مگر پھر بھی انگلش گورنمنٹ نے اپنے عہدِ حکومت میں اس عہدے کو بالکل موقوف نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ بعض قوانین کے ذریعہ جو ۱۷۹۳ء سے ۱۸۲۷ء تک وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہے۔ بنگالہ اڑیسہ بمبئی بہار اور مدراس میں ایک عدالتی اختیارات کے سوا باقی تمام کام جو قاضیوں سے متعلق چلے آتے تھے قائم رکھے تھے۔ جیسے دستاویزات کا تیار اور تصدیق کرنا، نکاح خوانی اور طلاق کی مجلسوں میں صدر نشین ہونا۔ انواع و اقسام کے آداب و رسومات مذہبی کا انجام دینا۔ قُرق شدہ جائیداد کے نیلام کی دیدبانی، زر خیرات و پنشن و وظائف کا تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ پھر رفتہ رفتہ حسب مقتضائے وقت ان کی خدمات محدود ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۶۴ء میں جملہ قوانین جو قاضیوں کے تقرر اور ان کے کاموں سے متعلق تھے۔ منسوخ کئے گئے اور یہ قرار پایا کہ قاضیوں کا تقرر بذریعہ گورنمنٹ کے عمل میں آنا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ اور قاضیوں کو اجازت دی گئی کہ جس وقت لوگ ان سے کسی رسمِ مذہبی وغیرہ کے انجام دینے کے خواستگار ہوں تو وہ بطور خود اس کو انجام دیں۔

مگر جس طبقے کے لوگوں کو ایسے کاموں کے لئے قاضیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے ذریعہ سے عموماً اور مسلمانان صوبۂ مدراس کے ذریعہ سے خصوصاً بارہا گورنمنٹ کی اطلاع میں آچکا تھا کہ بغیر ایسے قاضیوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوں۔ لوگوں کے کاموں میں حرج

واقع ہوتا ہے۔ اس لئے سر سید نے یہ مسودہ تیار کیا جس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ گورنمنٹ نے جو قاضیوں کے تقرر کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا، اس کو وہ پھر اپنے ہاتھ میں لے اور اوّل صوبۂ مدراس میں اس کو نافذ کرے اور تمام لوکل گورنمنٹوں کو اختیار دے کہ جس صوبے کے مسلمان اس قانون کو اپنے صوبے میں جاری کرانا چاہیں سو وہاں اس قانون کو جاری کریں۔ امید ہے کہ جہاں جہاں یہ قانون جاری ہو چکا ہے۔ یا آئندہ جاری ہو وہاں کے قدیم قاضیوں کے خاندان جو سرکاری عہدہ دار نہ ہونے کی وجہ سے ایک کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ ان کی قدر پرسش زیادہ ہونے لگے گی اور خاص خاص طبقوں کے مسلمانوں کو نکاح خوانی وغیرہ میں ان سے مدد ملے گی۔

قانونِ وقفِ خاندانی

ان دونوں قانونوں کے علاوہ سر سید نے ممبری کونسل کے زمانے میں ایک اور نہایت مفید خدمت اپنی قوم کی کرنی چاہی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ بعض موانع کے سبب وہ تدبیر پوری نہ ہو سکی۔ انہوں نے ایک مسودہ قانون وقفِ خاندانی کے نام سے تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا مقصود تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے اور جو امیر اور ذی مقدور خاندان تھے۔ ان کی اولاد مفلس ہوتی جاتی ہے اور جن میں ابھی کچھ جان باقی ہے وہ تین پشتوں کے بعد ان کی جائیدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضے میں فروخت ہو جائیں گی۔ اس لئے ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے۔ جس سے مسلمانوں کے معزز خاندان بنے رہیں اور ان میں کچھ ایسے ذی مقدور اور رئیس دکھائی دیں جن سے مسلمانوں کی قوم کی عزت اور امتیاز قائم رہے۔

اوّل انہوں نے نہایت محنت و جانفشانی سے سنّی اور شیعہ دونوں کی فقہی کتابوں سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی جائداد کو اپنے لئے اور اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کے لئے ہمیشہ کو وقف کر دے جس کی رُو سے وہ جائیداد نہ کبھی بیع ہو سکے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے۔ پھر جہاں جہاں ہندوستان میں مسلمان رئیسوں نے اپنی جائیدادیں اس طرح پر اپنے خاندان کے لئے وقف کی تھیں ان کی بہت سی مثالیں بہم پہنچائیں تاکہ مسلمانوں کے عمل درآمد سے مسئلہ شرعی کو اور زیادہ تقویت ہو۔ اس کے

بعد انہوں نے دیکھا کہ جو لوگ خانگی طور پر بلا مداخلتِ سرکار اپنی جائیدادیں اپنے خاندان کے لئے وقف کرتے ہیں، ایسے وقف سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو یہ امید نہیں کہ وہ جانشینی کا ایسا قاعدۂ کلیہ مقرر کر سکیں جس میں آخر کار خلشیں پیدا نہ ہوں اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ دوسرے اس صورت میں ہمیشہ وقف کے فرضی اور فریبی ہونے کا الزام لگا کر اس کی منسوخی کے دعوے، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے عدالت میں دائر ہو سکتے ہیں۔ تیسرے چونکہ اکثر جائیدادیں دیہاتِ مالگذاری سرکار ہوتے ہیں، اس لئے جب کوئی نالائق متولی یا جانشین زرِ مالگذاریٔ سرکار ادا نہیں کرتا تو امرِ شرعی یا قانونی اس بات کا مانع نہیں ہوتا کہ وہ جائیداد بعلتِ باقی نیلام ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ یہ مسئلہ شرعی بذریعہ ایک قانون کے گورنمنٹ کی منظوری سے استحکام پائے۔

اس غرض سے انہوں نے ایک مسوّدہ نہایت لیاقت کے ساتھ تیار کیا اور کونسل میں پیش کرنے سے پہلے وائسرائے سے پرائیویٹ طور پر اس کے مشتہر کرنے اور مسلمانوں کی رائیں اس کی نسبت دریافت کرنے کی اجازت لے کر تہذیب الاخلاق اعلی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات میں مشتہر کرایا۔ بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعے سے اس کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا۔ بعض شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور ممتاز لوگوں نے جلسے کئے اور اس تجویز کو نہایت پسند کیا۔ بعض نہایت مستند عالموں نے وقفِ خاندانی کے مسئلے کو تسلیم کیا اور اس کے جواز پر فتوے لکھ دیا۔ مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاص کر مولوی ابو سعید عظیم آبادی اور ان کے پیروؤں نے سخت مخالفت کی چنانچہ وقفِ خاندانی کے عدمِ جواز پر فتوے لکھے گئے اور گورنمنٹ میں اس کے برخلاف عرضیاں اور میموریل بھیجی گئیں۔

جس زمانے میں اس مسوّدہ کے برخلاف مولویوں کے فتوے شائع ہو رہے تھے۔ کسی انصاف پسند مسلمان نے ان فتووں کے خلاف ایک آرٹیکل لکھا تھا۔ جس کا پہلا فقرہ یہ تھا۔

انگلستان کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ "جو شخص اپنے ملک یا اپنی قوم کا بدخواہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ دنیا میں ایک عجائب چیز ہے"! ہم کہتے ہیں کہ یہ مصنف چونکہ یورپ میں پیدا ہوا تھا اس لئے شاید اس نے عمر بھر میں قوم کا کوئی بدخواہ نہ دیکھا ہو گا اور اسی لئے وہ قوم کے

بدخواہ کو ایک عجیب چیز سمجھتا تھا۔ لیکن اگر وہ ہماری قوم میں پیدا ہوتا تو بجائے اس قول کے شاید یہ جملہ اس کی زبان سے نکلتا کہ جو شخص مسلمان مولوی ہو کر اپنی قوم کا بدخواہ نہ ہو۔ اس کی زیارت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ دُنیا میں کوئی چیز اس سے زیادہ عجیب نہیں۔

بہرحال سر سیّد نے یہ تدبیر مسلمانوں کے لئے نہایت عمدہ سوچی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ وہ اس مسودے کو کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ نہ اس لئے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہیں تھا اور اس کی پابندی محض مالک جائیداد کی مرضی پر منحصر تھی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اصول قانون کی رُو سے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقہیہ کے مطابق بنایا گیا تھا اور فقہ کی رو سے ضرور تھا کہ جو وقف اس طرح اولاد کے لئے کیا جائے۔ وہ وقفِ دوامی ہو نہ میعادی۔ مگر ولایت کے مقنّنوں کی یہ رائے قطعی طور پر قرار پا چکی تھی کہ کسی جائیداد کو ہمیشہ کے لئے ناقابلِ انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ پس سر سید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے۔ ان کو یہ صلاح دی کہ موجودہ صورت میں مسودۂ قانون پیش کرنا عبث ہے۔ کیونکہ اس کے منظور ہونے کی امید نہیں۔ ہاں اگر وقف کی کوئی میعاد مقرر کر دی جائے۔ جس سے جائداد ایک مدتِ معین تک ناقابل انتقال رہے۔ اور اس کے بعد موجودہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے تو البتہ یہ قانون پاس ہو سکتا ہے لیکن چونکہ ایسے وقف کو میعادی قرار دینا شرعاً جائز نہ تھا اس لئے لاچار اس سے دست بردار ہونا پڑا۔

کونسل میں اسپیچیں

سر سیّد نے ان تینوں مسوّدوں کے تیار کرنے کے سوا اور اکثر موقعوں پر جب تک کہ وہ کونسل میں ممبر رہے، غیر معمولی لیاقت ظاہر کی۔ باوجود انگریزی نہ جاننے کے ہر ایک اہم معاملے پر جو کونسل میں پیش ہوتا تھا، وہ گفتگو کرتے تھے۔ اور اس لئے ان کو تمام کاغذات جو اس معاملے سے متعلق اور بالکل انگریزی میں ہوتے تھے سمجھنے پڑتے تھے اور اس طرح کافی اطلاع حاصل کرنے کے بعد وہ کونسل میں اسپیچ کرتے تھے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی اسپیچیں وہ اوّل خود اردو میں لکھ کر ان کا انگریزی ترجمہ کراتے تھے اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر خود کونسل میں اسپیچ دیتے

تھے اور بڑی بڑی اسپیچیں جو وہ تیار کر کے لے جاتے تھے۔ ان کو اکثر کونسل کا سیکرٹری پڑھ کر سناتا تھا۔ ان کی ایک اسپیچ جو فارسی میں لکھ کر دی تھی۔ لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا سرسید کہتے تھے کہ "جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ" میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سنی تھی۔" یہ اسپیچ غالباً مسودۂ قانون مزارعینِ دکن پر تھی۔ جس کا انتخاب کر کے گرہیم نے سرسید کی لائف میں چھاپ دیا ہے۔

ایک اور اسپیچ مسودۂ قانونِ انتقالِ جائیداد کی رپورٹ پیش ہونے پر سرسید نے ۲۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو بِل کی تائید میں کی تھی۔ اس بِل پر "انگلشمن" میں ایک لمبا آرٹیکل چھپا تھا جس میں سرسید کی اسپیچ کی نسبت لکھا تھا کہ کسی ہندوستانی جنٹلمین نے اب تک اس مسئلے کی تائید کی کہ ملک کا قانون کوڈیفکیشن (یعنی مجموعۂ احکام بنانے) کا محتاج ہے اور اس میں کوڈیفکیشن کی گنجائش ہے اور ملک کے دونوں فرقوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام کے ساتھ اشارہ کرتی ہے، ایسی صراحت کے ساتھ نہیں کی ہے۔ جیسی کہ آنریبل سید احمد خاں نے کی ہے۔"

اسی طرح قانونِ حقوقِ استفادہ اور قانونِ ترمیم مجموعۂ ضابطۂ فوجداری جو ہندوستان میں ہمیشہ یادرہے گا اور نیز دیگر قوانین پر انہوں نے بہت باوقعت اسپیچیں کی ہیں۔ خصوصاً وہ اسپیچ جو قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاعِ متوسط پر ۱۲۔ جنوری ۱۸۸۳ء کو لارڈ رپن کے زمانے میں کی تھی، وہ خاص توجہ کے لائق ہے۔ قانون مذکور میں جو کہ خاص اضلاع متوسط کے لئے بنایا گیا تھا، اس صوبے کی حالت کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر الیکشن سے اور ایک ثلث گورنمنٹ کے انتخاب سے مقرر ہونے تجویز کئے گئے تھے مگر لارڈ رپن کی پالیسی سے اس بات کا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں کل ممبر الیکشن سے منتخب ہوا کریں گے۔ چونکہ سرسید کی رائے اس کے برخلاف تھی اور ان کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اس وقت تک جب کہ ان صوبوں کے لئے قانون بنایا جائے گا کونسل میں ممبر رہیں گے۔ اس لئے انہوں نے اپنی اسپیچ میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں اسی اصول کے موافق دو ثلث ممبر الیکشن سے اور ایک ثلث نومی نیشن سے مقرر ہوا کریں۔ چنانچہ انہی کی اسپیچ پر

لارڈ رپن نے شمالی ہندوستان میں ایک ثلث ممبروں کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رکھا اور دو ثلث کے لئے الیکشن کا قاعدہ مقرر کیا۔

یہ اسپیچ سرسیّد کی اور اسپیچوں اور لیکچروں کے ساتھ ایک مجموعے میں چھپ گئی ہے اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس کے بعض فقرات ہم اس موقع پر نقل کریں گے جہاں انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کا مفصل ذکر کیا جائے گا۔

لارڈ رپن کے عہد میں جس قدر زمانہ کہ سرسیّد کے کونسل میں شریک رہنے کا تھا اس کے پورا ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے اور ان کے پورا کرنے کے لئے کلکتے جانے میں مدرسہ وغیرہ کے کاموں میں حرج واقع ہوتا تھا۔ اس لئے انھوں نے بذریعہ تار کے کونسل سے استعفیٰ بھیج دیا۔ مگر اس کے بعد جب کہ اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی ان کو لوکل گورنمنٹ نے اپنی کونسل کے لئے پھر انتخاب کیا اور اُس وقت سے لے کر وہ کئی برس تک برابر اس کے ممبر رہے آخر پھر ان کو مدرسہ ہی کے کاروبار کی ضرورت اور نیز ضعیفی کی وجہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔

کرنل گریہم سرسیّد کی لائف میں ان کی ممبری کونسل کی نسبت لکھتے ہیں۔ کہ ”جب سرجان میلکم کو بورڈ آف ڈائریکٹرز نے عہدۂ گورنری پر مقرر کیا تو اس تقریب میں گریٹ ڈیوک آف ولنگٹن نے سرجان میلکم کو ایک ڈنر دیا تھا۔ اس موقع پر جو تقریر ڈیوک نے کی تھی۔ اگر اُس تقریر میں بجائے انگلستان کے ہندوستان اور بجائے انگریز کے مسلمان کا لفظ بنا دیا جائے تو وہ تقریر سید احمد خاں کے ممبر کونسل ہونے پر خوب چسپاں ہوتی ہے اور وہ فقرہ یہ ہے ”ایک ایسا تقرر جیسا کہ یہ ہے عمل کرنے والا ہے۔ انگلستان کے تمام عرض و طول پر اور کم سے کم عمر کا نوجوان انگریز اس میں ایک مثال پاتا ہے۔ جس کی وہ تقلید کرے اور ایک کامیابی پاتا ہے۔ جس کو وہ حاصل کرے اور ایسے فیلنگز کے جوش سے جو بھلائی ملک کو حاصل ہوتی ہے۔ اُس کی کچھ انتہا نہیں۔“

ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

۱۸۸۲ء میں جب کہ سرسیّد لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تھے اُن کی شہادت بھی ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی۔ ان کا

طولانی اظہار علی گڑھ گزٹ کے متعدد پرچوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔ جس سے ان کا ایک بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سر سید اوّل کمیشن مذکور کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔ مگر جو طریقہ کمیشن کی کارروائی کا تھا وہ ان کی رائے کے خلاف تھا۔ اوّل تو ممبروں کو کسی کارروائی کی اطلاع پہلے سے نہیں دی جاتی تھی۔ تمام رزولیوشن دفعتاً پیش کئے جاتے تھے اور ممبروں کو ان پر کافی غور اور بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے جو مباحثہ ہر ایک رزولیوشن پر ہوتا تھا، وہ قلمبند نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ایک آدھ اجلاس کے بعد پریذیڈنٹ سے کہا کہ میرے نزدیک ممبروں کو پہلے سے اطلاع ہونی چاہیئے کہ کون سی تاریخ کیا کارروائی ہوگی تاکہ ان کو غور کرنے کا موقع ملے۔ دوسرے جو مباحثہ کمیشن میں ہو وہ بالکل قلمبند ہونا چاہیئے۔ مگر پریذیڈنٹ نے ان دونوں باتوں کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ موجودہ حالت میں بھی کام کی کثرت بہت ہے اگر ایسا کیا جائے گا تو کام بہت بڑھ جائے گا۔ سر سید نے کہا کہ اس صورت میں کمیشن کی شرکت سے مجھ کو معاف رکھا جائے۔ جب لارڈ رپن کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے سر سید سے کہا کہ اگر آپ ممبری سے علیحدہ ہوتے ہیں تو سید محمود کو اپنی جگہ ممبری قبول کرنے پر راضی کر دیجیئے اور آپ خود کمیشن میں شہادت دیجیئے۔ چنانچہ سید محمود[1] ان کی جگہ مقرر کئے گئے اور سر سید نے شہادت دی۔

---

[1] سید محمود نے اپنی ممبری کے زمانے میں ۱۶ رزولیوشن کمیشن میں ایسے پاس کرائے تھے جو خاص مسلمانوں کی ترقیِ تعلیم اور بہبودی سے علاقہ رکھتے تھے۔ مگر گورنمنٹ سے ان کی بابت یہ حکم ہوا کہ ان کے اجراء یا عدمِ اجراء کا اختیار لوکل گورنمنٹوں کو ہونا چاہیئے۔ جس تجویز کو وہ اپنے صوبے میں مناسب سمجھیں جاری کریں اور جس کو مناسب کرنا سب نہ سمجھیں جاری نہ کریں۔ وہ رزولیوشن یہ ہیں۔ (۱) مسلمانوں کی تعلیم کی خاص تقویت اور ترقی کا بار لوکل، میونسپل اور پروونشل فنڈوں پر جائز سمجھا جائے۔ (۲) جو دیسی مدرسے مسلمانوں کے ہیں اُن کو ترغیب دی جائے کہ اپنے ہاں کی خواندگی میں خالص دنیوی تعلیم کا اضافہ کریں (۳) مسلمانوں کے پرائمری اسکولوں کے واسطے خاص اسٹینڈرڈ مقرر کئے جائیں۔ (۴) پرائمری اور مڈل سکولوں میں سوائے ان مقامات کے جہاں اسلامی جماعتیں کسی اور زبان کی خواہش کریں، اصل زبان مسلمانوں کی تعلیم

سرسیّد کے اظہارات میں سے چند دلچسپ جواب جو انہوں نے بعض عام سوالات یا جرح کے سوالات پر کمیشن میں دیئے۔ اس مقام پر بطور خلاصہ کے نقل کئے جاتے ہیں تاکہ تعلیم کے متعلق

کے لئے اُردو ہونی چاہیئے۔ (۵) جہاں دفاتر کی زبان اردو نہیں ہے۔ وہاں بطور اختیاری مضمون کے پرائمری اور مڈل سکولوں میں جو مسلمانوں کے لئے پبلک فنڈ سے قائم ہیں، دفاتر کی زبان خواندگی میں پڑھائی جائے۔ اور نیز حساب اور بیان اسی زبان میں سکھایا جائے۔ (۶) جن مقامات میں مسلمانوں کی نسبتی تعداد بلحاظ آبادی کے معتدبہ ہے۔ وہاں پرائمری اور مڈل سکولوں میں جو کہ پبلک فنڈ سے قائم ہیں۔ ایسا انتظام کیا جائے کہ اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم دی جائے۔ (۷) مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لئے خوب اچھی طرح ترغیب عمل میں لائی جائے کیونکہ یہ ایسی تعلیم ہے۔ جس میں اس جماعت کو خاص مدد کی ضرورت ہے۔ جہاں جہاں ضرورت ہو ایک درجہ وار طریقہ خاص اسکالرشپوں کا مسلمانوں کے واسطے جاری کیا جائے جو انعام میں دیئے جائیں یعنی جو پرائمری سکولوں کی کامیابی پر مڈل سکولوں میں دیئے جائیں۔ ب۔ جو مڈل سکولوں کی کامیابی پر ہائی سکولوں میں دیئے جائیں۔ ج۔ جو انٹرنس اور ایف اے کے امتحانات کے نتائج پر کالجوں میں دیئے جائیں۔ (۹) ہر قسم کے سکولوں میں جو پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایک خاص نسبتی تعداد وظیفوں کی بالتخصیص مسلمان طلبا کے لئے رکھی جائے۔ (۱۰) جن مقامات میں تعلیمی اوقاف مسلمانوں کے فائدے کے واسطے ہیں اور گورنمنٹ کے زیرِ انتظام ہیں وہاں اوقاف کی آمدنی صرف مسلمانوں کی تعلیم میں صرف ہونی چاہیئے جہاں مسلمانوں کے اوقاف پرائیویٹ لوگوں یا جماعتوں کے زیرِ انتظام ہیں۔ وہاں فیاضی سے گرانٹ ان ایڈ دی جائیں۔ اور پرائیویٹ لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ گرانٹ اِن ایڈ کے قاعدے کے مطابق انگریزی تعلیم کیلئے سکول اور کالج قائم کریں۔ (۱۲) جہاں ضرورت ہو نورمل سکول یا کلاسیں مسلمان معلّموں کی تربیت کیلئے قائم کی جائیں (۱۳) جن مسلمان مدرسوں میں، جو اوقاف سے قائم ہیں، اُردو میں درس ہوتا ہو وہاں کوشش کی جائے کہ حتی الامکان مسلمان معلّم تعلیم دیں۔ (۱۴) افسران معائنہ جو مسلمان ہوں وہ ان پرائمری سکولوں کا معائنہ جو مسلمانوں کے لئے ہیں۔ موجودہ دستور سے زیادہ کیا کریں (۱۵) ترقی تعلیم مسلمانان کے لئے جو ایسوسیشن ہیں ان کو تسلیم کیا جائے اور ان کی ہمت بڑھائی جائے۔ (۱۶) پبلک انسٹرکشن کی سالانہ رپورٹوں میں ایک خاص باب مسلمانوں کی تعلیم پر ہوا کرے۔ (۱۷) لوکل گورنمنٹوں کی توجہ اس نسبت کی طرف مائل کرائی جائے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے لوگوں میں نوکریاں تقسیم کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے (۱۹) اصولِ مذکورہ بالا جو سفارش میں بیان کئے گئے ہیں۔ وہ دیگر اقوام پر بھی جو حالات مذکورہ میں مسلمانوں کے برابر ہوں۔ عائد کئے جائیں۔ ۱۲۰۔

جو اہم سوالات ہیں۔ ان کی نسبت اُن کی اصل رائے جو اُنہوں نے ہر ایک موقع پر نہایت آزادی سے ظاہر کی ہے، ناظرین کو معلوم ہو جائے۔

اُنہوں نے اِس سوال کے متعلق کہ آیا مغربی علوم کی تعلیم دیسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی زبان کے زیادہ مفید ہوگی، اس طرح جواب دیا کہ "ان ورنیکلر انگریزی، پرائمری اور مڈل سکولوں میں جن کا مقصد طالب علموں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے تیار کرنے کا نہیں ہے، مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ ان میں پڑھائے جاتے ہیں، ورنیکلر زبان میں پڑھایا جانا بے شک ملک کے حق میں بہتر ہوگا۔ مگر انگریزی ابتدائی سکولوں میں جو اس غرض سے قائم کئے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک زینہ کے کام دیں، ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سود مند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ میکالے کے منٹ ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا۔ اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہلِ ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں؟ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ بہت سے مباحثے بہت سے جلسوں میں کئے۔ اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے۔ لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا۔ مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔ مجھ کو ایک مشہور لبرل اسٹیٹسمین کے قول کو تسلیم کرنا پڑا۔ جس نے کہا تھا کہ "جو کچھ ہمارے زمانے کے ہندوستانیوں کو درکار ہے۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ وہ یہ ہے کہ وہ اس علم و حکمت پر نظر ڈالیں جو ان کے زمانے کی اور اس قوی قوم کی جان ہے اور جو اس کے نزدیک تمام علوم اور تمام طاقت کا مخزن ہے۔" میں لارڈ ولیم بنٹنگ کی اس پالیسی کی صحت اور سچائی کو سمجھ گیا کہ "ہندوستان کی قوموں میں یورپ کے علم و حکمت کو ترقی دینا گورنمنٹ کا مقصدِ اعلیٰ ہونا چاہیئے۔"

"خیال کیا جاتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم خود اس ملک کی زبان میں نہ آگیا ہو۔ مگر اس دلیل میں ایک بڑے جزو کو جسے اس کی جان کہنا چاہیئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ درحقیقت نہایت موزونیت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تاوقتیکہ وہ علم اس زبان میں نہ آگیا ہو جو اس ملک پر حکمران ہے۔ ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے وہ ورنیکلر نہیں ہے۔ بلکہ انگریزی زبان ہے۔ اس لئے اس ملک میں ورنیکلر کے ذریعہ سے کسی علم کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ تاریخ میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو، کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہو۔"

پھر اس سوال پر کہ کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلافِ نوعی محفوظ رکھا جا سکتا ہے، اس طرح جواب دیا کہ "تعلیم کی آزادی اور اس کے اختلافِ نوعی کا محفوظ رکھنا اس طریقے پر منحصر ہے جو کسی ملک کی یونیورسٹی نے مختلف علوم میں ڈگریاں عطا کرنے کے لئے قرار دیا ہو۔ پس ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس ملک کی یونیورسٹیوں نے اس باب میں کیا کیا ہے۔ میں یہاں صرف کلکتہ یونیورسٹی کی نسبت جو اس ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ گفتگو کروں گا۔ یہ یونیورسٹی لا، انجینئرنگ، میڈیسن اور آرٹس میں ڈگریاں عطا کرتی ہے۔ اور ہر شخص کو اس بات کی بالکل آزادی ہے۔ کہ ان میں سے جس مضمون کو چاہے اختیار کرے۔ وہ بلاشبہ تعلیم کی آزادی اور اختلافِ نوعی کو لوگوں کے حق میں جہاں تک کہ اس کو علم کی ان چار مختلف شاخوں سے تعلق ہے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن آرٹس کا سبجیکٹ ایک وسیع سبجیکٹ ہے اور آزادی و اختلافِ نوعی کو جو اب تک اس میں محفوظ نہیں رکھا گیا یا نہایت محدود کر دیا گیا ہے اس کا محفوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ جو کورس آرٹس کے امتحان کے واسطے ہماری یونیورسٹی نے اختیار کیا ہے وہ لنڈن کی یونیورسٹی کی ایک ناممکل تقلید پر قرار دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے گریجویٹ کسی سبجیکٹ میں ایک کامل علم حاصل نہیں کرتے ہیں۔ پس میں طریقۂ مروجہ کے برخلاف ہوں مگر چونکہ یہ بحث کمیشن کے احاطۂ تحقیقات سے خارج ہے اس لئے میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ کو اس کی نسبت کچھ زیادہ بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں صرف ہز ایکسیلنسی وائسرائے کی اسپیچ میں سے جو کلکتہ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ جلسہ میں حضورِ ممدوح نے ارشاد فرمائی تھی انتخابِ مندرجہ ذیل کمیشن کی

اطلاع کے واسطے پیش کرتا ہوں: جس بات کی سب سے اوّل تعلیم میں ضرورت ہے وہ علم کی تکمیل ہے۔ قوائے عقلیہ کو چیزوں کے کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ بہت سی باتیں بالائی طور پر سیکھی جائیں زیادہ تر عمدہ طور پر تربیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایک مضمون کو کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ سو علم ناکامل طور پر سیکھے جائیں زیادہ تر اصلی عقلی تربیت حاصل ہوتی ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے؟ اس طرح جواب دیا کہ اس امر کی نسبت جو میری خاص رائے ہے وہ پبلک فیلنگ کے برخلاف ہے میں نے اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کامل کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے کہ جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اُس وقت تک مناسب طور پر اُن کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لئے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام تر اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے مگر پبلک کی رائے اس رائے کی مؤید نہیں ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گورنمنٹ کا اس تعلیم سے علیحدہ ہونا واجب ہو۔ ایک نہایت لائق ہندوستانی نے جس کا میں دل سے ادب کرتا ہوں مجھ سے کہا کہ "یہ خیال کہ ہم کو آپ اپنی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیئے، بالکل ایک غلط خیال ہے اور لفظ "اپنے آپ" کا کسی قومی معنوں میں ہندوستان کے باشندوں کی نسبت استعمال کرنا بیجا ہے۔ کوئی قوم بڑا کام نہیں کر سکتی جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام فرقوں کے لوگ شریک نہ ہوں، ہندوستان میں اعلیٰ درجے کے پولٹیکل اور انتظامی اقتدار گورنمنٹ اور اس کے یورپین عہدہ داروں کو حاصل ہیں اور جو شخص ہندوستان میں تجارت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی یورپین ہیں اور اس وجہ سے وہ فی الحقیقت ہندوستان کی آبادی میں سب سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں، مگر جب کبھی ان عہدہ داروں سے کسی کالج یا اسکول کے لئے جو ملک میں ہندوستانیوں کے فائدے کے واسطے قائم کیا جائے زر نقد کی امداد کی درخواست کی گئی ہے تو وہ بالعموم اُس سے اس طرح پر علیحدہ رہے ہیں کہ گویا اُن کو اِن سے مطلق کچھ سروکار نہ تھا۔"

اس کے بعد سرسیّد نے کہا کہ "اس مقام پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گزرا ہے۔ یعنی جس زمانے میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ میں قائم ہوا تو میں نے

ایک نہایت معزز یورپین افسر سے اُس کی امداد کی درخواست کی۔ اس نے جواب دیا کہ "ہم پر اس کی امداد کرنا کچھ فرض نہیں ہے۔ وہ تمہارا بچہ ہے، ہمیں اس کو دھکا دے دینا چاہیے۔ اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اُس کو اپنی والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے۔ پس پبلک اُپنیین کے لحاظ سے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے واسطے اِس بات کا کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خرچ اپنے آپ برداشت کرنا چاہیے۔ اگر ہم ہندوستان کی حالتِ موجودہ پر ذرا غور کریں تو اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اگر لوگ اِس قسم کا کوئی ارادہ کریں گے تو اُس میں ایسی بے انتہا مشکلات ہیں کہ جن کے سبب سے اس میں سراسر ناکامی ہونے کا اندیشہ ہے۔"

اِس کے بعد اسی سوال کے متعلق انہوں نے کہا کہ "اکثر لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ اِس ملک میں ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے۔ پس اگر گورنمنٹ موجودہ کالجوں میں سے کسی کالج کو برخاست کرے گی تو وہ گو کیسی ہی واجبی اور معقول دلیل پر کیوں نہ ہو لوگوں کو یہی خیال ہوگا کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کا ہے۔"

پھر کہا کہ "گو میرے نزدیک مشنری اسکولوں اور کالجوں میں بائیبل پڑھنا کسی طرح بر مذہبِ اسلام کے برخلاف نہیں ہے، مگر مسلمانوں کی عام فیلنگ بالیقین میری اِس رائے کے خلاف ہے اور اگر کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو غالباً اُس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ پس گورنمنٹ کو اِس باب میں کسی کارروائی کے کرنے سے پہلے پبلک فیلنگ کی اصلی حالت دریافت کرنا مناسب ہے۔"

پھر کہا کہ "جہاں مشنری کالج اور اسکول ہیں اگر وہاں رعایا کا کوئی فرقہ اُن میں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانا پسند نہ کرتا ہو تو لوگوں کو لازم ہے کہ آپ اپنے لئے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں اور گورنمنٹ بھی اُس کو بغیر لحاظ اس بات کے کہ وہاں مشنری اسکول یا کالج پہلے سے قائم ہیں اور اِس صورت میں اور مدرسوں کی ضرورت نہیں کسی قدر مدد عطا فرمائے۔ اِس کے علاوہ گورنمنٹ اِس بات کی بھی خبرگیری کرے کہ حکّامِ ضلع اِس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور اپنی حکومت اور رعب داب کو اُن کے برخلاف عمل میں نہ لائیں جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے۔"

پھر اِس سوال پر کہ گرانٹ اِن ایڈ کا قاعدہ جو بالفعل مروّج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟" اِس

طرح جواب دیا کہ "ایک ہائی اسکول کا اسٹاف جب تک کہ اُس میں ایک یورپین ہیڈ ماسٹر اور اس کے ماتحت ماسٹر یونیورسٹی کے گریجویٹ اور سکنڈ لینگویج یعنی عربی فارسی اور سنسکرت کے ٹیچر لائق ٹیچر نہ ہوں کافی خیال نہیں کیا جا سکتا اور ایسا اسکول بغیر نو سو روپے ماہوار خرچ کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ قواعدِ مروجہ کے موافق اس قسم کے مدرسوں میں کس قدر گرانٹ اِن ایڈ دیا جاتا ہے۔ اُن قواعد میں یہ درج ہے کہ لڑکوں کی اوسطِ حاضری پر جو انگریزی پڑھتے ہوں فی طالب علم ڈیڑھ روپیہ ماہوار سے زیادہ گرانٹ اِن ایڈ کا اوسط نہ پھیلے۔ پس ایسے اسکول میں جس کا ذکر اُوپر ہُوا جب تک کہ اوسطِ حاضری انگریزی پڑھنے والوں کی کم سے کم تین سو نہ ہو گورنمنٹ سے اس قدر گرانٹ اِن ایڈ کے ملنے کی ہی توقع نہیں ہو سکتی جو اُس کے نصف خرچ کے برابر ہو یہ شرط عملاً اس کے مساوی ہے کہ کبھی کوئی شخص گورنمنٹ سے مناسب گرانٹ کے ملنے کی توقع پر ایک عمدہ ہائی اسکول قائم کرنے کا قصد نہ کرے۔ میرے نزدیک گرانٹ ان ایڈ طالب علموں کی تعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ جو تعلیم دی جائے اُس کی عمدگی کے لحاظ سے تجویز کرنا چاہیئے۔ معدودِ لڑکوں کو ایک عمدہ تعلیم دینا اِس سے بدرجہا بہتر ہے کہ بہت سے لڑکوں کو ناقص تعلیم دی جائے۔"

پھر سوال متعلقہ اسکالرشپ پر اس طرح جواب دیا کہ "میں اسکالرشپوں کے فائدے کا طرفدار ہوں اور اس رائے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ اسکالرشپ دے کر پڑھانا گویا تعلیم کے لئے رشوت دینا ہے۔ بالتخصیص ہندوستان میں اور زیادہ تر مسلمانوں کے واسطے اسکالرشپوں کی نہایت ضرورت ہے۔ اسکالرشپوں سے اُن غریب طلبہ کو جو اپنی حالت کی وجہ سے اپنی تعلیم کسی خاص جماعت سے آگے جاری نہیں رکھ سکتے نہایت مدد پہنچتی ہے۔ اگلے زمانے کے مشہور و معروف شخصوں میں جنہوں نے سائنس کو ترقی دی ہے یا اپنی عمدہ تصنیفات سے لٹریچر کو رونق دی ہے مسلمانوں اور نیز اور قوموں میں اکثر وہ لوگ تھے جو غریب اور نہایت مفلس شخصوں کی اولاد میں سے تھے۔ اب بھی اس قسم کے لوگوں سے بڑی بڑی امیدیں کی جا سکتی ہیں۔ اگر میری معلومات میں غلطی نہ ہو تو میں خیال کرتا ہوں کہ اب بھی انگلستان میں اُن غریب آدمیوں کے لئے جو "سیرز" کہلاتے ہیں یہی طریقہ جاری ہے۔ مگر اُن کے زیادہ

خوش حال اسکول فیلو اُن کو کسی قدر حقیر سمجھتے ہیں ۔ محمڈن کالج علی گڑھ میں بھی مینجنگ کمیٹی نے اِس قسم کے سیزر طالب علموں کی امداد کا ایک طریقہ جاری کیا ہے ۔ لیکن وہ اُس کی ایسے مخفی طور پر امداد کرتی ہے کہ اور طالب علموں کو اِس قسم کے سیزر کے موجود ہونے کی اطلاع نہیں ہوتی اور وہ اُس حقارت سے بچ جاتے ہیں جو اور طرح پر کی جاتی ہے ۔"

پھر ایک سوال کے جواب میں کہا کہ "گورنمنٹ کی تعلیم اس اثر کے پیدا کرنے سے اِس لئے قاصر رہتی ہے کہ مضامین تعلیم بے شمار ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی لیاقت نہیں ہوتی ۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی واقعی عمدہ مصنف یا خیالات کے ہادی پیدا نہیں ہوئے جن کا نام غالباً باقی رہتا یا جن کا اثر قوم پر پڑتا ۔ مورل اور سوشل ترقی کے لئے یہ ایک بڑی مصیبت ہے ۔ اس ملک کے عام لوگوں کی رائے کثرتِ مضامین تعلیم کے برخلاف ہے ، اگر اُس کا مقصد عمیق علم حاصل کرنے کا نہ ہو ۔ ہمارے ہاں ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ "نیم حکیم خطرۂ جان و نیم ملا خطرۂ ایمان ۔" اور میں نے سُنا ہے کہ پوپ کا بھی کوئی شعر اسی کے مطابق ہے ۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے اور اُس کی کامیابی کی کیا توقع ہے؟ مفصل جواب دینے کے بعد کہا کہ "گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کر سکتی جس سے اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں اور نہ کوئی ایسا اسکول قائم کر سکتی ہے جو کہ اُن لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے لائق ہو ۔ میں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو اِن اسکولوں میں نہیں بھیجتے ۔ اور یقیناً کوئی اشراف یورپین بھی گو وہ کیسا ہی تعلیم نسواں کا شوقین ہو مسلمانوں پر ایسا الزام نہیں لگا سکتا بشرطیکہ وہ اِس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ہو .... جس حیثیت اور وقعت کے مدارس نسوان ہند میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کئے جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو اُن مدرسوں میں تعلیم کے لئے بھیجنا پسند کریں گے ؟ ہرگز نہیں ۔ عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اُس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہئے وہ

غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل "حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اُس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گو خفیہ اثر پہنچے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ دار عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے ..... اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی۔ تو حالتِ موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اُس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع ہوگی۔"

پیٹرسن نے سوال کیا کہ "آیا ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگ اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری مدرسوں میں دی جاتی ہے وہ اُن کے بچوں کے لئے مناسب ہے یا نہیں؟" سر سید نے اِس کے جواب میں کہا کہ "اُن کو اِس قسم کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔"

پھر اُنھوں نے سوال کیا کہ "تعلیم کی ترغیب کے لئے ایجوکیشنل درباروں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟" سر سید نے کہا کہ "یہ دربار بجز نمائش کے اور کچھ نہیں۔"

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ "کیا آپ کوئی ایسا یورپین اسٹیشن ہندوستان میں بتا سکتے ہیں جہاں اہلِ یورپ کسی مشن اسکول یا اور پرائیویٹ اسکول کے مصارف کے واسطے جو ہندوستانیوں کے لئے ہو کنٹری بیوشن یعنی چندہ نہ دیتے ہوں؟" سر سید نے اس کا یہ جواب دیا کہ "یہ سوال پیچیدہ ہے۔۔۔ اس سے ضمناً یہ تسلیم کر لینا نکلتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک یورپین اسٹیشن میں انگریز ہندوستان کی تعلیم کے لئے کنٹری بیوشن دیتے ہیں۔ میں اس ضمنی تسلیم کو جو سوال سے نکلتی ہے تسلیم نہیں کرتا۔ باقی سوال دو جداگانہ امور سے متعلق ہے۔ اوّل مشنری اسکولوں سے۔ سو اُس کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے یورپین اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی مشنری اسکول کنٹری بیوشن کے ذریعے سے منتفع ہوا ہو اور انگریز اس کی مدد نہ کرتے ہوں۔ دوسرے یہ

سوال پرائیویٹ اسکولوں سے متعلق ہے - اس حصۂ سوال کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی ہندوستانی اسکول قائم ہوا ہو اور اس کی امداد انگریز بذریعہ کنٹری بیوشن کرتے ہوں، سوائے محمڈن کالج علی گڑھ کے جس میں فی الحال صرف ایک کنٹری بیوشن یورپین کی طرف سے مقرر ہے .... " اس کے بعد لارڈ نارتھ بروک، لارڈ لٹن اور دیگر جلیل القدر حکام اور ارکانِ سلطنت کے عطیات کی شکر گزاری کے بعد کہا کہ "مگر اسٹیشن کے یورپین عہدیداروں میں سے کسی نے ہمارے کالج کو کوئی ماہواری یا سالانہ کنٹری بیوشن اور سوائے ایک کے کسی نے اس کو یکمشت چندہ بھی نہیں دیا۔"

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ "محمڈن کالج کے پراسپکٹس میں کیا فی الواقع اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ صرف مسلمانوں پر چندے کا محدود رکھنا مناسب ہے؟" اس کا جواب سرسید نے اس طرح پر دیا کہ "کمیٹی نے تجویز کی تھی کہ انگریزی قوم سے جو ہمارے حاکم ہیں اس کام میں شریک ہونے کی درخواست کی جائے کیونکہ کمیٹی کے نزدیک ایسے کالج کو قائم کرنا جو انگریزوں کی ہمدردی سے جدا ہو پولٹکل مصلحت کے برخلاف تھا۔ پس اس نے یہ تجویز کی تھی کہ مسلمان انگریزوں سے بھی امداد کی درخواست کریں۔"

پھر مسٹر وارڈ نے پوچھا کہ "کیا فی الواقع سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے قائم کرنے میں انگریزوں نے روپے اور ہمدردی کے لحاظ سے آپ کی بڑی مدد کی تھی؟" اِس کا جواب سرسید نے یہ دیا کہ "سوائے مسٹر براملی کے جنھوں نے مجھ کو ایک ہزار روپیہ دئے تھے اور کسی سے مجھے کچھ مدد نہیں ملی۔ مگر انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اِس سے پہلے تعلیم کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔"

محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

۱۸۸۳ء میں سرسید نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی - اوّل اِن کو ۱۸۶۸ء میں جب کہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے چند سال گزرے تھے یہ خیال ہوا تھا کہ عام ہندوستانیوں کو خواہ وہ ہندو ہوں اور خواہ مسلمان تعلیم کی غرض سے یورپ کے سفر پر آمادہ کرنے کے لئے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے اور اس کے ممبر دو روپیہ ماہوار چندہ دیا

کریں جو بطور ایک فنڈ کے یورپ کے سفر کے لئے جمع ہوتا رہے۔ مگر اس تدبیر میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندو اُس وقت یورپ کے سفر کو مذہب اور ذات کے قواعد کے برخلاف جانتے تھے اور مسلمان بھی اس قسم کے توہمات رکھتے تھے۔ اس کے سوا یورپ کا سفر اُس زمانے میں مشکل بھی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ۱۸۸۳ء میں یورپ کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور ہندوستانیوں کے لڑکے تعلیم کے لئے ولایت جانے لگے تھے۔ لیکن خاص کر مسلمانوں کے لئے حالتِ موجودہ میں سول سروس کا امتحان ولایت جا کر پاس کرنا جیسا کہ سر سید نے علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۱ اگست ۱۸۸۳ء میں مفصل بیان کیا ہے ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ کسی قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ میں کچھ حصہ نہ رکھتی ہو، عزت نہیں ہو سکتی۔ دولت مند مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اُن کو اپنی اولاد کی تعلیم کا مطلق خیال نہیں۔ اس وقت سول سروس کے قاعدے کے موافق ۱۹ برس کی عمر میں ولایت جا کر سول سروس کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ اُمراء کے لڑکے ۱۹ برس کی عمر تک بچے سمجھے جاتے تھے اور سمجھے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بقول سر سید کے اُس وقت تک تعویذوں کی ہیکل بھی اُن کے گلے سے نہیں اُترتی۔ ہاں متوسط درجے کے لوگوں کو بلاشک اولاد کی تعلیم کا خیال تھا اور خیال ہے مگر ولایت کے سفر کا پورا خرچ وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے سر سید نے ایسوسی ایشن خاص مسلمانوں کے لئے اس غرض سے قائم کی کہ اگر کم سے کم پانسو مسلمان ممبر دو دو روپے ماہوار دینے والے پیدا ہو جائیں تو اس سے بارہ ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جائے گی جو بطور فنڈ کے جمع ہوتی رہے گی۔ تاکہ جن مسلمانوں کے لڑکے ولائت میں تعلیم کا تمام خرچ اپنے پاس سے ادا نہیں کر سکتے اُن کی اس فنڈ سے امداد کی جائے اور مدرسۃ العلوم میں ایک خاص کلاس قائم کی جس کی تعلیم کا طریقہ ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اُس کلاس کے طالب علموں کو ولایت پہنچ کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

اگرچہ اس کلاس کا نام سول سروس کلاس رکھا گیا مگر درحقیقت اُس کے طالب علموں کو اِس مقصد کے لئے تیار کیا جاتا تھا کہ وہ انگلستان پہنچ کر مندرجہ ذیل کورسوں میں سے کوئی کورس اختیار کر لیں (۱) سول سروس کا امتحانِ مقابلہ (۲) کسی مضمون میں ولایت کی کسی یونیورسٹی

کی ڈگری حاصل کر لیں (۳) کسی پیشے میں مثل بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجینئری کے ڈپلما حاصل کرنا۔

پھر اس ایسوسی ایشن کے کام کو زیادہ وسعت دینے کے لئے اُنھوں نے شمالی ہندوستان کے ہر ایک ضلع میں سب کمیٹیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ممبروں کی تعداد زیادہ ہو اور سب کمیٹیوں کے لئے قواعد مقرر کر کے شائع کئے۔ مگر اس تمام کوشش کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہؤا کہ ایسوسی ایشن میں ۲۹۹ ممبر شامل ہوئے جو کچھ عرصے تک دو دو روپے ماہوار دیتے رہے اور کچھ لوگوں نے بطور ڈونیشن کے بھی کسی قدر روپیہ دیا۔ آخر سب کے ارادے سست ہو گئے۔ اور جیسا کہ ماہواری یا سالانہ چندوں کا ہمیشہ انجام ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ چندہ دینا بند ہو گیا۔

ایسوسی ایشن مذکور کی آمدنی سے چار ہزار ایک روپیہ جمع ہؤا تھا جس کو ممبروں کی منظوری سے سرسید نے الہ آباد بینک میں جمع کرا دیا تھا، تاکہ جس کام کے لئے وہ جمع کیا گیا تھا، جب اُس کا موقع آئے وہاں خرچ کیا جائے اور اُس وقت تک اُس کے منافع سے محمڈن کالج علی گڑھ کے طلبہ کو امداد دی جائے۔

محمڈن ایسوسی ایشن علی گڑھ

اسی ۱۸۸۳ء میں سرسید نے بشرکتِ رئیسانِ ضلع علی گڑھ محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جس کے مقاصد نہایت عمدہ تھے اور اُس کا چلنا بھی ایسا دشوار نہ تھا جیسا کہ سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا چلنا اور قائم رہنا دشوار تھا۔ کیونکہ اُس کے مقاصد رؤسائے ضلع کے مذاق کے موافق تھے۔ مگر چونکہ سرسید مدرسہ کے کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اُس کے پیرو کار نہ تھے، اس لئے وہ چند روز کے بعد بالکل مدہم پڑ گئی اور اب اُس کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرنا

۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ محمڈن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہو گئی تو سرسید کو یہ خیال ہؤا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اور ایک کالج چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ

سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں، اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں۔ ہر حصۂ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں اُن میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر جیسا کہ سرسید نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں منعقد ہوا۔

اِس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب ذیل قرار دئیے گئے تھے۔ (۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجے تک پہنچانے میں کوشش کرنا (۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں اُن میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اُس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا (۳) علومِ مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا بطورِ خود دیتے ہیں، اُس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا (۴) جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اُس کے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن میں جو تنزل ہو گیا ہے اُس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا (۵) قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کے لئے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے، اُن کے حالات کی تفتیش کرنا اور اُن کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورۂ بالا مقاصد کے سرانجام کرنے کے لئے دو طریقے تجویز کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمے لیں، کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو تجویزیں مسلمانوں کی ترقیِ تعلیم کے متعلق مناسب سمجھیں وہ اجلاس میں پیش کریں اور بعد غور اور مباحثے کے اتفاق یا کثرتِ رائے سے اُن کی منظوری یا نامنظوری عمل میں آئے۔ دوسرے جہاں تک ممکن ہو ہر شہر و قصبے میں کانفرنس کے مقاصد کے لئے کمیٹیاں قائم کی جائیں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں اگر وہ منظور کریں تو اُنھیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا

جائے تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا شہر یا قصبے کی نسبت وقتاً فوقتاً ہر قسم کے مدارس اور مکاتب و صنعت و حرفت و تجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و تنزّل کے حالات جو مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں تحریر کر کے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجتے رہیں - اور جو تجویزیں کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں اُن میں سے جو تجویز اُن کے علاقے میں قابلِ اجرا ہو اس کے جاری کرنے میں کوشش کریں -

۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۶ء تک اس کے سالانہ جلسے برابر مختلف شہروں میں ہوتے رہے مگر سالِ گزشتہ میں کچھ تو سرکاری روک ٹوک کے سبب جو طاعون کے انسداد کے لئے ریل کے مسافروں کے ساتھ جابجا کی جاتی تھی اور زیادہ تر سر سید کی افسردہ دلی اور انقباض کی وجہ سے، جس کی نوبت آخر کو مرض الموت تک پہنچ گئی اُس کا اجلاس موقوف کیا گیا - منجملہ گیارہ کے اوّل کے پانچ اجلاسوں میں پنجاب اور شمال مغربی اضلاع کے مختلف مقامات کی چھوٹی بڑی ۳۵ رپورٹیں اسلامی انجمنوں اور خاص خاص شخصوں نے لکھ کر کانفرنس میں بھیجیں یا خود آ کر پیش کیں - اُس کے بعد ظاہرا کوئی رپورٹ نہیں آئی اور تقریباً اسّی رزولیوشن اتفاق یا کثرتِ رائے سے پاس ہوئے -

ہر سال اجلاس کی تمام کارروائی ایک کتاب کی صورت میں چھپ کر ممبروں کو تقسیم ہوتی رہی - جس میں کیفیت، انتظامِ کانفرنس، فہرستِ ممبران و وزیٹراں، تعدادِ زرِ چندہ، رپورٹ سکریٹری متضمن حساب جمع و خرچ زرِ چندہ و کیفیتِ تعمیل و عدمِ تعمیل تجویزاتِ سالِ گزشتہ، رزولیوشن جو اجلاس میں پیش ہو کر پاس ہوئے اور اُن کے متعلق ممبروں کی اسپیچیں اور مباحثے، رپورٹیں جو مختلف اضلاع سے موصول ہوئیں، لیکچر اور نظمیں جو کانفرنس میں پڑھی گئیں وغیرہ وغیرہ درج ہوتی تھیں -

اس اجتماع کا نتیجہ براہِ راست یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جو تجویزیں کانفرنس کے اجلاس میں ہر سال منظور ہو کر شائع ہوئیں، اُن کے موافق ہر ضلع کی اسلامی انجمنیں اپنی اپنی بستیوں اور شہروں میں عمل درآمد کرتیں - جو تعمیلیں کانفرنس کے سکریٹری سے تعلق رکھتی تھیں اُن کو سکریٹری انجام دیتا - عام مسلمان جہاں تک اُن کے قبضۂ اختیار میں تھا، کانفرنس کی تجویزوں کی تائید اور

کانفرنس کی صلاح کے موافق اپنی اولاد کی ترقیِ تعلیم کا انتظام کرتے ۔ کیونکہ کانفرنس اِس کے سوا اور کچھ اختیار نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کو اُن کی واقعی حالت سے اور جو تدبیر اُن کی بھلائی کے لئے مناسب سمجھے اُس سے آگاہ کر دے ۔

لیکن سوا اِس کے کہ سرسیّد نے جو ابتدا سے اخیر دم تک سکریٹری رہے اپنے فرائض کا پورا پورا حق ادا کیا ۔ اور انہیں کی توجہ اور کوشش سے کانفرنس کے اجلاس برابر گیارہ برس تک ترقیٔ روز افزوں کے ساتھ ہوتے رہے ۔ اُس کی تجویزوں پر بہت ہی کم عمل درآمد ہُوا ۔ سرسیّد ہر سال جہاں کانفرنس ہوتی تھی وہاں اجلاس کی تاریخوں سے کئی کئی دن پہلے خود پہنچتے تھے ۔ وہاں کی لوکل کمیٹی کو ہر قسم کے انتظام میں مدد دیتے تھے ۔ انھیں کی صلاح و مشورے سے اجلاس کے لئے اکثر ہال کی تیاری اور ممبروں کی آسائش کا بندوبست ہوتا تھا ۔ وہ خود کانفرنس کی کارروائی کے قواعد اور پروگرام بناتے تھے ، ٹکٹ چھپواتے تھے ، رزولیوشن انتخاب کرتے تھے ۔ سالِ گذشتہ کا حساب اور تعلیمات کی رپورٹ کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے تیار کرتے تھے ۔ کانفرنس کے اجلاس کے بعد تمام کارروائی کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرتے تھے ، اُس کو چھپوا کر تمام ممبروں کے پاس بھیجتے تھے ۔ مینجنگ کمیٹی جو ہر سال کانفرنس کا مقام تجویز کرنے کے لئے مقرر ہوتی تھی ، اُس سے خط و کتابت کرتے تھے ۔ سال بھر میں کانفرنس کے متعلق وقتاً فوقتاً اخبار میں آرٹکل چھاپتے تھے اور جب کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں ہوتا (اور زیادہ تر علی گڑھ ہی میں ہوتا تھا) تو لوکل کمیٹی کے تمام فرائض خود انجام دیتے تھے ۔ اُنھوں نے صرف اِس غرض سے کہ ہر ایک ضلع کی رپورٹ باقاعدہ مرتب ہو کر آیا کرے ، دوسرے سال کے اجلاس میں ضلع علی گڑھ کی مفصّل رپورٹ لطور نمونے کے لکھنؤ میں خود لکھ کر پیش کی تھی ۔ جن رزولیوشنوں کی تعمیل بحیثیت سکریٹری ہونے کے ان کی ذات سے متعلق ہوتی رہی اُنھوں نے برابر اُس کی تعمیل کی ۔ کبھی کسی لوکل گورنمنٹ سے کبھی سررشتۂ تعلیم سے اور کبھی یونیورسٹی کے رجسٹرار سے اُن کو خط و کتابت کرنا پڑتی تھی اور تمام خط و کتابت کا خلاصہ اور اُس کا نتیجہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پیش کرنا ہوتا تھا ۔ باوجود ان تمام باتوں کے وہ خود بھی اور ممبروں کی طرح اکثر رزولیوشن پیش

کرتے اور اُن پر لمبی لمبی اسپیچیں دیتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی بہت سے کام کانفرنس کے متعلق اُن کو انجام کرنے پڑتے تھے جیسا کہ کانفرنس کے گزشتہ جلسوں کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کانفرنس کے اجلاس ہوئے وہاں کی لوکل کمیٹیوں نے بھی چندے کی فراہمی اور ممبروں کی مدارات اور اُن کی آسائش و خورد و نوش کا انتظام نہایت فیاضی اور کوشش و جاں فشانی سے کیا۔ مگر جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال بھر تک کسی کو اُس کا خیال تک نہیں آتا تھا۔

کانفرنس میں بہت سے رزولیوشن ایسے پاس ہوئے ہیں کہ اگر اُن کے موافق عمل درآمد ہوتا تو قوم کو بہت فائدہ پہنچنے کی امید تھی۔ مثلاً قرآن مجید کی تعلیم کو ترقی دینا، مسلمانوں کے اوقاف کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانا، تمام شہروں اور قصبوں میں مقاصدِ کانفرنس کی تائید کے لئے کمیٹیاں قائم کرنا اور اسلامی انجمنوں سے اُس کی تائید کی خواہش کرنا، تمام اسلامی انجمنوں کا اس باب میں کوشش کرنا کہ مسلمان طلبہ کی وظیفوں سے امداد کی جائے۔ سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کا موقع دینے کی گورنمنٹ سے درخواست کرنا۔ تعلیم نسواں کے لئے مذہب اسلام اور طریقۂ شرفائے اہلِ اسلام کے موافق مدرسے جاری کرنے، یورپ کے مؤرخوں نے جو غلط الزام مسلمانوں پر لگائے ہیں اُن کی غلطیاں دُور کرنے کے لئے رسائل لکھے جانے، مسلمان بادشاہوں کے قدیم فرامین جمع کر کے اُن کو محفوظ رکھنے کے لئے چھپوانا، صاف اور سلیس اُردو میں اخلاقی رسالے اور کتابیں لکھنا جو لڑکوں کی تعلیم میں کام آسکیں۔ مسلمانوں کی قدیم اور مستند کتابوں کا جو کہ اب نادر الوجود ہیں، پتا لگانا اور تا مقدور اُن کو بہم پہنچانا، اِس بات کی تحقیقات کرنا کہ جو علوم مسلمانوں نے یونان وغیرہ ملکوں سے حاصل کئے تھے اُن پر کس قدر اضافہ اُنھوں نے خود کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر افسوس ہے کہ اُن میں سے کسی تجویز پر اِلّا ماشاء اللہ کوئی معتد بہ توجہ قوم یا قومی انجمنوں کی طرف سے نہیں ہوئی۔

بایں ہمہ کانفرنس سے جو نتائج بالذّات یا بالعرض پیدا ہوئے وہ بھی امید اور توقع سے زیادہ تھے۔ سب سے بڑا فائدہ جو اِس مجلس کے اِنعقاد سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعتِ کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزار ہزار سے متجاوز ہو گئی، نہ کسی سیر

اور تماشے کی غرض سے نہ کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لئے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے لئے ہوتا ہے اُس میں شریک ہوں، دُور دراز سفر کی تکلیف اور آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنسوں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک جگہ کھانا کھاتے تھے، ایک جگہ رہتے تھے، قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے، ہنستے تھے، بولتے تھے، انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا دوستوں میں خلوص پیدا ہوتا تھا اور اِس طرح ایک مُردہ اور پراگندہ قوم کے اجزار میں روز بروز اِلتیام پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اِس کے سوا جب سے کانفرنس قائم ہوئی مسلمانوں میں علی العموم تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا۔ خصوصاً جس شہر میں کانفرنس کا اجلاس ہوتا تھا وہاں کے باشندوں پر بالخصوص اُس کا اور بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔ اِس کے علاوہ صرف کانفرنس کی بدولت گذشتہ برسوں میں غریب مسلمان طلبہ کی امداد بہت زیادہ ہوتی رہی۔ کئی سال تک خود کانفرنس کے چندے میں سے بعد منہائی اخراجات کے، جس قدر روپیہ بچا وہ وظائف میں صرف ہوتا رہا۔ نیز پنجاب کی اکثر اسلامی انجمنوں نے کانفرنس کی صلاح سے بہت سے طالب علموں کی امداد کی۔ کانفرنس ہی کی تحریک یا اقتضا سے بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے، مضامین اور لیکچر ایسے تیار ہو گئے جن سے اُردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہوا ہے۔ جیسے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، الجزیہ، مضمون کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین، مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب، ابو ریحان بیرونی کی لائف، کتاب کلیلہ و دمنہ کے تاریخی حالات، اشاعتِ اسلام بلا اِستعانتِ حسام، شمس العلما مولٰنا نذیر احمد اور نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لیکچر اور اسپیچیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور ضمنی فائدہ کانفرنس سے یہ ہوا کہ پبلک سپیکنگ کی لیاقت میں کانفرنس کے مباحثوں سے بہت ترقی ہو گئی۔ جن لوگوں کی طبیعت میں اس کی خداداد قابلیت موجود تھی مگر اُس کے ظاہر ہونے کا کوئی اور موقع نہ تھا، اُن کو کانفرنس میں گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اور اُن کا ایک مخفی جوہر ظاہر ہوتا تھا اور چونکہ ممبروں کی تمام اسپیچیں کانفرنس کی روئداد میں ہر سال چھپتی تھیں اِس سے اُردو لٹریچر میں ایک مفید اور بکار آمد اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اِسی کانفرنس کی تحریک سے الٰہ آباد یونیورسٹی نے "کاکس ہسٹری" کو جس میں مسلمانوں کی توہین

کے مضامین مندرج تھے ہائی اسکولوں کے کورس سے خارج کیا اور جب کہ یونیورسٹی میں نہایت زور شور سے اِس بات کی تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج کی جائے تو اِسی کانفرنس کے ذریعہ سے یونیورسٹی کو مسلمانوں کی ایک باوقعت جماعت کے خیالات سے مطلع ہونے کا موقع ملا اور اُس کو معلوم ہو گیا کہ اگر فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کی جائے گی تو اُس سے مسلمانوں کی دِل شکنی ہی نہ ہوگی بلکہ ہندوستان کی تہذیب، اُس کے علمِ مجلس اور اُس کی ملکی زبان یعنی اُردو کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ نیز کانفرنس ہی کی تجویز کے موافق نواب وقار الملک کو گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کرنے کی جرأت ہوئی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ گورنمنٹ اضلاع شمال و مغرب نے بعض شرائط پر اِس کی اجازت دے دی جس کا شکریہ گیارھویں اجلاس میں ادا کیا گیا۔

سب سے عمدہ اور نتیجہ خیز تجویز جو کانفرنس کے اجلاس واقع ۱۸۹۲ء میں بمقام دہلی مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل علی گڑھ محمڈن کالج نے پیش کی تھی وہ تعلیمی مردم شماری کی تجویز تھی۔ یعنی یہ کہ ہندوستان میں جو مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم نہیں دلواتے ان کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کس قدر ہیں؟ اور کس وجہ سے وہ اپنی اولاد کو تعلیم نہیں دلواتے؟ آیا مذہبی خیالات سے؟ یا اس وجہ سے کہ تعلیم کے اخراجات کا مقدور نہیں رکھتے؟ یا محض اپنی بے پروائی اور سہل انگاری کے سبب؟ اور جن کی نسبت تیسری وجہ معلوم ہو اُن کو اولاد کی تعلیم پر متوجہ کیا جائے۔ اُن سے اِس غرض کے لئے خط و کتابت کی جائے اور اُن کے سمجھانے کے لئے لائق آدمی بھیجے جائیں۔ چنانچہ اِس تجربہ میں مسٹر بک کی توجہ سے بہت کامیابی ہوئی ہے اور اگر اسی طرح کوشش برابر جاری رہے تو اُس سے عمدہ نتیجے پیدا ہونے کی امید ہے۔

اِسی طرح کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جو کانفرنس کے نتائج میں شمار ہو سکتے ہیں۔ مگر ایسے مجمعوں کے مفید یا غیر مفید ہونے کا اندازہ ان باتوں سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم اُس کو برابر ترقیِ روز افزوں کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے یا نہیں؟ اگر قوم میں اُس کے تھامنے اور ترقی دینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے تو اُس کی نسبت نہایت وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں جان ڈالنے والی اور اُن کو قومیت کے درجے تک پہنچانے والی ہوگی۔ لیکن اگر اُس کا مدار کسی خاص شخص کی ذات پر ہو تو اُس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ کیونکہ اس

قسم کے سالانہ جلسوں کے نتائج اُن ملکوں میں بھی جو صدیوں سے اُن کے عادی چلے آتے ہیں اور اُن سے بے شمار فائدے اُٹھا چکے ہیں، مدّتِ دراز کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ پس ہندوستان جیسے ملک میں جہاں محض یورپ کی تقلید سے ایسی مجلسیں انعقاد پاتی ہیں جہاں نہ قومی بندش ہے نہ عملی طاقت اور جہاں قومی مجلسیں پبلک پر کسی قسم کا رعب و داب نہیں رکھتیں، یہ امید رکھنی فضول ہے کہ کوئی کانفرنس یا کانگرس قوم کو چند سال میں کوئی معتدبہ فائدہ پہنچا سکے۔ جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس نے آج تک کوئی کارِ نمایاں نہیں کیا وہ گویا اِس کو کمہار کا آوا سمجھتے ہیں جس میں برتن بہت جلد پک کر تیار ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ کمہار کا آوا نہیں بلکہ چینی کا خمیر ہے جس کے تیار ہونے کا سالہائے دراز تک انتظار کرنا چاہیئے۔

اگرچہ ۱۸۹۷ء میں جو سرسید کی افسردہ دلی کے سبب کانفرنس کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا، اِس سے بہت بڑی مایوسی ہو گئی تھی اور لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سرسید کے بعد کانفرنس کا قائم رہنا مشکل ہے۔ لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش مسلمانوں میں اُٹھا ہے اُس سے کانفرنس میں پھر جان پڑتی نظر آتی ہے۔ نواب محسن الملک نے سرسیّد کی زندگی ہی میں کئی سال سے کانفرنس کی ترقّی پر کوشش کرنی شروع کر دی تھی۔ خصوصاً ۱۸۹۶ء میں جیسا کہ گیارھویں اجلاس کی رپورٹ میں مفصّل مذکور ہے، جو کوشش اور جاں فشانی اُنھوں نے کانفرنس کی اصلاح و ترقّی میں کی وہ گزشتہ دس سال میں کبھی کسی سے بن نہیں آئی تھی۔ اور اب بھی جس سرگرمی کے ساتھ وہ محمڈن کالج کی ترقّی پر متوجّہ ہوئے ہیں اسی طرح انہوں نے کانفرنس کی طرف توجّہ کی ہے۔ چنانچہ اِس سال زندہ دلانِ پنجاب نے کانفرنس کو لاہور میں مدعو کیا ہے جس سے اس بات کی اُمید بندھی ہے کہ مسلمان اس قومی میلے کو ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

پبلک سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۶ء میں لارڈ ڈفرن نے سول سروس کمیشن کی ممبری کے لئے انتخاب کیا۔ اس کمیشن میں سرسید کے سوا کوئی ہندوستانی ممبر ایسا نہ تھا جو انگریزی کی اعلیٰ درجے کی لیاقت نہ رکھتا ہو۔ صرف سرسیّد ہی ایک ایسے ممبر تھے جو انگریزی میں سوا اِس کے کہ اپنا نام لکھ سکتے تھے یا بقدرِ ضرورت انگریزی سمجھ سکتے تھے، اور ٹوٹی پھوٹی میں معمولی بات چیت کر سکتے تھے اور کچھ نہ جانتے تھے۔ باوجود اس

کے جیسا کہ سُنا گیا ہے ممبری کمیشن کے فرائض اُنھوں نے نہایت عمدگی سے ادا کئے۔ جس طرح وائسرائگل کونسل کی ممبری میں اُنھوں نے ہر ایک قانون پر جو اُن کی موجودگی میں پیش ہُوا بڑی بڑی لیگل اسپیچیں کیں اور قانونی لیاقت کا بہت بڑا ثبوت دیا، اسی طرح سول سروس کمیشن میں تمام سوالات پر جو کمیشن کے زیرِ بحث تھے نہایت قابلیّت کے ساتھ بحث کی۔

افسوس ہے کہ کمیشن مذکور کی رپورٹ میں ممبروں کے مباحثے اور اُن کی اسپیچیں جن سے ہر ایک سوال کے متعلق ہر ایک ممبر کی رائے معلوم ہو، بالکل درج نہیں کی گئیں اور اس لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات کا ایسا نہیں جس سے سرسید کی کارگزاری اور اُن کی رایوں کا جو کمیشن میں اُنھوں نے ظاہر کیں سُراغ لگ سکے۔ صرف ایک خط سرسید کا جو راقم کے خط کے جواب میں اُنھوں نے اِسی امر کے متعلق لکھا تھا موجود ہے۔ اُس میں سے چند سطریں جو اِس مقام کے مناسب ہیں نقل کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"سول سروس کمیشن کا حال دریافت کرنے کے لئے جو آپ رپورٹ طلب کرتے ہیں اُس سے آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اُس میں بجُز اس کے کثرتِ رائے فلاں امر کی طرف ہوئی اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اُن ممبروں کا جن کی رائے مخالف یا موافق تھی نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اگر آپ کو میری نسبت کچھ لکھنا ہے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن میں مَیں اس بات پر ساعی تھا کہ سٹیٹوٹری سول سروس جو جاری ہے اور جس سے ہندوستانیوں کا انتخاب یورپین عہدوں پر ہوتا ہے وہ منسوخ نہ ہو اور جو قواعد اُس کی نسبت گورنمنٹ سے جاری ہوئے ہیں اگر ضرورت ہو تو اُن میں کچھ اصلاح کی جائے۔ کثرتِ رائے اِس کے برخلاف تھی اور وہ چاہتے تھے کہ قانونِ مذکور منسوخ ہو اور اُس کی جگہ دوسرا قانون پارلیمنٹ سے جاری ہو اور اُس میں جدید قواعد مرتّب کئے جائیں۔ اسی کثرتِ رائے کے مطابق یہاں سے رپورٹ گئی۔ مگر ولایت میں یہ تجویز ہوئی کہ سٹیٹوٹری سول سروس کے قانون کو منسوخ کرنا ضرور نہیں اور جدید قانون کے جاری کرنے کی بھی حاجت نہیں۔ مگر ولایت سے اُسی تجویز کے مطابق جو کہ کثرتِ رائے سے جدید قانون بنانے کے لئے لکھی گئی تھی کچھ قواعد بن

کرآئے جن کے بموجب اب عمل درآمد ہے اور جن کو میں پسند نہیں کرتا۔ زیادہ تفصیل اس کی بغیر آپ کی ملاقات کے بیان نہیں ہو سکتی۔"

سرسید کا یہ خط نومبر ۱۸۹۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس خط کے آنے کے بعد کئی دفعہ اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر اس خیال سے کہ جب کمیشن مذکور کی ممبری کا حال لکھنے کا وقت آئے گا اُس وقت اِس کی مفصل کیفیت دریافت کر لی جائے گی، اُن سے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی گئی۔ کیا خبر تھی کہ جب پوچھنے کا وقت ہوگا تو اُس وقت وہ دُنیا میں نہ ہوں گے۔ لاچار اِسی مختصر بیان پر اِکتفا کیا گیا۔

اِنڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت

سرسیّد کی لائف میں کانگرس کی مخالفت کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اثر ہندوستان سے لے کر انگلستان تک ایک نہایت تعجب انگیز صورت میں اور مختلف قوموں پر مختلف طور سے ظاہر ہوا ہے۔ اِس لئے ہم اِس واقعہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

مئی ۱۸۸۴ء میں بابو سرندرو ناتھ بنرجی نے ہندوستان کے اکثر حصّوں میں اس غرض سے دَورہ کیا تھا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتوں کو اس بات کی طرف متوجّہ کیا جائے کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر جو ۲۱ برس سے گھٹا کر ۱۹ برس قرار دی گئی اُس کی گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ۲۱ کی عمر کا قاعدہ جو امتحانِ مذکور کے لئے پہلے مقرّر تھا وہی اب پھر جاری کیا جائے اور تمام ہندوستانی مل کر ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ جمع کریں۔ کہ جب کبھی اُن کو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان میں کوئی درخواست یا شکایت پیش کرنے کی ضرورت ہو اِس فنڈ کی آمدنی میں سے خرچ کیا کریں۔

اس دَورے میں ایک مقام انھوں نے علی گڑھ میں بھی کیا تھا اور جو جلسہ اس مقصد کے لئے علی گڑھ میں ہوا تھا اِس میں سرسیّد صدرِ انجمن تھے۔ نیز جو درخواست سول سروس کی عمر بڑھانے کے لئے ولایت بھیجی گئی تھی اُس کے بھیجنے میں سرسیّد بھی شریک تھے۔

غالباً اِسی سنہ میں بنگالیوں نے کلکتے میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام اوّل بنگال نیشنل لیگ رکھا گیا تھا اور جس کا مقصد مختصر لفظوں میں یہ تھا کہ گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اُن کا مطالبہ کیا جائے۔ ۱۸۸۵ء کے شروع میں نیشنل لیگ کی طرف سے انگریزی

میں ایک گم نام پمفلٹ شائع ہوا جس کا نام "دی اسٹار ان دی ایسٹ" یعنی ستارۂ شرقی تھا۔ اس پمفلٹ کے شروع میں جو چند انگریزی اشعار تھے اُن کا مضمون یہ تھا "اے آسمان! کیا اُمید اور انصاف مرگئے؟ کیا کوئی نیا دن کبھی نمودار نہ ہوگا؟ آہ اے بچّو! تمہاری ماں (ہندوستان) ہمیشہ اسی طرح عبث غلطوں پر ملتبس کئے جائے گی؟ ایک ستارہ (نیشنل لیگ) مشرق کے شفاف افق پر چمک رہا ہے اور (اے ہندوستان) تیرے بچے جادو کے زور سے ایک مدت سے سوتے پڑے خواب دیکھ رہے تھے۔ تیرے جگانے کی آواز اُن کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔"

پھر انھیں دنوں ایک رسالہ بطور سوال و جواب کے اور ایک اور رسالہ جس میں مولوی فریدالدین اور رام بخش دو فرضی شخصوں کا مکالمہ چھپا تھا شائع ہوئے۔ ان تینوں رسالوں کی پچاس ہزار جلدیں ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہندوستان کے تمام اطراف و جوانب میں مشتہر کی گئیں ازاں جملہ اُس کا ایک ترجمہ اُردو میں بھی شائع ہوا تھا جس میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقۂ انتظام کی بُرائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی تھی جس سے خاص کر جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے دل پر بُرا اثر ہوتا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ انھیں رسالوں کی نسبت لارڈ ڈفرن نے ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ "کانگرس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور زود اعتقاد شخصوں کے درمیان اُن رسالوں کے تقسیم کرنے کے جواب دہ ہوئے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد صریح سرکاری افسروں کے خلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا۔" اسی طرح اُنھوں نے ولایت جانے سے پہلے اہلِ کلکتہ کے الوداعی ایڈریس کے جواب میں بنگالی اخبار نویسوں کی نسبت کہا تھا کہ "گورنمنٹ کے برخلاف رعایا کے بھڑکانے کے لئے کوشش مت کرو۔ جیسا کہ تیس برس کا عرصہ ہوا اسی قسم کی غلط بیانیاں زبردست باعث اِس بات کا ہوئیں کہ اِس مُلک میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔"

[illegible]ء کے شروع میں جب کہ سرسید سول سروس کمیشن کے ساتھ لاہور گئے تھے اُن اشعار کے مضمون پر جو ستارۂ شرقی کے شروع میں چھپے بہت سے مسلمانوں کے مجمع میں خود راقم کے سامنے نہایت افسوس کرتے تھے اور بنگالیوں کے ساتھ شریک ہونے کو مسلمانوں کے حق میں مضر بتاتے تھے۔ پھر جب مولوی فریدالدین اور رام بخش کا مکالمہ مشتہر ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ اس میں ایک

فرضی نام مسلمان مولوی کا ہے اُن کو زیادہ خوف ہؤا کہ مبادا مسلمان جو پہلے ہی سے بدنام ہیں اِس مجمع میں شریک ہو جائیں۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ یہ رسالے فی الواقع بدنیتی سے اور ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کی غرض سے لکھے گئے تھے، مگر اس میں شک نہیں کہ سرسید کا خوف بالکل بجا تھا انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات نہ صرف آنکھ ہی سے دیکھے تھے بلکہ خود اُن کو بھگتا تھا اور جو مصائب انگریزوں اور ہندوستانیوں پر گزرے اُن میں وہ خود اور اُن کے اکثر عزیز اور رشتہ دار شریک تھے۔ کلکتے اور بمبئی میں جس آگ کا دُھواں تک نہیں پہنچا تھا وہ خود سرسید کے گھر میں لگی ہوئی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے اور اپنی کتاب اسبابِ بغاوت میں مدلائل ثابت کر چکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت جس نے ہزاروں مسلمان خاندانوں کو تباہ کر دیا وہ محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا، نہ کسی ملکی سازش یا پولیٹکل نفرت کا۔ پس گو یہ رسالے بُری نیت سے نہ لکھے گئے ہوں مگر نہایت قرین تھا کہ جاہل اور ناواقف لوگ اُن کا مضمون سُن کر گمراہ ہو جائیں، یا گورنمنٹ اُن کو بغاوت کی ایک تحریک سمجھے۔

سرسید تیس برس سے جیسا کہ اُن کی لائف علی الاعلان شہادت دیتی ہے، برابر کوشش کر رہے تھے کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں موانست و دوستی پیدا ہو اور اِن دونوں قوموں کو ایک دوسرے پر زیادہ بھروسہ اور زیادہ اعتماد ہو۔ اِس لئے اُن سے زیادہ کسی کو اِس بات کا خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمان کہیں پھر انگریزوں کی بدگمانی کا نشانہ نہ بن جائیں۔ وہ غدر میں یہ تماشا اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بُنیاد تھی ہندوؤں سے شروع ہوئی اور مسلمانوں پر تھپ گئی۔ اُن کو اب بھی یہی خوف تھا کہ جو چیز بنگالیوں کی لبرٹی سمجھی جاتی ہے وہ مسلمانوں میں آکر میوٹنی نہ بن جائے۔ چنانچہ گورنر مدراس نے صاف ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ "عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ لیکن باز یا جرّہ اُس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اُس کی گردن توڑ ڈالتا ہے" وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندوستان کی اکثر قومیں عموماً تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں اور آزادی کے مفہوم اور برلش حکومت کے اصول سے محض بے خبر۔ ان میں غالب حصہ اُن لوگوں کا ہے جن کے نزدیک تمام ملک کا متفق

ہو کہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور ایجی ٹیشن پھیلانا بعینہٖ ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا۔ پس اُن کی اور خاص کر مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایجی ٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں اور ایسی ہدایتوں سے جو ناواقفوں کی گمراہ کرنے والی ہوں، اپنے کان بند کرلیں۔ ان کو یقین تھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے ہندوستانیوں کے اعتبار کو سو برس پیچھے ہٹا دیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سیکڑوں جوان والنٹیر ہوتے، ایکٹ اسلحہ کبھی وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فوج کے کپتان اور کرنل وجرنیل نظر آتے۔" پس اس بات کا خوف کرنا کچھ بیجا نہ تھا کہ مبادا جو صفائی اور اعتبار ہندوستانیوں نے تیس برس میں از سرِ نو حاصل کیا ہے یا کرتے جاتے ہیں، وہ پھر اُسی بے اعتباری کے ساتھ بدل جائے جو تیس برس پہلے گورنمنٹ کو اُن کی طرف سے ہو گئی تھی۔

باوجود ان تمام باتوں کے سرسید نے علی الاعلان کانگرس کی مخالفت ظاہر کرنے میں جلدی نہیں کی۔ وہ ابتدا سے ہندو مسلمانوں میں قومی اتحاد اور سوشل یگانگت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے۔ انھوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں سے کبھی مغائرت کا خیال نہیں کیا۔ ملازمت کے زمانے میں اُن کا برتاؤ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ یکساں رہا۔ ایامِ غدر میں بجنور کے ہندو رئیسوں سے خود درخواست کرکے ضلع کا انتظام اِن کے سپرد کر دیا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے قائم کرنے سے اُن کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول اور اتحاد کو زیادہ ترقی ہو۔ اگرچہ ۱۸۶۷ء میں جب کہ شمال مغربی اضلاع کی اکثر ہندو سبھاؤں اور انجمنوں نے اُردو زبان اور فارسی حرفوں کے برخلاف نہایت سخت کوشش کی تھی، سرسید کی طبیعت ہندوؤں کی طرف سے کھٹک گئی تھی اور اُن کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندو مسلمان مثل ایک قوم کے مل جل کر کوئی کام کریں گے۔ اس کے سوا بنگالی اخباروں کی نکتہ چینیاں اور اعتراضات جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی ان جزوی رعائتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ اُن کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں۔ اور اُن کی وہ مخالفانہ اور دل شکن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف اُن میں ہمیشہ چھپتی رہی ہیں اور رہتی مایوس کرنے والی تھیں۔ مگر پھر بھی جہاں تک ممکن تھا، وہ دونوں قوموں میں اتحاد قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے بارہا پبلک اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے

کہ وہ سب اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں ۔ اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے مغائرت پائی جائے۔
یہاں تک کہ گائے کی قربانی کی نسبت جیسا کہ اُنھوں نے ایک آرٹیکل میں ظاہر کیا تھا ہمیشہ اُن
کی یہ رائے رہی ہے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لئے
گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔
محمڈن کالج علی گڑھ میں اُنھوں نے کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا جس سے مسلمان طالب علموں کی ہندوؤں
پر ترجیح لازم آئے چنانچہ اب تک تقریباً دوسو ہندو طالب علم اس کالج سے مختلف امتحانوں میں
کامیاب ہو چکے ہیں۔

پس اگرچہ وہ کانگرس کے طریق عمل کو ناپسند کرتے تھے مگر اِس خیال سے کہ دونوں قوموں میں
زیادہ اختلاف نہ پیدا ہو جائے، دو برس تک اُنھوں نے کانگرس کے برخلاف کوئی کارروائی
نہیں کی بلکہ نہایت صبر و خاموشی کے ساتھ اِس بات کے منتظر رہے کہ کانگرس میں کیسی تجویزیں
پیش ہوتی ہیں اور کس قسم کے حقوق وہ گورنمنٹ سے طلب کرتے ہیں؟ یہاں تک کہ کانگرس
کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور اُس کے مقاصد اُن کو معلوم ہوئے تو اُن کو پختہ یقین ہو گیا کہ اگر
بالفرض کانگرس کی کارروائیوں پر گورنمنٹ کو کچھ اعتراض نہ ہو اور اُس کے مطالبے بھی سراسر
ادب اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو بھی مسلمانوں کا اور اُن تمام قوموں کا جو تعلیم کے لحاظ سے نہایت
پست حالت میں ہیں، کانگرس میں شریک ہونا اور اُس کی تائید کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔
اُنھوں نے خیال کیا کہ کانگرس کے اصلی اور مقدم مقاصد ایسے ہیں کہ اگر وہ پورے ہو جائیں تو مسلمانوں
کی پولیٹیکل حالت کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے مثلاً مقابلے کا امتحان جو متعہد عہدوں کے لئے
ولائت میں ہوتا ہے اُس کا ہندوستان میں ہونا یا تمام متعہد عہدوں کا مقابلے کے امتحان کے ساتھ
مشروط ہونا یا لیجسلیٹو کونسل میں رعایا کے اِنتخاب سے ممبروں کا مقرر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی
کے ساتھ اُن کو معلوم ہوا کہ مدراس میں جو عنقریب کانگرس کا اجلاس ہونے والا ہے اُس میں
بعض تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اِس لئے اُن کو ضروری معلوم
ہوا کہ مسلمانوں کو اُن نتائج سے آگاہ کر دیں جو اُن کے نزدیک کانگرس کی شرکت سے مسلمانوں کے حق
میں پیدا ہونے والے تھے ۔

۲۸ - دسمبر ۱۸۸۷ء کو جب کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہو رہا تھا مسلمانوں کے عام جلسے میں سرسید نے انڈین نیشنل کانگرس کے خلاف ایک نہایت مفصل اور پُر زور لیکچر دیا۔ جو اُن کی اسپیچوں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے اور اس لئے اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ مگر جو بحث کہ اس میں کونسل کے الیکشن اور امتحان مقابلہ پر کی گئی ہے اس کا لبِ لباب ہم اس مقام پر لکھتے ہیں۔ کونسل کے الیکشن کے متعلق اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا اُس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے اور اگر بفرضِ محال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے گا جس کی رُو سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو۔" اِس موقع پر انھوں نے عمادؔ یہ بات کہی "میں نے کونسل میں چار برس کام کیا ہے مگر ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل اور نالائق اور مجھ سے بدتر کوئی ممبر نہیں ہو سکتا"۔ اس کے بعد جو تقریر اُنھوں نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اگر بالفرض کوئی ایسا مسلمان نکل بھی آئے تو ہرگز یہ امید نہیں کہ وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر، سفر کی تکلیف گوارا کر کے تمام اخراجات جو ایک ممبر کونسل کے لئے زیبا ہیں اپنے پاس سے برداشت کر کے یا قوم سے چندہ کر کے کلکتہ اور شملہ میں حاضر رہے گا۔" مقابلے کے امتحان کی نسبت اُن کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس امتحان کے لئے ہمارا ملک تیار نہیں ہے۔ انگلستان میں مقابلے کا امتحان ہر شخص ڈیوک سے لے کر ایک ادنیٰ درزی کے بیٹے تک دے سکتا ہے چنانچہ جو لوگ ولایت سے مقابلے امتحان دے کر یہاں آتے ہیں اُن میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر یہ لوگ جو انگلستان سے حاکم ہو کر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اِتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کسی لارڈ کے بیٹے ہیں یا درزی کے، اس لئے یہ امر کہ ہم پر ایک ادنیٰ حکومت کر رہا ہے ہماری آنکھ سے چھپا رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کا حال اس کے برخلاف ہے۔ ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک ادنیٰ درجے کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گی۔

اس کے سوا مقابلے کا امتحان اُس ملک میں ہو سکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں یا مختلف قومیں بسبب تعلیم و تربیت کے مِل جُل کر ایک ہو گئی ہوں۔ مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل الگ ہے، کسی طرح مقابلے کا امتحان قرینِ مصلحت نہیں۔ پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اس قدر مختلف اور متفاوت ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلے کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ ہندوستان کی کوئی قوم بنگالیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پس اگر ہندوستان میں تمام متعہد اور غیر متعہد عہدوں کے لئے مقابلے کا امتحان مقرر کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی ٹکڑا ملک کا ایسا نہ رہے گا کہ سوائے بنگالیوں کے یا کسی قدر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اور کسی کی صورت حکومت یا عدالت کی کرسی پر دکھائی دے۔"

سر سید کا یہ لیکچر اُردو اور انگریزی میں بذریعہ اخبارات کے بہت جلد ہندوستان میں شائع ہو گیا اور نیز انگلستان کے اکثر نامور اخباروں نے اس سے نوٹس لیا اور اس پر عمدہ ریمارکس کئے۔

اس کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو بمقام میرٹھ اُنہوں نے دوسرا لیکچر اسی قدر طولانی جیسا کہ لکھنؤ میں دیا تھا مسلمانوں کے عام جلسے میں دیا۔ اس لیکچر کا بڑا مقصد اس بات کا ثابت کرنا تھا کہ کانگرس والوں نے جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعے سے یہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان عموماً کانگرس میں شریک ہیں، یہ بالکل غلط ہے اور معدودے چند مسلمان جو اس میں شریک ہوئے ہیں اُنہوں نے غلطی کی ہے اور اُن کے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان من حیث القوم کانگرس میں شریک ہیں۔ یہ لیکچر بھی نہایت پُر زور اور مؤثر تھا۔ ان دونوں لیکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پُرانے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سر سید کی ہر ایک رائے اور ہر ایک تجویز کی مخالفت یا اُس سے نفرت ظاہر کرتے تھے، اُنھوں نے بالاتفاق اُن کی رائے کو تسلیم کر لیا اور باستثنائے معدودے چند تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اُس پر پورا پورا عمل کیا۔ نیز پُرانے خیالات کے اکثر ہندوؤں نے اور تقریباً کل تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور رئیسوں نے عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان اُن کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

پیٹریاٹک ایسوسی ایشن

اس کے بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے بمقام علی گڑھ "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگرس میں شریک نہیں ہیں اُن کی رائیں اور خیالات اور خط و کتابت بطور پمفلٹ کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہلِ انگلستان اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لئے ولایت کو بھیجی جائے اور نیز اخبارات کے ذریعے سے ہندوستان اور انگلستان میں عام طور پر شائع کی جائے۔

اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالکِ متوسط، اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگرس کے برخلاف جلسے کئے گئے۔ تمام تعلقہ دارانِ اودھ، مہاراجہ بنارس، ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا اور جس قدر کارروائیاں کانگرس کے برخلاف تمام ملک میں ہوئیں اُن کی رُوئداد یں ایسوسی ایشن کے ذریعے سے وقتاً بعد وقتٍ چھپ کر ولایت کو روانہ ہوتی رہیں اور پارلیمنٹ کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ کانگرس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں۔

بنگالی اخباروں میں سرسید کی اِس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور اُن کے برخلاف بڑے بڑے تلخ آرٹیکل لکھے گئے۔ سب سے بڑا اعتراض اُن پر یہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے ریپریزینٹٹو اصول کے بڑے طرفدار رہے ہیں اور اُن کی تمام اگلی تحریروں اور اسپیچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس پر جو ہندوستان میں ریپریزینٹٹو اصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے معترض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ ریپریزینٹٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اور اس باب میں اُن کی اب بھی وہی رائے تھی جو ہمیشہ اپنی تحریروں میں ظاہر کرتے تھے۔ اُنھوں نے خود لکھنؤ کے لیکچر میں اقرار کیا تھا کہ "میں کنسرویٹو نہیں ہوں بلکہ بہت بڑا لبرل ہوں۔" اُنھوں نے کونسل میں جب کہ لارڈ رپن کے سامنے سلف گورنمنٹ کا قانون پیش تھا اپنی اسپیچ میں صاف کہا تھا کہ "میں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوں کہ میں اس قدر عرصے تک زندہ رہا کہ میں نے اُس دن کا آغاز

دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف ہیلپ اور سلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنھوں نے انگلستان میں ریپریزینٹیٹو انسٹی ٹیوشن پیدا کیے ہیں اور اس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔

لیکن اسی اسپیچ میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انگلستان سے ریپریزینٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان فی نفسہٖ ایک برِ اعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شدومد کے ساتھ جاری ہے ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں اور ایک گروہ دولتمند اور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا گروہ ذی علم اور ذی رعب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو اور روشن ضمیری کے جس درجے تک وہ گروہ پہنچ گیا ہو وہ درجہ باقی باشندوں کے درجے سے بہت اعلیٰ ہو۔ ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسل میں اُن کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پروا نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو کہ ہندوستان میں ریپریزینٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کے جاری کرنے سے بڑی مشکلیں اور سوشل اور پولیٹکل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے جہاں قومی امتیاز اب باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ اور اختلافات تحمل کی ترقی کے سبب کم ہو گئے ہیں، وہاں ایسے معاملے میں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آئیں۔ قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہو گئے ہیں عیسائیوں کی پارلیمنٹ میں اپنے مطالب کی حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا اور درحقیقت سوشل اور پولیٹکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں ذات پات کے اختلافات اب تک موجود ہیں جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ

ترقی نہیں کی، مجھ کو یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے، بہ نسبت محض تمدّنی خیالات کے زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ جب تک قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولٹیکل حالت میں ایک جزوِ اعظم رہے گا اور اُن معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبودی سے بیشتر متعلق ہیں، اُس کے باشندوں پر اثر پڑے گا، اُس وقت تک الکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں ہو سکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آ جائے گی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اِس قسم کی تدابیر کے جاری کرنے کا جوابدہ سمجھیں گے جن کے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے۔"

یہ اسپیچ سر سیّد نے ۱۲۔ جنوری ۱۸۸۳ء کو یعنی جو کانگرس کے خلاف لیکچر لکھنؤ میں دیا، پانچ برس پہلے لارڈ رپن کے سامنے کی تھی۔ اِس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ جس طرح ہمیشہ ریپریزینٹٹو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اسی طرح وہ ہندوستان کی موجودہ حالت اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس میں ریپریزینٹٹو اصول کے موافق عمل درآمد کیا جائے۔ انگلستان میں ہوم رول بل پر جو سب سے بڑا اعتراض مخالف پارٹی کا تھا اور جس نے آخر اُس کو پاس نہ ہونے دیا وہ یہی تھا کہ آئرلینڈ میں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بہت زیادہ ہے۔ پس اگر یہ بل پاس ہو جائے گا تو پروٹسٹنٹوں کو بہت سخت نقصان پہنچے گا۔ جب آئرلینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں ایک فرقہ کی مجارٹی دوسرے فرقہ کے حق میں اس قدر مضر خیال کی جاتی ہے تو ہندوستان میں جہاں برخلاف تمام دُنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں ریپریزینٹٹو اصول سے بھلائی کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

سر سیّد پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ کانگرس کے قائم ہونے سے پہلے جب کہ بابو سرو ندرو ناتھ بینرجی علی گڑھ میں آئے تھے اور اُنھوں نیشنل فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تھی اُس وقت سر سیّد نے کیوں ان کے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا؟ اور کیوں اُس جلسے میں صدر انجمن بنے تھے جو نیشنل فنڈ جمع کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا؟ اور جب کہ وہ فنڈ اسی لئے جمع کیا جاتا تھا کہ تمام

ہندوستان کی طرف سے پارلیمنٹ میں جو درخواستیں بھیجی جائیں یا جو استغاثے پیش کئے جائیں ان کے اخراجات میں صرف کیا جائے تو پھر نیشنل کانگرس سے جس سے وہ فنڈ جمع کیا جاتا تھا کس لئے مخالفت کی گئی؟

اس کا جواب بہت صاف ہے۔ جس جلسے کا ذکر کیا جاتا ہے اُس میں صرف ایک مقصد کی تصریح کی گئی تھی یعنی یہ کہ عرضداشت ولایت میں اس غرض سے بھیجی جائے کہ سول سروس کے امتحان کی عمر بجائے ۱۹ برس کے ۲۱ برس کی قرار دی جائے۔ اس کے سوا جہاں تک ہم کو معلوم ہے اور کسی خاص مقصد کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ اِس مقصد کے متعلق جس کے لئے وہ جلسہ منعقد ہوا تھا، سرسید کی رائے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ سول سروس کمیشن میں انھوں نے برابر اُس کی تائید کی اور وہ مقصد اُسی طرح حاصل بھی ہو گیا جس طرح کہ ہندوستانیوں کی خواہش تھی اور اگر وہ تجویزیں جو آخر کو کانگرس میں پیش ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا یقین کیا جاتا ہے اگر اس علی گڑھ والے جلسے میں اُن کی تصریح کی جاتی تو ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ سرسید اُن تجویزوں سے اتّفاق کرتے۔ کیونکہ جو اسپیچ اُنھوں نے پانچ برس پہلے قانونِ سیلف گورنمنٹ پر کونسل میں کی تھی اُس کا سارا نچوڑ اس بات پر ہے کہ ہندوستانیوں کو ایسے حقوق دینے جن سے ہندوستان کی تمام معزز قومیں برابر مستفید نہ ہو سکیں کسی طرح مناسب نہیں۔

اِس کے سوا جو طریقہ کانگرس نے گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کا اختیار کیا، سرسید اُس طریقے کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "اسبابِ بغاوت" میں گورنمنٹ پر اعتراض کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ مگر اُس کی ایک کاپی بھی اِس طرح جیسے کہ پچاس ہزار رسالے کانگرس نے تمام ملک میں تقسیم کئے ہندوستان میں شائع نہیں کی۔ بلکہ جس قدر جلدیں چھپوائیں اُن میں سے ایک آدھ جلد گورنمنٹ ہند کے ملاحظہ کے لئے اور باقی کُل جلدیں پارلیمنٹ میں بھیج دیں۔ وہ اِس قسم کے ایجی ٹیشن کو جیسا کہ کانگرس نے ہندوستان میں شروع کیا تھا تمام ملک کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً نہایت مضر سمجھتے تھے۔ وہ ایک چٹھی میں جو بدرالدین طیب جی کے نام اُنھوں نے لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "امریکا میں اوّل اسی قسم کا ایجی ٹیشن شروع ہوا تھا اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخری لفظ جو اُن کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا۔ کہ "نو ٹیکسیشن وِداوٹ ریپریزنٹیشن"۔ پس جن لوگوں میں اِس لفظ کے کہنے کی طاقت ہو وہ اِس کانگرس کے

ایجی ٹیشن میں شریک ہوں، ورنہ ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجاتی ہیں۔" پھر آگے چل کر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ "غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل چلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

اگرچہ کانگرس سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں نے عموماً سرسید کے کہنے پر عمل کیا اور چند مستثنیٰ اشخاص کے سوا کوئی مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہوا، لیکن بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان سرسید کی اس پالیسی کو مدت تک نہایت تعجب سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ ایک نہایت لائق تعلیم یافتہ مسلمان نے ہم سے کہا کہ "جب گورنمنٹ نے اوّل ہی اوّل ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تھی اُس وقت ہندوؤں نے اُس کو خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ مگر مسلمانوں نے نہایت سختی کے ساتھ اُس سے انکار کیا تھا۔ لیکن مسلمان آخر کار اپنے انکار سے پشیمان ہوئے اور مجبور ہو کر ان کو انگریزی تعلیم اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کو کہیں نیشنل کانگرس کی علیحدگی سے بھی آخر کو پہلے کی طرح پشیمان نہ ہونا پڑے۔" مگر سال گزشتہ میں جو افسوس ناک واقعات پنجاب میں گزرے اور جو عبرت انگیز نتیجے اُن سے مترتب ہوئے اُن کو دیکھ کر غالباً سب کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ اور معلوم ہو گیا ہو گا کہ سرسید کی رائے اس باب میں کس قدر صائب تھی اور کانگرس سے علیحدہ رہنا ایک ایسی قوم کے لئے جیسے کہ مسلمان ہیں کس قدر ضروری تھا۔

اگرچہ بنگالیوں کی طرف سے سرسید پر بے انتہا لے دے ہوئی۔ اُن کو خوشامدی، زمانہ ساز، ٹائم سرور اور نہ کیا اور کیا کہا گیا۔ اُن کی پچھلی تحریروں کا حال کی تحریروں سے مقابلہ کر کے دکھایا گیا کہ وہ ایک دوسری سے کس قدر مختلف ہیں۔ مگر سرسید نے جس بات کو اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھ لیا تھا اخیر دم تک اُسی پر قائم رہے اور کسی کے کہنے سننے پر مطلق التفات نہیں کیا۔ یہاں تک کہ نکتہ چینوں کے ترکش خالی ہو گئے اور سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

کے سی۔ ایس آئی کا تمغہ ملنا

۱۸۸۸ء میں سرسید کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلےٰ ستارۂ ہند" سے ممتاز کیا گیا۔ ۱۴ مئی روز دوشنبہ کو اس تقریب سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ہال میں ضلع اور شہر علی گڑھ کے رئیس اور سرسید کے مسلمان، ہندو اور یورپین دوست جو باہر سے اس رسم میں شریک ہونے کو آئے تھے اور تمام اسٹیشن کے انگریز

جمع ہوئے۔ ہال کی دیواریں علاوہ دیگر معمولی آرائشوں کے مشرقی وضع کی تلواروں اور مغربی وضع کی بندوقوں سے سجائی گئیں۔ مسٹر کریڈک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس، مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر، راجہ جے کشن داس سی ایس آئی اپنے اپنے تمغے پہنے ہوئے سر سید کو ہال کے اندر لائے۔ تمام حاضرین اُن کے آنے پر کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارڈ نے جس کو ضلع کی پولیس نے مقرر کیا تھا ہتیاروں سے سلامی ادا کی۔ اس کے بعد مسٹر ای ایچ ریڈیچی اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے فرمانِ شاہی حسبِ ذیل پڑھ کر سنائے:

(اقل)

(دستخط) وکٹوریہ آر آئی،

وکٹوریہ مظلۂ متحدہ گریٹ برٹن و آئرلینڈ۔ ملکہ حامئ دین قیصرۂ ہند فرمانروائے

طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریکِ طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر ممالکِ مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارکباد آنکہ

چونکہ یہ مدِ نظر ہوا کہ آپ کو ایک ایسا نشانِ خسروانہ عطا کیا جائے جس سے وہ قدر و منزلت آپ کی نمایاں ہو جو اِس سلطنت اور آپ کی ذات اور اُن خدمات کے شایان ہو جو آپ سے اُس سلطنت کے لئے ظاہر ہوئیں۔ لہٰذا یہ مناسب اور زیبا ہے کہ آپ کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند" سے ممتاز و سربلند کیا جائے۔ اِس لئے بذریعہ اس تحریر کے آپ کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند" عطا ہو کر اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اس اعزاز سے سرفراز و مفتخر ہو کر حقوق جزو کل متعلقہ طبقۂ اعلائے موصوف سے مستفید ہوں۔

عدالتِ عالیہ مقام آسبورن بذریعۂ مُہر طبقۂ موصوف

آج یکم جنوری ۱۸۸۸ء اور ۵۱ سنہ جلوسی کو جاری ہوا

(دستخط) کراس (وزیر ہند)

(دوم)

(دستخط) وکٹوریہ آر۔ آئی

وکٹوریہ مدظلہا متحدہ گریٹ برٹن آئرلینڈ ملکۂ حامیٔ دین۔ قیصرۂ ہند فرمانروائے

طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند

بنامِ نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریکِ طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل قانونی نواب لیفٹیننٹ بہادر مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارکباد آنکہ

آپ کو اعزازِ طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند سے ممتاز و نامور کیا گیا ہے از انجا کہ ہم کو حسبِ اختیارات قوانینِ طبقۂ اعلائے موصوف اختیار حاصل ہے کہ آپ کی حاضری ولایت کی بغرضِ استفادۂ اعزاز طبقۂ اعلیٰ سے معاف کریں۔ لہٰذا حسبِ اختیاراتِ خسروانہ طبقۂ موصوف ہم آپ کو پورے اختیارات پہننے و استعمال کرنے ستارۂ موصوف کی بجانبِ چپ بالائے پوشاکِ بیرونی عطا کرتے ہیں۔ اور نیز نشانِ خاص و بندشِ متعلقہ نائٹ کمانڈر موصوف پہنیں اور استعمال کریں اور حسبِ منشائے اختیاراتِ مذکور آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ تمامی حقوقِ جزو کل متعلقہ طبقہ نائٹ کمانڈر موصوف مع استعمال ایک نشانِ خاص نائٹ بیچلر سلطنتِ موصوف سے مستفید و بہرہ یاب ہوں اور یہ اسی طریقہ مراسم سے متصور ہے جیسا کہ آپ اس نائٹ ہڈ سے، ہم سے، یا بجائے ہمارے نائبِ سلطنت اور گورنر جنرل ہند سے جو گرینڈ ماسٹر طبقۂ موصوف ہیں اعزاز حاصل کرتے۔

عدالتِ عالیہ مقام آسبورن بذریعہ مُہر طبقۂ موصوف

آج ۱۱، فروری ۱۸۶۶ء اور ۲۹ سنہ جلوسی کو جاری ہوا

(دستخط) کراس (وزیر ہند)

اس کے بعد صاحب کلکٹر مسٹر کینیڈی اپنی کرسی پر سے اُٹھے۔ سب لوگ اُن کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارڈ نے پھر سلامی ادا کی۔ صاحبِ ممدوح نے حضور ملکۂ معظمہ کوئن وکٹوریا کی طرف سے ستارۂ ہند سر سید کے سینے پر لگا دیا اور فیتہ مع بیج کے جو اُس کے ساتھ تھا اُن کے گلے میں ڈال دیا۔ سب لوگ پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور صاحب کلکٹر نے اردو میں ایک لمبی تقریر

کی جس میں سر سید کی بہت تعریف کی تھی۔ اور جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ " اہلِ فرنگ اور اہلِ ہند نے سید صاحب کی دسیع عقل اور حبّ الوطنی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اُن میں نوجوانی سے دو وصف برابر پائے گئے ہیں، ایک عِلم کی محبّت دوسرے وطن کی محبت کہ یہ دونوں ایک جگہ بہت کم پائی جاتی ہیں " لبرل نے اُن کو کنسرو ٹو خیال کیا کیونکہ انھوں نے رسوماتِ مغربی کی بالکل نقل نہیں کی اور کنسرو ٹو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اپنے مُلک کے باہر کوئی عمدہ چیز پا سکیں گے۔ اُنھوں نے اہلِ فرنگ اور اہلِ ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لئے وہ مدد دی جو بہت کم لوگوں نے دی ہے۔ " سید صاحب وسیع ہمدردی، دانشمندانہ صلاح، تجربہ کاری، سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حبّ الوطنی کی مثال ہیں اور نیز وہ وہ شخص ہیں جنھوں نے اپنے واسطے کبھی کچھ تلاش نہیں کیا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اور اِس لئے اُن کے ملک کے لوگ اور ملکۂ معظمہ اُن کی عزت کرتے ہیں اور ہم لوگ محبّت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں "

اِس کے بعد سر سید نے اِس مضمون کے معمولی اقرار نامے پر کہ وہ طبقۂ مذکور کے قوانین کی اطاعت کریں گے، دستخط کئے اور جلسہ برخاست ہوگیا اور مسز کینیڈی نے اِسی تقریب میں چند انگریزوں اور مسلمانوں کی اپنے ہاں حاضری پر دعوت کی۔

اِس واقعہ کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ رؤسائے ضلع علی گڑھ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سر سید کو تمغہ مذکور ملنے والا ہے تو اُنھوں نے سر سید کو اور یوریپین افسروں کو اس خوشی میں ایک بہت بڑا ڈنر دینا چاہا اور کچھ لوگ رئیسوں کی طرف سے مع ایک خط کے سر سید کے پاس آئے کہ آپ اس ڈنر میں آنا منظور کریں۔ سر سید نے اُس کے جواب میں بعد شکریہ رؤسائے ضلع کو یہ لکھ بھیجا کہ " چونکہ قوم کی حالت ابتر ہے اور اُس کی بہر سانی تعلیم کی بہت حاجت ہے اِس لئے میں ایسے فضول اخراجات کا سخت مخالف ہوں ...... پس اِس ڈنر اور جلسہ سے آپ مجھے معاف رکھیں " اور اخبار میں ایک آرٹیکل لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ خوشی یا تقریب میں ڈنر دینے محض فضول ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اِس وقت مسلمانوں کی تعلیم میں خرچ کرنے کی ہے۔ ہمارے لئے جو ڈنر تجویز ہوا تھا اُس کے لئے بارہ سو روپے کا

تخمینہ ہوا تھا۔ اگر وہ روپیہ تعلیمِ مسلمانان کے اخراجات میں صرف ہوتا تو کس قدر مفید ہوتا؟
سر سید کے واسطے اِس اعزاز کے ملنے کی بہت دن سے تجویز ہو رہی تھی۔ مگر چونکہ اس تمغے کے پانے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہے یعنی کبھی بتّیس سے زیادہ نہیں ہونے پاتی۔ اس لئے جب تک نائٹ کمانڈر کا عہدہ خالی نہیں ہوتا دوسرے شخص کو تمغہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ لارڈ لٹن نے دربارِ قیصری کے بعد اِس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ بسبب خالی نہ ہونے کسی نائٹ کمانڈر کے عہدہ کے اِس وقت سر سید کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔

ڈاکٹر آف لاز کی ڈِگری

سنہ ۱۸۸۹ء میں سر سیّد کو اڈنبرا یونیورسٹی سے بحیثیت ایک اعلیٰ مصنّف اور حامئ علوم ہونے کے ایک بڑا علمی امتیاز دیا گیا۔ انگلستان میں ایک دستور ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے ملک میں امتیاز حاصل کرتے ہیں یا علم کی روشنی پھیلانے میں کوشش کرتے ہیں اُن کو اہلِ علم کے عام مجمع میں کسی یونیورسٹی کی طرف سے ایک خاص اعزاز دیا جاتا ہے جس کو "ڈِگری آف ڈاکٹر آف لاز" کہتے ہیں۔
سر سیّد کی شہرت خطباتِ احمدیہ اور دیگر تصنیفات و تحریرات کے سبب سے انگلستان میں بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے مصنّف کے ہندوستان سے کچھ کم نہ تھی! اِس کے سوا مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور ہندوستان میں مسلمانوں میں تعلیم کے رواج دینے سے وہ علومِ جدیدہ کے بہت بڑے حامی سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے بغیر اس کے کہ سر سید کو اطلاع ہو ۱۸۸۹ء میں ایڈنبرا کی مشہور یونیورسٹی سے ان کو ایل ایل ڈی کی ڈگری ملنی تجویز ہوئی۔
۱۸ اپریل کو شہر ایڈنبرا کے سب سے بڑے ہال میں جو سائنڈ ہال کے نام سے مشہور ہے، گریجویشن کی رسم ادا کی گئی یہ جلسہ جیسا کہ علی گڑھ گزٹ مطبوعہ ۲۸ مئی ۱۸۸۹ء میں بحوالۂ اخبارات وحیثیاتِ ولایت مفصّل مذکور ہے بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔ تمام گیلریاں اور ہال کا ایک حصّہ عام لوگوں سے جو مدعو کئے گئے تھے بھرا ہوا تھا اور دوسرا حصّہ یونیورسٹی کے گریجویٹس سے مزیّن تھا اور اس جلسہ میں دو تہائی لیڈیاں تھیں جن میں لیڈی میور صاحبہ جنھوں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی "میور پارک" میں سب سے پہلا پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا موجود تھیں۔ اور اُن کے معزز شوہر سر ولیم میور بھی جن کو ہندوستان کے لوگ عموماً جانتے ہیں بحیثیت پرنسپل یونیورسٹی

لارڈ چانسلر کے ہمراہ جو جلسہ کے پریذیڈنٹ تھے تشریف لائے تھے۔ جس وقت لارڈ چانسلر کے سامنے سر سیّد کا ذکر کیا گیا اور حاضرین نے اُس پر تحسین و آفرین کا نعرہ بلند کیا تو سر ولیم میور اور لیڈی میور صاحبہ خوشی سے باغ باغ ہو گئیں۔ اس موقع پر بارہ آدمیوں کو جن میں سے چھ حاضر اور چھ غیر حاضر تھے یہ ڈگری ملنی تجویز ہوئی تھی۔ پروفیسر کرک پٹرک نے سر سیّد کو لارڈ چانسلر سے انٹروڈیوس کرتے وقت کہا کہ "میں سب سے پہلے آپ سے یہ اجازت چاہتا ہوں کہ سر سیّد احمد خاں بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی کو اُن کی غیر حاضری میں ڈاکٹر اوف لاز کی آنریری ڈگری عطا کی جائے۔" اس کے بعد سر سیّد کی تاریخ ولادت، خاندان، سلطنتِ مغلیہ کا قدیم توسّل، سرکاری ملازمت، ایام غدر کی خدمات اور تیس انگریزوں کی جان بچانے میں نہایت شریفانہ ہیروئزم ظاہر کرنا، پولٹکل پنشن اور خطابات کا ملنا، وائسریگل کونسل کی ممبری اور ملکی و قومی خدمات، آثار الصنادید اور دیگر تصنیفات خصوصاً خطباتِ احمدیہ کا لکھنا، اسپیکنگ کی اعلیٰ لیاقت، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا فیلو مقرر ہونا، محمڈن کالج قائم کرنا، اور بڑے بڑے ارکانِ سلطنتِ ہند کا اُس میں مدد دینا یہ سب باتیں بیان کیں اور کہا کہ "سر سیّد سب سے زیادہ نامور مسلمان سبجکٹ حضور ملکہ معظمہ قیصرِ ہند کے ہیں اور اس لئے خصوصیت کے ساتھ یونیورسٹی کے اِس اعزاز کے مستحق ہیں۔" اس کے بعد تمام حاضرینِ جلسہ نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کئے اور سر سیّد کو ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ افسوس ہے کہ جو سند اڈنبرا کی یونیورسٹی نے سر سیّد کو بھیجی تھی۔ وہ اِس کتاب کے لکھنے وقت ہم کو دستیاب نہیں ہوئی۔ اِس لئے ہم یہاں اُس کی نقل کرنے سے معذور ہیں۔

اگرچہ سر سیّد اڈنبرا یونیورسٹی کی اس قدر شناسی کے نہایت شکر گزار تھے اور جو اعزاز کہ اُس نے اُن کو دیا تھا اُس پر فخر کرتے تھے۔ لیکن اُنھوں نے ایسی آنریری ڈگریوں کو ڈگری پانیوالوں کی اصلی لیاقت کا معیار کبھی نہیں سمجھا بلکہ وہ یونیورسٹی کی ہر ایک ڈگری کو اُس قوم کے حق میں جس کے ہاتھ میں اُس یونیورسٹی کی باگ نہ ہو ایک بھیک کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک ایڈریس کے جواب میں جو اہلِ پنجاب نے ۱۸۹۴ء میں اُن کو بمقام جالندھر دیا صاف کہا تھا کہ "یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں، اُن کے ہاتھ بِکے ہوئے ہیں۔ جو کچھ ناتمام علم کا وہ دیتی ہے اُس کو کھاکر

پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج سر پر۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف نچر بناتی ہے۔ اے دوستو! میں خود بھی انھیں میں ہوں کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے ہم آدمی جبھی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

ٹرسٹی بل پر اختلاف

کالج کا انتظام ابتدا میں صرف ایک کمیٹی سے جو کالج فنڈ کمیٹی کہلاتی تھی متعلق تھا۔ لیکن جوں جوں کالج ترقی کرتا گیا نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں پہلے قواعد کی ترمیم ہو کر نئے بائی لاز بنائے گئے اور کالج فنڈ کمیٹی کے ماتحت چار اور کمیٹیاں مقرر ہوئیں (۱) کمیٹی ڈائرکٹران تعلیم السنہ مختلفہ و علوم وغیرہ (۲) کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنّت و جماعت (۳) کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اثنا عشریہ (۴) مینجنگ کمیٹی جس کا کام بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اور بورڈروں کی ہر طرح کی نگرانی تھا۔

اِس کے بعد جب کالج کی حالت اور اُس کی جائداد بہت ترقی کر گئی اور اس پر لوگوں کا اعتماد زیادہ ہوگیا یہاں تک کہ لوگ ہزارہا روپیہ اپنے بچّوں کی تعلیم کے لئے ہمیشگی طور پر کمیٹی میں امانت رکھوانے لگے تو سرسید کو یہ خیال ہُوا کہ اب کالج کا ایک معمولی کمیٹی کے سپرد رہنا مناسب نہیں۔ اس خیال کو پیدا ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اتفاق سے سرسید سخت بیمار ہوگئے جب صحت ہوئی تو اُنھوں نے اس بات کو بہت ضروری سمجھا کہ اُن کی زندگی میں سرکاری قانونِ مروجۂ وقت کے موافق کالج اور اُس کی جائداد کے لئے ٹرسٹی (امین) مقرر ہو جائیں اور ایسے قواعد و ریگولیشن بنائے جائیں جو تمام ضروری جزئیات کالج پر حاوی ہوں، اور جہاں تک ممکن ہو ایسا انتظام کیا جائے کہ جن اصولوں پر کالج کی بُنیاد رکھی گئی ہے انھیں اصول پر ہمیشہ قائم رہے۔ سرسید کے معزز یورپین دوستوں نے بھی دُور اندیشی کی راہ سے یہی صلاح دی اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ ایما پایا گیا کہ جب تک اطمینان کے قابل آئندہ انتظام نہ ہوگا گورنمنٹ اور حیدرآباد کی امداد جاری نہیں رہ سکتی۔

پس سرسید نے ۱۸۸۹ء میں حسبِ ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لئے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اُس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لئے بھیجیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی نے اُس کی بعض دفعات سے اختلاف کیا۔ جن میں سے ایک وہ دفعہ بھی جس کی رُو سے آنریبل سید محمود کو جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا اور اُن کے ساتھ اُن کے اکثر دوست بھی جن میں زیادہ تر ضلع علی گڑھ اور بلند شہر کے رئیس تھے، اس اختلاف میں شریک ہو گئے۔ اگر یہ اختلاف، اختلافِ رائے کی حد سے متجاوز نہ ہوتا اور ٹرسٹی بل کے پاس ہو جانے پر بالکل رفع ہو جاتا تو ہم اُس کو خدا کی رحمت سمجھتے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ آخر کار مخالفت کی صورت میں بدل گیا۔ باوجودیکہ مسودہ ممبرانِ کمیٹی کے بھرے جلسے میں مجارٹی کی رُو سے پاس ہو گیا، مگر اُن کی مخالفت رفع نہ ہوئی۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں اور تقریباً اُن کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہو گئی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی رائے اس باب میں خطا پر تھی تو بھی جب کہ ٹرسٹی بل جاعلے کے موافق پاس ہو چکا تھا تمام کالج کے ہوا خواہوں کو اُسے سر پر رکھنا چاہیے تھا۔ یہی وہ مستحکم بنیاد ہے جس پر تمام شائستہ ملکوں میں قومی جماعتیں اور قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہیں اور روز بروز ترقی کرتے جاتے ہیں۔ جب تک کوئی تجویز کثرتِ رائے سے پاس نہیں ہوتی، اس سے نہایت زور شور کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی پر غالب آنے کے لئے تمام وسائل جو اُس کی قدرت میں ہوتے ہیں کام میں لاتی ہے۔ مگر جہاں ایک پارٹی کثرتِ رائے سے غالب آئی فوراً دوسری پارٹی نے ہتیار ڈال دیئے اور اختلاف اتفاق کے ساتھ بدل گیا۔ چنانچہ انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین نے کہ وہ بھی اس اختلاف میں شریک تھے بل پاس ہو جانے کے بعد اُس کو بسر و چشم قبول اور منظور کر لیا اور کالج کے پہلے سے زیادہ حامی و مددگار بن گئے۔ مگر اور صاحبوں نے قانونِ ٹرسٹیاں کو ہرگز تسلیم نہیں کیا اور کالج سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔

اگرچہ سرسید چالیس برس برابر طرح طرح کی مخالفتیں جھیلتے رہے مگر کوئی مخالفت اُن کو ایسی شاق نہیں گذری جیسی کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور اُن کی پارٹی کی مخالفت۔ جس سے فی الواقع اُن کا حوصلہ تنگی کرنے لگا تھا اور صبر و تحمل کا دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اوّل تو مولوی سمیع اللہ خاں کو وہ اپنا قوتِ بازو سمجھتے تھے جن سے کالج اور بورڈنگ کے انتظام اور نگرانی میں اُن سے بے انتہا تقویت پہنچتی تھی اور ایسے عزیز دوست اور مددگار سے ایسی سخت مخالفت کا ظہور میں آنا فی الواقع ناقابلِ برداشت تھا۔ دوسرے اُن کی مخالفت اُنھیں کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ کالج کے بہت سے معاون اُن کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لئے سرسید کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں کالج کی چلتی گاڑی میں روڑانہ اٹک جائے۔ چنانچہ اُنھیں دنوں میں اُنھوں نے ایک نہایت پُرجوش آرٹکل علی گڑھ گزٹ میں شائع کیا تھا اور جس میں فرانس کی طرح ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسید کے دل کی اُس وقت کیا حالت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈِسپاٹک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصلت کو چاہو اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو اور چاہو اُن کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو۔ بہرحال یہ خصلت اُن میں ضرور تھی۔ گو وہ جزوی اور فروعی باتوں میں اختلافِ رائے سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے، مگر جن اصول پر اُنھوں نے کالج کی بنیاد رکھی اُن سے وہ ہرگز دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور جس بات کو اُن میں مخل سمجھتے تھے اُس کو جہاں تک کہ اُن کے امکان میں تھا چلنے نہیں دیتے تھے۔ اُن کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اُس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدّم مقصد جو ۱۸۵۷ء سے لے کر اخیر دم تک اُن کے پیشِ نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یک جہتی، میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لئے انھوں نے یورپین اسٹاف کو کالج کا جزوِ غیر منفک قرار دیا تھا اور انگلستان سے چیدہ چیدہ آدمی بُلوا کر کالج میں جمع کئے تھے مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ یورپین اسٹاف مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک گیا تھا اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرسید نے اپنی زندگی میں آئندہ کے لئے سکریٹری شپ کا انتظام نہ کیا تو اُن کے بعد ضرور مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری ہوں گے۔ اُنھوں نے، نیز اور بعض اور یورپین افسروں نے سرسید کو صلاح دی کہ سید محمود کو جائنٹ سکریٹری مقرر کر دیں تاکہ یورپین اسٹاف جس کو معاہدہ کر کے انگلستان سے بلایا گیا ہے، سرسید کے آئندہ جانشین کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو جائے۔ اگرچہ سرسید کو یقین تھا کہ سید محمود کو جائنٹ سکریٹری مقرر کرنے

سے لوگوں کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی اور ایسی بدگمانیوں سے جیسا کہ اِس کتاب کے صفحات میں جابجا مذکور ہے، وہ سو سو کوس بھاگتے تھے۔ اِس کے سوا سیّد محمود کی نسبت معتبر ذریعوں سے سُنا گیا ہے کہ وہ سکریٹری یا جائنٹ سکریٹری بننے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر چونکہ یورپین اسٹاف کو اِس بات پر سخت اصرار تھا اور اُن کو کالج کی آئندہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضرور تھا اِس لئے سرسیّد کو ٹرسٹی بل میں ایک خاص دفعہ سیّد محمود کے جائنٹ سکریٹری مقرر کرنے کے لئے داخل کرنی اور سیّد محمود کو بہ جبر اس تجویز پر راضی کرنا پڑا۔

جو لوگ کالج کے خیر خواہ تھے اُن کا فرض تھا کہ اوّل تو اس تجویز سے اختلاف ہی نہ کرتے کیونکہ وہ ایک ایسی مصلحت پر مبنی تھی جس کو سرسیّد نے ہمیشہ نظام کالج میں ہمیشہ سب سے زیادہ مقدم سمجھا ہے۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض کثرتِ رائے سرسیّد کی طرف نہ ہو جاتی تو سرسیّد قطعاً کالج کو چھوڑ بیٹھتے۔ اور یورپین اسٹاف یقیناً کالج کو خیر باد کہہ کر چلا جاتا۔ اور پھر کوئی یورپین جنٹلمین یہاں آنے کی ہامی نہ بھرتا اور اینگلو انڈین افسروں اور حاکموں کو جو ہمدردی کہ اب کالج کے ساتھ ہے وہ ہرگز باقی نہ رہتی اور اگر انہوں نے اختلاف ہی کیا تھا تو بل پاس ہو جانے کے بعد لازم تھا کہ اُس کو خوشی سے منظور کر لیتے اور سمجھ لیتے کہ اگر اِس تجویز کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے تو ہر وقت اس تجویز کا تدارک اور دفعہ مذکور کی ترمیم ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر اُس مخالفت پر باوجود پاس ہو جانے بل کے برابر اصرار کرتے رہے تو کالج کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ اور مسلمانوں کی پھوٹ اور نااتفاقی پر سارا زمانہ ہنسے گا۔ یہ کہنا کہ ہم حق پر تھے اور اِس لئے ہم کو غلط میجارٹی کا اتباع کرنا ضرور نہ تھا، بالکل ایسی بات ہے جیسے دو فریق قرعہ اندازی پر فیصلہ کا انحصار کریں اور جب قرعہ کسی فریق کے خاطر خواہ نہ نکلے تو یہ عذر کرے کہ اِس میں میری حق تلفی ہوتی ہے۔ اِس لئے میں اِس فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا۔

الغرض بل پاس ہو جانے کے بعد اگرچہ مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کالج سے بالکل بے تعلق ہو گئی تھی مگر مدت تک اُن کے نام ٹرسٹیوں کی جماعت میں بدستور قائم رکھے گئے اور مثل تمام ٹرسٹیوں کے سرسیّد اُن سے بھی کالج کے معاملات میں برابر مشورہ اور رائے طلب کرتے رہے۔ لیکن چونکہ وہ تمام کارروائی کو جو جدید قواعد کے موجب کی جاتی تھی غلط سمجھتے تھے اِس لئے

اُنھوں نے کبھی کچھ جواب نہیں دیا۔ آخر ایک عرصے کے بعد مجبور ہو کر اُن کا نام ٹرسٹیوں کی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد نواب سر وقار الامرا، بہادر مدار المہام ریاستِ حیدر آباد دکن نے جبکہ وہ کالج کے ملاحظے کے لئے علی گڑھ میں تشریف لائے ہوئے تھے، بنظرِ سرپرستی کالج و خیر خواہی اہلِ اسلام سر سید اور مولوی صاحب ممدوح کے درمیان صفائی کرا دی تھی۔ چنانچہ سر سید نے سالانہ اجلاس ٹرسٹیاں میں مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کے نام پھر ٹرسٹیوں میں داخل ہونے کی تحریک کی اور تمام حاضرینِ جلسہ نے بہت خوشی سے اُس کو منظور کیا، مگر بعض معقول وجوہات پر جن کی تفصیل طولانی ہے اُنھوں نے ٹرسٹی بننا منظور نہیں کیا اور جو صفائی کہ ہِز ایکسیلینسی نے کرائی تھی سر سید کی زندگی میں اُس پر کوئی عمدہ نتیجہ مترتب نہ ہوا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ جولائی میں نواب لیفٹننٹ گورنر اضلاعِ شمال مغرب نے مسلمانوں کی بدبختی پر رحم فرما کر آنریبل سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خاں سی ام جی کے باہم پھر صفائی کرا دی ہے اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ اس صفائی کا انجام بہتر ہوگا اور تمام لائق اور ذی رعب مسلمان متفق ہو کر اس قومی انسٹی ٹیوشن کے استحکام و دوام اور ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں گے۔

اگرچہ قوم کے اُن دو معزز ممبروں میں صفائی ہو جانے کے بعد ہمارا ہرگز جی نہ چاہتا تھا کہ ٹرسٹی بل کے ناگوار واقعے کا ذکر کر کے ناظرین کو وہ نامبارک زمانہ یاد دلائیں جو قومی کالج اور قومی تعلیم کے حق میں ایک سخت مصیبت کا زمانہ تھا، مگر چونکہ سر سید کی بائیوگرافی میں اُن تمام واقعات کا جن سے اُن کے اخلاق پر کوئی روشنی پڑتی ہو، استقصا کرنا ضرور ہے۔ اس لئے جو کچھ اِس معاملے کے متعلق ہم کو معلوم تھا یا ہماری سمجھ میں آیا بے کم و کاست بیان کر دیا گیا۔

کالج کے روپے میں غبن ہونا

عربی میں یہ مثل مشہور ہے "الھموم بقدر الھمم" یعنی جس قدر ہمتیں عالی ہوتی ہیں اسی قدر رنج و غم زیادہ ہوتے ہیں۔ سر سید نے کالج کے عشق میں اتنے کام اپنے سر دھر لئے تھے کہ ایک آدمی کا اُن سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار تھا۔ آخر ۱۸۹۵ء میں اِن کو کالج کی بدولت ایک ایسا دھچکا لگا کہ جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش

نہیں ہوا منجملہ اہلکارانِ دفتر سکریٹری کے ایک شخص شام بہاری لعل جون ۱۸۸۳ء سے ہیڈ کلرک کے عہدے پر مامور تھا جو علی گڑھ کے ایک ممتاز کالستھ خاندان کا آدمی تھا۔ اس کا باپ پنجاب میں تحصیلدار اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا اور اب پنشن پاتا تھا اور اس کا دادا لفٹننٹ پنجاب میں میر منشی تھا۔ سرسید نے اس کو ایک اشراف خاندان کا آدمی سمجھ کر اپنے انگریزی دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر کر لیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد جتایا گیا کہ یہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزائے قید پا چکا ہے، مگر سرسید نے اس خیال سے کہ اول تو یہاں اُس کی تحویل میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کا احتمال ہو، دوسرے اشراف آدمی ایک زک اُٹھا کر پھر ویسی ہی خطا نہیں کرتا، اُس کو بدستور اُس کے عہدے پر بحال رکھا۔ سرسید میں ایک خاص خصلت تھی جس کو اگرچہ پرانی سوسائٹی میں ایک نہایت شریفانہ خصلت خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانے میں وہ سخت اعتراض کے قابل سمجھی جاتی ہے خاص کر اُس صورت میں جب کہ اُس کا اثر ذاتی معاملات سے گزر کر قومی معاملات تک پہنچ جائے۔ اُن میں ایک خاص قسم کی مروت بدرجۂ غایت تھی۔ وہ کسی کو ملازم رکھ کر عام اس سے کہ اُن کا ذاتی ملازم ہو یا نہ ہو، باوجود متواتر شکایتوں کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُس کے باب میں کسی قسم کی شکایت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ کسی کی نسبت اُن کو مطلق بدگمانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں پر پورا اعتماد کر لیتے تھے اور جو کام اُن کو سپرد کر دیتے تھے اُس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بغیر اعتبار کے دُنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا لیکن اس مشہور قول کے موافق کہ "الحزم سوء الظن" ضرور ہے کہ کبھی کبھی امتحاناً اپنے ماتحتوں کے کام کو جانچ لیا جائے تاکہ اُن کے دل میں ڈر رہے اور وہ ہر ایک بات کا اپنے تئیں جوابدہ سمجھتے رہیں مگر سرسید کے دل میں کبھی اس قسم کے امتحان کا خیال نہ آتا تھا۔ شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے جولائی ۱۸۹۵ء تک اُن کے دفتر میں رہا۔ اس عرصے میں کبھی اُس نے یہ نہیں جانا کہ مجھ سے کوئی بازپرس کرنے والا ہے یا نہیں۔

کالج کا بہت سا روپیہ بینک بنگال میں بطیبۂ امانت جمع رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت چیکوں کے ذریعے سے وصول کیا جاتا تھا اور کچھ پرامیسری نوٹ ملکیت کالج بطور

کیپٹل فنڈ کے بنک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول ہوتا تھا۔ چیک بک سرسید کے پاس ایک بکس میں بند رہتی تھی اور اُس کی کنجی بھی اُنھیں کے پاس رہتی تھی۔ مگر جب چیک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو شام بہاری لال سرسید سے کنجی لے کر چیک نکال لیتا تھا اور اُس کی خانہ پُری کر کے سرسید سے دستخط کرا لیتا تھا، اور چیک جاری کر دیتا تھا سرسید چونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے اور کلرک پر اعتماد رکھتے تھے بے تامل چیک پر دستخط کر دیتے تھے۔ کئی سال تک وہ ٹھیک ٹھیک کام کرتا رہا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ سکریٹری کو اُس پر پورا اعتماد ہو گیا ہے اُس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے۔ جب چاہتا سکریٹری سے کنجی لے کر چک نکال لیتا۔ اور جس قدر روپیہ چاہتا اس میں درج کر کے کبھی خود سیکرٹری سے دستخط کرا لیتا اور کبھی آپ اُن کے جعلی دستخط بنا کر چک جاری کر دیتا۔ یہاں تک کہ جب زرِ ضمانت جو بینک میں جمع رہتا تھا ختم ہو گیا تو اُس نے ایک نہایت دلیری کا کام کیا، ۹۴ ہزار کے پرامیسری نوٹ جو بطور کیپٹل فنڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے اور کسی کو اُن کے منافع کے سوا اصل فنڈ میں تصرف کرنے کا اختیار نہ تھا اُن پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنایا جس میں بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً جس قدر روپے کی کالج کو ضرورت ہو پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی روپیہ قرض دیتا رہے اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے اُس کو بینک میں بھیج دیا۔ کچھ کم ۶۳ ہزار روپیہ تو وہ زرِ ضمانت میں سے غبن کر چکا تھا۔ اب نوٹوں کی کفالت پر سودی قرض بینک سے وصول کرنا شروع کیا یہاں تک کہ علاوہ زرِ امانت کے بیالیس ہزار پانسو ستر روپیہ اور بینک سے وصول کر کے خورد برد کر گیا۔

سچ یہ ہے کہ ماہ جولائی ۱۸۹۵ء کالج کے حق میں، سرسید کے حق میں اور خود اُس خدا ناترس کے حق میں جس نے مسلمانوں کا کوڑی کوڑی دکان مانگا ہوا ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپیہ شراب خوری اور عیاشی میں برباد کر دیا سخت منحوس اور نامبارک مہینا تھا جس کے بعد کالج کی تعمیر بالکل بند اور آگے چندے کی راہ مسدود ہو گئی۔ سرسید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا اور شام بہاری لال فالج میں مبتلا ہوا، اسی حالت میں پکڑا گیا دورہ سپرد ہوا اور نہایت تلخی

اور رسوائی کے ساتھ حوالات ہی میں کچھ کھا کر مر گیا۔

اگرچہ اس صدمے کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے جو اِس غبنِ فاحش سے سرسید کے دل پر گزرا ہوگا اُنھوں نے چپیوں چپیوں تالاب بھرا اور قطرہ قطرہ اوس جمع کر کے قوم کی پیاس بجھانے کا سامان مہیا کیا تھا مگر باوجود اس سخت صدمے کے وہ نہایت غنیمت سمجھتے تھے کہ اُن کی زندگی میں یہ راز کھل گیا اور شام بہاری لال کی بداعمالی سب پر ظاہر ہوگئی اور اگر وہ دفعتہً سخت بیمار نہ ہو جاتا تو خدا جانے یہ مادۂ فاسد اندر ہی اندر کس حد تک پہنچ جاتا اور اُس سے آخر کو کیا نتیجہ پیدا ہوتے۔ سرسید نے اُنہیں دنوں میں جب کہ شام بہاری لال پر کالج کی طرف سے فوجداری میں مقدمات دائر ہو رہے تھے راقم کو ایک خط لکھا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان دنوں میں میری طبیعت نہایت پریشان ہے اور عدالت میں حاضر ہونے اور مقدمات میں حلفی اظہار دینے کی تکلیف نہایت سخت معلوم ہوتی ہے مگر جو امور تقدیری ہیں اُن سے کچھ چارہ نہیں ..... بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اِس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، ایک دن میں مرجاؤں گا اور جو کچھ اُس نے جعل سازی کی ہے وہ سب تلپٹ ہو جائے گی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اُس کی جعلسازی اور فریب کھل گیا ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپے میں تصرف کیا ہے۔ بس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی راز کھل گیا بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضے میں تھا، حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ قانونِ ٹرسٹیاں میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے۔ چنانچہ کُل روپیہ بینک میں جمع تھا اور بینک کے خزانے سے بذریعہ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا جب تک کہ ان کا حال نہ کھلے کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔ بہرحال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں یہ حال کھل گیا گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو۔"

الغرض جب شام بہاری لال دفعتہً فالج میں مبتلا ہو گیا اور اُس کی غیبت میں بینک سے چٹھیاں موصول ہوئیں تو اُن کا مضمون سن کر سرسید کو شبہہ پیدا ہوا۔ اُنھوں نے چیک بُک نکلوا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہت سے چیکوں کے نصف ٹکڑے جو بینک میں بھیجے جاتے ہیں ندارد

ہیں اور اُن کے مثنّے جو چک بُک میں لگے رہتے ہیں وہ کورے بغیر لکھے لگے ہوئے ہیں جب روزنامچہ دیکھا تو اُن نمبروں کے کسی چک کی روانگی روزنامچہ میں مندرج نہ پائی گئی اور جو ڈرافٹ کہ چکوں کے ساتھ حسبِ قاعدہ بینک میں بھیجے گئے تھے اُن کی نقل بھی رجسٹر میں نہ ملی۔ آخر جب سرسید نے بینک سے خط و کتابت شروع کی اور وہاں سے تمام کاغذات کی نقلیں منگوائیں تو کلرک کی تمام چوریاں اور جعل سازیاں من وعن ظاہر ہوگئیں۔ اُنھوں نے حسبِ منشائے قانونِ ٹرسٹیاں فوراً اِس واقعہ کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیج دی اور دس مقدمے بنام بہاری لال پر فوجداری میں دائر کئے گئے۔ یہاں تک کہ صاحب مجسٹریٹ نے اُس کو سپردِ سشن کر دیا۔ لیکن ابھی عدالتِ سشن میں روبکاری کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ وہ حوالات ہی میں غالباً کچھ کھا کر دفعتہً مر گیا۔

سرسید نے جو رپورٹ سالانہ اجلاسِ ٹرسٹیاں منعقدہ یکم جنوری ۱۸۹۶ء میں پیش کی تھی اُس سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے ایک بات کے سوا اُن تمام فرائض کے ادا کرنے میں جو بحیثیت سکریٹری ہونے کے اُن کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بیشک اُن سے یہ بڑی فروگذاشت ہوئی کہ ایک مدتِ دراز تک یہ دھاڑی چور چک بُک میں سے نکال نکال کر جعلی چک جاری کرتا رہا اور اُن کے مثنّے کورے بغیر لکھے چک بُک میں لگے رہے اور کبھی کسی نے چک بُک کو کھول کر نہ دیکھا کہ اُس میں دن دہاڑے کیا لوٹ مچ رہی ہے اور نہ اُس کا سبب سرسید کی وہی نیک دلی اور اُن کا حسنِ ظن تھا جس کی وجہ سے خبثِ نفس کی طرف کبھی اُن کا ذہن انتقال نہ کرتا تھا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے "اِنَّ الکریمَ اذا خادعتہ انخدعا" یعنی کریم النفس آدمی کو جب دھوکا دو گے وہ دھوکا کھا جائے گا۔ اِس ایک الزام کے سوا کسی قسم کی گرفت سرسید پر نہیں کی جا سکتی۔ اُن کا کلرک کی انگریزی تحریروں پر بلا تامل دستخط کر دینا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ تمام دفاترِ سرکاری و غیر سرکاری میں اِسی طرح ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر اُن پر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نخواہی اُن کے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہرگز کام نہیں چل سکتا۔ اِس کے سوا کلرک مذکور نے تمام جعلی چکوں اور جعلی ڈرافٹوں پر سرسید سے دستخط نہیں کرائے، بلکہ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے جعلی دستخط بنا کر چک جاری کئے۔ جو روپیہ

نوٹوں کی کفالت پر بطور سودی قرض کے بینک سے وصول کیا گیا اس کا الزام بھی عائد نہیں ہوتا کیونکہ اُن کو ہر طرح سے اطمینان تھا اور اطمینان ہونا چاہئے تھا کہ کیپٹل فنڈ کی کفالت پر بینک کسی کو ایک حبہ قرض نہیں دے سکتا۔ جو جعلی مختار نامہ کلرک نے بینک میں بھیج کر اُس کو دھوکا دیا اُس کا کسی کو شان گمان بھی نہ تھا اُس پر سرسید کے اصلی دستخط تھے اور نہ کسی ٹرسٹی کے بلکہ سب کے دستخط کلرک نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے اور مختار نامہ بالاہی بالا تیار کر کے بینک کو چلتا کر دیا تھا۔ مرزا عابد علی بیگ صاحب ٹرسٹی کالج اور سید ولایت حسین صاحب بی اے سکنڈ ماسٹر اسکول ڈپارٹمنٹ نے جو تین مہینے کی لگاتار کوشش اور محنت سے کالج کے حساب کی ابتدا سے اخیر تک جانچ پڑتال کی اور اُس کا مقابلہ بینک کے حسابات سے کیا اس سے جیسا کہ سرسید کی رپورٹ میں درج ہے صاف پایا جاتا ہے کہ بینک میں پہنچنے سے پہلے کسی طرح کا تغلب دفتر سکریٹری میں نہیں ہوا، بلکہ بینک میں پہنچنے کے بعد جعلی چکوں کے ذریعے سے روپیہ نکلوایا گیا۔ چنانچہ سرسید کی رپورٹ مذکورہ بالا سُن کر تمام ٹرسٹیوں نے جو جلسہ میں حاضر تھے اِس بات کو تسلیم کیا تھا کہ سرسید نے جو احتیاط کہ ممکن تھی اُس میں کسی طرح کی فروگذاشت نہیں کی اور جس طریقے سے کہ غبن وقوع میں آیا اُس کا احتمال بہت کم ہوتا ہے اور شام بہاری لال کے ہاتھ میں کسی رقم وصولی کا نہ رہنا اور تمام رقوم مندرجۂ روز نامچہ کا بالیقین بینک میں جمع ہو جانا اِس بات کے لئے کافی تھا کہ سرسید کو کلرک کی نسبت کسی طرح کی بے اطمینانی نہ ہو۔ اِسی بنا پر جملہ حاضرین نے بالاتفاق ایک ووٹ آف فُل کانفیڈنس اِس مضمون کا پاس کیا کہ سرسید نے حساباتِ کالج میں کوئی دقیقہ احتیاط کا فروگذاشت نہیں کیا اور ہیڈ کلرک پر اُس سے زیادہ بھروسہ نہیں کیا جیسا کہ انگریزی دفتروں میں عموماً ایسے عہدیداروں پر کیا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے اِس ووٹ کے پاس ہونے کا حال سُن کر کہا کہ "ٹرسٹی اگر ایسا ووٹ پاس نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ وہ خود اُس الزام میں جس سے اُنھوں نے سکریٹری کو بری کرنا چاہا ہے سکریٹری کے شریکِ غالب تھے"۔ حق یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک مولوی سمیع اللہ خاں نے اپنے خط موسومہ سکریٹری مورخہ ۲۵ر جنوری ۱۸۹۶ء میں بالکل صحیح لکھا تھا "کہ اگر ٹرسٹی نگرانی کرتے اور سال میں دو سال میں بھی کبھی اپنے فرض

کے پورا کرنے کے خیال سے حسابات کو کالج کے جانچتے تو یہ لاکھ روپے سے زیادہ کے تغلب کی مصیبت، جس میں مسلمانوں کا روپیہ برباد ہو گیا، کالج پر کیوں نازل ہوتی؟ سچی بات یہ ہے کہ گو مسلمان قومی تعلیم میں روپیہ خرچ کرنا سیکھ گئے ہیں مگر روپیہ دینے کے بعد پھر اُس کی خبر لینی بالکل نہیں جانتے اور ٹرسٹیوں میں ایسے لوگ شاذو نادر ہی نکلیں گے جو اپنے تئیں کالج کے کسی معاملے کا ذمہ دار سمجھتے ہوں۔ پس جب تک مسلمانوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو گا کہ جو روپیہ ہم نے قوم کی تعلیم کے لئے دیا ہے وہ کیونکر خرچ ہوتا ہے اور اُس کے محفوظ رہنے کا کیا انتظام کیا گیا ہے اور جب تک تمام ٹرسٹی اپنے تئیں کالج کے معاملات کا جواب دِہ نہ سمجھیں گے اور اپنے فرائض کو جو قانونِ ٹرسٹیان میں بیان ہوئے ہیں ہمیشہ نصب العین نہ رکھیں گے اُس وقت تک کالج کا سرمایہ بدستور خطرے میں رہے گا۔ ایک سکریٹری کس کس چیز کی خبر رکھے گا اور کہاں کہاں اپنا ذہن دوڑائے گا اور ایک قحط زدہ قوم میں ایسا جامع حیثیات سکریٹری کہاں سے آئے گا جو فکرِ معاش سے فارغ البال اور خانگی بکھیڑوں سے بالکل آزاد ہو۔ رات دن کالج کے انتظام میں مصروف رہے اور جب روپے کی ضرورت ہو تو در در بھیک مانگتا پھرے" گورنمنٹ اور قوم دونوں کا معتمد علیہ ہو، سپیکر ہو، ماسٹر ہو، خزانچی ہو اور باوجود ان تمام باتوں کے ایک نہایت کارآزمودہ کلرک بھی ہو جو کلرکوں کی چالاکیوں سے بخوبی آگاہ اور خبردار ہو۔

سرسید کی وفات

اگرچہ غبن کے واقعہ نے سرسید کی خوش دلی کو بہت کچھ مکدّر کر دیا تھا مگر اس صدمے سے اُن کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی ہمّت اور کوشش میں فتور آجائے۔ وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے موافق برابر انجام دیتے تھے اور غبن کے سبب سے جو نقصان کالج کو پہنچا تھا اس کے تدارک کی فکر سے غافل نہ تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خلش سے ابھی نجات نہ ہوئی تھی کہ اُن کو ایک ایسی لاعلاج مصیبت پیش آئی جس کا اعادہ کرنا اُس سے زیادہ سخت مصیبت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء کے نصفِ اخیر میں اُس بیٹے کی علالت اور سوءِ مزاج نے جس پر نہ صرف باپ کو بلکہ تمام قوم کو فخر تھا سرسیّد کو آرے کی طرح بٹھا دیا۔ گو بظاہر وہ اس مصیبت کو اخیر دم تک نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ اور ایسے تحمّل کے ساتھ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، برابر جھیلتے رہے مگر یہ صدمہ اندر ہی اندر کام

تمام کرتا جاتا تھا۔ جو تلخ اور ناگوار حالت اُس زمانے میں اُن پر گذری اس کا کسی قدر اندازہ اِس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرض الموت میں ایک بڑے ڈاکٹر نے اُن کے ملاحظہ کے بعد لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صدمہ اُن کو نہ پہنچتا تو اُن کے قویٰ ایسے عمدہ تھے کہ پندرہ بیس برس اور زندہ رہ سکتے تھے۔ باوجود ایسی تلخ حالت کے کبھی کسی نے اُس کوہ وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہوگا۔ مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے اُن کو چُپ لگ گئی تھی۔ بولتے بہت کم تھے اور ہاں اور نہیں کے سوا، بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ اُن کے یارِ غار محسن الملک اور سید زین العابدین خاں گھنٹوں اُن کے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے صحبت کا لطف بالکل جاتا رہا تھا۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ سر سید نے کہا "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چُپ رہنا ہوگا اس لئے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔"

باایں ہمہ قومی خدمات کی دُھن اور خاص کر کالج کی بہبودی کا خیال کبھی اُن کے دل سے فراموش نہ ہوتا تھا۔ اسی حالت میں اُنہوں نے متعدد آرٹیکل تعلیم پر لکھے۔ انہی دنوں میں اردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب تیسری بار جھگڑا اُٹھا تو اُنھوں نے اِس معاملے کی نسبت پھر اپنی قدیم رائے مرنے سے آٹھ دن پہلے ظاہر کی اور گورنمنٹ کو اِس کی طرف توجہ دلائی اور جو کمیٹی الہ آباد میں اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت کے لئے قائم کی گئی تھی اُس سے خط کتابت کی اور باوجود ہر طرح کی معذوری کے تا مقدور اُس کی تائید کرنے کا وعدہ کیا۔ انہیں دنوں میں ایک عیسائی نے رسالہ امہات المؤمنین اسلام کے برخلاف شائع کیا تھا جس میں آنحضرتؐ کی ازدواج اور آپ کے اخلاق پر نہایت دریدہ دہنی سے اعتراض لکھے تھے۔ سر سید نے اوّل بطور تمہید کے ایک بڑا آرٹکل اصولِ تنقیدِ روایات پر اسی رسالہ کو دیکھ کر لکھا۔ اس کے بعد اُس کا جواب لکھنا شروع کیا۔ یہ جواب[1] ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو احتباسِ بول کا عارضہ ہوا۔ صاحب سول سرجن علی گڑھ بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے اور میرٹھ کے مشہور میڈیکل آفیسر ڈاکٹر موریانی کو بھی مشورے کے لئے بلایا گیا۔ مگر چونکہ وقتِ موعود آپہنچا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ۲۶ کی شام

---

[1] یہ جواب جس قدر لکھا گیا تھا علی گڑھ میگزین میں چھپ گیا ہے۔ ۱۲ منہ

کو علاماتِ ردیہ ظاہر ہونے لگیں۔ ۲۷ مارچ کی صبح کو نہایت سخت دردِ سر لاحق ہوا جو اس بات کی علامت تھی کہ یورک ایسڈ دورانِ خون میں شامل ہو کر جلد جلد دماغ پر اپنا اثر کر رہا ہے۔ اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تپ چڑھی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ اُن کی عادت تھی کہ ہمیشہ بیماری کی شدت میں "حسبی اللہ نعم الوکیل" بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اس دفعہ بھی ہذیان کی حالت طاری ہونے سے پہلے قرآن کی یہ دو آیتیں برابر اُن کی زبان پر جاری رہیں "حسبنا اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر۔ اِنّ اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین آمنو صلوا علیہ و سلموا تسلیما۔" مگر تپ کی شدت اور ہذیان کی حالت میں کوئی بات جو سمجھ میں آئے اُن کی زبان سے نہیں نکلی۔ گویا کہ تپ کے چڑھتے ہی تھوڑی دیر بعد احتضار شروع ہو گیا تھا۔ تین گھنٹے سخت کرب اور بے چینی رہی اور رات کے دس بجے حاجی اسمٰعیل خاں کی کوٹھی میں جہاں مرنے سے دس بارہ روز پہلے حالتِ صحت میں وہ سید محمود کی کوٹھی سے اُٹھ گئے تھے، وفات پائی۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے دن کے جنازہ اُٹھایا گیا۔ مدرسۃ العلوم کا کل اسٹاف اور تمام طالب علم، اسٹیشن کے یورپین اور ہندوستانی افسر اور اہلِ کار، علی گڑھ کے رئیس اور ہر درجے کے مسلمان، ہندو اور عیسائی اس کثرت سے جنازے کے ساتھ تھے کہ غالباً علی گڑھ میں اِس نوعیت کا اژدحام کسی نے نہ دیکھا ہو گا۔ جو راج مزدور، بڑھئی اور سنگ تراش ۲۵، ۲۶ برس سے کالج میں کام کرتے تھے وہ اور اُن کی عورتیں اور بچے جو دیہات سے یہ خبر سُن کر آئے تھے جنازے کی گذرگاہ کے ایک جانب کھڑے ہوئے نہایت حسرت بھری نگاہ سے اپنے مربی کے جنازے کو تک رہے تھے اور اکثر طالب علم زار و قطار روتے جاتے تھے۔ الغرض چھ بجے کے بعد کرکٹ فیلڈ میں جنازہ کی نماز ہوئی۔ نماز کے بعد جنازہ فیلڈ سے بورڈنگ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوا تو گارڈ آف آنر نے جو گورنمنٹ کی طرف سے مامور ہوا تھا پریزنٹ آرمس کی سلامی اُتاری اور قبیلِ مغرب مسجدِ مدرسۃ العلوم کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اُس کے احاطے کے اندر بیکار پڑی تھی، وہاں اُس قوم کی اُمید گاہ اور پشت پناہ کو دفن کیا گیا۔

قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت — بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

تا قیامت گوئی از تاراجِ ما فارغ شدند — کایں مصیبت بر سرِ اسلامیاں انداختند

اگرچہ سرسید کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن دو عربی مادے عجیب و غریب نکلے ہیں ۔ ایک "غُفِرَ لَہٗ" اور دوسری قرآنِ مجید کی یہ آیت "اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ" [۵]

اس شخص کے مرنے پر جس غیر معمولی طریقے سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر قوموں نے اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ملکوں میں بھی رنج و افسوس کا اظہار کیا گیا ہے ، اُس کی مثال ملنی دشوار ہے ۔ تعزیت کے کچھ کم دو سو تار جن میں سے کسی قدر بذریعہ کالج میگزین کے شائع کئے گئے تھے اطرافِ ہندوستان سے اُن کے بیٹے کے نام پہنچے اور تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسلامی انجمن یا سوسائٹی ایسی رہ گئی ہوگی جس میں سرسید کی وفات پر ماتمی جلسہ اور رنج و ملال کا اظہار نہ کیا گیا ہو ۔ حضور وائسرائے اور نواب لیفٹننٹ گورنر کے علاوہ اکثر یوروپین افسروں اور حاکموں نے بذریعہ تار یا تحریر یا تقریر کے اِس بزرگ کی موت پر رنج کا اظہار کیا ۔ نواب لیفٹننٹ گورنر نے صاحب کلکٹر علی گڑھ کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ ہز آنر کی طرف سے جنازے کی مشایعت اور دفن میں شریک ہوں ۔ ملک میں کوئی انگریزی یا دیسی اخبار ایسا نہ ہوگا جس میں بار بار اِس عالمگیر حادثے پر آرٹیکل یا نوٹ نہ لکھے گئے ہوں ۔ اور بہت سے اخباروں نے تو آج تک اپنے کالم اِس مضمون کے لئے وقف کر رکھے ہیں ۔ لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں میں (جیسے ٹائمز آف لندن ، پال مال گزٹ ، اِیوننگ سٹینڈرڈ ، ایکو ، پیپل ، ڈیلی میل ، لائڈز ، ایوننگ نیوز وغیرہ) اس واقعہ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی پولٹکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا گیا اور اینگلو انڈین اور مسلمان دونوں کے لئے ایک عام مصیبت بیان کیا گیا ۔

انگلستان میں جو ایک مسلمانوں کی سوسائٹی موسوم "بہ مسلم پیٹریاٹک لیگ" ہے اس میں بھی سرسید کی وفات پر ایک ماتمی جلسہ کیا گیا جس میں مولوی رفیع الدین احمد نے ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا تھا کہ سرسید کی خدمات کا شکریہ اور اُن کی وفات پر رنج و افسوس اور اُن کے

---

[۵] اِس آیت میں حضرت عیسیٰ کی طرف خطاب ہے جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھ کو موت دینے والا ہوں اور اپنی طرف اُٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں کے اتہام سے پاک کرنے والا ہوں ۔ ۱۲

وارثوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے"۔ ٹائمز آف لندن نے بھی اِس جلسہ کا ذکر کیا تھا اور سر سید کی وفات پر ایک لمبا آرٹیکل چھاپا تھا جس میں لکھا تھا کہ "وہ (یعنی سر سید) اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں اُن کو ہر نوع کے حملوں سے بچانے کے لئے ہمیشہ تیار رہے ہیں۔ اور خود ہمارے کالموں نے اور بعض بڑے بڑے میگزینوں نے اُن کی اِس علمی اور منطقی لیاقت کی شہادت دی ہے۔ جو اُنھوں نے اپنی قوم کی حمایت میں ظاہر کی"۔ اس کے بعد اُس میں لکھا تھا کہ کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور اُن کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے لئے ضروری معاملے کا خیال دلوانے میں اُن کے کام کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔ فی الحقیقۃ جب اس معاملے میں ان کی عمر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔ علی گڑھ کی سوسائٹی، اُس کا مطبع، اُس کا اخبار اور محمڈن کالج جو کیمبرج اور آکسفورڈ کالجوں کے نمونے پر مسلمانوں کی شریف قوموں کے لئے بنایا گیا ہے یہ سب اُس کی ہمت عقل اور فراخ حوصلی کی شاندار یادگاریں ہیں۔

پال مال گزٹ مورخہ ۲۹ ر مارچ میں سر سید کی نسبت لکھا تھا کہ "سرکارِ انگریزی اور باشندگانِ ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اِس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سر سید احمد خاں کی زندگی پر۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگریزی راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا"۔

انگلستان کے اخباروں کے حوالہ سے یورپ کے اکثر اخباروں اور نیز ممالکِ اسلامیہ کے بعض عربی اخباروں میں بھی اِس حادثہ پر افسوس کیا گیا۔ چنانچہ المؤید میں انھیں کے حوالے سے لکھا تھا کہ مسلمانوں میں سید مرحوم ایک بڑے زبردست پولیٹیشن تھے۔ اِس لئے مرحوم کی وفات اسلامی دُنیا میں ایک عالمگیر مصیبت خیال کی گئی ہے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور مسلمانوں کو اُن کا نعم البدل عنایت کرے۔

پایونیر مورخہ ۲۹ ر مارچ ۹۸ء میں اِس واقعہ کی خبر پہنچتے ہی یہ لکھا گیا تھا کہ "سر سید احمد خاں جو ایک دُور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے

ساتھ اِس نہایت مفید، بار آور اور نہایت زبردست پولٹکل طاقت کا خاتمہ ہو گیا ہے جس نے موجودہ صدی کے اخیر رُبع میں ہندوستان کی اسلامی دُنیا کو متحرک کر دیا تھا۔

ٹائمز اوف انڈیا مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء میں جو ایک لمبا آرٹیکل کسی انیگلو انڈین کا لکھا ہُوا اِس واقعہ کے متعلق چھپا تھا اُس میں سرسیّد کی نسبت لکھا تھا کہ "اُس کا خیال یہ تھا کہ اسلام کو دوبارہ اُس درجہ پر پہنچا دیا جائے جو بارہویں صدی عیسویں میں علم و حکمت کا مربّی ہونے کی حیثیت سے اُس کو حاصل تھا۔"

جو اسپیچیں انگریزوں اور ہندوستانیوں نے اطراف ہندوستان کے ماتمی جلسوں میں سرسیّد کی وفات پر کی ہیں وہ گنتی اور شمار سے خارج ہیں۔ یہاں ہم صرف دو معزز اور لائق انگریزوں کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہیں جن کو مدتِ دراز تک علی گڑھ میں رہنے اور سرسیّد سے ملنے جُلنے اور اُن کے حالات پر غور کرنے کا اِتفاق رہا۔

مسٹر لپرنڈ کلکٹر و مجسٹریٹ میرٹھ نے جو تقریر میرٹھ کے ماتمی جلسہ واقعہ ماہ اپریل ۱۸۹۸ء میں کی اُس میں اُنھوں نے کہا "آج اِس جلسہ میں ہم پر ایک غم کی گھٹا چھائی ہُوئی ہے۔ سرسیّد احمد کے انتقال سے نہ صرف ملک نے ایک بڑا رکنِ سلطنت اور قوم کا بڑا خیر اندیش کھو دیا ہے بلکہ حاضرینِ جلسہ میں سے اکثر کا ایک ذاتی دوست ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔ اگر میں نے اُس کی زندگی کے مطالعے میں غلطی نہیں کی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جہاں اُس میں اور بڑے بڑے اوصاف موجود تھے، اُن میں دو بہت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے، اوّل اُس کی اعلیٰ درجہ کی حُبّ الوطنی اور دوسری اعلیٰ درجہ کی دلیری، اُس نے گویا ابتدائے عمر ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان مایوسانہ جہالت میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اُن کو روشن ضمیر بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ بڑی بڑی قومی ضرورتیں رفع کرنے کے لئے ہمیشہ بڑے آدمی درکار ہوتے ہیں اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا بڑا شخص اُن کی ضرورت رفع کرنے کو اُٹھا۔ سرسیّد احمد نے مجبوری کے ساتھ اپنے تئیں تقدیر کے حوالے نہیں کیا اور نہ اُس نے گورنمنٹ سے مدد چاہی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جو کام اُس کو درپیش ہے اگر اُس کو پورا کرنا ہے تو قوم ہی اُس کو پورا کرے گی اور اِس لئے اُس نے زندگی کے ایک ایسے زمانے میں جب کہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چُراتے ہیں اور باقی

عمر کو اپنی ذاتی آسائشوں اور ذاتی افزائشوں کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں، اپنا وقت، اپنی طاقت، اپنا روپیہ اور سچ پوچھو تو اپنا سب کچھ ہم جنسوں کی بھلائی کے لئے وقف کر دیا۔ ہم میں سے جو یہاں موجود ہیں کوئی شخص ان مشکلات کا جن کا اُس کو مقابلہ کرنا پڑا اور اُس عزم و حزم کا جو ان مشکلات کے مغلوب کرنے کے لئے مطلوب تھا، تصوّر اور اندازہ نہیں کر سکتا لیکن باوجود تمام مشکلات اور تمام ناامیدیوں کے وہ اپنے منصوبے پر کامل وثوق رکھتا تھا اور اُس کو اپنی کوششوں کا ثمر مل گیا۔

اِس کے بعد مسٹر پیرٹر نے کالج کی ابتدا اور اُس کی ترقیات کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ لندن کے سینٹ پال کیتھڈرل میں سر کرسٹوفر رین کی لاش مدفون ہے اور اُس کی قبر پر لیٹن میں یہ مشہور کتبہ کندہ کیا ہوا ہے۔ "اگر تم اُس کی یادگار تلاش کرنی چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو۔" جن لوگوں نے یہ کتبہ وہاں کندہ کرایا تھا انھوں نے خیال کیا اور صحیح خیال کیا کہ اِس بڑے نقاش کی سب سے عمدہ یادگار یہی نامی گرجا ہے جو اُس کے مجوزہ نقشے پر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جب تم سے لوگ سرسیّد کی یادگار پوچھیں تو تم بھی اُس عالیشان کالج کو بتا سکتے ہو جس کی بُنیاد اُس نے ڈالی ہے اور کہہ سکتے ہو کہ اپنے چاروں طرف دیکھو۔ لیکن اگر تم اور تمہاری آئندہ نسلیں اپنے لیڈر کی زندگی کے سبقوں کو خوب ذہن نشین کر لیں گی۔ تو اُس سے بھی زیادہ عالیشان یادگار اُس کے لئے قائم کریں گی۔ تم نہ صرف بے جان پتھر اینٹ اور مسالے کو بلکہ ایک بڑے قومی کالج کی زندگی بخش طاقت کو اور اُس کے تعلیم یافتہ گروہ کی بے سقم تربیت، حب الوطنی، خود اعتباری اور سب سے بڑھ کر اُن کی اعلیٰ درجے کی اخلاقی حالت کو پیش کر سکو گے۔"

"صاحبو! ایک ایسے وقت میں جیسا کہ یہ وقت ہے میں جو ایک مختلف نسل کا ممبر اور مختلف مذہب پر یقین رکھنے والا ہوں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم تمام اختلافات اور حسد اور عداوت کو جس نے تمہیں متفرق کر رکھا ہے اپنے مرحوم لیڈر کی قبر میں دفن کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ خفیف خفیف باتوں یا مذہبی خیالات میں تم سرسیّد کے ساتھ یا باہمدگر کیسا ہی اختلاف رکھو۔ مگر تم سب کو اُس عالیشان جانفشانی کی جو اُس نے اسلام کی حمایت میں

ؔ یہ لندن میں ایک نہایت شاندار اور مشہور گرجا ہے جو عمارت اور نقشے کی خوبی میں ضرب المثل ہے۔

ظاہر کی اور اِن اعلیٰ نتائج کی، جو اُس جانفشانی کی وجہ سے اُس نے حاصل کئے، قدر کرنی چاہیئے اگر تم صرف اُس کے کام ہی کو جاری رکھوگے تو یقیناً تم کو کامیابی حاصل ہوگی۔ کیونکہ میں تم کو یاد دِلاتا ہوں کہ دُنیا میں اتفاق اور صرف اتفاق ہی کا نام طاقت ہے۔"

مسٹر آرنلڈ نے جو انجمن اسلامیہ لاہور کے ماتمی جلسہ واقع ۲۹ رمارچ ۹۸ء میں سرسید کی وفات پر تقریر کی اُس کا ترجمہ ہم اول سے آخر تک نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا "میں امید کرتا ہوں کہ اِس موقع پر مجھ کو اِس لحاظ سے کہ دس برس تک اُس بزرگ اور شریف آدمی کی خدمت میں مجھے رہنا نصیب ہوا ہے جس کی موت پر ہم اِس وقت رنج والم ظاہر کرتے ہیں، چند الفاظ کہنے کی اجازت دی جائے گی مجھ کو دس برس تک اِس عجیب وغریب اور بالاترین شخص سے تقرب اور دوستی کی عزت حاصل رہی ہے۔ نہیں نہیں بلکہ فرزند کے شفقت بھرے لفظ سے اُنھوں نے مجھ کو خطاب کیا ہے۔ اِس دس برس میں سوائے زمانہ تعطیل کے مجھ کو سرسید سے روزانہ ملنے جُلنے کا اتفاق رہا۔ اُن کا مکان میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جس کا دروازہ ہر وقت میرے لئے کھُلا رہتا تھا جس قدر سرسید سے کوئی شخص زیادہ واقف ہوتا تھا اُسی قدر اُن کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ معترف ہوتا تھا۔ کیونکہ حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سید احمد خاں اُس کے مستحق تھے تاریخ سے معلوم ہوگا کہ دُنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن اُن میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں مجتمع ہوں وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولی ٹیشین، مصنّف اور مضمون نگار تھا۔ اُس کا اثر اُس سوچنے والے عالم کا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے بلکہ علانیہ دُنیا کے سامنے لوگوں میں، لوگوں کا رہبر بن کر اس لئے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اُس کی دُنیا مخالف ہو تو ساری دُنیا سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ تھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی۔ باوجود اِس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ رتبہ ہے جو اُس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔ سرسید نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کاہلی، غفلت، جہالت، اور ذلت سے جن میں وہ مبتلا تھے اپنے تئیں نکالیں اور دیکھو اُس کی

پکار پر ایک نئی نسل اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے سرسید کو جھوٹا سمجھا، اُن کی باتوں کو بدنیتی پر محمول کیا اور چاروں طرف سے اُن پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوئی مگر اُس نے تمام مخالفتوں کو سامنے سے ہٹایا اور رستے کی تمام خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوا اس منزل کی طرف سیدھا ہو لیا جس پر پہنچنا مقصود تھا۔ جو منصوبے وہ باندھتا تھا اُن کی طرف سے اوّل گورنمنٹ کو اطمینان دلانا ہوتا تھا جو ابتدا میں اِس اندیشے سے کہ وہ کہیں سلطنت کے استحکام اور ملک کے امن میں خلل انداز نہ ہوں، مطمئن نہ تھی اور نہ پھر اپنے ہم مذہبوں کے تعصبات اور اوہام سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ جو سرسید سے اس لئے بدگمان تھے کہ اُس نے مذہبی مسائل میں ایک نیا اسکول قائم کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اُس کو ملحد اور بیدین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ہم نہایت مضبوط شہادت سرسید کی طبیعت کی اُس مقناطیسی قوت پر پاتے ہیں جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم میں جس کی قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم ہو اور ایسی حالت میں جب کہ وہ نیچری کافر سمجھا جاتا ہو اپنی قوم کا مسلّم سردار مانا گیا۔ تاریخ اسلام میں بہت سی مثالیں ایسی تحریکوں کی پائی جاتی ہیں جن کو مذہبی پیشواؤں نے شروع کر کے تکمیل تک پہنچایا۔ اور ہزاروں پیرو اُن لوگوں میں سے جو مذہبی خیالات میں اشتراک رکھتے تھے پیدا کر لئے۔ لیکن کوئی تحریک (جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں)، اسلام کی تاریخ میں ایسی نہ ملے گی جس میں ایک مسلمان شخص ایسے مسلمانوں کا سردار تسلیم ہوا ہو جو اُس کے مذہبی خیالات سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں۔"

"جب سر آکلینڈ کالون ہندوستان سے جانے لگے تو علی گڑھ میں آئے اور اپنے دوست سید احمد خاں کے ذکر میں جن کو اُنھوں نے گریٹ مین کے لفظ سے یاد کیا تھا غدر کے اُس ہولناک واقعہ کا ذکر کیا جب کہ لوگوں کے دل عداوتوں سے بھرے ہوئے اور انتقام کے خیالات دلوں میں موجزن تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ "اُس وقت کیا ہندوستانیوں میں اور کیا انگریزوں میں سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے اس سوال کی طرف توجہ کی کہ اِس خرابی کا کیونکر علاج ہو اور حاکم و محکوم میں کس طرح آشتی پیدا ہو۔"

"سرسید نے غدر ۵۷ء کے بعد سب سے پہلے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں دوستی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اُس وقت سے مرتے دم تک وہ اِسی بات میں کوشش کرتے رہے کہ قلم سے زبان سے، اور نصیحت و تنبیہ سے حاکم اور محکوم کے زخموں پر مرہم لگائیں اور اُن میں ایک مضبوط

اتفاق پیدا کریں۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے سرسیّد کی قدر و منزلت ہُوئی۔ لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آئے۔ دُنیا کے سنگ طینت لوگ اِس بات پر جس قدر اُن کا جی چاہے بھونکیں لیکن میں جو برسوں سے سرسیّد کو جانتا ہوں، اِس بات کو سچ سمجھتا ہوں۔ میں آج تک کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہُوں جس نے سرسیّد سے زیادہ شریف زندگی بسر کی ہو، جو جاہ طلبی میں اُن سے زیادہ بے غرض ہو اور جو اُن سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے تئیں وقف کر دینے والا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اُس کی موت پر روتے ہیں۔ اب اُس جیسا کوئی کہاں ملے گا!"

"ایک اور بات رہ گئی ہے جس کو میں اِس وقت کہنا چاہتا ہُوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کے یہ آنسو جھُوٹے نہیں ہیں اور آپ جو سرسیّد کے ہم مذہب اور ثنا خواں ہیں، اگر آپ کا یہ غم و الم سچا ہے، تو کیا آپ کو رونے کے علاوہ کوئی اور کام باقی نہیں ہے؟ سمجھ لیجئے کہ یہ شخص جس کو آپ رو رہے ہیں اِس قدر مفلس تھا کہ نہ اُس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو، لیکن پھر بھی اُس نے ایک دولت آپ کے لئے چھوڑی ہے، وہ آپ کے لئے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ لڑائی جاری رکھو۔ اور آپ ہی کے سپرد یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی اُفتادہ قوم کو اُٹھاؤ اور موجودہ فرائض زندگی جو کچھ ہیں اُن سے اپنی قوم کی مصالحت کراؤ۔ اِس شخص نے آپ کے لئے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اُس کی پیروی کی تو وہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے قبضے میں سب سے بڑی دولت ہو گی۔"

جس قدر مرثیے اُردو، فارسی اور انگریزی میں اِس حادثے پر لکھے گئے ہیں ظاہراً واقعۂ کربلا کے بعد کسی شخص کی موت پر نہ لکھے گئے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ جعفر بن یحییٰ برمکی اور معن بن زائدہ شیبانی کے مرنے پر بھی شعرائے عرب نے بیشمار مرثیے لکھے تھے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ تعداد میں سرسیّد کے مرثیوں سے کچھ کم نہ تھے تو بھی وہ مرثیے اِن مرثیوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اُن میں شعراء اپنے ذاتی فائدوں اور شخصی منفعتوں کو روتے تھے جو اُن کی ذات کو جعفر و معن کے بذل و عطا سے ہمیشہ پہنچتی تھیں اور اِن میں اُس نقصانِ عظیم پر افسوس کیا گیا ہے جو قوم کے تمام افراد کو

ایک شخص کے مرنے سے پہنچا ہے۔ وہ اُن شخصوں کی شان میں لکھے گئے تھے جو لوگوں کی جیبیں درہم و دینار سے بھرتے تھے اور یہ اُس شخص کے لئے لکھے گئے ہیں جو لوگوں کی جیبیں خالی کرتا تھا۔ اُن کا موضوع ایک خاندان یا ایک قبیلے کی تباہی پر افسوس کرنا تھا اور یہاں کا موضوع تمام قوم کی مصیبت پر رنج و افسوس کرنا ہے۔ عرب کے ایک شاعر اشجع بن عمر سلمی نے جو اشعار اپنے باپ کے مرثیے میں بطور مبالغہ کے لکھے تھے، سچ یہ ہے، کہ سرسید سے بہتر اُن کا کوئی مصداق نہیں ہو سکتا۔

مضیٰ ابن سعیدٍ حین لم یبق مشرقٌ ولا مغربٌ الا لہٗ فیہ مادحٗ

وما کنتُ ادری ما فواضل کفہٖ علی الناس حتیٰ غیبّتہُ الصفائحٗ

کان لم یمت حیٌّ سواہٗ ولم تقم علیٰ احدٍ الا علیہ النوائحٗ

(**ترجمہ**) ابن سعید گزر گیا جب کہ مشرق و مغرب میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں اُس کا کوئی نہ کوئی مداح نہ ہو، جب تک وہ قبر میں دفن نہ کیا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں پر اُس کے کس قدر احسانات ہیں۔ گویا اس کے سوا دُنیا میں نہ کوئی زندہ آدمی مرا ہے اور نہ کسی پر نوحہ کیا گیا ہے۔

منجملہ اُن بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اِس حادثۂ عظیم پر لکھے گئے ہیں چند اشعار ایک یورپین فاضل لیڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب دیئے تھے۔ چونکہ لٹریری دُنیا میں شاید یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ کے اپنی زبان میں لکھے، اِس لئے ہم اُس لطیف سونٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس مقام پر لکھتے ہیں۔

"ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اُس کی سایہ دار شاخیں جو چاروں طرف دُور تک جُھومتی تھیں، صحت بخش شبنم اُن سے ٹپکتی تھی اور اُنہوں نے کثرت سے بیج بکھیرے تھے، اُن کے سائے میں بنجر زمین اصلاح پا گئی۔

بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوبصورت نونہالوں نے نفاست اور حُسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ مگر! اب شاہانہ درخت کے لئے کہ اجل نے اُس کو گرا دیا ہے۔

غم کرو، مگر امید کے ساتھ، کیونکہ اُس کی ہری بھری کھیتیاں جو اُس کی سالہا سال

کی محنت کا ثمرہ ہیں اُس کی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں کو اس نے اپنی
چھاؤں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں اور پھیک رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی
اُسی کی مانند زندہ رہیں گے تاکہ کسی ویرانے کو گلزار بنا جائیں۔"

سرسید کی وفات پر لوگوں نے صرف زبانی مدح وثنا اور مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی پر ہی بس نہیں کی بلکہ عملی طور پر اِس بات کا کافی ثبوت دیا ہے کہ یہ شخص اپنی راست بازی اور خلوص سے ایک عالم کے دِل میں اپنی عظمت کا نقش بٹھا گیا ہے اور اپنی محبت کا بیج بو گیا ہے اور قومی ہمدردی کی چینک ایک ایسی مُردہ دل قوم کو لگا گیا ہے جو سرد مہری میں ضرب المثل اور ورنا اتفاقی میں شہرۂ آفاق تھی۔ سرسید کے مرتے ہی کچھ لوگ اُن کی ایک عظیم الشان یادگار یعنی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ جن کا اپیل مسلمانوں نے اور خاص کر پنجاب کے زندہ دل مسلمانوں نے بڑی توجہ اور نہایت ذوق شوق سے سُنا اور اُس کی تائید پر فوراً کمر بستہ ہو گئے۔ اہلِ پنجاب نے سخت تقاضوں سے اُن کو لاہور میں بلایا اور اثنائے راہ میں اُسی گرم جوشی کے ساتھ جیسی کہ سرسید کے استقبال میں ظاہر کی جاتی تھی، ان کی آؤ بھگت اور مدارات کی گئی یونیورسٹی کے لئے مالیر کوٹلہ اور لاہور میں بڑی امنگ اور چاؤ سے لوگوں نے چندہ دیا اور صرف صوبۂ پنجاب سے دو لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ لاہور کے جلسوں میں سرسید کی تصویریں جن کی آنہ دو آنہ سے زیادہ قیمت نہ تھی پانچ پانچ روپے کو لوگوں نے خریدیں۔ بعض جواں مرد تاجروں نے اپنے منافع کا ایک معتد بہ حصہ سرسید کی یادگار کے لئے مخصوص کر دیا۔ اکثر تھوڑی تھوڑی تنخواہ کے ملازموں نے اپنی ایک ایک پوری تنخواہ چندے میں دے دی۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبا نے بڑے شوق سے چندہ جمع کیا۔ طالبعلموں کی ایک جماعت نے خاص اسی کام کے لئے دکان لگائی تاکہ جو کچھ اِس سے فائدہ ہو اِس فنڈ میں جمع کیا جائے۔ پنجاب کے سوا اور اطراف میں بھی اِس کی تحریک شروع ہو گئی ہے یہاں تک کہ انگلستان میں جو مسلمان طلبہ کی ایک مختصر جماعت نے انجمنِ اسلامیہ قائم کر رکھی ہے اس میں بھی گرمجوشی سے چندے کی تحریک ہوئی اور پہلے ہی جلسہ میں حاضرین نے بیس پونڈ چندہ دینے کا وعدہ کیا اور آئندہ چندہ کے لئے کوشش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اضلاعِ شمال ومغرب کے بعض مقامات میں بھی معقول چندہ کیا گیا ہے اور دکن میں بھی اُس کے لئے تحریک ہو رہی ہے چندے کی تعداد صرف

تین مہینے میں پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ جس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ نواب محسن الملک جنھوں نے درحقیقت سرسیّد کا جُوا اپنے کندھے پر رکھا ہے اُن کو مسلمان اُسی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے سرسیّد کو دیکھتے تھے اور ہر شخص کی نظر میں اُن کی وُقعت ویسی ہی ہے جیسی اُن کے اُس بڑے پیش رَو کی تھی۔

یہ تمام علامتیں اِس بات کی ہیں کہ مسلمان قومی خدمات کی قدر کرنے لگے ہیں اور قومی ہمدردی کی آگ جو سرسیّد کے سینے میں مشتعل تھی اُس کو وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گئے بلکہ اُس کی آنچ دُور دُور پہنچ گئی ہے اور اُس ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہو گئے ہیں۔ اکثر لوگ اُن انگریزوں کی ہمدردی پر تعجب کرتے ہیں جو سرسیّد کی یادگار کے چندے میں بہت خوشی سے شریک ہوئے ہیں خصوصاً لارڈ اسٹنلی کا انگلستان سے دو سو پونڈ بھیجنا اور مسٹر آرنلڈ کی تحریک سے لاہور میں اسی مقصد کے لئے ایک یورپین کمیٹی کا قائم ہونا، بڑے بڑے افسروں کا اس میں شریک ہونا اور معقول رقمیں چندے میں دینا بڑے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ تعجب نہیں ہُوا۔ اِن لوگوں کا خمیر اس سرزمین کی خاک سے ہے جہاں بنی نوع کی بھلائی کے کاموں میں لوگ اُڑ کر شریک ہوتے ہیں انسانی ہمدردی اُن کی گھُٹی میں پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے قومی ریفارمروں کی کوشش سے اعلیٰ مدارجِ ترقی پر پہنچے اور اِسی لئے ہر قوم کے ریفارمر اور ہر ملک کے ہیرو کی دِل سے عزّت کرتے ہیں اور اُس کی یادگار قائم کرنے کو منجملہ فرائضِ انسانی سمجھتے ہیں۔ پس اُن لوگوں کا ہماری بھلائی کے کاموں میں شریک ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر تعجب ہے تو ہم کو اپنی مُردہ دل قوم کی حالت پر ہے جو اب سے تیس برس پہلے ہمدردی، قومیّت اور ریفارمیشن کے مفہوم تک سے واقف نہ تھے۔ جنھوں نے سلف کے اَدھورے کاموں کو پُورا کرنے کا کبھی سبق نہیں پڑھا تھا، جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا کسی رفاہِ عام کے کام میں روپیہ خرچ کرنا مطلق نہ جانتے تھے اور بغیر حکّام کے رعب و داب کے ایک پیسہ ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ایسی قوم میں اپنے ہیرو کی یادگار قائم کرنے کا جوش یا اُس کے منصوبے پُورے کرنے کا خیال، یا ایک قومی درس گاہ کو یونیورسٹی بنانے کا جذبہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟ بیشک یہ بیج سرسیّد کے بابرکت ہاتھوں کا بویا ہُوا ہے جس کو اُن کی مساعیِٔ جمیلہ کا سب سے اعلیٰ اور افضل نتیجہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر اُن کی کوششیں انھیں کی ذات پر ختم ہو جاتیں اور قوم میں یہ ولولہ پیدا نہ ہوتا تو اُن کی تمام عمر کی جانفشانی اور محنت گویا بالکل رائیگاں جاتی اور اُس گھنگھور گھٹا کی طرح جو ایک ناقابلِ زراعت

زمین میں خوب زور شور سے برس کر کھل جائے ، درحقیقت سرسید کی کوئی پائدار اور زندہ نشانی دنیا میں باقی نہ رہتی ۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس نے قوم میں اپنی زندہ یادگار چھوڑی ہے اور قوم کے بہت سے افراد میں وہ اپنا درد مرضِ متعدی کی طرح پھیلا گیا ہے ۔

فتیً عیش فی معروفہ بعد موتہ کما کان بعد السیل مجراہ مرتعاً

(یعنی وہ ایک جواں مرد تھا جو خود مر گیا ، اُس کا فیض زندہ ہے جیسے رَو کی گزرگاہ ، جب رَو کا پانی نکل جاتا ہے تو مویشی کے لئے ایک سرسبز چراگاہ بن جاتی ہے ۔)

مصر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اپنے سفرِ یورپ کا حال عربی زبان میں لکھا ہے ۔ وہ اہلِ یورپ کی ملکی اور قومی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ " اسی خصلت نے ان قوموں کو تمام دنیا کی قوموں سے بالاتر اور بزرگ تر کر دیا ہے ۔ یہ لوگ وطن اور قوم کی خدمت کرنے والوں کی صرف اُن خدمات کو دیکھتے ہیں جو اُنہوں نے عام بھلائی کے لئے کی ہیں اور اُن کے عیبوں پر مطلق نظر نہیں کرتے ۔"
اس کے بعد اُس نے اٹلی ، فرانس ، انگلینڈ اور رُوس کے چند وطن دوستوں کے نام لئے ہیں اور اُن کے بڑے بڑے اخلاقی عیوب جو تاریخ میں مذکور رہیں . بیان کئے ہیں ۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ " اُن کے ہم وطن اُن عیبوں پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ اُن کے احسانات کہ جو اُنھوں نے قوم پر کئے ہیں یاد کر کے اُن کے نام پر سر جھکاتے ہیں ۔ اُن کے اسٹیچو جو ملک میں قائم کئے گئے ہیں اُن کی زیارت کے لئے اطراف و جوانب سے آتے ہیں اور اُن کی تعظیم کے لئے سروں سے ٹوپیاں اور تاج اُتار لیتے ہیں اور اُن پر فخر کرتے ہیں ۔"

اگرچہ ہماری قوم میں ابھی تک یہ شریف خصلت کمیاب ہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوشِ ہمدردی لوگوں نے ظاہر کیا ہے اور جس گرم جوشی سے سرسید کی یادگار قائم کرنے کا ولولہ قوم میں اٹھا ہے اور جس توجہ اور خوشی سے اُس کے محرکوں کا اپیل سُنا گیا ہے ، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خصلت قوم میں رفتہ رفتہ ترقی کرتی جاتی ہے ۔ لوگ اپنی قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں اور جو اُن ضرورتوں کے رفع کرنے پر کمر باندھتے ہیں ، اُن کی عظمت دلوں میں بیٹھتی جاتی ہے یہی قوموں کی زندہ دلی کی علامت ہے اور یہی وہ صفت ہے کہ جس قوم میں وہ معدوم ہو جاتی ہے وہ قوم جیتے جی مر جاتی ہے ۔

"مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے"

مذکورہ بالا تحریر کے بعد معلوم ہوا کہ ۲۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو نواب لیفٹننٹ گورنر بہادر اضلاعِ شمال مغرب محض سرسید میموریل فنڈ کمیٹی کی تائید کے لئے علی گڑھ میں تشریف لائے اور ایک عام جلسے میں جس میں علی گڑھ اور اُس کے گرد و نواح کے رئیس شریک تھے، کمیٹی کے ایڈریس کا جواب دیتے وقت حضور لارڈ ایلگن وائسرائے کشورِ ہند کی چٹھی جو اس موقع پر اُن کے نام موصول ہوئی تھی، حاضرین کو پڑھ کر سنائی، جس میں حضورِ ممدوح نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج پر نہایت مربیانہ توجہ اور کمیٹی کی اُن کوششوں پر جو وہ کالج کی ترقی میں کر رہی ہے، کمال خوشنودی ظاہر فرمائی تھی اور مسلمانوں کو اور نیز غیر قوموں کو جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس تحریک کی اعانت پر توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ "میں ہمیشہ اپنے تئیں اس وجہ سے خوش نصیب سمجھوں گا کہ سال گزشتہ میں مجھ کو علی گڑھ میں جانے کا موقع مل گیا اور سرسید سے ملاقات کرنے اور اس دارالعلوم کو دیکھنے کا جو سرسید کو نہایت عزیز تھا ایسی حالت میں کہ ان کی ذات کا حوصلہ بخش سایہ اس پر چھایا ہوا تھا۔" اس کے بعد لکھا تھا کہ "اُس دن کی یادگار میری اس خواہش کو قوی کرتی ہے کہ میں بھی اپنے تئیں اُس کالج کے دوستوں کے زمرے میں شامل کر دوں اور اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جو فنڈ اب جمع ہو رہا ہے اُس میں دو ہزار کا چندہ شامل کر کے اپنی ہمدردی کا عملی اظہار کر دوں۔ امید ہے کہ آپ از راہِ مہربانی میری خواہش سے کمیٹی کو مطلع کر دیں گے۔"

اس کے بعد ہز آنر کی موجودگی میں حاضرین کے سامنے چندے کی فہرست پیش کی گئی اور اسی جلسے میں تقریباً پچیس ہزار کا چندہ جس میں حضور وائسرائے اور نواب لیفٹننٹ گورنر کا چندہ بھی شامل ہے لکھا گیا۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ "اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سرسبز ہے اُس کے سائے میں راحت ملتی ہے اور اُس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو گیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے۔" یہی مثال ہمارے ہیرو سرسید کی تھی وہ بھی مسلمانوں کا ایسا ہی دوست تھا۔ جب تک زندہ رہا اپنے ہاتھ پاؤں، زبان، قلم، جان اور مال سے اُن کی مدد کرتا رہا اور جب مر گیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت

کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ اُن کی بھلائی کا کام جو اُس نے اَدھورا چھوڑا ہے اُس کو سب مل کر پُورا کریں۔ حق یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے۔ جَمالُ ذِی الارض کانوا فی الحیٰوۃ وھم بعد الممات جمالُ الکتب والسیَر۔

حصّہ اوّل ختم ہُوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُوسرا حصّہ

سرسید کی لائف، اُن کی تصنیفات اور اُن کے کاموں پر ریویو

سرسید کی ترقّی کے اسباب

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے مگر اس موقع پر نہ ایسی ترقی سے ہماری غرض متعلّق ہے اور نہ ہمارے نزدیک سرسید نے عہدہ یا منصب کے لحاظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا ہے جو اُن کی اعلیٰ لیاقتوں کے مقابلے میں کچھ وزن رکھتا ہو۔ میرے ایک دوست سے ایک لائق انگلش مین نے سرسید کا ذکر کرتے وقت کہا کہ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو کسی بڑی امپائر میں وزیر اعظم کے درجے تک پہنچتا۔ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں اُن کو باعتبار پولٹیکل لیاقت کے سرسالار جنگ اوّل سے دوسرے درجے پر رکھا ہے' مگر اخبار براڈ ایرو مطبوعہ ۱۲ر فروری ۱۸۸۵ء میں اُس پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "سید احمد خاں کو سرسالار جنگ سے دوسرے درجے پر رکھنے میں ایک ممتاز ہندوستانی جنٹلمین کی قدر و قابلیت کا غلط اندازہ کیا گیا ہے جس کی تمام زندگی شمالی ہندوستان کے واسطے برکت اور رحمت رہی ہے"

بہر حال یہاں سرسید کی جس ترقّی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ عہدہ اور منصب کی ترقی نہیں بلکہ وہ ترقّی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ عہدہ اور منصب کے لحاظ سے اور نہ مال و دولت و جاہ و حکومت کے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ اور اشرف خصائل انسانی کے لحاظ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کر دیتی ہے +

سرسید کی زندگی کے واقعات جو پہلے حصے میں بیان ہو چکے ہیں اگر اُن کو محض سرسری طور پر دیکھا جائے تو اُن سے اِس قدر ضرور ثابت ہو گا کہ ایک مسلمان جو قومی تنزّل کے زمانے میں پیدا ہوا، جس نے ایک مُردہ دار الخلافہ کی پژمردہ سوسائٹی میں ہوش سنبھالا اور ہندوستان کی کمزور

آب و ہوا میں نشوونما پائی، اُس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصّہ نہایت جانکاہ محنت، دلی شوق اور بے نظیر استقلال کے ساتھ گورنمنٹ کی خیر اندیشی، ملک کی خیر خواہی، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دی۔ پس اس مقام پر ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اُس کے دل میں پیدا کی؟ اور کیونکر وہ اس قدر طول طویل زمانے تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا؟ اگرچہ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کلامِ معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ "کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ" (یعنی ہر شخص کو اُس کام میں جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے آسانی دی گئی ہے)، لیکن چونکہ سرسید کی بائیوگرافی کو ہم آئندہ نسلوں کے لئے ایک مثالِ قابلِ تقلید سمجھتے ہیں اس لئے اُن کی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

سرسید کی لائف میں جیسا کہ اُن کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے، بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر اُن کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ قطع نظر اُن جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا، اتفاقاتِ حسنہ نے بھی اُن کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ اُن کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسّل گھرانے کی یادگار تھی اور اُن کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت، حسنِ تدبیر اور علم وفضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانے کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اُنھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی۔ اُن کی ماں ایک نیک نہاد، سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں جن کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جوہر قابل کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ اُنھوں نے حسنِ اتفاق سے ایسی حالت میں نشوونما پائی کہ اُن کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ اُنکو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا۔ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ مگر اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے، نہ اُن پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی

گئی تھی کہ جدھر منہ اُٹھ گیا چل نکلے۔

اُن کے والد ایک آزاد منش اور تعلقاتِ دُنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنہ اور رعب داب کے نہایت متحمل اور بُردبار تھیں پس وہ بے جا تشدّد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانے میں اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دِل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے، سرسید پر کبھی نہیں گذری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی۔ وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیر زادوں سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیئے تھا، مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی اُن کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لئے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتشگیر مادّہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوانِ شباب میں ہوا و ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حبِ قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا:۔

"دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا"

جس حد تک سرسید کی تعلیم ہوئی اُس کو بھی اُن کی ترقی کا موّید سمجھا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے جیسا کہ پہلے حصّے میں بیان ہو چکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقے میں پوری تعلیم نہیں پائی۔ اگر وہ پُرانے طریقے کی تعلیم پوری کر لیتے اور علومِ قدیمہ کا رنگ اُن پر چڑھ جاتا تو پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی قابلیت اُن میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑبند ہو جاتے اور تعصب کے تو بہ تہ پردے اُن کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقے کی تعلیم بھی اُن نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجے کی سویلیزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالبِ علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ وہ اُن کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لئے

کی جاتی ہیں محض بے سُود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا پُرانی تعلیم میں اُدھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا نہ ہونا مجملہ اُن اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشّان کام پر ہاتھ ڈالنے سے اُن کو جھجکنے نہیں دیا۔

اگرچہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں، بلاشبہ ایسی ہیں۔ جن کو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کو اُن کی ترقّی کے اسباب میں شمار کیا جائے، کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقّی کی سدِّ راہ دیکھی گئی ہیں۔ اس کے سوا ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاص کر ہماری مُردہ قوم میں جس قسم کے حیرت انگیز اور عظیم الشّان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی جلیل القدر خدمتوں میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصّہ نہایت استقلال کے ساتھ بسر کیا ہے، اُن کو محض اتفاقیہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تجرّد اور بے تعلّقی کی حالت میں رہنا ہی اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی۔ اگر وہ دُوسرا نکاح کر لیتے تو ہرگز اُن کو اِن کاموں کے سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس تقدیر پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایک چالیس بیالیس برس کے توانا تندرست، ذی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاحِ ثانی سے باز رکھا اور تجرّد کی ناگوار اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور تبادر ہوتی ہوگی، یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے اور یورپ کے اُن نامور لوگوں کے حالات سے جنھوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف ہوئے ہیں، اُس وقت سے ہندوستان میں بھی کم و بیش قومیّت اور قومی ہمدردی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ پس یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے کہ سرسید نے بھی جو کچھ ملک یا قوم یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انھیں یورپ کے ریفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات سن کر اُن کی ریس سے کیا ہو۔ لیکن اوّل تو جس وقت سرسید کو ملک اور قوم کی خدمت یا مذہب کی حمایت کا خیال پیدا ہُوا اُس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی، دُوسرے

اگر بالفرض یہ بات مان بھی لی جائے تو صرف اسی قدر مانی جا سکتی ہے کہ یورپ کی تاریخ سے اُن کے دل میں بھی حبِّ وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دُودھ کا سا اُبال پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پک جائے کہ ایک ہندوستان کا مسلمان قوم کی دُھن میں اپنے تئیں فنا کر دے۔ جس طرح حالتِ موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے مُوجدوں اور مخترعوں کے حالات سُن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی مُوجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں، اسی طرح یہ بھی اِمکان سے خارج ہے کہ یورپ کے ریفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا زبانی سُن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جان نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ ایشیائی طرزِ حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اُس کے سوا تمام طاقتوں کو فنا کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایشیائی ملکوں کی طرح ابتدائے آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی اُس نے ایشیا کی کسی قوم بلکہ کسی متنفس میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص (یعنی بادشاہ) ملک کا خیر خواہ ہو سکتا ہے اور بس۔ جان سٹوارٹ مِل لکھتے ہیں کہ "اگر رعیّت کو ایسا بنا دو کہ وہ مُلک کے لئے کچھ نہ کر سکے تو اُس کو مُلک کی کچھ پروا نہ رہے گی"۔ اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرزِ حکومت بدل گئی ہے، جس کا مقتضا یہ ہونا چاہیئے کہ لوگوں میں ملک اور قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو، مگر جو سکون اور اِنجماد ہندوستان کی قوموں میں صدہا پُشت سے متوارث چلا آتا ہے اور جو اُن کے آب و گِل میں خمیر ہو گیا ہے اُس کو برٹش طرزِ حکومت، جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے، ایک صدی میں زائل نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی نظیریں سُن سُن کر جو اکثر ہندوستانیوں کے دِل میں بعض اوقات ملک اور قوم کی بھلائی کا جوش دفعتہً اُٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گزرنے کہ وہ آوے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایشیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے اِرادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی میں طاقت ہے۔ کہ انسان نہایت سخت ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، تمام لذّات کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے، آگ میں تپتا ہے، برف میں گلتا ہے، گھر بار لُٹا دیتا ہے اور ہر نا قابلِ برداشت تکلیف اُٹھاتا ہے، مگر

مذہب بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہُوا ہو، طرزِ حکومت کا تابع ہوتا ہے - اُس میں جتنی باتیں طرزِ حکومت کے مقتضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصّہ ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے - مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا - وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن کا نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہوجاتا ہے اور یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے - وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلاواسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے - مذہب کی یہ حالت ایسی پائدار اور مستحکم ہوجاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہوجانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے - پچھلے جس شاہراہ پر اگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند کر کے اسی شاہراہ پر پڑ لیتے ہیں، دائیں بائیں آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے - مگر بعض اوقات زمانے کی ضرورتیں خود مذہبی فرقے میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنی پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصّہ جو موجودہ زمانے کے موافق ہوتا ہے اس پر عمل کرنا اور اس کو رواج دینا پڑتا ہے - زمانے کی ضرورتیں اس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور بانیٔ مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے اور خود مذہب اس میں استقلال پیدا کرتا ہے جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلاف اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے یہیں سے اُس چیز کا سُراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدمتیں سرانجام کرائی ہیں - ہمارے نزدیک جہاں تک کہ اُن کی لائف شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ اُن کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے ر اُن کی تمام ترقیات کا منبع، اُن کے کُل مقاصدِ عالیہ کا محرّک اور اُن کی ہر منزل کا رہبر مذہب کے سوا اور کوئی چیز قرار نہیں پا سکتی *

اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانیٔ اسلامؐ کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھُٹّی میں پڑی تھی - دارالخلافہ کا اخیر دَور تھا اور مسلمانوں کو آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی اُمید دُنیا میں باقی نہ رہی تھی اِس لئے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے - خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا - شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ جو اُس زمانے میں دیندار مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھی، اُس کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا - ان کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال عقیدت و ارادت رکھتے تھے اور اس لئے سرسید

بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے تھے اور ایک مدتِ دراز تک اُنھوں نے وہاں کا رنگِ صحبت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اُن کی والدہ کے سوا اُن کے ننھیال والے جہاں اُنھوں نے نشوو نما پائی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دَور دَورہ دیکھا تھا، گویا مذہب ہی کی آغوش میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علومِ جدیدہ جس عمر میں مذہب سے دل اُچاٹ کر سکتے ہیں اُس عمر میں سرسید پر اُن کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر اُن کی لے اُس وقت کھلنی شروع ہوئی جب مذہب کی جڑ پتال تک پہنچ چکی تھی اور جب کہ سائنس کو بجائے اس کے کہ مذہب کے ساتھ جنگ کرے اُس سے صلح کرنی ضرور تھی۔

چونکہ سرسید کا تمام خاندان دو ایسے خاندانوں سے عقیدت رکھتا تھا جو نہ صرف دلّی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامعِ شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے اس لئے اُن کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں، چنانچہ سرسیدؔ کہتے تھے کہ "اس زمانے میں بھی جب کہ میرے مذہبی خیالات محققانہ اصُول پر مبنی ہیں، میں اپنی والدہ کے عقائد میں ایک آدھ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصُول کے خلاف نہیں پاتا" یہی عقائد ابتدا سے سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت اُنھوں نے آنکھ کھول کر دیکھی تھی۔ گویا ہوش سنبھالتے ہی اُنھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیفات نے اُن کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور اُن کو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ اُن پر غالب رہا، مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ انھیں سنت و بدعت و تقلید و عدمِ تقلید کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف اُنھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانے کی ضرورتوں نے اُن کی آنکھیں کھولیں اور خود اُس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت اُن کی گھٹی میں پڑا تھا، اُن کو اسلام کی حقیقت اور اُس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں اُن کو چھوڑا اور جو اُس کے مطابق پائیں اُن کو پکڑا اور زید و عمر کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اُٹھا دیا۔ ہر ایک معاملے میں خود مذہب

کو نہ کہ زید و عمر کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اُس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اُس کو سر پر رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے مگر مذہب نے اجازت دی اِس لئے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کر لی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی و ایام گذاری کے طور پر کرنی چاہیئے؟ یا تہِ دل سے اُس کے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اُس کے فرائض تہِ دل سے ادا نہ کرنا خدا اور رسولؐ کی مرضی کے خلاف ہے، اِس لئے نوکری کے فرائض نہایت ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کئے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیّت کو اُس کی خیر خواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضرور ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایۂ حمایت میں رعیّت کو ہر طرح کا امن و آزادی حاصل ہو اُس کی رعیّت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو۔ لہٰذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کر دی۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدقِ دل سے دوستی، میل جول اور کھانا پینا، دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدّس کے موافق ہے یا نہیں؟ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضرور ہے، کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر کسی خصلت کو نہیں بتاتا۔ اس لئے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اُسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیئے۔

واقعہ ۱۸۵۷ء نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت صدمہ پہنچایا اور اُن کے پنپنے کی بالکل اُمید نہ رہی، اس سے سرسیّد کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ اُن کا ارادہ ہندوستان سے تعلّقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کا ہو گیا۔ اس وقت بھی اُنھوں نے مذہب ہی سے سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کود نا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر اور کسی گوشے میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصلِ اصُول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی ہے اور بس۔ مذہب نے اُن کو بتایا کہ بانیٔ اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام اُمت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے۔ کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اُس نے دنیا میں آ کر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیر خواہی میں بسر کی۔ وہ گمراہ تھے اُن کو ہدایت کی، وہ وحشی

تھے اُن کو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اُن میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی، وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اُن میں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا، اُن کا دین اور دُنیا دونوں درست کئے، اُن کی خیرخواہی اور اصلاح میں سخت شدائد اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں، ملک کی محبت کو جزوِ ایمان قرار دیا اور کہا کہ "حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ" قوم کی محبت پر تمام اُمت کو مجبور کیا اور فرمایا کہ "حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْاِیْمَانِ" قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھیرایا اور کہا کہ "سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ" اخیر دم تک اُمّت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور اُمّتِی اُمّتِی کہتا دُنیا سے رخصت ہُوا۔

سرسید نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کئے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ اُنھوں نے دُنیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیرخواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطعِ تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام قویٰ کو نفسِ واپسین تک قومی خدمت اور قومی خیرخواہی کے لئے وقف کر دیا۔ اُنھوں نے مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیرخواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعزاز سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے ذریعے سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے ان کے دل میں ڈالا کہ مسلمان دُنیوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہوئے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذلت بعینہٖ اسلام کی ذلت ہے۔ اگر چند روز اُن کا یہی حال رہا تو ہندوستان میں اُن کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا اور اسلام اس ملک سے رخصت ہو جائے گا۔ اِس لئے اُنھوں نے قوم کو اوّل دنیا ہی کی طرف متوجہ کیا اور جو ذریعے اُن کی دُنیوی ترقیات کے تھے اُن کے لئے مہیا کئے۔ سب سے زیادہ اُن کی ترقی کا مدار انگریزی تعلیم پر سمجھا۔ اِس لئے ایک زمانہ نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی، مگر اُنھوں نے اُس کو قوم میں جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی اوہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے مانع تھے اپنی پُرزور تحریروں سے اُن کی غلطی ثابت کی۔ سوشل اور اخلاقی خرابیاں جو قوم میں شائع تھیں، جن پر غیر قومیں ہنستی تھیں اور جو دنیوی عزت اور وقار کی منافی تھیں اُن کی اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی۔ قوم کی طرف سے جو گورنمنٹ کو پولیٹکل بدگمانیاں تھیں اُن کو رفع کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو قوم کے دل میں مغایرت یا دہشت یا جھجک تھی اُس کو دور کیا۔ انگریز جو اسلام کو ایک نہایت مہیب اور خوفناک مذہب خیالی

کرتے تھے اور اس لئے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے، اُن کو اسلام کی اصلی صورت دکھائی اور ثابت کیا کہ اگر دُنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست، عیسائی مذہب کا حامی، بائیبل کی تصدیق کرنے والا اور اُس کے اصُول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بس۔ ہندو مسلمانوں میں جہاں تک کہ ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے کہ آپس میں مِل جُل کر رہیں۔ جتنے مدرسے انسٹی ٹیوشن قائم کئے اُن میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور اُن سے دونوں کے فوائد ملحُوظ رکھے۔ ہمیشہ اپنی پبلک اسپیچوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لئے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں، جہاں تک ممکن تھا اُن میں اتفاق والتیام کی بُنیاد ڈالی۔ مدرسۃ العلوم میں ہر مسلمان فرقے کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقے کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ اپنے سُنّی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائی عمر میں اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اُس سے ہمیشہ کے لئے اجتناب کیا۔ باوجودیکہ اُن کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے مذہب کے متعلق صدہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات زبان سے نہیں نکالی۔ کبھی جمہور اہلِ اسلام کے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اُس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا، کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اِس لئے کیا کہ قوم میں اختلافات اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور میل کا بیل نہ بن جائے۔

جس وقت سرسید نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا اُس وقت مذہب ہی نے اُن کو اُس یقین پر قائم رکھا کہ جو صدمہ یوروپ میں عیسائی مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا اور جب کہ انگریزی تعلیم اُن میں جاری ہوگئی اور اُس کو روز بروز ترقی ہونے لگی، اُس وقت بھی مذہب ہی نے ان کو یہ سمجھایا کہ جب تک سائنس اور اصُولِ اسلام میں تطبیق نہ کی جائے تب تک اُن کورے اور سادہ لوح طالب علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہوسکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لئے اُن کے دل میں مذہب کی طرف سے سوءِ ظن پیدا ہوجانا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ مذہب نے اُن کو ڈرایا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدمہ پہنچا تو اُس کا مظلمہ

خاص کر اُس شخص پر ہو گا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اس عظیم الشان کام کو بھی اُنھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم و عقل کے موافق قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا یہ محض بے سروپا قیاسات نہیں ہیں بلکہ خود سرسید نے اپنی تحریروں میں جابجا اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصاً وہ آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق مورخہ یکم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ میں "ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیادار" کے عنوان سے لکھا ہے اُس سے ہمارے مذکورہ بیانات کی بخوبی تائید ہوتی ہے۔ اُس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمات اُسی سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مرتاض اور نفس کُش زاہد عبادتِ الٰہی بجا لاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی اُن کے ذوق و شوق کو کم کرتی تھی اور نہ گرمی یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے اُن کی ہمت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر اُنھوں نے مخالفتیں جھیلیں، اُن کے کفر کے بیشمار فتوے لکھے گئے، اُن کو دہری، ملحد، کافر اور دجّال سب کچھ کہا گیا، اُن کو بارہا قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ صدہا گمنام خطوں میں مغلظ گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں، اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک ہو سکا اُن کی توہین کی گئی، مگر وہ اپنی دُھن میں اسی طرح لگے رہے اور اپنا کام اُسی ذوق و شوق کے ساتھ کئے گئے۔ بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اُسی قدر اُن کا جوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی۔ لوگ اُن کو بُرا کہہ کر اور گالیاں دے کر اس قدر خوش نہ ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ بُرا سُن کر اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے۔ اُن کی بہن کے انتقال کی خبر اُن کو اُس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کارروائی میں مصروف تھے۔ جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخاست نہ ہوا وہ بہن کی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہوئے۔ جوان بیٹے کی موت سے اُن کو سخت صدمہ پہنچا، پندرہ بیس روز تک قلب کی حرکت نہایت سُست رہی اور یہ صدمہ آخر دم تک فراموش نہ ہوا، باایں ہمہ وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک رات اور ایک دن سے زیادہ جو دِلّی کی آمد و رفت میں صرف ہوا اُنھوں نے باوجود ایسے سخت صدمے کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور ایسے مواقع کو تا مقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا۔ جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو اور قومی خدمات میں حرج واقع ہو۔ دلّی میں انھیں خیالات سے وہ جنازے کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے۔ لوگوں کو سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کئے اور حق یہ ہے کہ اُن کے اعتراض بالکل بجا تھے۔ کیونکہ میں

جمیلۃ شیئاً اعدا کا" الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اُن کے تمام کاموں کی محرّک کوئی ایسی روحانی اُمنگ تھی جس پر دُنیا کے معمولی خلجان غالب نہیں آ سکتے تھے اور جس قدر جسمانی اُمنگیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ اُمنگ بڑھتی جاتی تھی۔

اِس مقام پر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ سرسیّد کی فطرت میں جیسا کہ اُن کے حالات اور اُن کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے، غایت درجہ کی فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی تھی یہاں تک کہ بعض اشخاص غلطی سے اُن کو حد سے زیادہ مُسرف اور فضول خرچ خیال کرتے تھے جو لوگ ان کے حالات سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا خیال اُن کے دل میں پیدا نہیں ہُوا تھا وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھ کر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کبھی اُن کی آمدنی میں سے ایک حبّہ پس انداز نہ ہوتا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے اُن کو تعلیمِ اہلِ اسلام کا خیال ہُوا اُنھوں نے اس قسم کے شخصی سلوک اور احسان بالکل بند کر دئے، جو کچھ اُن کے ضروری اخراجات سے بچا وہ اُنھوں نے مدرسہ کے سوا اور کہیں صرف نہیں کیا۔ سائل اُن کے دروازے سے ہمیشہ ناکام پھرتے تھے۔ تعلیم کے سوا کسی اور رفاہِ عام کے چندہ میں بھی وہ شریک نہیں ہوتے تھے بخلاف اس کے مدرسہ کی امداد میں وہ اپنی طاقت اور استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرتے رہتے تھے۔ قدرسے

لہ مارچ ۱۸۹۴ء میں جب کہ سرشیر محمد خاں بہادر رئیسِ پالن پور کالج کے ملاحظہ کو علی گڑھ میں آئے اور ٹرسٹیوں کی طرف سے سرسیّد نے اُن کو ایڈریس دیا، اُس وقت کالج کی خیر خواہی کے جوش میں سرسیّد نے ایک ایسا کام کیا جس کو سُن کر ہر شخص تعجب کرے گا۔ رئیس ممدوح نے چلتے وقت پچاس روپیہ سرسیّد کے پوتے سیّد مسعود کو اور پچاس محمد شبیر کو جو نواب محسن الملک کا عزیز ہے اور پچاس روپے دونوں صاحبوں کے ملازموں کو علاوہ پانسو روپیہ چندہ کالج کے دئے تھے۔ دونوں بچوں نے تو خوشی سے کہہ دیا کہ ہم دونوں کے سو روپیہ کالج کی مسجد کی تعمیر میں صرف کئے جائیں مگر سرسیّد نے نوکروں کا روپیہ بھی لینا چاہا۔ نواب محسن الملک نے اپنے نوکروں کے انعام کو اُن سے لینا ہرگز پسند نہ کیا اور پچاس روپیہ اُنھیں کو دے دئے، مگر سرسیّد نے حجّتِ شرعی تمام کرنے کو نوکروں سے کہا کہ اگر تم کو ہماری نوکری منظور رہے تو جو انعام نواب صاحب نے تم کو دیا ہے وہ کالج میں دے دو ورنہ ابھی اپنا حساب کرلو۔ وہ بیچارے نوکری کیونکر چھوڑ سکتے تھے اُنھوں نے مجبوراً پچاس روپیہ سرسیّد کو دے دئے اور سرسیّد نے بلا تکلف اُن سے روپیہ لے کر کالج فنڈ میں جمع کر لیا۔ ۱۲-

پہلے جب کہ وہ بجنور میں صدر امین تھے اُنھوں نے کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کرائی، اپنے پاس سے بھی روپیہ صرف کیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی لے کر لگایا، مگر غدر کے بعد جب سہارنپور کی جامع مسجد کے لئے اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو اُنھوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کیا اور لکھ بھیجا کہ "میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کے فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔"
اِن باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ سرسید کی کل مذہب کے ہاتھ میں تھی۔ مذہب جہاں چاہتا تھا اُن سے خرچ کراتا تھا اور جہاں چاہتا تھا اُن کا ہاتھ روک دیتا تھا کیونکہ مذہب کے سوا کوئی ایسا زبردست حاکم نہیں ہے جو انسان کی طبیعت کے اقتضا پر غالب آجائے اور ایک ہی شخص کو ہمیشہ کے لئے ایک جگہ غایت درجہ کا فیاض اور دوسری جگہ حد سے زیادہ ممسک اور تنگدل بنا دے۔ جیسا کہ بعض صحابہ کا حال تھا کہ کہیں اُن کی داد و دہش کے آگے حاتم کی فیاضی ہیچ معلوم دیتی تھی اور کہیں ان کی کفایت شعاری اور جزرسی پر حد سے زیادہ تعجب ہوتا تھا۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے جتنے بڑے بڑے کام کئے وہ عقلِ سلیم اور رائے صائب کی ہدایت سے کئے اور اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے کارہائے نمایاں اُن کی دانشمندی اور رائے صائب کے نتیجے تھے نہ مذہب کے۔ لیکن اوّل تو جو شخص مذہب اور عقل کو لازم و ملزوم جانتا ہو اُس کے کسی کام کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عقل کا نتیجہ تھا نہ مذہب کا۔ دوسرے عقل کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ راہِ راست بتا دیتی ہے مگر اُس راہ پر چلنا اور ثابت قدم رہنا اور نہایت استقلال کے ساتھ اُس کی تمام منزلیں طے کرنا جب تک کہ مذہب کا سہارا نہ ہو، غیر ممکن ہے۔

اس بحث کو جو ہم نے اِس قدر طُول دیا ہے، اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سرسیّد کے مخالفوں کو اُن کے مسلمان یا پابندِ مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کو سرسید مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفوں کے نزدیک نہ وہ مذہب مذہب تھا اور نہ وہ اسلام اسلام۔ بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہاں وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے، جو شخص مذہب کا پابند بھی نہ ہو وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں، یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ ہوں گے ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔ یورپ اور امریکہ میں اب

تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں اُن کے بانی مبانی تقریباً تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے۔ لوتھر، کالون، بیکن، ملٹن، نیوٹن، کولمبس، بنجمن فرینکلن، جارج سٹیفن، واشنگٹن، ہمپڈن، ہیزینی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے۔

سرسیّد کی مُلکی خدمات اور اُن کے نتائج

اس عنوان کے تحت ہم سرسیّد کی سرکاری، ملکی اور قومی تینوں قسم کی خدمات کا ذکر کریں گے مگر پیشانی پر ہم نے ان تمام خدمات کو ملکی خدمات کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ سرسید کو گورنمنٹ کی خیر خواہی اور حُسنِ خدمت کی بدولت ملک اور قوم کی بھلائی کرنے میں بے انتہا مدد پہنچی ہے اور اس لئے ہم ایسی سرکاری خدمات کو بھی ملکی خدمات میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک کے کسی فرقے کو جو زمانے کے انقلاب سے پست ہو گیا ہو، اُبھارنا اور اُس کے ہموطنوں میں اس کا اعزاز از سرِ نو قائم کرنے میں کوشش کرنا درحقیقت ملک کے ایک ایسے عضوِ ماؤف کی اصلاح کرنا ہے جس کے سبب سے اُس کے تمام صحیح اعضا معرضِ خطر میں ہوں۔

سرکاری خدمات

سب سے پہلے ہم سرسید کی سرکاری خدمات پر جو اُن کی تمام ترقیات کی پہلی سیڑھی اور اُن کے تمام کارناموں کا ایک زبردست آلہ رہی ہیں، نظر ڈالتے ہیں اور اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو گورنمنٹ سروس کے ذریعہ سے اعزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں نصیحت کرتے ہیں کہ اُن کو سرسید کی راستبازی، دیانت، وفاداری اور شریفانہ و غلامانہ اطاعت سے جس پر وہ ملازمت کے زمانے میں اور اس کے بعد ہمیشہ کاربند رہے، سبق لینا چاہیے کیونکہ حُسنِ خدمت کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ اُن کو اس سے بہتر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

سرکاری ملازمت کی اِبتدا

جس زمانے میں سرسید نے انگریزی نوکری اختیار کی اس وقت مسلمانوں کو انگریزوں کے اخلاق، عادات، طرزِ معاشرت اور انگلش گورنمنٹ کی طرزِ حکومت سے بہت ہی کم واقفیت تھی اور ردی اور اس

کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے خصوصاً جو خاندان قلعۂ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے اُن کو انگریزی نوکری کا کبھی خواب بھی نظر نہ آتا ہوگا۔ چنانچہ سرسید نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو اُن کے تمام عزیز اور رشتہ دار اس ارادے سے مانع آئے، مگر چونکہ اُن کے نانا دبیر الدولہ نے بعض سرکاری خدمات انجام دی تھیں اور اُن کے خالو خلیل اللہ خاں اُس وقت ایک ممتاز انگریزی خدمت پر مامور تھے اس لئے انھوں نے قلعۂ دہلی کے تبرک پر قناعت نہ کی بلکہ انگریزی نوکری اختیار کر لی۔

کام سیکھنے کا شوق

سرسید نے ابتدائے ملازمت ہی میں یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے ملنے سے پہلے اُس کام کی لیاقت اور اُس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی فرض ہے۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں جب رابرٹ ہملٹن نے اُن کو عدالتِ سشن کا سررشتہ دار[1] مقرر کرنا چاہا تو اُنھوں نے اُس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کام کی اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول اور اُس کے فرائض ادا کر سکتا ہوں؟ جب وہ آگرہ کی کمشنری میں نائبِ منشی کے عہدے پر مقرر ہوئے تو انھوں نے بہت جلد قوانینِ مال سے واقفیت حاصل کر لی اور ترتیبِ دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق تمام دفترِ کمشنری آگرہ کا مرتّب کیا گیا۔ پھر عدالتِ منصفی کے متعلق قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا، جس کو صاحب کمشنر آگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کر کے اُن کے لئے عہدۂ منصفی کی سفارش کی۔

حسنِ خدمت

اس کے بعد انھوں نے اپنے تمام زمانۂ ملازمت میں اس قاعدے کو ہمیشہ

---

[1] چونکہ سررشتہ داری عدالت سشن کے قبول کرنے سے سرسید نے اِس خوف سے انکار کیا تھا کہ مبادا اُس کے فرائض اُن سے ادا نہ ہو سکیں، اس لئے مسٹر رابرٹ ہملٹن نے جو سفارش کی چِٹھی مسٹر لنڈزی کے نام لکھ کر سرسید کو آگرہ بھیجا تھا اُس میں اُن کو عالی خاندان اور ہوشیار ہونے کے علاوہ ڈرپوک بھی لکھا تھا۔ اس چٹھی کو کرنل گریہم سرسید کی لائف میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ سرسید میں اب کوئی علامت ڈرپوک ہونے کی نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ عبارتِ جنگ کے معنی ماسٹرا دف وار لکھ کر کہتے ہیں کہ غدر کے موقع پر سید احمد نے اس خطاب کا کافی ثبوت دیا ہے۔ ۱۲۰۔

نصب العین رکھا کہ جو کام سرکار کی طرف سے اُن کو تفویض ہوا اُس کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچائی اور اُس کے فرائض بڑے تجربہ کار آدمیوں کی طرح سرانجام کئے ۔ یہاں تک کہ سروس کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بھی جتنے کام گورنمنٹ نے اُن سے لینے چاہے ان کو کمال جانفشانی اور محنت سے اور نہایت بصیرت اور اطلاع کے ساتھ انجام دیا ۔ لیجس لیٹو کونسل کی ممبری اُنھوں نے ایسی لیاقت کے ساتھ کی کہ اُن سے پہلے کسی ہندوستانی ممبر نے نہیں کی تھی ۔ اُن سے پہلے ظاہرا کسی نیٹو ممبر نے کوئی مسودۂ قانون پیش نہیں کیا تھا اُنھوں نے تین مفید قانون بنائے جن میں سے صرف دو پیش ہوئے اور دونوں پاس ہو گئے ۔ کونسل کے اکثر مباحثوں میں باوجود انگریزی نہ جاننے کے نہایت سنجیدہ اور لیگل اسپیچیں کیں اور محض اپنی اعلیٰ لیاقت کے سبب دو وائسرائوں کے عہد میں دوبار منتخب ہوئے ۔ اُن کی ایک اسپیچ کی نسبت جیسا کہ پہلے حصّے میں بیان ہو چکا ہے خود لارڈ لٹن نے اپنی زبان سے کہا کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سُنی ۔ اسی طرح ایجوکیشنل کمیشن میں جیسی مبسوط اور مفصل شہادت اُنھوں نے دی اور جیسی روشنی تعلیمی معاملات پر اُن کی شہادت نے ڈالی اُس سے زیادہ کسی شہادت میں نہیں سُنی گئی ۔ غرض کہ انھوں نے سرکاری کام کو کبھی بیگاریوں کی طرح نہیں کیا بلکہ ہر ایک خدمت کے فرائض نہایت تندہی اور جانفشانی سے ادا کئے ۔ اسی سبب سے اُن کے افسر ہمیشہ اُن کے مدّاح اور شکر گذار رہے ۔

بے غرضی

جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُنھوں نے کبھی اپنی ترقی یا کسی خدمت کے صلہ کی صراحتہً یا کنایتہً اپنے افسروں سے درخواست نہیں کی بلکہ ہمیشہ اپنی کارگذاری اور حسنِ خدمت سے اُن کے دل میں جگہ کی اور خود اپنے کاموں کو اپنا سفارشی بنایا ۔ ۱۸۶۹ء میں جب کہ سرسید کو مقام علی گڑھ کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی کا خطاب دیا گیا اُس وقت صاحب کلکٹر علی گڑھ مسٹر کینڈی نے سرسید کی تعریف میں جو لمبی تقریر کی تھی اُس میں یہ بھی کہا تھا کہ " یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی " پروفیسر آرنلڈ ایم ۔ اے جو دس برس علی گڑھ کالج میں سرسید کے پاس رہے اُنھوں نے لاہور کے ماتمی جلسہ میں جو سرسید کی وفات پر اسپیچ دی تھی اُس میں یہ بھی کہا تھا کہ " گورنمنٹ کی طرف سے جو اعزاز یا خطاب اُن کو ملا وہ ہمیشہ بے طلب ملا اور میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو اُن سے زیادہ شریفانہ زندگی بسر کرنے والا اور

اُن سے زیادہ بے لاگ اور بے غرض ہو۔"

دیانتداری کی صفت اُن کی تمام پبلک سروس میں ایسی نمایاں رہی ہے جیسے آفتاب میں روشنی۔ صہیبؓ رومی کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "نِعْمَ الْعَبْدُ صُهَيْبٌ لَوْ لَمْ يَخَفِ اللّٰهَ لَمْ يَعْصِهِ" (یعنی صہیب ایسا نیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اس کی نافرمانی نہ کرتا) یہی حال سرسید کے تدیّن کا تھا، وہ نہ کسی حاکم کے خوف سے اور نہ شرعی امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے اقتضا سے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ غدر سے پہلے اُن کا تدیّن بہت خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا، اہلِ مقدمہ کو یہ جرأت تو نہ ہوتی تھی کہ اُن کے سامنے کچھ نذرانہ پیش کریں، یا ایسا پیغام بھیجیں۔ البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دورانِ مقدمہ میں اُن کے مکان پر ملنے کے بہانے یا کوئی سوغات لے کر چلے جاتے تھے۔ سوغات کا قبول کرنا تو درکنار، ہم نے سُنا ہے کہ وہ سوغات لانے والے سے اس قدر بدگمان ہو جاتے تھے کہ اُس کا اثر مقدمے کے فیصلے تک پہنچتا تھا، آخر اہلِ مقدمہ نے اثنائے تحقیقات اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ جھوٹے مقدمے بنانے والے اور جھوٹی گواہیاں دینے والے اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ نہ اُن سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور نہ غیروں کو۔ صاحب جج بنارس نے سالانہ رپورٹ میں اُن کی نسبت لکھا تھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سرسید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔"

غدر سے پہلے جو اکثر یورپین افسروں نے سرسید کی نسبت اپنی چٹھیات میں رائے ظاہر کی ہے اُس میں زیادہ تر اُن کے علوِ خاندان، لیاقت اور دیانتداری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ وہ ہندوستانیوں کے کیرکٹر سے اسی وقت بخوبی واقف ہو سکتے تھے جب کوئی امتحان کا موقع پیش آئے۔ یہاں ہم صرف ٹامس مٹکاف صاحب رزیڈنٹ و کمشنر دہلی کی چٹھی مؤرخہ ۱۴ر جولائی ۱۸۵۲ء کا ترجمہ نقل کرتے ہیں کہ "سید احمد خاں معزز خاندان کے ممبر ہیں اور نواب دبیر الدولہ خواجہ فرید خاں مرحوم کے جو شاہنشاہ اکبر شاہ مرحوم کے وزیرِ اعظم تھے نواسے ہیں اور میں اپنے ذاتی تجربے سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ ایمانداری اور لیاقت میں بہت اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر رکھتے ہیں۔" اس باب میں سرسید کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ ان کی سروس ختم ہونے پر باوجودیکہ گورنمنٹ بہت خوشی سے اُن کو کام کرنے

کی مہلت دینی چاہتی تھی مگر اُنھوں نے زیادہ مہلت لینی مناسب نہ سمجھی کیونکہ مدرسۃ العلوم قائم ہو چکا تھا۔ جس کے لئے چندہ جمع کرنے کی از بس ضرورت تھی اور وہ عام طور پر چندہ وصول کرنا ملازمت کی حالت میں خلافِ احتیاط سمجھتے تھے، چنانچہ جب تک اُنھوں نے پنشن نہیں لی بنارس میں اپنے دوستوں کے سوا کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

آزادی

اگرچہ سرسید نے اس دربار کے سانچے میں پرورش پائی تھی جو ایک قدیم ڈسپاٹک گورنمنٹ کی یادگار تھا۔ جہاں آزادی کے پر جلتے تھے اور خوشامد کا بازار گرم تھا، نیز اس وقت شمالی ہندوستان میں انگریزی عملداری کا ابتدائی زمانہ تھا اور اس لئے برٹش گورنمنٹ میں بھی اس وقت تک ایشیائی طرزِ حکومت کی تمام خاصیتیں موجود تھیں۔ اہل کار خوشامد کو اہلکاری کا زیور سمجھتے اور اس وجہ سے یورپین حکام اور افسر ہندوستان میں آکر خوشامد پسند بن جاتے تھے،

باوجود اس کے سرسید کا برتاؤ اپنے افسروں کے ساتھ ابتدا سے اخیر تک نہایت آزادانہ رہا۔ وہ اپنے افسروں کا ادب اور تعظیم اور سرکار میں اُن کی اطاعت جیسی کہ چاہیئے ہمیشہ کرتے تھے مگر اُن کا بے جا دباؤ کبھی نہیں مانا اور بے موقع کبھی اُن کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ غدر سے بہت پہلے جب کہ دلی میں جان پاٹن گبنس سشن جج اور سرسید منصف تھے، قسمت دہلی کے دو جاگیردار بھائیوں میں جن میں سے ایک سرسید کا گہرا دوست تھا، جاگیر کی بابت سخت نزاع تھا اور اُن کا جھگڑا گورنمنٹ میں پیش تھا۔ دوسرے بھائی نے صاحب جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو سید احمد خاں بہکاتا اور ہر قسم کی مدد دیتا ہے، اس کو آپ سمجھا دیں کہ جب تک ہمارا جھگڑا عدالت سے طے نہ ہو جائے، وہ میرے بھائی سے ملنا چھوڑ دے۔ جان پاٹن گبنس کے طنطنے اور رعب و داب کی تمام قسمت میں دھاک تھی اور اُن کے کسی ماتحت کی یہ مجال نہ تھی کہ اُن کا کہنا نہ مانے۔ اُنھوں نے ایک روز سرسید کو بلا کر سمجھایا کہ جب تک یہ نزاع رفع نہ ہو تم اپنے دوست سے ملنا چھوڑ دو۔ سرسید نے صاف کہہ دیا کہ میں بے شک آپ کے ماتحت ہوں، سرکاری معاملات میں جو کچھ آپ ہدایت کریں گے۔ اُس کی بسر و چشم تعمیل کروں گا مگر میرے ذاتی تعلقات میں آپ کو دخل دینا نہیں چاہیئے، اگر آپ کہیں کہ تم چند روز کو اپنی ماں یا بہن سے ملنا چھوڑ دو تو میں کیونکر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں۔ اگرچہ انگریزوں میں ہندوستان کی آب و ہوا تحکم اور خوشامد پسندی پیدا کر دیتی ہے مگر چونکہ آزادی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے وہ ایسے آزاد شخصوں کی آخر کار قدر کرنے لگتے ہیں اور برخلاف

عام اشخاص کے اُن کے ساتھ خاص طور کا برتاؤ برتتے ہیں۔جب صاحب جج نے یہ معقول عُذر سنا پھر کبھی اُن پر ایسا بیجا دباؤ نہیں ڈالا۔

۱۸۵۵ء میں جبکہ وہ پہلی بار مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اُس وقت رہتک میں عجیب کھلبلی پڑی ہوئی تھی۔مسٹر گنتری قائم مقام مجسٹریٹ نے بیشمار مقدمے بداعمالی اور رشوت ستانی کے مسٹر کرک پر دائر کرا رکھے تھے،مخبری کا بازار گرم تھا۔جو لوگ گنتری صاحب کے ہاں کرک کے برخلاف مخبری کرتے تھے اُن سے سب لوگ دبتے تھے۔خان بہادر غلام نبی خاں مرحوم جو اُس وقت وہاں نائبِ سررشتہ دار کلکٹری تھے ان کا بیان ہے کہ" سید صاحب نے وہاں جا کر کئی کام صاحب مجسٹریٹ کی مرضی کے بالکل برخلاف کئے اور کبھی اُن کا دباؤ نہیں مانا۔ایک شخص بابر خاں نامی قصبۂ رہتک کا نمبردار جس کو راقم بھی جانتا ہے،گنتری صاحب کا بڑا مقرب تھا جس نے کرک کے برخلاف اُن کو بہت مدد دی تھی۔اُس نے کسی دیوانی کے مقدمے میں سید صاحب کے اجلاس میں جھوٹی گواہی دی۔انھوں نے فوراً اُس کو ماخوذ کیا،ہرچند گنتری صاحب نے اس کی رہائی کے لئے سفارش کی مگر سید صاحب نے سفارش نہیں مانی اور اُس کو دورہ سپرد کر دیا جہاں سے اُس کو تین برس کی قید کا حکم ہوا۔"

پھر میونسپل کمیٹی کے ایک مقدمے میں گنتری صاحب ایک ٹھیکہ دار کی جائداد بعلتِ مطالبہ کمیٹی نیلام کرنی چاہتے تھے اور تمام ممبرانِ کمیٹی سوائے سید صاحب کے اُن کے ساتھ متفق الرائے تھے۔سرسید نے اُس وقت کے بائلانہ کے مطابق یہ رائے دی کہ کمیٹی بدوں حاصل کرنے ڈگری دیوانی کے اپنے اختیار سے ٹھیکہ دار کی جائداد نیلام کرنے کی مجاز نہیں ہے۔جب سب نے اس رائے سے اختلاف کیا تو انھوں نے اپنی رائے مدلل تحریر کر کے کمیٹی میں بھیج دی،آخر گنتری صاحب کو بصد اکراہ اُنھیں کی رائے کے موافق عمل کرنا پڑا۔

منشی صاحب ہی کا یہ بیان ہے کہ" جب سے گنتری صاحب نے مسٹر کرک کو زک دی تھی صدر الامینی کی کچھ وقعت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی،خصوصاً ملازمانِ کچہری ضلع اُس کو لاشئے محض سمجھنے لگے تھے۔اتفاق یہ کہ ایک شخص جس کا باپ ضلع کے محکمہ میں سررشتہ دار تھا،صدر امینی میں بزمرۂ محرراں نوکر تھا اور اس گھمنڈ پر کہ میرا باپ صاحب مجسٹریٹ کی ناک کا بال ہے اپنا کام نہایت

بے پروائی سے کرتا تھا۔ سرسید نے اس کو بعلت غفلت و بے پروائی کے معطل کر دیا۔ ہر چند ضلع والوں نے سفارش کے لئے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر انھوں نے کچھ التفات نہ کیا، یہاں تک کہ دُہ دیوالی کی تعطیل میں دلی چلے گئے۔ مگر تعطیل سے واپس آکر کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اُس کے باپ کے بڑھاپے کا خیال کر کے اس کو پھر بحال کر دیا"۔

یہ واقعات اُس زمانے کے ہیں جبکہ سرسید یورپین حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدیدار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے اور جو وقعت اور اعتبار اُن کو ایامِ غدر کی خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہُوا اُس کا عشر عشیر بھی اُس وقت حاصل نہ تھا۔ مگر اُس حالت میں بھی انھوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنے فرائضِ منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ "منی صاحب جو مسٹر کرک کے مقدمات کی تحقیقات کے لئے اڈیشنل کمشنر ہو کر رہتک گئے تھے جب سرسید اُن سے ملے تو وہ اُن کی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے اور اُن کی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ ہم نے ہندوستانی افسروں میں ایسا صاف اور آزاد طبیعت کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سرسید کا منی صاحب سے اس قدر ربط بڑھ گیا تھا کہ آثار الصنادید کا انگریزی ترجمہ جو مسٹر رابرٹس جنٹ مجسٹریٹ دلی نے ناتمام چھوڑ دیا تھا اُس کے پورا کرنے کا وعدہ اُنھوں نے سرسید سے کیا چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں جج ہو کر گئے تو بہت سا ترجمہ اُنھوں نے کرایا"۔

نعیبو ڈور مارلیسن اُس آرٹکل میں جو اُنھوں نے سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پولٹکل ورکس پر لکھا تھا، ٹرکی اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت لکھتے ہیں کہ" اس مضمون پر سرسید نے کوئی مذبذب اور مشتبہ آواز نہیں نکالی۔ اُس نے بھی اور مسلمانوں کی طرح سلطانِ ٹرکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اس کے تنزل پر افسوس کیا ... ... وہ کہا کرتا تھا کہ عصائے سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے اور اُس کو یہ خوف تھا کہ مبادا مسلمان بھی پولٹکل بے وقعتی کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی حالت ہے۔ اسی لئے ٹرکی کے ہر ایک صدمے پر وہ ویسے ہی سچے دل سے رنج والم کرتا تھا جیسا کہ ہر مسلمان کرتا ہے۔ لیکن اس ہمدردی کی بدولت جو اُس کو اپنے معزز ہم مذہبوں کے ساتھ تھی، وہ قیصرِ ہند کی وفاداری اور احسان مندی سے بکسد و غش نہیں ہو سکا"۔

بے تعصبی اور انصاف

اس کے سوا سرسید نے اپنی تمام ملازمت کا زمانہ جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بسر کیا وہ فی الحقیقت ہمارے ملک میں ایک ایسی مثال ہے جو نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اُنھوں نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہر قوم اور ہر مذہب کے آدمی کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا اور کبھی ایک جج ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے آدمی پر ترجیح نہیں دی۔ بلکہ ایسی ترجیح دینے کو ایک نہایت کمینہ خصلت اور ننگِ انسانیت تصور کیا۔ اُن کی بے تعصبی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ غدر کے موقع پر جیسا کہ پہلے حصے میں مفصل بیان ہو چکا ہے، باوجودیکہ ضلع بجنور کے ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، وہاں کے تمام ہندو تعلقہ داروں نے خود سرکار سے کمال خوشی اور آرزو کے ساتھ یہ درخواست کی کہ جب تک ضلع میں امن نہ ہو سید احمد خاں اور ڈپٹی رحمت خاں کو ضلع سپرد کیا جائے اور انھیں کو ضلع کا حاکم بنایا جائے۔ تاریخِ سرکشیٔ بجنور میں سرسید نے جہاں ہندو چودھریوں کا حال لکھا ہے، اس سے اُن کی غایت درجے کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ باوجودیکہ ہندو چودھریوں اور اُن کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں، اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے پاک تھے۔ اس لئے اُن کو اس الزام سے بالکل بری کیا ہے اور واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو جو اُس وقت ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے مطلق کام نہیں لیا۔

جب سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہونے کو تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤسا نے بشمول یورپین حکام کے اُن کو ایک الوداعی ایڈریس دیا تھا جس میں اُن کی سرکاری ملکی اور قومی خدمات کے علاوہ خاص کر اُن کے بے لاگ انصاف اور بے تعصبانہ فیصلوں کی نہایت تعریف تھی۔ سرسید نے اُس کے جواب میں کہا کہ "اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلالحاظ کسی کے مذہب اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی تو اُس کے لحاظ سے میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھ کو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھ کو تفویض ہوا ہے اُس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو خوب سمجھتا رہا ہوں اور دُنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدردانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے، نہ کہ انسان کا۔ گو میں نے اپنی رائے میں غلطی کی ہو، مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔ باوجود اس کے مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوئی کہ جو کوششیں میں نے

سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں ان کی قدر شناسی میرے ہموطنوں نے کی ہے"۔

انھیں دنوں میں جب کہ سرسید بنارس سے رخصت ہونے والے تھے شہر کے ہندو اور مسلمان شرفا نے اُن کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک کمیٹی منعقد کی تھی جس کے پریذیڈنٹ راجہ شمبھو نرائن سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سرسید کی یادگار کے طور پر بنارس کالج میں طبیعات کی تحصیل کے لئے ایک سکالرشپ ہمیشہ کے واسطے "سید احمد خاں سکالرشپ" کے نام سے مقرر کی تھی جو اب تک برابر جاری ہے۔

انتظامِ قحط ضلع مراد آباد کا مفصل حال ہم پہلے حصّے میں لکھ چکے ہیں وہ واقعہ جو راجہ جیکشن داس صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور جس سے اُن کو سرسید کی بے تعصبی کا یقین ہوا تھا ملاحظے کے قابل ہے کہ رسالہ "لائل محمڈنز اوف انڈیا" کو دیکھ کر انھوں نے سرسید کو ایک سخت متعصب مسلمان خیال کیا تھا مگر مراد آباد کے محتاج خانے میں ہر مذہب اور ہر ملت کے ادنیٰ ادنیٰ کنگلوں کی خدمت گذاری میں ان کو دیوانہ وار سرگرم دیکھ کر وہ حیران اور اُن کی بے تعصبی کے دل سے قائل ہو گئے۔

وفاداری غدر کے زمانہ میں جس خلوص اور سچائی کے ساتھ گورنمنٹ کی وفاداری خیر خواہی اور یورپین مردوں عورتوں اور بچوں کی جان کی حفاظت اُن سے بن آئی اُس کو ہم مفصل پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں صرف سر جان اسٹریچی کے چند الفاظ نقل کئے جاتے ہیں جو انھوں نے ۱۸۸۰ء میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمڈن کالج کمیٹی کے ایڈریس کے جواب میں سرسید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے اُنھوں نے کہا کہ "کسی شخص نے اس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) دیا۔ میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے اُن کی جاں نثاری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے"۔ اسی اسپیچ میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ "شمال مغربی اضلاع میں اُن سے زیادہ کوئی روشن ضمیر جج نہیں ہوا" اور مسٹر شکسپیئر نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا تھا کہ "اگر صدر امین (یعنی سید احمد خاں) بیچ میں واسطہ نہ ہوتا تو ہماری جانیں نواب محمود خاں کی شکار ہو جاتیں" اسی رپورٹ میں اُنھوں نے سرسید کی دانشمندی، بے مثل ایمانداری اور سرگرمی پر شہادت دی تھی۔

بنارس کی سول جسٹس ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۸۶۹ء میں صاحب جج بنارس نے اُن کی نسبت

لکھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں نہایت باقاعدہ اور اُن کی طرف متوجہ رہنے والا ہے اور اُس کے فیصلے نہایت احتیاط اور غور سے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ مقدمے کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب پر اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالتِ اپیل کے فیصلے کے واسطے کچھ باقی نہیں رہتا۔ اُن کے اس بہت بڑے تجربے سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں حاصل ہے، میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"

ہائی کورٹ کے ججوں نے سرسید کی درخواستِ پنشن گورنمنٹ میں بھیجتے وقت حسبِ ذیل رپورٹ کی تھی۔ "سید احمد خاں کے اوصاف اور قابلیت بحیثیت ایک پبلک سرونٹ کے ہز آنر پر بخوبی روشن ہیں مگر یہ عدالت بوجہ بالادست عدالت ہونے کے جس کے سید احمد خاں ماتحت رہے ہیں، اُن کی ذہانت، محنت، قابلیت اور ہوشیاری کی بلند اور بے داغ شہرت کو جو انھوں نے اپنے طول طویل زمانۂ ملازمت میں تمام جماعتوں کے درمیان حاصل کی ہے بطور شہادت کے درج کر دینا چاہتی ہے اور نیز اُس نقصان پر افسوس ظاہر کرنا چاہتی ہے جو پبلک سروس کو جو اُنھوں نے اس قدر عزت اور شرافت کے ساتھ انجام دی ہے، اُن کی کنارہ کشی سے پہنچے گا۔"

نواب لفٹنٹ گورنر کی طرف سے جو اِس رپورٹ کا جواب موصول ہُوا وہ یہ ہے "سید احمد خاں کا استعفا منظور کرنے میں ہز آنر لفٹننٹ گورنر نے مجھ کو ہدایت کی ہے کہ اُن کی ہائی اپنین سید احمد خاں کی اُس قابلیت اور ہوشیاری کی نسبت ظاہر کروں جو پبلک سروس میں اُن کے امتیاز کا باعث رہی ہے اور نیز اُن کی اُس روشن، مہذب اور بے غرضانہ محنت کی نسبت بھی جو انھوں نے اپنی پرائیوٹ لائف میں اپنے ہموطنوں کے فائدے کے واسطے کی ہے۔"

استحقاق اس موقع پر ہائی کورٹ نے چاہا تھا کہ سرسید کی خدمات کی نسبت ایک خاص شکریہ گورنمنٹ گزٹ میں مشتہر کرایا جائے مگر چونکہ یہ ایک غیر معمولی طریقہ تھا اس لیے عمل میں نہیں آنے پایا لیکن پایونیر نے غالباً رجسٹرار ہائی کورٹ کے اشارے سے اس شکریہ کے الفاظ چھاپ کر مشتہر کر دیے تھے۔

کتاب "پرنسز آف دی انڈین امپائر"، جس میں سرسید کو ارکانِ سلطنتِ ہندوستان میں سے

ایک رکن شمار کیا گیا ہے، اُن کی ممبریِ کونسل کے زمانے کی طرف اشارہ کر کے یہ لکھا ہے کہ "ان طریقوں میں سے جو لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو عزت اور ذمہ داری کے مناصب پر ترقی دینے کے لئے اختیار کئے تھے کوئی طریقہ از روئے استحقاق کے اس قدر ہر دلعزیز نہیں ہوا جیسا کہ شائستہ مسلمانوں کے اس واجب التعظیم لیڈر (یعنی سید احمد خاں) کا لیجس لیٹو کونسل میں مقرر کرنا ہوا ہے۔ اس اعزاز کو ہندو اور مسلمانوں نے مساوی طور پر سید احمد خاں کی دیانتداری، بے غرضانہ اور شریفانہ برتاؤ اور اُن کی قابلیتوں کا صلہ تسلیم کیا ہے۔"

پولٹکل خدمات

مسٹر ایچ جی کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار "ہوم ورڈ میل" میں سرسید کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سید احمد خاں جس سے میں نے ۱۸۸۳ء میں جب کہ وہ لیجس لیٹو کونسل کا ممبر تھا واقفیت حاصل کی تھی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا ایک انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی، خاص کر مشکل اور خطرے کے وقت میں خواہش کرے گا۔ وہ ایک خاندانی، تعلیم یافتہ، لائق، وفادار اور پوری اُمرِ جبل اور مستقل طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ تاجِ برطانیہ کا ایک خیر خواہ اور دوست سبجکٹ ہے، مگر بایں ہمہ وہ انگریزی گورنمنٹ کے نقصوں سے بخوبی واقف ہے۔"

مسٹر تھیوڈور بک نے جو ۲۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کی وفات پر اسپیچ دی تھی اُس میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "دس برس کا عرصہ ہوا کہ سر آکلینڈ کالون نے جب کہ وہ لفٹننٹ گورنر تھے مجھ سے یہ کہا تھا کہ "کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی، برٹش گورنمنٹ کے استحکام سلطنتِ ہندوستان کے بارے میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔"

رسالہ اسبابِ بغاوت اور اُس پر لوگوں کی رائیں

رسالہ اسبابِ بغاوت جس کا لکھنا ایک حیثیت سے ملک اور قوم کی بے نظیر خدمت اور دوسری حیثیت سے تاجِ برطانیہ کی حقیقی خیر خواہی کا کام

تھا، سر سیّد کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہے جن سے وہ ارکانِ سلطنت میں شمار کئے جانے کے مستحق ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں جو ولایت سے مولوی سیّد مہدی علی خاں کو بھیجا ہے لکھتے ہیں کہ "میں انڈیا آفس میں صاحب سکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسباب بغاوت" مع تمام و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اُسے دیکھ کر میرا بہت دل خوش ہُوا۔ جو کچھ رائیں اُس کی بدولت قرار پائیں اُن کا بیان بے فائدہ ہے۔ اہلِ ہند نا قدر دان، دوست کُش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں۔ مگر میں خوش ہُوں کہ میرے ہموطنوں کی بھلائی ہوئی"۔

اسی حال کو اُنھوں نے زبانی مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ "ولایت میں سر جان کے فارن سیکرٹری وزیر ہند سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو اُن کی میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ "تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسبابِ بغاوت اصل اور اُس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اُس کے ساتھ وہ تمام مباحثات ہیں جو اُس پر پارلیمنٹ میں ہوئے مگر چونکہ وہ مباحثے کانفیڈنشل تھے اس لئے وہ نہ چھپے اور نہ ولایت کے کسی اخبار میں تذکرہ ہُوا"۔

سر آکلنڈ کالون کی رائے

اسی کتاب کی نسبت ۱۸۸۸ء میں سر آکلنڈ کالون لفٹنٹ گورنر نے ٹرسٹیاں محمڈن کالج کے ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے کہ "جو واقعات سب سے پہلے مجھ کو اُس وقت پیش آئے جب کہ میں اوّل مرتبہ ہندوستان میں آیا تھا، منجملہ اُن کے ایک یہ بات تھی کہ میرے دوست سر سیّد احمد خاں نے ایک ایسے معاملے میں مجھ سے اعانت کی خواہش کی جو اُس وقت اُنھوں نے شروع کیا تھا اور جس کی طرف اُن کی دلی توجہ مائل تھی۔ انھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی کہ میں اُن کو ہندوستانی زبان سے انگریزی زبان میں اُس رسالے کا ترجمہ کرنے میں مدد دوں جو اُنھوں نے اُن افسوسناک واقعات کے اسباب کی نسبت تحریر کیا تھا، جو ۱۸۵۷ء میں ظہور میں آئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے اُس رسالے کو دیکھا ہوگا انھوں نے مجھ سے اس امداد کی درخواست کرکے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا جو ہندوستان میں میرے دورِ ملازمت کے خاتمہ تک قائم رہے گا کیونکہ اُنھوں نے اُس رسالے میں خاص کر بعض ایسے خیالات پہ زور دیا تھا جن کی پوری قوّت کو میں اُس کے بعد اپنے تجربے کی رُو سے بخوبی سمجھ سکا ہوں۔

سرسید احمد خاں نے اُس میں اشارہ کیا تھا کہ جو بات انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لئے ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالات کو بخوبی سمجھیں۔ اُنھوں نے اِس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر اُن واقعات کی بنیاد جن پر وہ بحث کر رہے تھے، بجائے ناراضی کے غلط فہمی تھی پس اگر انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو اُن کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و مستحکم ہو جائیں گے۔" اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انھیں خیالات کی دُوسری صورت علی گڑھ کالج ہے۔"

مسٹر مارلیسن کی رائے

مسٹر تھیوڈور مارلیسن نے جو سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پولٹکل ورکس پر ایک آرٹکل لکھا تھا اُس میں وہ اسی رسالہ اسبابِ بغاوت کی نسبت لکھتے ہیں کہ "انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ فتح کے بعد اہندوستانیوں سے دل کھول کر انتقام لیں اور اُن کے غصّے کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرّک ہوئے ہیں۔ اُس وحشیانہ حالت میں جب کہ شدید تر خیالات پھیلنے کا اِحتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی، منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ۱۸۵۸ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے، باوجود اس کے سرسید کے دلائل کے عام منشا کی سچائی اسی وقت سے تسلیم کر لی گئی ہے اور جو لوگ سرسید کے اُس برتاؤ پر جو اُس نے نیشنل کانگرس کے ساتھ کیا، الزام لگاتے ہیں اُن کے لئے اس بات پر غور کرنا مفید ہوگا کہ اُس نے اتنی مدت پہلے جتنی کہ ۱۸۵۸ء سے اب تک گذری ہے، گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لیجس لیٹو کونسل میں دیسیوں کو داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے"۔

ہوم نیوز کی رائے

انگلستان کے مشہور اخبار "ہوم نیوز" نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ "سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تحریر کئے تھے اُن میں سے بعض نہایت قیمتی اور عمل درآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکّامِ ہندوستان نے کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیں۔ اُس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اُس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ اُن اسباب کے

بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جا سکتا ہے اور جن کی صحت تجربے سے پُورے طور پر ثابت ہو چکی ہے "+

برمنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے

برمنگھم ڈیلی گزٹ نے سرسید کی اسی کتاب کا کسی قدر خلاصہ لکھ کر یہ تحریر کیا تھا کہ "ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی اور ہندوستانی اور یورپین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریذیڈنسیوں کی لیجس لیٹو کونسلوں میں شریک کئے گئے "۔

سینٹ جیمس بجٹ کی رائے

اخبار "سینٹ جیمس بجٹ" نے اسی کتاب پر یہ ریمارک کیا تھا کہ "سید احمد خاں کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اس کے ملک کے واسطے سراسر مفید ہے، وہ اُس کے اُن خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کر دیتی ہے جو اُس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب "اسباب بغاوت" میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔ خود سید احمد خاں دو دفعہ وائسرائے کی کونسل میں لارڈ لٹن اور لارڈ رپن کے عہد میں ممبر رہا ہے اور اُس کی وہ خواہش جو ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی پوری ہوئی ہے لیکن ابھی اُس کی اِس شکایت میں زور ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں طرفداری اور غلط فہمی ہونے کے سبب ہنوز ایک دوسرے سے جدا ہیں اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق ظاہر نہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک خیالی شکایت ہے لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم عملی لوگ ہیں، اِس لئے ہم کو خیالی شکایتوں پر توجہ نہ کرنی چاہیے، تو بیشک ہم اس غلطی

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسالہ اسبابِ بغاوت کے دیکھنے کے بعد یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ کیونکہ ملکہ معظمہ کا اشتہار جس میں اس تبدیلی کا اعلان کیا گیا تھا، سرسید کی کتاب چھپنے سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ پس اس سے یہ مراد ہے کہ جس بات کی آرزو سرسید نے اس کتاب میں ظاہر کی تھی وہ اُن کی کتاب پیش ہونے سے پہلے ہی پوری کر دی گئی - ۱۲ -

ہیں گھبر جائیں گے جس کی سید احمد خاں شکایت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے، بہ نسبت ان شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں"

کرنل گریہم کی رائے

کرنل گریہم جنھوں نے سرسید کی لائف لکھی ہے، وہ اس کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ہم میں سے بعضے لوگ سید احمد کی "اسبابِ بغاوت" سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہماری خیر خواہ اور وفادار مسلمان شرفا میں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے، فی نفسہٖ بدرجۂ غایت مفید ہے کہ اُس سے ہندوستانی طرزِ خیالات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے"

رسالہ اسباب بغاوت کے بعض نتائج

اگرچہ کرنل موصوف کے بیان کے موافق ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالے کے مضامین بالکل تسلیم نہ کرتے ہوں یا اُس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکورہ بالا انگریزی اخباروں میں تصریح کی گئی ہے، سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل درآمد اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا۔ مثلاً سب سے بڑی چیز جس کو سرسید نے کتابِ مذکور میں بغاوت کا اصلی سبب قرار دیا تھا، وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا۔ یعنی ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے گئے، چنانچہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاسِ کونسل میں ہم پہلی ہی بار مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ، راجہ دیو نرائن سنگھ رئیس بنارس اور راجہ ڈنکر راؤ دیوانِ ریاستِ گوالیار کو شریک پاتے ہیں۔ اگرچہ اُس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا، مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا جواب بار آور ہونے لگا ہے اور ان کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہیگا۔

یا مثلاً کتابِ مذکورہ میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتابِ مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پنڈت شمبو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج

مقرر ہوئے اور اُس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ملنے لگے۔

پولٹکل خدمات پر پال مال گزٹ کی رائے

لندن کے نامور اخبار پال مال گزٹ میں سرسید کی وفات پر ان کی پولٹکل خدمات کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "سرکارِ انگریزی اور باشندگانِ ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر کہ سرسید احمد خاں کی لائف پر۔ وہ ابتدا سے آخر دم تک سرکارِ انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں اُن کی قدر وقیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔"

یہاں تک ہم نے سرسید کی سرکاری خدمات اور جو وقعت اور اعتبار اُنہوں نے اُن خدمات کی بدولت ایک ایسی قوم کی حکومت میں حاصل کیا جس کی نظر میں ہندوستانیوں کا جچنا شاید محال سے کچھ ہی کم ہوگا، اُس کو بطورِ مشتے نمونہ از خروارے بیان کر دیا ہے۔ اب ہم اُن کی ملکی اور قومی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔

اگرچہ پہلے حصے میں سرسید کے ہر قسم کے واقعاتِ زندگی کے ضمن میں اُن کی ملکی و قومی خدمات کا ذکر اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے، مگر ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اُن کو ایک سلسلے میں نہایت اختصار کے ساتھ منتظم کر کے ناظرین کو خاص طور پر اُن کی طرف متوجہ کیا جائے اور اُن کے متعلق جو امور پہلے حصہ میں بیان نہیں ہو سکے، یا جو نتائج اُن خدمات پر مترتب ہوئے اُن کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر دیا جائے۔

مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم اِس کتاب میں ایک ایسے شخص کی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں جس کے اختیار میں اپنی طاقت کے موافق کوشش و تدبیر کرنے کے سوا کچھ نہ تھا، نہ اس کے ہاتھ میں سلطنت اور حکومت کی باگ تھی کہ اپنے ملک اور قوم کے واسطے جو چاہے سو کر گذرے اور نہ ملک اور قوم کے دل اس کے قبضے میں تھے کہ جو نیک صلاح اُن کو بتائے اس سے کسی کو اختلاف یا انکار نہ ہو۔ پس ہم کو سرسید کی لائف میں بہ نسبت اِس کے کہ اُس کی کوششوں سے ملک اور

قوم کو کیا کیا فائدے پہنچے، زیادہ تر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُس نے اُن کے فائدے کے واسطے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسی لئے ہم نے سرسید کی کامیاب اور بارور کوششوں کے ساتھ اُن کاموں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہیں ہُوا یا جو بسبب نامساعدتِ وقت کے ادھورے رہ گئے۔ تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اُس شخص کی ساری عمر کس دُھن اور کس ادھیڑ بُن میں گذری ہے۔

ملکی و قومی خدمات

ہمدردی ہمدردی کا اصل مادہ ظاہرا انسان اور تمام حیوانات میں یکساں پیدا کیا گیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ دیگر حیوانات کی ہمدردی اُس حد سے جو اُن کی فطرت میں رکھی گئی ہے، کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ برخلاف انسان کے کہ کبھی اُس کی ہمدردی ایک چھوٹے سے حلقے میں محدود رہتی ہے اور کبھی بیرونی اسباب سے وہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اس کا تعلق اوّل گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے، پھر جس قدر انسان میں بیرونی اسباب سے متاثر ہونے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے اُسی قدر وہ تعلق بڑھتا جاتا ہے۔ سرسید کے واقعاتِ زندگی سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اُن میں ہمدردی کا مادہ اور بیرونی اسباب سے منفعل ہونے کی قابلیت معمولی آدمیوں سے بمراتب بڑھ کر پیدا کی گئی تھی۔ محبّت جو کہ ہمدردی کی ماں ہے اُن کی طبیعت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔

خاندان کی محبّت محبّت کی پہلی سیڑھی خاندان کی محبّت ہے، سو اس کی شہادتیں اس کتاب میں جا بجا ملیں گی۔ خاندان کے بعد وطن کی محبّت ہے۔ سو دلی کے ساتھ جو دلبستگی اُن کو تھی اور جو آخر کو حسرت کے ساتھ بدل گئی تھی، اُس کا ثبوت بھی اِس کتاب میں متعدد مقامات پر ملے گا۔

وطن کی محبّت اسی وطن کی محبّت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اُس اُجڑے دیار کے پُرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اُٹھانے

پر مجبور کیا اور آئینِ اکبری کی تصحیح میں جس سے دلّی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دھندلی تصویر کا اُجالنا مقصود تھا، اُن سے فوق العادت محنت کرائی۔ لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسیّد کی کوششیں انھیں کاموں پر ختم ہو جاتیں تو شاید اُن کو ایک محبِّ وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا، مگر جب اُن کی آئندہ مسلسل خدمات پر جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا، نظر کی جاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے یہ معمولی کام اُسی طلائی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں جو زمانۂ مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات سے ترتیب پانے والی تھی۔

عملی قوت

پہلے حصّے میں جو سرسیّد کے ہر قسم کے کام تاریخ وار بیان کئے گئے ہیں اُن پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس شخص میں جس درجے کی عملی قوت پیدا کی گئی تھی وہ اُن کاموں پر بس کرنے والی نہ تھی جو وہ ابتدائے حال میں وقتاً فوقتاً سرانجام کرتے رہے، باوجود یکہ عدالت کا کام جو اُن کو سپرد تھا اور جس کو وہ کمال تندہی اور نہایت غور و فکر سے انجام دیتے تھے، فی نفسہٖ ایک تھکا دینے والا کام تھا، باایں ہمہ وہ بعینہٖ ایک مستسقی کی طرح جس کی پیاس چلّو دو چلّو پانی سے نہیں بجھتی اور وہ کنوئیں یا دریا کی طرف دوڑتا ہے، ہمیشہ کسی بڑے کام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جیسا کہ پہلے حصّے میں بیان ہو چکا ہے، انھوں نے مختلف قسم کے بہت سے کام سرانجام کئے مگر اُن کی پیاس کسی طرح نہ بجھی۔ آخر وہ وقت آ پہنچا۔

خارجی اسباب سے متاثر ہونا

جب کہ اُن کی طبیعت کے اصلی جوہر ظاہر ہونے والے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے جیسا کہ سرسیّد کے کسی دوست کا قول ہے، اُن کے دل پر وہ کام کیا جو ٹوتھر کے دل پر بجلی کے گرنے نے کیا تھا۔ جس طرح سورج کی گرمی سے پانی کا ایک خاص حصّہ اپنے تبخیرِ طبعی سے بلند ہو جاتا ہے اسی طرح غدر کی آنچ نے سرسیّد کو اپنے طبقے کی سطح سے بالاتر کر دیا۔ دلی، مرادآباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی اور بربادی دیکھ کر جس جوش کے ساتھ ہمدردی کی لہر اُن کے دل میں اُٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی۔ اُس وقت اُن کا حال بعینہٖ اُس شخص کا سا تھا جس کے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک حِصّہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کو بچانے کے لئے دیوانہ وار اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہو۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی روندن میں آ چکے اور جو خاندان بگڑ چکے اُن کو مدد پہنچانی تو اب امکان سے خارج

ہے مگر جو باقی ہیں اور جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں، اُن کو کس طرح غدر کے آئندہ خوفناک نتیجوں سے بچایا جائے؟ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے بدگمان ہوگئی ہے، مسلمان گورنمنٹ کے شدید انتقام اور سخت سزاؤں سے جو غدر کے بعد ظہور میں آئیں اُس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہوگئے ہیں۔ جن غلط فہمیوں کے ہندوستانی شکار ہوئے ہیں ان کی سوتیں بدستور جاری ہیں، جس جہالت اور تعصب نے یہاں تک نوبت پہنچائی وہ اسی طرح ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے سر پر سوار ہے، حکمران قوم مسلمانوں کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے خلاف آرٹکل لکھے جاتے ہیں جن سے انگریزوں کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے۔ کچہریاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے ہیں، فوج میں اُن کی بھرتی موقوف ہوگئی ہے، وہ درباروں میں کم بلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کرکے اوّل اوّل تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جاکر بود وباش کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا، مگر آخرکار اُن کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ اُس وقت جو کیفیت ان کے دل پر طاری تھی، اُس کا کسی قدر اندازہ اُس اُردو مناجات کے پُر درد الفاظ سے ہوسکتا ہے جو ملکۂ معظّمہ کا اشتہار معافی شائع ہونے کے وقت انھوں نے بعد ادائے دوگانۂ شکر الٰہی کے پندرہ ہزار مسلمانوں کے مجمع میں بمقام مرادآباد پڑھی تھی اور جس کو ہم پہلے حصّہ میں بجنسہٖ نقل کرچکے ہیں۔

الغرض اس مہم کے سر کرنے کے لئے جب کبھی جو تدبیر ان کے خیال میں گذری اُس کو انھوں نے کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں اُن کو یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں مغربی طریقۂ تعلیم عام نہ ہوگا اُس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ میں جو منافرت چلی آتی ہے، وہ رفع نہ ہوگی۔

مدرسۂ مرادآباد

چنانچہ مرادآباد میں آتے ہی اُنھوں نے اوّل ایک اسکول جس کو تعلیم کے میدان میں اُن کا پہلا قدم سمجھنا چاہیئے قائم کیا۔ پھر اُنھیں دنوں میں جیسا کہ پہلے حصّے میں بیان ہوچکا ہے ایک رسالہ جس میں ورنیکلر اسکولوں پر سخت اعتراض کئے تھے

سرکاری طریقۂ تعلیم پر اعتراض

اور گورنمنٹ کو نہایت شدّومد کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے ساتھ فی الواقع بھلائی کرنی چاہتی ہے تو اُن کو انگریزی زبان میں تعلیم دے، اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کر شائع کی۔

بغاوت کے اسباب سے گورنمنٹ کو مطلع کرنا

رسالۂ اسبابِ بغاوت کے ذریعہ سے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کو اُن تمام شکایتوں سے جو ازراہِ غلط فہمی یا واجبی طور پر گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں متمکن تھیں اور اُن کے ظاہر ہونے کی کوئی سبیل نہ تھی، نہایت دلیری اور صفائی کے ساتھ ظاہر کیا۔

انتظامِ قحط اور یتیموں کی حفاظت

اسی ہمدردی کے جوش میں جو اُس وقت اُن کے دل میں موجزن تھا اُنھوں نے صاحب کلکٹر مراد آباد سے خود درخواست کر کے قحط کا انتظام اپنے ذمّہ لیا اور جہاں تک اُن کی دسترس تھی

لہ اسی رسالے میں جہاں انھوں نے ہندوستانیوں کے کونسل میں شریک نہ ہونے کی شکایت کی ہے وہاں اس اعتراض کا جواب کہ ہندوستانی جو جاہل اور بے تربیت تھے کونسل میں کیونکر شریک کئے جاسکتے تھے اس طرح دیا ہے کہ کونسل میں رعایا کے شریک کرنے کا طریقہ ہم نے علیحدہ بیان کیا ہے اس کو ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ پھر جو خط کہ سرسید نے ولایت سے سیّد مہدی علی خاں کو لکھے ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت ہی میں طریقۂ انتظامِ سلطنتِ ہندوستان پر ایک مبسوط کتاب لکھنی چاہتے تھے۔ مگر جب راقم نے بذریعہ تحریر کے اُن سے اس کتاب کا حال دریافت کیا تو انھوں نے ایک لمبی تحریر بھیجی تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس کتاب کے لکھتے وقت یہ ارادہ تھا کہ انڈیا کونسل کے ممبروں سے بھی ہر ایک پوائنٹ پر اس باب میں گفتگو کی جائے مگر کونسل مذکور کے تمام ممبر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور میں اردو میں، نہ وہ میری بات سمجھتے تھے اور نہ میں اُن کی، اس لئے کافی معلومات ملنے کا کوئی سامان میسر نہ آیا۔ پھر ہر ایک ممبر سے گفتگو کرنے کے لئے کرایہ کی گاڑی پر جانا پڑتا تھا اور جب تک گفتگو ہو گاڑی کو باہر کھڑا رکھنا پڑتا تھا اور ان اخراجات کا تحمل ناممکن تھا اسی لئے جو چند یادداشتیں اور مسودے لکھے تھے وہ سب معدوم کر دیئے گئے۔ ۱۲۔

ہندو مسلمانوں کے یتیم بچوں کو مشنریوں کے چنگل سے بچانے میں کوشش کی۔

رسائل لائل محمڈنز آف انڈیا پھر اُسی زمانے میں جب کہ مسلمانوں کے برخلاف انگریزی اخباروں میں زیادہ بوچھاڑ ہونے لگی تو اُنھوں نے ایک سہ ماہی رسالہ موسوم بہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" اردو اور انگریزی میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے نکالنا شروع کیا۔

شرحِ لفظِ نصاریٰ اسی زمانے میں اُنھوں نے سُنا کہ ایک مسلمان کو اس جرم میں کہ اُس نے انگریزوں کو لفظِ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا سخت سزا دی گئی ہے۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے ایک رسالہ اس لفظ کی تحقیق پر لکھ کر اردو اور انگریزی میں شائع کیا جس میں نہایت خوبی سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان انگریزوں کو ازراہِ تحقیر کے نصاریٰ نہیں کہتے بلکہ قرآن کی رُو سے اُن کے ہاں کوئی لقب انگریزوں کے لئے اس سے زیادہ معزز نہیں ہے۔

تفسیرِ بائیبل مراد آباد ہی میں سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو غلط فہمیاں عیسائی ملکوں میں اسلام اور بانیٔ اسلام کی نسبت ابتدائے شیوعِ اسلام سے آج تک چلی آتی ہیں اور جو تیرہ سو برس تک پُختے پُختے تمام دنیا کے عیسائیوں کی طرح انگریزوں کے نزدیک بھی مثلِ علومِ متعارفہ کے مسلّم الثبوت ٹھیر گئی ہیں جب تک وہ رفع نہ ہوں گی (اور اُن کا رفع ہونا ہنسی کھیل نہیں ہے) اُس وقت تک مسلمان ہمیشہ انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے رہیں گے اور جو تدبیر مسلمانوں کی صفائی کے لئے کی جائے گی وہ اُس دوا کی طرح جو بغیر ازالۂ سبب کے کسی مرض کے علاج میں استعمال کی جائے بے سود ثابت ہو گی۔ اگرچہ یہ بہت بڑا کام تھا جس کا بوجھ سید احمد جیسی حیثیت کے آدمی سے اٹھانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہوتا ہے جوں ہی سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا معاً سرکار سے اُن کی مدتوں کی چڑھی ہوئی تنخواہ جو غدر کے زمانے میں بند رہی تھی اور لُٹے ہوئے اسباب کا معاوضہ اُن کو مل گیا۔ اُنھوں نے فوراً جیسا کہ پہلے حصّہ میں مفصل مذکور ہے اس عظیم الشان کام کی بنیاد مراد آباد ہی میں ڈال دی اور بائیبل کی تفسیر لکھنی اور ساتھ کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی۔ جس بنیاد پر اور جس غرض سے سرسید نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جو اثر اُس کے شائع ہونے سے عیسائیوں کے دل پر ہوا اس کا ذکر مجملاً ہم پہلے حصہ میں کر چکے

ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کام خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید اور نتیجہ خیز تھا۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ مسلمانوں میں اُس کی کچھ قدر نہ ہوئی اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ سرسید کی توجہ اُس سے مفید تر اور اعلیٰ تر کاموں کی طرف منعطف ہوگئی اس تفسیر کی صرف دو جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔

سائنٹفک سوسائٹی

غازی پور پہنچ کر انھوں نے دوسری طرح ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول بڑھانے اور اُس منافرت کے دُور کرنے کی جو ۵۷ء کی بغاوت نے حاکم و محکوم میں پیدا کر دی تھی، بنیاد ڈالی۔ اس سے ہماری مراد سائنٹفک سوسائٹی کا قائم کرنا ہے جو اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے۔ علمی مضامین پر سوسائٹی میں لکچر دئے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصولِ حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کئے جائیں جو اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔ ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کئے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

سوسائٹی کے نتائج

قطعِ نظر اُن اہم مقاصد کے جن کے لئے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اُس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی۔

انجمنوں کا قائم ہونا

پھر ۲۵ برس کے عرصے میں جس قدر سوسائٹیاں، انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اُس کے بعد اور اُسی کی رِیس سے قائم ہوئیں اور اسی سوسائٹی کے اخبار نے تمام دیسی اخباروں کا رنگ بالکل بدل دیا۔ اُن میں

اخباروں کی اصلاح

بجائے اس کے کہ کچھ سچی اور اکثر بے سروپا بعید از قیاس خبریں درج ہوتی تھیں، پولٹکل سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین بھی خبروں کے ساتھ چھپنے لگے اور بجائے اس کے کہ وہ محض دلبستیوں کے دِل بہلانے کے اوزار تھے،

اُن کو یہ دن نصیب ہُوا کہ گورنمنٹ اُن کی آواز پر کان لگانے لگی۔

اُردو لٹریچر کی ترقی

پھر اسی سوسائٹی کی درخواست پر جو کہ اُس نے ایڈریس مورخہ ۹ مئی ۱۸۶۸ء میں بحضور سرولیم میور لفٹننٹ گورنر بمقام علی گڈھ پیش کی تھی ہزآنر نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف یا تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی اُن میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۶ر اگست ۱۸۶۸ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ شمال مغرب نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصے میں ملک کو اِس سرے سے اُس سرے تک دیسی زبانوں کی تصنیفات سے مالامال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گذر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اُس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا، مگر اُس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ اُنھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حقِ تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اردو لٹریچر صرف اسی تحریک کی بدولت جو کہ اشتہارِ مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصے میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

اسی ایڈریس میں جو کہ سر ولیم میور کی حضور میں پیش کیا گیا تھا یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ منجملہ اُن کتابوں کے جو اُردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے، دو کتابیں سید احمد خاں لائق آنریری سکرٹری تیار کر رہے ہیں، ایک اردو لٹریچر کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں، نام، اُن کے مصنف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرزِ بیان اور مختلف مقامات سے اُس کی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہوگا۔ دوسری اردو ڈکشنری۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کی شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی لیکن اُردو ڈکشنری جو سرسید نے لکھنی شروع کی تھی اُس کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپا ہُوا اور اس پر بعض یورپین فاضلوں کے عمدہ ریمارکس موجود ہیں۔ اگرچہ سرسیّد نے اِن دونوں کاموں میں سے کوئی کام پورا نہیں کیا لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ملک اور قوم کی تمام مقدم ضرورتیں جن میں سے بعضی اب تک بھی لوگوں کو محسوس نہیں ہوئیں، اس شخص نے اب سے تیس بلکہ چالیس برس پہلے بخوبی محسوس کر لی تھیں۔

یہاں تک کہ عیب کوئی اُن ضرورتوں کا پورا کرنے والا نظر نہ آتا تھا تو باوجود یکہ سرد ہزار سو دا ہونے کے خود ہی اُس کام کے سرانجام کرنے کو کھڑا ہو جاتا تھا۔

سوسائٹی کی ترقی میں کوشش

مگر درحقیقت یہ سب سوسائٹی کے ضمنی نتائج تھے اور جس بڑے مقصد کے لئے وہ قائم کی گئی تھی۔ اُس کا گھر ابھی بہت دُور تھا اور محض سوسائٹی اُس درد کی دوا نہیں ہو سکتی تھی باایں ہمہ سرسید نے سوسائٹی کے ترقی دینے میں کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سالانہ چندہ اور قیمت اخبار کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔ ضلع کے رئیسوں کو اُس کی امداد پر آمادہ کیا۔ گورنمنٹ کو اُس کی طرف توجہ دلائی، خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی مدد پہنچائی، اُس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی۔ اُس کی مستقل آمدنی کے لئے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں۔ لائق لائق آدمی ترجمہ کے لئے مقرر کئے، قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور، علی گڑھ، بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے، یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دُھن برابر لگی رہی۔ چنانچہ ولائت جاتے ہوئے جو خط کہ اُنھوں نے مہدی علی خاں کو عدن سے بھیجا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ "مجھ کو علاوہ مفارقتِ احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹیفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریںگے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کو دینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں"۔

سوسائٹی قائم کرنے کے بعد جب تک کہ سرسید اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے جو کام ملک اور قوم کی بھلائی کا اُن کو معلوم ہوا اُسی ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ جو اُن کی جبلّت میں تھا اُس کو سرانجام کیا۔

غازی پور کا مدرسہ

۱۸۶۴ء میں انھوں نے غازی پور میں محض قومی چندے سے بڑی دھوم دھام کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا جس کی اُٹھان

مدرسۃ العلوم کی ابتدا سے کچھ ہی کم سمجھنی چاہیئے اور جو اب تک وکٹوریہ اسکول کے نام سے غازیپور میں جاری ہے۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

پھر ۱۸۶۶ء میں اُنھوں نے علی گڑھ آکر "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" جس نے اب "نیشنل کانگرس" کی صورت میں جنم لیا ہے قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے دردِ دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لئے براہِ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ جس مقصد کے لئے یہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی وہ اس سبب سے کہ ملک میں اُس کو چلانے کی قابلیت نہ تھی اور سرسید جو اُس کے بانی مبانی تھے وہ یک انار و صد بیمار کے مصداق تھے حاصل نہ ہوا۔ مگر اُس کے ذریعے سے اکثر مفید تحریکیں کی گئیں اور اُن میں اکثر میں کامیابی ہوئی، جیسے مسافرانِ ریل کی تکلیفات کی شکایت، کتابوں کے محصول میں تخفیف کی درخواست، ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کی سلسلہ جنبانی وغیرہ۔

ہومیوپیتھک کی تائید

پھر ۱۸۶۷ء میں بمقام بنارس اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہومیوپیتھک سے زیادہ کوئی طریقہ علاج کا ملک کے لئے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا، اُس کی حمایت اور ترویج و اشاعت میں کوشش کی، اُس کی تائید کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جس کے وہ خود سکرٹری تھے، ایک ہومیوپیتھک ہوسپٹل کھولا، اس طریقۂ علاج کی ہسٹری اور اُس کے اُصول پر لکچر دیئے اور ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا۔

تعلیمی کمیٹیاں

پھر ۱۸۶۸ء میں سرسید ہی کی سلسلہ جنبانی سے تمام اضلاعِ شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن میں ہر ضلع کے زمینداروں کو تعلیم کے انتظام، نگرانی اور اخراجات پر بحث اور گفتگو کرنے کا اختیار دیا گیا۔

اُردو زبان کی حمایت

پھر بنارس ہی میں اُنھوں نے اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں جو بظاہر خاص مسلمانوں کی طرفداری کا، مگر درحقیقت تمام شمالی ہندوستان کی بھلائی کا کام تھا بے انتہا کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے دفاترِ سرکاری میں اُردو زبان اور فارسی خط بحال و برقرار رکھا گیا اور ہزارہا ہندو مسلمان جو بذریعہ اُردو تحریر اور فارسی

خط کے سرکاری نوکری کرتے تھے یا نوکری کے امیدوار تھے اور جن کو بڈھے طوطے کی طرح اب بھاشا زبان اور ناگری حرفوں کا سیکھنا اور اُس میں امتحان دینا ایسا ہی مشکل تھا جیسا نیچر کا بدلنا، اِس ناگہانی طوفان کے ریلے سے بچ گئے اور اُردو زبان جس نے کئی صدیوں کی ترقی کے بعد ایک مستقل زبان کا درجہ حاصل کیا تھا اور جو ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر ٹکڑے میں برابر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ اس صدمے سے جو کورٹ کی زبان اور خط کے بدلنے سے اُس کو پہنچنے والا تھا، محفوظ رہی۔

مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول پیدا کرنا

اس کے سوا بنارس ہی میں اُنھوں نے احکامِ طعامِ اہلِ کتاب پر ایک رسالہ اس غرض سے لکھا کہ مسلمان جن کا مذہب انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے سے مانع نہیں ہے، بلکہ محض رسم و رواج کی قید نے اُن کو آج تک انگریزوں سے دُور دُور رکھا ہے، اُن کی یہ جھجک اور رکاوٹ جاتی رہے، اُن کو حکمران قوم کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملے، ہر ایک قوم دوسری قوم کے اصلی خیالات سے بلا واسطہ اطلاع حاصل کرے اور بدگمانی اور خوف صفائی اور اطمینان کے ساتھ بدل جائے۔ اگرچہ اُس وقت اِس رسالے پر بہت لے دے ہوئی اور سرسید کو اُس کے لکھنے پر جیسی کہ امید تھی سب کچھ کہا گیا مگر آخر کار اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایک جمِ غفیر نے جن کی انگریزوں تک رسائی اور اُن کے ساتھ ربط ضبط تھا یہ آن بالکل توڑ ڈالی +

اس رسالے کے علاوہ سرسید نے اور طرح طرح سے انگریزوں اور مسلمانوں میں موانست پیدا کرنے کی کوشش کی مسلمانوں کی جھجک نکالنے کے لئے انھوں نے اولاً خود انگریزوں کے ساتھ معاشرت اور مواکلت اختیار کر کے قوم کے واسطے ایک مثال قائم کی اور رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کی سوسائٹی میں اس طریقے کو وسعت دے کر اُس کا اثر دُور تک پھیلا دیا۔ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انھوں نے بہت سے آرٹکل اسی مضمون پر لکھے۔ انگریزوں کو اُنھوں نے سب سے پہلے نہایت شدّ و مد کے ساتھ رسالہ اسبابِ بغاوت میں تنبیہ کیا تھا کہ اُن کو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی اور صداقت کا برتاؤ رکھنا ضرور ہے۔ اِس کے بعد ہمیشہ اپنی تحریروں اور پبلک اسپیچوں میں اس بات کی تقاضا ظاہر کرتے رہے کہ ہمارے اور انگریزوں کے سوشل تعلقات برادرانہ

اور دوستانہ ہونے چاہئیں نہ حاکم محکومانہ۔

مسٹر بلنٹ کی دعوت پر اسپیچ

اس موقع پر ہم سید کی ایک مختصر اسپیچ جو انھوں نے علی گڑھ میں ایک ڈنر پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کا جام صحت پروپوز کرتے وقت ۱۸۸۳ء میں کی تھی اور جس میں یہی تمنا خاص مسلمانوں کی طرف سے ایک لطیف پیرائے میں ظاہر کی گئی تھی۔ بجنسہٖ نقل کرتے ہیں۔ سر سید نے کہا "ہم کو نہایت خوشی ہے کہ مسٹر بلنٹ نے ہمارے ملک کو دیکھا، ہماری قوم کے مختلف گروہوں سے ملے، ہم کو امید ہے کہ انھوں نے ہر جگہ ہماری قوم کو تاجِ برطانیہ کا لائل اور کوئین وکٹوریہ ایمپریس آف انڈیا کا دلی خیرخواہ پایا ہوگا۔ اگر ہماری کسی آرزو سے وہ واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی طرف سے سمپیتھی کی خواہش ہوگی۔ جس کی نسبت میں بلاشبہ کہوں گا کہ ہماری وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔

"مسلمانوں کی یہ خواہش کہ مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں سمپیتھی قائم ہو، کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ ہم مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں کوئی معرکہ ایسا گذرا ہو کہ ہم میں اور اُن میں کوئی بنائے مخاصمت قائم ہوئی ہو، اُن کو ہم سے بدلہ لینے کی رغبت ہو اور ہم کو اُن کے عروجِ اقبال سے رشک و حسد ہو۔ کروسیڈ کے زمانے میں جو ایک زمانہ ہر قسم کی عداوتوں کے برانگیختہ ہونے کا تھا، انگلش نیشن کو بہت ہی کم اُن معرکوں سے تعلق تھا۔

یہ بات سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں کئی صدیوں تک شاہنشاہی کی، یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کی شان و شوکت کو بھول نہیں سکتے، لیکن اگر یہ خیال کسی شخص کے دل میں ہو کہ ہم مسلمانوں کو انگلش نیشن کے ساتھ اِس وجہ سے کہ انھوں نے ہماری جگہ ہندوستان کی حکومت حاصل کی، کچھ حسد و رشک ہے تو وہ خیال محض بے بنیاد ہوگا۔ وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، ایسا زمانہ تھا کہ بچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی، اُس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اُس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا۔ تاکہ گاسپل کے عہدنامے کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں۔ مگر اس وقت اس پر کچھ کہنا ضرور نہیں ہے کہ انگلش نیشن نے اِس پاک وعدے کو کہاں تک پورا کیا"۔

"ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت قائم کی۔ ہندوستان میں انگلش حکومت قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُن دونوں میں کس نے زیادہ کام کیا۔ پس ہم مسلمانوں کی نسبت ایسا خیال کرنا کہ ہم انگلش حکومت کو ایک ناگواری سے دیکھتے ہیں محض ایک غلط خیال ہوگا۔

"انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی، مگر مثل ایک دوست کے نہ بطور ایک دشمن کے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل ہونی چاہیئے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لئے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا اُن کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی اور بہتری کے لئے۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم میں اور اُن میں سمپتھی نہ ہو۔ سمپتھی سے میری مراد پولٹکل سمپتھی نہیں ہے۔ پولٹکل سمپتھی تانبے کے برتن پر چاندی کے ملمع سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اِس کا اثر دونوں رفریق کے دلوں میں کچھ نہیں ہوتا، ایک فریق جانتا ہے کہ وہ تانبے کا برتن ہے دوسرا فریق سمجھتا ہے کہ وہ جھوٹے ملمع کی قلعی ہے۔ سمپتھی سے میری مراد برادرانہ و دوستانہ سمپتھی ہے۔"

سرسید کہتے تھے کہ "یہ اسپیچ جب اخبار میں سرالیفرڈ لائل لیفٹیننٹ گورنر کی نظر سے گذری اور اُس کے بعد میں اُن سے ملا تو اُنھوں نے فرمایا کہ تم نے یہ عجیب طرح کی اسپیچ دی تھی۔ میں نے کہا شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی۔" غالباً ہز آنر کو اسپیچ مذکور کے اِس فقرے پر تعجب ہُوا ہو گا کہ "انگلش حکومت کے قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے دو پلڑوں کے شریک تھے۔" شاید عام لوگ سرسید کی اس تلمیح سے آگاہ نہ ہوں۔ اِس لئے اِس کا جو مطلب ہم سمجھے ہیں اِس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ غالباً سرسید نے اِس فقرے میں ہندوستان کے اُن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالکِ ہندوستان کی ابتدائی انگریزی فتوحات اور سرکارِ کمپنی کے رعب وداب اور اُس کی پالیسی کو مسلمان امیروں اور حکمرانوں کی تائید اور آشتی سے بہت مدد ملی ہے، جیسے پلاسی کی لڑائی میں میر جعفر کا بمقابلہ سراج الدولہ کے لارڈ کلایو کا ساتھ دینا۔ شاہ عالم کا مرہٹوں کے مقابلے کے وقت اپنے تئیں لارڈ لیک کی حفاظت میں سپرد کر دینا اور نظام حیدر آباد کا لارڈ ولزلی کی صلاح ماننا اور تمام فرانسیسیوں کی فوج کو اپنی قمرو سے یک قلم موقوف کرنا وغیرہ وغیرہ

نمائش آگرہ کے دربار میں یورپین افسروں سے جھگڑا

ایک اور موقع پر اسی سودا کے جوش میں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ اچھا نہیں ہے سرسید ایک ایسی جرأت کر بیٹھے جس کی بدولت آخرِ کار اُن کو گورنمنٹ سے معافی مانگنی پڑی۔ فروری ۱۸۶۷ء میں جب کہ ڈرمنڈ صاحب اضلاع شمال مغرب میں لیفٹیننٹ گورنر تھے، آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ اس کمیٹی میں اُن کے سوا اور بھی چند معزز ہندوستانی انگریزوں کے ساتھ شامل تھے اور تمام ممبروں کو یکساں اختیار دئے گئے تھے۔ کسی طرح کا تفاوت انگریزوں اور ہندوستانی ممبروں میں نہ تھا۔ نمائش کی اخیر تاریخ دربار کے لئے مقرر تھی اور دربار کا انتظام مسٹر پالک کلکٹر ضلع آگرہ کے سپرد تھا۔ صاحبِ موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لئے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا کرسیوں کی ایک لائن تو اس مقام پر لگائی اور اُس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ کی روک ہو، کھچوا دیا اور دوسری لائن اُسی کے متوازی مگر اُس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سرسید نے اکثر ہندوستانی درباریوں کو اِس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس موقع پر گورنمنٹ کو یہ منظور ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کچھ تمیز نہ رکھی جائے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک معزز ہندوستانی شاید دربار سے ایک دن پہلے چلتے پھرتے دربار کے میدان کی طرف جا نکلے اور اتفاق سے اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک بابو نے آکر اُن کو وہاں سے اُٹھا دیا اور کہا کہ آپ کے واسطے نیچے کی لائن لگائی گئی ہے۔ وہ وہاں سے سیدھے سرسید کے پاس آئے اور حال بیان کیا اور یہ کہا کہ آپکا خیال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مساوات کے باب میں صحیح نہ تھا۔ سرسید کو نہایت تعجب اور اُس کے ساتھ سخت ندامت ہوئی کہ جو کچھ لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا وہ غلط ہوگیا۔ یہ اُسی وقت دربار کے میدان میں پہنچے اور قصداً اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ بابو نے آکر اِن کو بھی ٹوکا یہ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسٹر جیمس سمسن سکرٹری گورنمنٹ سے جو وہیں دربار کے ٹکٹ بانٹ رہے تھے سارا حال بیان کیا۔ اُنھوں نے بھی اِس امر کو ناپسند کیا اور سرسید سے کہا کہ آپ اِس کا ذکر مسٹر پالک سے کریں۔ اتنے میں مسٹر تھارن ہل، صدر بورڈ کے

حاکم اعلیٰ وہیں چلے آئے۔ جب اُن کو یہ قصہ معلوم ہُوا تو وہ سرسیّد پر نہایت برافروختہ ہُوئے اور کہا کہ
تم لوگوں نے غدر میں کون سی برائی تھی جو ہمارے ساتھ نہیں کی [illegible] ب تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے اور
اور ہماری عورتوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو دربار میں بیٹھو؟ سرسیّد نے کہا " اسی سبب سے تو یہ ساری خرابیاں
پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر اُن کو اِس طرح ذلیل نہ سمجھا جاتا تو کیوں
یہاں تک نوبت پہنچتی۔ نھارن ہِل صاحب اور زیادہ برہم ہوئے۔ آخر مسٹر جمیس سمتھ نے سرسیّد کو سمجھایا
کہ اس گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں۔ سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں
ہوئے۔ لیکن یہ خبر نواب لیفٹننٹ گورنر کو پہنچی تو اُنھوں نے بھی دربار کی ترتیب اور انتظام کو ناپسند کیا۔
اور یہ حکم دیا کہ اس وقت زیادہ تبدیلی تو نہیں ہو سکتی لیکن ہر ضلع اور قسمت کے حکام کو چاہیئے کہ اپنے
اپنے ضلع اور قسمت کے ہندوستانی رئیسوں اور افسروں کے ساتھ نیچے کی لائن میں بیٹھیں۔ دربار کے
بعد جو یورپین افسر سرسیّد سے ملتا تھا اِس واقعہ کو پوچھتا تھا اور جب وہ بیان کرتے تھے تو بگڑتا تھا۔ لاچار
اُنھوں نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رات کو وہاں سے سوار ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ مگر
چند روز بعد لوکل گورنمنٹ کے سکرٹری کی چِٹھی سرسیّد کے نام پہنچی جس میں اُن سے اِس بات کا جواب
طلب کیا گیا تھا کہ تم دربار میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ اور بلا اجازت کس لئے علی گڑھ چلے گئے۔ سرسید
نے آگرہ سے بلا اجازت چلے آنے کا سبب لکھ بھیجا اور دربار میں شریک نہ ہونے کی معافی چاہی۔
اِس کے بعد پھر وہاں سے کچھ بازپرس نہیں ہُوئی۔ مگر اِس نمائش سے پہلے جو لارڈ لارنس مرحوم
وائسرائے وگورنر جنرل نے آگرہ میں دربار کیا تھا وہاں سرسیّد کو ایک طلائی تمغہ دیئے جانے کا حکم
دیا تھا اور وہ تمغہ اب تیار ہُوا تھا چونکہ سرسیّد نمائش کے دربار میں شریک نہیں ہوئے تھے اس لئے
نواب لیفٹیننٹ گورنر نے وہ تمغہ صاحب کمشنر قسمت میرٹھ کو دے دیا تاکہ وہ میرٹھ جاتے ہوئے
علی گڑھ میں سرسیّد کو اپنے ہاتھ سے پہناتے جائیں۔ صاحب کمشنر جب علی گڑھ ریلوے اسٹیشن
پر پہنچے تو سرسیّد حسب الحکم وہاں موجود تھے ان کو ایک طرف لے جا کر بسبب اس رنجش کے جو
نھارن ہِل صاحب سے اُنھوں نے سخت گفتگو کی تھی یہ کہا کہ اگرچہ میں اپنے ہاتھ سے تم کو تمغہ پہنانا
پسند نہیں کرتا لیکن گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں، یہ کہہ کر سرسیّد کو تمغہ پہنانا چاہا۔ سرسیّد نے یہ کہہ
کر کہ میں بھی گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں اُن کے آگے سر جھکا دیا اور تمغہ پہن کر چلے آئے۔ ہم نے

معتبر ذریعہ سے سُنا ہے کہ اُنھیں دنوں میں گورنمنٹ کا ارادہ سب ججوں کی تنخواہ میں معقول اضافہ کرنے کا تھا مگر سرسید کی اِس کارروائی سے وہ اضافہ مدت تک ظہور میں نہیں آیا۔ اور سرسید کے ساتھ اور لوگ بھی جو اُن کے ہم عہدہ تھے اس سے محروم رہے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ اِس واقعے کے بہت دن بعد مسٹر پالک سے جب کہ وہ کمشنر تھے ایک دن سرسید کا ذکر آیا اُنھوں نے نہایت چیں بہ جبیں ہوکر کہا کہ وہ بڑا مفسد اور باغی ہے اور آگرہ کی نمائش گاہ کا وہ تمام قصہ بیان کیا۔ میں نے یہ حال سید صاحب کو لکھ بھیجا اُنھوں نے مسٹر پالک کو ایک مفصل چٹھی لکھ کر بھیجی جس میں اصل منشا اپنی اُس جسارت کا بیان کیا تھا۔ اُس چٹھی کے آنے کے بعد پھر مسٹر پالک اُن کی طرف سے بالکل صاف ہو گئے تھے۔

الغرض سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی ذلت کا باعث ہو۔ خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرتے میں اُنھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فروگذاشت نہیں کیا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی سالانہ جلدوں میں شاید ہی کوئی جلد ایسی نکلے جس میں اُن کے متعدد آرٹکل اِس مضمون پر لکھے ہوئے موجود نہ ہوں۔

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو جو اُنھوں نے ۱۸۷۱ء میں مقام بنارس لکھا تھا اور جس کا مفصل ذکر پہلے حصے میں ہو چکا ہے، سرسید کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے ہے جس کے شکریے سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور وہابی خصوصاً کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ چونکہ اس ریویو میں سرسید نے اپنے وہابی ہونے کا اقرار کیا تھا اِس لیے انگریزوں کی بدگمانی وہابیوں کی نسبت بالکل جاتی رہی تھی۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ غالباً ۱۸۷۱ء میں جب مسٹر گریفن ڈپٹی کمشنر لاہور نے منشی قادر بخش خاں تحصیلدار چونیاں کو ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ پر بجرم وہابیت زیرِ مواخذہ کرکے صاحب فنانشل کمشنر کے پاس بھیجا اور کرنل ڈیوس کو جو اُس وقت کمشنر تھے، یہ معلوم ہوا کہ قادر بخش خاں کا وہی مذہب ہے جو سید احمد خاں کا ہے تو اُنھوں نے فنانشل کمشنر سے سفارش کرکے اُن کی تبدیلی قصور میں کروا دی۔ اس کے بعد جب اُن کی تبدیلی قصور سے ہونے لگی تو مسٹر ابراہن اسسٹنٹ کمشنر قصور نے ان کو سرٹیفکیٹ

بغرضِ صفائی کے دبا تھا اُس میں بڑا ثبوت اُن کی صفائی کا یہ لکھا تھا کہ یہ شخص وہی مذہب رکھتا ہے جو سید احمد خاں صدر الصدور اضلاعِ شمال مغرب کا مذہب ہے اور اس لئے اُس کی نسبت بدخواہیٔ سرکار کا اشتباہ محض لغو ہے"۔

ولایت میں مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیالات

ولایت کا سفر جو سر سید نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ بظاہر اس غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کے لئے انگلستان لے جاکر اُس کے آرام و آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے کریں اور اُس کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کر کے واپس چلے آئیں مگر جن مشغلوں اور جن منصوبوں میں اُنھوں نے سترہ مہینے لندن میں بسر کئے اُن سے صاف پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا، ورنہ اصل منشا اس سفرِ دور و دراز کا قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کی لگن میں سر سید کا حال بعینہٖ اس شعر کے مصداق تھا۔

"تَرَکْتُ لِلنّاسِ دُنْیاھُمْ وَدِیْنَھُمْ شُغْلاً بِحُبِّکَ یا دِینی وَدُنْیانی"[1]

مذہبِ اسلام کی خدمت جو کچھ کہ وہاں اُن سے بن آئی اُس کا ذکر ہم اگلے عنوان میں کریں گے یہاں صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ اِس سفر کے آغاز سے لے کر انجام تک برابر اُن کو مسلمانوں کی لو کس قدر لگی رہی۔

دِلسوزی کے آرٹیکل

اُن کے سفر نامے سے جس کا نمونہ پہلے حصّے میں دکھایا جا چکا ہے اور اُن کے آرٹیکلوں سے جو وقتاً فوقتاً وہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کے لئے ولایت سے ہندوستان میں بھیجتے رہے، ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے، کہ ہندوستان سے چلتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اُس سے اُن کے دل پر

دِلسوزی کے پرائیویٹ خطوط

عجب بے چینی اور قلق کا عالم تھا، خصوصاً اُن کے دل

---

[1] شاعر اپنے محبوب کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کی دنیا اور اُن کا دین مبارک ہو، میرا تو دین بھی تو ہی ہے اور دنیا بھی تو ہی ۔۱۲۔

کی کیفیت اور تلاطم اُن پرائیویٹ خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جو انھوں نے اپنے ہمدرد اور دلی دوست سید مہدی علی خاں کو ولایت سے بھیجے ہیں اور جو اس کتاب کے لکھنے وقت مخدومی مولوی سید زین العابدین نے راقم کو عنایت کئے ہیں - صاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص قوم کے سوز میں انگاروں پر لوٹ رہا ہے کبھی یورپ کی ترقی کے مقابلے میں مسلمانوں کی پستی و تنزل کا اندازہ کرکے نہایت مایوسی کے الفاظ لکھتا ہے، کبھی کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون مسلمانوں کے برخلاف دیکھ کر پیچ و تاب کھاتا ہے، کہیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی انجمن مسلمانوں کی طرزِ معاشرت کی اصلاح کے لئے جلد قائم کرنی چاہیئے، کبھی اسی غرض سے کوئی قومی اخبار یا میگزین ہندوستان میں جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، کبھی انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوانے پر کمر باندھتا ہے جن میں یورپ کے مورخوں کے اُن سب بیجا اعتراضات کا جواب دیا جائے جو انھوں نے مسلمان بادشاہوں یا خلیفوں پر وارد کئے ہیں اور جن کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹکل حالت پر بہت بُرا پڑتا ہے اور اِس کام کے لئے ہندوستان سے چندہ طلب کرتا ہے، کبھی ایسی کتابیں لکھوانے کا ارادہ کرتا ہے جن سے مسلمانوں کو اپنی گذشتہ عظمت کا خیال پیدا ہو اور اُن کو سلف کی ترقی اور اپنے تنزل کا اندازہ کرنے سے عبرت آئے، کبھی کسی ہندوستان کے مسلمان کے اعزاز کی خبر سن کر نہایت خوشی ظاہر کرتا ہے اور کبھی کسی ایسے قانون کے نافذ ہونے پر جس سے ہندوستانیوں کے حقوق کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے افسوس کرتا ہے - یہاں ہم چند فقرے مذکورہ بالا خطوں میں سے ناظرین کی اطلاع کے لئے بطور نمونہ کے نقل کرتے ہیں +

ایک خط میں اُس عربی مدرسہ کا جو دِلّی میں منشی امو جان مرحوم کے مکان میں قائم کیا گیا تھا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "جانِ من و جنابِ من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی اُن کا نکالنے والا نہیں - ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں - ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں - اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے - اگر تم یہاں

آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیمِ اولاد کا قاعدہ کیا ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آن کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر، مردود، گردن مروڑی ہوئی مُرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سُنے گا"۔

ایک اور خط میں اس طرح لکھتے ہیں "جس کتاب[1] کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہوگئی ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اُس کے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیسا سچ اختیار کیا ہے، گو بعض خیالات اُس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے جب آپ اُس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے"۔

"اب ایک ضروری بات ہے جو لکھتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت نا انصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی بُرائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ از راہ نا انصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اُس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں، اِس لئے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔

"دو بڑے واقعے دُنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے۔ ایک واقعہ

---

[1] یہ اس کتاب کا ذکر ہے جو جان ڈیون پورٹ نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھی اور جس کو لندن میں کوئی پبلشر نہیں چھاپتا تھا۔ مگر سرسیّد نے وہاں پہنچ کر اور اپنے روپیہ سے اِس کو چھپوا کر ہندوستان میں بھیجا اور یہاں دو شخصوں نے اُس کے الگ الگ ترجمے کئے۔ اگرچہ ڈیون پورٹ کی انگلستان میں کچھ وقعت نہ تھی اور اُس کی کتاب میں اور مصنفوں کے اقوال نقل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر چونکہ سرسیّد نے اس سے پہلے کسی یورپین مصنف کی ایسی تحریر جس میں اسلام کی اِس قدر حمایت کی گئی ہو نہیں دیکھی تھی اس لئے اُن کو اِس کے شائع کرنے کا خیال ہُوا۔ ۱۲۔

فتحِ اُندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اُس قوم کی کی، نہایت ہی عجیب اور قابلِ فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اُن عالم صاحب (یعنی جان ڈیون پورٹ) سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں اور اُن کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا قصور اُن کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن، لیٹن، فرنچ، گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے، صرف انگریزی کتابوں پر اُس کو بھروسا نہیں ہے، اِس لئے امید ہے کہ جیسی بلاتعصب اُس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہوگا۔ فی کتاب چار سو روپیہ۔ بس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کر کر میرے پاس بھیج دیں، چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیئے، صرف احبابِ مخلصین سے چندہ ہو۔ مثلاً آپ میر ظہور حسین، زین العابدین، مرزا رحمت اللہ اور اور احباب سے ملاقات کریں اور زبانی بات چیت کریں اور جو جس کی توفیق ہو اُس سے لے کر جمع کریں۔"

مولوی سید مہدی علی خاں کے لئے ہندوستان میں صاحب کمشنر نے خلعت کے لئے گورنمنٹ میں رپورٹ کی ہے اِس کی مبارکباد کے بعد سرسید اُن کو لکھتے ہیں "بھائی مہدی! تم پایونیر اخبار الہ آباد کے آرٹکل کا ترجمہ سنو وہ لکھتا ہے کہ "آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں، وہ بھی ضعیف ہیں، جلد پنشن لیں گے اور اُن کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نہیں ہوگا۔ دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا، اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹکل بہت بڑا ہے کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر بالکل سنو۔ بہر حال جو عزت تم کو خدا دے وہ تمام قوم کی عزت ہے اور مجھ کو دوہری خوشی ہے ایک قومی، دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ با اقبال رکھے"۔

مولوی امداد العلی جو سرسید کے سخت مخالف تھے اُن کو ہندوستان میں سٹار آف انڈیا کا

خطاب ملنا تجویز ہوا یہ خبر سن کر سرسید مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "بلا تصنّع میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹار آف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ عین آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشمِ ما روشن و دلِ ما شاد۔ اُن کا یہ فرمانا کہ سید احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر سٹار آف انڈیا لیا اور انھوں نے مونچھوں پہ تاؤ دے کر نہیں نہیں بھول گیا اُن کے مونچھیں نہیں ہیں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر) میرے سر اور آنکھوں پر۔ خدا کرے ایک اُن کو اور ہزار اور مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو"[1]۔

اور کئی خطوں میں مولوی مہدی علی خاں کو اس بات کی تاکید لکھی ہے کہ میرے واپس آنے سے پہلے ایک ایسوسی ایشن مسلمانوں کی طرزِ معاشرت کی اصلاح کے لئے قائم کرو اور ایک اخبار اسی مقصد کے لئے ایسوسی ایشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو اور رُقعیاں کرو اور چندیں کرو۔ پھر جب اس سے بھی کچھ کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو ممانعت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اگر بالتخصیص مسلمانوں کی تربیت کے لئے جداگانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک رحمت ہمارے لئے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ ایسے مدرسے کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں۔ مگر بغیر دس لاکھ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے" اسی طرح سرسید کے تمام خطوں میں جو ولایت سے اُنھوں نے سید مہدی علی خاں کو لکھے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا دُکھڑا رونے کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کی تدبیریں

الغرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لئے برابر باندھتے رہتے تھے اِس رائے پر آکر ختم ہو گئے کہ ہندوستان میں چل کر قوم کی تعلیم کے لئے ایک محمڈن کالج یا محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولٹکل حالت درست کرنے کے لئے ایسوسی ایشن قائم کرنی یا کاغذ کی ناؤ سے اِس دریا کو طے کرنا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ جب تک اُن میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی اُن کی بھلائی کی

---

[1] مولوی امداد العلی اتباعِ سنت کے خیال سے مونچھیں نہیں رکھتے تھے یہ اُس کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲۔

تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بیکار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آبپاشی کرنا۔ اُنھوں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اپنی تمام زندگی اس کام پر وقف کر دیجیے۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق تمام ابتدائی مدارج جو ولایت میں طے ہونے ممکن تھے، اُنھوں نے وہیں طے کرلئے۔

ولایت میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر پمفلٹ لکھنا

ایک پمفلٹ جس میں ہندوستان کے موجودہ نظامِ تعلیم پر اعتراض اور بجائے اُس کے جو طریقۂ تعلیم اُن کے نزدیک ہندوستان کی حالت کے مناسب تھا، اُس کو بیان کیا تھا، لندن میں شائع کیا تاکہ جن کی رائے اِس کے خلاف ہو۔ وہ اخباروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں +

کیمبرج یونیورسٹی کو دیکھنا

نیز کیمبرج یونیورسٹی کو خود جاکر نہایت توجہ سے دیکھا اور اس کے تمام جزئی و کلّی حالات پہ غور کی۔

اِشتہار جاری کرنا

پھر مسلمانوں اور گورنمنٹ کی اطلاع کے لئے اُردو اور انگریزی میں اشتہار چھپوا کر سید مہدی علی خاں کے پاس اشاعت کی غرض سے ہندوستان میں بھیجے اور ہندوستان میں آکر نہایت باقاعدہ اور دانشمندانہ طریقے سے اُس منصوبے کے پورا کرنے پہ کمر باندھی جو اُن کی سالہاسال کی غور و فکر کا آخری نتیجہ تھا،

انجمن خواستگارِ ترقیِ تعلیمِ مسلماناں

ادھر تو انجمن خواستگارِ ترقیِ تعلیمِ مسلماناں قائم کی جس کی کوششوں سے آخر کار مدرسۃ العلوم قائم ہوگیا +

تہذیبُ الاخلاق

اور اُدھر قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف مائل کرنے کے لئے پرچہ تہذیب الاخلاق نکالا۔ سرسید کے ان دونوں کاموں کا مفصّل حال ہم پہلے حصّے میں لکھ چکے ہیں یہاں ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور مدرسۃ العلوم سے اُن کو اب تک کیا فائدہ پہنچا اور آئندہ کن فائدوں کے پہنچنے کی توقع ہے۔

تہذیب الاخلاق کے نتائج

ہندوستان میں دیسی اخباروں اور میگزینوں کی حالت کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن میں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہوتا جو

پبلک میں کچھ جنبش پیدا کرے اور زیادہ تر ہندوستانیوں کی مردہ دلی کے سبب جیسی کہ اب تک رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ یورپ میں یہی اخبار اور میگزین قوموں کے دلوں کے مالک ہیں اور اُن کے جذبات اور خیالات پر حکومت کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں سوا اِس کے کہ لوگ اُن کو ایک دِل کا بہلاوا جانتے ہیں وہ کسی مرض کی دوا نہیں سمجھے جاتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے، کہ تہذیب الاخلاق سے جو ایک سب سے زیادہ افسردہ اور دل مُردہ قوم کے بیدار کرنے کے لئے نکالا گیا تھا، کیا امید ہو سکتی تھی؟ باوجود اس کے جو نتیجے اِس سے پیدا ہُوئے وہ نہایت تعجب انگیز ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس وقت یہ پرچہ جاری ہُوا اُس وقت مسلمانوں پر بسبب اُس انقلاب کے جس نے غدر کے بعد اُن کی حالت دِگرگوں کر دی تھی، دو مختلف حالتیں تھیں۔ ایک طرف مذہبی تعصبات اور مذہبی جوش و خروش، جو اِدبار اور تنزل کے زمانے کے ہتھیار ہیں، نہایت زوروں پر تھے اور تہذیب الاخلاق کا جزوِ اعظم وہ مضامین تھے جن کو مذہبی تعصبات کے ساتھ وہی نسبت تھی جو آگ کو بارُود کے ساتھ ہوتی ہے۔ پس جیسی کہ امید تھی تہذیب الاخلاق نے متعصب مولویوں کے گروہ میں تلاطم پیدا کر دیا اور مذہبی مناظرہ کے ہتھیار جو مدّتِ دراز سے کام میں نہ آنے کے سبب زنگ خوردہ پڑے تھے اُن کو کام میں لانے کا موقع ملا۔

دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی تھا جن کی افسردہ اور مایوس طبیعتیں اپنے روز افزوں تنزّل کے سبب ڈوبتی ہوئی ناؤ کی طرح کوئی ایسا سہارا ڈھونڈ رہی تھیں جس سے اُن کی ڈھارس بندھے اور کوئی امیّد کی صورت نظر آئے۔ تہذیب الاخلاق نے اس گروہ کے دل پر فی الواقع وہ کام کیا جو مرہم زخم پر یا ٹھنڈا پانی پیاسے پر کرتا ہے۔ اس گروہ نے جب کہ وہ اپنے تئیں ناچیز اور ایک نہایت کس مپرس حالت میں سمجھ رہا تھا اور دنیوی ترقیات کے دروازے اپنے چاروں طرف مسدُود پاتا تھا، دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دِلسوزی سے اُن کو نیند سے جگاتا ہے، اُن کی غفلت پر ملامت کرتا ہے، اُن کے اسلاف کے کارنامے سُنا کر اُن کو غیرت دلاتا ہے اور اُن کو ترقّی کرنے کا گرُ بتاتا ہے، یہ گروہ اُس کی آواز پر اِس طرح دوڑا جیسے کسی بے سری فوج کا کوئی سردھرا پیدا ہو جائے اور وہ اُس کے اشارے پر اِدھر اُدھر سے سمٹ کر اُس کے گرد جمع ہو جائے۔ غرض کہ موافق اور مخالف دونوں فریق

ہمہ تن اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پہلا اِس لئے کہ اُس کی آواز غور سے سُنیں اور دوسرا اِس لئے کہ اُس کی آواز کسی کو سننے نہ دیں۔ تعجّب یہ ہے کہ جس قدر اُس کی موافقت سے قوم کو فائدہ پہنچا اُسی کے قریب قریب اُس کی مخالفت نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

مدارسِ اسلامیہ کا قائم ہونا

جُوں جُوں "تہذیب الاخلاق" "مدرسۃ العلوم" کی طرف لوگوں کو بُلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں اُن کے ذہن نشین کرتا تھا اُسی قدر مدارسِ اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور برابر ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو جاری ہُوئے شاید تین برس گذرے تھے کہ مولوی سخاوت علی صاحب نے انبہیٹہ میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ قائم کرنے کے بعد اُنھوں نے جیسا کہ تہذیب الاخلاق نمبر ۱ جلد ۴ میں منقول ہے ایک موقع پر کہا کہ "اگرچہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے یہاں تک چوکنا اور آگاہ کیا جس کے سبب اس قصبے میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا۔ خدا اس پرچہ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لئے ہمیشہ مبارک رکھے"۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے مدرسہ انبہٹہ اور ضلع کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور اور گنگوہ کو بڑی تسلّی ہے کہ یہ سب مدرسے اسی مدرسۃ العلوم مسلمانان سے جس کے قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے مستفیض ہوں گے۔ گویا علی گڑھ ہمارے مدرسوں کے طلباء کا قصرِ امیّد ہے۔ اگر درحقیقت ہم اپنی ترقی کریں گے تو وہ قصر ہمارے ہی لئے ہے، پس کس قدر ہم کو اِس کے بانیوں کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔

اِس قول کے نقل کرنے کے بعد سرسیّد تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ "سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریر دل کے اثر سے قائم ہُوا وہ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے جس میں بشمول دیگر علوم معینّہ کے مذہبِ شیعہ اثنا عشریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سُنّی دونوں کے دل کو جگا دیا ہے"۔ سرسیّد نے جس مضمون میں یہ حال لکھا ہے وہ ۱۸۷۳ء کا لکھا ہُوا ہے جس کو اب چوبیس برس کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اِس عرصے میں اور بے شمار مدارسِ اسلامیہ زیادہ تر اسی خیال سے قائم ہوئے ہیں کہ انگریزی تعلیم جس کی بُنیاد مسلمانوں میں تہذیب الاخلاق نے ڈالی ہے اُس کے اثر سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ یہ خیال

فی نفسہٖ صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق ہی نے مسلمانوں میں یہ جوش پیدا کیا ہے اور اس طرح سرسید کی چیخ پکار نے اپنے مخالفوں میں بھی وہ اسپرٹ پیدا کر دی ہے جس پر قومی ترقی کا دار و مدار ہے +

اگرچہ تمام مدارسِ اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں ان میں آج تک کوئی تبدیلی زمانے کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم ڈگر اب تک نہیں چھوڑی گئی جو اِس زمانے کے ہرگز مناسب نہیں ہے لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفارمر ہے اُن کی اصلاح کئے بغیر نہیں رہے گا۔ چنانچہ ندوۃ العلمار جس کا پانچواں اجلاس سالِ گذشتہ میں ہو چکا ہے اِس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلۂ درس کی زمانۂ حال کی ضروریات کے موافق اِصلاح کرے اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلمأ کا وجود اُسی نتیجے کی ایک نشان ہے جس کے لئے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا وہی کانپور جو تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے تہذیب الاخلاق کے برخلاف نورالانوار، نورالآفاق اور اِمدادالآفاق اور کیا کیا مدّتِ دراز تک شائع ہوتے رہے، وہیں سے علمار کی یہ جماعت اِس غرض سے اُٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرزِ تعلیم زمانۂ حال کی طرزِ تعلیم کے سانچے میں ڈھالی جائے اور اسی لئے اکثر علماء اُس سے بدگمان ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اِشارے سے قائم ہوئی ہے۔ ہم ایسا تو نہیں سمجھتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ "ھذا ایضًا من برکات البرامکۃ" بے شک مسلمانوں کی اصلاح کا خیال اُن

کے دل میں سید کی چیخ پکار نے پیدا کیا ہے اور اگر وہ اپنے اِرادوں پر ثابت قدم رہے اور لومۃِ لائم سے خوف زدہ نہ ہوئے تو رفتہ رفتہ ضرور وہ اپنے موجودہ خیالات سے آگے بڑھیں گے اور جن باتوں کی درحقیقت قوم کو ضرورت ہے اُن کی طرف متوجہ ہوں گے

مخالف مولویوں کی رایوں میں اِنقلاب

نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں گفتگو کرتے وقت ندوۃ العلمار کی روئداد میں سے اُس کے بعض ممبروں کی تقریر کا خلاصہ نقل کیا تھا جو تہذیب الاخلاق جدید کی پہلی جلد میں چھپ گیا ہے۔ اُس کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا

ہے کہ جو کچھ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی ابتدائی جلدوں میں علومِ جدیدہ کی ضرورت کے متعلق لکھا تھا، یا قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر علومِ جدیدہ ———————————— کے مطابق کی تھی اور جس پر اُن کی تکفیر کی جاتی تھی، ہمارے علما، کی رایوں پر اُس نے کس قدر اثر کیا ہے اور اُن کے خیالات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا قدیم علمِ کلام جو اُس زمانے کے فلاسفہ کے مقابلہ کے لئے مُدَوّن ہوا تھا اِس زمانے میں اُس کا مدارسِ اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے۔ اب فلاسفۂ زمانۂ حال کے مقابلے کی ضرورت ہے اور اِس لئے انگریزی زبان کا سیکھنا اور علومِ جدیدہ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ پہلے جو ہمارے علمار علومِ جدیدہ کے پڑھنے سے اِس لئے منع کرتے تھے کہ اُن سے اُصولِ اسلام میں شبہات پیدا ہوں گے اور الحاد اور دہریت پھیلے گی، اب برخلاف اُس کے وہ بھی وہی کہنے لگے ہیں جو بیس برس سے برابر سرسید کہتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ ایک عالم نے ندوۃ العلمار میں یہ کہا کہ "مذہبِ اسلام ایسا بنیے کا گھر نہیں جس پر نئے فلسفہ کا ریلا کچھ اثر کرے اور نہ کبھی پچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے۔ فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا، پر آسمانی مذہب کبھی نہ بدلے گا۔ اسلام کا کوئی دُنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہَیئت و ریاضی ہے، وہ تو صرف انسان کی اخلاقی و رُوحانی تعلیم کرنے والا ہے" پھر کہا کہ "اسلام نے تاریخ کا بھی بطرزِ مورِخانہ ذمہ نہیں لیا ہے بلکہ اُنھیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے لئے عبرت و حیرت پیدا کر دیں۔ اگر بطلیموس کی ہَیئت ثابت ہو جائے تو کیا اور فیثاغورث کی قائم ہو جائے تو کیا، جزوِ لایتجزّیٰ باطل ہو تو کیا اور ثابت ہُوا تو کیا، خلا کا بطلان ہُوا تو کیا اور اثبات ہُوا تو کیا۔ ہمارے بزرگوں نے یونانی فلسفہ کے حملے رد کرنے کے لئے ایسے ایسے مسائل علمِ کلام میں داخل کئے تھے جن کو آجکل محض جودتِ طبع کے لئے ہم لوگ پڑھتے ہیں، نہ وہ ہمارا مذہب تھا نہ کتاب و سنّت اور مشکوٰۃِ نبوت کا فرمودہ تھا۔ سب کچھ بگڑ جائے تو ہماری بلا سے"۔

اگر تہذیب الاخلاق لوگوں کی مخالفت کے خوف سے صلحِ کل کا طریقہ اختیار کرتا اور جو رکاوٹیں مسلمانوں کی ترقی کی سدِ راہ تھیں اُن کے دُور کرنے پر علی الاعلان کمر نہ باندھتا تو ظاہر ہے کہ اُس کی مخالفت بالکل نہ ہوتی اور اِس لئے جو عمدہ نتیجے اُس کی مخالفت سے پیدا ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے۔ نیز جس قدر اُس کی مخالفت کم ہوتی اُسی قدر اُس کے مددگاروں کا جوش کم ہوتا اور اِس لئے وہ مخالف

اور موافق دونوں کے حق میں کوئی معتدبہ نتیجہ پیدا نہ کر سکتا۔ یہی سبب تھا کہ جوں جوں اُس کی مخالفت زیادہ ہوتی گئی اُسی قدر لوگ اُس کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے گئے اور اُسی قدر اس کا منتر زیادہ کارگر ہوتا گیا۔

مسلمانوں کا اسلاف کی ترقیات سُن کر متنبہ ہونا

اُس نے جب کہ مسلمان اپنے اسلاف کے حال سے بے خبر تھے نہایت مؤثر طریقوں کے ساتھ اُن کو اُن کے بزرگوں کی علمی اور عقلی فتوحات سے آگاہ کیا تاکہ اُن میں وہ حمیت پیدا ہو جو اولاد کے دل میں اپنے آباؤ اجداد کی بڑائی سننے سے پیدا ہونی چاہیئے اور وہ اپنے موجودہ تنزل کا مقابلہ زمانۂ سلف کی ترقیات کے ساتھ کر کے خود ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اگرچہ تہذیب الاخلاق کو اِس مقصد میں پوری کامیابی ہوئی کہ اُس نے مسلمانوں میں فخر و مباہات کا جوش توقع سے زیادہ پیدا کر دیا لیکن اُن نیچرل موانع کے سبب جو گری ہوئی قوموں کو مدت تک اُکسنے نہیں دیتے، ابھی تک اُن میں وہ حرکت پیدا نہیں ہوئی جو سلف کے کارنامے سُن کر ایک غیور قوم میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُن کو پستی و تنزل کے تنگ و تار غار سے نکلنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ تاہم جس قدر بیس بائیس سال کے عرصے میں کم و بیش ترقی کا خیال ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہوا اُس کو اُسی تہذیب الاخلاق کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے، ورنہ مسلمانوں نے زمانے کی مخالفت پر جس شد و مد کے ساتھ کمر باندھی تھی وہ اُس وقت تک کہ زمانہ اُن کو پیس نہ ڈالے، ہرگز کھُلنے والی نہ تھی۔ تہذیب الاخلاق جس کوٹھے پر چڑھنے کی تاکید کرتا تھا صرف اُس کے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اُس کا زینہ بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے لوگوں کو ترقی کی طرف بُلاتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مدرسۃ العلوم کی تصویر اُن کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اِسی لئے اُس کی کوششیں بالکل اکارت نہیں گئیں۔

مسلمانوں میں عیسائی مؤرخوں کے الزامات رفع کرنے کا خیال پیدا کرنا

تہذیب الاخلاق ہی نے لوگوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ یورپ کے مصنفوں نے جو غلطیاں اسلام کی حقیقت ظاہر کرنے یا اسلام کی تاریخ لکھنے میں کی ہیں اُن غلطیوں کو رفع کیا جائے اور اُن کا منشا ظاہر کیا جائے۔ اگرچہ سرسید اپنی

متعدد تصنیفات میں جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا ظاہر کیا گیا ہے، اِس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور آئندہ مصنفوں کے لئے یہ رستہ صاف کر چکے تھے، مگر اُن کی اکثر تحریرات عام طور پر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ تہذیب الاخلاق ہی کی تحریک سے لائق لائق مسلمان اس کام پر کھڑے ہوئے، بہت سے مضامین تہذیب الاخلاق میں اِسی موضوع پر لکھے گئے اور ان کے سوا عمدہ عمدہ متعدد کتابیں انگریزی اور اُردو میں شائع کی گئیں۔ اِس تحریک کا سب سے عمدہ نتیجہ مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان جن سے ہم خود واقف ہیں یا جن کا حال معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے، اُن اعتراضوں کو دیکھ کر جو انگریزی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں پر وارد کئے گئے ہیں اسلام سے برگشتہ ہو چلے تھے کوئی عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور کوئی سرے سے مذہب ہی کو لغو سمجھنے لگا تھا۔ مگر تہذیب الاخلاق کے مضامین دیکھ کر جو شبہات اسلام کی طرف سے اُن کے ذہن میں خطور کرتے تھے وہ یک قلم زائل ہو گئے اور اُن کے دل کا دغدغہ بالکل جاتا رہا۔ اب وہ اسلام پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اپنے اُن پراگندہ خیالات سے نادم ہیں۔

تعصّب، تقلید، توکّل، قناعت اور تقدیر کی مزاحمتوں کا کم ہونا

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا، تقلید کی بندشیں ڈھیلی کر دیں، توکّل، قناعت اور تقدیر کے جو غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے تھے اور جس غلطی نے اُن کو نکمّا اور کاہل اور جمادات کی طرح بے حس و حرکت کر دیا تھا اُس سے اُن کو مطلع کیا اور صرف مطلع ہی نہیں کیا بلکہ لاکھوں کے خیالات بدل دئے اور تدبیر و کوشش کی طرف اُن کا رُخ پھیر دیا۔

سیلف ہیلپ کا خیال پیدا ہونا

اسی پرچے نے اُن کو اپنے دست و بازو پر بھروسا کرنا اور گورنمنٹ کا سہارا چھوڑنا سکھایا اور سیلف ہیلپ کا اصول جس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی، اُن کے ذہن نشین کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومی کاموں میں ایک پیسہ صرف کرنا نہیں جانتے تھے وہ سیکڑوں اور ہزاروں صرف کرنے لگے۔ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ قومی کاموں میں چندہ دینا کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف تہذیب الاخلاق نے یا دوسرے لفظوں میں سید احمد خاں

کی تحریروں اور اسپیچوں نے سکھایا ہے اور اس بات کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان جو روپیہ دو روپیہ مہینے سے زیادہ اولاد کی تعلیم میں خرچ کرنا نہیں جانتے تھے وہ اسی شخص کی چیخ پکار سے اب پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپیہ مہینا بے دریغ اپنے بچوں کی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں اور ولایت کی تعلیم کے لئے ایک ایک لڑکے پر بیس بیس تیس تیس ہزار صرف کر دیتے ہیں ۔ سرسید کے مخالف جو ہمیشہ مستثنے نتیجوں کو اعتراض کا ذریعہ گردانتے ہیں اس مقام پر ضرور مسلمان لڑکوں کی وہ مثالیں پیش کریں گے جن کو ولایت جانے سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچا ہے مگر ایسے مستثنیات سے تو خدا کے کام بھی خالی نہیں پائے جاتے ۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ہم کو اس باب میں ان شاذ و نادر مثالوں پر نظر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ سرسید نے مسلمانوں کے خیالات میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ جو روپیہ وہ پہلے اولاد کی بیاہ شادیوں کی بیہودہ رسموں میں خرچ کرنے کے عادی تھے یا جس روپیہ سے جاہل اور نالائق اولاد کے لئے جائداد خرید کر اُن کی عیاشی اور بد چلنی یا کاہلی اور سستی کا سامان مہیّا کر جاتے تھے، اب وہ روپیہ اُن کی لیاقت اور اصلی عزّت اور اقتدار بڑھانے میں صرف کرنا سیکھ گئے ہیں ۔

قومیت کا خیال پیدا ہونا

تہذیب الاخلاق ہی نے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے، تو مسلمانوں کو مدتِ دراز کے بعد قومیت کے معنی یاد دلائے ہیں ۔ قومیت جو درحقیقت ایک لفظ اسلامی اخوت کا مرادف ہے اُس کے مفہوم سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بالکل ذہول ہو گیا تھا۔ اُن میں مثل ہندوؤں کے ذاتوں کی تفریق پیدا ہو گئی تھی اور ایک ذات کو دوسری ذات کے ساتھ قومی حیثیت سے کچھ تعلّق نہ سمجھا جاتا تھا۔ پٹھانوں کو یہ استحقاق نہ تھا کہ وہ مغلوں کی فتوحات پر فخر کر سکیں اور سادات اس بات کا حق نہیں رکھتے تھے کہ بنی امیہ یا بنی عباس کی کارناموں پر نازاں ہوں ۔ اس کے مذہبی فرقوں کے سوا اختلاف نے ان میں ایک دوسری طرح کا تفرقہ ڈال دیا تھا جس کے سبب سے وہ رابطہ جو تمام اہلِ قبلہ میں بسبب اتحادِ اسلامی کے متحقق ہونا چاہیئے باقی نہ رہا تھا تہذیب الاخلاق نے ان دونوں تفرقوں کو دُور کرنے کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں میں کم سے کم یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ذاتوں

کے تفرقہ یا مذہبی طریقوں کے اختلاف سے قومی اتحاد میں کچھ فرق نہیں آتا اور ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت و قومی ہمدردی اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام طور پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسید ہی کی تحریروں نے جو اوّل سوسائٹی اخبار میں اور اُس کے بعد تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئیں لوگوں کو بولنے سکھائے ہیں +

اُردو لٹریچر میں انقلاب پیدا ہونا

اُردو لٹریچر کو بھی اِس پرچے سے کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔ یہ پرچہ جیسا کہ پہلے حصّے میں بیان ہو چکا ہے چھبیس برس کے عرصے میں تین دفعہ مختلف وقتوں میں جاری ہوا مگر سب سے زیادہ عرصے تک صرف پہلی دفعہ یعنی سات برس تک برابر نکلتا رہا۔ لٹریری خوبی کے لحاظ سے جس قدر عمدہ مضامین اِن سات برس کے پرچوں میں شائع ہوئے پھر ویسے نہیں ہوئے اور جو نتائج کہ ہم نے اوپر بیان کئے ہیں وہ زیادہ تر انھیں سات برس کے پرچوں سے علاقہ رکھتے ہیں +

اس پرچے کو جاری ہوئے صرف تین برس کا عرصہ گذرا تھا کہ سرسید کے ایک انگریز دوست نے جیسا کہ جلد ۴ نمبر ا میں مذکور ہے اُن کو لکھا تھا کہ "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اُردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہبِ اسلام الیسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے" +

مذہبی لٹریچر میں آزادی کا پیدا ہونا

یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ سوشل اخلاقی اور مذہبی مضامین جس سادگی اور لطافت اور شائستگی کے ساتھ اس پرچے میں لکھے گئے ویسے کبھی کسی اُردو زبان کے پرچے میں نہیں لکھے گئے +

اِس پرچے نے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں جو صدیوں سے بند پانی کی طرح بے حس و حرکت چلا آتا تھا دفعتہً تموّج پیدا کر دیا۔ تہذیب الاخلاق سے پہلے ہندوستان میں جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا گیا تھا اُس میں سرسید کے سوا بہت ہی کم لوگوں کی تحریروں میں آزادی کا عنصر پایا جاتا تھا، تعصب اور تقلید نے اُرجنیلٹی کی سوتیں بالکل بند کر دی تھیں، علمائے سلف کے اقوال اور اُن کی رایوں کو نقل کر دینا ہی تصنیف و تالیف کی معراج تھی۔ غیر مقلد جو بہت

آزادی کا دم بھرتے تھے اُن کی جولانگاہ بھی صرف چند مسائل فقہیہ متعلق بہ عبادات تھے اور بس۔ پادریوں کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کرنے کا طریقہ اِس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جو اعتراضات وہ مذہبِ اسلام پر قرآن اور حدیث کے حوالوں سے کرتے تھے اسی قسم کے اعتراضات عیسائی مذہب پر توریت و انجیل کے حوالوں سے کئے جاتے تھے۔ یورپین سویلزیشن اور یورپین سائنس کے حملے جو اسلام پر ہو رہے تھے، اوّل تو اُن سے مسلمان عالم محض بے خبر تھے اور اگر اُن کو خبر بھی ہوتی تو تقلید کی بدولت اُن میں یہ قابلیت نہ رہی تھی کہ اُن نئے حملوں کو دفع کرنے کے لئے نئے ہتھیار ایجاد کریں۔ مناظرے کا طریقہ اس قدر نامہذّب اور خراب ہو گیا تھا کہ کتابوں کے نام لٹھ، جوت، آرہ، دُرہ، قبقاب اور کتاب رکھے جاتے تھے۔ تہذیب الاخلاق نے جہاں تک کہ اُس سے ہو سکا تعصّب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑیں، مذہبی تحریروں میں آزادی کی رُوح پھونکی، مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ جو اُس زمانے میں کچھ بکار آمد نہ تھا، اُس کی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانے کے مناسبِ حال تھا جاری کیا۔ مناظرے کے ناپسندیدہ طریقے کی اصلاح کی اور اپنے طرزِ بیان سے اس طریقے کی ایک مثال قائم کی جس کی قرآن نے ہدایت کی تھی۔ کہ "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ احسن"

اُردو شاعری میں انقلاب

اُردو شاعری جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دُہرائے جا رہے تھے اُس نے بھی زیادہ تر اسی پرچے کی تحریک سے کروٹ بدلی۔ نئے نئے میدانوں میں شعراء قدم رکھنے لگے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھینچنے لگے اور شاعری بجائے اِس کے کہ محض ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی ایک کام کی چیز بننے لگی۔

محمڈن کالج کا ہونا

سب سے عمدہ نتیجہ جو اِس پرچے کے اجراء سے مترتّب ہوا اور جس کے لئے درحقیقت یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان جو قدیم سے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کرتے چلے آتے تھے آہستہ آہستہ اُن کی جھجک نکلنی شروع ہوئی یہاں تک کہ لاکھوں مسلمان ہندوستان میں اب ایسے موجود ہیں جو انگریزی تعلیم کو اپنی اولاد کے حق میں نہایت ضروری جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بغیر اِس کے ملک میں عزت سے رہنا ناممکن ہے۔

محمڈن کالج کے نتائج

سب سے بڑی ملکی اور قومی خدمت جو سرسیّد سے بن آئی اور

جس کا احسان بظاہر صرف مسلمانوں کی قوم پر مگر درحقیقت ہندوستان کی تمام اقوام پر ہے، وہ مدرستہ العلوم کا قائم کرنا ہے۔ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا جس کی تعداد قریب چھ کروڑ کے ہے تعلیم سے محروم رہنا تمام ملک کے لئے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ایسا ہی مضر تھا جیسا کہ عضوِ رئیس کا ماؤف ہونا انسان کے تمام اعضائے رئیسہ کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔

ہندوؤں میں تحریک کا پیدا ہونا

اس کے سوا صرف مدرستہ العلوم کی ریس سے شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں قومی تعلیم کا جوش حد سے زیادہ پیدا ہو گیا اور اُنھوں نے قومی چندے سے متعدد کالج کھول لئے۔ پھر خود مدرستہ العلوم میں کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا گیا جس کی رُو سے وہ مسلمانوں کے لئے مخصوص سمجھا جائے۔ اس میں ابتدا سے آج تک ہندو، مسلمان، عیسائی، بنگالی، پارسی سب قوموں کے طالب علم برابر پڑھتے رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء سے اب تک جس قدر ہندو طالب علم محمڈن کالج اور اس کی لا کلاس سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہوئے ہیں اُن کی تعداد یہ ہے۔ گریجویٹ ۲۲، انڈر گریجویٹ ۶۷، انٹرمینس ۹۸، ایل ایل بی ۸ وکالتِ ہائیکورٹ ۲ وکالتِ ضلع ۵ میزان ۱۹۲، اور متعدد ہندو گریجویٹ اسی کالج کے بیرسٹری یا میڈیسن میں ولایت جاکر کامیاب ہو چکے ہیں۔ پس یہ کہنا کچھ بناوٹ میں داخل نہیں ہے کہ محمڈن کالج نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کی بھلائی کے لئے قائم کیا گیا ہے اور اُس سے غیر قوموں کو بھی برابر فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ سرسید کا بڑا مقصد اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔

مسلمانوں کی ترقّی تعلیم کے موانع

قطعِ نظر اُن سخت مخالفتوں کے جو مدرستہ العلوم قائم کرتے وقت پیش آئیں اور جن کا حال ہم آیندہ عنوان میں لکھیں گے۔ مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ ابتدا سے ہندو اور مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھا اس کا اندازہ اِس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں جب کہ گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لئے ایک سنسکرت کالج قائم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اِس مضمون کی گذرانی کہ ہم کو اِس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہمارے لئے

سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اس کو چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو انگریزی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرے۔ برخلاف اس کے ۱۸۳۵ء میں جب کہ واقعۂ مذکورہ پر گیارہ برس گذر چکے تھے، اور ہندوؤں کا شوق دوبالا ہو گیا تھا، کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سُنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو اُنھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اِس قدر توجہ کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ اُس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔

قطعِ نظر مذہبی خیالات کے مسلمان زیادہ تر اس وجہ سے بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے کہ ابتدائے اشاعتِ اسلام سے وہ جس ملک میں گئے اور جا کر رہے مستثنیٰ صورتوں کے سوا کبھی اُن کو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہ جہاں جاتے تھے اپنی زبان اور اپنا علم ادب اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ جس طرح اسپین میں جا کر اُنھوں نے اسپینش زبان یا ایران میں ژند زبان نہیں سیکھی، اسی طرح ہندوستان میں آ کر اس ملک کی زبانوں کو سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اور اس لئے غیر زبانوں کے سیکھنے کی فی الواقع اُن میں قابلیت نہ رہی تھی۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں غیر زبان سیکھنے کا ملکہ اپنے میں بخوبی پیدا کر لیا تھا۔ جو قومیں ملازمت پیشہ تھیں وہ اپنی اولاد کو کم از کم فارسی زبان سکھانا نہایت ضروری جانتی تھیں اور اکثر شوقین لوگ فارسی کی تکمیل کے لئے عربی بھی سیکھتے تھے۔

پس مسلمانوں کو جس قدر کہ مذہبی خیالات انگریزی تعلیم سے مانع تھے اُس سے زیادہ اُن کی طبعی نامناسبت جو تیرہ سو برس سے اُن میں متوارث چلی آتی تھی ایک اجنبی زبان کے سیکھنے کی اُن کو اجازت نہ دیتی تھی۔ مدارسِ انگریزی میں انگریزی زبان کے سوا اور بھی بعض سبجکٹ ایسے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ مناسبت نہ رہی تھی۔ جغرافیہ جس میں اُن کے اسلاف نے اگلے زمانے میں بے انتہا ترقی کی تھی اب وہ اس کو محض لغو جاننے لگے تھے۔ تاریخ کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا۔ ریاضی سے فی الواقع مسلمانوں کو کچھ لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں عموماً یہ بات نشین تھی اور اب تک ہے کہ انگریزی زبان میں منطق اور حکمت و فلسفہ بالکل نہیں ہے اور دنیا میں عربی کے سوا کوئی علمی زبان نہیں ہے۔

اس کے سوا اور بہت سے موانع تھے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت سرسید نے محمڈن کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا اُس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہوگی؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء یعنی اس وقت سے جب کہ کلکتہ مدراس اور بمبئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں ----

۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی تعلیم کی کیا حالت تھی

۱۸۷۵ء یعنی اس وقت تک کہ علی گڑھ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا، تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جن میں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے۔ حالانکہ اس وقت تک ہندو گریجویٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ گئی تھی جن میں ۷۱۵ بی اے اور ۱۳۱ ایم اے تھے۔ نیز جو نفرت یا نامناسبت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آتی تھی اُس سے اِس بات کا اندازہ بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض اُن کو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی اُن میں انگریزی تعلیم کے ساتھ دل بستگی اور مناسبت پیدا کرنے کے لئے کس قدر عرصہ درکار تھا؟ اور وہ کتنی مُدت میں اِس قابل ہو سکتے تھے، کہ اپنی ہموطن قوموں کے ساتھ جو چالیس برس پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اُس کے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوڑ میں شریک ہوں۔

علیگڑھ کالج نے ۱۹ سال میں کتنے مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دی

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد جو نتائج نہایت قلیل عرصے میں علی گڑھ محمڈن کالج سے ظہور میں آئے اُن کو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ علیگڑھ محمڈن اسکول ۱۸۷۵ء میں اور محمڈن کالج ۱۸۷۸ء میں کھولا گیا تھا اور کالج کے نتائج ۱۸۸۱ء سے نکلنے شروع ہوئے اُس وقت سے ۱۸۹۸ء تک کہ جس کو ۱۹ برس سے زیادہ مہلت نہیں گذری اُس نے صرف اپنے مسلمان طلبہ میں سے ۲۲۶ گریجویٹ اور ۴۱۷ انڈر گریجویٹ پیدا کئے ہیں۔

جو طالب علم کہ محمڈن کالج کی لاکلاس میں لکچر سنتے ہیں وہ ۱۸۹۰ء سے قانونی امتحانوں میں شریک ہونے لگے ہیں۔ اُس وقت سے اب تک صرف مسلمانوں میں سے ۱۴ ایل ایل بی کے امتحان میں

اور ۵ وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں ....

محمڈن کالج کا اثر ملک کے دیگر حصّوں پر

اور اگر اُس سخت گیری پر جو آٹھ سات برس سے قانونی امتحانوں میں ہونے لگی ہے، نظر کی جائے تو اِس قلیل عرصے میں مذکورہ بالا نتائج خاص کر مسلمانوں کے حق میں بہت غنیمت ہیں۔ مگر محمڈن کالج کے فوائد کو صرف اُن نتائج ہی میں منحصر نہ سمجھنا چاہیئے جو خاص کر اُس کے طالب علموں نے یونیورسٹی کے مذکورہ بالا امتحانوں میں حاصل کئے ہیں بلکہ اُس کا اثر ہندوستان کے تمام حصّوں اور تمام صوبوں تک پہنچا ہے اور اس کا کسی قدر اندازہ اِس بات سے ہو سکتا ہے کہ لیفٹیننٹ گورنر بنگال نے سنہ۱۸۹۶ء کے آغاز میں ایک موقع پر مسلمانانِ بنگالہ کی تعلیم کے متعلق یہ کہا تھا کہ "سنہ۱۸۸۱ء میں جب کہ میں نے بنگالہ کو چھوڑا تھا تو صوبۂ مذکور کے تمام مدرسوں اور کالجوں میں ایک لاکھ بچاسی ہزار مسلمان طالب علم تھے اور اپنے واپس آنے پر مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اس تعداد کی نوبت چار لاکھ نوے ہزار کے پہنچ گئی ہے" چونکہ سنہ۱۸۸۱ء ہی سے زیادہ محمڈن کالج کا چرچا ہندوستان میں ہوا ہے اور صوبۂ بنگال میں ظاہرا کوئی زبردست تحریک مسلمانوں کی تعلیم کے لئے نہیں ہوئی اس لئے سوا اس کے کہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور محمڈن کالج کی شہرت سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

نیز اسی کالج کی ریس اور اسی کے بانی کی چیخ پکار سے متعدد[۱] کالج اور بے شمار اسکول خاص مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے لئے ہندوستان میں کھول لئے جس کا ایک صریح نتیجہ یہ ہے کہ سنہ۱۸۷۵ء سے لے کر اُس وقت تک کہ محمڈن کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے اور اُس کی شہرت سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا ولولہ پیدا ہوا یعنی سنہ۱۸۸۱ء تک جو کہ چھ برس کا زمانہ ہوتا ہے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئیٹس کی تعداد صرف ۴۳ تک پہنچی تھی مگر سنہ۱۸۸۲ء سے سنہ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف بارہ سال میں تمام ہندوستان کے مسلمان گریجوئیٹس کی تعداد ۴۳ سے بڑھ کر ۲۳۹ تک پہنچ گئی اور سنہ۱۸۹۴ء سے سنہ۱۸۹۶ء تک یعنی تین سال میں صرف الہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۰۵ مسلمان بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں کامیاب ہوئے اور اگر بدقسمتی سے وہ مشکلات جو گذشتہ دس برس سے طالب علموں کو پیش آ رہی ہیں اور

---

[۱] جیسے لاہور، امرتسر اور کراچی کے محمڈن کالج یا حیدرآباد اور رامپور کے اسٹیٹ کالج۔ ۱۲

جنھوں نے خاص کر مسلمانوں کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا ہے پیش نہ آتیں تو اور بھی زیادہ عمدہ اور بہتر نتیجے ظہور میں آتے۔

تعلیم کی ابتدائی مشکلات

اس کے سوا جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ قومی تعلیم کی چال ابتدا میں نہایت سست اور دھیمی ہوتی ہے۔ کم عمر لڑکے جن سے قومی تعلیم کی بنیاد قائم ہوتی ہے، باوجودیکہ اُن کو حد سے زیادہ ترغیب اور اشتعالک کی ضرورت ہوتی ہے وہ اپنے دائیں بائیں کوئی سامان ایسا نہیں دیکھتے، جس سے اُن کو تعلیم میں کچھ مدد مل سکے، یا اس کی طرف کافی توجہ ہو۔ نہ تو قومی سوسائٹی میں اُن باتوں کا چرچا ہوتا ہے جن سے تعلیم کا شوق اور اُس کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو، اور نہ خاندان کے چھوٹے بڑوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے جس سے مدرسہ کی پڑھائی میں کسی قسم کی اعانت کی توقع ہو۔ برخلاف اس کے جب قوم میں تعلیم کی بنیاد پڑ جاتی ہے تو اُن کو گلی کوچہ اور گھر کے در و دیوار سے یہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس لئے اُمید ہے کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کا شوق اسی نسبت سے آئندہ بھی بڑھتا رہا جیسا کہ گذشتہ ۲۳ برس میں بڑھتا رہا ہے تو اُن کی ترقی کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جائے گی۔

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان میں پیدا ہونا

ولایت کی تعلیم کا خیال ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں درحقیقت اس وقت سے پیدا ہوا ہے جب کہ سرسید اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر انگلستان گئے ہیں۔ اُس سے پہلے ہندوستان سے کوئی مسلمان اور شمالی ہند سے کوئی ہندو یا مسلمان ولایت میں تعلیم کے لئے نہیں گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس سفر کی جرأت زیادہ تر اُس اسکالرشپ کے سہارے سے ہوئی تھی جو سید محمود کی تعلیم کے لئے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا لیکن چونکہ وہ خود بھی مع اپنے بڑے بیٹے کے ۱۷ مہینے ولایت میں ٹھیرے تھے اور سید محمود کی تعلیم ختم ہونے تک ایک خدمت گار برابر پانچ برس اُن کے ساتھ رہا تھا اور بعض ایسے اخراجات بھی جو اوروں کو اٹھانے نہیں پڑتے تھے سرسید کو برداشت کرنے پڑے تھے، اس لئے علاوہ دس ہزار روپیہ کے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا پچاس ہزار روپیہ اُن کو اپنی جائداد اور کتابیں بیچ کر اور رخصت کے زمانے کی تنخواہ کٹوا کر گویا اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑا۔ اگرچہ سرسید کو اُس سے بڑی زیر باری ہوئی مگر ہندوستان کے لئے آئندہ ولایت جانے کی راہ کھل گئی۔ سرسید نے اسی بہ

اِکتفا نہیں کیا کہ بیٹے کو ولایت میں تعلیم دلا کر ملک کے لئے ایک مثال قائم کر دی، بلکہ جیسا پہلے حصّے میں مذکور ہو چکا ہے اُنھوں نے متعدد تدبیریں ہندوستانیوں کے اور خاص کر مسلمانوں کے ولایت بھیجنے کے لئے کیں جن کا نتیجہ ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کلکتہ بمبئی اور مدراس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں کوئی سال ایسا نہیں جاتا جس میں کچھ ہندو یا مسلمان طالب علم تعلیم کے لئے ولایت نہ جاتے ہوں۔ ایک معتدبہ تعداد ولایت کے تعلیم یافتہ بیرسٹروں اور سول سرونٹس وغیرہ کی جن کا پہلے بنگالیوں اور پارسیوں کے سوا کسی قوم میں وجود نہ تھا، اکثر قوموں میں پیدا ہو گئی ہے جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جیسا کہ نواب محسن الملک نے اپنے لاہور کے لیکچر میں بیان کیا ہے اس وقت صرف محمڈن کالج کے ۳۱ طلباء بیرسٹر ایٹ لا ہیں، اور ۴ ولایت میں ڈاکٹری کی تعلیم پا رہے ہیں۔

اِس حالت کا مقابلہ جب شمالی ہندوستان کی اُس حالت سے کیا جاتا ہے جبکہ سرسیّد نے پہلی ہی بار ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا اور جب کہ ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں مذہبی خیالات کے سبب یورپ جانے کو عیسائی ہو جانے سے کم نہیں سمجھتے تھے اور غیر ملکوں کے سفر کے بالکل عادی نہ تھے تو دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے اور اس میں شک کرنے کی ظاہرا کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس طرح مسلمانوں میں ولایت کی تعلیم کا خیال صرف سرسیّد کی تحریک سے پیدا ہوا ہے اسی طرح شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ خیال اسی شخص کی بدولت پھیلا ہے۔

باوجودیکہ ہندو ۱۸۲۳ء سے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ یہ رستہ طے کر رہے تھے جیسے تنہا خور آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ پچاس برس گذر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی مگر سرسیّد کی چیخ پکار صرف مسلمانوں ہی کو جگانے والی نہ تھی بلکہ اُس نے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اِس سرے سے اُس سرے تک تعلیم کا غل ڈال دیا۔ اگرچہ ہندوستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسیّد کی تحریک نے سوا اس کے کہ اُن کی ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اُس پر نہیں کیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال اُن میں صرف مسلمانوں کی ریس اور سرسیّد کے شور و غل سے پیدا ہوا۔ مذہبی رکاوٹیں ہمارے ملک کے ہندوؤں میں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ تھیں، چنانچہ بعض شریف ہندو اسی جرم میں کہ اُنھوں نے ولایت میں

جا کر تعلیم پائی، برادری سے خارج کر دیے گئے، لیکن چونکہ تعلیم نے اُن کو ذکی الحس کر دیا تھا اور زمانے کا ساتھ نہ دینے کے مضر نتائج سے وہ خوب واقف تھے، اِس لئے انہوں نے وہ تمام قیدیں جو ترقی کے مانع تھیں توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کو ولایت کی تعلیم میں بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد کا بڑھنا

سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت میں جس قدر ترقی مسلمانوں نے محمڈن کالج کی تعلیم کے ذریعہ سے بواسطہ یا بلاواسطہ کی ہے اُس کا اندازہ اس طرح پر کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کالج کے قائم ہونے سے پہلے مسلمان ملازموں کی تعداد کیا تھی اور اس کے قائم ہونے کے بعد کہاں تک پہنچ گئی؟ یا یہ کہ ہندوستان کی دیگر قوموں کے ساتھ صیغۂ ملازمت میں اُن کی پہلے کیا نسبت تھی اور اب کیا ہے؟ بلکہ ہمارے نزدیک اُس کا اندازہ اس طرح ہونا چاہیئے کہ اگر محمڈن کالج قائم نہ ہوتا اور سرسید کی تحریک سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کا خیال پیدا نہ ہو جاتا تو آج کے مسلمان سرکاری محکموں یا ہندوستانی ریاستوں میں ملازم پائے جاتے؟

سرکاری ملازمت کی جو شرطیں گذشتہ بیس سال میں وقتاً فوقتاً قرار پاتی رہی ہیں اور انھیں کے قریب ہندوستانی ریاستوں میں بھی قیدیں لگتی جاتی ہیں اُن پر لحاظ کرنے سے اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اگر اب تک مسلمان اُسی خوابِ غفلت میں رہتے اور انگریزی تعلیم سے جس قدر حصہ کہ انھوں نے اس عرصہ میں لیا ہے وہ حصہ نہ لیتے تو آج سرکاری دفتر اور محکمے اُن سے گویا بالکل خالی پاتے اور ہندوستانی ریاستوں میں بھی وہ شاید خال خال ہی نظر آتے۔

ذمہ داری کے عہدے جو پہلے ہندوستانیوں کو ادنیٰ درجے کی تعلیم یا سعی سفارش وغیرہ کے ذریعے سے مل جاتے تھے، اب سوا اس کے کہ گورنمنٹ اپنے خاص اختیارات سے کسی مستثنےٰ آدمی کو دے دے، گریجوایٹس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتے۔ کومپیٹیشن کے قاعدے نے ایجوکیٹڈ کلاس کے سوا ہر درجے کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے اور جس قدر ملازمت کے امیدواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اُسی قدر ملازمت کی شرطیں روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہیں۔ سیکڑوں مڈل پاس اور انٹرنس پاس آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار

کی نوکری ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اور مشکل سے فی صدی دس کامیاب ہوتے ہیں*

سنہ ۱۸۸۲ء میں جب کہ محمڈن کالج کی عمر دو تین برس سے زیادہ کی نہ تھی سرسید نے جو متعدد مضامین پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی تعلیم کے خلاف لکھے تھے اُن میں ایک جگہ لکھتے ہیں "جب صدرِ عدالتِ دیوانی ہائیکورٹ نہیں ہوئی تھی مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم و لائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب تھے کہ زمانہ اُن پر رشک کرتا تھا دفعتہً ۱۸۶۶ء میں صدر عدالتِ دیوانی ہائی کورٹ ہوگئی اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا تو وہ بارآور درخت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جن کی پھننگ آسمان تک پہنچی تھی اس طرح کملا کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا نازک پودا پالے کے صدمے سے جھلس جائے۔ اب ہائیکورٹ میں جا کر علمائے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ اُن پر مکھیاں بھنکتی ہیں نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کر سکتے ہیں، نہ ملک کا، نہ قوم کا۔ تمام عہدوں میں سے مشرقی علوم و مشرقی زبان خارج ہوگئی ہے۔ دیوانی عہدوں میں جن کی بنیاد وکالت کے امتحان پر قائم ہوتی ہے مشرقی علوم و مشرقی زبان کی قدر و پرسش نہیں رہی ہے۔ ہم نے سُنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے امیدواروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ بھی سُنا ہے کہ ایک لائق تحصیل دار عالم علوم مشرقی کو امیدوارانِ ڈپٹی کلکٹری کی فہرست میں اس لئے جگہ نہیں مل سکی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا"*

سرسید کا یہ مضمون ۱۸۸۲ء کا لکھا ہوا ہے جس کو سترہ برس کا زمانہ گذر چکا ہے اور جس کے بعد سرکاری عہدوں کی شرطیں آج تک برابر سخت ہوتی چلی آئی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عرصے میں جو تھوڑی بہت ترقی مسلمانوں نے انگریزی تعلیم میں کی ہے اگر اس کا اب تک کچھ ظہور نہ ہوتا تو سرکاری معزز عہدوں پر شاذ و نادر ہی کسی مسلمان کی صورت نظر آتی اور پایونیر نے جو ۱۸۸۲ء میں صوبۂ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ "تمام بنگالہ میں چند مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلد پنشن لیں گے اور اُن کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہوتے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نہیں دکھائی دے گا" بعینہٖ وہی حال صوبۂ پنجاب اور اضلاعِ شمال مغرب و اودھ کا ہو جاتا کہ سرکاری عہدوں پر کسی مسلمان کی شکل دکھائی نہ دیتی لیس، یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جس قدر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان

سرکاری عہدوں پر نظر آتے ہیں عام اس سے کہ وہ محمڈن کالج کے تعلیم یافتہ ہوں یا کسی اور کالج کے، یہ سب اسی شور و غل کا نتیجہ ہے جو سرسید نے ولایت سے آکر محمڈن کالج قائم کرنے اور مسلمانوں کو اُس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے تمام ملک میں ڈال دیا۔

ملازمت میں محمڈن کالج کے طالب علموں کی تعداد

اگرچہ اس صاف اور صریح نتیجے پر خیال کرنے کے بعد اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ خاص کر محمڈن کالج کے جن مسلمان طالب علموں نے گورنمنٹ سروس یا ہندوستانی ریاستوں کی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا ہے اُن کی گنتی بتائی جائے تاہم اُن لوگوں کی اطلاع کے لئے جو انگریزی تعلیم یا محمڈن کالج کی علتِ غائی ملازمت کے سوا اور کسی چیز کو نہیں سمجھتے محمڈن کالج کے اُن طالب علموں کی فہرست جو بالفعل سرکاری یا غیر سرکاری عہدوں پر ہندوستان کے مختلف حصّوں میں مامور ہیں یا عنقریب مامور ہونے والے ہیں نواب محسن الملک کی ایک تحریر سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

امپیریل سروس	۱	ڈپٹی کلکٹر و اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۱۱	اسسٹنٹ سب ڈپٹی اوپیم ایجنٹ	۲
سول سروس	۲	جو پولیس اسکول الہ آباد میں تعلیم پا رہے ہیں	۵	سررشتہ دار ہیڈ کلرک وغیرہ	۶۴
بیرسٹرایٹ لا	۳۱	جج	۲	اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ نمک و اسٹیشن ماسٹر وغیرہ	۱۰
سول سرجن	۱	منصف	۷	ملازمانِ سررشتہ تعلیم	۳۱
جو ڈاکٹری کے لئے ولایت میں تعلیم پا رہے ہیں	۴	انسپکٹر و سب انسپکٹر پولیس	۲۹	ملازمانِ ریاستہائے ہندستانی	۴۹
جو ڈاکٹری کے لئے لاہور تعلیم پا رہے ہیں	۵	نائب تحصیلدار	۱۶		

[1] اس فہرست میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں مگر ہندو خال خال ہیں باقی کل مسلمان ہیں۔ صرف وکلاء میں ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہے۔ ۱۲۔

وکلا	۳۷	تحصیلدار	۲۰	ملازمانِ فوج	۷	میزان	۳۳۴[1]

محمڈن کالج کی خصوصیات

علی گڑھ محمڈن کالج کے جو نتائج اُوپر بیان کئے گئے اگرچہ اُن کو مسلمانوں کی اُس پست حالت کے لحاظ سے جو بیس برس پہلے تھی اور جو روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی بہت غنیمت سمجھنا چاہیئے، لیکن ان نتائج سے محمڈن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی کہ جس کی رُو سے اُس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دی جا سکے یا اُس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے، کوئی تفاوت تعلیم اور نتائجِ تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں پس تا وقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹی ٹیوٹ نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ نفسِ تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب تک کہ اُن کی باگ ڈور ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے ایک سانچے سے ایک ہی سے پُرزے ڈھل کر نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے۔

درپسِ آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں می گویم

بارہا خود مدبّرانِ سلطنت نے ایجوکیشنل درباروں میں کہا ہے کہ سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں کامل تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ پس جو تعلیم کا اصلی مقصد ہونا چاہیئے اُس کو سر دست ہندوستان کے کسی کالج میں ڈھونڈھنا لاحاصل ہے، ہاں اگر ہندوستانیوں میں اتنی ہمت اور اُس کے ساتھ قدرت بھی ہو کہ وہ بھی یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح اپنے پرائیویٹ کالجوں میں فیلو سسٹم جاری

[1] منجملہ اُن کے ایک جج ہائیکورٹ اور ایک سکرٹری ہوم ڈپارٹمنٹ حیدر آباد ہے۔ ۱۲

کریں یا اپنی یونیورسٹی الگ قائم کریں تو ممکن ہے کہ اِس ملک میں بھی ویسے ہی محقق اور موجد و مخترع پیدا ہونے لگیں جیسے انگلستان فرانس اور جرمنی میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ سب تاشدنی باتیں ہیں جن کو ہندوستان کی آب و ہوا راس آتی معلوم نہیں ہوتی +

لیکن اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو محمڈن کالج میں ضرور ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن کے لحاظ سے اُس کو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جا سکتا ہے ازانجملہ ایک نہایت صاف اور صریح خصوصیت کالج مذکور کی یہ ہے کہ اُس میں ہر سال جس قدر روپیہ اسکالرشپوں میں خرچ کیا جاتا ہے ظاہراً ہندوستان کے کسی گورنمنٹ کالج یا پرائیوٹ کالج میں صرف نہیں کیا جاتا کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو غریب طالب علموں کو جو شوقین اور ہونہار معلوم ہوتے ہوں اسکالرشپوں کے ذریعہ سے تعلیم میں مدد دی جائے اور تا بمقدور غریب اور آسودہ حال طلبہ تقریباً یکساں حالت میں طالب علمی کا زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۶ء تک یعنی چھ سال میں کچھ کم ستائیس ہزار روپیہ اس کالج کے طلبہ کو اسکالرشپوں اور وظیفوں میں دیا گیا ہے۔ اگر ذی مقدور مسلمانوں کو منتظمانِ کالج کی نسبت ایک سوال حصہ بھی قوم میں تعلیم پھیلانے کا خیال ہو تو مذکورہ بالا رقم سے دس حصہ زیادہ روپیہ اس مد میں صرف ہو سکتا ہے۔

سامانِ تربیت

لیکن بڑی خصوصیت اس کالج کی سامانِ تربیت ہے جس کو بانیٔ کالج نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہے اور جس کے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے یہی وہ چیز ہے جس کا ہماری درسگاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اور اسی لئے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چاہیئے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ کالج کے بانیوں نے تربیت کے متعلق بہت کچھ تحریروں اور تقریروں میں بیان کیا ہے باوجود اس کے اکثر لوگ تربیت کے مفہوم سے اب تک ناواقف ہیں اور اسی واسطے محمڈن کالج کے کھیلوں پر اور طالب علموں کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسی خیال سے ہم چاہتے ہیں کہ اس مطلب کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں کیونکہ سرسید کی لائف میں اِس سے زیادہ کوئی مہتم بالشان واقعہ نہیں ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کی درسگاہ میں تربیت کی بنیاد ڈالی ہے +

ہمارے ہاں تربیتِ اولاد کا آلہ زیادہ تر تعلیم و تلقین، نصیحت و پند، زجر و توبیخ یا زدو کوب کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ لڑکے ایک معتد بہ زمانے تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہوئے ہیں۔ مذکورہ بالا وسائل سے اول تو اکثر صورتوں میں مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں اور اگر کوئی عمدہ اثر دلوں پر ہوتا بھی ہے تو وہ نقش بر آب کی طرح زائل ہو جاتا ہے لیکن سوسائٹی کے اثر سے عمدہ اخلاق رفتہ رفتہ طبیعتِ ثانی بن جاتے ہیں۔ اسی سوسائٹی کے اثر سے اہلِ یورپ کے اخلاق اصولاً ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اسی سوسائٹی کے میسر نہ ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لڑکے جب کسی درسگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اُن کو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے زیادہ تر اِس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھ کر آتے ہیں اُس کو بالکل اُن کے دلوں سے بُھلا دیا جائے۔ قطع نظر اُن تمام خرابیوں کے جو ہندوستانیوں کے اخلاق اور معاشرت میں عموماً پائی جاتی ہیں، ہم خاص کر اُن چند خصلتوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں جیسے مذہبی تعصبات، باہمی نزاع، رشک و حسد، غیبت، بدگمانی، کاہلی، تن آسانی، تضییعِ اوقات، ادائے فرائض میں سستی کرنا، غصہ، بے اعتدالی، نافرمانی وغیرہ وغیرہ۔ اور کچھ شک نہیں کہ اِن میں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ دیکھی جاتی ہیں یہی باتیں جب چھوٹے بڑوں میں دیکھتے ہیں تو اُن کی طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور آخرکار اُن کی طبیعتِ ثانی بن جاتی ہیں۔

اِنھیں خرابیوں کے تدارک کے لئے محمڈن کالج میں بورڈنگ سسٹم قائم کیا گیا ہے مگر پہلے اس سے کہ ہم اس سسٹم کے فوائد اور یہ کہ اُس کو طلبہ کی تربیت میں کیا دخل ہے بیان کریں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح تعلیم کے نتیجے اعداد کے ذریعہ سے دکھائے جا سکتے ہیں اس طرح تربیت کے نتائج نہیں دکھائے جا سکتے۔ نیز تعلیم کا اثر دفعتہً اور نمایاں ہوتا ہے اور تربیت کا اثر نامعلوم اور بتدریج ہوتا ہے۔ جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جو آہستہ آہستہ نشو و نما پاتے ہیں اُن کا موکر نا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا اِسی طرح تربیت کے نتائج

بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو قائم ہوئے کچھ بہت زیادہ عرصہ نہیں گذرا اس لئے یہاں ہم کو زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہے کہ محمڈن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیّت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؟ وہ کہاں تک اُن کی حالت کے مناسب ہے؟ اور اُس سے آیندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؟ نہ یہ کہ اس طریقۂ تربیت سے اب تک کیا نتیجے مترتب ہو چکے ہیں؟

قومیّت کا خیال

سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں میں اِتفاق و یک جہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے جس کے نہ ہونے سے تمام قوم روز بروز مضمحل اور تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے۔ یہ امید رکھنی کہ وعظ و نصیحت سے یا اخباروں اور رسالوں میں اتفاق کے فوائد پر بڑے بڑے آرٹیکل لکھنے سے یا اس مضمون پر زوردار اور موثر نظمیں شائع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو جائے گا، ایسی ہی بات ہے جیسے حُبّ کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرنی۔ اُن میں اتفاق پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اُن کی نسلیں اِتفاق کے سایہ میں نشو و نما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں، مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں، ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیلڈ میں مردانہ کھیل کھیلیں، ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈیبیٹ کریں، ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطے میں دن رات سگے بھائیوں کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح اُن کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

ریاضتِ جسمانی

ریاضتِ جسمانی جس کا سامان محمڈن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے اور جس میں یہاں کے طالب علموں نے تمام مُلک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے طالب علموں کی طبیعت تعلیم سے اُچاٹ ہو جاتی ہے اور کالج میں رہنے سے جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر جس قوم کی تقلید سے ہم اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں اُن کے ہاں ریاضتِ جسمانی تعلیم کا جزوِ لاینفک سمجھی جاتی ہے۔ لیکن صرف اُن کی تقلید ہی سے ریاضتِ جسمانی کو محمڈن کالج میں

ضروری نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اِس لئے اُس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مُستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں اور سُستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اِس کے وہ اُن میں چُستی و چالاکی کی بُنیاد ڈالیں، وہ برخلاف ان تمام کتاب کے کیڑوں کے جو اپنے تمام قوائے دماغی کتاب کی نظر کر دیتے ہیں اور زندہ دلی و شگفتگی اور تمام اُمنگیں اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں، جب کالج کو چھوڑیں تو لکھنے پڑھنے کے سوا وہ دُنیا کے تمام کاموں کے لائق ثابت ہوں۔

وہ ہندوستان کی عام حالت کے برخلاف جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماعِ ضدین سمجھا جاتا ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی۔ وہ اُن فرسودہ دماغوں کی طرح جن میں کثرتِ مطالعہ سے تحمل اور برداشت کی طاقت نہیں رہتی، چڑچڑے، نازک مزاج اور بد دماغ نہ بن جائیں۔ اگر اُن کو یورپین افسروں کی ماتحتی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر اُن کا ساتھ دینے سے عاجز اور ان کی نظر میں ذلیل نہ ہوں۔ وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی خدمات کے لئے انتخاب ہوسکیں۔ اگر اُن کو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست و بازو پر بھروسا کر کے ہر کام پر ہاتھ ڈالنے کی جُرأت کر سکیں۔ اُن میں ایسی مستعدی پیدا ہو جائے کہ بیکاری اور آرام طلبی جو مسلمانوں کی قومی خصلت بن گئی ہے اور جس کے سبب سے عرب میں "ہندی بطّال" ایک مثال ہو گئی ہے[1] اُن کو وبال معلوم ہونے لگے۔ وہ غیر ملکوں کے سفر سے نہ ہچکچائیں، وہ سختیوں کے جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ انھیں اغراض کے لئے محمڈن کالج میں ریاضتِ جسمانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس میں دلیری اور مستعدی کا عنصر پیدا نہ ہو۔ لارڈ ڈفرن اپنے عہدِ حکومت میں جب محمڈن کالج کے ملاحظے کو آئے اور ایڈریس میں کرکٹ وغیرہ کا ذکر سنا تو اس کا جواب دیتے وقت اُنھوں نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "ہماری قوم نے پہلی فتح کرکٹ کے میدان میں حاصل کی تھی" ایک حکیم کا قول ہے کہ "قومی قوت صحت پر منحصر ہے" اور چونکہ صحت بغیر ریاضتِ

---

[1] عربی میں بطّال نکمّے اور بیکار آدمی کو کہتے ہیں۔

جسمانی کے قائم نہیں رہ سکتی اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ قومی قوت ریاضتِ جسمانی پر منحصر ہے ؀

خصوصًا جس قوم کو خدا نے ہم پر حکمران کیا ہے اور جن کی پسند اور انتخاب کے ساتھ ہماری تمام امیدیں وابستہ ہیں اُن کے برابر کوئی قوم رُوئے زمین پر ریاضتِ جسمانی کی فریفتہ نہیں اُن کو شیر خوارگی کے زمانہ سے ریاضت کے قابل بنایا جاتا ہے اور جب تک مرض الموت میں مبتلا نہیں ہوتے کبھی ریاضت ترک نہیں کرتے۔ علاوہ معمولی کھیلوں اور ریاضتوں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کوس گھوڑے یا بائیسکل پر یا پیادہ پا سفر کرتے ہیں، کشتیاں کھیتے ہیں، گاڑیاں ہانکتے ہیں برف پر دوڑتے ہیں، پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، کانوں میں اُترتے ہیں، لکڑیاں چیرتے ہیں یہی سبب ہے کہ مصر کا ایک لائق مسلمان اپنے سفرنامۂ یورپ میں لکھتا ہے کہ "مخاطرہ و مہالک میں گھس جانا، اخیر دم تک اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنا اور جس قدر زیادہ مشکلات پیش آئیں اُسی قدر زیادہ ثبات اور استقلال سے اُن کا مقابلہ کرنا، دنیا کی کسی قوم میں ایسا نہیں پایا جاتا جیسا انگریزوں کی قوم میں پایا جاتا ہے"۔ ایسی قوم کی نظر میں کیا ہمارے نوجوان جب تک کہ اُنھیں کی برابر بلکہ اُن سے زیادہ جفاکش، محنتی، دلیر اور مستعد نہ ہوں محض کتاب کا کیڑا بننے سے کچھ اعتبار یا وقعت حاصل کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں ؀

جو لوگ گورنمنٹ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو والنٹیر بنایا جائے اور ہم کو فوج میں معزز عہدے دئے جائیں، جب تک کہ وہ بھی مثل انگریزوں کے اپنے تئیں ایجوکیٹڈ سپاہی نہ بنائیں ہرگز ایسی خواہش کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے اور اسی لئے محمڈن کالج کے بانیوں نے ریاضتِ جسمانی کو تعلیم کا جزوِ لاینفک قرار دیا ہے ؀

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ کرکٹ، فٹ بال اور جمناسٹک وغیرہ کے شوقین تعلیم میں کوشش نہیں کرتے یا لکھنے پڑھنے سے اُن کا دل اُچاٹ ہو جاتا ہے، کیونکہ ہم نے سُنا ہے کہ جس کالج ٹیم نے پچھلے دنوں میں بمبئی اور پارسی ٹیم اور پٹیالہ ٹیم پر دو نمایاں فتحیں حاصل کی تھیں اُن میں کئی گریجویٹ تھے اور باقی جتنے کالج کلاسوں میں پڑھتے تھے، وہ سب تعلیم کے لحاظ سے بھی اپنی جماعتوں میں اچھے سمجھے جاتے تھے ؀

وقت کا خیال | ایک اور فائدہ بورڈنگ سسٹم سے طالب علموں کے لئے یہ سمجھا گیا ہے کہ

بورڈنگ ہاؤس میں رہنے سے اُن کو ضبطِ اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی اولاد تضییعِ اوقات کرنے والی مشہور ہے۔ حالانکہ جس قوم کی گورنمنٹ سے ہمارے نوجوان نوکریوں کے خواستگار ہیں اُس کا ایک ایک فرد وقت کو اپنی دولت بلکہ اپنا دین وایمان سمجھتا ہے اور فی الحقیقت جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دُنیا کے +

وقت کی پابندی بھی وعظ ونصیحت سے یا کتابوں میں اُس کی خوبیاں پڑھنے یا کسی نفع کی امید یا نقصان کے خوف سے نہیں ہوتی، بلکہ ایک مُدّت تک اُس کی مشق کرنے سے ہوتی ہے۔ محمڈن کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو صغیر سن لڑکے ایک الگ وارڈ میں رہتے ہیں اُن کی ابتدا ایسی ڈالی گئی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ اوقات کے پابند رہیں گے۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں، نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا یا گیند بلا کھیلنا، مارننگ اسکول، نائٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا اور سونا یا سو کر اُٹھنا غرض ہر ایک کام کے لئے خاص اوقات مقرر ہیں جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا ظاہر ہے کہ آٹھ دس برس تک جب اُن کی زندگی اس پابندیِ اوقات کے ساتھ گذرے گی تو امید نہیں کہ وہ عمر بھر اس عادت کو چھوڑ سکیں۔ اگرچہ بڑی عُمر کے لڑکوں کے لئے بھی فرائض اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے وہ طبیعتِ ثانی ہو جاتی ہے بخلاف بڑی عمر کے لڑکوں کے اوّل تو اُن کو بچوں کی برابر کالج میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے جو عادتیں وہ باہر سے سیکھ کر آتے ہیں اُن کا زائل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے محمڈن کالج میں بچپن سے رہنا بہ نسبت بڑی عمر کے لڑکوں کے زیادہ مفید ہے +

اطاعت کی مشق شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے اُس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اِس بورڈنگ ہؤس میں موجود ہیں ظاہرا ہندوستان کے کسی اِنسٹی ٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔ علاوہ کالج اور ہائی اسکول اور مارننگ اسکول اور نائٹ اسکول کے جہاں طالب علم

کو برابر پروفیسروں اور ماسٹروں کے آرڈر میں رہنا ضرور ہے وہ ہر وقت اپنے تئیں کسی نہ کسی ہیڈ یا افسر کے زیرِ حکم پاتے ہیں۔ جب تک وہ بورڈنگ ہوس میں ہیں پراکٹر کے محکوم ہیں جب تک ڈائننگ ہال میں رہتے ہیں ایک یورپین پروفیسر اُن کا نگران رہتا ہے۔ اسی طرح فیلڈ میں پر دوسٹ یا کیپٹن، یونین کلب میں پریذیڈنٹ یا اُس کا قائم مقام، جمناسٹک اور قواعد کے وقت ڈرل ماسٹر، گھوڑے کی سواری کے وقت رائڈنگ ماسٹر، بیماری کی حالت میں ڈاکٹر اور مسجد میں ایک دیندار عالم اُن کی روک ٹوک کے لئے مقرر ہیں جن کا حکم ماننا اُن کو ضرور ہے۔ ظاہر ہے کہ جب برابر آٹھ سات برس طالب علموں کی زندگی اِن ضوابط کے ساتھ بسر ہوگی۔ تو کس قدر باقاعدگی اور اطاعت اُن کی طبیعت میں پیدا ہو جائے گی؟ اور کس قدر وہ دُنیا میں ہر جگہ ہر دل عزیز ہو کر رہنا سیکھ جائیں گے؟

ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اس کی عادت اولاد کو ابتدائے عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے ابل بچھیرے کو سدھا کر اور باگوں پر صاف کر کے سواری کے قابل بنانا۔ جس طرح اوکھے اور سرکش گھوڑے کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جا[illegible] کثر اُ[illegible] [illegible] افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان ایسے فرماں بردار نہیں ہوتے جیسے ہندو اور اسی لئے یورپین افسر اُن کی نسبت ہندوؤں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اولاد جن کا مدارِ معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہے اُن کو سب سے زیادہ اطاعت فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی اور اطاعت میں منافات ہے صحیح نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دُنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے حالانکہ اُن سے بڑھ کر کوئی اپنے افسر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس محمڈن کالج کے بورڈنگ ہوس میں رہنے سے مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جس پر ان کی تمام آئندہ کامیابیاں منحصر ہیں۔

قومی لباس کا خیال

اس کے سوا مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لئے ایک اور چیز کی ضرورت ہے جس کو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابلِ التفات نہیں سمجھا، حالانکہ وہ ایک نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے۔

لباس جس کی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ "اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ" اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ انگرکھا، پاجامہ ٹوپی، عمامہ، پگڑی یا مُجوّتا غرض کہ کوئی چیز مسلمان کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو مسلمانوں میں پہلے صرف اُلٹے اور سیدھے پردے کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطعِ نظر اور ملکوں کے جہاں ہر قوم ایک خاص لباس رکھتی ہے خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنے قومی لباس سے پہچانی جاتی ہیں، جیسے پارسی، مرہٹے بنگالی، راجپوت وغیرہ۔ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لباس کا متحد ہونا قومی یگانگت کے بڑھانے اور مغایرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، نسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اس کے سوا جس قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی، اُن کی مجلسیں، اُن کے میلے اور اُن کی جماعتیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گوہار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے سرسید کو ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور مابہ الامتیاز پیدا کریں، اور چونکہ بقول ان کے آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اس کے رواج دینے پر زور دے، اس لئے اُنھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اوّل خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمڈن کالج کے بورڈروں کے لئے اس قاعدے کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عملدرآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا۔ لیکن محمڈن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہؤس میں آکر رہتے ہیں بغیر کسی جبر کے اپنے ہم چشموں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکش لباس اختیار کر لیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوشنما ہونے کے ہر موسم اور ہر حالت کے مناسب اور قواعدِ حفظِ صحت کے بھی موافق ہے اور جب وہ کالج چھوڑ کر وہی لباس اپنے وطن میں جا کر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان اُن کی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح محمڈن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگرچہ بعض تنگ دل انگریز جو ہندوستانیوں کو ہمیشہ پست اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ اِس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہم کو ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع لوگ ہیں جن کے ایسے متعصبانہ خیالات نہیں ہیں اس لئے محمڈن کالج کے طالب علم نہایت آزادی سے ٹرکش لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بے جا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

کالج کی سوسائٹیاں

نیز بورڈروں نے کالج کے احاطے میں متعدد سوسائٹیاں قائم کر رکھی ہیں۔ ازانجملہ ایک کالج یونین کلب اور دوسری اسکول یونین کلب ہے۔ کالج اور اسکول کے طلبا، ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے صدرِ انجمن کے رُوبرو انگریزی یا اردو میں معارضانہ بحث کرتے ہیں مگر کوئی بات آدابِ مناظرہ اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لا سکتے جو لڑکے ڈبیٹ یا اسپیکنگ میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ہیں اُن کو انعام دیئے جاتے ہیں اس سے علاوہ اسپیکنگ اور استدلال کا ملکہ پیدا ہونے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مجادلہ کا ناپسندیدہ طریقہ عموماً جاری ہے، اُس کی اصلاح کی اُن میں بُنیاد پڑتی ہے اور طالب علموں کو مختلف سوالات پر بحث کرنے کے لئے مختلف کتابیں دیکھنے اور ہر ایک سوال پر رائے قائم کرنے کا موقع ملتا ہے۔

طالب علموں ہی نے ایک دوکان ڈیوٹی شاپ کے نام سے بورڈنگ ہاؤس میں کھول رکھی ہے جو مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کر کے کالج اور طلبہ کی مدد کرتی ہے۔ اس سے اُن کے دل میں کالج کے ساتھ ہمدردی اور اُس کی امداد کے لئے عملی کام کرنے کی خود بخود ترغیب ہوتی ہے۔

ایک اور سوسائٹی برادرہڈ کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں اُن تمام طالب علموں نے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کہیں نوکر ہو گئے ہیں اپنی آمدنی میں سے فیصد ایک روپیہ ماہوار چندہ محض کالج کی امداد کے لئے دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے سوا دو اور سوسائٹیاں ہیں۔ ایک انجمن اخوان الصفا جس میں اُس کے ممبر آزادی کے ساتھ مختلف عنوانوں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے ہیں، دوسری لجنتہ الادب جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔

ایک اور سوسائٹی حال ہی میں سائنس پر لکچر دینے اور اُس کے تجربے دکھانے کے لئے طالب علموں نے قائم کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی گو ابھی ابتدائی حالت میں ہے مگر چونکہ وہ زمانے کے مقتضا کے موافق ہے اس لئے اُس کے ترقی کرنے کی بہت کچھ امید کی جاتی ہے +

ان سب سوسائٹیوں کے علاوہ ریاضتِ جسمانی کے لئے کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک کلب اور گھوڑے کی سواری کے لئے رائڈنگ اسکول ہے۔ اگرچہ رائڈنگ اسکول نے مسلمانوں کی کم ہمتی یا بے مقدوری کے سبب ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی مگر جو کلب ریاضتِ جسمانی کے لئے قائم ہیں اُن میں توقع سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے کالج ٹیم نے تمام ہندوستان کی یورپین اور ہندوستانی ٹیموں میں، جیسا کہ کالج کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے، توقع سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے +

مذہبی تعلیم

مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمڈن کالج میں ہونی چاہیئے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچی۔ لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے اور منتظموں پر عائد نہیں ہوتا۔ اوّل تو دو مذہبی کمیٹیاں شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے جُدا جُدا مقرر ہیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی، انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اِس قدر مشکل اور طویل الذّیل ہوتے ہیں کہ اُن کے پورا کرنے میں طلبہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے، یہاں تک کہ اگر اُن پر مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ بایں ہمہ جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اِس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل اس کی سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے، ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود نہیں ہے +

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تقلید سے اس کالج میں تربیت کا مذکورہ بالا سامان مہیا کیا گیا ہے اُن کے مقابلے میں اِس کالج کو مشکل سے ایک خاکہ یا ادھورا نمونہ اُن کالجوں کا کہا جا

سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورہ بالا کالج کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڑھ محمڈن کالج بیس بائیس برس کے عرصے میں پہنچ گیا ہے اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا، انگلستان کے بڑے بڑے نامور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گمنامی اور پستی کی حالت میں رہی ہیں اور جس طرح بتدریج قوم میں تعلیم بڑھتی گئی اسی طرح آہستہ آہستہ اُن کی حالت ترقی کرتی گئی۔ پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت پر نظر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا ہے اگر انھیں اصول کے موافق وہ ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس میں وہ کس درجے پر پہنچ جائے گا۔

بیشک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابلِ اعتراض موجود ہیں جن کو سرسیّد کی خود رائی اور ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ صدیوں کے کام مہینوں اور دنوں میں پورے نہیں ہو سکتے اور ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قومی انسٹی ٹیوشن کو اُس حد تک پہنچا جائے جس کے بعد کسی اصلاح یا ترقی کی ضرورت نہ رہے اور ایک ریفارمر جس نے اگلے وقتوں کے بہت سے خیالات اور بہت سی رایوں کی اصلاح کی ہو اُس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ساتھ کے ساتھ اپنے خیالات اور اپنی رایوں کی بھی اصلاح کرتا جائے۔

یوروپین اسٹاف

ایک اور خصوصیت اِس کالج کی یوروپین اسٹاف ہے جس کو بانیٔ کالج نے متعدّد وجوہ سے نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ اُن کی رائے تھی کہ اوّل تو ہندوستانی تعلیم یافتہ علمی لیاقت اور طرزِ تعلیم کے لحاظ سے بھی یوروپین پروفیسروں کی برابری نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسے لائق ہندوستانی پروفیسر میسّر بھی آجائیں تو اُن کا اثر طلبہ کی تربیت پر جو اس کالج کا اصلی مقصود ہے ویسا ہرگز نہیں پڑ سکتا جیسا انگریز پروفیسروں کا پڑ سکتا ہے۔ ڈیوٹی کا خیال، وقت کی قدر، قواعدِ حفظِ صحت کی پابندی، سلیف ہیلپ، مستعدی اور ریاضتِ جسمانی کی عادت یہ تمام خصلتیں یوروپ میں بھی انگریز قوم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔ خصوصاً انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ شریفانہ اخلاق کے لحاظ

سے تمام قوم میں ممتاز گنے جاتے ہیں۔ اس کے سوا کالج کا نظم ونسق اور افسرانہ رعب وداب جیسا کہ ایک انگریز معلّم کالج یا اسکول میں قائم رکھ سکتا ہے، ہندوستانی معلموں سے اس کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی لئے کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یوروپین ہونا چاہیئے اور جہاں تک کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے اور جب کسی یوروپین پروفیسر کی ضرورت ہو تو انگلستان کی کسی مشہور یونیورسٹی کا گریجویٹ جس کی علمی اور اخلاقی فضیلت پر اُس کے اُستادوں نے شہادت دی ہو ایک ہزار روپیہ سفر خرچ دے کر بُلایا جائے۔ چنانچہ اب تک چار چار یا پانچ پانچ یوروپین افسر کالج اور اسکول میں برابر مقرر رہے ہیں اور اگر کالج فنڈ میں گنجائش ہو تو ممکن ہے کہ عند الضرورۃ اُن کی تعداد اس سے زیادہ بڑھ جائے۔

اگرچہ بظاہر جو بیش قرار تنخواہیں یوروپین عہدہ داروں کو دی جاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یوروپین اشاف نے عام طور پر اُس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے اُن کو کالج کا جزوِ اعظم قرار دیا ہے۔ وہ باوجود قومی، مذہبی اور ملکی مغایرت کے محمڈن کالج کو گویا اپنا قومی انسٹی ٹیوشن سمجھتے ہیں، وہ اپنے طلبہ کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں، ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں، ان کی مجلسوں میں، اور اُن کے مباحثوں میں وہ خود دلی شریک ہوتے ہیں اور اسٹیشن کے یوروپین افسروں اور اُن کی لیڈیوں کو شریک کرتے ہیں اور اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں اُن کا اعتبار زیادہ ہو، اُن کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھاتے ہیں۔ خود اُن کا برتاؤ جو ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہے انگلش نیشن کی محبت اور وقعت اُن کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ طرح طرح سے اُن کو غیرت دلاتے ہیں اور اُن کی غفلت کے نتائج سے اُن کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں، شائستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی، ضبطِ اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرکٹر پر نہایت قوی اور پائدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقے سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالب علموں کی طرح طرح سے امداد اور تقویت کرتے ہیں، بیماروں کی خبر لیتے ہیں، کالج کے

چندوں میں شریک ہوتے ہیں، اُس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں اُس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور اُس میں وہ تمام انتظامات اور تربیت کے طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ جاری کرتے جاتے ہیں۔ وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں، مسجد کی غیر حاضری پر اُن کو سزائیں دیتے ہیں۔ مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی اُن کو تاکید کرتے ہیں مولود کی مجلسوں اور اُن کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔

ایک بڑا بدیہی ثبوت اس بات کا کہ وہ محمڈن کالج میں کس وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، یہ ہے کہ مسٹر آرنلڈ پروفیسر آف فلاسفی جو کالج کی بدقسمتی سے یہاں کا تعلق ترک کر کے لاہور کالج میں چلے گئے ہیں، اُن کی روانگی کے زمانے میں ہر شخص کو جو کالج سے تعلق رکھتا تھا اس قدر افسوس ہوا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً کالج کلاسوں کے طالب علم جو اُن کا لیکچر سنتے تھے اُن کو مسٹر آرنلڈ کی اور مسٹر آرنلڈ کو اُن کی جدائی کا جس قدر رنج اور قلق ہوا تھا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان سے پہلے جب مسٹر والس پروفیسر اور مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر نے کالج سے قطع تعلق کیا تھا اس وقت بھی تمام کالج کو اسی کے قریب قریب رنج ہوا تھا جیسا کہ اس سال مسٹر آرنلڈ کے جانے سے ہوا اور اسی طرح مسٹر ڈنٹن مرحوم ہیڈ ماسٹر کے قبل از وقت مر جانے پر کالج کے تمام متعلقین نے مثل اپنے عزیزوں کے رنج و ماتم کیا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کالج کو ہمیشہ ایسے ہی دل سوز اور مسلمانوں کے ہمدرد پروفیسر ملتے رہیں گے جن کا ذکر اوپر ہوا یا جیسے کہ اب کالج میں موجود ہیں لیکن بہر حال یورپین اسٹاف کا اس کالج میں ہونا خاص کر مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء سے، بلکہ اُس وقت سے جب کہ ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگلش قوم کے ہاتھ میں گئی، ہندوستان کے مسلمانوں کا حال بعینہٖ ایک نوجوان بیوہ کا سا رہا ہے کہ کیسی ہی عفیفہ اور پاک دامن ہو مگر بدگمانیوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح اپنے مذہب کی رُو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ سچے دل سے انگلش گورنمنٹ کے وفادار رہیں اُسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضرور ہے کہ حکمران قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان

ہونے کا موقع نہ دیں۔ آج کل انگریزی تعلیم سے انگریزوں میں تقریباً ویسی ہی بدگمانی پائی جاتی ہے جیسی کسی زمانے میں جہالت اور تعصب سے پائی جاتی تھی۔ پس ایک ایسا انسٹی ٹیوشن جہاں چار چار سو مسلمان ایک وقت میں انگریزی تعلیم پاتے ہوں اور کئی کئی برس تک دن رات وہیں زندگی بسر کرتے ہوں، جب تک کہ اُس میں متعدد یوروپین افسر اُن کے نگران اور اُن کے خیالات کی اصلاح کرنے والے موجود نہ ہوں حکمران قوم کے اطمینان کے لائق نہیں ہو سکتا۔

انھیں خیالات سے سرسید نے کم سے کم چار یوروپین افسروں کا ہمیشہ کالج اور اسکول میں رہنا کالج کے قواعد میں داخل کر دیا ہے اور اس تدبیر سے کالج کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کی آئندہ توقع ہے۔ زیادہ تر اسی خصوصیت کی وجہ سے گورنمنٹ پندرہ ہزار چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد اس کالج میں دیتی ہے اور اسی سبب سے تمام اینگلو انڈین افسر اور حکام عموماً اس کالج کی نسبت عمدہ خیال رکھتے ہیں۔ دُور دُور سے نابالغ سردار زادوں اور رئیس زادوں کو تعلیم کے لئے یہاں بھیجتے ہیں، ہر صوبے میں یہاں کے طالب علموں کو خوشی سے نوکریاں دیتے ہیں۔ بعض اوقات پرنسپل سے خود درخواست کر کے یہاں کے طلبہ کو نوکری کے لئے بلاتے ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر انگریز کالج کو آکر دیکھتے ہیں، چار وائسرائے اور چھ سات لیفٹیننٹ گورنر اب تک یہاں آچکے ہیں۔ لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپیہ اسکالرشپوں کے لئے اس کالج کو عنایت کیا ہے اور اُن کے سوا کئی وائسراؤں اور لفٹننٹ گورنروں نے اس میں چندہ یا تمغے دئے ہیں خصوصاً سرسید کی وفات کے بعد جو خاص توجہ اور مربیانہ سرپرستی حضور لارڈ ایلگن اور آنریبل مسٹر لاٹوش اور خاص کر سر انٹونی مکڈانل نے کالج کی نسبت ظاہر فرمائی ہے اُس کی شکرگزاری سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور منتظمانِ کالج خصوصاً کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام امتیازات زیادہ تر یوروپین اسٹاف اور خاص کر مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل کالج کی بدولت اِس انسٹی ٹیوشن کو حاصل ہوئے ہیں۔ انھیں وجوہات سے سرسید کالج کی باگ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جانی نہیں چاہتے تھے جس سے یوروپین اسٹاف کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنے کی، جیسا کہ وہ خود اُن کے ساتھ رکھتے تھے، توقع نہ ہو۔

کالج کی نسبت مدبرانِ سلطنت کی رائیں | جو رائیں اور خیالات محمڈن کالج

یا اُس کے طلبہ اور اُس کے بانی کی نسبت مدبرانِ سلطنت نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں یا تقریروں میں ظاہر کئے ہیں اُن میں سے کچھ کچھ فقرے انتخاب کر کے ہم اِس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

سر جان اسٹریچی ۱۸۸۰ء میں سر جان اسٹریچی نے اُس ایڈریس کے جواب میں جو ہندوستان سے جاتے وقت اُن کو کالج میں دیا گیا تھا کہا کہ "سب سے بڑا اور انجیر کام جس میں اُنھوں نے (یعنی سر سید احمد خاں نے) اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل کو صرف کیا ہے یعنی اپنے ہموطنوں کی تعلیم اور اُن کی حالت کو ترقی دینے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان زیادہ تر اتّحاد اور ہمدردی پیدا کرنے کا وہ کام ہے جس کے بعض نتیجوں کو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ یہ نتیجے آئندہ زمانے میں اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہوں گے لیکن اب بھی میں اِس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی پچھلی تواریخ کے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات میں سے تصوّر کرتا ہوں"۔

پھر صاحب ممدوح نے اپنی کتاب "اِنڈیا" میں اوّل ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا یہ فقرہ جو محمڈن کالج کے متعلق ہے نقل کیا ہے کہ "بعض اعتبارات سے یہ کالج ہندوستان میں سب اِنسٹی ٹیوشنوں سے اعلیٰ درجے کا انسٹی ٹیوشن ہے جو تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا وعدہ کرتا ہے انگریزی حکومت کے آغاز سے لے کر اب تک مسلمانوں کی ذاتی کوشش کا یہ پہلا اظہار ہے۔ علی گڑھ کی جماعت نے ایک مثال پیدا کی ہے جس کی اگر اچھی طرح سے پیروی کی جائے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دے گی۔ اُن لوگوں کی جنھوں نے ایسی دلسوزی سے محنت کی ہے اور اُس مدد کی جو سرکار کو تعلیم اور ترقی کے کام میں ملا ہے جہاں تک قدر و منزلت کی جائے نامناسب نہ ہوگی" اس کے بعد وہ اپنی کتاب "اِنڈیا" میں اہلِ انگلستان سے محمڈن کالج کی سفارش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اُنھیں (یعنی اہلِ انگلستان کو) اپنی مدد سید احمد خاں کے کالج کے واسطے بھیجنی چاہیئے، اُن کو اس سے زیادہ طمانیت بخش موقع نیکی کرنے کا نہیں ملے گا"

ڈاکٹر ہنٹر ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریذیڈنٹ تھے، اضلاعِ شمال مغرب کے دورہ کے وقت صرف محمڈن کالج کی عظمت و شان کے لحاظ سے کمیشن کا پہلا اجلاس علیگڈھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ جو ایجوکیشن کے باب

میں تھی وہ کالج کے بڑے ہال میں آکر کی اور کالج کی نسبت کہا "صاحبو یہ کالج جس میں ہم جمع ہوئے ہیں، چونکہ یہ ایک نہایت عظیم اور شریف کوشش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے کی گئی ہے، اس کمیشن کا پہلا اجلاس جو اضلاعِ شمال مغرب میں ہونا چاہیئے تھا علی گڑھ میں تجویز ہوا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی اور اس مقام پر آنا اس سیلف ہیلپ کی عظیم الشان مثال کی خوبی کا ایک ثبوت خیال کیا جائے گا۔ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہیلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔ پھر کہا کہ "یہ ایک نہایت شریف کام ہے جو کسی فائق انسان کے ہاتھوں سے دنیا کے پردے پر ہوا ہو اور یہ میرے پاس موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جس نے بیس برس کی پُرصبر اور پُر استقلال کوششوں سے اس کام کو انجام دیا ہے" پھر کہا کہ "پہلے دس برسوں میں میرے دوست سید کو اکثر مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور اُس کے اختیار کئے ہوئے کام میں بہت کم ترقی ہوئی۔ اُس کو اپنے بعض خیالات چھوڑ کر نئی تجویزیں اختیار کرنی پڑیں اور لوگوں کی مخالفت اور ناراضی اور اپنے پُرانے دوستوں کی سرد مہری اور جاہل دشمنوں کی پُرضرر شورش نہایت تحمّل سے برداشت کرنی پڑی مگر اُس نے ایک لمحہ کے واسطے ہمّت نہ ہاری۔ رفتہ رفتہ مگر مضبوطی سے اس کے مقصد نے ترقی پائی۔ لوگوں نے اُس پر اعتماد کیا کیونکہ وہ اپنے کام پر اعتماد رکھتا تھا"

سر الیفرڈ لائل

سر الیفرڈ لائل نے اس کالج کی نسبت کہا کہ "اس نظیر کے قائم کرنے سے کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور رعایا اور علی العموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے، کیونکہ وہ ہم کو ایک ایسے مسئلے کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جو اب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصے میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہو"

سر آکلنڈ کالون

سر آکلنڈ کالون نے محمڈن کالج کے طالب علموں کی نسبت کہا کہ "جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلے ہیں، وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پبلک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجویٹ

ظاہر کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کا طالب علم فیاضانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ خصلت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اُس فرقے کا ایک نمونہ ہوگیا ہے جو انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اُس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی اُن کی خواہشوں کی اسی طرح داد دیں"۔

مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ

مسٹر کین جو پارلیمنٹ کے ایک نامور اور بنی نوع کے خیرخواہ ممبر ہیں اور جو پچھلے برسوں میں شراب اور مسکرات کے استعمال کے خلاف ہندوستان میں لکچر دینے اور اصلی حالات تحقیق کرنے کے لئے آئے تھے، اُنھوں نے سفرِ ہندوستان کے متعلق ایک کتاب موسوم بہ پکچر سک انڈیا لکھی ہے۔ جس کے ایک باب میں علی گڑھ کالج کی نسبت نہایت عمدہ اور مفصّل خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اُن میں سے ہم چند فقروں کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج دوسرے کالجوں سے اِس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ ایک خاص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹکل جوش پھیلانے والا ہے۔ اسی فیلنگ کا یعنی اس بات کا کہ قومی بہبودی اسی اصول پر منحصر ہے جس کا وہ پابند ہے، یہ نتیجہ ہے کہ اس کی بڑی امداد کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کا ترقی یافتہ گروہ بلکہ گورنمنٹ انگریزی بھی نہایت توجہ اور شوق سے اُس کی جانب نظر رکھتی ہے" دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اوّل تو اِس میں مسلمان طالب علموں کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سُن کر طالب علم اسی وسیع احاطے کی تمام اطراف سے اپنے آباؤ اجداد کے عقیدے کے موافق عبادت کرنے کے لئے مسجد میں جمع ہوجاتے ہیں۔ نماز کے علاوہ قرآن اور دینیات اور اخلاق کی کتابوں کا پڑھنا کالج کے سلسلۂ خواندگی کا ایک حصّہ ہے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ جو طالبعلم اس کالج سے نکلیں گے وہ قدیم خیالات پر نئے علوم کا پیوند لگا دیں گے اور اُس کے ذریعہ سے پُرانے خیالات کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلیں اور جو طریقہ قوم کو اس کی ذلیل حالت سے نجات دینے کا موجود ہے اُس کو اختیار کریں۔ دوسرا اصُول جس میں یہ کالج سرکاری مدارس سے ممتاز ہے، یہ ہے کہ اُس میں برخلاف سرکاری مدارس کے

صرف عقلی تعلیم ہی پر توجہ نہیں کی جاتی، بلکہ وہ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نمونے پر قائم کیا گیا ہے۔ سب طالب علم ایک احاطے میں رہتے ہیں، ایک جگہ کھانا کھاتے ہیں اور ایک صحت بخش کالج لائف سے حظ اٹھاتے ہیں۔ کسی ملک میں ایک ایسے انسٹی ٹیوشن کا پایا جانا مشکل ہے جو اس کالج کی بہ نسبت زیادہ تر زبردست جوش باہمی اتحاد کا پیدا کرتا ہو۔ قوم کی امیدیں اس انسٹی ٹیوشن کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ ایک بڑی کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے باب میں ایسی قوم نے کی ہے جس میں تقدیر پر بھروسہ کرنے کے عقیدہ نے تمام ہمتیں اور ارادے پست کر دئیے ہیں۔" پھر کرکٹ کلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ "کالج کی ایک ٹیم تمام اپر انڈیا میں ہندوستانی ٹیموں سے گوئے سبقت لے جاتی ہے اور اسٹیشن کی نہایت عمدہ الیونوں کا مقابلہ کرتی ہے"۔ پھر یونین کلب وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "ڈبیٹنگ سوسائٹی جو کیمبرج یونین کلب کے نمونے پر قائم کی گئی ہے لڑکوں کو جلسۂ عام میں گفتگو کرنے اور انگریزی طریقے پر کاروبار انجام دینے کا سبق دیتی ہے۔ کالج کی دعوتوں اور جلسوں اور مذہبی تہواروں، شاعرانہ صحبتوں، کرکٹ، فٹ بال اور اور جسمانی ورزشوں کے باعث نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی کے مختلف طریقوں میں دل بہلانے کے لئے مدد ملتی ہے اور اُن کی مختلف لیاقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ معلموں اور طالب علموں میں کسی قسم کا تفرقہ جو قومی اختلاف سے پیدا ہوتا ہے مطلق نہیں ہے۔ علی گڑھ میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو صفائیِ قلب اور دلی میل جول دیکھا جاتا ہے، ویسا شاذ و نادر ہی ہندوستان میں کہیں اور دیکھا جاتا ہے۔ اسٹیشن کے انگریز جنٹلمین اور لیڈیاں کالج کے طالب علموں کی بیچ پر دعوت کرتے ہیں اور کالج کے ہال میں اُن کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اس طرح پر محبت کی فیلنگ کی ایک ایسی بنیاد قائم کی گئی ہے کہ اگر اس کو ترقی ہو جائے تو وہ ہندوستان کے باشندوں اور انگریزی حکومت دونوں کے حق میں بیشمار فائدوں کا باعث ہو گی۔ ایسے موقعوں پر معزز بزرگ سید نے اکثر اوقات پُر جوش سرگرمی کے ساتھ اپنی یہ دلی آرزو ظاہر کی ہے کہ انگریز اور مسلمان سچے دوست ہو جائیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے کام کیا کریں اور انھیں موقعوں پر اُس نے کالج کے اُس نشان کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ہلال پر ایک صلیب لگی ہوئی ہے۔"

سر اینٹونی مکڈانل | سر اینٹونی مکڈانل نے جو ۱۸۹۶ء میں ٹرسٹیان کالج کی ایڈریس کا جواب

دیا تھا اس میں اُنھوں نے کالج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "ایک بڑے شاعر کا قول ہے کہ صلح کی فتوحات لڑائی کی فتوحات کی نسبت کچھ کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ہمارے عہد کی مصالحت آمیز فتوحات میں اس کالج کا قائم ہونا یقیناً ایک فتح ہے جس سے سب کے دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور کسی کے دل کو تکلیف یا رنج نہیں پہنچتا۔ یہ ایک ایسی فتح ہے جس کی رونق مرورِ زمانہ کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی"۔ پھر فرمایا کہ "میں اِس انسٹی ٹیوشن کو نہایت عزت کے لائق سمجھتا ہوں جس طرح پر کہ میں کسی شخص کو پسند کرتا ہوں، اسی طرح پر میں اُس انسٹی ٹیوشن کو پسند کرتا ہوں جو آپ اپنے اوپر بھروسا رکھتا ہو اور فخریہ طور پر آزاد ہو اسی کے ساتھ گورنمنٹ کی فیاضانہ مہربانی کی واجبی طور پر قدر کرتا ہو" پھر اسپیچ کے خاتمہ پر یہ الفاظ کہے "اس بات کی اُمید کرنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ یہ کالج ترقی پا کر آئندہ مسلمانوں کی بڑی درسگاہ ہو جائے گا اور یہ مقام مشرق کا قرطبہ ہو جائے گا"۔

لارڈ ایلگن نے نومبر ۱۸۹۷ء میں، جبکہ سرحد پر سرکاری فوج آفریدیوں سے لڑ رہی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت اینگلو انڈین اخبارات حکمران گروہ میں بدگمانی پھیلا رہے تھے، محمڈن کالج میں آنے کی خود خواہش ظاہر کی اور جو ایڈریس ٹرسٹیان کالج کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کی گئی اُس کے جواب میں اُنھوں نے اُس وقت جب کہ کالج کے تمام طالب علم اُن کے سامنے حاضر تھے، یہ فرمایا کہ "صاحبو کوئی وقت ایسا نہیں ہے جبکہ اس قسم کا مجمع میری طبیعت کو اس قدر خوش معلوم ہو سکے جیسا کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں اور اِس وقت گورنمنٹ ہند بالکل اپنی خواہش کے برخلاف اُن قوموں کے ساتھ جو تمہارے ہم مذہب ہیں، علانیہ لڑنے پر مجبور ہوئی ہے اور ایسے شخصوں کی کچھ کمی نہیں ہے جنھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اُس کی مسلمان رعایا کے درمیان مخالفت روز بروز روبہ ترقی ہے ..... صاحبو ان قابلِ افسوس ہنگاموں میں ہم نے پھر اُس بات کو دیکھا ہے جو ہم اکثر اوقات سابق میں دیکھ چکے ہیں، یعنی حضور ملکۂ معظمہ کی نسبت مسلمان رعایا کی خیر خواہی اور بہادری کو اور میں اس جگہ یہ ایک زیادہ تر بُرامن موقع پر اس بات کو تسلیم کرنے اور معلوم کرنے

سے خوش ہوں کہ اس کالج کے اندر پُرامن صورتوں میں خیر خواہی اور وفاداری کا وہی جوش ترقی پر ہے جیسا کہ میدانِ جنگ میں ظاہر کیا گیا ہے"۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے عمدہ خیالات مُدبّرانِ سلطنتِ انگلشیہ اس کالج کی موجودہ حالت دیکھ کر وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ ایک تعلیمی انسٹی ٹیوشن کی عمدگی پر ان لوگوں کی شہادت سے بہتر کسی کی شہادت نہیں ہوسکتی۔

یہ ہے سید احمد خاں کی زندگی کا وہ کارنامہ جس کی اگرچہ مسلمانوں نے عام طور پر اب تک کچھ قدر نہیں کی لیکن یورپ کے نامور اخبار ٹائمز آف لندن نے گذشتہ اپریل میں اسی کارنامے پر سرسیّد کی نسبت لکھا تھا کہ "اس شخص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں تعلیم کا پروفٹ کہا جائے تو بجا ہے" اگرچہ اس عظیم الشان کام کی ابتدائی مشکلات اُس مرحوم کی جانفشانی اور استقلال سے تقریباً بالکل حل ہوگئی ہیں، مذہبی مخالفتوں اور بدگمانیوں کا طوفان فرو ہوگیا ہے، کالج کی سالانہ آمدنی اور خرچ کی نوبت پون لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے، عمارتیں جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر بنانی منظور تھیں گو ابھی اُن کی تکمیل نہیں ہوئی مگر قوم کی تھوڑی سی توجہ سے پوری ہوسکتی ہے، یورپین اور نیٹو اسٹاف توقع سے زیادہ عمدہ اور قابلِ اطمینان بہم پہنچ گیا ہے۔ یونیورسٹی کے نتائجِ امتحان کالج اور اسکول کی وقعت اور اعتبار لوگوں کی نظر میں روز بروز زیادہ کرتے جاتے ہیں، بورڈنگ ہوس ایک بےنظیر نمونے پر جیسا کہ کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا طلبہ کی تربیت کے لئے قائم ہوگیا ہے۔ مذہبی تعلیم و تربیت کا سامان بھی جہاں تک کہ منتظمانِ کالج کی قدرت میں تھا مہیا کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گورنمنٹ نے اُس کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے مگر درحقیقت اُس کا تھامنا اُس کی اصلاح کرنا اور اُس کو ترقی دینا قوم کا اور صرف قوم ہی کا کام ہے۔ اگرچہ سرسیّد کی زندگی میں تو لوگ قوم کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی کالج کی حالت دگرگوں ہوجائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ سرسیّد کے بعد مسلمانوں نے بالکل خلافِ توقع اور خلافِ امیّد کالج کی طرف توجہ ظاہر کی ہے کہ بقول ایک ظریف کے اگر سرسیّد کو یہ خبر ہوتی کہ میرے بعد لوگ ایسی سرگرمی ظاہر کریں گے تو وہ بن آئی موت مر جاتے۔

ترقی تعلیم کی دیگر تدبیریں سرسیّد نے ترقیٔ تعلیم کی غرض سے صرف محمڈن کالج قائم کرنے

اور اُس میں تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم کی اصلاح اور ہائی ایجوکیشن کی ضرورت پر وُہ اخیر دم تک اپنی تحریروں اور اسپیچوں میں برابر زور دیتے رہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم کو وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کے حق میں غیر مفید خیال کرتے تھے۔ اور جب سے ملک میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے اُن کو سخت اندیشہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے جو مر مر کر تعلیم کے وسائل مہیا کئے گئے ہیں کہیں یہ تمام کوششیں برباد نہ ہو جائیں اور سر منڈاتے ہی اولے نہ پڑ جائیں، اس لئے وہ ہمیشہ یونیورسٹیوں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جب کبھی اُن کو گورنمنٹ کے تیور ہائی ایجوکیشن کے برخلاف معلوم ہوئے اُنھوں نے فوراً اُس کی حمایت پر قلم اٹھایا اور نہایت دلیری اور بے باکی سے اس پالیسی کی تغلیط کی۔ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے وقت یونیورسٹی کے نقص اور سقم ظاہر کرتے رہے۔

ہائی ایجوکیشن کی حمایت

ہائی ایجوکیشن کے متعلق انھوں نے کمیشن کو آگاہ کیا کہ لوگوں میں عموماً یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن بند کرنا چاہتی ہے پس اگر گورنمنٹ کوئی کالج توڑے گی، خواہ اُس کے توڑنے کی کیسی ہی معقول وجوہات ہوں، لوگ یہی سمجھیں گے کہ سرکار ہم کو اعلیٰ درجے کی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت

اس سے پہلے ۱۸۸۱ء میں جس شد و مد کے ساتھ اُنھوں نے اس بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگی۔ اس مخالفت کی بُنیاد یہ تھی کہ اوّل لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات میں جو اسپیچیں کیں اُن سے مشرقی علوم کی ترغیب و تحریص کی بُو آتی تھی۔ اس کے بعد جو ایڈریس اہلِ پنجاب نے لارڈ رپن کی حضور میں گذرانے اور جو جواب حضورِ ممدوح نے اُن پر دیئے اُن سے یہ احتمال قوی ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں ہائی ایجوکیشن کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ہز اکسلنسی کے جواب میں یہ الفاظ موجود تھے کہ "ترقی و اشاعتِ زبانہائے مشرقی و علوم مشرقی نہایت ہی کارِ احسن ہے ..... اور جہاں تک میری محدود واقفیت معاملاتِ ہندوستان میں ہے، میں اُن خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف زبانہائے دیسی کے توسل سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین سہولت سے ہو سکتی ہے۔"

اور جس ایڈریس کے جواب میں ہز اکسلنسی نے یہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "ساڑھے تین لاکھ روپیہ جو سرمایۂ یونیورسٹی کالج ہے والیانِ ریاستہا و دیگر رؤسائے پنجاب نے دراصل زبانہائے دیسی کی تکمیل سے تعلیم کو رواج دینے کی غرض سے عطا کیا تھا۔ سینیٹ کو اس بارے میں کچھ شک نہیں کہ علم کو زبانہائے دیسی کے توسّل سے ترقی دینا تعلیم کی ضروریات کو ملک کے حسبِ حال بنانے کا بہترین طریقہ ہے اور سینیٹ اور گورنمنٹ ہند کا بھی یہی مقصد ہے"۔

جب یہ ایڈریس اور اس کا جواب شائع ہوا اور سرسیّد کی نظر سے گذرا تو اُن کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا اور جیسا کہ اُن کی طرزِ تحریر سے پایا جاتا ہے، عنانِ صبر اُن کے ہاتھ سے جاتی رہی اُنھوں نے حد سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف لکھ کر شائع کئے جن کا تمام پنجاب میں غل پڑ گیا۔ تعلیم یافتہ گروہ نے جن میں زیادہ تر ہندو ایجوکیٹڈ شامل تھے تینوں آرٹکلوں کو ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیا اور تمام پنجاب میں اُن کو عام طور پر شائع کر دیا جس سے پنجاب یونیورسٹی کے اکثر حامیوں کی رائیں بدل گئیں اور ڈاکٹر لائٹنر جو مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کے نہایت سرگرم حامی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کو گویا ورنیکلر اورینٹل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے اُنھوں نے سرسیّد کے آرٹکلوں کا انگریزی اور اُردو زبانوں میں جواب لکھ کر شتہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق "قَدْ سَبَقَ السَّيْفُ الْعَذْلَ"[1] سرسیّد کی تحریریں اپنا کام کر چکی تھیں اور اس لئے اب اُن کا جواب لکھنا اور اُن کی تردید چھاپنی بے سود تھی۔ اگرچہ یہ تینوں آرٹکل بہت لمبے ہیں اور یہاں اُن کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بھی سرسیّد کی ملکی خدمات میں سے ایک خدمت ہے اور اُس کی وقعت کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اُن تحریروں میں سے کچھ فقرے بطور نمونہ کے ناظرین کو دکھائے جائیں، اس لئے ہم تینوں آرٹکلوں میں سے بعض بعض مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

پہلے آرٹیکل کو جس کا عنوان "مشرقی علوم و فنون" ہے وہ اس طرح شروع کرتے ہیں "ہم کو نہایت ہوشیاری سے دیکھنا چاہیئے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے اور ہمارے

---

[1] یعنی تلوار چل چکی اب ملامت بے فائدہ ہے۔

ملک کی بہبودی اور ترقی کے لئے ہے، ایسا نہ ہو کہ صرف دھوکا ہو۔ ہم کو اس وقت پچھلے زمانے کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا میں ایشیائی سلطنت کے زمانے میں علوم و فنون کیا تھے اور اُن کے وقت میں اُن کو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی محض بے فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانے کے حالات پر جو گورنمنٹ انگلشیہ کی حکومت کا زمانہ ہے، غور کرنا اور اُس کو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لئے زیادہ مفید اور زیادہ تر بکار آمد ہے"۔

اس کے بعد انھوں نے وہ مختلف طریقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ابتدائے عملداری سے اختیار کرتی رہی یعنی اول ہندوستانیوں کی تعلیم کے فرض سے غافل رہنا، پھر اُن میں علوم مشرقی کے رواج دینے میں کوشش کرنا اور آخر کار لارڈ مکالے کے اصرار سے اہلِ ہند کو یورپ کے علم و حکمت کی تعلیم دینا، بیان کئے ہیں پھر انھوں نے دینیات کو مستثنٰے کرنے کے بعد مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی جس کو پنجاب یونیورسٹی از سرِ نو زندہ کرنا چاہتی تھی خوب قلعی کھولی ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ مکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اُس کو بہشت نصیب کرے کہ اُس نے اس دھوکے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا۔ کیا وہ ٹٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے؟ ایڈریس کے ساتھ (جو لارڈ رپن کو دیا گیا تھا) بڑے بڑے ہندوستانی سرداروں کا ہونا اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چندوں کا دے دینا مثل اُسی فیاضی کے ہے جو ہمیشہ وہ اصلی مقصد سے ناواقف رہ کر دیگر اسباب سے کیا کرتے ہیں۔ اُن کی شان و شوکت ایسے امر کی، جو فی الحقیقت کچھ وقعت نہیں رکھتا، وقعت نہیں بڑھا سکتی چند ناعاقبت اندیش ہندوستانی شاید ان باتوں سے خوش ہوتے ہوں گے اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہوں گے، مگر دُور اندیش آدمی ان باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس و مایوسی سے گورنمنٹ اور اُن یورپین اعلیٰ درجہ کے حکام کی کارروائی کو جو اس میں شریک ہیں، دیکھتے ہیں"۔

"ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیر خواہی سے بتانا چاہتے ہیں کہ سمجھدار اور دُور اندیش ہندوستانی اِن تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ نہایت

بدخیال اُن کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ چند سال گزرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا) کہ اُن کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تعلیم دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کہ اُس کو ضرورت ہے اور ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظامِ ملک اور انتظامِ دفتر کے لئے چند ایسی پتلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں، مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ مانچسٹر میں سُوت کاتنے کے لئے تکلیوں کی ضرورت ہے جو کچھ کہ وہ (یعنی گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اُس کا شکرگزار نہ تھا اس لئے اُس کو خودغرضی پر محمول کیا جاتا تھا نہ رعایا پروری پر"۔

"کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا (یعنی جب کہ ہندوستان میں کلکتہ بمبئی اور مدراس یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں)، کہ ہندوستانیوں میں یہ بدخیال دُور ہوا تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالیسی بدل دی ہے اور درحقیقت اُس کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دینا اور ہندوستانیوں کو انھیں کے فائدے کے لئے تعلیم دینا مقصود ہے، مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبّرانِ سلطنت کی پالیسی پھر بدلی ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی تعلیم دینا زیادہ مناسب نہیں سمجھتی۔ ان کو (یعنی ہندوستانیوں کو) اب تک یقین نہیں ہے کہ یہ پالیسی دراصل مستحکم ہو گئی ہے اور اس پر عمل کرنا فی الواقع قرار پا چکا ہے۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آتے جاتے ہیں جیسے کہ حضورِ عالی لارڈ لٹن کے وقت میں انڈین سول سروس کے قواعد قرار پائے اور جیسے کہ جنابِ ممدوح نے بعض اسپیچوں میں علومِ مشرقی کی ترقی کی ترغیب دی، یا جیسے کہ یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کامل یونیورسٹی بنانے کی درخواست کے وقت پیش آیا، دُور اندیش ہندوستانیوں کو نہایت تردّد میں ڈالتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ پالیسی مستحکم ہوگئی ہے اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی کی جاتی ہے جس کہ

لے چونکہ انڈین سول سروس کے قواعد میں امیدواروں کے لئے کسی یونیورسٹی کی ڈگری کی شرط نہیں تھی، اس لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن کو موقوف کرنا چاہتی ہے۔ ۱۲۔

ہمارے محسن لارڈ مکالے نے اپنی نہایت سچی تحریروں اور زبردست ہاتھوں سے اُٹھایا تھا۔ ہم نے کوئی مجلس لائق ہندوستانیوں کی ایسی نہیں پائی جس میں ان خیالات کی روز بروز ترقی نہ ہوتی ہو۔ ہمارا دلی مقصد ہے کہ ہم اصلی حال اُن ہندوستانیوں کی فیلنگ کا جن کی فیلنگ درحقیقت قدر دغور کے لائق ہے، گورنمنٹ سے مخفی نہ رکھیں اور اس میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی جماعت کی باتوں سے جن کے ظاہری بدن زروجواہر سے جگمگاتے ہیں اور جن کے تمام کام درحقیقت دیگر اسباب پر مبنی ہیں، نہ واقعی واقعات پر، دھوکے میں نہ آوے۔"

دوسرے آرٹیکل میں جس کا عنوان "ورنیکلر یعنی ہماری زبان" ہے اُنھوں نے اوّل اُن مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کرنے میں پیش آتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے قائم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لئے سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہاں کے باشندوں میں سے وہی لوگ برسرِعرصہ اور حکومت میں شریک ہوئے جنھوں نے اُن کے علوم، اُن کی زبان، اُن کے سے خیالات، اُن کا سا تمدن، اُن کا سا لب ولہجہ اور اُن کی سی روش اختیار کی۔ ہندوستان میں اس خیال کا پیدا کرنا کہ ہم مشرقی علوم، دیسی زبان اور دیسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کریں گے بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی امریکا کے اصلی باشندوں کو خیال دلا دے کہ تم اپنی دیسی زبان اور دیسی علوم میں ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔

"قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جائی بہنیں ہیں، پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے، تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتحمند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتحمندوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے، علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجے کی لیاقت حاصل کرے جن میں اُن فتحمندوں نے قابلیت حاصل کی ہے۔ سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجے تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا برتاؤ محالات سے ہے۔ اسی مناسبت کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ برتاؤ

نہیں ہے۔ خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے سو کہے اور پولٹکل طریقے میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے، مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فتحمند قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اس کا الزام اپنی فتحمند قوم کے ذمہ نہیں دھرتے بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں کہ اُس نے خود اپنے تئیں اس لائق نہیں بنایا کہ ہماری فتحمند قوم ہم سے دوستانہ برتاؤ کر سکے۔ پھر علومِ مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی؟ اور ہم کو کونسی عزت و دولت و حشمت و حکومت بخشیں گی؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے اب تک ہم کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے جو آئندہ پوری یونیورسٹی ہو کر اور مُردہ علومِ مشرقی کو زندہ کر کے اور ہماری پرانی شائستگی کو پھر پیدا کر کے ہم کو پہنچا دے گا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کالج اب بھی ہماری ترقیوں کا سدِّ راہ رہا ہے اور جب وہ یونیورسٹی ہو جائے گا اور ضرور ہو جائے گا، تو ملک کے لئے، قوم کے لئے، ملکی اور قومی ترقی کے لئے آفتِ عظیم ہوگا۔ ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم اور تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے؟ اس کا جواب کسی پیرائے میں اور کیسے ہی میٹھے لفظوں میں دیا جائے اُس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لئے ہے۔"

"گورنمنٹ نے ہمارے لئے سول سروس میں داخل ہونے کا راستہ، گو اس میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں، ابھی تک کھلا رکھا ہے۔ بیرسٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلوما اور انجینئری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں انڈین سول سروس کے عہدے کو، جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے، جانے دو، مگر ہائی کورٹ کی ججی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں۔ ہندوستانیوں کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے۔ ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لئے ہم کو کیا کرنا ہے؟ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی؟ کیا ہماری پرانی شائستگی کو پھر ہمارے لئے مہیا کرنے والی تجویز؟ معمولی عہدے بھی، جیسے وکالت و منصفی و سب ججی ہے، بغیر انگریزی زبان کی کافی لیاقت کے ہم کو میسّر نہیں آ سکتے، پھر کیا مُردہ علومِ مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کی ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؟ یونیورسٹی کالج لاہور، جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے، بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے اور

ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں، ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟

ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیئے کہ ہم دُور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں، ہم بساطی کی سی دکانداری سے نکلیں، ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی "محمڈن اینڈ ہندو کمپنی" کے نام سے کوٹھیاں لنڈن میں، ایڈنبرا میں، بروسلز میں، سینٹ پیٹر برگ میں، برلن میں، وائنا میں، قسطنطنیہ میں، پکین میں، واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری اور بری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور قومیں کرتی ہیں جس سے ہم کو عزت، دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو۔ پھر کیا ہمارے مُردہ مشرقی علوم کا زندہ ہونا اور مشرقی زبانوں کا ترقی دینا اور ہماری پرانی شائستگی کو پھر قائم کرنا ہم کو اس قابل بنا دے گا؟ ہرگز نہیں۔ پس ہم کو علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے جو لوگ دُور اندیش ہیں وہ کبھی ایسی پالسی کو پسند نہ کریں گے اور اُس میں ہندوستان کی فلاح نہ تصور کریں گے بلکہ اپنے حق میں، ہندوستان کے حق میں اور گورنمنٹ کے حق میں شدید مضر سمجھیں گے۔"

اس کے بعد اُن اسباب کی طرف جن سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے، اشارہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہے اور اُنہوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بے جا اور ناواجب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چیں جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدردان ہیں شاید کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ پس نکتہ چینی کے اندیشہ سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق میں کچھ انصاف نہیں ہے ہم کو بائع العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر نابالغ کے درجے پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کر سکتے۔"

"ہمارے لئے یہ صاف راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے یوروپین لٹریچر اور یوروپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں، جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں حاصل کریں، جب اُس سے بھی زیادہ ہم میں ہمت ہو، آکسفورڈ و کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں، اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں، اپنے تئیں مہذب و تعلیم یافتہ جنٹلمین اُس کے

اصلی و حقیقی معنوں میں بنائیں اور جو فیضِ تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے اُن مہذّب ملکوں میں حاصل کیا ہو اُس کو اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں میں پھیلا دیں۔ بے شک ہم کو ایسا کرنے میں بہت مشکلات ہیں، اِدھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت و تعصب سے مقابلہ کرنا ہے اور اُدھر اپنی فتحمند قوم کے اُن تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے۔ جو ہماری سوشل اور پولٹکل حالت کی ترقّی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں۔ ہماری انگلش لائف، انگلش تمدن، جنٹلمین کے سے اخلاق، یہاں تک کہ ہمارے تغیرِ لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشمِ خشم آلود سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہم کو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیئے اور جو تکالیف اور مشکلات ہم کو پیش آئیں نہایت تحمّل اور پختہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں۔ مگر ہم اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ رفتار مرالیتی زمانہ، ان باتوں کو ضرور ہونے دے گا اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی و خفگی اُس کو روک نہیں سکے گی۔ لیکن بے شک یہ تنگدلی کے خیالات ناراضی کو ترقّی دینے والے اور فاتح و مفتوح میں ہمدردی و محبت کو توڑنے والے ہیں"۔

یہ دو آرٹکل جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ سرسید نے خاص کر پنجاب یونیورسٹی پر حملہ کیا ہے، جب یونیورسٹی کے حامیوں کو شاق گذرے اور اُن کے برخلاف پنجاب سے بعض مضامین شائع ہوئے تو سرسید نے ایک تیسرا آرٹکل جس کا عنوان "ہماری زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم" تھا اور لکھا جس سے صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ درحقیقت ہمارا روئے سخن پنجاب یونیورسٹی کی طرف نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالسی کی طرف تھا جس سے خوف تھا کہ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان کی یونیورسٹیاں یہی اصول نہ اختیار کرلیں۔ اس آرٹکل کو انہوں نے اس طرح شروع کیا ہے "ہمارے دو آرٹکلوں نے ہمارے پنجاب کے دوستوں کو گھبرا دیا ہے بلکہ کسی قدر رنجیدہ کر دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اُن آرٹکلوں سے ہم کو بالتخصیص یونیورسٹی پر حملہ کرنا مقصود ہے اور اپنے حسن ظن سے اس کی بنیاد حسد پر قائم کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ اگر یہ کمینہ خصلت ہم میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج جس کے اصول سے بلاشبہ ہم مختلف الرّائے ہیں، اگر وہ یونیورسٹی ہوجائے تو ملک کو اور ایسے وسیع ملک کو جس میں تین اور یونیورسٹیاں موجود ہوں کوئی معتدبہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے اور اُس سے ملک کو برخلاف ہماری رائے کے فائدہ پہنچنے والا ہے تو چشمِ ما روشن۔ ہماری

عین خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچے اور ہماری رائے غلط ثابت ہو اور اگر وہ فی الحقیقتہ ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے تو اُس کو ہونے دو، اس سے مخالفت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، خود اُس میں ناکامی کا بیج ہے اور وہ آپ ہی ناکام ہو جائے گی"۔

اس کے بعد وہ مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم کے نتائج کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجّہ کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں اُن پنڈتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھوتی باندھے، مکری پہنے منکنکا اور شیوالا گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی مقدس زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر اُن کی تحصیل سے ملک کو بجز اس کے کہ بنارس میں دس پانچ ہنگتا پنڈت اور زیادہ ہو گئے، کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشاں[1] کے طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی ہو دی ہو، ہم کو اس کا حال معلوم نہیں، مگر آج تک ہندوستان میں، اُس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں اُن لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنھوں نے مسجد کے چبوتروں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود فاتحہ کی روٹی پر گذران کر کر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحّر اُن میں پیدا کیا۔ مگر اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ مُردوں کی روٹیاں کھانے والے اور زیادہ ہو گئے، ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟ اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہم کو علوم مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے (اگر ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں)، تو بجز اس کے کہ چند بھکاری اور چند فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملک میں اور زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو ..... پروفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں اور اُن سے ملک کو، قوم کو، اُس کی دولت کو، اُس کی حکومت کو، اُس کی تجارت کو، اس کے اخلاق کو، اُس کی روشن ضمیری کو اور اس کی وسعتِ خیالات کو کیا فائدہ پہنچا، یا آئندہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیم سے مقصد ہی یہ ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جا سکتا ہے"۔

اس کے بعد سرسیّد نے اس اعتراض کا کہ سائنٹفک سوسائٹی جو اُنھوں نے علی گڑھ میں قائم

---

[1] جو آرٹکل سرسیّد کے خلاف لاہور سے نکلے تھے اُن میں لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج میں بلخ و بدخشاں تک کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔

کی تھی، وہ بھی اسی اصول پر مبنی تھی کہ مغربی علوم ترجموں کے ذریعے سے ملک میں شائع کئے جائیں، جواب دیا ہے اور جو آسمان و زمین کا فرق سوسائٹی کے قیام کے وقت میں اور موجودہ زمانے میں ہو گیا تھا اُس کو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ "اُس زمانے کے مناسبِ حال بلاشبہ ایک شخص کو جو سچے دل سے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا خواہاں ہو، اس خیال کا پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبان کے ذریعے سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں نہایت سچا اور واجب خیال ہو سکتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوتے گئے اور خود زمانے نے بتا دیا کہ کدھر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کدھر ہے"۔

پھر آرٹکل کو اس طرح ختم کیا ہے کہ "ہم کہہ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کسی اصول پر قائم ہو، صحیح پر یا غلط پر، ہم کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اِس لئے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ پنجاب یونیورسٹی پر کوئی حملہ کریں۔ بلاشبہ ہم کو اُس وقت خوف پیدا ہوتا ہے جب کہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی برائی نفع نقصان سپرد کیا ہے، مُردہ مشرقی علوم و مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے پر مائل پاتے ہیں تو ضرور سمجھتے ہیں بلکہ بلحاظِ حبِّ قومی اپنا فرض جانتے ہیں کہ اس امر کو بیان کریں کہ مُردہ علومِ مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لئے، ملک کے لئے، بلکہ گورنمنٹ کے لئے کچھ بھلائی نہیں ہے۔ اپنی قوم کو سمجھاتے ہیں کہ اُن کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا ہونا چاہئے اور گورنمنٹ سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں یورپ کی حکمت کو ترقی دینا اس کا مقصد ہو"۔

الہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت

پھر ۱۸۸۹ء میں جب کہ الہ آباد یونیورسٹی اُسی اصول پر جس پر پنجاب یونیورسٹی کے قائم ہونے کا گمان تھا، قائم ہونے لگی اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر سابق جو مشرقی علوم کے بڑے قدردان تھے اُن کی پرانی تجویز کے موافق یہ یونیورسٹی بھی اِس غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو ترقی دے، تو اُنھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی بھی اُسی تندومد کے ساتھ مخالفت کی جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ اُن کے ایک آرٹکل کے چند جملے بطور نمونہ کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا "افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے اور دن بہ دن اُس کو دُرستی ہوتی جاتی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی کی ہوگی۔ شاید اُس کی صورت میں کچھ

تبدیلی ہو۔ مگر اُس کی پالسی وہی ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی یعنی علوم مشرقی کی ترقّی کا دھوکا دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کولھو کے بیل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں کولھو کے گرد پھرائے جاتا ہے اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بیشک ایک مہذّب گورنمنٹ کا کام نہیں ہے۔ ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں کہ الٰہ آباد یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کی بہن نہیں ہونے کی، وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لئے بمنزلہ ایک مادرِ مہربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ ہمارا خیال غلط ہے تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے، استقلال، استقلال، استقلال، ہمّت، ہمّت، ہمّت، کوشش، کوشش، کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالسی کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیئے اور خود اپنے لئے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اگر ہم میں سیلف ریسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیئے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر رایوں پر نہیں "

اگرچہ بالیقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سرسیّد کی تحریروں کا کیا اثر ہوا اور آیا فی الواقع پنجاب یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا مقصد مشرقی علوم کی آڑ میں انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا تھا یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ جو خیالات دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں پھیل گئے تھے اور جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے وہ خیالات محض بے بنیاد نہ تھے، اب تک علانیہ طور پر اُن کا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ بظاہر دونوں یونیورسٹیوں میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں پایا جاتا جو ہائی ایجوکیشن کا سدِّ راہ ہو۔ بے شک پنجاب یونیورسٹی جس طرح بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہے اسی طرح اورینٹل کالج کے طلبہ کو بی او ایل اور ایم او ایل، یا بالغ العلوم اور مالک العلوم وغیرہ کی بھی ڈگریاں دیتی ہے مگر جیسا کہ سرسیّد نے کہا تھا کہ "اُس میں ناکامی کا بیج ہے اس لئے وہ آپ ہی آپ ناکام ہو جائے گی " اورینٹل کالج روز بروز تنزل کرتا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ فضول سمجھ کر توڑ دیا جائے۔

سرسیّد نے جو مذکورۂ بالا آرٹکلوں میں مشرقی علوم (یعنی قدیم منطق، فلسفہ، طبیعات اور ہیئت وغیرہ جن کا درس و تدریس مسلمانوں میں قدیم سے جاری ہے) اور مشرقی زبانوں کو ترقی دینے یا دیسی زبانوں میں مغربی علوم کے شائع کرنے پر اس قدر لے دے کی ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ

وہ اس کے بالکل مخالف تھے۔ مشرقی زبانوں کی نسبت انھوں نے خود اپنے پہلے آرٹکل میں لکھا ہے کہ "بلاشبہ ہم اس بات کو کہ پنجاب یونیورسٹی کالج، قدیم مشرقی زبانوں کو ترقی دے، پسند کرتے ہیں، کیونکہ قدیم لینگوج ماڈرن لینگوج کی زیور ہیں" اسی طرح انھوں نے مغربی علوم کے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونے کی نسبت دوسرے آرٹکل میں لکھا ہے کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عام تعلیم کے لیے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیلی و دیہاتی مکتبوں میں محدود رہنی چاہیئے۔" اس کے سوا انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں خود اس مضمون کا رزولیوشن پیش کیا تھا کہ "علوم عربی جو ہماری قومی نشانی ہیں اور علوم مذہبی جو ہماری روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں، بدستور قائم رہیں اور مسلمانوں کے اوقاف کا روپیہ اُن کی ترویج اور ترقی میں صرف کیا جائے۔" پس انھوں نے جو علی العموم مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور دیسی زبانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے اُس سے اُن کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجے کی تعلیم محض انگلش لینگوج کے ذریعے سے ہونی چاہیئے نہ یہ کہ کالجوں میں انگلش لینگوج بطور سیکنڈ لینگوج کے برائے نام رہ جائے اور اصل مقصود مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی اور مغربی علوم کو بذریعۂ دیسی زبانوں کے تعلیم دینا قرار دیا جائے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت

مذکورہ بالا آرٹکلوں کے سوا اُن کی بے شمار تحریریں اسی موضوع پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی جلدوں میں موجود ہیں جن میں شاید سب سے اخیر وہ آرٹکل ہے جو علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۹۸ء میں اُن کے مرنے سے سوا مہینے پہلے شائع ہوا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سردست ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجے کی دماغی تعلیم کی ضرورت ہے جو اب تک بالکل پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔ چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیچوں میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے بھی سرسید کو یہی اندیشہ ہوگیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشا ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لئے جب کوئی اسپیچ اُن کی نظر سے گذرتی تھی وہ ضرور اُس کے برخلاف کچھ نہ کچھ لکھتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک رزولیوشن ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا، اور رزولیوشن کی تائید میں ایک طول طویل اسپیچ کی تھی جو کانفرنس کی روئداد میں مندرج ہے اور جس

کا ماحصل یہ تھا کہ اگر ٹیکنیکل تعلیم کالجوں اور اسکولوں میں محض اوپشنل طور پر جاری کی جائے اور ہماری اعلیٰ درجے کی لٹریری تعلیم کو اُس سے کچھ صدمہ نہ پہنچے تو ہم کو اُس میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا لیکن اگر موجودہ طریقۂ تعلیم میں کوئی ایسی تبدیلی کی جائے جو ہماری اعلیٰ درجے کی لٹریری تعلیم میں مخل ہو تو ہم کو علانیہ یہ بات ظاہر کر دینی چاہیئے کہ ہم ایسی تبدیلی سے سخت ناراض ہیں۔ سرسید کو یہ خیال اس سبب سے پیدا ہوا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی میں بغرضِ ترقیِ ٹیکنیکل ایجوکیشن یا بہ خیالِ تکمیلِ تجاویزِ گورنمنٹ متعدد دفعہ ایسے امور پیش ہوئے تھے جو سرسید کے نزدیک علانیہ لٹریری تعلیم کو روکنے والے تھے اور انہیں دنوں میں گورنمنٹ شمال مغرب نے ایک رزولیوشن بغرضِ ترقیِ ٹیکنیکل ایجوکیشن مشتہر کیا تھا اور ایک کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے کو منعقد کی تھی کہ ٹیکنیکل تعلیم کو کن طریقوں سے ملک کے حق میں مفید بنایا جائے۔ سرسید نے اس خوف سے کہ کہیں یہ سب تمہیدیں ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کی نہ ہوں یہ رزولیوشن کانفرنس کے جلسۂ عام میں جس میں ایک ہزار لائق ہندوستانی موجود تھے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ اس باب میں ہندوستانیوں کی عام رائے معلوم ہونے کے بعد یونیورسٹی کو اُس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہ رزولیوشن جس کی تائید مولوی حشمت اللہ ایم اے اور مسٹر تھیوڈور بک نے بڑے زور کے ساتھ کی تھی تمام مجمع کے اتفاق سے پاس ہوا اور الہ آباد یونیورسٹی اور گورنمنٹ شمال مغرب کو اس تمام کارروائی کی اطلاع دی گئی۔

سرسید نے مسلمانوں کی ترقیِ تعلیم کے لئے اُنھیں تدبیروں اور کوششوں پر بس نہیں کی جو اُن کی زندگی کے ساتھ ختم ہونے والی تھیں بلکہ وہ قوم کی تعلیمی مشکلات کی حل کرنے والی ایک ایسی انجمن چھوڑ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اُس کو قائم رکھا تو وہ تمام معاملات میں جو قومی تعلیم سے علاقہ رکھتے ہیں، سرسید کا نعم البدل ثابت ہوگی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قائم کرنا اُنھوں نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کا ذکر پہلے حصے میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے اس قومی انجمن کو اپنی زندگی میں برابر گیارہ برس تک جاری رکھا اور اس عرصے میں وہ تمام مرحلے جو ابتداً ایسے کاموں میں پیش آتے ہیں، نہایت خوبی کے ساتھ طے کر دیئے اور آئندہ نسلوں کے لئے رستہ بالکل صاف کر دیا کہ کس طرح اُس کو چلائیں اور کیونکر اُس سے فائدہ

اُٹھائیں۔ جو کام قوم کے کرنے کے تھے ایک جم غفیر کے صلاح و مشورے سے قوم کو اُن کے کرنے کی صلاح دی اور جو باتیں گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کی تھیں اُن کو بطور ایک جماعت کی رائے کے باوقعت صورت میں گورنمنٹ کے کان میں ڈالا اور اپنی بے نظیر لیاقت اور حسنِ تدبیر سے ایک ایسی مجلس کو جس میں تعلیم و تعلم کی رُوکھی پھیکی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا، چند سال کے عرصہ میں ایسا دلچسپ بنا دیا کہ پان پان سو اور ہزار ہزار کوس سے ہندوستان کے مسلمان جو ایسی صحبتوں سے دُور بھاگتے تھے خرچ کثیر برداشت کرکے ایسے چاؤ اور امنگ کے ساتھ، جیسے کہ لوگ پھول والوں کی سیر یا شالامار کے میلے میں دُور دُور سے آتے ہیں، اس علمی مجمع میں آ آ کر شریک ہونے لگے۔

سول سروس فنڈ اور سول سروس کلاس

ایک اور تدبیر ترقیٔ تعلیم کی جو قوم کی معمولی بے پروائی سے براہِ راست پوری نہ ہوسکی، سول سروس کلاس اور سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا قائم کرنا تھا جن کو سرسید نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ جو مسلمان اپنی اولاد کو ولایت کی تعلیم کے لئے تیار کرنا چاہیں اُن کو محمڈن کالج میں ایک خاص طریقے پر ابتدائی تعلیم دی جائے اور بعد امتحان کے جو لڑکے ولایت میں جانے کے قابل سمجھے جائیں اُن کو چندے کے ذریعے سے مدد دی جائے۔ یہ تجویز بھی اگر چل جاتی تو مسلمانوں کی ترقیٔ تعلیم کے حق میں نہایت مفید تھی۔ یہاں تک کہ ایجوکیٹڈ کلاس کے ہندو بھی اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونے کی دل سے آرزو کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جب کہ سرسید نے پنجاب کا دوسرا ٹور کیا تو لاہور کے مقام میں برہمو سماج اور آریہ سماج کے تقریباً پچاس معزز ممبروں نے اور نیز انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے سرسید سے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ "اس ایسوسی ایشن میں اگر ممکن ہو تو ہندوؤں کو بھی شامل کیا جائے۔ وہ بہت خوشی سے اس میں چندہ دینے کو تیار ہیں۔ اگرچہ اور طریقوں سے ہندو مسلمانوں کے لئے ولایت کی تعلیم کی راہ کھل گئی مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار وہ کلاس اور وہ ایسوسی ایشن دونوں توڑ دی گئیں۔

کونسل کی ممبری

کونسل کی ممبری کے زمانے میں جو ملک کی خدمت سرسید نے کی اُس کو نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ جو ایڈریس انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے ۱۸۸۴ء میں اُن کو دیا تھا اُس میں صاف لکھا تھا کہ "ہندوستان

کی قانونی کونسل میں جو آپ نے نہایت منفعت بخش کارروائی کی اس کی نسبت یہاں (یعنی ایڈریس میں) صرف سرسری طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے اور آپ جو اُس زمانے میں جب کہ آپ مجلسِ مذکور (یعنی کونسل) میں کام کرتے تھے بے طرفدارانہ طور پر تمام فرقوں کی بہبودی کی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راستبازی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال رکھتے تھے اس کے لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہموطنوں کی طرف سے دلی احسانمندی کے مستحق ہیں" اسی طرح برہم سماج اور آریہ سماج کے ایک معزز ڈپوٹیشن نے جیساکہ سفرنامۂ پنجاب میں مذکور ہے، سرسیّد کی میمبریٔ کونسل کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ" ہم ممبرانِ آریہ سماج اور برہم سماج لاہور تمام ہندوؤں کی طرف سے — آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لئے کی ہیں — ہندو راجہ مہاراجہ (غالباً یہ اشارہ راجہ شیو پرشاد کی طرف ہے) جن سے بہت کچھ امید کی جاتی تھی، ملک کے لئے خیرخواہ نہ ثابت ہوئے — لیکن آپ نے حُبّ الوطنی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور البرٹ بِل[1] اور دیگر مفیدِ ملک تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی"۔

---

[1] البرٹ بل سے مراد وہ مشہور مسودۂ قانون ہے جو لارڈ رپن کے عہد میں وائسریگل کونسل کے لیگل ممبر مسٹر البرٹ نے ۱۸۸۳ء میں بہ اجلاسِ کونسل پیش کیا تھا اور اسی لئے یہ مسودہ البرٹ بل کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس مسودے کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو بھی مثل یوروپین مجسٹریٹوں کے یوروپین اور یوریشین باشندگانِ ہند کے فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ چونکہ مسودے کو یوروپین اور یوریشین باشندوں کے حقوق سے تعلق تھا اس لئے جس قدر کہ لیجس لیٹو کونسل میں اور اخباروں میں اس مسودے پر بحث اور نکتہ چینی اور مخالفت ہوئی تھی ویسی شاید ہی ہندوستان کے کسی مسودۂ قانون پر ہوئی ہو۔ ہندوستانی ممبروں میں سے سرسیّد نے اور آنریبل کرسٹوداس پال نے اس مسودے کی بڑے زور سے تائید کی تھی مگر راجہ شیو پرشاد مثل اکثر یوروپین ممبروں کے اس کے مخالف تھے جس کی وجہ سے بنگالی اخباروں میں اُن پر سخت نفرت ہوئی تھی۔ جو اسپیچ سرسیّد نے اس مسودے کی تائید میں کی تھی اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ باقی اگلے صفحے پر

جو کام خاص کر مسلمان خاندانوں کی بھلائی کا سر سید نے ممبری کونسل کے زمانے میں کرنا چاہا تھا اُس کا مفصل ذکر پہلے حصّے میں ہو چکا ہے۔ یعنی قانونِ وقفِ خاندانی کا مسودہ جو بڑی محنت

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۱۴) اُنھوں نے کہا " مائی لارڈ! میں اس بات سے واقف ہوں کہ اس بل کی نسبت اخبارات میں بہت بحث ہوئی ہے اور یورپین اور یوریشین باشندوں کے غیر سرکاری گروہ میں اس کی نسبت بڑا تہلکہ مچا ہوا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قانونِ مجوزہ سے اُن کی آزادی خطرے کی حالت میں ہے۔ ...... اگرچہ ہر طرح پر میری یہ خواہش ہے کہ جو رائیں یورپین اور یوریشین لوگوں نے ظاہر کی ہیں ان پر بخوبی غور کیا جائے۔ لیکن مائی لارڈ! میں اقرار کرتا ہوں کہ جو طریقہ مسودۂ قانون کے برخلاف تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اُس پر میں دلی افسوس سے باز نہیں رہ سکتا۔ تحریک کرنے والوں نے میرے ہموطنوں کے برخلاف نہایت سخت اور کسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ کلمات استعمال کئے ہیں ...... مائی لارڈ! اس مقام پر میں اپنی دلی امید ظاہر کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی حصّے میں میرے ہموطن اُن شخصوں کی پیروی نہ کریں گے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ واضعانِ قانون کی غور کے واسطے دلائل اور دعووں کے پیش کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ عام طور پر مجمع کر کے سخت گفتگو کرنا ہے ...... میرے نزدیک جو مخالفت اس مسودۂ قانون کی نسبت کی گئی ہے وہ زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے معاملات میں ہندوستان کے قوانین کی تاریخ سے واقفیت نہیں ہے اور جو خفیف تبدیلی قانونِ مروجہ میں اس بل کی رُو سے کرنی تجویز کی گئی ہے اُس کے سمجھنے میں انھوں نے غلطی کی ہے۔ میں کانسٹی ٹیوشنل لا کے مسائل سے واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس مسوّدہ قانون کے برخلاف جو یہ حجت پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں حضور قیصرِ ہند کی یورپین اور یوریشین رعایا ایسے حقوق رکھتی ہے جن کے سبب سے وہ ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کے اختیار سے باہر ہے، اس کی قانونی صحت کی نسبت میں بلا تامل شبہ کر سکتا ہوں۔ میں ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل کا ایک ناچیز ممبر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی پابندی کو ناپسند کرتا ہوں۔ ہم نے اپنے اختیارات انگلستان کی بڑی پارلیمنٹ سے حاصل کئے ہیں اور جب تک ہم اُن اختیارات کی حد سے تجاوز نہ کریں اس وقت تک میرے نزدیک ان تمام معاملات میں جو ہندوستان سے متعلق ہیں، اس کونسل کی قانونی حکومت کی نسبت شبہ کرنا بے جا معلوم

اور جانفشانی اور اعلیٰ درجے کی قانونی لیاقت سے تیار کیا تھا اور جو بعض قانونی موانعات کے سبب کونسل میں پیش نہ ہو سکا، وہ کم سے کم اس بات کو ہمیشہ یاد دلائے گا کہ قوم کی بھلائی کی کوئی تدبیر

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۱۵) ہوتا ہے ..... جو تحریک بالفعل اس مسودے کے برخلاف کی گئی ہے، اُس میں ہم انھیں دلیلوں اور رایوں کا تکرار پاتے ہیں جواب سے پہلے خطرہ پیدا کرنے والوں نے اُس وقت پیش کی تھیں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں کے ہندوستانی ججوں کو صیغۂ دیوانی کی اُن نالشات کی تجویز کا اختیار دیا گیا تھا جن میں یوروپین اور یوریشین فریق مقدمہ ہوں۔ میں بغیر اندیشۂ تردید کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جن مقدمات میں یوروپین شریک ہوتے ہیں اُن میں ہندوستانی ججوں کے اختیاراتِ دیوانی کے عمل میں لانے سے قومی اختلاف کی بنا پر کوئی ناانصافی بلکہ شکایت بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بیشک اُس زمانے کے خطرے پیدا کرنے والوں کے اندیشے بے اصل تھے اور اُن کی پیشین گوئی غلط ثابت ہونے والی تھی۔ اس وقت تمام برٹش انڈیا میں ہندوستانی جج اہلِ یوروپ پر اختیاراتِ دیوانی ایک ایسے طریقے میں استعمال کرتے ہیں، جو درحقیقت اس الزام کے لائق نہیں ہے کہ قومی امتیاز کا اس میں اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دیوانی کا اختیار فوجداری کے اختیار سے مختلف ہے، دیوانی کا اختیار صرف جائداد پر مؤثر ہوتا ہے اور فوجداری کا اختیار ذاتی خصلت اور آزادی پر۔ پس ہندوستانی ججوں کے دیوانی کے اختیار کی اطاعت سے یہ لازم نہیں آتا کہ فوجداری کے معاملات میں بھی اُن کے اختیار پر رضامندی ظاہر کی جائے"۔

"مائی لارڈ! میں اس وجہ کو نہیں سمجھ سکتا جس پر یہ امتیاز مبنی ہے۔ عدالت ہائے دیوانی کی ڈگریات ایک شخص کو دولت مند سے مفلس کر سکتی ہیں، دیوانی کے بعض صیغے صرف ذاتی ملکیت ہی سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ اُن میں ذاتی گرفتاری کے اختیارات بھی شامل ہوتے ہیں اور انصاف کی غرض سے اُن میں اُس قسم کی کارروائی کی اجازت دی گئی ہے جو فوجداری کی عدالتوں کے واسطے قرار دی گئی۔ دیوانی کے مقدمات میں واقعات کی نسبت نتیجوں کو قرار دینے کا قاعدہ زیادہ تر وہی ہے جیسا فوجداری کے مقدمات میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں امرِ حق کی تحقیقات ایک ہی قانونِ شہادت کے بموجب کی جاتی ہے عدالت ہائے دیوانی کی تجویزوں سے فریقین کی نیک نامی پر تقریباً اسی طرح دھبا لگ سکتا ہے اور اُن کی

جو خیال میں آسکتی تھی عام اِس سے کہ ممکن الوقوع ہو یا نہ ہو، اِس شخص نے اُس کا تعاقب کئے بغیر نہیں چھوڑا۔

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۱۶) عزت برباد ہو سکتی ہے، جیسی فوجداری عدالتوں کے احکام سے۔ پس میرے نزدیک دونوں عدالتوں کے جوڈیشل اختیارات میں امتیاز قرار دینے کے لئے کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے اگر راست بازی، انصاف اور قومی بے تعصبی دیوانی کے معاملات میں ہندوستانی ججوں میں پائی جاتی ہے تو اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ ان میں وہی خصلتیں فوجداری کے اُن مقدمات میں نہ پائی جائیں جن میں یوروپین اور یوریشین شریک ہوں۔ تمام ہندوستانی مجسٹریٹ اب بھی ان مقدمات فوجداری میں جن میں اہل یوروپ نالشی ہوں اور بطور فریق مضرر رسیدہ کے عدالتوں سے چارہ جوئی کریں، اختیارات عمل میں لاتے ہیں۔ میں نے اب تک کبھی نہیں سُنا کہ یوروپین انگریزی رعایا نے ہندوستانی مجسٹریٹوں سے دادخواہی کرنے میں عذر کیا ہو۔ پس جب کہ یہ صورت ہے تو اس بات کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں پر اُن مقدمات میں جن میں یوروپین انگریزی رعایا کی نسبت نالشیں پیش کی جائیں، اُس قسم کا اعتبار نہ کیا جائے جو مجسٹریٹ کہ دادرسی کے مجاز ہیں ضرور ہے کہ وہ سزا دینے کے بھی مجاز ہوں اور رعایا کے کسی فرقے کا یہ کہنا ناواجب اور بے جا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی مجسٹریٹوں کے روبرو چارہ جوئی کے واسطے تو جائیں گے لیکن اس بات کو گوارا نہ کریں گے کہ جو نالش ہم پر کی جائے اُس میں وہ ہماری نسبت تجویز کریں۔

..... میں یقین کرتا ہوں کہ مجھ کو یہ صحیح اطلاع دی گئی ہے کہ جزیرۂ لنکا میں جو اس ملک کے متصل واقع ہے اور جو برطانیہ کی وسیع سلطنت کا ایک جزو ہے ہندوستانی مجسٹریٹ اور جج یوروپین انگریزی رعایا پر فوجداری کا اختیار عمل میں لاتے ہیں اور وہاں اُس جوڈیشل ناقابلیت کو جو قومی تفرقہ پر مبنی ہو، کوئی جانتا بھی نہیں حالانکہ انگریزی سرمایہ اور انگریزوں کی تجارتی اولوالعزمی کو بجائے اس کے کہ وہ اس جزیرے سے جاتی رہی ہو، نہایت ترقی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک لنکا میں قہوہ کے کاشتکاروں کے مطالب بنگالہ کے نیل کے کاشتکاروں کے مطالب سے کسی حالت میں کمتر نہیں ہیں اور لنکا کے باشندے ہندوستان کے باشندوں کی نسبت کسی طرح پر کچھ کم ایشیائی نہیں ہیں اور نہ لنکا میں اُن کا کوئی نہایت معتبر طرفدار قوم بھی میزانِ شائستگی میں اُس سے زیادہ تر اعلیٰ رتبے کا دعویٰ کرے گا جو وہ ہندوستان کے باشندوں کی نسبت قرار دے گا، مگر

نیشنل کانگرس کی مخالفت اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کرنا

نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے

جو ۱۸۸۷ء میں سرسید نے مسلمانوں کو باز رکھا اگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ اُن کی اس کارروائی سے

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۱۷) باوجود اس کے یورپین انگریزی رعایا پر فوجداری کے اختیار کے معاملے میں برٹش انڈیا کا قانون لنکا کے قانون سے پیچھے ہے۔ پس مائی لارڈ! میرے نزدیک یہ کچھ ناواجب بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے یہ خیال کریں کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ قانون میں اصلاح کرنے کی شدید ضرورت ہو گئی ہے۔ ...... مائی لارڈ! جیسا کہ میں نے اس مسوّدے کو سمجھا ہے اُس میں یہ تجویز نہیں کی گئی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو انگریزی یوروپین رعایا کی نسبت تجویز کرنے کا اختیار دیا جائے بلکہ صرف اُنھیں ہندوستانیوں کے معاملے میں جنھوں نے اپنی مسلّمہ راست بازی اور لیاقت کی بدولت جوڈیشل سروس میں ایسے عہدے حاصل کئے ہیں جو رُتبے میں اعلیٰ درجے کے انگریزی عہدیداروں کے مساوی ہیں۔ اِس مسوّدے میں اُن جوڈیشل نااہلیتوں کے دُور کرنے کی تجویز کی گئی ہے جو قومی امتیاز پر مبنی ہیں۔ اِس قسم کے ہندوستانی عہدیداروں کی تعداد نہایت محدود ہے اور اِس وجہ سے اِس مسوّدے کی نسبت یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ بغیر کافی غور و تامل کے پیش کیا گیا ہے یا اُس کے سبب سے دادرسی کے موجودہ ذریعوں میں کسی بڑی عملی تبدیلی کا ہونا متصور ہے"۔

"جس دلیل پر قومی امتیازات کا نہایت لحاظ کیا گیا ہے میرے نزدیک اُس میں بڑی غلطی ہے جس چیز کی لوگ اُن ملکوں میں جن کو شائستہ گورنمنٹ کی برکت حاصل ہے اطاعت کرتے ہیں، وہ کچھ خاص خاص شخصوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ قانون کے احکام ہیں۔ جب تک کہ قانون منصفانہ بے طرفدار اور بارحم ہوگا اور جب تک اُس قانون کا کل درآمد ٹھیک ٹھیک طور پر کیا جا سکے گا اُس وقت تک اُن شخصوں کی قومیت جو قانون کی تعمیل کریں، باریک خیال والوں کے نزدیک بھی چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہونی چاہیئے جس چیز کی تعظیم اور ادب اور اطاعت درکار ہے وہ قانون کی حکومت ہے نہ کہ خاص خاص شخصوں کی۔ پس جو لوگ ہندوستانیوں کو اپنی برابری کا مستحق نہیں سمجھتے وہ اگر غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ گورنمنٹ کے نوکر ہیں جن کے متعلق گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ قانون کے مناسب عمل درآمد کے واسطے انتظام کرنا

تعلیم یافتہ ہندوؤں میں عموماً ایک قسم کی ناراضی مسلمانوں سے پیدا ہو گئی۔ مگر درحقیقت سرسید نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک خار دار جھاڑی میں، جو شاید اوروں کے لئے درختِ باردار ہو، اُن کا دامن اُلجھنے نہیں دیا۔ سرسید کی اس کارروائی کو اوّل اوّل تعلیم یافتہ لوگ نہایت

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۱۸) گورنمنٹ کا فرض ہے اور اس مقصد کے واسطے گورنمنٹ کو نہایت عمدہ ذریعے جو ہم پہنچ سکیں منتخب کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایک پوچ اور غیر واجبی تجویز معلوم ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی کوئی رعایا اس بات پر اصرار کرے کہ عہدیداروں کا انتخاب کسی خاص قوم یا فرقے پر حصر رکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے اصول کی نسبت کسی جدید فیصلے کی حاجت نہیں ہے، اس سوال کی نسبت اُس وقت بحث کی گئی تھی اور اُس کا فیصلہ عمدہ طور پر ہو گیا تھا جب کہ انگلستان نے اپنی عالی حوصلگی اور انصاف سے ہندوستان کے باشندوں کو یہ حقوق عطا کئے تھے کہ سلطنت کی ملازمت میں ہندوستانیوں کو اُسی حیثیت پر نوکری دی جائے جیسی کہ خاص انگریزوں کو۔ اس فیصلے کا پچھلے برسوں میں عملی طور پر نفاذ کیا گیا ہے اور انتظامی مصلحت اُس خفیف تبدیلی کی مقتضی ہوئی ہے جو اس بل میں تجویز کی گئی ہے۔

"لیکن مائی لارڈ! اس مسودے کی تائید میں انتظامی مصلحت کی بہ نسبت زیادہ اعلیٰ درجے کی وجوہات موجود ہیں یعنی میں آزادی، انصاف اور انسانیت کے اُن عمدہ اصولوں کا ذکر کرتا ہوں جن کی جائے قرار کہیں اس قدر نہیں جیسی کہ اُس قوم کی طبیعت میں ہے جس نے سب سے پہلے غلاموں کو آزاد کیا اور سب سے پہلے ہندوستانیوں کو اس امر سے مطلع کیا کہ کانسٹی ٹیوشنل حقوق کے معاملے میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں ہونی چاہیئے .... تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی کی برباد کرنے والی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان قومی تفرقہ قائم رکھا جائے کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس بات کا خواہاں نہیں کہ انگریزی قوم اور ہندوستان کے باشندوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو بہ نسبت اُس کے جیسی کہ اب تک ہوئی ہے اور زیادہ ترقی ہو۔ قدرت نے دونوں قوموں کو ایک پولٹیکل اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک سوشل رشتے میں ملایا ہے جس کو جوں جوں زمانہ گذرتا جاوے گا اسی قدر زیادہ استحکام ہوتا جاوے گا..... مجھ کو یقینِ واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا اُس وقت تک دونوں قوموں کے درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب

تعجب سے دیکھتے تھے مگر پچھلے دنوں میں پونا کے افسوسناک واقعات نے ، امید ہے کہ اُن کا تعجب رفع کر دیا ہوگا ۔ مسلمان جو تعلیم میں نسبتہً مرہٹوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اگر کانگریس والوں کے خیالات عام طور پر اُن میں پھیل جاتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے بہ نسبت پونا کے برہمنوں کے بہت زیادہ اپنے تئیں گورنمنٹ کی بدگمانی کا نشانہ بنا لیتے اور جب اُن پر کوئی ایسا بڑا وقت آکر پڑتا جیسا پچھلے دنوں میں پونا کے برہمنوں پر پڑا تو جو ہمدردی اہلِ پونا کے ساتھ

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۱۹) میں مزاحمتیں قائم رہیں گی ۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت پولٹکل ہمسری سے اور ایک ہی قانون کے زیرِ حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا اگر زمانۂ قدیم کے مقنن برہمن کے واسطے ایک قانون اور شُدر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے بغیر زمانۂ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گذر جانے سے ہم شائستگی کے اُس درجے تک پہنچ گئے ہیں کہ قومی امتیاز کو بہر کیف ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے ۔ میرے نزدیک یقیناً اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے ، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یورپین ہوں یا یوریشین ، اس بات کو سمجھنے لگیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور اُن کے پولٹکل حقوق یا کانسٹی ٹیوشنل رتبے میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت جو حفاظت کا استحقاق ان کو حاصل ہے وہ کچھ قوم یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہے ، بلکہ اُس بڑے حق کے سبب سے ہے جس میں سب شریک ہیں یعنی اُس جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار رعایا ہونے کے حق کے سبب جس کے عہدِ دولتِ مہد نے ہندوستان کو امن و آسائش بخشی ہے اور اس کو تجارتی اولوالعزمی اور زمانۂ شائستگی کے ہنر اور فنون کے اکتساب کے واسطے ایک مناسب مقام بنا دیا ہے " ۔

مائی لارڈ! چونکہ یہ موقع غالباً اخیر موقع ہے جو قانونی کونسل سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے کا مجھ کو حاصل ہوگا اس لئے میں اس اخیر گفتگو کو بغیر کہے اس بات کے ختم نہیں کر سکتا کہ حضور کا عہدِ حکومت اس بات پر دل سے مبارکباد کا مستحق ہے کہ اُس میں ایک ایسا مسودۂ قانون پیش کیا گیا جس کے ذریعے سے میں یقین کرتا ہوں کہ حسد انگیز قومی امتیازات بہت کچھ دور ہو جائیں گے اور آخرِ کار حکام اور محکوم کے درمیان اس ملک میں جس میں بہت سی قومیں مختلف مذاہب کی رہتی ہیں ، دوستی اور باہمی ادب اور ہمدردی کو ترقی ہوگی " ۔

ملک نے ظاہر کی اور جس قدر اُن کی طرف سے ڈیفنس میں پیروی کی گئی اُس کا سواں حصّہ بھی بدنصیب مسلمانوں کے ساتھ، نہ مسلمانوں کی طرف سے اور نہ غیر قوموں کی طرف سے ظہور میں آنے کی امّید تھی۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ مولوی ہدایت رسول کی مثال پر غور کرے جو کانگرس کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر بنگالیوں سے آزادی کا سبق پڑھ کر آئے تھے، اگر عام مسلمانوں میں جو تعلیم سے عموماً بے بہرہ ہیں اور جن میں مشکل سے پچاس ہزار میں ایک تعلیم یافتہ نکلے گا، کانگریشین گروہ کے خیالات پھیل جاتے تو اُن سے اکثر ایسی ہی سخیف اور نالائق حرکتیں سرزد ہوتیں جیسی ہدایت رسول سے لکھنؤ کے ایک عام مجمع میں سرزد ہوئی اور جب وہ عدالت میں ماخوذ ہوتے تو اپنے تئیں ویسا ہی بے یار و مددگار پاتے جیسا مولوی ہدائیت رسول کا حال ہُوا کہ اُس کو ضمانت تک میسّر نہ آئی اور جو سزا عدالتِ ماتحت نے اُس کے لئے تجویز کی اُس کو بے چون وچرا قضائے مبرم کی طرح بھگتنا پڑا۔

پس اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے لیکن کانگرس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے وہ اُن کے لئے اس سے بہت زیادہ افسوسناک ہوتے اسی لئے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اُس شخص کی چیخ و پکار سے وہ ایک ایسے ایجی ٹیشن میں جو دیوانوں کے لئے ہُو کی آواز اور ہشیاروں کے لئے خالی بادل کی گرج تھی، شریک ہونے سے باز رہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگرس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "حلوا خوردن را رُوئے باید"۔ ہماری قوم میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے، مذہبی تعصبات مادۂ اکالہ کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں۔ ہر فرقہ دوسرے فرقے کی جان کا، مال کا، عزت و آبرو کا خواہاں ہے۔ پولیس ہمارے مذہبی جھگڑوں کی تحقیقات کرتے کرتے اور حاکم سزائیں دیتے دیتے تھک گئے مگر ہم لڑنے جھگڑنے کے لئے اُسی طرح تازہ دم ہیں۔ تمام قوم ہزاروں بیہودہ رسموں کی پابندی میں گرفتار ہے؛ اسراف اور فضول خرچی ہماری قومی خصلت بن گئی ہے۔ صدہا خاندان اپنی فضولیوں کے سبب بگڑ گئے اور بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ کروڑہا روپے کی جائداد زمینے کی ڈگریوں اور عدالت کے جھگڑوں میں غیر قوموں کے پاس منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ تعلیم کے

لحاظ سے اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ابھی ہم نے الف بے تے شروع کی ہے۔ عورتوں کی تعلیم جو قومی ترقی کی جڑ ہے، اُس کے لحاظ سے ہم اب تک بالکل صفر ہیں، تجارت میں گویا ہمارا کچھ حصہ ہی نہیں، دولت کو ہمارے ساتھ وہ نسبت ہے جو پانی کو چھلنی کے ساتھ ہے، لاکھوں مسلمان شہر شہر اور گاؤں گاؤں بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر ہم اس کا کچھ تدارک نہیں کرتے، ہزاروں اشراف خاندانوں کے لاوارث اور مفلس بچے آوارہ اور مطلق العنان پھرتے ہیں مگر ہم سے اُن کی پرورش اور تعلیم کا کچھ انتظام نہیں ہو سکتا۔ ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ "اُونٹ رے اُونٹ تیری کون سی کل سیدھی"۔ جب کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو کس برتے پر ہم نیشنل کانگرس میں شریک ہو سکتے ہیں اور کیا منہ لے کر ہم گورنمنٹ سے اُن حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں، مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیئے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے اُن اصلاحوں کے خواستگار ہوں جو اُس کے اختیار میں ہیں، ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہئیں، جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔

ہم کو اپنی معاشرت، مذہب، اخلاق اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہزاروں کام کرنے ہیں جن کے بغیر ہماری دُنیا اور دین دونوں خراب ہیں پھر ہم سلطنت سے کس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم کو اپنے نبیؐ کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ "أَعْمَالُكُمْ عُمَّالُكُمْ" یعنی جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسی ہی تم پر حکومت کی جائے گی، اسی لئے سرسیّد نے اپنی لکھنؤ والی اسپیچ کے آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ "گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں اُن حقوق کا مستحق بناؤ" اور کہا تھا کہ "جو چیز تم کو اعلیٰ درجے پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے، ہم ذلیل رہیں گے اور دل سے پست رہیں گے اور اُس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کی ہیں مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ۔ میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ اُن سے کہہ دُوں اور اپنا فرض ادا کر دوں اور خدا کے سامنے جو قادرِ مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے، اپنے ہاتھوں کو دھوؤں"۔

یہ ہے سلسلہ سرسیّد کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات کا جن میں بعض ایسی جلیل القدر ہیں

کہ جس قوم میں ایک مثال بھی ایسی خدمات کی پائی جائے وہ قوم کم سے کم دُنیا کی نظروں میں حقیر نہیں سمجھی جاتی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:۔

"متیٰ تخلو تمیمٌ من کریمٍ ۔۔۔ ومسلمۃُ ابنُ عمرٍو من تمیمٍ"

(یعنی جب کہ مسلمۃ بن عمرو (یعنی میرا ممدوح) بنی تمیم میں سے ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ بنی تمیم جوانمردوں سے خالی ہیں) +

مذہبی خدمات

اِس عنوان میں ہم سر سید کی وہ کوششیں اور خدمات دکھانی چاہتے ہیں جو دینِ اسلام کی حمایت میں زمانۂ حال کی ضرورتوں کے موافق وہ اخیر دم تک انجام دیتے رہے۔ اگرچہ ابھی تک اُن کی مذہبی خدمات کی کچھ قدر نہیں ہوئی، کیونکہ ایک محدود جماعت کے سوا اکثر مسلمان اُن کی مذہبی تصنیفات کو مخرّبِ اسلام جانتے ہیں اور اکثر تکفیر یا تضلیل کے خوف سے محض مصلحتہً مخالفین کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں یا سکوت اختیار کرتے ہیں، لیکن چونکہ مخالفت کا سبب محض تعصّب یا پاسِ دینداری ہی نہیں بلکہ اُس کے ساتھ ناواقفیت اور زمانے کی ضرورتوں سے بے خبر ہونا بھی شامل ہے اس لئے امید ہے کہ جس قدر لوگ زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اُسی قدر سر سید کی مذہبی خدمات کی قدر مسلمانوں میں روز بروز بڑھتی جائے گی +

سر سید نے جو کچھ مذہب کے متعلق ابتدا سے اخیر تک لکھا ہے، منجملہ اُس کے وہ کتابیں اور رسالے جو غدر کے زمانے سے پہلے لکھے گئے اور جن کا ذکر پہلے حصّے میں اپنے اپنے موقع پر آچکا ہے وہ اس مقام پر ہماری بحث سے خارج ہیں، کیونکہ اُن میں ہم کوئی چیز ایسی نہیں پاتے جس کے لحاظ سے اُن کو قدیم طرز کی تصنیفات میں کوئی ممتاز درجہ دیا جائے یا جو اسلام کی حمایت کے لئے اس زمانے میں درکار ہے۔ پس جو کچھ ہم کو اس باب میں دکھانا ہے وہ صرف اُن کی وہ مذہبی

خدمات ہیں جو غدر کے بعد اُنھوں نے انجام دیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ اُنھوں نے غدر کے بعد مذہب کے متعلق لکھا وہ خطا اور غلطی سے بالکل پاک ہے اور ایک فانی مخلوق کا کام ایسا ہو بھی نہیں سکتا لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہیں اور کہیں گے کہ جس شخص کو کافر، ملحد، نیچری اور بدمذہب کہا جاتا تھا، جو اسلام کی خدمت اُس سے بن آئی وہ نہ ان مستفتیوں سے ہوسکی جنھوں نے مکہ میں جب کر اُس کے کفر کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں سے جنھوں نے مسجد الحرام میں بیٹھ کر اُس کے کفر کے فتووں پر مہریں کیں۔

ہندوستان میں اسلام کن خطروں میں گھرا ہوا تھا

ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اُس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دَوروں میں اُن کو دُبلا پتلا شکار پیٹ بھرا و بل جاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صیدِ فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔

پہلا خطرہ

ہندوستان میں سب سے زیادہ اُن کا دانت مسلمانوں پر تھا اور اس لئے اُن کی منادیوں میں، اُن کے اخباروں میں، اور اُن کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی طرح طرح سے بُرائیاں ظاہر کرتے تھے، بانیٔ اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب، اور اکثر افلاس کے سبب اُن کے دام میں آگئے۔ اس خطرے سے بلاشبہ بعض علمائے اسلام (شکر اللہ مساعیہم) جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آلِ حسن اور ڈاکٹر وزیر علی خاں وغیرہ، متنبہ ہوئے۔ اُنھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلے میں لکھیں اور اُن سے بالمشافہ مناظرے کئے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا۔ لیکن اس کا اثر مسلمانوں ہی تک محدود رہا۔ عیسائیوں کی غلط فہمیاں جو اسلام کی نسبت قدیم سے چلی آتی تھیں وہ بدستور قائم رہیں۔

دوسرا خطرہ

دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت سے علاقہ رکھتا تھا۔ اوّل تو مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی، ہمیشہ حکمران قوم کی نگاہ میں کھٹکتے تھے۔ دوسرے بسبب اُن غلط فہمیوں کے جو یورپ کی تمام عیسائی قوموں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں، انگریز مسلمانوں کے

مذہب کو بغی و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرا خطرہ

تیسرا خطرہ خاص کر مذہبِ اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا، اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا ابھرنا محال ہو گیا تھا یہاں تک کہ سرسید کو خود ان میں تعلیم پھیلانی پڑی، حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔

پچھلے دونوں خطروں کا سرسید کے سوا ہندوستان کے کسی عالم کو احساس نہیں ہوا۔ مولویوں سے اس کے سوا کہ چند روز دریا کی رَو یعنی انگریزی تعلیم کو روکنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار کر رہ گئے اور کچھ نہیں ہو سکا۔

سرسید نے تینوں خطروں کا مقابلہ کیا

سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے ان تینوں خطروں کا جہاں تک کہ اس کی قدرت میں تھا مقابلہ کیا اور توقع سے زیادہ اس میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے تمام اعتراضوں کے جواب جن کے ذریعے مشنری مسلمانوں کو دام میں لا سکتے تھے، خود عیسائی عالموں کے اقوال کی سند پر لکھے۔ اس نے تمام غلطیوں کو رفع کیا جو اسلام کی نسبت عیسائی قوموں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے بدلائلِ قاطعہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں کوئی مذہب اسلام سے زیادہ عیسائی مذہب اور عیسائی قوم کا دوست نہیں ہو سکتا اور اسی نے جب دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے کسی طرح مسلمانوں کو مفر نہیں ہو سکتا تو اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ اسلام کو انگریزی تعلیم کے مضر نتائج سے بچانے میں صرف کیا۔

بائیبل کی تفسیر

انھوں نے ان مقاصد کی طرف پہلی ہی بار اس وقت توجہ کی تھی جب کہ مراد آباد میں تبئین الکلام یعنی توریت و انجیل کی تفسیر لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ اس کتاب کا مفصّل ذکر پہلے حصے میں ہو چکا ہے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کی تیاری

پھر جب سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اُس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اُس وقت جو حال سر سید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۶۸ء یا ۱۸۶۹ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دلّی سے منشی امو جان مرحوم اور جہانگیر آباد سے نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کہ یہ بھی اس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے علیگڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کے ہمراہ میں بھی گیا تھا گو اُس وقت تک میری سر سید سے جان پہچان نہ تھی، مگر چونکہ ہم انھیں کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے، اُن کے خیالات معلوم کرنے کا اکثر موقع ملتا تھا، وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے، اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔ اسی وقت ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سر سید جاہلیّت کے اشعار جن سے اس زمانے کی بیہودہ اور نفرت انگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہٖ نقل کئے گئے ہیں، ایک مولوی سے انتخاب کرا رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا پختہ ارادہ سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخرِ کار جب انھوں نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور جن کتابوں کی اس مضمون کے لئے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو اُن کو ولایت جانے کا خیال ہوا۔ چنانچہ ایک ہی دو برس بعد جب سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

سر ولیم میور کا جواب لکھنے سے دوستوں کا منع کرنا

سر سید کے بعض خطوں سے جو انھوں نے سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں پایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب انھوں نے یہ ارادہ اپنے احباب پر ظاہر کیا تو اُن کے بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار اور سر ولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے ان کو سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے مگر سر سید نے اُن کا کہنا نہیں مانا اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہو گئے۔

خطباتِ احمدیہ کیلئے میٹریل جمع کرنا

انھوں نے انڈیا آفس کے کتب خانے سے کتابیں بہم پہنچائیں، برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعیں حاصل کیں۔ سیر کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ اسپتے یعنی خطبے یا مضمون لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطباتِ احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر مشتہر کیا۔

خطبات کے لکھنے میں سرگرمی جو ولایت کے خطوں سے پائی جاتی ہے

اس کتاب کے لکھنے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں تھا اور جو مالی مشکلات اُن کو اُس کے شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اُس کے لکھنے میں اُن کو کرنی پڑی اُس کا کسی قدر اندازہ ان کے خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "اِن دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دل کو جلا دیا اور اُس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلعم کی سیر میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں، چٹھیات روانہ ہوگئیں، سیرتِ ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خرید لیں، ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کر مضمون تبلاسکے"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "مواعظ احمدیہ (یعنی خطباتِ احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس خط کے پہنچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کر دوں گا ..... ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور لکھدیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج

دو ..... کیا کہیئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے خدا مدد کرے"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی (یعنی خطبات احمدیہ) میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے ..... اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ اِدھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آئے گا"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں، سکتہ سا ہو گیا ہے۔ دن رات کی تکلیف سے جو میرا دل ہی خوب جانتا ہے، جلد اوّل خطبات احمدیہ کی تمام ہو گئی ہے اور اس مہینے میں چھاپہ بھی تمام ہو جائے گا۔ اب جو اندازہ اُس کی ایک جلد کے چھاپے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپے سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہتے ہیں اور جان میں جان نہیں۔ میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے۔ تین سو روپے اس کے چندے کی بابت بھیجے ہیں۔ میر ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے، مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اپنا چندہ سو روپیہ بھیج دیا ...... آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھیج دیجئے۔ اپنا ذاتی چندہ سو روپے کا بھی بھیج دیجئے"۔

جب ہندوستان سے سرسید کے دوستوں نے کچھ اور چندہ بھیجا ہے تو اُن کو بے انتہا تقویت ہوئی، چنانچہ اُس کی رسید کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ "اگر آپ لوگ کچھ مدد نہ کرتے تو زہر کھا کر مر جانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا"۔

مگر بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپے کا پہلے کیا گیا تھا، اُس سے بہت زیادہ صرف ہو گیا تھا یعنی قریب چار ہزار کے خرچ ہوا جس میں سے کچھ کم سولہ سو روپیہ سرسید کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے بھیجا اور باقی روپیہ سرسید نے قرض لے کر ادا کیا۔ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت سے مراجعت کرتے وقت اُن کے پاس زادِ راہ کے لئے کچھ نہ رہا تھا اور نہایت پریشان تھے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اب جب تک اور روپیہ قرض نہ لیا جائے، مراجعت متعسّر ہے۔ یہ تردّدات ایسے جانکاہ ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہو رہی ہیں واسطے روانگی ہندوستان کے، اُن کے محصول وغیرہ میں بھی دو سو روپے سے کم خرچ

نہیں ہونے کے۔ اب زیادہ حال تردّدات کا لکھنا ناحق آپ کو تردّد میں ڈالنا ہے"۔

شاید اسی اخیر خط کے جواب میں مولوی سید مہدی علی خاں نے اپنی ساری تنخواہ بھیجنے اور کچھ قرض لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں سرسید نے ان کو لکھا کہ "کتاب کے اخراجات کا صدمہ اور عین اسی صدمہ میں صدمۂ غمِ انتقالِ ہمشیرۂ حامد و محمود کا لاحق ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گذرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا۔

اِیں ہمہ اندر عاشقی بالائے غمہائے دِگر

آپ نے جو الفاظ اپنی محبت اور الفت سے لکھے ہیں اُن کا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف لکھتا ہوں کہ اب کچھ حاجت نہیں رہی، تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا، سب بیباق ہوگیا۔ اب آپ کچھ قرض لیجیے نہ اپنی تنخواہ بھیجیے"۔ مگر خارجاً معلوم ہوا کہ سید مہدی علی خاں اس خط کے پہنچنے سے پہلے اپنی تنخواہ کا روپیہ روانہ کر چکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے اور جب کہ وہ حسبِ دل خواہ تیار ہوگئی تو اُن کو بے انتہا خوشی اور فخر اس کے لکھنے پر ہوا تھا۔ وہ سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں "اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا، خدا قبول کرے"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میری کتاب خطباتِ احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحّر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اُس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اُس کی لذّت میں ہی جانتا ہوں"۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں "آنحضرت صلعم کی بارہ برس کی عمر تک کا حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں"۔

خیر یہ خیالات تو سرسید کے اپنی کتاب کی نسبت ایسے ہیں، جیسے ہر مصنف کے خیالات اپنی تصنیف کی نسبت ہوتے ہیں، اس سے سوا اس کے کہ وہ اسلام کی حمایت کرنے سے بے انتہا

خوش تھے اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ سرسید سے پہلے بے شمار عالموں نے بمقابلہ عیسائیوں کے اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے خود ہندوستان کے علمائے اسلام نے (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) بڑی بڑی مبسوط کتابیں نہایت کوشش سے اسی مضمون پر تحریر کی ہیں، پس تاوقتیکہ خطباتِ احمدیہ میں کوئی وجہ ترجیح کی نہ پائی جائے اُس کو اگلے علمار کی کتابوں پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

خطباتِ احمدیہ کی ترجیح پہلی کتابوں پر جو اسلام کی حمایت میں لکھی گئیں

اگر ہمارے نزدیک فی الواقع ایسی وجوہات موجود ہیں جن کی رُو سے کہا جا سکتا ہے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان سے اسلام کی ایسی خدمت بن نہیں آئی۔

ترجیح کی پہلی وجہ

اولاً جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے، سرسید سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر محض اس غرض سے نہیں کیا کہ وہاں جا کر اسلام کی حمایت کے لئے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹریل جمع کرے، وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے۔ یورپ ہی کی کسی زبان میں جو تمام برّاعظم میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو، اُس کا ترجمہ کرلئے اور وہیں اس کو چھپوا کر شائع کرے اور اس طرح اسلام کی خوبیاں اُن قوموں کے کان تک پہنچائے جنھوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت بُرائی کے سوا کوئی بات نہ سُنی ہو۔

ریورنڈ ہوپر، جو اب سے تقریباً بیس برس پہلے لاہور ڈویژنی کالج میں پرنسپل تھے اور جن سے میں خود بارہا ملا ہوں، انھوں نے میرے ایک دہلی دوست سے جو اُن کو اردو پڑھاتے تھے کہا کہ "مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ وہ سید احمد خاں کو کافر ملحد اور بدمذہب سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو اُن کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے، اُن پر اسلام کی حقیقت اور اُس کی خوبی ظاہر کرنے ——— اُن کے ملکوں میں جا کر اُنھیں کی زبان میں وعظ کہتے، اور اُنہیں کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کیا ہو۔"

مسٹر آرنلڈ جنھوں نے اپنی پریچینگ آف اسلام لکھی ہے اور اُس کے لکھنے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے بے مثل واقفیت حاصل کی ہے ایک نہایت سچّے اور پختہ عیسائی ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ "ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی، اور اُس کا ترجمہ کسی یوروپ کی زبان میں ہوگیا۔ لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یوروپ میں جاکر یوروپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو" +

سرسید کہتے تھے کہ ۱۸۷۰ء میں جب کہ خطباتِ احمدیہ چھپ کر لندن میں شائع ہوئی تو اُس پر لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے لکھا کہ "عیسائیوں کو ہوشیار ہونا چاہیئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُس نے دکھایا ہے، کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبّوں سے پاک ہے جو عیسائی اُس کے خوش نما چہرے پر لگاتے ہیں" +

دوسری وجہ دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سرسید نے اس کتاب میں مناظرے کے اُس مخاصمانہ طریقے کی جگہ جو مسلمانوں میں عموماً دائر و سائر ہے اور جس سے فریقِ مخالف کے دل میں بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے، ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار کیا ہے، جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لئے ایک ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی +

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں خطباتِ احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اس کتاب سے مصنّف کا غیر معمولی تعمّق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصّبی اور اصلی عیسائیّت کے سچّے اصول کا ادب ظاہر ہوتا ہے،" پھر اپنی قوم کے مذہبی لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ "جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کو چاہیئے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ دینِ محمدی تو زمانہ انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اُس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصّب، مغائرت اور تنگ دلی کی اُس میں خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ناظرینِ کتاب

جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اُٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سر سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔" اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خطباتِ احمدیہ نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا اور جو کتابیں مذہبی مناظرے کے متعلق برخلاف قدیم طریقے کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر مفید اور کس قدر فریقِ ثانی کو انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

تیسری وجہ تیسری خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سر ولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ و لوسیدہ طریقہ جس کے بموجب مشنری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جس میں ان کو مقابلہ اہلِ اسلام کے کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا، اور اُس کی جگہ اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاص کر تعلیم یافتہ لوگوں پر خواہ وہ مسلمان ہوں، خواہ ہندو اور خواہ عیسائی، بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا۔ مثلاً قدیم مشنری مسلمانوں کی کتبِ سیر و احادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے الہام سے نہیں لکھی گئیں اور اس لئے جن روایتوں سے آنحضرتؐ کے معجزات اور پیشین گوئیاں ثابت کی جاتی ہیں۔ وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں، مگر سر ولیم میور نے اُن کے برخلاف تمام روایتوں کو جو مسلمانوں کی حدیثوں، تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں مندرج ہیں، صحیح تسلیم کر کے آنحضرتؐ کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی۔ یا مثلاً پادری فانڈر وغیرہ اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے تھے اور اُس کی تعلیم کو انبیاء کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے، مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کی تھیں اور بجائے اس کے کہ اسلام کی تعلیم کو روحانیت کے برخلاف ثابت کریں، اس کو زمانہ حال کی شائستگی اور تمدن و حسنِ معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا۔ مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمان بادشاہوں کی ہوا پرستی و سفاکی اور خونریزی کا جوابدہ اسلام کو ٹھیرایا تھا۔ یہ باتیں گو فی نفسہٖ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جادو کا کام کرنے والی تھیں۔ سر سید نے

اِن تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دل نشیں دلائل سے رفع کیا ہے، انھوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور اُن روایتوں کا جو ان کتابوں میں درج ہیں مفصّل حال بیان کیا ہے، جو اُن لوگوں کے لئے جو سچائی اور انصاف سے اسلام کے متعلّق کچھ لکھنا چاہیں، ہمیشہ کے واسطے ایک بے مثل رہنما ہے۔ ان خطبوں میں روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدّثین نے مقرّر کئے ہیں اور جو معیار اُنھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے اُن کی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اُس پر غور کرنے کے بعد اُن روایات کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی، جن کی رُو سے سر ولیم میور نے اسلام کی تعلیم اور بانیٔ اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ اُنھوں نے نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانۂ حال کی شائستگی یا دُنیوی ترقّیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جن کے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں، اُن کے جوابدہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام اور جو مباحث تاریخی یا جغرافی تحقیقات پر مبنی تھے اُن کا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کسی منصف مزاج کو، اگرچہ وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو، اُس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں +

چوتھی وجہ مگر سب سے بڑی خصوصیت خطباتِ احمدیہ کی جو اس کو اگلے علمار کی کتابوں سے ممتاز ٹھیراتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں برخلاف علمائے اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے، بلکہ ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب جو عیسائی اور لامذہب دونوں کو برابر دیا جا سکے لکھا گیا ہے۔ الزامی جوابوں سے سوا اس کے کہ صرف مسلمانوں کی تسلّی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں ان لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں سے الگ ہیں یا مطلقاً قیدِ مذہب سے آزاد ہیں۔ یہاں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم چند مقامات خطباتِ احمدیہ کے اس غرض سے دکھاتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں سر سید کا طریقِ استدلال کیا ہے اور جنھوں نے اُن سے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں اُن کا طریقِ استدلال کیا تھا؟ مگر ہم باوجود اس کے کہ سر سید نے اس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا ہے، مولانا رحمت اللہ اور مولوی آلِ حسن کے سر سید سے کچھ کم مدّاح اور شکر گذار نہیں ہیں جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشنریوں کے حملوں سے بچایا اور ان سے مناظرہ کرنے کی سب سے

پہلے بنیاد ڈالی اور جن کی کتابیں دیکھ کر پچھلوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔

پہلی مثال عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت صلعم پر بابت کثرتِ ازدواج اور اسلام پر بابت اجازت تعددِ ازدواج اور اجازتِ طلاق کے ہے اس کی تردید میں ہمارے علما نے بالکل الزامی جوابوں سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند ہوں تو یہ جواب اُن کے لیے کافی و وافی ہیں۔ مثلاً ازالۃ الاوہام میں توریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیم کے تین نکاح، حضرت یعقوب کے چار نکاح، حضرت موسیٰ کے دو نکاح، حضرت داؤد کی نوّے سے زیادہ بیویاں جن میں بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ تھیں اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیویاں اور بعض اور انبیاء کی کثرتِ ازدواج کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح طلاق کی طعن پر توریت سے جس کے احکام کو عیسائی منسوخ نہیں مانتے، ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جوازِ طلاق کا حکم دیا ہے۔ کتاب استفسار میں بھی اوّل اسی قسم کے الزامی جواب دیئے ہیں اور آخر میں جوابِ تحقیقی یہ لکھا ہے کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت و انجیل سے بھی اس بات پر قائم نہیں ہے کہ جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہو سکتا یا خدا تعالیٰ کسی نبی کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دی گئی ہے اور عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں، ناسخ و منسوخ نہیں۔

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علما نے دیئے ہیں مسلمانوں کی تسلی کے لیے اور عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں، تو اُن کے ساکت کرنے کے لئے کافی ہیں مگر عیسائی، باوجودیکہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر منسوخ جانتے ہیں، نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے حوالوں پر کان دھرتے ہیں۔ نیز عیسائی انبیا کو مثل اہلِ اسلام کے معصوم نہیں سمجھتے یہاں تک کہ اُن میں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب کرتے ہیں پس تاوقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے اُن کی زبان بند نہیں کی جا سکتی۔ اس کے سوا الزامی جوابات اُن لوگوں کے لیئے جو توریت و انجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں، جب تک اس زمانے کی مسلّمات کے موافق اُن کا جواب نہ دیا جائے۔

مسئلہ تعددِ ازدواج اور جوازِ طلاق کی بحث خطباتِ احمدیہ میں بھی آگئی ہے، اس میں سرسید نے اوّل سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ تعددِ ازدواج اور طلاق کا حکم عام

اخلاق کی بیخ کنی کرتا ہے، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے۔ اور حسنِ معاشرت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

اس کے جواب میں سرسید نے اول تعددِ ازدواج پر لمبی بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے، اول قانونِ قدرت کے لحاظ سے، سو ہم قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روحوں کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوٹا جوٹا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک مادہ اور ایک نر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جن ذی روحوں کی متعدد مادائیں ہونی مقصود تھیں، ان کے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر مادہ کی تعداد متناسب نہیں ہوتی۔ اس قانون کے بموجب، جیسا کہ ظاہر ہے انسان دوسری قسم میں داخل ہے۔ مگر چونکہ رتبہ میں بوجہ اس بیش بہا قوت کے جو مدرکِ کلیات و جزئیات ہے وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لیئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے قدرت نے اس کو عطا کیئے ہیں ان کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ اموراتِ طبیعی اور حسنِ معاشرت اور انتظامِ خانہ داری یا نظمِ ملکی قوانینِ حفظانِ صحت اور ممالکِ مختلفہ کی آب و ہوا کے کام میں لائے ورنہ اس میں اور دیگر حیوانات میں جو اس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ پس جس طرح کثرتِ ازدواج اکثر حالتوں میں قابلِ نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلافِ فطرت ہے۔

اس کے بعد سرسید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا" اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اپنی مجالست سے اس کی خوشی کو بڑھا دے، اپنی محبت بھری ہمدردی سے اس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لیئے وہ پیدا کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ "بڑھو اور پھیلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے۔ مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرائض کے ادا کرنے

ہیں قاصر ہو تو اُس دانشمند حکیم خالقِ زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہو گی اور وہ بجزاس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں جورو ئیں رکھنے کی اجازت ہو اور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیئے تھا چنانچہ مذہبِ اسلام کی رُو سے اُس کو حاصل ہے۔ سیاستِ مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے لیکن عورت کو اوّل قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیئے۔"

"اگر اِس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اس کے سبب سے حُسنِ معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ تعلیم و تربیت سے اس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے، پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اُس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں، جو حُسنِ معاشرت کے لیئے سمِ قاتل ہیں۔"

اِس کے بعد وہ ڈیون پورٹ کی کتاب سے مانٹیگیو کی رائے تعددِ ازواج کی تائید میں نقل کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ "گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بڑھیا ہو جاتی ہیں ضرور ہے کہ تعددِ ازواج کا قاعدہ جاری کیا جائے،" پھر مسٹر ہگنز کی رائے لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ "علم قوائے انسانی اور علم طبیعیات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسی دریافت کی ہیں جو کثرتِ ازدواج کے واسطے بطور ایک عذر کے متصوّر ہو سکتی ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے مینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتیں، مگر بنی اسمٰعیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں، متعلق ہو سکتی ہیں۔" اس کے بعد مسٹر ہگنز نے سر ڈبلیو اوسلی صاحب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یوروپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالمِ ضعیفی کو پہنچتے ہیں۔ مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانیٔ اسلام کے لیئے اس بات کی کہ انہوں نے متعدد جورؤں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ ایک کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کے آئین پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہو گی وہ یوروپ کے واسطے

نامناسب ہو گی۔"

ان دونوں مذکورۂ بالا رایوں پر سرسید یہ ریمارک کرتے ہیں "افسوس کہ ان دونوں صاحبوں نے تعددِ ازدواج پر صرف اموراتِ طبیعی کے لحاظ سے نظر کی ہے مگر مذہبِ اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف اموراتِ طبیعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی۔ بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوّج کی تلخیوں کے واسطے اور مقاصدِ تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اُس کے قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔"

اس کے بعد سرسید اُن اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں جو آنحضرتؐ سے پہلے عرب اور اُس کے گرد و نواح کے ملکوں میں ازدواج کے متعلق واقع تھیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "ایران میں قوانینِ نکاح بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے، یہاں تک کہ بیٹے کو اُس کی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اُس کی بیٹی اور بھائی کو اُس کی بہن۔ یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشۂ مغرب میں بکثرت آباد تھے تعددِ ازدواج کی رسم بلا کسی قید اور حد کے بے روک ٹوک جاری تھی۔ عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعددِ ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیازِ یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔ عیسائیوں کا حال ان سب کے برخلاف تھا۔ اُن کے ہاں ایک جورو بھی کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ رہبانیت اور تجردِ محض کی عام ہدایت تھی اور مرد و عورت دونوں کے لئے وہی نیکی گنی جاتی تھی۔ ایسے زمانے میں جبکہ عقل اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ گئی تھی بانیٔ اسلام نے ایک ایسا عمدہ قانون جاری کیا۔ جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقلِ کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسنِ معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالتِ زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیئے اُس کی تلخیوں کے دُور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلے پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعددِ ازدواج کو روکا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اُس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے۔ یہودیوں کے ہاں بکثرت اور بلا تعینِ حد ازدواج موجود

ہے۔ عیسائی مذہب نے بھی تعددِ ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی۔ چنانچہ مسٹر ہگنز لکھتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان اور حضرتِ داؤد کی نظیر پر جو خدا کی دِلی مرضی کے مطابق چلتے تھے۔ اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیئے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی اُن بیس انجیلوں میں سے جن کو اُن کے معتقدوں نے اُن کے احکام قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اُس کی ممانعت نہیں کی۔ جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعددِ ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم جان ملٹن جو تعددِ ازدواج کا ایک مشہور حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کی ہیں، اُس کی تقریر نقل کی ہے جس میں تعددِ ازدواج کے جواز پر ایک لطیف اور دقیق استدلال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "یہ حال تو تعددِ ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعددِ ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اُس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا، ضرور ایسا ہوگا جو قانونِ قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنےٰ میں اجازت ہو اور وہ یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملے اور دقیق اور پُر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا۔ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً" (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیئے) اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "اس آیت کے اگر وہی معنی لئے جائیں جیسے کہ اکثر فقہا اور علماء نے لئے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعددِ ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے، کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعددِ ازدواج کی جو ایسی

سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے کیونکہ یہ نہیں کہا تھا کہ اِنْ لَمْ تَعْدِلُوا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوا پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی "عدل نہ ہو سکنے" کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا" اس کے بعد اُنھوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لیے مستثنیٰ صورتوں کے سوا اس کو متعدد جورو ئیں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی اور وہ یہ آیت ہے "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ" (یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو) اس کے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعددِ ازدواج کی اجازت دی گئی ہے بیان کر کے لکھتے ہیں۔

"ہاں بلا شبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا منشا تٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے ایک حیلہ ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اُس عمدہ اور مفید قاعدے کی بیجا عملدرآمد کرنے سے وہ لوگ اُس خدا کے سامنے جواب دِہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرمِ راز ہے اور وہ یقیناً اُن کو اس قسم کی سزا دے گا جو اُن کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی"

ان باتوں کو سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبے کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ جو تعددِ ازدواج اس زمانے میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو تین تین اور چار چار جورو ئیں کرنے لگے اور ایک بازاری عورت کو داؤں پر چڑھایا اور نکاح کر مارا، جہاں مقدس بزرگ مولوی ہوئے اور اللہ میاں کے سانڈ بنے۔ اُس مریدنی کو بے ڈالا، وہاں وعظ کہنے لگے اور سنّتِ نکاحِ ثانی کو جاری کیا۔ قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبۂ النکاح کا پڑھانے لگے اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنگالنا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہبِ اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے، یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں، جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے۔ پس ایسے شخص کے افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے جیسے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے"

اس کے بعد سر سید نے طلاق کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ وہ اوّل حسنِ معاشرت کی نظر سے اُس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسنِ معاشرت و تمدّن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں "لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو اُن کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیئے اور وہ علاج طلاق ہے کیونکہ اس سے مرد عورت کو آزادی ہو جاتی ہے جن کے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ بااینہمہ اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ اُن بداخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکار طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیز اُس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدّن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اُس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اُنہی حالت میں اُس کی جانب رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے جبکہ اُس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں اور ایسے تردّدات و تفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والے اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن طعن و جوتی بیزار میں رکھنے والے ہوں، دُور ہو سکتے ہوں۔ اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے (جیسا کہ اسلام نے ایسی حالت میں جائز رکھا ہے) تو وہ کسی طرح حسنِ معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اُس کی اصلاح کرنے والی اور ترقّی دینے والی ہے۔"

اس کے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی و عیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "یہودیوں کے ہاں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط حالت کے مرد کے اختیار میں تھا جب وہ چاہتا تھا طلاق نامہ لکھ کر جورو کو دے دیتا تھا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا۔ لیکن اگر فی الواقع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کی امتناع سے حضرت عیسیٰؑ کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان

کی طاقت سے باہر تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے معتقدوں نے اُن سے کہا کہ اگر جورُو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورُو کرنا خوب نہیں۔ اگر یہ حکم اُسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں تو حسنِ معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج دہ امور زن وشوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراضِ تزوّج برباد ہو جاتے ہیں، اُس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن ومرد دونوں کے لیئے اور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

اس کے بعد سرسید نے یوروپ کے مشہور نامور عیسائی عالم جان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رائے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق رکھتے ہیں نقل کی ہے اور بائیبل کی جن آیتوں سے اُنہوں نے جوازِ طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں جس سے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ "حضرت عیسیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے اس کے ہرگز یہ معنی نہیں جو اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں" اس سے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائیبل کے درسوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجونِ مفرّح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرضِ لاعلاج کا علاج ہے۔"

جان ملٹن کی تقریر نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اب دیکھنا چاہیئے کہ "اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اُس نے طلاق کو بطور ایک مرضِ لاعلاج کے جائز ومباح بنایا ہے مگر زن وشوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور عجیب قسم کے ارتباط واختلاط کا معاملہ ہے کہ جو اُس میں بیماری پیدا ہو سوائے اُنہیں دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اُس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیئے بانیِ اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر، بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلّی اور موانست کے لیئے ابتدا میں عورت بطور انیسِ دلنواز اور مونسِ غمگسار کے پیدا ہوئی تھی۔"

"اب اِس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملے میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے۔"

"بانیٔ اسلام نے اسلام کے سچے پیروؤں کو بتایا کہ" ماخلق اللّٰہ شیئاً علی وجہ الارض ابغض الیہ من الطلاق (یعنی کوئی چیز خدا تعالےٰ نے زمین کے پردے پر ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو)۔"

"پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ" ابغض الحلال الی اللّٰہ الطلاق" (یعنی خدا کے نزدیک مباح چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ چیز طلاق ہے)۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں "کہ یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا" ایّما امرأۃٍ سألت زوجہا طلاقاً فی غیر ما بأس فحرام علیہا رائحۃ الجنۃ" (یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے اس پر جنت کی بُو تک حرام ہے)"

پھر لکھتے ہیں کہ "پیغمبر خدا صلعم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعتہً قطعی طلاق دے دے وہ قتل ہونے کے لائق ہے چنانچہ نسائی نے روایت کی کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعتہً تین طلاقیں دے دیں۔ یہ سُن کر آنحضرت صلعم غصے میں بھرے ہوئے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا اس نے خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے؟ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں اس کو قتل نہ کر ڈالوں! یعنی وہ شخص آنحضرتؐ کی شدّت غضب سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کیے جانے کے لائق کام کیا ہے۔"

اس کے بعد اُن کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ "بانیٔ اسلام نے طلاق کے روکنے میں انہیں تہدیدوں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ نکاح اور ملاپ قائم رکھنے کے لیئے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دی جائے زن و شوہر میں پوری تفریق نہ ہو اور دفعتہً تین طلاقیں دینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب مناسب فاصلے سے طلاق دی جائے

کہ ہر ایک میں تقریباً پچیس روز کا فاصلہ ہوتا ہے: تاکہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہوجائے تو بدستور زن وشوہر رہیں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرطِ مصالحت کے اسی طرح ملاپ ہو جائے۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائمی تفریق ہوجائے۔"

"علاوہ ان ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور ان کے ساتھ مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔"

"اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعے سے حالتِ زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہوجائیں یا کم ہوجائیں اور بغیر اس کے حالتِ معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسنِ معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن وشوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسنِ معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابلِ نفرت طریقے پر استعمال کیا ہے، پس ان کے افعال کی نفرین انہیں پر ہونی چاہیئے نہ مذہبِ اسلام پر۔ ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلے پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لیئے اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔"

دوسری مثال

جہاد کے طعن پر بھی ازالۃ الاوہام اور استفسار وغیرہ میں عہدِ عتیق کے بےشمار حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس شدت اور سختی کے ساتھ جہاد کا حکم انبیائے بنی اسرائیل کو دیا گیا اور جس طرح انبیاء نے اس حکم کی تعمیل کی، اسلام میں ویسی شدت اور سختی جہاد کے حکم میں نہیں ہے۔ یہ جواب بھی بلاشبہ عام مسلمانوں کے اطمینان اور عیسائیوں کے ساکت کرنے کے لیئے جو کہ تمام عہد عتیق کو الہامی جانتے ہیں، کافی تھا، مگر جو لوگ یہودی یا عیسائی

مذہب کے قائل نہ تھے اور جہاد کو گویا خواہ وہ کسی مذہب میں ہو، اصولِ تمدّن اور حُسنِ معاشرت کے خلاف جانتے تھے اور مسلمان فاتحوں کے افعال کی بدولت خود اسلام کو سب مذہبوں سے زیادہ بنی نوعِ انسان کی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے اُن کے لیے اور اُن تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیئے جو ان معترضین کی تحریر دیکھتے تھے، کافی نہ تھا۔

سرسید نے خطباتِ احمدیہ میں اور اُس کے سوا اپنی اور بہت سی تحریروں میں اس مغالطے کو اس طرح رفع کیا ہے کہ فی الواقع کسی انصاف پسند کو، خواہ وہ عیسائی ہو اور خواہ غیر عیسائی اسلام کے مسئلہ جہاد پر نکتہ چینی کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ مفصّل بحث انہوں نے اس مسئلے پر اپنی تفسیر میں کی ہے۔ مگر یہاں ہم صرف اُن کی اُس تحریر کا بہت مختصر خلاصہ جو خطبات میں درج ہے، لکھتے ہیں۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اُس نے مذہب کے معاملے میں رائے کی آزادی بالکل روک دی بلکہ معدوم کر دی ہے۔ سرسید نے اُس کے جواب میں اوّل ایک لمبی تحریر میں اِس بات کا ثبوت دیا ہے کہ جیسی آزادی رائے کی روک عیسائی مذہب میں ہے ایسی دُنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اگر عیسائیوں کے قول کے موافق اسلام میں آزادیٔ رائے نہ ہونے سے یہ معنی ہیں کہ اِسلام کے قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے تو یہ اسلام پر اُن جھوٹے الزامات میں سے ہے، جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اُس پر لگائے ہیں۔ یا تو وہ لوگ اصولِ اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ و دانستہ حق پوشی کی نظر سے ایسا کیا ہے جبکہ اسلام دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے تو کیونکر یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ وہ زبردستی منوایا اور قبلوایا جاتا ہے۔ جو لوگ اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الزام قرآنِ مجید کے اِس صاف اور روشن حکم کے کس قدر برخلاف ہے کہ "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (یعنی دین کے معاملے میں کچھ جبر نہیں کیونکر ہدایت اور گمراہی میں صاف فرق ظاہر ہو گیا ہے)"

اِس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "جس اصول پر حضرت موسیٰؑ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر

استثنا کے قتل و غارت اور نیست و نابود کر دیں، اس اصول پر اسلام نے کبھی تلوار میان سے نہیں نکالی، اُس نے کبھی تمام کافروں اور بُت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کرانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلا شبہ اُس نے بھی تلوار نکالی مگر دوسرے مقصد سے۔ یعنی خدا پرستوں کی جان و مال کی حفاظت اور اُن کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو اور یہ وہ منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا۔ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور اب بھی بقدر ضرورتِ وقت کے اُن پر فرض ہے کہ کافروں کے ملکوں میں جائیں اور خدا کی توحید کا یقین اُن کے دل میں بٹھائیں جہاں کوئی ایسے وعظ و نصیحت کا مانع نہیں ہے وہاں اسلام نے تلوار نکالنے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ مگر جب خدا کے نام کی منادی روک دی جائے اور موحدوں کو امن میسر نہ ہو، جیسا کہ مکّہ میں کافروں نے کیا کہ جب مسلمان مکّہ سے نکل گئے تو بھی اُن کا تعاقب نہ چھوڑا، اُس وقت بلا شبہ اپنے بچاؤ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے۔"

مذکورہ بالا مضمون کو نہایت مفصل و مشرح بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اس بیان سے اُن عیسائی مصنّفوں کی بھی غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے" پھر لکھتے ہیں کہ "ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتحمندوں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی سے دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کیا، مگر مذہب کا اندازہ اُن کے افعال سے نہیں بلکہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ آیا اُنہوں نے اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں؟ اُس وقت صاف کُھل جائے گا کہ اُن کے افعال اسلام کے بالکل برخلاف تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان فتحمند اپنے مذہب کے پابند تھے وہ دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلا لحاظ قوم و مذہب کے ہر طرح کا امن و آزادی بخشتے تھے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں ایک عیسائی مصنّف نے جس سے اسلام کی طرفداری کی بالکل توقع نہ تھی، اسپین کے علمِ تاریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے۔ اُس میں وہ لکھتا ہے کہ "اسپین کے بنی اُمیّہ خلفا کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات قابلِ بیان ہے کیوں کہ اُس

سے اسپین کے ہمعصر یعنی عیسائی اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلے میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانے تک ان بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے یعنی اُن کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا۔"

اس کے بعد گاڈفری ہگنز کی رائے اس امر کے متعلق نقل کی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کیئے جاتے ہیں "کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسی کہ پادریوں کی زبانی اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اُس میں تعصب زیادہ ہے اور دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے یہ عجیب ظلم اور ریاکاری ہے، وہ کون تھا جس نے مور مسلمان باشندگانِ اسپین کو بایں وجہ کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے جلاوطن کر دیا تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور اُن سب کو بطور غلام کے دے دیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے؟ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی[1] امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور اُن کے مذہب، اُن کے پادریوں، اُن کے بشپ، ان کے بزرگوں اور اُن کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے جو لڑائی بالفعل یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اُس لڑائی کے جو حال میں ڈیمرارا کے حبشیوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہبی نہیں ہے۔"

"ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ "وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب اُن میں خوش و خرم تھے۔ اگرچہ بظاہر مور اس وجہ سے جلاوطن کئے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آگئے تھے کہ نادان عیسائی مانک (راہب) سمجھتے تھے کہ اُن کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہہ نہیں کہ جہاں تک اُن کی ناقص قوّت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک اُن کا خیال صحیح تھا۔"

---

[1] مصنف مذکور کے زمانے میں یونان ترکوں کے قبضے میں تھا۔

"خلفا کی تمام تاریخ کی کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب نہ چھوڑنے کے سبب آگ میں جلایا گیا ہو اور نہ مجھ کو یقین ہے کہ زمانۂ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔"

اس کے بعد جان ڈیون پورٹ کی کتاب اپالوجی سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں

"خونریزی اور بربادی ان نو احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے تقریباً دو سو برس تک ترکوں پر کئے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، پھر قتل کرنا ان شخصوں کا جو اس عقیدے کو نہیں مانتے تھے کہ انسان کو دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیئے، لوتھر کے پیروؤں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے مائن سے لے کر انتہائی شمال تک ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی میری کے حکم سے قتل ہونا، فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا، چالیس برس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا، فرانسیس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جو اب تک اس لئے قابلِ نفرین ہے کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا۔ علاوہ اس کے وہ بیس برس کی خرابیاں جبکہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے، زہر خورانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا .... اور آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیئے قتل ہونا، اس میں شک نہیں کہ البہاکر وہ اور گویا ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا۔"

اس کے بعد مشہور عیسائی مورخ مسٹر گبن کی رائے اس آزادی کی تائید میں جو اسلام نے غیر قوموں کو دی ہے نقل کی ہے۔ پھر ایک آرٹکل سے جو کسی یوروپین مصنف نے الیسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں چھپوایا تھا، مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے "اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہنچائی، کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لئے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام کی تاریخ

میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل
برخلاف ہے۔"

اس کے بعد فلسطین کے ایک عیسائی شاعر لامارٹین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "صرف مسلمان
ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں"

پھر ایک انگریزی سیاح سیلٹن کا یہ قول نقل کیا ہے جو اس نے بطور طعن کے مسلمانوں کی نسبت
کہا ہے یعنی یہ کہ "وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں"

یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "دیکھو یہ سب باتیں بہت سے بے طرفدار
اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سرولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کیسے برخلاف ہیں
کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے۔"

خطبات احمدیہ کے مضامین کا خلاصہ

ان دو مثالوں کے بعد ہم سرسید کی کتاب کی نہایت مختصر کیفیت جس
سے مصنف کی محنت اور جانفشانی کا جو اس کتاب کے لکھنے میں
اس نے کی ہے، کسی قدر اندازہ ہو سکے گا اور ناظرین کے ذہن
میں کتاب کی حقیقت کا ایک دھندلا سا خیال پیدا ہو جائے گا، بیان کرتے ہیں۔

پہلا خطبہ

پہلے خطبے میں جو سب سے بڑا اور بجائے خود ایک کتاب ہے، عرب کا نہایت
مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے ان بعض مسلّمات کے ثابت کرنے کے لیئے
جن کا سرولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے، بطور بنیاد مباحث آئندہ کے بیان کیا گیا ہے تاکہ
آئندہ خطبات میں اس بات کا فیصلہ آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جبل فاران جس کا نام توریت کی ایک آیت
میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرتؐ کی نبوت کی بشارت نکالتے ہیں آیا وہ بقول اہل اسلام جبال
عرب میں سے ہے یا بقول سرولیم میور کے جبال شام میں؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیلؑ اور
ان کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں، آباد ہوئے یا بقول سرولیم میور
کے آباد نہیں ہوئے؟ یا یہ کہ آنحضرت کا اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سرولیم میور
کے ثابت نہیں ہے؟ اس خطبہ میں سرسید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں
سے اپنے ہر ایک دعوے پر سرولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے برخلاف استدلال کیا ہے۔

دوسرا خطبہ دوسرے خطبے میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و عقائد اچھے یا بُرے، جہاں تک کہ شعرائے جاہلیت کے اشعار اور دیگر معتبر ذریعوں سے معلوم ہوئے بیان کیے ہیں اور جس قدر باتیں اشعار سے استنباط کی ہیں ان کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دئیے ہیں جن سے ان باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ لوگوں کو اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام کے بعد اُن کے اخلاق اور عادات اور عقائد و خیالات کس درجے تک تبدیل ہو گئے۔

تیسرا خطبہ تیسرے خطبے میں اُن ادیانِ مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع ہوئے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیان میں کون سے دین سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے؟ اس خطبے میں بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں منقسم تھے۔ بُت پرست، خدا پرست، لامذہب اور معتقدینِ مذہبِ الہامی۔ ان میں سے اوّل کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد عرب کے الہامی مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے۔ (۱) مذہبِ صابئین (۲) مذہبِ ابراہیمؑ اور دیگر انبیائے عرب یعنی ہودؑ صالحؑ اسمٰعیلؑ اور شعیبؑ کا (۳) مذہبِ یہود (۴) مذہبِ عیسوی۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتہً اسلام نمودار ہوا اور اُس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دُور کر دیا اور دفعتہً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نُور سے بھر پُور کر دیا" اس کے بعد انہوں نے مفصل بیان کیا ہے کہ اسلام نے عرب کے مذاہب مذکورہ میں کیا کیا اصلاحیں کیں؟ کن باتوں کو قائم رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی؟ اس کے بعد جو اکثر عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام درحقیقت اصول و عقائدِ متفرقہ و منتشرہ مذاہبِ سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے، اُس کا اس طرح جواب دیتے ہیں کہ "ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہو گی کہ یہ مشابہت اصولِ اسلام کی دیگر مذاہبِ الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر متغیر اور کامل ذات ہو، ضرور

ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی۔ جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس طرح کہ اُس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطے سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو متناقض اصول اور احکام اُس کی ذات سے صادر ہوں۔ مسلمانوں کو بلکہ تمام دُنیا کو حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیئے جنہوں نے ابتدائے دُنیا سے اپنے زمانے تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا، جنہوں نے دُنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی جنہوں نے اپنے باایمان متبعین کے لیئے بے بہا اور لازوال نُور کے دروازے کھول دیئے۔"

چوتھا خطبہ چوتھے خطبے میں اس بات کا نہایت شافی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور اس سے مُوسوی اور عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔ اس خطبے کو سرسید نے اس طرح شروع کیا ہے کہ "یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصّب دل پیدا کرنا چاہیئے کیونکہ طرفدار دل سچے اور صحیح نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ اس الزام کے دفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانی مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اس کو ظاہر کرتے ہیں، مگر جہاں تک ہم سے ہوسکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرفدار دل اور سیدھی سادی سچّی نیّت سے یہ مضمون لکھا ہے اور اسی لیے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اُس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے۔"

خطبہ ۴ کا پہلا حصّہ مصنّف نے اس مضمون کو چار حصّوں پر منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصّے میں وہ فائدے بیان کیے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اُس کے ثبوت میں اُن مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کیئے ہیں جنہوں نے اسلام کے حق میں مذہبِ اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں۔ جیسے سر ولیم میور جن کی نسبت سرسید لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے، ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، ٹامس کارلائل وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا حصّہ دوسرے حصے میں اُن عیسائی مصنّفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنہوں نے اسلام کو نوعِ انسان کی معاشرت کے حق میں مُضر بنایا ہے اور اس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنّفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حُسنِ معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے۔

تیسرا حصّہ تیسرے حصّے میں اُن فائدوں کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں مذہبوں کو بالاشتراک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔ یہ دونوں حصّے خطبۂ مذکورہ کے چونکہ بہت طولانی ہیں اور خلاصے میں اُس کی خوبی باقی نہیں رہ سکتی اس لیئے ان کو اصل کتاب میں دیکھنا چاہیئے۔ مگر تیسرے حصّے کا صرف ایک فقرہ بطور نمونہ کے یہاں لکھا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاقی کے افعالِ قبیحہ منسوب کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ان تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی اُن تمام تحریروں کو الہام ربانی اور اُن نبیوں اور مقدس لوگوں کو اُن افعالِ قبیحہ[1] کا مرتکب یقین کرتے تھے۔ اسلام نے اُن معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو اُن تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے اُن پر لگائے تھے اُن کو فتحمندی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دُنیا کے بہت بڑے حصّے پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلے پر یقین دلانے سے کہ انبیاء پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں توریت کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور جن وجوہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے اُن کو بخوبی دریافت کیا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ اُن کی بیٹیوں، حضرت اسحٰقؑ، یہودا۔ حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹوں، ہارونؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے وہ تمام

---

[1] یہ عہدِ عتیق کے اُن درسوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حضرت لوطؑ حضرت داؤدؑ وغیرہما کی طرف زنا اور دیگر افعالِ قبیحہ کی نسبت کی گئی ہے ۱۲

دُنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کرکے کالے پانی بھیجتے ہیں یا اُن کے گناہوں کی سزا کے لیے اُن کو سُولی پہ لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دُنیا میں اس حد تک پہنچادی جس کے وہ مستحق تھے۔"

چوتھا حصہ پھر اسی خطبے کے چوتھے حصّے میں اُن فائدوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں مذہبِ اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں۔ عیسائی مذہب کی بُنیاد اُس نیک اور حلیم شخص (یعنی حضرت یحیٰی پیغمبر) سے ہے جو خدا کا رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دار و مدار اُس عجیب شخص پر ہے جس کو انہوں نے اتنا بزرگ اور مقدّس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰؑ پر) مذہبِ اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادہ اور نڈر دل اور نہایت استوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرفدار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی باپٹسٹ (یعنی حضرتِ یحیٰیؑ) بلاشبہہ سچّے پیغمبر اور حضرتِ عیسیٰ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔ پس کونسا مذہب اس بات کا دعوے کرسکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ ترمفید ہے اور اس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے۔"

"جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اس لازوال مسیح کے بھی متناقض تھا اور اُن خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرتِ عیسیٰؑ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امرِ اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اُسی نے خدائے ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اُس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت نے کی تھی۔ اسلام ہمیشہ اس زمانے کے عیسائیوں کو اُن کی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی متنبہ کرتا رہتا ہے۔ اسلام نے عیسائیوں سے اُسی سچّے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا۔

جیسا کہ قرآن میں آیا ہے "قُلْ یَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا" بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی میں کھل گئیں اور اُس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہوئے جس میں مبتلا تھے اور انہوں نے پھر اُسی رتبے کے حاصل کرنے کی کوشش جو پہلے اُن کو حاصل تھا۔ یعنی انہوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہٗ لاشریک لہٗ اور عیسیٰ مسیح کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونیٹیرین (یعنی موحدین) سے معزز ہے"

اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لیئے دنیا سے اٹھالیا جائے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ "اگر سینٹ پیٹر[1] یا سینٹ پال پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اُس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسی پُراسرار رسومات کے ساتھ اُس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ آکسفورڈ یا جینوا میں جاکر اُن کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں جاکر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول[2] مفسروں نے ان کی تحریرات اور اُن کے مالک (یعنی عیسیٰ مسیح) کے کلمات کی تفسیر کی ہے اُس پر غور نا کرنا پڑے گا"

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے اُن میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیاراتِ ناجائزہ سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا با اختیار نائب سمجھتے تھے اور اُس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ اُن کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے گناہوں کے بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ پوپ کو پورا اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ درحقیقت

---

[1] سینٹ پیٹر۔ یعنی پطرس حواری اور سینٹ پال یعنی پولوس مقدس ۱۲

[2] صادق القول کا لفظ مسٹر گبن نے بطور طنز کے لکھا ہے جس سے مراد تحریف کرنے والے مفسر ہیں ۱۲

پوپ بلحاظ اُن اختیارات کے جو اُس کو حاصل تھے اور جن کو وہ کام میں لاتا تھا، کسی طرح حضرت عیسیٰؑ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اِس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اُس سے پیدا ہوتی ہیں اُن کو بتلایا اور جا بجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور اُن کو سمجھایا کہ اِس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لیے سچ کی جستجو کریں چنانچہ قرآنِ مجید میں فرمایا: "قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ" اور پھر دوسری جگہ فرمایا "اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ"۔

"جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم جو اُس وقت عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اُن کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے عدیؓ اس بُت کو اپنے گلے سے نکال پھینک۔ چنانچہ نکال ڈالی۔ جب وہ پاس آئے تو آنحضرت قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ، جب آپ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ "ہم تو اُن کی پرستش نہیں کرتے" آپ نے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر تم بھی اُس کو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھیراتے ہیں وہ اُس چیز کو جسے خدا نے حرام کر دیا سو تم بھی اُس کو حلال سمجھنے لگتے ہو؟ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا بس یہی اُن کا پوجنا ہے۔

"ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کیے اور اُس کے ہر مسئلے سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے اُسے دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدس کے دل پر اُس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ اُن دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جن میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوائے دوسرے خدا یا چھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلے نے اُن کے دل پر اثر کیا اور جیسی کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اُٹھے کہ "پالیا پالیا"

اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور ان کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اُس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے جس کی بدولت ہم کروڑں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو یہ نعمت نہ بخشتا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بُت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھلک فرقے کے لوگ بُت پرست ہیں اور حضرتِ مسیح کی مجسّم مورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں، عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے"

"چونکہ درحقیقت لوتھر مقدّس نے مذہبِ اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لیئے اس کے مخالف علانیہ اُس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا۔ کوارٹرلی ریویو نمبر ۴۲۵ میں لکھا ہے کہ جینی برارڈ نے پوپ کی طرف سے جرمنی کے ریفارمروں اور خصوصًا لوتھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہبِ اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور لوتھر کے عقیدے میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کا میلان جو بُت پرستی کے برخلاف ہے اُس پر غور کرو۔ مارٹینس، الفانسس اور والڈس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمد (صلعم) نے انہیں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں۔"

"تاہم لوتھر نے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخرِ کار اُس عظیم الشّان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عمومًا مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی، آزاد کر دیا ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدّس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلہ تثلیث کے مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلے کو بھی، جو درحقیقت حضرتِ عیسیٰؑ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اُس نبی آخر الزماںؐ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا۔ پس مذہبِ عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیئے۔"

پانچواں خطبہ | پانچویں خطبے میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب

حدیث، کتبِ سیر و تفاسیر اور کتبِ فقہ کی تصنیف کا منشا اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چیں جو اسلام کی نسبت آئندہ زمانے میں کچھ لکھنا چاہیں اُن کو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرزِ تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ اُن مصنّفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کے سبب غلطی میں پڑے ہیں گمراہ نہ ہوں اور اُن کی رہبری کے لیئے ایک سیدھا رستہ بن جائے۔

چھٹا خطبہ چھٹا خطبہ مذہبِ اسلام کی روایت پر لکھا گیا ہے۔ یہ خطبہ کسی قدر طُولانی ہے اس لیئے صرف اُس کی سُرخیاں لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اس میں اوّل روایت کی اصلیت اور یہ کہ اُن کے رواج کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور نیز یہ کہ دینِ اسلام صرف انہیں صحیح روایتوں پر منحصر ہے جو تبلیغِ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دُنیوی امور سے، بیان کیا ہے۔ پھر جھوٹی روایت کرنے کا امتناع اور اُس کی سزا جو اسلام میں مقرر ہے، درجاتِ احادیث بلحاظ ثقہ ہونے رواۃ کے، راویوں کا درجۂ اعتبار بلحاظ تفقّہ کے، یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرتؐ نے صحابہ کو دی، اختلافِ روایت کے اسباب، احادیثِ موضوعہ کا بیان؛ یہ تمام باتیں مفصّل بیان کی گئی ہیں اس کے بعد سر ولیم میور نے جن روایات سے استدلال کر کے اسلام اور بانیٔ اسلام پہ اعتراضات وارد کیے ہیں اُن اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری اور مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے اُجالے میں کوئی غیر مذہب مصنّف بشرطیکہ اُس نے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں، ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔

ساتواں خطبہ ساتویں خطبے میں اوّل قرآن مجید، اس کا نزول، اُس کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب، اُس کی مختلف قرأتیں، آیاتِ ناسخ و منسوخ کی بحث، اس کے جمع ہونے کا زمانہ اس کی نقلوں کی اشاعت اور اس کا کامل اور الہامی ہونا بیان ہوا اور اس کے بعد سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو انہوں نے قرآنِ مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل منشاء وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے۔ یورپ کی زبانوں میں بے شک اس کے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کیئے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یورپ میں ہوا اس کو بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شائع ہوتا کہ ہر لفظ قابلِ تبدیل (یعنی محتمل المعنیین) متین اور شائستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابلِ برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنانے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی، تو اس ذریعے کا کسی قدر تصور بندھ سکتا جس کی وساطت سے یوروپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی۔"

اس کے بعد سرسید نے سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض انہوں نے غلط فہمی سے قرآن پر وارد کیے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

آٹھواں خطبہ

آٹھواں خطبہ خانۂ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ یقطان جس کا ذکر توریت میں جابجا آیا ہے اہلِ عرب کا اس کی اولاد میں ہونا، حضرت اسمٰعیلؑ کا مکہ کے قریب آباد ہونا، خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کی تمام مراسم کا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے تعلق ہونا، یہ سب بناوٹ اور افسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور مورخانہ احتمالات و قیاسات سے نہایت بعید ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "حجر اسود کو بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منا میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیمؑ سے یا ان خیالات و اصول سے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہنچے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں، یا ان کو بت پرستی کے ان اصول سے جو جزیرۂ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا۔" اس دعوے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جو آگے چل کر آنحضرتؐ صلعم کے بنی اسمٰعیل ہونے

سے انکار کیا ہے اور آپ کے نسب نامہ پر شبہات وارد کیئے ہیں اُن کے لیئے ایک وجہ ہاتھ آئے۔

سرسید نے اِس خطبے میں صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ تر یورپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ والوں کی تحقیقات سے حضرتِ اسمٰعیلؑ اور اُن کی اولاد کا حجاز یا عرب میں آباد ہونا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ حجرِ اسود اور قربانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص حضرتِ ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد سے تعلق ہے۔ انہوں نے توریت کے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد یعنی حضرتِ اسحٰقؑ، حضرتِ یعقوبؑ اور حضرتِ موسیٰؑ سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیئے ایک بِن گھڑا پتھر مثل حجرِ اسود کے کھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اس کو بیتِ ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے اور تمام مراسم جو موسمِ حج میں خانہ کعبہ اور اُس کے قرب و جوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں ان سب کا تعلق حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرتِ اسمٰعیلؑ کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر منصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

مثلاً وہ کعبہ اور حجرِ اسود کی نسبت کتاب پیدائش اور کتاب خروج کے متعدد بابوں اور آیتوں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ "حجرِ اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ بناتے تھے۔ . . . . یہ سب بزرگ ایسے پتھر کی تعظیم کرتے تھے، یعقوب نے اس پر تیل ڈالا جو اُس زمانے کے دستور کے موافق غایت الغایتہ تعظیم پرستش کے قریب تھی یعقوبؑ نے کہا کہ یہ جگہ خانۂ خدا ہو گی . . . . اور خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمہاری ستر گاہ اُس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے۔ پس اب کونسا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت نبی ابراہیمؑ میں جاری نہ تھا جس پر سر ولیم میور حجرِ اسود کی سی خفیف تعظیم کو نبی ابراہیمؑ کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بُت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں"

"ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اُس کا نام رکھنا، جیسے کہ کعبہ ہے اگر ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا یعنی موسیٰؑ جس نے بمقام گبعون بیابان

میں خدا کا گھر بنایا۔۔۔۔اور وہ کون تھا (یعنی داؤدؑ) جس نے خرمنگاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر (لکڑی و لوہا و پیتل اُس کے بنانے کو جمع کیا۔۔۔۔۔اور وہ کون تھا (یعنی سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمنگاہ ارنان یبوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا۔۔۔۔پس کعبے کی بنا کو اور اُس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔"

اس کے بعد عرفات کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ "عرفات جس کو سر ولیم میور بت پرستوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیمؑ اور اُس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے، ہزاروں جگہ توریت میں آیا ہے کہ خدا ابراہیمؑ کو مرئی ہوا، خدا اسحاقؑ کو مرئی ہوا، خدا یعقوبؑ کو مرئی ہوا، خدا موسیٰؑ کو مرئی ہوا، بس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں۔ جس پہاڑ پر، جو قریب مکہ کے ہے، خدا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو مرئی ہوا، اس پہاڑ کا نام جبلِ عرفات ہے۔ معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے جبلِ عرفات کو کیا سمجھا جو اُس کی نسبت کہا کہ اُس کو ابراہیمی رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے۔"

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دُنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ ۔۔۔۔عرفات کا استعمال بجز خاندانِ ابراہیمؑ کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا ۔۔۔۔۔یہی وہ مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں وہاں کوئی چیز نہیں ہے، پہاڑ تلے کا میدان ہے، اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں، وہاں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں، ٹھیک اُسی طرح جس طرح کہ موسیٰؑ نے کوہِ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے۔ پس غور کرنا چاہیئے کہ اِس رسم کی اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیمؑ سے۔"

اس کے بعد منا کی نسبت لکھتے ہیں کہ "منا کا مقام صرف قربانی کے لیئے ہے، وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی۔ تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بیت اللہ بنا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ منا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہیں اس لیئے قربانی نذر کرنے کے لیئے

وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ابراہیمؑ و یعقوبؑ و اسحٰقؑ اور موسیٰؑ اور داؤدؑ و سلیمانؑ کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اُس قربانی میں جانور کو مار کر اُس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ اس خیال سے کہ خدا کو اُس کی خوشبو یعنی چراند پسند آتی تھی اور اسلام میں وہ قربانی غریب و محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں۔ اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منا کی رسومات کو بُت پرستی کی رسوم تصوّر کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ذی عقل اُس پہلی قربانی سے اِس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔"

یہ خطبہ بہت لمبا ہے۔ اس کی اصل خوبی بغیر اس کے کہ اُس کو اوّل سے آخر تک اصل کتاب میں دیکھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس میں سر ولیم میور کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانۂ کعبہ اور مکہ معظمہ کی تاریخ محققانہ طور سے مفصل بیان کی گئی ہے۔

نواں خطبہ

نواں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ اس خطبے کے لکھنے کا منشا یہ تھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلعم کے بنی اسمٰعیلؑ ہونے سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرتؐ) اسمٰعیل کی نسل سے ثابت کئے جائیں اُن کی عین حیات میں پیدا ہو گئی تھی اور اس طرح پر محمدؐ (صلعم) کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیلؑ اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصّے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے"۔ سر ولیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب سے ہوئی کہ آنحضرتؐ کا نسب سِیَر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ تک جتنی پشتیں اہلِ سیر نے لکھی ہیں اُن میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

اسی بنا پر اس خطبے کے اوّل میں سر سید نے ایک نہایت عمدہ تمہید لکھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں ان میں بے مثل تھیں، ایک شاعری، دوسرے علم الانساب۔ چونکہ اُن کے ہاں کتاب کا رواج نہ تھا اور صرف حافظے پر مدار تھا اس لئے وہ اپنے اپنے قبیلے کی تمام پشتیں نامقدور زبانی یاد رکھتے تھے اور نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے مگر چونکہ بغیر کتابت کے کسی قبیلے

کی تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اس لیے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے اور کچھ بھول جاتے تھے مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ ان کے نام اور ان کے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلے اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا بتا سکے۔ اگرچہ کسی کو کسی قبیلے کی نسلیں بہ ترتیب یاد نہ ہوں مگر ہر ایک قبیلے میں جو نامور اور قابلِ فخر اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے۔ اسی لیے جب اسلام کے زمانے میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مؤرخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا تو ان کو ایسی دقتیں پیش آئیں جن کا حل کرنا بہت دشوار تھا کیونکہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے تھے۔ شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامے کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اس کا نام لے دیتے تھے۔ جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰ کی نسبت لکھا ہے کہ "نسب عیسیٰؑ بن داؤد ابن ابراہیم" حالانکہ مسیحؑ سے داؤدؑ تک اور داؤدؑ سے ابراہیمؑ تک بہت سی پشتیں درمیان تھیں مگر چونکہ داؤدؑ اور ابراہیمؑ نہایت مشہور اشخاص تھے اس لیے مسیحؑ کو داؤدؑ اور داؤدؑ کو ابراہیم کا بیٹا بتا دیا۔

"عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کرسی نامہ بیان کرتے وقت جب آبا و اجداد کے نام ان کی یاد کے موافق ختم ہو جاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے۔ ان اسباب سے مؤرخوں کو ان کے نسب نامے سلسلہ وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں۔"

آنحضرت کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ آپ کو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ تمام عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلۂ قریش سے اور قریش کو معد ابن عدنان کی اولاد میں اور عدنان کو قیدار ابنِ اسمٰعیلؑ ابنِ ابراہیمؑ کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدر ان کا

جاننا آپؐ کے بنی اسمٰعیلؑ ہونے کے لئے کافی تھا، گو کہ درمیان میں کتنی ہی پشتیں گزری ہوں۔ اسی لئے کوئی صحیح روایت آپؐ کے نسب نامے کے متعلق موجود نہیں ہے سوا اس کے کہ آپؐ نے فرمایا "ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور ولی ہیں"۔

"پس جب لوگوں نے آنحضرتؐ کا نسب نامہ بترتیب لکھنا چاہا تو اُن میں اختلاف ہونا ضروری امر تھا۔ آنحضرتؐ سے لے کر معد ابنِ عدنان تک کسی مورّخ کا اختلاف نہیں ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ معد ابنِ عدنان سے اسمٰعیلؑ تک کی پشتوں میں ہے۔ عرف تین شخص ایں جن کے لکھے ہوئے نسب ناموں میں معد ابنِ عدنان سے لے کر ابراہیمؑ تک پشتوں کا بیان ہوا ہے

اس کے بعد سرسید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے، کیونکہ اُن میں قطع نظر اختلافات کے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیمؑ کے درمیان گزرا ہے وہ نو یا دس یا گیارہ پشتوں سے (یعنی فی صدی تین پشتوں کے مسلّمہ قاعدے کے موافق) پورا نہیں ہوتا۔ اب وہ نسب نامے باقی رہ گئے۔ ایک برخیا کاتب الوحی ارمیانبی کا۔ دوسرا الجرا کا۔ ارمیانبی جیسا کہ بائیبل سے ثابت ہے خود معد ابن عدنان کے زمانے میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامے میں انہوں نے معد کو بچایا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ اُن کو معد کا نسب نامہ اسمٰعیل بن ابراہیمؑ تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہو گی اور اِس نسب نامے کو مسعودی اور واقدی نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ مگر اِس نسب نامے سے بھی اگر اُس میں آنحضرتؐ سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں، اُن کو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرتؐ سے ابراہیمؑ تک ہے پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الجرا نے لکھا ہے وہ بھی اب تک ایک جُدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سرسید نے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جُدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامے کا تتمہ ہے۔ کیوں کہ اُس کو تتمہ فرض کرنے کی صورت میں آنحضرتؐ سے اسمٰعیلؑ تک ستّر پشتیں ہوتی ہیں جو فی صدی تین پشت کے مسلّمہ قاعدے کے موافق اُس زمانے پر بالکل منطبق ہو جاتی ہیں، جو اسمٰعیل کی ولادت کے درمیان گزرا ہے۔ یعنی دو ہزار چار سو چھیتّر برس کا زمانہ۔

سر ولیم بطور طعن کے لکھتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی سوانح سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے"۔ اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ "بلا شبہ اہلِ عرب نبی

اسرائیل سے نہایت قرابتِ قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیلؑ کی اولاد تھے اور بنی اسرائیل اسحٰقؑ کی۔ وہ ان پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اُس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل آنحضرتؐ نے نہیں فرمائی اُس کا مفصّل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں، خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی۔"

"پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبرؐ کا نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس کا کبھی مذکور آنحضرتؐ کی زندگی میں نہیں ہوا تو بلاشبہ اُنھوں نے اپنے بنی اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا اُن کے ہاں رواج تھا، مدد لی۔"

اِس کے بعد سرسید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ "نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اِس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور ازراہِ طعن ہماری نسبت کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہیں۔ گو یا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اِسی طرح اسلام بھی مذہبِ یہود کا محتاج ہے۔ ہم نہایت خوشی سے اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور جو مشابہت اِن دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اُس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اُس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں۔ صرف ہم مسلمان ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و یعقوبؑ و اسحاقؑ و اسمٰعیلؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ "قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃٍ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ۔" ہم مسلمانوں کا فخر یہی ہے کہ یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں۔ جنھوں نے یحییٰ و عیسیٰ اور محمدؐ رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور اُن کی پیروی کی ہدایت کی تھی، مگر یہودیوں نے اُن تینوں کو اور عیسائیوں نے اُس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا اور اُن کی سچی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔"

اِس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے نسب نامے کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے

کی ہے ۔ خدا کے اُس وعدے کا پورا ہونا جو اُس نے بنی اسرائیل سے موسیٰؑ کی زبانی کیا تھا کہ "میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیلؑ کی نسل سے موسیٰؑ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا" کچھ اِس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیلؑ کی نسلیں محمدؐ سے لے کر اسمٰعیلؑ تک ہم کو ترتیب وار اور پوری پوری یاد ہوں اور نہ اِس بات پر منحصر تھا کہ وہ کُرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں اور بریجیا کی تحریروں سے لیں ۔ وہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک کے لئے ہونا تھا سو محمدؐ رسول اللہ کی نسبت پورا ہُوا ۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے پچھلے مؤرخ ، خواہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اِس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے ، بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ بنی ہاشم ، قریش ، اسمٰعیلؑ ابنِ ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں ۔ محمدؐ رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ابیکم ابراہیم جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اِس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے ۔"

اس کے بعد ابوالفدا مسلمان مؤرخ اور مسٹر گبن اور ریورنڈ فاسٹر عیسائی مؤرخوں کی شہادتیں نقل کی ہیں ، جن میں سے گبن کا قول یہ ہے کہ "محمدؐ (صلعم) کو حقیر اور مبتذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ اِفترا ہے ، ایسا اِفترا کرنے سے بجائے اس کے اُس سے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں اُن کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں ۔ اسمٰعیلؑ سے اُن کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے ۔ بالفرض اگر کُرسی نامے کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف و نجیب ہیں ۔ وہ قریش اور بنی ہاشم ہیں جو اہلِ عرب میں نہایت نامی اور مکّہ کے فرمانروا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے ۔ یہی رائے مسلمان مؤرخ یعنی ابوالفدا کی ہے اور یہی گواہی ریورنڈ مسٹر فاسٹر کی ہے ۔

اِس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "اب ہم اِس خطبے کے خاتمے میں اپنے پیغمبرؐ کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور چونکہ مجھ کو بھی اِس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اُسی آفتابِ عالمتاب کے ذرّوں میں سے ہُوں اِس لئے اپنے نسب کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اُس سرور دوجہان سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اُس سرورِ دوعالم میں ہے اور جس کے سبب لحمک لحمی و دمک دمی ہمارا موروثی خطاب ہے اِس ظاہری ارتباط سے معزز ہو جائے ۔"

گرچہ خُردیم نسبتیست بزرگ ذرۂ آفتابِ تابانیم"

دسواں خطبہ دسواں خطبہ اُن بشارتوں کے بیان میں ہے جو توریت اور انجیل میں آنحضرت صلعم کے نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں۔ اِس خطبے میں اوّل سرسید نے قرآنِ مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اِس بات کا بیان ہے کہ توریت و انجیل میں آپ کی نبوّت کی خبریں دی گئی ہیں۔ اُس کے بعد اُنھوں نے وُہ وجوہات بیان کی ہیں جن کے سبب سے اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیائے سابقین کی کتابوں کا پُورا پُورا اعتبار نہیں کیا اور اس لئے اُنھوں نے توریت و انجیل میں اُن بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور تحریف کا عُذر پیش کر کے اُن بشارتوں کے نشان دینے سے جن کی قرآن میں جا بجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے پھر اُن محققین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نہایت کوشش و استقلال سے اُن کی تفتیش کی اور توریت و انجیل میں سے بہت سے ایسے مقامات دریافت کئے جہاں آنحضرتؐ کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چونکہ اُن کی نشان دی ہوئی بشارتیں جو ہماری مذہبی کتابوں اور تفسیروں اور سیر و تواریخ میں مذکور رہیں اُن کی بابت کچھ پتا نہیں دیا گیا کہ وہ بائیبل کی کون سی کتاب اور کون سے باب اور کون سے درسوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے جن میں کثرت سے اختلافِ عبارت تھا اور جن کے جُدا جُدا نام تھے اُن میں سے کون سے نسخے میں وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ جتایا گیا کہ بائبل کی بہت سی کتابیں جو اب مفقود ہیں، جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وُہ بشارتیں اُن میں سے لی گئی ہیں یا موجودہ مسلّمہ کتابوں میں سے، اِس لئے سرسید نے صرف چند[1] بشارتیں جو آنحضرتؐ کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجودہ مسلّمہ مجموعہ عہدِ عتیق و عہدِ جدید میں موجود ہیں، جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں، اِس خطبے میں بیان کی ہیں۔

اِس کے بعد انھوں نے وہ طریقہ جس طریقے سے کہ بائبل میں پیشین گوئیاں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوتی ہیں بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اُن کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہیلی یا معمّے کا بیان ہوتا ہے۔ جب

---

[1] ان میں سے اکثر بشارتیں سرسید سے پہلے ہمارے زمانے کے بعض علمائے مسلّمہ مجموعہ بائیبل سے بحوالہ باب اور درس کے نقل کی ہیں مگر جس عمدگی کے ساتھ خطبات میں ان کا بیان ہوا ہے ویسا کسی نے بیان نہیں کیا ۱۲

تک کہ اُن کی تشریح نہ کی جائے اور اُن کا حل نہ بتایا جائے اُن کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اِس لئے پہلے اِس سے کہ آنحضرت صلعم کی بشارتیں بیان کریں، اُنہوں نے اوّل بطور مثال کے عہدِ عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جن کو حواریوں نے حضرتِ عیسٰی کے حق میں بتایا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بائبل میں پیشین گوئی کس طریقے سے بیان کی جاتی ہے اور نیز حضرتِ عیسٰی اور آنحضرت کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جائے کہ کون سی بشارتیں زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کون سی مبہم اور دُھندلی۔

اس کے بعد اُنہوں نے چھ بشارتیں عہدِ عتیق سے اور تین بشارتیں عہدِ جدید سے آنحضرت صلعم کی نسبت بیان کی ہیں۔ ازاں جملہ عہدِ عتیق کی تین بشارتیں جن میں سے ایک توریت کتابِ استثنا باب (۱۸) میں اور دوسری کتابِ استثنا باب (۳۳) و کتاب حبقوق نبی باب (۳) میں اور تیسری کتاب تسبیحاتِ سلیمان باب (۵) میں مندرج ہے اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں ایک بشارت، یہ چار بشارتیں نہایت معرکۃ الآرا ہیں جن کی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلیں کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے اُن کے ترجموں میں عجیب عجیب کارستانیاں کی ہیں۔ سرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہیئے اُس سے بڑھ کر تحقیقات کی۔ بڑے بڑے عیسائی محققوں کے اقوال اور بائیبل کے حوالوں سے اپنے استدلالات کو تقویت دی ہے اور اپنے بیان کو فی الواقع اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسٰی مسیح کی پیشین گوئیوں کے آنحضرت کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کا محل باقی نہیں رہا۔

گیارہواں خطبہ گیارہویں خطبے میں معراج اور شقِ صدر کی حقیقت محققانہ طور سے بیان کی ہے اور اِس باب میں جس قدر مختلف اور متناقض روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں اُن کا اختلاف اور تناقض دکھایا ہے اور اس لئے جس قدر کہ قرآنِ مجید میں معراج کی نسبت بیان ہوا ہے صرف اُسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہے اور معراج کو رویا پر محمول کیا ہے جس کا ایک جزو شقِ صدر بھی تھا اور عیسائیوں کی طعن کا جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہے۔

یہ دونوں بحثیں یعنی معراج اور شقِ صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ ان سے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں۔ اس لئے اُن دونوں بحثوں کو تفسیر میں دیکھنا چاہیئے۔

بارہواں خطبہ

بارھویں خطبے میں آنحضرت صلعم کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر کہ معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے بیان کیا ہے اور جو بے شمار رطب و یابس روایتیں اہل سِیَر نے اپنی کتابوں میں بھر دی ہیں اور جن کی رُو سے سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں جا بجا تعریضیں کی ہیں، اُن کی تضعیف کی ہے اور اکثر جگہ برتقدیر اُن کی صحت کے نہایت لطیف جواب سر ولیم میور کی تحریرات کے دئے ہیں۔ سر ولیم میور نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات تعریضاً بیان کئے ہیں جیسے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ آنحضرتؐ کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اُڑا دینا، اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، مدینہ سے حدیبیہ جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا۔ اس پر سر سید لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایامِ طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرت صلعم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے۔ اُنھوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ" پس ایسی باتیں اگر ہوئیں بھی تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں"۔

یا مثلاً سر ولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرتؐ کے سفرِ شام کا حال ابو طالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "زمانۂ سابق کے منہدم اور اُجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب و غریب بیانوں اور دل انگیز روایتوں نے اور بھی پُر اثر کر دیا تھا۔ اور گرجاؤں کی صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد (صلعم) کے غور کنندہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پائدار اثر کر دیا تھا"۔

سر سید اوّل تو سفرِ شام میں چچا کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے اور اور اس کے بعد برتقدیرِ تسلیم لکھتے ہیں کہ ہم نہایت ادب سے سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص (جیسا کہ سر ولیم میور نے آنحضرتؐ کی نسبت لکھا ہے) کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص غور کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے؟ اگرچہ یہ بیان سر ولیم کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علاماتِ دینِ عیسوی سے اس قدر اثر پذیر ہوا تھا، بعد کو انھیں چیزوں سے مخالفت اختیار کی۔ صلیب کو توڑا، مورتوں کو بھینڈا، اُن کی پرستش سے منع کیا اور

بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں، تثلیث کے عقیدے کو جھٹلایا خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا۔"

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ درحقیقت مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا، صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گذرتی تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں، صلیبوں، مورتوں اور علاماتِ دینِ عیسوی کے دیکھنے سے ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے اُن کے برخلاف ایسے کامل نتائج درمعبود غیر حاضر اور بقائے تدرج انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا۔ وہ بلاشبہ مادرزاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرتِ عیسیٰؑ نے یہ کہہ کر بشارت دی ہے کہ "سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لئے ضرور ہے کیونکہ اگر میں چلا جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

اس خطبے میں بمقابلہ سرولیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف مباحث ہیں جن کو خطباتِ احمدیہ میں دیکھنا چاہیئے۔

یہ جو کچھ ہم نے خطباتِ احمدیہ میں سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے اس کو ایک بہت بڑے حوض یا تالاب میں چلّو دو چلّو پانی سمجھنا چاہیئے۔ اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کہ اس میں لکھا گیا ہے اُس کی حقیقت جب تک کہ اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی خصوصاً اردو خطبات جو سرسید نے ولایت سے آ کر بہت مدت کے بعد لکھی ہے اور جس میں بہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ لکھی ہے، اُس سے مصنف کی محنت لیاقت اور اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سرسید کے ارادے کے موافق پوری نہ ہو سکی۔ اُن کا ارادہ سرولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھیرنا ناممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر، کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آ کر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہو گئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں بآسانی میسر آ سکتی تھیں اُن کا ہندوستان

میں کہیں وجود نہ تھا، وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا مگر جو مباحث سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے اُن میں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی یا اجمالی جواب اسی ایک جلد میں آگیا ہے۔ کیونکہ جس اصول پر سر ولیم میور نے اپنے تمام اعتراضات کی بنیاد قائم کی ہے خطباتِ احمدیہ میں اُس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور نہایت واضح طور پر جتا دیا گیا ہے کہ اسلام پر مخالفین کا کوئی اعتراض اُس وقت تک وارد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قرآن یا اُن حدیثوں کی سند پر جو اصولِ علمِ حدیث کے موافق واجب التسلیم قرار پائیں مبنی نہ ہو اور اِس قاعدے سے وہ اعتراضات یک قلم ساقط ہو جاتے ہیں جو عام تاریخ و سیر کی کتابوں یا اجتہادِ فقہا یا اقوالِ علماء و آرائے مفسرین کی رُو سے مذہبِ اسلام پر ایراد کئے جاتے ہیں۔

جس وقت سر سید نے خطباتِ احمدیہ لکھی ہے اس وقت تک مذہبی تحقیقات کے متعلق اُن میں وہ آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی تفسیر القرآن میں دیکھی جاتی ہے اور اِس لئے خطباتِ احمدیہ میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس کو اسلام کے اصولِ متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے۔ البتہ دو ایک جگہ کسی قدر اُنھوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ علمائے محققین نے صدہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً معراج کے مضمون کو، جیسا کہ بعض صحابہ کا مذہب ہے، رویا پر محمول کیا ہے اور شقِ صدر اور براق کی سواری کو اسی رویا میں داخل کیا ہے یا اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی جمہور کے خلاف بیان کی ہے، لیکن اِس سے اصول کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ تعجب ہے کہ سر ولیم میور نے، جیسا کہ سر سید کی زبانی سُنا گیا ہے، جس وقت خطباتِ احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ "میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے بلکہ اُس اسلام پر اعتراض کئے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آتے ہیں"۔ یہ بعینہٖ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیر انداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اُس پر تیر برسانے شروع کرے اور جب اُدھر سے بھی خلافِ توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہے تیر اندازوں سے نہیں ہے۔ سر ولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ایک نئے طریقے سے نکتہ چینی کی تھی۔ اور چونکہ مسلمانوں نے اِس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سُنے تھے، اِس لئے سر ولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا مگر جب اُنھوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات اُنھوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کئے تھے اِسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور پر استعمال کئے گئے ہیں جس کی اُن کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ اُن کی زبان سے نکلے جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے

تو اسلام کو تنہا سمجھ کر حملہ کیا تھا۔

خطبات پر اخبار انکوائرر کی رائے

انگلستان کے اخبار "انکوائرر" مورخہ ۱۱ مئی ۱۸۷۲ء میں جب کہ سر سید کو ولایت سے ہندوستان میں آئے ہوئے دو برس گذر چکے تھے، کسی آزاد خیال انگریز نے خطباتِ احمدیہ پر مفصل ریویو چھپوایا تھا اُس کے چند دلچسپ فقرے ہم اِس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ "ہمیں اس کتاب کے مضامین کو خوشی سے لینا چاہیئے کیونکہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کم از کم پہلے پہل ہی اُس مبادلۂ خیالات اور فیلنگز کے جو مشرق اور مغرب میں اُن مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں، جو باوجود اختلاف کے ایک نوع کا اتحاد بھی رکھتے ہیں، ہوتا چلا ہے گو ہم پہلے ہی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خیالات کا مبادلہ زمانۂ آئندہ میں کہاں تک جاری رہے گا یا اِس سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے، لیکن بہر حال ہم سید احمد کو جو اپنے ملک میں رفاہِ عام کے سرگرم کارگذار اور اپنے مذہب کی اُٹھ کر حمایت کرنے والے ہیں وِلکم کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی مذہبی تحریریں ہمارے سامنے پیش کی ہیں مسلمانوں کو بلا شبہ اِس بات کا حق ہے کہ انجیل کی تفسیر[1] کے متعلق جو کچھ وہ کہیں اُس کی سماعت کی جائے خصوصاً اِس وجہ سے کہ شاید وہ روایات کے نئے ذریعے ہم پر ظاہر کریں۔ سائنٹفک مذہب کا فرض ہے کہ وہ کسی شہادت کے سننے سے جو اُس کو مل سکے انکار نہ کرے، مگر مصنف کو اِس سے زیادہ ہم سے توقع رکھنی نہیں چاہیئے کہ ہم اُس کے خیالات سے ایک حد تک اتفاق کریں گے۔"

اِس سے آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "محمد (صلعم) جیسے شخص کا کیرکٹر معلوم کرنے کے لئے ایک ایسی سائیکولوجی کا جو تاریخ کے ذریعہ سے منکشف ہوئی ہے ایک سخت دشوار اور دقیق مسئلہ حل کرنا پڑتا ہے۔ میور اور اسپرنگر نے زمانۂ حال کی نکتہ چینی کا طریقہ جس کو متشرع عیسائی اپنے مذہب کی نسبت ناپسند کرتے ہیں، اسلام کی اصل اور اُس کی ترقی کے حالات دریافت کرنے میں برتا ہے اور بارتھیلمی سینٹ ہلیر نے ہمارے سامنے ایک مفصّل تاریخی تصویر پیش کی ہے۔ ہم عام طور پر یہ ظاہر کر سکتے ہیں۔ کہ ہم نے محمد (صلعم) کی تعریف

---

[1] یہ اشارہ ہے خطباتِ احمدیہ کے ان بیانات کی طرف جہاں سر سید نے کہیں عیسائی مفسرین کی سند سے اور کہیں اور دلائل سے انجیل کے معنی جمہور عیسائیوں کے برخلاف بیان کئے ہیں۔

اور عزت دل میں رکھنی سیکھ لی ہے۔ مگر ہم میں سے ایسے کم ہیں جو کبھی قرآن کو پڑھتے ہوں۔ یہاں تک کہ سیل نے جو ابتدائی بحث اس کتاب (یعنی قرآن) کی نسبت کی ہے اُس کو بھی نہیں پڑھتے اور اُن سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اسلام کو کیا بلحاظ ملکی اور کیا بلحاظ مذہبی قوت کے ایک ایسی زندہ طاقت سمجھے ہوئے ہیں جو اپنی موجودہ یا کسی تبدیل شدہ حالت میں آنے والی صدیوں میں حکمران طاقتوں میں سے ایک طاقت شمار ہوگی"

سرسید نے جس خطبے میں آنحضرت (صلعم) کی نسبت بائیبل کی پیشین گوئیاں بیان کی ہیں اس کے متعلق فاران اور فارقلیط کی پیشین گوئی کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ "سید احمد بار بار اِس بات پر اطمینان ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے دلائل اُسی درجے کے ہیں جیسے کہ عیسائی عموماً استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ ہم کو اپنے دلائل کا یقین دلانا چاہتے ہیں تو اُن کو چاہیئے کہ عیسائیوں کی طرح عمدہ ہی نہیں بلکہ عمدہ ترین[1] دلیلیں ہمارے سامنے پیش کریں۔ انہوں نے اپنے دشمنوں کو ایک کر دیا ہے، وہ خیال کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب ہی اُن پر حملہ کر رہا ہے حالانکہ اُس کے ساتھ ہی آج کل کی نکتہ چینی کا طریقہ اُن کے مذہب کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کر رہا ہے جیسا کہ وہ اور مذہبوں کے ساتھ جن میں کرید کرنی اس کو منظور ہوتی ہے، کرتا ہے۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ سید احمد میور اور اسپرنگر جیسے لوگوں کے مقابلے میں اپنی جگہ پر قائم رہنا بخوبی جانتے ہیں"۔

اس کے بعد چوتھے خطبے کے اُس مدلل بیان پر جو سرسید نے تعددِ ازدواج کی بحث میں لکھا ہے کہتا ہے کہ "فی الواقع یہ مضمون مصنف کو بہت عزت دیتا ہے کہ وہ یہ بات ثابت کرنے کے لئے پولیگمی (یعنی تعددِ ازدواج) مضر نہیں ہے، اپنے اونٹ کو سوئی کے ناکے سے نکال لے گیا ہے۔ گو اُس نے اس کی جرأت نہیں کی کہ اُس کو حقیقی فوائد میں سے شمار کرتا۔ بہرحال ایسے مضمون پر اگر ہم کو سرسید احمد سے اتفاق بھی ہو تو ہم اُس کو ظاہر نہ کریں گے کیونکہ ہم کو اِس موقع پر ایک خوشگوار سکوت[2] ہی کو ترجیح دینی چاہیئے" پھر اِسی خطبے کے متعلق اُس بیان پر جس میں سرسید نے ثابت کیا ہے کہ اسلام عیسائیوں کے لئے رحمت تھا،

---

[1] چونکہ ریویو نگار ایک آزاد خیال آدمی ہے اس لئے وہ جس طرح عیسائیوں کی پیشین گوئیوں کو تسلیم نہیں کرتا اسی طرح مسلمانوں کی پیشین گوئیوں کو نہیں مانتا اور اثباتِ نبوت کے لئے ایسی دلیلوں کو کافی نہیں سمجھتا ۱۲۔

[2] اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے خوف سے اپنا عندیہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا ورنہ سرسید کے استدلال کو وہ دل سے مان گیا ہے ۱۲۔

کہتا ہے کہ "ہم دیکھتے ہیں کہ ہیئت اور طب یہ دونوں علم اور پروٹسٹنٹ اور یونی ٹیرین" یہ دونوں مذہب اُن فوائد میں سے ہیں جو اسلام نے کرسچینٹی (یعنی عیسائی مذہب) کو عطا کئے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ عیسائی قومیں کافی شکر گزار ہوں گی ان فوائد میں سے ہر ایک فائدہ کے لئے اور سب فائدوں کے لئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ فوائد مشکل سے کافی بیان ہیں اُس زبردست تحریک کا جو یورپ میں اندلس کے مسلمانوں سے پیدا ہوئی اور جو فنِ تعمیر، شاعری، معاشرت اور آداب سب پر حاوی ہے۔"

اس کے بعد نویں خطبے کے متعلق جس میں آنحضرت صلعم کا نسب بیان کیا گیا ہے اوّل سرسید کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ عدنان تک جو کہ پیغمبرِ خدا صلعم کے نسب نامہ میں اکتالیسواں ہے، مطلقاً عربی روایات سے لیا گیا ہے اور عدنان سے اوپر یہود کی تاریخ سے لیا گیا ہے۔ ہم کو بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے عیسائی مصنفوں نے اپنا وقت ضائع کیا اور بے فائدہ دماغ صرف کیا اس بے فائدہ تلاش میں کہ اسلام اور یہودی مذہب میں تعلق ہے حالانکہ کسی مسلمان نے اِس سے انکار کرنے کا خیال تک نہیں کیا۔ عیسائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے طنز کے ساتھ ہم کو الزام لگایا کہ تم نے یہ چیز یہودیوں سے لی اور وہ چیز اُن کے ہاں سے چرائی۔ گویا اسلام کوئی بنیاد نہیں رکھتا جس پر وہ قائم ہو۔ بلکہ بالکل عیسوی اور یہودی دین پر منحصر ہے۔ ہم مسلمانوں کو دونوں الہامی مذہبوں سے انکار کرنا تو کیسا ہم تو اپنی سب سے بڑی عزت سمجھتے ہیں کہ "ہم سچے اور ایماندار پیرو ہیں ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کے"۔ اس پر ریویو نگار لکھتا ہے کہ "اخیر کے جملے کو ہم نے ممتاز حرفوں میں لکھا ہے۔ کیونکہ وہ توجہ کے قابل ہے اور اس قابل ہے کہ یاد رکھا جائے۔ ہم کو یقین ہے کہ اِس جملے کے الفاظ ایسے ہیں جو کم سے کم اسلام کی اصولی تعلیم پر مبنی ہیں اور اِس میں شک ہی نہیں کہ وہ مصنف کے نزدیک مسلّم ہیں۔ یہ الفاظ ہم کو ایک شریف قول معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہیں جو بالکل تسلیم کئے جانے کے قابل ہیں۔ ان پر فی الحقیقت کیتھولسٹی[1] کے سچے اصول کی مہر ہے۔ فی الواقع اگر کوئی جامع اصول مختلف مذہبوں میں مصالحت پیدا کر سکتا تو وہ صرف یہی اصول ہوگا۔ شاید ہم سید احمد کو بغیر ناراض کئے

---

[1] کیتھولسٹی کا ایک لفظِ مشترک بہت سے معنوں میں آتا ہے جن میں سے ایک معنی مذہبی فراخ حوصلگی یا بے تعصبی اور ناطرفداری کے ہیں۔

یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ملکی یا عربی کیتھولک ہے۔ بہرحال انہوں نے لٹریچر کا مردِ میدان ہونے کا حق بخوبی ثابت کر دیا ہے ...... اور اُن کے مضامین کو وہ لوگ توجہ سے پڑھیں گے جن کو اس سبجکٹ میں دلچسپی حاصل ہو چکی ہے اور جو اس میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی تلاش میں ہیں۔"

جان ڈیون پورٹ کی کتاب کا چھپوانا

لندن ہی میں سرسید نے جان ڈیون پورٹ کی کتاب "اپالوجی فور محمد اینڈ قرآن" کو جو انہوں نے عیسائیوں کے برخلاف اسلام کی حمایت میں لکھی تھی، خود اپنے روپے سے چھپوایا۔ سرسید کے خطوں سے جو سید مہدی علی خاں کے نام ہیں معلوم ہوتا ہے کہ لندن کا کوئی پبلشر اس کتاب کے چھاپنے کی حامی نہیں بھرتا تھا اور خود مصنّف کو اس قدر استطاعت نہ تھی کہ اپنے روپے سے اس کو چھپوا کر شائع کر دے۔ سرسید نے وہاں پہنچ کر جب اِس کتاب کے مضامین سُنے تو انہوں نے فوراً اپنے پاس سے روپے کی تدبیر کر کے وہ کتاب جھٹ پٹ چھپوا دی اور اُس کی کئی سو جلدیں ہندوستان بھجوا دیں۔ یہاں اس کا ایک اردو ترجمہ مولوی عنایت الرحمٰن خاں صاحب دہلوی نے اور دوسرا مولوی ابو الحسن نے کیا اور دونوں ترجمے چھپ کر شائع ہو گئے۔

گاڈفری ہگنز کی کتاب کا ترجمہ کرنا

انگلستان کے ایک ذی وقعت مصنّف گاڈفری ہگنز کی کتاب جو کسی زمانے میں مصنّفِ مذکور نے اسلام کی تائید میں لکھی تھی اور اب نایاب ہو گئی تھی، ایک جرمن کتاب فروش کی مشہور دکان سے جہاں ہر زبان کی پُرانی اور نایاب کتابیں بکتی ہیں، سرسید نے دس گنی قیمت پر لندن میں خریدی۔ اصل مطلب اس کے خریدنے سے یہ تھا کہ خطباتِ احمدیہ کی تصنیف میں اُس سے مدد لی جائے مگر انہوں نے ہندوستان میں آکر اُن لوگوں کے لئے جن کو مشنریوں سے مذہبی گفتگو کرنے کا اتفاق ہوتا ہے، پانسو روپیہ خرچ کر کے اُس کا اردو ترجمہ[1] بھی جو حمایت الاسلام کے نام سے مشہور ہے شائع کر دیا۔

رسالۂ ابطالِ غلامی

اگرچہ یہ مضمون بقدرِ ضرورت خطباتِ احمدیہ میں لکھا جا چکا تھا مگر ولایت سے آنے کے بعد سرسید نے اِس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھ کر اوّل تہذیب الاخلاق

---

[1] یہ ترجمہ مشہور عالم مولوی محمد احسن مرحوم پروفیسر بریلی کالج نے کیا تھا ۱۲

کے متعدد پرچوں میں شائع کیا اور پھر اس کو علیحدہ کتاب کی شکل میں چھپوایا۔ ہمارے علما جنھوں نے اُن اعتراضوں اور طعنوں سے کان بند کر رکھے ہیں جو یورپ کی قوم اسلام اور اہلِ اسلام پر کرتی ہیں اُن کو تو آج تک یہ بھی احساس نہیں کہ یہ بردہ فروشی کا دستور جو عرب اور افریقہ میں جاری ہے اُس میں کیا برائی ہے اور وہ اصُولِ اسلام کے موافق صحیح ہے یا نہیں؟ اُن کے نزدیک حمیّتِ اسلامی اسی کا نام ہے کہ جو شخص اسلام پر اعتراض کرے، اگر قدرت ہو تو اُس کا منہ بند کر دیں ورنہ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر جو لوگ اس قسم کے مطاعن کتابوں اور اخباروں میں دن رات دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور جن کو معلوم ہے کہ یہ مطاعن مسلمانوں کی نئی پود پر جو دنیا کے حالات سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتی جاتی ہے، کیا اثر کرتے ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر معترضین کی غلط فہمیوں کو اس وقت رفع نہ کیا جائے تو ہماری نسلیں، جو ہمارے بعد اسلام کی وارث ہونے والی ہیں، وہ اسلام کو کس نگاہ سے دیکھیں گی اور تمام عیسائی قوموں میں اور خاص کر انگریزوں کی قوم میں جو ہندوستان کے مسلمانوں پر حکمران ہے، مذہبِ اسلام کس نظر سے دیکھا جائے گا۔

انہیں مطاعن میں سے ایک طعن جوازِ استرقاق یعنی لونڈی غلام بنانے کا ہے جو عیسائی قومیں مذہبِ اسلام پر اس لئے کرتی ہیں کہ نصف صدی سے مسلمانوں کے سوا اور کسی قوم میں یہ دستور باقی نہیں رہا۔ اگرچہ اٹھارھویں صدی تک جو غلاموں کی حالت زار یورپ اور امریکا میں تھی اُس بے رحمی اور سنگ دلی کی سنین اسلام میں کہیں نظیر نہیں پائی جاتی چنانچہ فرانس کے مشہور محقق ڈاکٹر لی بان نے جیسا کہ احمد شفیق بک نے اپنے رسالے میں نقل کیا ہے اپنی کتاب تمدنِ عرب میں اُن بے رحمیوں کا بیان کرنے کے بعد جو عیسائی قومیں غلاموں پر کرتی تھیں، صاف اقرار کیا ہے کہ "حق بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی غلامی بالکل اس غلامی کے برعکس ہے جو عیسائیوں میں جاری تھی" لیکن اسی بے رحمی کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ نیک دل لوگوں کو غلاموں کی حالت پر رحم آیا اور وہ اُن کی حمایت کے لئے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ غلامی کا نام و نشان تک یورپ اور امریکا سے مٹا دیا گیا۔

پس اس سے زیادہ اور کیا افسوس کی بات ہو سکتی ہے کہ جو قومیں غلاموں پر ایسی ظالم تھیں اور جن کے مذہب میں کوئی خاص رعایت غلاموں کے ساتھ نہیں کی گئی، وہ تو تمام دنیا میں غلامی اور بردہ فروشی کا انسداد کرتی پھرتی ہیں اور مسلمان جن کے مذہب نے تمام دنیا کے مذاہب سے بڑھ کر غلاموں کی حمایت کی اور اگر سچ پوچھئے تو گویا غلامی کو بالکل معدوم کر دیا، وہی تمام دنیا میں بردہ فروشی کے ناجائز و ناشائستہ رواج

میں سب سے زیادہ بدنام ہیں اور اُنہیں کے مذہب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ نوعِ انسان کا دشمن اور ظلم و بے رحمی کا سرچشمہ ہے۔

سر سید اپنے ایک آرٹکل میں جو رسالۂ ابطالِ غلامی کے علاوہ اُنہوں نے اسی مضمون پر لکھا ہے، لکھتے ہیں: "ولیم ہوورد رسل صاحب جو نہایت نامی گرامی ادیب ہیں اپنے روزنامچہ میں اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "اُس نے اس نیکی کے حاصل کرنے اور رسمِ بد کے موقوف کرنے میں بڑی کوشش کی ہے اور کسی قدر کامیاب بھی ہوا ہے"۔ اس کے بعد سر سید کہتے ہیں کہ "اگرچہ مسٹر رسل کی کتاب پڑھ کر ہمارا دل خوش ہوا مگر جس لفظ نے ہمارے دل کو رنجیدہ کیا اس کا بیان کرنا بھی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں اُنہوں نے اسمٰعیل پاشا کے اِس نیک کام کی تعریف کی ہے، وہاں یہ بھی لکھا کہ اُس نے برخلاف اپنے مذہب و ایمان کے یہ نیک کام کیا ہے۔ اِس تحریر پر ہم کچھ مسٹر رسل سے ناراض نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے ٹھیک لکھا ہے، مگر اُن کافر مسلمانوں سے ناراض ہوئے جنھوں نے اپنے افعالِ ناشائستہ کو ایسے طور پر رواج دیا ہے جس کے سبب غیر قومیں اِن افعال کو مذہبی اور ایمانی افعال سمجھتی ہیں اور مذہبِ اسلام کو حقارت سے دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ تہذیب اور شائستگی اور انسانیت مذہبِ اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی"۔

اگرچہ مسلمان سلطنتوں میں سلطان عبد المجید خاں اور اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کے وقت سے بردہ فروشی کا انسداد محض بطورِ مصلحتِ ملکی کے ہونے لگا مگر ۱۸۸۸ء تک وہاں بھی کسی مسلمان عالم کو یہ خیال نہیں آیا کہ عیسائی جو بردہ فروشی کے نالائق طریقے کو دینِ اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں، اُن کی غلط فہمی کو رفع کیا جائے۔ حالانکہ ٹرکی، مصر اور افریقہ کے دیگر ممالکِ اسلامیہ کے علما کا سب سے مقدم فرض تھا کہ وہ اسلام پر سے اس الزام کو رفع کرتے، کیونکہ دنیا میں کوئی مرکز بردہ فروشی کا اب وسط افریقہ کے سوا باقی نہیں رہا جہاں ایک مدت سے سلاطین یورپ انسدادِ بردہ فروشی کی تدبیروں میں مصروف ہیں اور عیسائی مشنری تمام یورپ اور افریقہ میں منادی کرتے پھرتے ہیں کہ مظلوم حبشیوں کو اسلام کے پنجۂ ظلم سے نکالو۔

بارے ۱۸۸۸ء میں یعنی سر سید کی تصنیف سے اُنیس برس بعد، مصر کے ایک روشن ضمیر فاضل احمد شفیق بک کو جس نے فرانس میں تعلیم پائی ہے، یہ خیال اُس وقت پیدا ہوا جب کہ کارڈنل لاویجری پیرس کے ایک چرچ میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ بردہ فروشی کے مظالم پر لکچر دے رہا تھا اور اُس کا الزام صرف مسلمانوں ہی کے اعمال و افعال پر نہیں بلکہ مذہبِ اسلام پر لگاتا تھا کہ وہ علانیہ اِس رسمِ بد کی تعلیم دیتا ہے۔

اس کے بعد احمد شفیق بک نے دیکھا کہ وہ لکچر یورپ میں عام طور پر شائع ہو گیا، اس لئے انھوں نے ایک رسالہ فرانسیسی زبان میں لکھا جس کا ترجمہ احمد ذکی آفندی نے عربی میں کیا ہے۔

اس رسالے کی جس قدر شہرت اور وقعت یورپ کی عیسائی قوموں میں اور مصر و ٹرکی کے مسلمانوں میں ہوئی ہے اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون جس کو اب سے اُنتیس برس پہلے سر سید لکھ چکے تھے اور جس کا صلہ اُن کو یہ ملا تھا کہ بجائے عیسائیوں کے خود مسلمانوں نے اُس کے رد لکھے، کس قدر ضروری تھا۔ مصر کے اسلامی اخبار المؤید مورخہ ۲ ستمبر ۱۸۹۱ء میں اس کی نسبت لکھا گیا تھا کہ " اسلام کی حمایت میں اس سے عمدہ اور افضل کوئی تصنیف نہیں ہوئی چنانچہ کبراء فضلائے اہل اسلام نے جو ایسے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں، احمد ذکی آفندی سے نہایت التجا کے ساتھ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے عربی میں کرایا۔" اس کے سوا فرانس کے مشہور عالم موسیو میسر نے اس رسالے کو دیکھ کر مصنف کو لکھا "کہ تم نے اپنے حریف (یعنی کارڈنل لاویجری) کو لاجواب کر دیا اور بے شک حق تمہاری جانب ہے۔" اس طرح فرانس کے اور بڑے بڑے مشاہیر نے رسالۂ مذکور کی نہایت تعریف اور اس کے لکھنے پر مبارکباد لکھی خصوصاً موسیو لوکار انسپکٹر کمپنی نہر سویز نے لکھا کہ "میں نہایت قدر کرتا ہوں تمہارے اس کام کی جو تم نے اپنے مذہب اور اپنے ملک کی حمایت کے لئے کیا ہے اور کیا اچھا ہو اگر فرانس کا ہر فرد اسی طرح اپنے مذہب اور اپنے ملک کے لئے کھڑا ہو۔" رستم پاشا سفیر سلطانی جو اس وقت لندن میں تھے انھوں نے رسالۂ مذکور کی رسید میں نہایت شکریہ کے بعد مصنف کو لکھا۔ "اس رسالے سے نہایت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے اور میں ان نسخوں کو نہایت خوشی سے انگریزوں میں اور اُن اخباروں میں جو انگریزوں کی نظر سے گذرتے ہیں، تقسیم کر دوں گا۔" احمد ذکی آفندی مترجم رسالۂ مذکور لکھتے ہیں کہ "بہت دن گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ مضمون تمام یورپ میں مشہور ہو گیا۔ یورپ کے بڑے بڑے اخباروں میں اُس پر عمدہ عمدہ ریویو لکھے گئے اور بعض اخباروں میں یہ رسالہ بجنسہٖ اوّل سے آخر تک چھاپ دیا گیا۔"

الغرض اسلام کی اس ضروری اور مہتم بالشان خدمت کی نسبت غالباً تمام اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سید احمد خاں کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ غلامی کے باب میں جو فضیلت اور فوقیت مذہب اسلام کو تمام دُنیا کے مذاہب پر ہے اور جو نیکی اور سلوک و احسان اُس نے لونڈی غلاموں کے ساتھ کیا ہے اُس کو صاف صاف دُنیا پر روشن کریں۔ انھوں نے اوّل ۱۸۷۰ء میں جہاں سر ولیم میور

کے اور مطاعن و اعتراضات کے جواب خطباتِ احمدیہ میں دیئے ہیں، انہیں کے ذیل میں غلامی پر بھی بہت شافی بحث کی ہے جس کے بعد عیسائیوں کے مقابلے میں کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہ تھی مگر چونکہ اس میں ایک دعوے فقہائے اسلام کے خلاف تھا اور جب تک اصولِ شرع کے موافق اُس پر استدلال نہ کیا جائے وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہ تھا اس لئے انھوں نے ۱۸۷۲ء میں ایک مستقل اور مبسوط رسالہ اسلام کی غلامی پر لکھ کر تہذیب الاخلاق میں چھپوایا۔[1]

اس رسالے میں اوّل بطور تمہید کے دلائلِ عقلیہ غلامی کی برائی پر نہایت عمدگی اور صفائی سے بیان کئے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ اگر غلامی خدا کی مرضی کے موافق ہو تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا بندوں کو اپنا شریک گردانا پسند کرتا ہے، کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ "کُلُّکُمْ عَبِیْدُ اللّٰہِ وَکُلُّ نِسَائِکُمْ اِمَاءُ اللّٰہِ"[2] اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر غلام اچھی طرح رحم اور محبت کے ساتھ رکھے جائیں تو کوئی برائی نہیں، اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ غلامی فی نفسہٖ ایک قدرتی گناہ ہے اور اُن کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہے اور کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے +

اس کے بعد لکھا ہے کہ "یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اُس کی نسبت کچھ نہیں کہا مگر رسول اللہ صلعم نے جو کچھ اُس کی نسبت کہا اُس کو کسی نے نہیں سمجھا" پھر جس جس طریقے سے زمانۂ جاہلیت میں غلام بنائے جاتے تھے اُس کی تفصیل لکھی ہے . . . . اور دکھایا ہے کہ غلامی کی رسم کو جو اُس وقت عرب میں تمام دنیا کی قوموں کی طرح جاری تھی اُس کا دفعتہً موقوف کر دینا صرف مصالحِ ملکی کے برخلاف ہی نہ تھا بلکہ ایسا کرنا انواع و اقسام کے گناہوں کا مورث ہوتا۔ چنانچہ اب بارہ سو برس بعد بھی یورپ کے بڑے بڑے مدبر جنھوں نے غلامی کے معدوم کرنے میں بے انتہا کوششیں کیں وہ بھی اس سے زیادہ

---

[1] چونکہ سرسید نے غلامی پر کوئی علیحدہ مضمون لکھ کر انگریزی میں شائع نہیں کیا تھا بلکہ خطبات کے ضمن میں اس کا ذکر کیا تھا اور خطبات کی بہت کم جلدیں انگریزی میں شائع ہوئی تھیں اس لئے اس کی شہرت یورپ میں نہیں ہوئی جیسی احمد شفیق بک کے رسالے کی ہوئی۔

[2] یعنی تم سب خدا کے غلام ہو اور تمہاری سب عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں۔

کچھ نہ کر سکے کہ آیندہ کی غلامی کو بند کیا اور موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جانے کی تدبیریں کیں مگر اُن کی تدبیروں میں اور بانیِ اسلام کی تدبیروں میں یہ فرق تھا کہ اُن کی تدبیریں زیادہ تر روحانی چیزوں سے علاقہ رکھتی تھیں۔ پس اسلام نے جس طرح شراب خوری کو تدریج موقوف کیا تھا، اسی طرح غلامی کے رفتہ رفتہ مسدود کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اوّل طرح طرح سے غلاموں کے آزاد کرنے کی مسلمانوں کو ترغیب دی یہاں تک کہ بردہ آزاد کرنے کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا۔ بعض گناہوں کے کفارے میں بردہ آزاد کرنے کا حکم دیا، اور بتایا کہ جو غلام اپنی قیمت اپنی کمائی سے ادا کرنی چاہیں اُن سے یہ اقرار نامہ لے کر چھوڑ دو۔ جن سے اُن کے مالک اس طرح آزاد کرنے کا وعدہ کریں، اُن کی خیرات یا چندہ سے مدد کرو۔ بیت المال میں سے مکاتب غلاموں کی آزادی کے لئے روپیہ دینا تجویز کیا۔ بعض صورتیں ایسی بتائیں کہ لونڈی غلام بغیر آزاد کرنے مالک کے خود بخود آزاد ہو جائیں۔ اسی طرح اور طرح طرح کی سبیلیں اُن کے آزاد کرنے کی نکالیں۔ مالک کو اُن کے ساتھ رعایتیں کرنے کی نہایت تاکید کی کہ اُن سے زیادہ خدمت نہ لیں۔ انھیں لونڈی غلام کہہ کر نہ پکاریں، اُن کو مثل اپنے کھانا اور کپڑا دیں، اُن کو ان کے رشتہ داروں سے جدا نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔

یہاں تک سرسیّد کا بیان جمہور علمائے اسلام کے مطابق ہے۔ مگر اس کے بعد انھوں نے دو دعوے نہایت شد و مد کے ساتھ کئے ہیں جن میں بظاہر وہ منفرد معلوم ہوتے ہیں پہلا دعویٰ اُن کا یہ ہے کہ لڑائی کے قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآنِ مجید کی کسی آیت میں یا کسی حدیثِ صحیح میں نہیں ہے۔ اس کے بعد جن آیتوں یا حدیثوں سے علما نے استرقاق کا حکم استنباط کیا ہے اُن کو نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ ان سے استرقاق کا حکم مستنبط نہیں ہوتا اور جو الفاظ قرآنِ مجید یا احادیثِ صحیحہ میں ایسے آئے ہیں جن سے آنحضرت صلعم کے زمانے میں لونڈی غلاموں کا ہونا معلوم ہوتا ہے جیسے ماملکت ایمانکم رقبۃ عبد امۃ فتیات وغیرہ اُن کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ بیشک جب تک آیہ منّا وفداءً[1] نازل نہیں ہوئی اُس وقت تک عرب کی قدیم رسم کے مطابق مختلف طریقوں سے (جن کی تفصیل انھوں نے لکھی ہے) برابر لونڈی غلام بنائے جاتے تھے،

---

[1] یعنی سورۂ محمد کی یہ آیت " فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء " ۱۲

اور نیز بعد اُنہ نے آیۂ مذکور کے گو آئندہ کے لئے استرقاق کی ممانعت ہوگئی مگر جن کے پاس لونڈی غلام پہلے سے موجود تھے اُن کو آزاد کرنے پر مجبور کیا گیا کیوں کہ آیۂ مذکورہ میں صرف آئندہ کے لئے یہ حکم تھا کہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔ پس قرآن و حدیث کے جن الفاظ سے رقیت کا وجود رسولِ خدا صلعم کے زمانے میں معلوم ہوتا ہے وہ انھیں لونڈی غلاموں سے متعلق ہیں جو آیۂ مذکورہ کے نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کے پاس موجود تھے۔

دوسرا دعویٰ اُن کا یہ ہے کہ سورۂ محمّد کی اُس آیت سے جس میں یہ حکم ہے کہ آیندہ لڑائی کے قیدیوں کو یا احسان رکھ کر چھوڑ دیا کرو یا فدیہ لے کر، اسلام نے رسمِ استرقاق کو جو مثل اور قوموں کے عرب میں بھی قدیم زمانے سے چلی آتی تھی، ہمیشہ کے لئے موقوف کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں لڑائی کے قیدیوں کو قتل کرنا، لونڈی غلام بنانا، فدیہ لے کر یا احساناً چھوڑ دینا، یہ چار دستور رائج تھیں اور اسلام میں بھی جب تک کوئی حکم قیدیوں کی نسبت نہیں آیا، ایسا ہی ہوتا رہا۔ لیکن جب سے یہ آیۂ منّ و فدا نازل ہوئی پھر آنحضرت نے کسی غزوہ میں قیدیوں کو لونڈی غلام نہیں بنایا۔ یعنی جاہلیت میں جو اسیرانِ جنگ کے ساتھ چار طرح کے برتاؤ کئے جاتے تھے اُن میں سے قتل و استرقاق کو بالکل موقوف کر دیا اور صرف منّ و فدا میں اختیار دے دیا کہ چاہو بغیر کسی معاوضے کے محض احساناً چھوڑ دو اور چاہو کچھ فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

اس دوسرے دعوے کے متعلق انھوں نے بہت سی موافق اور مخالف روایتیں کتبِ احادیث سے نقل کر کے اس بات کے ثابت کرنے میں کوشش کی ہے کہ آیۂ منّ و فدا کے بعد رسولِ خدا صلعم کے عہد میں پھر کسی کو لونڈی یا غلام نہیں بنایا گیا اور بعد آنحضرتؐ کے صحابہؓ تابعین و تبعِ تابعین کے زمانے میں جو کچھ ہوا اس کی نسبت ان کے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ جب قرآن مجید یا حدیثِ صحیح سے غلام بنانے کا کوئی صاف حکم نہیں نکلتا اور آیۂ منّ و فدا سے صاف پایا جاتا ہے کہ جاہلیت کی رسم کے موافق جو ابتدائے اسلام میں لونڈی غلام بنائے جاتے تھے اس کی صاف ممانعت ہوگئی اور اُس کے بعد آنحضرتؐ نے کسی قیدی کو لونڈی غلام نہیں بنایا، اب ہم کو کچھ ضرورت اس بات کے دریافت کرنے کی نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد صحابہ یا تابعین وغیرہ نے اس باب میں کیا کیا؟

اس بیان کی تائید انھوں نے اس طرح سے کی ہے کہ شراب کی حرمت نازل ہونے کے بعد کوئی نہیں سمجھا تھا کہ شراب حرام ہوگئی یہاں تک کہ تین دفعہ اُس کی حرمت نازل ہوئی۔ پھر باوجودیکہ بیعِ اُمّہاتِ اولاد کا ممنوع ہونا آنحضرتؐ کے زمانے میں تسلیم کیا جاتا ہے تاہم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تک بیع ہوتی رہی۔ اس کے سوا مُتعہ کی حرمت سے عمر فاروقؓ کی خلافت تک صحابہ ناواقف رہے۔ پس اسی طرح ناممکن ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں آیۂ منّ وفدا سے جو اصل مقصود تھا، اُس کو بھی صحابہ نہ سمجھے ہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ پہلے بھی قیدیوں کو احساناً یا فدیہ لے کر چھوڑنے کا دستور برابر جاری تھا۔ پس اس آیت کے اترنے کے بعد جو تمام قیدی کبھی نہ کسی طرح چھوڑ دیئے گئے اور قتل یا استرقاق واقع نہیں ہوا اُس کو سب نے ایک اتفاقی بات سمجھا ہو اور بعد آنحضرتؐ کے خلافتِ راشدہ میں اس مسئلے پر بحث کا موقع اس لئے نہ ملا ہو کہ پہلی خلافت مرتدین کے مطیع کرنے میں ختم ہوگئی۔ دوسری اور تیسری خلافت میں دارالخلافہ سے دُور دُور کے فاصلہ پر لڑائیاں ہوئیں اور چوتھی خلافت کا آپس کے جھگڑوں میں خاتمہ ہوگیا اور اس لئے چاروں خلافتوں میں اس مسئلے کے تصفیہ کرنے کی مہلت نہیں ملی۔

اگرچہ یہ اُمید نہیں ہے کہ علمائے اسلام اور خاص کر ہندوستان کے علما موجودہ حالت میں ایک ایسی رائے کے ساتھ اتفاق کریں گے جو اسلام کی غلامی کے متعلق انھوں نے برخلاف جمہورِ فقہا و علمائے اسلام کے قائم کی ہے۔ چنانچہ ایک مبسوط رسالہ جو ازاِ استرقاق پر سرسید کے برخلاف اُنھیں دنوں میں جب کہ پہلی بار ابطالِ غلامی کا رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا تھا، لکھا جا چکا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جس طرح سرسید کی رائے فقہا و مفسرین اور تعاملِ اہلِ اسلام کے برخلاف ہے، اسی طرح تعاملِ اہلِ اسلام اور فقہا و مفسرین کے اقوال ظاہر قرآن کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں بیشک نہ قرآن میں کوئی ایسی نص صریح موجود ہے جس میں لونڈی غلام بنانے کا حکم دیا گیا ہو اور نہ آیۂ منّ وفدا کے حصر کی کوئی ایسی معقول تاویل ہو سکتی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ لڑائی کے قیدیوں کے ساتھ سوائے منّ وفدا کے تیسرا سلوک کیا جا سکتا ہے اور نہ اُن لوگوں کے پاس جو نسخ کے قائل ہوئے ہیں کوئی ایسی صاف اور صریح نصِ قرآنی موجود ہے جس کو آیۂ مذکورہ کا ناسخ قرار دیا جائے اور اس بات کا تو انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ آیۂ مذکورہ نے اُس سلوک کو جو اسیرانِ جنگ

کے ساتھ کرنا چاہیئے صرف دو باتوں میں منحصر کر دیا ہے، یا احسان رکھ کر چھوڑنا یا کچھ چھڑائی لے کر چھوڑنا۔ ورنہ آیۂ مذکور کے منسوخ ماننے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔

اس تقدیر پر، اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو، مسئلۂ متنازع فیہ کی صورت بعینہٖ ایسی ہو گئی جیسے عبداللہ ابن عباس سے مسحِ رِجلین اور غسلِ رجلین کے باب میں منقول ہے کہ "لا اجد فی کتاب اللہ الا المسح ولکنھم ابوا الا الغسل" (یعنی میں قرآن میں تو مسح کے سوا کچھ نہیں پاتا لیکن صحابہؓ نے صرف غسل ہی کو اختیار کیا ہے)

اگرچہ عام طور پر تعاملِ اہلِ اسلام اور فقہا و مفسّرین کے اقوال سرسیّد کی رائے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں مگر بعض تاریخی شہادتیں ایسی ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اُمیّہ کے زمانے میں آیۂ منّ وفدا سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ منّ و فدا کے سوا اور کوئی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ایک دفعہ، جیسا کہ کتاب عقد الفرید میں مذکور ہے، حجّاج کے روبرو کچھ اسیر لائے گئے۔ حجّاج نے اُن کے قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔ ایک قیدی نے جب کہ اُس کو قتل کرنے لگے۔ حجّاج کو بددعا دی اور کہا خدا تعالیٰ تو اپنی کتاب میں یہ کہتا ہے کہ "فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء" اور تمہارا شاعر اپنی قوم کے مکارمِ اخلاق اس طرح بیان کرتا ہے۔

"وما نقتل الاسری ولکن نفکھم اذا اثقل الاعناق حمل المقلد"

(یعنی ہم قیدیوں کو قتل نہیں کرتے بلکہ اُن کو جب کہ اُن کی گردنیں طوقوں کے بوجھ میں دبی جاتی ہیں چھوڑ دیتے ہیں) یہ سُن کر حجّاج نے (گویا مقتول قیدیوں کی طرف مخاطب ہو کر) کہا "تمہارا بُرا ہو کیا تم نہ کہہ سکتے تھے جو بات اس منافق نے مجھ کو جتائی" اور یہ کہہ کر باقی قیدیوں کو چھوڑ دیا۔

حجّاج ہی کا ایک اور قصّہ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں درج ہے یعنی حجّاج کے سامنے ایک اسیر لایا گیا۔ حجّاج نے عبداللہ ابن عمر سے، جو اُس وقت وہاں موجود تھے کہا کہ اُٹھو اور اس کو قتل کر ڈالو۔ ابن عمر نے فرمایا۔ "ہم کو یہ حکم نہیں ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے" اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً "۔

اگرچہ احمد شفیق بیگ نے آیۂ منّ و فدا پر زیادہ زور نہیں دیا مگر نتیجے کے لحاظ سے اُن کے اور سرسیّد کے استدلال میں چنداں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ احمد شفیق کی تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ چوں کہ

سب پُشت ہاپُشت سے لونڈی غلام بنانے کے عادی تھے اور یہ عادت اُن کی طبیعتِ ثانی ہوگئی اور اسلام کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان مقصد توحید کا پھیلانا اور شرک وجہالت کا استیصال کرنا تھا۔ اس لئے غلامی کا دفعتہً موقوف کر دینا ضرور اسلام کے اعلیٰ اور اشرف مقاصد میں خلل انداز ہوتا۔ لیکن جو نصیحتیں بانیٔ اسلام نے غلاموں کے حق میں مُسلمانوں کو فرمایئں اور جو بے شمار حقوق اُن کو عنایت کئے اور جس طرح اُن میں اور اُن کے مالکوں میں ہر طرح سے مساوات کا درجہ قائم کیا اُس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے غلامی کی سوتیں بالکل بند کر دیں۔ اس کے سوا اسلام صرف اُن غیر مسلمین کے استرقاق کی اجازت دیتا ہے جو شرعی جہاد میں اسیر ہوں اور اس پر بھی اُن کو ہمیشہ کے لئے مملوک رہنے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ جس طرح بادشاہِ اسلام اُن کو احساناً چھوڑ سکتا ہے اسی طرح وہ خود فدیہ دے کر چھوٹ سکتے ہیں۔ پس جو حبشی وسط افریقہ سے ناجائز طور پر پکڑے جاتے ہیں، وہ عام اس سے کہ مُسلم ہوں یا غیر مسلم اصولِ اسلام کے موافق لونڈی غلام نہیں ٹھہر سکتے +

اس بیان میں اور سر سیّد کے بیان میں جیسا کہ ظاہر ہے اس سے زیادہ کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا کہ سر سیّد کے نزدیک جس طرح چوری سے پکڑے ہوئے یا چھینے ہوئے حبشی لونڈی غلام نہیں بن سکتے۔ اسی طرح اسیرانِ جنگ بھی لونڈی غلام نہیں بنائے جا سکتے بلکہ اُن کے قید ہونے کے بعد مسلمانوں کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اُن کو احساناً چھوڑ دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں اور احمد شفیق بک کے نزدیک وہ قیدی ہونے کے بعد لونڈی غلام تو بن جاتے ہیں مگر اس کے بعد اگر مسلمان اُنکو احساناً نہ چھوڑیں تو وہ فدیہ دے کر چھوٹ سکتے ہیں۔ اس تقدیر پر ظاہراً ثمرۂ اختلاف صرف یہ نکلے گا کہ احمد شفیق بک کے نزدیک اگر مسلمان اُن کو احساناً نہ چھوڑیں تو جب تک وہ فدیہ ادا نہ کریں گے، بدستور لونڈی غلام رہیں گے اور سر سیّد کے نزدیک اگر وہ فدیہ ادا نہ کر سکیں، تو مسلمانوں کو چار و ناچار انہیں چھوڑنا پڑے گا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک درحقیقت رقیّت طاری نہیں ہوتی۔

بہر حال سب سے پہلے سر سیّد نے اور اُن کے بعد مصر کے اس روشن ضمیر فاضل نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ جو سلوک اور احسان لونڈی غلاموں پر اسلام نے کیا ہے وہ کسی مذہب سے بن نہیں آیا اور گو نصف صدی سے بلحاظ حُسنِ معاشرت کے عیسائیوں نے اور خاص کر انگلش قوم نے اس باب میں تمام دُنیا کی قوموں پر فضیلت حاصل کی ہے مگر مذہب کی رُو سے وہ غلاموں کے حق میں اس سے زیادہ کوئی شہادت پیش نہیں کر سکتے کہ انجیل تمام بنی آدم کو ایک دوسرے کا بھائی ٹھیراتی ہے اور سب کو ایک دوسرے سے محبّت کرنے کی تاکید کرتی ہے۔ تمام عہدِ جدید میں کوئی صریح نص

غلامی کے برخلاف نہیں پائی جاتی، بلکہ سینٹ پال کے تمام خطوں میں، جو دین عیسوی کی اشاعت کی غرض سے اطراف وجوانب میں بھیجے گئے، کوئی حکم غلاموں کی نسبت اس کے سوا نہیں پایا جاتا کہ وہ اپنے آقاؤں کے آگے سر جھکائیں، اُن کی اطاعت کریں، اُن سے ڈریں، اُن کی ایسی فرماں برداری کریں جیسی عیسےٰ مسیح کی کرتے ہیں۔ اُن کو ہر تعظیم و تکریم کے لائق سمجھیں اور اگر اُن کے آقا عیسائی ہوں تو اُن کی خدمت گذاری میں اور بھی زیادہ مبالغہ کریں۔ برخلاف اس کے بانیٔ اسلام نے کہیں غلاموں کو اپنے مالکوں کی اطاعت یا تعظیم و تکریم کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ جہاں نصیحت کی ہے وہاں مالکوں کو غلاموں کے ساتھ مہربانی اور شفقت اور ہر ایک بات میں اپنے برابر سمجھنے کی کی ہے اور طرح طرح سے اُن کے آزاد کرنے کی ترغیبیں دی ہیں اور مالک و مملوک میں ایک محض اعتباری فرق کے سوا کوئی فرق نہیں رکھا اور اگر قرآن کے موافق دیکھا جائے تو غلامی کو ہمیشہ کے لئے بالکل موقوف کر دیا ہے۔

تفسیر القرآن سرسید نے قرآنِ مجید کی تفسیر جن اصول پر اور جس ضرورت اور غرض سے لکھی ہے اس کا مختصر ذکر پہلے حصے میں آچکا ہے، یہاں ہم اُس کی وہ خصوصیتیں بیان کرنی چاہتے ہیں جو اُس میں اور دیگر تفاسیر میں مابہ الامتیاز ہیں اور جن سے سرسید کی نیّت کا اور اُس ضرورت کا جس نے اس تفسیر کے لکھنے پر اُن کو مجبور کیا، کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمارے قدیم مفسّروں نے بلاشبہ اُن تمام ضرورتوں کو جو اُن کے زمانے میں وقتاً فوقتاً پیش آتی گئیں بخوبی پورا کیا اور اپنی آسمانی کتاب کی خدمت کا حق بحسبِ ضرورت ادا کرتے رہے۔ سب سے پہلے اُن کو اس بنا پر کہ تفسیر بالرّائے کی نسبت حدیث میں وعید وارد ہوئی تھی، اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جس قدر اخبار و آثار تفسیر القرآن کے متعلق کتبِ احادیث میں روایت کئے گئے ہیں اُن سب کو تفسیروں میں اپنے اپنے موقع پر بیان کیا جائے تاکہ کوئی ضروری بات جو قرآن کی تفسیر کے متعلق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ امت تک پہنچنے سے نہ رہ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ قدما کی اس کوشش سے جو محض نیک نیتی سے کی گئی تھی بےشمار روایتیں تفاسیرِ قدیمہ میں ایسی درج ہو گئیں، جن کے لحاظ سے علمائے محققین کو یہ کہنا پڑا کہ "کتب التفسیر مشحونۃ بالاحادیث الموضوعۃ" اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ ہے کہ پچھلوں نے قدما کی تفسیروں میں جو رطب و یابس روایتیں پائیں، بغیر اس کے کہ اصولِ علمِ حدیث کے مطابق اُن کی تنقید کریں اُن تمام رطب و یابس روایتوں سے اپنی تفسیروں کو بھر دیا اور

مخالفوں کے لیئے اعتراض کا دروازہ کھول دیا۔

پھر جب اسلام دور دراز ملکوں میں اور غیر قوموں میں، جن کی مادری زبان عربی نہ تھی اور جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل اہل زبان کے اندازہ نہیں کر سکتے تھے، پھیلنے لگا تو اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر بموجب قواعد صرف و نحو و معانی و بیان کے بحث کی جائے اور وجوہ اعجاز قرآن نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں۔ اس ضرورت کو بھی ہمارے علما نے اُس زمانے کی حالت کے موافق نہایت خوبی اور لیاقت کے ساتھ پورا کیا۔

جب یونانی فلسفہ اور منطق اہل اسلام میں شائع ہوئی اور مسلمانوں میں نئے نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور ہر فرقہ آیات قرآنی کی تفسیر اپنے اپنے عقائد اور اصول کے موافق منطق اور فلسفے کی رو سے کرنے لگا تو علمائے متکلمین نے اسلام کی حمایت اس بات میں منحصر سمجھی کہ تفسیر قرآن میں فلسفہ اور حکمت کو دخل دیا جائے اور تفسیروں میں مذہب حق کی تائید دلائل عقلیہ سے کی جائے۔ بعض مفسروں نے اپنی تفسیروں کی بنیاد جزئیات فقہیہ کے استنباط اور اخلاقی مسائل میں اپنے اپنے مذہب کی نصرت اور حمایت پر رکھی۔ غرض کہ جو ضرورت ہمارے قدیم مفسّروں کو پیش آئی اُس کو بہ احسن وجوہ پورا کیا گیا۔ لیکن جو ضرورتیں اس وقت نہ صرف ہندوستان کے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو اُن کے مذہب کے متعلق درپیش ہیں، ویسی ضرورتیں اگلے زمانے میں کبھی پیش نہیں آئیں اور اس لئے ہمارے علما کو تفسیروں میں اُن کے پورا کرنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ صدی میں کرۂ زمین کا کوئی پہلو اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں عیسائی قوموں کی حکومت یا اُن کا رعب و داب قائم نہ ہو اور اگر دنیا عالم اسباب ہے تو ضرور اُن کا رعب و داب روز بروز بڑھتا جائے گا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں کسی عیسائی قوم کا رعب و داب قائم ہوا اور فوراً اُن کا مشن اور اُن کی تجارت سائے کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچی۔ اگرچہ عیسائی حکومتوں میں عموماً اور انگریزی حکومت میں خصوصاً جس قدر رعایا کو مذہبی آزادی حاصل ہے شاید دنیا کی کسی حکومت میں کبھی اس سے زیادہ آزادی حاصل نہیں ہوئی ہوگی۔ لیکن رعیت کو کیسی ہی مذہبی آزادی دی جائے سلطنت کی مقناطیسی کشش اپنا کرشمہ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ حکمران قوم کی رسوم و عادات و اوضاع و اطوار و اخلاق یہاں تک کہ اُن کے دین و مذہب کی طرف محکوم قوم

کا دل خود بخود کھنچتا ہے اور جب کہ سلطنت کے ساتھ دعوتِ دین بھی شامل ہو اور کروڑوں روپیہ حکمران قوم کے مذہب کی اشاعت میں صرف کیا جاتا ہو اور سلطنت بھی ایک ایسی قوم کی ہو جو عقل و دانش اور شائستگی و تمدّن میں دنیا بھر کی قوموں میں ممتاز ہو اور طرح طرح کی ترغیبیں تبدیلِ مذہب کی موجود ہوں، تو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کشش کس حد تک پہنچ جائے گی۔ اگرچہ ہندوستان میں ابھی تک مشنریوں کا منتر مسلمانوں پر ویسا کارگر نہیں ہوا جیسا کہ اور قوموں پر ہوا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مسلمان ہمیشہ اسی طرح مشن کی زد سے بچے رہیں گے۔ مسلمانوں کے پولٹکل زوال کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور اس لئے اسلام کی حقیقت کا سکّہ ابھی اُن کے دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ آباؤ اجداد کی مذہبی عظمت اُن کو فراموش نہیں ہوئی، آزادی نے ابھی اُن کو بالکل مطلق العنان نہیں کیا، قومی سوسائٹی کا دباؤ ابھی اُن کی طبیعتوں پر کم و بیش باقی ہے، تبدیلِ مذہب سے جو ذلّت قوم اور خاندان کی نظر میں ہوتی ہے ابھی تک وہ اُس کو گوارا نہیں کر سکتے، لیکن جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا اُسی قدر رکاوٹیں کم ہوتی جائیں گی اور نہایت اندیشہ ہے کہ مبادا آخر کار مسلمان بھی اپنے اسلاف کے مذہب سے ویسے ہی بے تعلق ہو جائیں جیسے ہندوستان کی اور قومیں جو ہزار برس سے غیر قوموں کی محکوم چلی آتی ہیں اور مذہب کو بزرگوں کی ریت اور رسم سے زیادہ کوئی چیز نہیں سمجھتیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ اور مذہبوں کی طرح اسلام کی سرحد میں بھی مشن اپنا قدم بڑھاتا جاتا ہے ما بقیں دنوں میں پنجاب کے ایک دیسی مشنری کی تحریر ہماری نظر سے گذری جس میں لکھا ہے کہ چالیس برس کے عرصے میں صرف امرت سر کے گرجا میں ۱۵۲ مسلمانوں نے بپتسمہ پایا ہے اور دہلی کے صرف باپٹسٹ مشن میں ۲۸ مسلمانوں نے اصطباغ لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اہلِ اسلام کو ایسی حالت بارہ سو برس تک کبھی پیش نہیں آئی۔ وہ جہاں گئے اور جہاں جا کر بسے اسلام کا رُعب و داب اُن کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ اس عرصے میں کبھی کسی غیر قوم کے جو اپنے دین کی اشاعت میں مثل عیسائیوں کے سرگرم ہو، محکوم ہو کر نہیں رہے اور اس لئے ہمارے قدیم علما کو وہ ضرورتیں جو آج کل اسلام کے خیر اندیشوں کو نظر آتی ہیں، کبھی محسوس نہیں ہوئیں۔

دوسری ضرورت، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، اسلام کو سائنس کے حملے سے بچانے کی ہے علومِ جدید کا رواج جیسا عیسائی ملکوں میں ہے ویسا ہی تمام دنیا میں روز افزوں ترقی کرتا جاتا ہے اور جو صدمہ کہ اُس

نے یورپ میں عیسائی مذہب کو پہنچایا ہے وہی صدمہ دُنیا کے تمام مذاہب کو اُس سے پہنچتا معلوم ہوتا ہے۔ شام و مصر و ٹرکی میں علومِ جدیدہ کی اشاعت کو غالباً پچاس برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، اس قلیل عرصے میں اُس سے جو نتائج ممالکِ مذکورہ میں باوجود اسلامی سلطنت ہونے کے پیدا ہوئے ہیں، اُن کو طرابلس کے ایک مشہورِ عالم شیخ حسین آفندی نے اپنی کتاب حمیدیہ[1] میں ایک موقع پر اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "جو مُسلمان نوجوان مدارس میں علومِ جدیدہ اور خاص کر فنِ طبیعات کی تعلیم پاتے ہیں وہ اسلام کی قید سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اُن کو اُس سے کچھ لگاؤ باقی نہیں رہتا۔ وہ اس بات کے معتقد نہیں رہتے کہ کوئی عالم کا پیدا کرنے والا موجود ہے بلکہ تمام کائنات اور آثارِ موجودات کو مادہ اور اس کے اجزا کی حرکت اور قوانینِ طبیعی کی طرف منسوب کرتے ہیں اور جب کہ اُن کا حال الوہیت کے اعتقاد میں، جو اصلِ اصولِ اسلام ہے، ایسا ہو تو پھر کون سا اعتقاد دینِ اسلام کی نسبت اُن میں باقی رہ سکتا ہے۔" اس کے بعد مُصنّفِ ممدوح اپنے ہم وطن مسلمانوں کو اُس آفت اور بلائے عظیم سے آگاہ کرتا ہے جو اُن کی اولاد میں پھیلتی جاتی ہے اور اُن کو ہوشیار کرتا ہے کہ پہلے اس سے کہ یہ مصیبت لاعلاج ہو جائے اُس کا تدارک کریں۔

ظاہر ہے کہ علومِ جدیدہ کی تعلیم جب کہ ممالکِ اسلامیہ میں یہ نتائج پیدا کر رہی ہے، تو ہندوستان میں اسلام کیوں کر اُس کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ مُسلمان اُن نتائج سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کی تعلیم سے دست بردار ہو جائیں، وہ پہلے ہی اپنی اُس غفلت اور فرو گذاشت پر کفِ افسوس مل رہے ہیں جو زمانۂ گذشتہ میں انگریزی تعلیم کی نسبت اُن سے ظہور میں آئی اور وہ کیوں کر اُس تعلیم سے دست بردار ہو سکتے ہیں جس سے ٹرکی اور شام اور مصر کے مُسلمانوں کو بھی کسی طرح مفر نہیں۔ اس کے سوا مُسلمانوں کا اولاد کو صرف اس اندیشے سے مغربی تعلیم نہ دلوانا کہ وہ دینِ اسلام سے بداعتقاد نہ ہو جائیں۔ گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ اسلام فلسفۂ جدیدہ کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا اور اسلام کا اعتقاد سائنس کے یقین کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔

جو خطرے ہم نے اوپر بیان کیے بے شک اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کو محسوس نہیں ہو سکتے جن کے

---

[1] یہ کتاب سنہ ۱۳۰۶ھ میں اُن شکوک و شبہات کے رفع کرنے کی غرض سے جو علومِ جدیدہ کی تعلیم سے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اصولِ اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں ملکِ شام میں لکھی گئی ہے جس کا نام مصنّف نے سلطان عبدالحمید خاں بالقابہ کے نامِ نامی پر "حمیدیہ" رکھا ہے ۱۲

دل ہر قسم کے وساوس و شبہات سے بالکل پاک ہیں یا جو بقائے دینِ اسلام کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتے کہ صرف اُن کے خاندان کا محدود حلقہ الحاد یا ارتداد کے صدمے سے محفوظ رہے گو کہ ساری دنیا ملحد و بد مذہب ہو جائے۔ لیکن جو لوگ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات سے واقف ہیں اور ہر مسلمان کے تبدیلِ مذہب سے اُن کو وہی صدمہ پہنچتا ہے جو اپنے کسی عزیز یا دوست کے ارتداد سے پہنچنا چاہیے، اُن کو یہ ضرور تیں روزِ روشن کی طرح نظر آ رہی ہیں اور اُن کو وہ زمانہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ کسی مذہب کا اعتقاد، جب تک کہ اُس کو زمانۂ حال کے شکوک و شبہات سے منزّہ اور مبّرا ثابت نہ کیا جائے گا محض آباؤ و اجداد کی تقلید سے قائم نہ رہے گا۔

۱۸۷۸ء میں ایک مرزا صاحب نے سرسیّد پر یہ اعتراض لکھ کر شائع کیا تھا کہ "سیّد صاحب دینوی ترقّی کی کوشش میں مذہبی بحث کو کیوں دخل دیتے ہیں۔" اس پر لاہور گورنمنٹ کالج کے ایک مسلمان طالب علم نے کچھ لکھ کر علی گڑھ گزٹ میں چھپوایا تھا جس میں لکھا تھا کہ سرکاری مدارس میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا، خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان، جس کا اعتقاد اپنے مسائل مذہبی پر ویسے ہی استحکام سے ہو جیسا کہ پیشتر تعلیم سے تھا۔ ممکن ہی نہیں کہ انگریزی پڑھ کر مشرقی قصّوں اور کہانیوں اور دیووں اور پریوں کی داستانوں کو جھوٹا نہ سمجھے اور جن کتابوں میں اُن کا ذکر ہو اور پھر اُن کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو اُن کو لغو اور بیہودہ نہ جانے۔ آج کل کے طالب علموں کے اگر دل چیر کر دیکھے جائیں تو معلوم ہو کہ اُن کے مذہبی مسائل اُن کے دل میں کیسے کھٹکتے ہیں اور کوئی مُلّا مولوی اُن کی تشفّی نہیں کر سکتا۔ بعض جو بہت آزاد طبع ہوتے ہیں اور اپنے کانشنس کو دبا نہیں سکتے اور بغیر کافی دلیل کے اُس کو زبردستی جھٹلا نہیں سکتے وہ عیسائی یا لامذہب ہو جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ سیّد صاحب نے اصلاحِ مذہبی سے اِس آفت کو روکا۔ اسی اصلاح نے پادریوں کی اُمید کو توڑا۔ اگر سیّد صاحب یہ اصلاح نہ کرتے تو نہ معلوم مدرسۃ العلوم ہی کے کتنے مسلمان طالب علم اصطباغ پا چکے ہوتے۔ ہماری رائے میں سیّد صاحب کے تمام کارہائے نمایاں میں جو نہایت قدر و منزلت کے لائق بات ہے اور آئندہ کی ترقی کی جڑ ہے، وہ وہی حصّہ ہے جس کو مرزا صاحب قابلِ تنفّر قرار دیتے ہیں۔ کاش اگر مرزا صاحب چندے کالجوں میں رہے ہوتے تو وہ سیّد صاحب کے اسی کام کو جس کو وہ اب قابلِ نفرین قرار دیتے ہیں، نہایت عمدہ بلکہ تمام کارہائے نمایاں کی جان قرار دیتے اور جو تحریریں اب باعثِ وحشت اور موجبِ ضلالت و گمراہی خیال کی گئی ہیں، ہم مرزا صاحب کے گلے میں

بطور حرزِ جان کے لٹکتی دیکھتے۔"

یہ اگرچہ ایک نوجوان طالب علم کی شہادت ہے جس کی شاید لوگوں کی نظر میں کچھ زیادہ وقعت نہ ہو، مگر اس قول کے موافق کہ "اهل البیت ادریٰ بما فی البیت" انگریزی خواں طلبہ کے نزدیک اس نوجوان طالب علم کی شہادت بڑے بڑے مشائخ کبار کی شہادت سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے اور اس کا ثبوت بارہا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے سامنے یہ واقعہ گذرا کہ عید الفطر سے پہلے ایک عالم نے وعظ میں یہ روایت بیان کی کہ "عید کے روز روئے زمین پر ہر شہر میں خدا تعالیٰ علی الصباح اپنے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور وہ زمین پر اتر کر ہر ایک بستی کے گلی کوچوں میں منادی کرتے ہیں جس کو تمام مخلوقات سوائے جن و انسان کے سنتی ہے اور بلند آواز سے کہتے ہیں کہ اے اُمتِ محمدیہ اُس خدا کی طرف چلو جو بڑا بخشش والا اور بڑے بڑے گناہ معاف کرنے والا ہے۔" اُس وقت اتفاق سے کچھ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی وہاں موجود تھے۔ جب وعظ ہوچکا، تو مسجد سے باہر نکل کر اُن میں سے اکثر طلبہ اس روایت پر ہنستے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ عجب تماشا ہے جن کو عیدگاہ میں بھیجنا منظور ہے وہ تو سُن نہیں سکتے اور تمام نباتات و جمادات سنتے ہیں پھر اگر ہم لوگ عیدگاہ میں نہ جائیں تو ہمارا کیا قصور ہے۔

اسی طرح کے صدہا واقعات ہر روز دیکھنے اور سُننے میں آتے ہیں اور زیادہ تر یہ خرابیاں ہمارے واعظوں کی سادہ لوحی اور ناعاقبت اندیشی سے پیدا ہوتی ہیں جو اس قسم کی ضعیف و موضوع روایتیں بیان کرکے لوگوں کو دین پر ہنسواتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ہر گروہ کے ساتھ اُس کی عقل اور سمجھ کے موافق گفتگو کرنی چاہیئے، سب کو اسی قدیم دستور کے موافق ایک لاٹھی سے ہانکتے چلے جاتے ہیں۔

سرسیّد نے انہیں خرابیوں کے تدارک کے لئے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی جس کی پہلی جلد ۱۲۹۷ھ میں چھپ کر شائع ہوئی اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اُس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ نصف قرآن سے کچھ ہی زیادہ کی تفسیر لکھنے پائے تھے کہ پیغامِ اجل آپہنچا اور چھ جلدیں چھپی ہوئی آخر سورۂ بنی اسرائیل تک اور ایک جلد بن چھپی سورۂ انبیاء تک اور چند چھوٹے چھوٹے رسالے مثل تفسیر السمٰوٰت، ابطالِ غلامی، ازالۃ الغین فی قصّۃ ذی القرنین، ترقیم فی قصۃ اصحاب الکہف والرقیم وغیرہ وغیرہ کے جن کو تفسیر کے اجزا سمجھنا چاہیئے، سرسیّد سے یادگار رہ گئے۔

سرسید نے اس تفسیر میں اُن مضامین سے بہت ہی کم تعرّض کیا ہے جن کو قدیم مفسّرین نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنی اپنی تفسیروں میں بیان کر چکے تھے۔ یا جن کے بیان کرنے کی اُس زمانے میں کچھ ضرورت نہ تھی، بلکہ انھوں نے زیادہ تر انھیں باتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جن کو وہ اس زمانہ میں اسلام کی حمایت کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور جن سے اگلی تفسیریں بالکل خالی نظر آتی تھیں۔

پہلی خصوصیّت مثلاً ہمارے مفسّروں نے اخبارِ ماضیہ کی تنقیح پر، جو کہ قرآنِ مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں، بہت ہی کم توجّہ کی تھی۔ اس کا سبب خواہ یہ سمجھو کہ اُن کو ایسی ضرورت پیش نہیں آئی اور خواہ یہ قرار دو کہ اُس زمانے میں اطلاع کے ذریعے محدود تھے۔ دونوں صورتوں میں یہ فرد گذاشت بلاشبہ تفسیرِ قرآن میں ایک بہت بڑی کمی کا باعث تھی۔ اگرچہ قرآنِ مجید میں اُممِ سابقہ کے قصّے ایسی تفصیل کے ساتھ جیسی کہ بائیبل میں درج ہے، بیان نہیں ہوئے بلکہ اکثر اُن قصّوں کی طرف ترہیب یا ترغیب کی غرض سے اجمالی اشارے کئے گئے ہیں لیکن جب کہ اکثر وہی قصّے کتبِ سابقہ میں مفصّل مذکور ہیں اور قرآنِ مجید میں اُن کتابوں کی جابجا تصدیق کی گئی ہے اس لئے ضرور تھا کہ ہمارے مفسّرین جہاں تک ممکن ہوتا قرآنِ مجید کے اُن اِجمالی قصّوں کی تفصیل کتبِ سابقہ کے موافق بیان کرتے اور دونوں بیانوں میں تطبیق یا عدمِ مطابقت کی وجہ بیان کرتے۔ اگرچہ یہ بات علمائے مسیحی کے اقرار سے بخوبی ثابت ہے کہ بہت سی مقدّس کتابیں جن کا ذکر بائیبل کی موجودہ کتابوں میں آیا ہے اب ناپید ہوگئی ہیں اور اس لئے یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر قصّہ جس کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے وہ موجودہ مجموعۂ بائیبل میں بھی پایا جائے لیکن جو قصّے قرآن مجید میں اجمالاً یا تفصیلاً ایسے مذکور ہوئے ہیں جو بائیبل میں بھی اُسی طرح یا کسی قدر جزوی اختلاف کے ساتھ مندرج ہیں، ان کی تطبیق کرنی یا عدمِ مطابقت کی وجوہ بیان کرنی خاص کر اس زمانے میں ایک ایسی بات تھی جس کی ضرورت کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔

سرسیّد نے سب سے پہلے اس کمی کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے ہر ایسے قصّے یا واقعے کا، جو قرآن میں مذکور ہوا ہے، تا بمقدور بائیبل میں سُراغ لگایا ہے اور قرآن اور بائیبل کی تطبیق کی ہے یا عدمِ مطابقت کی وجہ بیان کی ہے اور جس قصّے کا پتہ موجودہ بائیبل میں نہیں لگا تا بمقدور اُس کا ثبوت اور ذریعوں سے دیا ہے۔ مثلاً طالوت اور جالوت کی لڑائی کا قصہ جو سورۂ بقرہ میں مذکور ہے۔ یہی

مثال ۱ قصہ شموئیل نبی کی کتاب میں بھی بیان ہوا ہے مگر اس میں وہ مضمون نہیں ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے کہ : "اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَۃً بِیَدِہٖ" لیکن یہی مضمون کتاب قضاۃ کے ساتویں باب میں، جہاں جدعون کی مدیانیوں پر لشکر کشی کا ذکر ہے، مندرج ہے۔ اس لئے عیسائی مؤرخوں نے قرآن کے بیان پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقعہ کو طالوت کے لشکر کے واقعے سے ملا دیا ہے، حالانکہ دونوں واقعے بالکل جدا جدا ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر واقع ہوئے ہیں۔

مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں علمائے مسیحی کے اقرار اور شہادت سے یہ ثابت کیا ہے کہ کتاب شموئیل کے بعض ابواب کے متعدد درس صحیح نہیں ہیں اور جان کیٹو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اُسے الحاقی سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلاکم وکاست صحیح جانیں کیوں کہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا تھا اُنہوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو۔" اس کے سوا شموئیل نبی کی کتابوں کے متعلق یہودی اور عیسائی عالموں میں اختلاف ہے بعض تین نبیوں کی اور بعض یرمیاہ نبی کی لکھی ہوئی بتاتے ہیں اور بعض کی رائے ہے کہ شموئیل نبی کے بہت مدت بعد لکھی گئی ہیں اور اُس سے بآسانی خیال میں آسکتا ہے کہ بعض واقعات اُلٹ پلٹ ہو گئے ہوں یا بعض تحریر میں نہ آئے ہوں۔

مثال ۲ یا مثلاً قرآن مجید میں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات کے ضمن میں خلق طیر کے واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ موجودہ عہد جدید کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے اس لئے عیسائی اُس کو ایک غلط واقعہ بیان کرتے ہیں۔ مگر سرسید نے اپنی تفسیر میں ثابت کیا ہے کہ گو یہ واقعہ موجودہ عہد جدید میں نہیں ہے، لیکن وہ انجیلیں جو اناجیل طفولیت کے نام سے اب تک موجود ہیں اور جن کو ایک زمانے میں اکثر مشہور عیسائی عالم تسلیم کرتے تھے اور مدتوں ایشیا اور افریقہ کے گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھیں، اُن میں یہ واقعہ جس کا قرآن میں اجمالی ذکر ہوا ہے بہت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور اُن انجیلوں کا تمام بیان جو اس واقعہ سے متعلق ہے تفسیر میں نقل کیا ہے جس سے عیسائیوں کو اب یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہی کہ خلق طیر کا ذکر جو قرآن میں آیا ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

مثال ۳ یا مثلاً عیسائی قرآن کی اُن آیتوں کے مضمون پہ اعتراض کرتے ہیں جن سے قومِ عاد کا قومِ نوح کے بعد اُن کا جانشین ہونا اور حضرتِ ہودؑ کا قومِ عاد کی ہدایت کے لئے مبعوث ہونا پایا جاتا ہے کیوں کہ بائبل میں اُس کا کچھ ثبوت موجود نہیں ہے۔ مگر سرسیّد نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں اُن کتبوں کے بموجب جو اوّل معاویہؓ بن ابی سفیان کے عہد میں عبدالرحمٰن حاکمِ یمن کو ملے تھے اور اب ۱۸۳۴ء میں انگریزوں کو یمن کی پیمائش کرتے ہوئے وہاں کے کھنڈرات میں دستیاب ہوئے ہیں عیسائیوں کے دونوں اعتراضوں کو رد کیا ہے اور ریورنڈ فاسٹر نے جو غلط نتیجے اُن کتبوں سے نکالے ہیں اُن کی غلطی ثابت کی ہے۔

غرض کہ تاریخی اور جغرافی تحقیقات جو قرآن مجید کے قصوں سے متعلق ہے اُس کی طرف سرسیّد سے پہلے ہمارے مفسّروں نے بہت ہی کم التفات کیا تھا۔ شاید اگلے زمانے میں اس کی اتنی ضرورت نہ ہو اور ہر مسلمان کے یقین کے لئے کسی قصہ یا واقعہ کا قرآن میں مذکور ہونا ہی کافی ہو لیکن اس زمانے میں اس کی نہایت ضرورت تھی۔ قطع نظر مخالفین کے اعتراضات کے جن کو ہر طرح کی نکتہ چینی کرنے کی آزادی ہے، خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تشفّی کے لئے ہر قصہ اور ہر واقعہ اور ہر نام اور ہر مقام کو جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں، زمانۂ حال کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کرنا اور درصورتِ عدمِ تطبیق کے تاریخی و جغرافی تحقیقات کو غلط ثابت کرنا ضرور ہے۔

اگرچہ ہمارے قدیم مفسّروں نے بھی اپنی تفسیروں میں اُمم سابقہ کے حالات کثرت سے قلمبند کئے ہیں لیکن اوّل تو اُن کا ماخذ زیادہ تر وہ ضعیف روایتیں ہیں جو محدّثین کے نزدیک اعتبار کے قابل نہیں اور اگر بالفرض اُن روایتوں کو اصولِ حدیث کے موافق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ صرف اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے کافی ہو سکتی ہیں جن کے دل شکوک و شبہات سے بالکل پاک ہیں، نہ کہ عیسائیوں کے لئے جو قرآن مجید کے قصوں پر مورّخانہ نکتہ چینیاں کرتے ہیں اور نہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے جو یورپین مصنّفوں کے اعتراضات اُن کی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں بعضے ایسے قصے بھی بیان ہوئے ہیں جو بائبل میں مذکور نہیں ہیں، جیسے ذوالقرنین کا قصہ یا اصحابِ کہف کا قصہ۔ سرسیّد نے ان قصوں کی تحقیقات میں بھی کمانیغی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قصوں کے متعلق انھوں نے دو علیحدہ رسالے لکھے ہیں، اور دونوں کا جس قدر بیان قرآن مجید

میں ہوا ہے اُس کے تمام جزئیات کو تاریخِ مسلّمہ پر منطبق کرنے میں کوشش کی ہے۔ لیکن ذوالقرنین کے قصے میں جو اُنھوں نے چی وانگٹی فغفورِ چین کو ذوالقرنین کا مصداق ٹھہرایا ہے اُس پر بلاشُبہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرآن میں جس قدر قصے اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہوئے ہیں اُن میں کوئی قصہ ایسا نہیں ہے جو عرب یا اُس کے قرب وجوار میں مشہور و مسلّم نہ ہو پس کسی طرح قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ایسے اجنبی ملک کے بادشاہ کا قصہ جس کے حالات سے نہ صرف عرب بلکہ دُنیا کی اکثر قومیں خاص کر نزولِ قرآن کے زمانے میں بالکل بے خبر تھیں، اُس کتاب میں بیان کیا جائے، جو عرب کے اُمیوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہو۔ اکثر مفسروں نے سکندرِ رومی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے اور ابوریحان بیرونی نے بنی حمیر کے بادشاہوں میں سے ابوکرب شمس بن عبیر بن افریقس کو اُس کا مصداق ٹھہرایا ہے مگر یہ دونوں قول سرسیّد کے قول سے بھی زیادہ مخدوش ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس قصے کی کوئی تفسیر اب تک ایسی نہیں کی گئی جس میں اُس کے تمام جزئیات کو تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر منطبق کیا گیا ہو اور باوجود اس کے قرآن کے وظیفۂ مستمرہ کے کے بھی خلاف نہ ہو۔

دوسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ جو اعتراضات زمانۂ حال کے نکتہ چین مسلمانوں کے اُن مسائل و معتقدات پر وارد کرتے ہیں جو اسلام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں جیسے جہاد، حج، صومِ رمضان، طلاق، حرمتِ ربا، معراج، بہشت و دوزخ وغیرہ، اُن اعتراضوں اور اُن مسائل و معتقدات پر جس صفائی کے ساتھ اس تفسیر میں بحث کی گئی ہے اور جن مناسب طریقوں سے مقتضائے وقت کے موافق اُن کو دفع کیا گیا ہے اس کی نظیر قدیم تفسیروں میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ یہاں ہم اُن میں سے صرف دو مثالیں نہایت اختصار کے ساتھ بطور نمونہ کے ناظرین کی اطلاع کے لئے بیان کرتے ہیں۔

مثال ۱

سب سے بڑا معرکۃ الآرا جہاد کا مسئلہ ہے جس پر سرسیّد اپنی متعدد تصنیفات میں تفسیر لکھنے سے پہلے کافی بحث کر چکے تھے مگر تفسیر میں مسئلہ مذکور کے متعلق اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جن کو تیرہ سو برس سے عیسائی قوموں نے اسلام کے مطعون کرنے کا ایک زبردست آلہ بنا رکھا تھا اور جن کی بدولت واقعہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو نہایت سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اُنھوں نے اوّل سورۂ بقرہ کی اُن آیتوں کی تفسیر میں جن میں مشرکینِ مکہ سے قتال کرنے کا حکم ہے، اجمالی طور پر جہاد کے متعلق ایک لطیف تقریر لکھی ہے جس کو کسی قدر اختصار کے

ساتھ ہم اِس مقام پر لکھتے ہیں ”اکثر لوگ اسلام پر یہ طعن کرتے ہیں کہ اُس میں تحمّل اور بُردباری اور مذہب کے سبب سے جو تکلیفیں کافروں سے پہنچیں اُن کی صبر کے ساتھ برداشت نہیں - اور یہ باتیں مذہب کی سچائی اور نیکی اور اخلاق کے برخلاف ہیں مگر یہ ایک بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے - بے شک قرآن مجید میں جو لڑائی کے احکام نہایت نیکی اور انصاف پر مبنی تھے اُن کو مسلمان بادشاہوں نے دینداری کے بہانے سے اپنی خواہشِ نفسانی کے پورا کرنے اور ملک گیری کے لئے نہایت بداخلاقی اور ناانصافی سے برتا اور وحشی درندوں سے بھی بدتر کام کئے اور علمائے اسلام نے اُن کی تائید کے لئے ایسے مسئلے بیان کئے جو اسلام کی روحانی نیکی کے برخلاف تھے مگر اُن کے ایسا کرنے سے جو برائی قرار دی جاوے وہ انھیں پر محدود ہے جنھوں نے ایسا کیا، نہ اسلام پر۔“

”اسلام میں اگرچہ جا بجا عفو و صبر و تحمّل کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور اُن پر رغبت دلائی گئی ہے مگر اسی کے ساتھ بدلہ لینے کی بھی بغیر زیادتی کے اجازت دی ہے - کیا یہ قانون دُنیا کے پیدا کرنے والے کے قانونِ قدرت کے مناسب نہیں ہے؟ اور کیا اس قانون سے زیادہ عمدہ اور سچا کوئی قانون ہو سکتا ہے؟ انسان جب اخلاق کی باتوں پر گفتگو کرتا ہے تو بہت سی ایسی باتیں اور ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کان کو اور دل کو نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں اور سُننے اور پڑھنے والے خیال کرتے ہیں کہ یہی اصول اخلاق کے اور یہی اصول اعلیٰ درجہ کی نیکی کے ہیں، مگر درحقیقت وہ ہوا کی آواز سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتے اور چوں کہ وہ اصولِ فطرتِ انسانی بلکہ قانونِ قدرت کے برخلاف ہوتے ہیں، کبھی اُن پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا -“

”کوئی کتاب دُنیا میں انجیل سے زیادہ انسان کو نرم مزاج اور بُردبار و متحمّل کرنے والی اور اخلاق کو ایسی چمک سے دکھانے والی جس سے آنکھوں میں چکاچوند آجاوے نہیں ہے - مگر ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اُن کا لوگوں میں کیا اثر ہوا تھا؟ انجیل میں لکھا ہے کہ ”اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اُس کے سامنے کر دے۔“ بلاشبہ یہ مسئلہ اخلاق کے خیال سے تو بڑا عمدہ معلوم ہوتا ہے مگر کسی زمانہ کے لوگوں نے اُس پر عمل کیا ہے؟ اگر دُنیا اس پر عمل کرے تو دُنیا کا کیا حال ہو؟ اسی طرح آباد رہے؟ اور اسی طرح لوگوں کی جان اور مال امن میں رہے؟ نہایت دلچسپ جواب دیا جاتا ہے کہ جب سب ایسے ہی ہو جاویں تو دنیا سے شر اُٹھ جاوے - مگر پوچھا جاتا ہے کہ کبھی ایسا ہوا ہے؟ یا کبھی ہوگا؟ یہ سب

ناشُدنی باتیں ہیں جو خیال میں شُدنی قرار دے کر انسان خیالی اور جھوٹی خوشی حاصل کرتا ہے۔"

"عیسائی مذہب جس کی جڑ ایسی نیکی اور نرمی اور اخلاق میں لگائی گئی تھی وہ پھولا اور پھلا اور سرسبز و شاداب ہوا۔ اس کو چھوڑ دو کہ وہ کس سبب سے بڑھا اور سرسبز ہوا۔ مگر دیکھو کہ اُس نے کیا پھل پیدا کیا؟ ایک بھی نصیحت اُس کی کام نہ آئی اور خود مذہب نے جو خونریزی اور بے رحمی اور ناانصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھائی وہ شاید دُنیا میں بے مثل ہوگی اور جس نیکی میں اُس کی جڑ لگائی گئی تھی اُس نے کچھ پھل نہیں دیا، کیوں کہ وہ قانونِ قدرت کے خلاف لگائی گئی تھی۔ جو خوبی، کیا روحانی اور کیا اخلاقی اور اور کیا تمدّنی، اب ہم بعض عیسائی ملکوں میں دیکھتے ہیں کیا یہ پھل اُسی درخت کا ہے جس کی جڑ ایسی نیکی میں لگائی گئی تھی جو خلافِ قانونِ قدرت تھی؟ حاشا و کلاّ، بلکہ یہ اس کا پھل ہے کہ اُس درخت کو وہاں سے اکھاڑ کر دوسری زمین پر لگایا ہے جو قانونِ قدرت کی زمین ہے اور جس قدر کہ پہلی زمین کی مٹی اُس کی جڑ میں لگی ہوئی ہے اُسی قدر اُس میں نقصان ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ رحیم مذہب کا حال سُنو جس نے ایک چھوٹے سے چھوٹے جانور کی جان کو بھی مارنا سخت گناہ قرار دیا ہے۔ خون کا بہانا آدمی کا ہو یا درندے کا یا ایک پشّہ کا خدا کی صنعت کو ضائع کرنا سمجھا ہے۔ مگر تاریخ اور زمانہ موجود ہے۔ اس اصول نے جو قانونِ قدرت کے مخالف تھا کیا نتیجہ دیا؟ قتل و خونریزی ویسی ہی رہی اور ویسی ہی ہے جیسی کہ قانونِ قدرت سے ہونی چاہیئے، وہی جو ایک پشّہ کا مارنا گناہ عظیم سمجھتے تھے، ہزاروں آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرتے تھے اور قتل کرتے ہیں۔ پس کوئی قانون گو وہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آئند ہو جب کہ وہ قانونِ قدرت کے برخلاف ہے محض نکمّا اور بے اثر ہے۔"

"اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اُس کے تمام قانون، قانونِ قدرت کے مطابق اور عملدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ، جہاں تک کہ قانونِ قدرت اجازت دیتا ہے، رحم ہے۔ معافی کی جگہ معافی ہے بدلے کی جگہ بدلہ ہے، لڑائی کی جگہ لڑائی ہے، ملاپ کی جگہ ملاپ ہے اور یہی بڑی دلیل اُس کی سچائی کی اور قانونِ قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے۔"

"اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا۔ جس نے اُن کو یعنی مسلمانوں کو امن دیا ہو مسلمان ہو یا کافر، اُس کی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔ کافروں کے ساتھ جو عہد و قرار ہوئے ہوں اُن کو نہایت ایمان داری کے ساتھ پورا کرنے کی تاکید کی ہے۔ خود کسی پہ ملک گیری اور

فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اُس میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے، حملہ کر کے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دو صورتوں میں اُس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ ایک اُس حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے، نہ کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں اور خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے، اس کو مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ دوسرے جب کہ اُس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو، اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، اُن کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو۔ مگر اس حالت میں بھی بتایا ہے کہ جو لوگ اُس ملک میں بطور رعیت کے رہتے ہیں، گو صرف بوجہ اسلام کے اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی اُن کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی، یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں، اور اُس ملک میں امن لئے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں، اُن کو مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے۔ یا اُن کے لئے امن اور مذہبی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اُس کو مذہب کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔"

"یہی بات ہے جس پر اسلام نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے، یہی لڑائی ہے جس کا نام جہاد رکھا ہے، یہی لڑائی ہے جس کے مقتولوں کو روحانی ثواب کا وعدہ دیا ہے، یہی لڑائی ہے جس کے لڑنے والوں کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی لڑائی نا انصافی اور زیادتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانونِ قدرت اور انسان کی فطرت کے مخالف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہوتا بلکہ دوسرا گال پھیر دینا، خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا؟

لڑائی شروع ہونے کے بعد تلوار ہر ایک کی دوست ہوتی ہے۔ اس میں بجز اس کے۔ کہ دشمنوں کو قتل کرو، لڑائی میں بہادری کرو، دل کو مضبوط رکھو، میدان میں ثابت قدم رہو، فتح کرو یا مارے جاؤ اور کچھ نہیں کہا جاتا، وہی قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص، اُس موقع اور محل کو جس کی

نسبت قرآن میں لڑنے والوں کے دلوں کے مضبوط کرنے کی آیتیں نازل ہوئی ہیں، چھوڑ کر اُن آیتوں کو عموماً خونخواری اور خونریزی پر منسوب کرے جیسا کہ اکثر نادان عیسائیوں نے کیا ہے، تو یہ خود اُس کا قصور ہوگا نہ اسلام کا۔"

"لڑائی میں بھی جو رسم قانونِ قدرت کے موافق ضرور ہے اسلام نے اُس میں فروگذاشت نہیں کیا، عورتوں کو، بچوں کو، بوڑھوں کو اور جو لڑائی میں شریک نہ ہوئے ہوں اُن کو قتل کرنے کی ممانعت کی۔ عین لڑائی میں اور صفِ جنگ میں جو مغلوب ہو جاوے اُس کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ صلح کو اور معاہدۂ امن کو قبول کرنے کی رغبت دلائی، باغ کو، کھیتوں کو جلانے کی ممانعت کی، قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ نہایت ظالمانہ طریقہ جو لڑائی کے قیدیوں کو، عورت ہوں یا مرد، غلام اور لونڈی بنا لینے کا تھا اس کو معدوم کیا۔ اس سے زیادہ لڑائی کی حالت میں انصاف اور رحم کیا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے اس میں سے کسی کی بھی پوری تعمیل نہیں کی، بلکہ برخلاف اس کے بے انتہا ظلم و ستم کیے، مگر جب کہ وہ اسلام کے حکم کے برخلاف تھے تو اسلام کو اُس سے داغ نہیں لگ سکتا۔ وہ بھی تو مسلمانوں ہی میں سے تھے جنھوں نے عمرؓ کو، عثمانؓ کو، علیؓ، حسینؓ کو ذبح کر ڈالا تھا، کعبہ کو جلا دیا تھا۔ پس اُن کے کردار سے اسلام کو کیا تعلق ہے؟"

"مشرکینِ مکہ نے اُن لوگوں پر جو مسلمان ہو گئے تھے، صرف اسلام کی عداوت سے اور خود رسولِ خدا صلعم پر بہت سے ظلم کیے تھے اور تکلیفیں پہنچائی تھیں، قتل کے درپے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ مسلمانوں نے حبشہ میں جا کر پناہ لی اور آخر کار آنحضرت صلعم مکہ کو چھوڑ کر مدینے چلے آئے۔ پھر انھوں نے وہاں بھی تعاقب کرنا چاہا اور مکہ میں حج کو آنے سے روکا، لڑائی پر آمادہ ہوئے۔ تب اسلام نے اُن سے لڑنے کا حکم دیا۔ پس جس قدر احکام قتلِ مشرکین کے ہیں وہ سب انھیں لڑنے والوں سے متعلق ہیں، وہ بھی اُسی وقت تک کہ فتنہ و فساد دفع ہو جائے، جیسے کہ خود خدا نے فرمایا ہے۔ "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ" امام فخر الدین رازی نے تفسیرِ کبیر میں لکھا ہے کہ "مشرکین کا فتنہ یہ تھا کہ وہ مکہ میں مسلمانوں کو مارتے تھے اور ایذا دیتے تھے، یہاں تک کہ تنگ ہو کر مسلمان حبشہ کو چلے گئے۔ پھر بھی وہ برابر ایذا اور تکلیف دیتے رہے، یہاں تک کہ مسلمان مدینہ میں ہجرت کر گئے اور مشرکین کی غرض ایذاؤں اور تکلیفوں سے یہ تھی کہ مسلمان اپنا اسلام چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی

اور اُس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں سے لڑو جب تک کہ اُن پہ غالب ہو جاؤ، تاکہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیرنے کے لیے ایذا نہ دے سکیں اور تم شرک میں نہ پڑو۔ "یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ" کا فقرہ بھی اُنھیں آیتوں کے ساتھ ہے جو مشرکینِ عرب کے حملہ کے دفع کرنے کو لڑنے کی بابت نازل ہوئی تھیں۔ اس کے یہ معنی سمجھے کہ اتنا لڑنا چاہیئے کہ اسلام کے سوا کوئی دین نہ رہے۔ یہ تو محض نادانی کی بات ہے جو سلف سے آج تک نہ کبھی ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ اس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ اس قدر لڑنا چاہیئے کہ اللہ کے دین کے بجا لانے میں جو کافر ہرج ڈالتے ہیں وہ نہ رہے اور اللہ کے لئے دین ہو جائے کہ مسلمان خدا کے لئے اس کو بے ایذا کے بجا لا سکیں۔"

سرسیدؔ نے سورۂ بقر کی تفسیر میں مسئلۂ جہاد کے متعلق صرف اسی اجمالی بیان پہ اکتفا کیا ہے، مگر سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی تفسیر میں اس بحث کو نئے سرے سے بہت بڑے اہتمام کے ساتھ اٹھایا ہے اور اپنی تفسیر کی چوتھی جلد قریب نصف کے اسی مسئلہ کی تحقیقات پر لکھی ہے۔

اُنھوں نے سورۂ توبہ کی تفسیر میں اوّل بطور الزامی حجّت کے آنحضرتؐ کی لڑائیوں کا مقابلہ حضرتِ موسیٰؑ کے قتل و غارت سے جو کہ توریت میں مذکور ہے کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کی لڑائیاں اُس کے مقابلے میں بالکل رحمت تھیں اور جو لوگ توریت کو اور حضرت موسیٰؑ کو مانتے ہیں اُن کے لئے حضرت مسیحؑ کا یہ قول کافی ہے کہ "تو اُس تنکے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے کیوں دیکھتا ہے اور جو شہتیر تیری آنکھ میں ہے اُسے دریافت نہیں کرتا۔" اِس کے بعد وہ لکھتے ہیں: "مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم صرف حجّتِ الزامی پر اکتفا کریں۔ بلکہ ہمارا مقصود ہر امر کی تحقیق کرنا اور اُس کی اصلیت کو ظاہر کرنا ہے، اس لئے ہم اس امر کو بخوبی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے اُن تمام اعتراضات کا جو قدیم سے عیسائی اسلام کے مسئلۂ جہاد پر کرتے چلے آتے ہیں، لُبِّ لباب بیان کر کے اس بات کا دعوےٰ کیا ہے کہ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلعم کے زمانے میں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں اُن سے صرف امن قائم رکھنا اور کفار کے شر سے اسلام اور اہلِ اسلام کو بچانا مقصود تھا نہ کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے، جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں، اسلام منوانا۔ اور اُس کے ثبوت میں اوّل اُن تمام واقعات کی تفصیل بیان کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرہ برس تک برابر آنحضرت صلعم اور مسلمانوں نے مکہ معظمہ میں قریش کے ہاتھوں سے کیسی کیسی سختیاں اور ظلم و ستم برداشت کئے اور کیا کیا مصیبتیں جھیلیں اور کس مجبوری سے اس کی حالت میں یہ زمانہ اسلام اور

بانیٔ اسلام پر گذرا، یہاں تک کہ جب آنحضرتؐ کے شفیق چچا ابو طالب کا انتقال ہوگیا تو دین اسلام کے معدوم کرنے یعنی رسولِ خدا صلعم کے قتل کا نہایت پختہ طور سے منصوبہ باندھا گیا۔ دو دفعہ انھیں سختیوں اور ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں ہجرت کر کے حبشہ کو چلے گئے اور آخر کار آنحضرتؐ کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے وطنِ مالوف چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ قریش نے ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کے آزار پہنچانے میں کمی نہیں کی۔ حبشہ کے مہاجروں کا تعاقب اُنھوں نے سمندر کے کنارے تک کیا اور جب وہ ہاتھ نہ آئے تو نجاشی کے پاس بہت سے تحفے اور ہدیے بھیج کر مسلمانوں کو اس سے مانگا۔ مگر نجاشی نے اُن کے دینے سے انکار کیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ بھی جنھوں نے آنحضرتؐ کی نصرت کا وعدہ کیا تھا یا جو مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے، قریش نے برائی کرنے میں کچھ کمی نہیں کی اور مدینہ پر بھی قریش کے حملہ کرنے کا برابر خطرہ لگا رہا۔

جب کہ اسلام اور اہلِ اسلام کی یہ حالت تھی تو سر سید لکھتے ہیں کہ "ایسی حالت میں آنحضرت صلعم کو اور مہاجرین و انصار کو اپنے اور مدینہ کی حفاظت اور امن قائم رہنے کے لئے چار امر لازمی تھے کہ بغیر اُن کے کبھی امن اور مطلوبہ حفاظت کسی طرح قائم نہیں رہ سکتی تھی (۱) اس بات کی خبر رکھنی کہ قریش مکہ کیا کرتے ہیں اور کس منصوبے میں ہیں (۲) جو قومیں کہ مدینہ یا نواحِ مدینہ میں رہتی تھیں اُن سے امن کا اور قریش کی مدد نہ کرنے کا معاہدہ کرنا، لیکن عہد شکنی کی حالت میں اُن سے مقابلہ کرنا اُس منصوبے کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسا کہ امن کا معاہدہ کرنا کیوں کہ عہد شکنی کی مکافات قائم نہ کی جائے تو کوئی معاہدہ اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتا اور امن مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتا (۳) جو مسلمان مکہ میں بہ مجبوری رہ گئے تھے اور موقع پا کر وہاں سے بھاگ آنا چاہتے تھے اُن کے بھاگ آنے پر جس قدر ہو سکے اُن کی اعانت کرنا چنانچہ جو قافلہ مکہ سے نکلتا تھا ہمیشہ احتمال ہوتا تھا کہ شاید اُس کے ساتھ بہانہ کر کے کوئی مسلمان مدینہ کی طرف بھاگنے کے ارادے سے نہ نکلا ہو۔ (۴) جو گروہ قریش کا مکہ سے مدینہ پر حملہ کرنے کو نکلے یا کسی طرح پر احتمال ہو کہ وہ مدینہ پر آنے والا ہے، اُس کا ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا کیوں کہ ایسا کرنا اُسی امن کے قائم رکھنے کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ان کے سوا دو امر اور ہیں جو ہتھیاروں کے اٹھانے کا باعث ہوتے ہیں (۱) یہ کہ کفار اُن مسلمانوں کو جو اُن کے قبضے میں ہوں، تکلیف اور ایذا دیتے ہوں اور اُن

کی مخلصی کے لئے لڑائی کی جادے۔ کون شخص ہے جو اس لڑائی کو انسانی اخلاق اور انسانی نیکی کے برخلاف کہہ سکتا ہے اور یہ اتہام کر سکتا ہے کہ وہ زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے مذہب قبلو انے کے لئے ہے (۲) یہ کہ کفار مسلمانوں کو اُن کے احکامِ مذہبی ادا کرنے کے لئے مانع ہوں بشرطیکہ وہ اُن کی عملداری میں رہتے نہ ہوں۔ کیوں کہ اس صورت میں اُن کو وہاں سے ہجرت کرنی لازم ہے نہ لڑائی۔ اگرچہ اس لڑائی کی بُنیاد ایک مذہبی امر ہے۔ لیکن اُس کا مقصد اپنی مذہبی آزادی حاصل کرنا ہے نہ کہ دوسروں کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا منوانا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ "ایک اور امر ہے جو انھیں قسموں کی لڑائیوں کا ضمیمہ ہے، یعنی جس ملک یا قوم سے انھیں امور (یعنی مذہبی امور) کے سبب مخالفت ہے اور لڑائی مشتہر ہو چکی ہے اُس ملک یا قوم پر چھاپہ مارنا یا اُن کا اسباب اور اُن کی رسد اور اُن کے ہتھیاروں کو لوٹ لینا۔ اس زمانۂ تہذیب میں بھی کون سی مہذب سے مہذب قوم ہے جو اس فعل کو نامہذب و ناجائز قرار دے سکتی ہے؟ اور کون ہے جو اُس کو ہتھیاروں کے زور سے مذہب کا قبلوانا قرار دے سکتا ہے۔ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ہوئیں وہ انھیں امور پر مبنی تھیں۔ ایک لڑائی بھی اس غرض سے نہیں ہوئی کہ مخالفوں کو زبردستی اور ہتھیاروں کے زور سے اسلام منوایا جائے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "اِس دعوے کا ثبوت دو طرح پر ہو سکتا ہے، اوّل اُن احکام سے جو قرآنِ مجید میں لڑائیوں کی سنبت وارد ہیں اور جن سے ظاہر ہوگا کہ لڑائی کا حکم صرف امن قائم کرنے کے لئے تھا نہ زبردستی سے اسلام قبلوانے کے لئے۔ دوسرے اُن لڑائیوں کے واقعات پر غور کرنے سے جو آنحضرت صلعم کے زمانے میں واقع ہوئیں.... اس کے بعد ایک امر اور بحث طلب باقی رہ جائے گا (یعنی یہ) کہ ایک پیغمبر کو اس قسم کی لڑائیاں لڑنا بھی زیبا ہے یا خاموشی سے گردن کٹوا کر اور سر کو طشت میں رکھوا کر دشمن کے سامنے جانے دینا؟ یا کافروں کے ہاتھوں میں اپنے تیئں ڈلوا کر صلیب پر چڑھنا اور جان دینا؟ سو ہم اس پر بھی اخیر کو بحث کریں گے۔"

اس کے بعد انھوں نے نہایت شدّ و مد سے دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں جبراً مسلمان کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مسلمان کرنے کے لئے صرف وعظ اور نصیحت کرنے کی ہدایت کی ہے پھر وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں مذہب کی آزادی کا حکم ہے مثلاً سورۂ نحل میں آنحضرتؐ کو حکم ہے کہ "دعوتِ اسلام

کہ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور اُن سے بحث کو پسندیدہ طریقے کے ساتھ" یا سورۂ نور میں حکم ہے کہ "خدا اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو ہمارے رسول کے ذمہ صرف حکموں کا پہنچا دینا ہے" یا سورۂ قاف میں فرمایا کہ " اے پیغمبر تو اُن پر جبر کرنے والا نہیں ہے" اور سورۂ غاشیہ میں فرمایا کہ " اے پیغمبر تو صرف نصیحت کرنے والا ہے کچھ اُن پر کروڑا نہیں ہے" اور سورۂ یونس میں فرمایا کہ " اے پیغمبر کیا اُن کو مجبور کرنا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں" اور سورۂ بقرہ میں صاف صاف فرمایا کہ "دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے"

اس کے بعد مخالفین کے اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ قرآن کی یہ نصیحتیں اُسی وقت تک تھیں جب تک کہ آنحضرت مکہ میں تھے، مگر جب مدینہ میں چلے گئے اور مہاجرین و انصار ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسلام کو قوت حاصل ہو گئی تو اُس وقت یہ نصیحتیں بدل دی گئیں اور تلوار کے زور سے مسلمان کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ اوّل تو سورۂ نور اور سورۂ بقرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ اسلام کو بخوبی قوت حاصل ہو گئی تھی حالانکہ انہیں سورتوں میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یہ حکم ہے کہ رسول کا کام صرف حکموں کو پہنچا دینا ہے اور دین میں کچھ جبر و اکراہ نہیں ہے۔ دوسرے خدا کے احکام جو بطور اصل اصول کے نازل ہوتے ہیں وہ جگہ کے بدلنے یا قوت و ضعف کے تفاوت سے تبدیل نہیں ہو سکتے، پس جب کہ آپ مکہ میں تھے جب بھی، اور جب مدینہ میں چلے گئے جب بھی یہی حکم تھا کہ کوئی شخص زبردستی سے مسلمان نہ کیا جائے۔ ہاں جب آپ مدینہ میں تشریف لے گئے تو بے شک لڑائی کا حکم ہوا مگر نہ اس لئے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان کیا جائے بلکہ محض امن قائم کرنے کے لئے جیسا کہ آئندہ بہ تفصیل بیان کیا جائے گا۔

اس کے بعد صلح اور معاہدے کی حالت میں جو مذہبی آزادی قرآن میں غیر مسلمین کو دی گئی ہے اُس کا مفصّل ذکر کیا ہے اور قرآن کی وہ تمام آیتیں نقل کی ہیں جن میں صلح و معاہدہ کے احکام بیان ہوئے ہیں پھر قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جن میں کفار سے لڑنے کا حکم ہے ایک ایک کر کے ذکر کی ہیں اور نہایت وضاحت اور صفائی کے ساتھ اُن سے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں صرف تین قسم کے لوگوں سے لڑائی کا حکم ہوا ہے (۱) اُن لوگوں سے جو خود مسلمانوں سے لڑائی شروع کریں (۲) اُن لوگوں سے جنہوں نے دغابازی کی ہو اور معاہدوں کو توڑ دیا ہو (۳) اُن لوگوں سے جنہوں نے مسلمانوں کو یا اُن کے بچوں اور

عورتوں کو عذاب اور تکلیف میں ڈال رکھا تھا۔ ان تین صورتوں کے سوا کہیں قرآن میں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر انھوں نے آنحضرت صلعم کے زمانے کی تمام لڑائیاں جو غزوہ اور سریہ کے نام سے مشہور ہیں بالاستیعاب بیان کی ہیں اور سنہ ۱ھ سے سنہ ۹ھ تک ۳۱ غزوات اور ۵۲ سرایا کا مفصل حال حدیث اور سیر اور جغرافیہ کی سولہ معتبر کتابوں سے لکھا ہے، اور کمال خوبی اور صفائی کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ ان ۸۳ واقعات میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس غرض سے کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بجبر و بزورِ شمشیر مسلمان کیا جائے بلکہ یہ تمام لڑائیاں اور مقابلے یا تو دشمنوں کی مدافعت اور ان کا حملہ روکنے کے لئے ہوئے تھے، یا اُن کا ارادہ فاسدہ معلوم ہونے کے بعد اُن کو منتشر کرنے کو، یا اُن کی عہد شکنی اور دغابازی ظاہر ہونے کے بعد، اور یا اُن لوگوں کی مدد کے لئے جو خبر رسانی کی غرض سے بھیجے گئے تھے اور دشمنوں سے اُن کا مقابلہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس نے ملک کا انتظام ہاتھ میں لیا ہو اور اُس کو اس قسم کی لڑائیاں نہ پیش آئی ہوں۔ پھر ان لڑائیوں کی نسبت یہ کہنا کہ زبردستی ہتھیاروں کے زور سے مسلمان کرنے کے لئے تھیں، ایک ایسا غلط قول ہے جس کو کوئی ذی عقل، بجز اُس کے جس کے دل میں تعصب بھرا ہو، تسلیم نہیں کر سکتا۔"

پھر لکھتے ہیں کہ "جس قوم کی کسی ملک میں حکومت ہو جاتی ہے قدرتی طور پر اُس قوم کے نہ صرف مذہب کو بلکہ رسم و رواج عادات و اطوار کو ترقی ہوتی ہے اور لوگ اُس کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ مقولہ کہ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ" ہر ایک قوم اور - - - - - ہر ایک مذہب پر صادق آتا ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے سبب اُسی قدرتی قاعدہ سے اسلام کی ترقی کو بھی مدد پہنچی بلکہ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا عجیب واقعہ پایا جاتا ہے جو اور کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ہے کہ فاتح قوم[1] نے فتح کامل حاصل کرنے اور استقلالِ کامل پانے کے بعد اپنی مفتوح قوم (یعنی مسلمانوں) کا دفعۃً مذہب

---

[1] یہاں فاتح قوم سے مراد خوانینِ تاتار ہیں جن میں سب سے زیادہ نامور چنگیز خاں اور ہلاکو خاں ہوئے ہیں جو مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ چنانچہ چنگیز خاں کا قول تھا کہ "خدا تعالیٰ نے مجھے مسلمانوں کے قلع قمع کے لئے بھیجا ہے۔" اُن کی حکومت تمام ایران، توران، خوارزم، دشتِ قبچاق اور روس وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی سلطنت اور حکومت کے زمانے میں اوّل بیرکہ خان چنگیز خاں کا پوتا مسلمان ہوا تھا اور پھر سلطان احمد جس کا نام اسلام سے پہلے نکودار تھا اسلام لایا اور پھر رفتہ رفتہ تمام تاتاریوں میں اسلام پھیل گیا ۱۲

اختیار کر لیا۔"

اس کے بعد آنحضرتؐ کی بُت شکنی میں (جس کو مخالفین اسلام مثل سلاطین اسلام کی بُت شکنی کے قابلِ الزام سمجھتے ہیں) اور محمود و عالمگیر وغیرہ کی بت شکنی میں فرق بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ "کعبہ ایک مسجد تھی حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی خدائے واحد کی عبادت کے لئے، اس کے بعد جب عرب بُت پرست ہوگئے تو اُس مسجد میں انھوں نے بُت رکھ دیئے جن کا برباد کرنا اور دینِ ابراہیم کا اُس (مسجد) میں جاری کرنا ابراہیم کے پہلونٹے بیٹے کے فرزند کو لازم تھا۔ قوم عرب، جس کا غالب حصّہ ابراہیم کی نسل سے تھا اور جس نسل میں خود آنحضرتؐ بھی تھے اُس قوم کو بتوں کی پرستش سے چھڑانا اور ابراہیم کے خدا کی پرستش سکھانا ضرور تھا۔ پس آنحضرتؐ نے خود اپنی قوم کے بُت توڑے تھے۔ اس سے دیگر اقوام کے مذہب کی آزادی کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں بُت شکنی اور غیر مذہب کے معبدوں کو برباد کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، اسی طرح ہزاروں مثالیں اس کے برخلاف موجود ہیں مسلمانوں کی سلطنت دُنیا کے بہت بڑے حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُس میں مختلف مذاہب کی قومیں رہتی تھیں، تمام سینگاگ اور تمام گرجے جو زیادہ تر رومن کیتھلک مذہب کے تھے، بدستور قربانی اور گھنٹے بجاتے تھے۔ تمام ملک میں ناقوس کی آواز گونجتی تھی، مندروں میں بُت موجود تھے۔ ہر ایک قوم اپنے مذہب میں آزاد تھی۔ پس ان تمام حالات کو جو نہایت کثرت سے تھے، بھول جانا اور چند واقعات کو جو اُس کے برخلاف شخصی طبیعت سے واقع ہوئے تھے پیش کرنا اور کہنا کہ اسلام نے مذہبی آزادی کو مٹایا تھا محض ناانصافی ہے۔"

اس کے بعد آنحضرتؐ کے غزوات کی نسبت لکھتے ہیں کہ "تمام انبیاء جب کہ قوم کی اصلاح اور اُن کی درستی کو کھڑے ہوتے ہیں تو ابتدا میں عموماً اُن کے دشمن چاروں طرف ہوتے ہیں اگر وہ مخالفوں سے محفوظ رہنے کی کوشش نہ کرتے تو دُنیا میں نہ آج یہودی مذہب کا وجود ہوتا اور نہ کسی اور مذہب کا، اور نہ عیسائی مذہب کا نام باقی رہتا اگر بعد حضرت مسیحؑ کے اُس کے لئے ایسا زمانہ نہ آتا جس میں اُس کے پیروؤں کی مخالفین سے حفاظت کی گئی اور بزورِ حکومت اُس کو ترقی دی گئی۔ قرآن میں نہایت عمدہ اور بالکل سچ بات خدا تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ "وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ

صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰہِ كَثِيرًا (یعنی اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو ڈھا دی جاتیں عیسائیوں اور دہ ویشوں کی خانقاہیں اور یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں بہت زیادہ خدا کا ذکر کیا جاتا ہے) پس یہ کہنا کہ انبیاء کو ایسی لڑائیاں نازیبا ہیں ایک ایسا قول ہے جس کو قانونِ قدرت مردود ٹھہراتا ہے۔ لوگ حضرتِ موسیٰؑ کے کاموں کو تو بھول جاتے ہیں اور غریبی اور مسکینی اور مظلومی کی مثال میں حضرتِ مسیحؑ کو پیش کرتے ہیں، مگر حضرتِ مسیحؑ نے جب اپنے تئیں خلقت کے سامنے پیش کیا اُس وقت سے اُن کی وفات تک نہایت قلیل زمانہ قریب تین برس کے گذرا تھا اور صرف ستر آدمیوں کے قریب (اس عرصے میں) اُن پر ایمان لائے تھے۔ اُن کو مطلق ایسی قوت جس سے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں حاصل نہیں ہوئی تھی اور اسی سبب سے کالوری کے پہاڑ پر وہ افسوسناک واقعہ (یعنی مصلوب ہونا) واقع ہوا۔ اس کے بعد اگر اُس کے (یعنی دینِ مسیحی کے) ایسے حامی نہ پیدا ہو جاتے جو دشمنوں کو دفع کر سکتے تو آج دُنیا میں ایک بھی گرجا اور ایک بھی خانقاہ نہ دکھائی دیتی۔ اس کے علاوہ آنحضرتؐ کو روحانی بادشاہی کے سوا سلیمانؑ کی سی سلطنت کے انتظام میں داخل ہونے میں بہت بڑی مجبوری تھی۔ عرب میں بادشاہت کا وجود نہ تھا۔ ہر ایک قبیلے کا سردار اُن کا حاکم ہوتا تھا اور جس کو سب لوگ بڑا سمجھتے تھے اُس کو یہ مجبوری افسر بننا اور تمام ملکی انتظام کرنا لازم تھا۔ جب کہ تمام قبائل رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے تو امکان سے خارج تھا کہ وہ لوگ سوائے آنحضرتؐ کے اور کسی کو اپنا سردار تسلیم کرتے اور تمام معاملاتِ ملکی بجز آنحضرتؐ کے حکم کے اور کسی کے حکم سے تعمیل پاتے۔ پس ہر بات پر انصاف سے غور کرنا چاہیئے نہ تعصّب سے۔"

سرسیّد کی ان تمام تحریروں کا جو کہ انھوں نے جہاد کے متعلق ۱۸۵۷ء سے لکھنی شروع کی تھیں اور جن کا تفسیر القرآن پر خاتمہ ہو گیا، یہ نتیجہ ہوا ہے کہ بہت سے منصف مزاج انگریزوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ دینِ اسلام میں جبراً مسلمان کرنے اور کفار سے عموماً جہاد کرنے کا حکم نہیں ہے، چنانچہ سب سے پہلے اور آخر ۱۸۷۱ء میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے عربی داں حاکم نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "جہاد (از روئے اصولِ اسلام) اُن لوگوں کے مقابلے میں ہونا چاہیئے جو صرف کافر ہی نہیں بلکہ تعمیلِ شرائطِ اسلام میں مزاحمت بھی کرتے ہوں الذین کفروا وصدّوا عن سبیل اللّٰہ جہاد کی شرطِ ضروری یہ ہے کہ حاکم کی طرف سے احکامِ اسلام کی تعمیل میں

مسلمانوں پر جبر و تعدّی یا مزاحمت ہوتی ہو اور جبر و تعدّی و مزاحمت جو وجوبِ جہاد کے لئے شرط ہے وہ بھی معاملاتِ باہمی میں معتبر نہیں بلکہ معاملاتِ مذہبی میں ہونی ضرور ہے۔ مسلمان جو انگریزی عملداری کے ظلّ حمایت میں رہتے ہیں جہاد کے باب میں اُن کو شریعت نے ایسی سخت قیود کے ساتھ جکڑ رکھا ہے کہ جب تک وہ تمام شرائط نہ پائے جائیں جہاد پر اقدام نہیں کر سکتے حالانکہ انگریزی عملداری میں اُن میں سے کوئی شرط بھی پائی نہیں جاتی، بلکہ فی زماننا مسلمانوں کو وہ امن حاصل ہے، جو پیغمبر صاحب اور اُن کے ہمراہیوں کو نجاشی نصرانی فرمانروائے ایبے سینیا کی حمایت میں حاصل تھا۔ پس جب تک اس طرح کا امن باقی ہے بغاوت ایک شرعی گناہ سمجھا جائے گا۔

مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ جو ایک نہایت سچے اور منصف مزاج عیسائی ہیں، انھوں نے تو اپنی کتاب ، پریچنگ اوف اسلام میں (جو ابھی شائع ہوئی ہے) اس بحث کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے کہ قرآن کی رُو سے غیر مذہب والوں کو بزورِ شمشیر مسلمان کرنے کا حکم ہے یا بذریعہ وعظ و نصیحت کے ؛ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ جن اسباب سے پروفیسر ممدوح کے دل میں پریچنگ اوف اسلام پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور اس میں کامیابی کی امید بندھی تھی اُن میں ایک بڑا محرک سرسیّد کی تحریرات کا مطالعہ تھا۔

مثال ۲ معراج کے مسئلے پر بھی سرسیّد نے تفسیر میں نہایت مفصّل بحث کی ہے جو اُن سے پہلے کسی مفسّر نے نہیں کی۔ معراجِ جسمانی پر جو عیسائی یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ عقل کے بالکل خلاف ہے اُس کے الزامی جواب ازالۃ الاوہام وغیرہ میں عہدِ عتیق و عہدِ جدید کے حوالوں سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مگر یہ جوابات اُن لوگوں کے لئے کافی نہ تھے جو توریت و انجیل کو نہیں مانتے یا بالکل قیدِ مذہب سے آزاد ہیں اس لئے ضرور تھا کہ معراج کے سوال پر محققانہ بحث کی جائے اور معراج کی حقیقت جو قرآن و حدیث سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے اُس کو ظاہر کیا جائے۔ سرسیّد نے اس مسئلے پر اپنی تفسیر کے ۲۴ صفحوں میں نہایت بسط کے ساتھ بحث کی ہے مگر ہم اس موقع پر صرف اُس کا لُبِ لباب بیان کریں گے جن کو تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ اصل تفسیر کو ملاحظہ کریں۔

انھوں نے اُن تمام روایتوں میں سے جو معراج کے متعلق حدیث اور سیر کی کتابوں میں قلمبند کی گئی ہیں، غالباً کوئی روایت باقی نہیں چھوڑی اور چونکہ ان روایتوں میں اس قدر اختلاف ہے کہ شاید

ہی کسی اور مضمون کی روایت میں ایسا اختلاف ہوگا، اس لئے معراج کے تمام جزئیات کے متعلق جس قدر اختلاف ہیں اُن سب کو اوّل جدا جدا بیان کیا ہے مثلاً اس بات میں اختلاف کہ معراج کب ہوئی؟ یا یہ کہ معراج اور اسراء (جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا ہے) ایک واقعہ تھا یا دو جُداگانہ واقعات تھے؟ یا معراج ایک دفعہ ہوئی یا دو دفعہ؟ یا معراج جسد کے ساتھ بیداری میں ہوئی یا روح کے ساتھ رؤیا میں؟ غرض اسی قسم کے بے شمار اختلافات جو روایاتِ متعلّقہ واقعۂ معراج میں پائے جاتے ہیں اُن سب کو مع ہر ایک روایت کے بیان کیا ہے۔ پھر ان اختلافات کے اسباب اور وجوہ جو قرینِ قیاس تھے، بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اِس بات کا ثبوت دیا ہے کہ معراج اور اسراء درحقیقت ایک ہی واقعہ تھا اور وہ ابتدا سے اخیر تک روح کے ساتھ اور خواب کی حالت میں واقع ہوا تھا اور اس دعوے پر پانچ دلیلیں لکھی ہیں جن میں سے پہلی دلیل گویا اس شبہ کا جواب ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت جس میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک جانا بیان ہوا ہے اُس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو خواب میں جانے پر دلالت کرتا ہو۔ سو اس کے جواب میں انھوں نے سورۂ یوسف کی یہ آیت کہ "اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا" اور صحیح مسلم کی چند حدیثیں پیش کی ہیں جن میں کوئی لفظ خواب پر صراحۃً دلالت نہیں کرتا حالانکہ سب کے نزدیک اُن میں خواب کا بیان ہے۔ دوسری دلیل میں سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت پیش کی ہے وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ (یعنی ہم نے نہیں کر دانا اُس خواب کو جو تجھے دکھلایا مگر ایک امتحان لوگوں کے لئے)، قطعِ نظر اس کے کہ یہ آیت اُسی سورۂ بنی اسرائیل میں واقع ہوئی ہے جس میں اسراء کا ذکر ہوا ہے، صحیح بخاری سے دو حدیثیں عبد اللہ ابن عباس کی نقل کی ہیں جن میں صاف صاف اس بات کی تصریح ہے کہ جس رویا کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہی رویا ہے جو رسولِ خدا صلعم کو لیلۃ الاسراء میں دکھایا گیا۔ تیسری دلیل میں بخاری اور مسلم سے مالک ابن صعصعہ اور انس ابن مالک کی روایتیں نقل کی ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ معراج کے وقت آپ سوتے تھے چوتھی دلیل یہ لکھی ہے کہ منجملہ صحابہ کے معاویہؓ، حسنؓ، حذیفہ بن الیمان اور حضرت عائشہؓ کا یہ مذہب تھا کہ معراج خواب میں واقع ہوئی ہے نہ بیداری میں، پانچویں دلیل موافق اصولِ علمِ حدیث کے یہ لکھی ہے، کہ جب عقل اور نقل میں بظاہر اختلاف پایا جائے تو نقل کے معنی اس طرح بیان کرنے چاہئیں جو عقل کے مطابق ہوں اور بڑے بڑے علماء مثل امام سخاوی، ابن جوزی، ابوبکر بن الطیب وغیرہم کے

اقوال اس باب میں نقل کئے ہیں کہ حدیث کے موضوع ہونے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اُس کا مضمون عقل یا حس اور مشاہدے کے خلاف ہو اس دلیل کے ذیل میں ایک لطیف بحث اس مضمون پر کی ہے کہ حدیثیں جو کتبِ احادیث میں جمع کی گئی ہیں اُن کے الفاظ بعینہٖ رسولِ خدا صلعم کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ راویوں کے الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنی سمجھ کے موافق بیان کئے ہیں اور اس کے ثبوت میں تابعین و تبع تابعین کے اقوال نقل کئے ہیں جن میں سے حسن اور سفیان ثوری کا یہ قول ہے کہ اگر ہم حدیث اُسی طرح بیان کرنی چاہیں، جس طرح سُنی ہے تو ایک حرف بھی نہ بیان کرسکیں۔ غرض کہ اس مطلب کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ معراج کی حدیثوں میں جس قدر واقعات عقل کے خلاف پائے جاتے ہیں ضرور ہے کہ اُن کی تاویل عقل کے مطابق کی جائے نہ یہ کہ جن روایتوں سے معراج کا خواب میں ہونا پایا جاتا ہے اُن کو تاویلاتِ بعیدہ اور رکیکہ اور دلائلِ فرضیہ دُور از کار سے ایسا واقعہ بنا دیا جائے جو حقیقت اور عقل دونوں کے خلاف ہو۔

تیسری خصوصیت تیسری خصوصیت اس تفسیر کی یہ ہے کہ اس میں برخلاف قدیم تفسیروں کے روایات کی طرف بغیر سخت ضرورت کے بہت ہی کم رجوع کیا گیا ہے۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری قدیم تفسیریں باتفاق تمام محققین اہل اسلام کے عموماً بے سند اور موضوع و ضعیف حدیثوں اور یہودیوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں، اور اُس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جس قدر روایتیں تفسیر القرآن کے متعلق صحاح میں وارد ہوئی ہیں اگر اُن سب کو بعد حذفِ اسناد کے ایک جگہ جمع کیا جائے تو تمام مجموعہ معدود صفحات سے زیادہ نہ ہوگا حالانکہ کتبِ تفاسیر کی روایتوں اور قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو کم سے کم ایک ضخیم جلد مرتّب ہو سکتی ہے۔

اگرچہ روایات کے باب میں مفسرین کی بے احتیاطی اور عدمِ مبالات قدیم زمانے میں بھی قابل الزام تھی لیکن اس زمانے میں، جب کہ ہر مذہب پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے کی ہر شخص کو آزادی اور الحاد و دہریت کا ہر طرف زور شور ہے، ایسی روایتوں اور قصوں اور سوپر نیچرل افسانوں کو تفسیروں میں درج کرنا صرف یہی نہیں کہ اسلام کو مخالفین کے اعتراضوں کا نشانہ بناتا ہے بلکہ خود مُسلمان نوجوانوں کو جو اس زمانے کے علوم کی تعلیم پاتے ہیں اسلام سے بدگمان بلکہ متنفر کرنا ہے۔

چوتھی خصوصیت چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس تفسیر میں برخلاف اکثر قدیم تفسیروں کے ہر ایک آیت کی تفسیر کے متعلق تمام اقوالِ مختلفہ نقل کر کے ناظرین کے ذہن کو پریشان نہیں کیا گیا، بلکہ جو قول راجح معلوم ہوا صرف اُس کو ذکر کیا گیا ہے اور باقی مرجوح اقوال کو یا تو بالکل ذکر نہیں کیا اور یا بالشرطِ ضرورت ہر ایک قول میں جو کمزوری یا ضعف دیکھا اُس کو بھی بیان کر دیا ہے۔ آج کل ایسی تفسیریں، جن میں قرآن کے معنی معیّن نہیں کئے جاتے اور ایک ایک آیت یا ایک ایک لفظ کی شرح میں متعدد خیالات اور مختلف اقوال نقل کئے جاتے ہیں، اُن لوگوں کے دل میں، جو مذہب کو موروثی چیز نہیں سمجھتے اور تقلید کی قید سے آزاد ہیں بجائے اس کے کہ مفسّر کے تبحّر اور احاطۂ علمی کا نقش جمائیں ممکن ہے کہ دوسری قسم کے خیالات پیدا کریں اور جس کتاب کی نسبت خدا نے یہ فرمایا تھا کہ "لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" اُس میں بے شمار اختلافات دیکھ کر طرح طرح کے شکوک و شبہات میں پڑ جائیں۔ پس اس وقت زمانے کا اقتضا ہرگز یہ نہیں کہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں متعدد اقوال اور مختلف رائیں بیان کر کے اُن کو اُسی طرح غیر منفصل چھوڑ دیا جائے اور قرآن کے معنی معیّن نہ کئے جائیں۔

پانچویں خصوصیت پانچویں سب سے بڑی اور معرکۃ الآرا خصوصیت اس تفسیر کی جیسا کہ پہلے حصّے میں مذکور ہو چکا ہے، یہ ہے کہ اسلام میں جہاں تک کہ معلوم ہے سب سے پہلی کوشش اُن شبہات کو رفع کرنے کے لئے جو علومِ جدیدہ کی تعلیم سے قرآنِ مجید کے بعض مضامین کی نسبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو سکتے تھے، اس تفسیر میں کی گئی ہے۔ اس باب میں جو کوشش بلیغ سرسیّد نے کی ہے، اس کا پورا پورا اندازہ بغیر اس کے کہ اُن کی تفسیر کو اوّل سے آخر تک دیکھا جائے، کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ مگر چوں کہ اُس میں بمقابلہ علومِ جدیدہ کے ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور صدہا مقامات میں جمہورِ مفسّرین سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اصول کے موافق بیان کئے گئے ہیں اِس لئے ممکن نہیں کہ مفسّر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں، لیکن ایسے مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی زائل نہیں ہو سکتی بلکہ انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ اگر تمام تفسیر میں ایک آیت کے معنی بھی اسلوبِ قرآن اور اصولِ عربیّت کے موافق ایسے بیان کئے گئے ہوں جن کی رُو سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پہ وارد ہوتا ہے، یقیناً رفع ہوتا ہو تو گو وہ معنی تیرہ سو برس میں کسی مفسّر نے نہ لکھے ہوں، بلاشبہ تسلیم کرنے کے قابل ہیں۔

اگرچہ ہمارا ارادہ جیسا کہ دیباچے میں اشارہ کیا گیا ہے، اس تفسیر کی مذکورہ بالا خصوصیت پر مفصل بحث کرنے کا تھا لیکن چوں کہ یہ بحث بہت طولانی ہے جس کی ایک بائیوگرافی متحمل نہیں ہوسکتی اس کے سوا عام ناظرین کو اس مضمون سے چنداں دلچسپی بھی نہیں ہوتی اس لئے جو کچھ اس کے متعلق ہم نے لکھا ہے یا آئندہ لکھیں گے اُس کو کسی بادفعت میگزین کے متعدد نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا۔

ریفارمیشن اور اُس کا منشا

ظاہر ہے کہ سرسید نے اپنی تصنیفات اور عام تحریروں اور پبلک اسپیچوں کے ذریعے سے اور نیز خود مثال بن کر قوم کے پولٹکل اور سوشل خیالات اور خاص کر اُردو لٹریچر میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے اور اس لئے اُن کو قوم کا پولٹکل اور سوشل لٹریری ریفارمر کہا جا سکتا ہے، لیکن اس مقام پر ریفارمیشن سے ہماری مراد قوم کے مذہبی خیالات کی اصلاح ہے جو فی الواقع ایک نہایت سخت و دشوار کام تھا اور جس کی وجہ سے اُس قوم کے فدائی کو کافر دجّال ملحد اور مرتد سب کچھ کہا گیا۔

اگرچہ سرسید کا اصل مقصد مسلمانوں کی پولٹکل اور سوشل حالت کا درست کرنا تھا لیکن چوں کہ مسلمان اپنے مذہب کو ہمیشہ سے دین اور دنیا دونوں کا رہبر سمجھتے رہے ہیں اور کسی بات کو خواہ دینی ہو خواہ دنیوی، جب تک کہ اُس کا ثبوت مذہب کی رُو سے نہ دیا جائے تسلیم نہیں کرتے اور نیز مسلمانوں کی پولٹکل حالت کو بہت کچھ تعلق اُن کے مذہب کے ساتھ تھا، اس لئے سرسید کو ۱۸۵۷ء کے بعد سے اخیر دم تک برابر مذہبی مباحث میں مشغول رہنا پڑا۔

اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح ہر مذہب میں جس قدر کہ بانیٔ مذہب کا زمانہ بعید ہوتا جاتا ہے اُسی قدر بہت سی باتیں جن کو اصل مذہب میں چنداں دخل نہیں ہوتا داخل ہوتی جاتی ہیں اسی طرح دینِ اسلام میں رفتہ رفتہ بہت سے امور ایسے شامل ہو گئے جو درحقیقت دین کی ذاتیات سے خارج تھے، مثلاً اصولِ عقائد میں صدہا مسائل ایسے داخل کر دیئے گئے جن کا صدرِ اسلام میں کہیں پتہ نہ تھا مگر اب وہی علم جس میں ان مسائل پر بحث کی جاتی ہے منجملہ علومِ دینیہ کے ایک نہایت مہتم بالشان علم، موسوم بہ علمِ کلام، سمجھا جاتا ہے۔ یا مثلاً فروع میں بے شمار جزئیات جن کی بنیاد محض قیاس پر ہے، مثل

نصوصِ کتاب و سُنّت کے واجب التسلیم سمجھی جاتی ہیں۔ مفسّرین کی روایتیں اور اُن کے اقوال جو انھوں نے آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں بیان کئے ہیں، وہ بھی مثل آیاتِ قرآنی کے واجب الاذعان مانے جاتے ہیں۔ اصولِ فقہ جو بڑھتے بڑھتے ایک وسیع علم بن گیا ہے، وہ بھی دینیات میں ایک نہایت ضروری علم شمار ہوتا ہے۔ جس قدر رطب و یابس روایتیں اور بے سرو پا قصّے کتبِ تفسیر و سلوک و سیر میں درج کئے گئے ہیں وہ سب بغیر اس کے کہ ان کو اصولِ تنقید کے موافق جانچا جاتے رسولِ خدا صلعم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں صحاح میں جو حدیثیں اُمّت کی اصلاحِ معاش سے علاقہ رکھتی ہیں اور جن کی نسبت آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "انتم اعلم باموردنیاکم" وہ بھی اُن حدیثوں کی طرح جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہیں تعلیم دین میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس کے سوا جب متعدد فرقے اسلام میں پیدا ہو گئے تو بہت سے خیالات دور از کار اپنے اپنے مذہب کی طرفداری اور تعصّب کی وجہ سے ہر مذہب کے اجزائے غیر منفک بن گئے۔ پھر جہاں اسلام پُہنچا اُن ملکوں کی اکثر رسمیں اور رواجات اور اوہام شدہ شدہ مذہب کے رنگ میں رنگے گئے اور اس طرح اسلام جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ "الدین یسر" ایک دفترِ بے پایاں کا نام جو دائرۂ حصر و احصا سے خارج ہے، قرار پا گیا اور ان تمام حشو و زوائد کا اصل دین سے جدا کرنا ایسا ہی مشکل ہو گیا جیسا گوشت کا ناخن سے جدا کرنا۔ اگرچہ علمِ کلام، علمِ فقہ، اصولِ فقہ اور تفسیر مسلمانوں کے لئے سرمایۂ افتخار اور قوم کی اعلے درجے کی دماغی اور ذہنی قابلیت کے نہایت روشن ثبوت ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ دینِ اسلام کو اُن سے بے انتہا مدد پہنچی ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دینیات میں اُن کو کتاب و سنّت کے برابر درجہ دیا جاتے ورنہ ضرور ہے کہ عربی صرف و نحو و معانی و بیان و لغت کو بھی دینیات میں وہی درجہ دیا جائے جو علوم مذکورہ بالا کو دیا گیا ہے، کیوں کہ اسلام کو ان علوم سے بھی کچھ کم مدد نہیں پہنچی۔

اگرچہ اسلام کے ہر طبقہ اور ہر دور میں ایسے آزاد طبع روشن ضمیر لوگ ہمیشہ اُٹھتے رہے ہیں جنھوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر میدانِ تحقیق میں قدم رکھا ہے اور بڑے بڑے مہتم بالشان مسائل کے متعلق مذہبِ جمہور کی غلطیاں ظاہر کی ہیں، لیکن چوں کہ وہ زمانہ اسلام کی حکومت اور مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا تھا اور معترضینِ اسلام کی زبانیں آج کل کی طرح کھلی ہوئی نہ تھیں لہٰذا جو ضرورتیں اسلام کو موجودہ زمانے میں پیش آئیں اُن سے وہ بزرگ بالکل بے خبر تھے۔ اس کے سوا ممالکِ اسلامیہ میں علمائے اسلام کو یہ آزادی نہ تھی کہ بادشاہِ وقت کے مذہب کے خلاف کوئی بات بیباکانہ زبان سے نکال سکیں۔ اس لئے علمائے سلف میں کسی ایک شخص

نے عام اصلاح کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ کسی نے احادیث کی تنقید کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور اُن کے جانچنے کے قواعد مقرر کئے، کسی نے شرائع اور مصالح میں تفرقہ کیا اور جو حدیثیں شرایع سے متعلق تھیں اُن کے لئے الگ اور جو مصالح سے متعلق تھیں اُن کے لئے الگ درجہ قرار دیا، کسی نے تقلید کی بندشوں کو توڑا، کسی نے اجماع اور قیاس کے حجت ہونے سے انکار کیا، کسی نے آیاتِ متشابہات میں تاویل کرنے کی راہ کھولی، کسی نے مفسّرین و واعظین کے بے سروپا قصوں اور بے سند روایتوں کی بے اعتباری ظاہر کی، کسی نے آیاتِ منسوخہ کو جن کی تعداد پانسو تک پہنچ گئی تھی بلکہ حصر و احصا سے خارج ہو گئی تھی، بیس سے بھی کم میں محدود کیا، کسی نے متکلّمین کے منطقیانہ استدلالات و توجیہات کو جو کہ وہ اپنے مذہب کی نصرت و حمایت کے لئے آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں کرتے تھے مقصدِ شارع کے خلاف ثابت کیا، کسی نے تعمّق و تشدّد پر رد و قدح کی، کسی نے شرک و بدعت کے استیصال پر کمر باندھی اسی طرح مختلف زمانوں میں خاص خاص خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہی، مگر عام طور پر کسی کو اس بات کے کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ خالص اسلام کی تعلیم قرآنِ مجید اور حدیثِ صحیح میں منحصر ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ اسلام کی حقیقت سے خارج ہے۔ نہ اسلام اُس کا جوابدہ ہے اور نہ مسلمان اُس پر اعتقاد رکھنے کے مکلّف ہیں۔

سرسیّد نے، اگر غور کر کے دیکھا جائے، تو شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جو صداقتیں اہلِ اسلام کی تصنیفات میں فرداً فرداً صرف ضبطِ تحریر میں آئی تھیں اور اکابر علماء کے سوا اُن سے کسی کو اطلاع نہ تھی، سرسیّد نے اُن سب کو ایک ہی بار خاص و عام پر علی الاعلان ظاہر کر دیا کیوں کہ جو ضرورتیں اس وقت خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھیں وہ کسی خاص خرابی کی اصلاح سے رفع نہیں ہو سکتی تھیں۔ مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان سے جا چکی تھی اور قومی تعصّبات، جو بعد سلبِ حکومت کے مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ ایک مدت تک ضرور باقی رہتے ہیں، مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کر رہے تھے جس سے حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا اور اُن کا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں سے جو بُری بات سرزد ہوتی تھی وہ اُن کے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ فقہا کے فتوے جو مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے مانع تھے، اکثر انھیں قومی تعصّبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمان اُن کو وحیِ مُنزل کی طرح دل و جان سے قبول کرتے تھے۔ عیسائی مشنری مسلمانوں کی سیر اور تاریخ کی کتابیں اور اُن کی تفسیریں دیکھ دیکھ کر اسلام اور بانیٔ اسلام پر اعتراض کرتے تھے اور اسلام کو اُن کا جوابدہ سمجھ کر مسلمانوں سے جواب طلب کرتے تھے۔

تعلیم یافتہ مسلمان بہت سی باتیں مروجہ اسلام میں سائنس کے خلاف دیکھ کر اسلام کی خالص تعلیم سے ، جو کتاب و سنّت میں منحصر ہے ، بد اعتقاد ہونے لگے تھے اور یہ تمام حالات اس بات کے مقتضی تھے کہ خالص اسلام میں اور اُن چیزوں میں جو اسلام میں بل جُل کر اُس کی ذات میں داخل ہو گئی ہیں امتیاز قائم کیا جائے اور جو مشکلات اس اختلاط اور امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ سرسیّد نے اپنی ریفارمیشن میں اُن اصول سے جن پر قدیم محققین کی اصلاحیں مبنی تھیں، بہت ہی کم تجاوز کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ زمانۂ حال کی ضرورتوں کے اقتضا سے قدیم اصلاحوں میں خود بخود ایک قسم کی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خبر متواتر اور خبر مشہور کے سوا جن کی تعداد کتبِ احادیث میں نہایت قلیل ہے، جو حدیثیں خبرِ احاد کہلاتی ہیں اور جن سے صحاح ستہ اور تمام احادیث کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ مفید یقین نہیں ہیں، بلکہ اُن میں احتمال صدق اور کذب کا باقی ہے۔ اور اس اصول سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خبرِ واحد، بشرطیکہ صحت کے درجے کو پہنچ جائے، اُس پر صرف عمل کرنا واجب ہے مگر اُس پر اعتقاد رکھنا ضرور نہیں، اور بعض کے نزدیک عمل اور اعتقاد دونوں ضرور نہیں۔ سرسیّد نے اس نتیجہ کو زیادہ وسیع کر دیا ہے، اُن کی یہ رائے ہے کہ جب خبرِ واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ جس خبرِ واحد کی رُو سے اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو خواہی نخواہی اُس خبر کو تسلیم کر لیا جائے اور بعد تسلیم کرنے کے اُس اعتراض کے جواب میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ خبرِ واحد مفید یقین نہیں اور اس لئے جو اعتراض اُس کی رو سے وارد ہوتا ہے اسلام اُس کا جوابدہ نہیں ہے۔

یہ رائے صرف سرسیّد ہی کی نہیں بلکہ اُن سے پہلے بھی علمائے اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے۔ امام رازی سے فرقۂ حشویہ کے ایک شخص نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت کی کہ "ما کذب ابراھیم الا ثلاث کذبات" (یعنی ابراہیم نے صرف تین جگہ جھوٹ بولا ہے) امام نے کہا "بہتر ہے کہ ایسی روایتیں قبول نہ کی جائیں" اُس نے بطور تعجب کے کہا "اگر ہم اس روایت کو قبول نہ کریں تو راویوں کی تکذیب لازم آئے گی۔" امام نے کہا "اے مسکین اگر ہم قبول کر لیں تو ہم کو ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت کرنی پڑتی ہے اور اگر اُس کو نہ مانیں تو راویوں کی طرف جھوٹ کو منسوب کرنا ہوگا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ابراہیم کو جھوٹ سے بچانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ چند مجاہیل کو جھوٹ سے بچایا جائے۔"

یا مثلاً اوّل اوّل سلفِ صالح آیاتِ متشابہات کی تاویل بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے پھر جب یونانی فلسفے

کا اسلام میں رواج ہوا اور آیاتِ متشابہات کے ظاہری معنوں پر، جو کہ علمائے اسلام بیان کرتے تھے، ملاحدہ اور مخالفینِ اسلام نکتہ چینی کرنے لگے تو علما کو متشابہات کی تاویل کرنی پڑی۔ مگر نہایت محدود آیتیں تھیں جن کے حقیقی معنوں پر اُس زمانے کے لوگ اعتراض کرتے تھے، اس لئے صرف وہی آیتیں مجازی معنوں پہ محمول کی گئیں۔ اب چوں کہ زمانہ علم و حکمت کی ترقی کا ہے اس لئے سرسیّد نے تاویل کو انھیں آیتوں میں محدود نہیں رکھا بلکہ اور بہت سی آیتوں کو جیسا کہ دوسری جگہ ہم نے مفصّل بیان کیا ہے مجاز و استعارہ و تمثیل پہ محمول کیا ہے۔

یا مثلاً آیاتِ منسوخہ کی تعداد پہلے پانسو سے بھی زیادہ مانی جاتی تھی۔ پھر، جیسا شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں لکھا ہے، سیوطی وغیرہ نے اُن کو بیس۲۰ میں محصور کیا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے نسخ کو صرف پانچ آیتوں میں محدود کر دیا۔ سرسیّد نے جب دیکھا کہ آیاتِ منسوخہ کی تعداد پانسو سے گھٹتے گھٹتے پانچ تک پہنچ گئی تو اُن کو یقین ہوگیا کہ قرآن مجید میں نسخِ حقیقی بالکل واقع نہیں ہوا اور قرآن کی جس آیت سے مفسّرین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ قرآن کی آیتیں ایک دوسرے کی ناسخ و منسوخ ہیں، اُس آیت کا سیاق و سباق، جیسا کہ خطباتِ احمدیہ میں مفصّل مذکور ہے صاف دلالت کرتا ہے کہ وہاں نسخ سے مراد شرائعِ سابقہ کا قرآن سے منسوخ کرنا ہے نہ کہ قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا۔ پس عیسائیوں کا اعتراض جو کہ وہ مسلمانوں کے مسئلۂ نسخ پہ کرتے ہیں، قرآنِ مجید پہ وارد نہیں ہوتا۔

یا مثلاً اگلے محققین نے فروع میں تقلیدِ شخصی کو اس بنا پہ ضروری نہیں سمجھا کہ حق چاروں مذہبوں میں دائر ہے مگر سرسیّد جس طرح تقلید کو فروع میں ضروری نہیں سمجھتے اسی طرح اصول میں بھی نہیں سمجھتے کیوں کہ جس بنا پہ حق چاروں مذہبوں میں دائر سمجھا گیا ہے اُسی بنا پہ اُس کو اشاعرہ اور معتزلہ اور دیگر فرقِ اسلامیہ میں بھی دائر سمجھنا ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے انھوں نے اکثر اصولی مسائل میں معتزلہ کی پیروی کی ہے۔ اس رائے میں بھی سرسیّد منفرد نہیں بلکہ اگلے محققینِ اہلِ سنّت نے بھی اکثر مسائل میں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کیا ہے چنانچہ اسی اختلاف کے سبب جب امام غزالیؒ پر لے دے ہوئی تو انھوں نے ایک رسالہ موسوم بہ "تفرقہ بین الاسلام والزندقہ" لکھا جس میں اپنے مخالفوں کی نسبت لکھتے ہیں کہ "وہ مذہبِ اشاعرہ سے الگ ہونے کو گو کہ وہ بالشت بھر ہی کیوں نہ ہو، اور اُن کے خلاف کرنے کو، گو کہ وہ ذرا سی چیز ہی میں کیوں نہ ہو، گمراہی جانتے ہیں۔" مگر چونکہ امام غزالیؒ کے وقت میں سلطنت کی طرف سے علماء کو پوری مذہبی آزادی نہ تھی اس لئے انھوں نے چند جزوی باتوں کے سوا اشاعرہ کے اصول سے اختلاف نہیں کیا۔ لیکن سرسیّد بلا قید جس مسئلے میں اختلاف کی ضرورت سمجھتے ہیں اشاعرہ کے اصول سے اختلاف کرتے ہیں...

الغرض سرسیّد کی اصلاحات کو جہاں تک دیکھا جاتا ہے اُن میں بہت ہی کم اصلاحیں ایسی ہوں گی جن کی اصل محققینِ اہلِ اسلام کی تصنیفات میں موجود نہ ہو۔ البتہ اگلے محققین کی اصلاحیں اُسی حد تک محدود رہیں جہاں تک کہ اس زمانے کی حالت اور ضرورت مقتضی تھی اور سرسیّد کی اصلاحات میں موجودہ زمانے کی حالت اور ضرورت کے موافق زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

سرسیّد کی ریفارمیشن کا منشاء جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں، یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اسلام میں ایک نیا فرقہ قائم کریں اور خود اُس فرقے کے سرگروہ بنیں۔ وہ جس طرح نبی کے سوا کسی امام یا مجتہد یا اور کسی اُمتی کے مقتدا بنانے کو شرک فی النبوۃ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اسی طرح خود کسی فرقے کا مذہبی پیشوا بننے کو اشتراک فی النبوۃ سمجھتے تھے چنانچہ لاہور میں جو انھوں نے اسلام پر لکچر دیا تھا اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "میری یہ خواہش نہیں ہے کہ کوئی شخص، گو وہ میرا کیسا ہی دوست ہو، میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جس کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسولِ خدا محمّد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر جن کا ازلی مذہب خدا ابدالآباد تک قائم رکھے (اور ضرور قائم رکھے گا۔ کیوں کہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے) ختم ہو گیا۔" پس اُن کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ لوگ اُن کی پیروی کریں اور اُن کو اپنا مذہبی پیشوا جانیں، بلکہ اُن کی ریفارمیشن کا اصل مقصد صرف مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے موانع کو دور کرنا اور عیسائی قوموں کے اس اعتراض کو دفع کرنا تھا کہ "اسلام ترقی اور شائستگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔" اور چوں کہ اس زمانے میں مغربی تعلیم کے سوا کوئی ذریعہ دنیوی ترقی کا نہیں ہے اس لئے جو شبہات مغربی تعلیم سے اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ممکن تھے اُن کا رفع کرنا بھی ضرور تھا۔ پس یہی دو مقصد تھے جن کے لئے سرسیّد کو مذہبی مباحث میں پڑنا اور بہت سی باتوں میں جمہور سے اختلاف کرنا پڑا۔

سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم نے ایک کونسل علما اور عقلا کی اس امر کی تحقیقات کے لئے منعقد کی تھی کہ دینِ اسلام دنیوی ترقی کا مانع ہے یا نہیں؛ کونسل نے اپنی تحقیقات کے بعد جو رپورٹ لکھی اُس کا ماحصل یہ تھا کہ "اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جو دنیوی ترقی کی مانع ہو، مگر مسلمانوں کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانے میں مفید تھیں. مگر حال کے زمانے میں نہایت مضر ہو گئیں چھوڑنا ضرور ہے۔" ظاہر ہے کہ کونسل

نے جو کچھ اسلام کی نسبت لکھا وہ بالکل قرآن[1] اور حدیث کے مطابق تھا بلکہ ہمارے نزدیک صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے کہ باوجود اُس کی سخت پابندی کے انسان دنیوی ترقی اور شائستگی کو کمال کے درجے تک پہنچا سکتا ہے۔ بخلاف دیگر مذاہب کے، جن سے دست بردار ہوئے بغیر ترقّی کے میدان میں ایک قدم نہیں رکھا جا سکتا: لیکن اگر کونسل سے پوچھا جاتا کہ وہ کون سی رسوم و عادات ہیں جن کے چھوڑنے کے بعد مسلمان اپنے موجودہ مذہب کے موافق ترقی کی دوڑ میں شریک ہو سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب دینا نہایت مشکل تھا۔ سرسید نے یہی مشکل کام اپنے ذمّہ لیا تھا اور جو مشکلات اُن کو اِس کام میں پیش آئیں وہ عنقریب کسی قدر اختصار کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔

سرسیدؔ کی نسبت یہ اعتراض اکثر سُنا گیا ہے کہ مصلح یا مجدّدِ مذہب ایسا شخص کیوں کر ہو سکتا ہے جو علومِ مُروّجۂ اسلام میں متوسط درجے سے بھی کم درجہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ اعتراض اُس شخص کی نسبت زیادہ موزوں ہو سکتا ہے جو علومِ مُروّجۂ اہلِ اسلام میں کمال حاصل کرنے کے بعد مصلح یا مجدّدِ مذہب بننے کا دعویٰ کرے۔ انسان جس مذہب کی سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اُس مذہب کے ساتھ اُس کو قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ پھر جب اُسی مذہب کی تعلیم پاتا ہے تو وہ روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ تعلیم کمال کے درجے کو پہنچ جاتی ہے تو اُس مذہب کی تقلید اور اُس کا تعصّب اُس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور کسی بات میں خود غور اور تحقیق کرنے کی مطلق قابلیّت باقی نہیں رہتی۔ اگر مثلاً حنفی مذہب کی تعلیم اُس کو ہوئی ہے تو اُس کے دل میں کبھی بھُول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس مذہب میں کوئی غلطی ہو گی۔ یہ اصول بھی کہ حق چاروں مذہب میں دائر ہے محض تقلیداً مانتا ہے کیونکہ عملاً حنفی مذہب کے ایک مسئلے میں بھی غلطی کا ہونا اس کے نزدیک محال معلوم ہوتا ہے۔ باوجودیکہ بخاری کو اصح الکتب بعد کلام اللہ جانتا ہے مگر بیسیوں حدیثیں جو اُس میں صریح حنفی مذہب کے خلاف ہیں اُن کو قابلِ عمل نہیں سمجھتا۔ ایسا شخص بلاشبہ کسی مذہب کا مصلح یا مجدّد نہیں ہو سکتا بلکہ یہ منصب اُس شخص کا ہے جو حق و باطل اور خطا و صواب میں تمیز کر سکتا ہے، ہر ایک امر پر غور کرتا ہے اور جو بات صحیح جانتا ہے پھر جب اُس میں غلطی معلوم

---

[1] خدا تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" اور رسولِ خدا صلعم نے فرمایا انما بُعثتم مُبشّرین ولم تُبعثوا مُعسّرین اور فرمایا الدین یُسر" اور ابو موسیٰ اور معاذ بن جبل کو جب یمن میں بھیجا تو یہ نصیحت کی "یسّروا ولا تعسروا"۔

ہوتی ہے تو اُسی بات کو غلط قرار دیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ غلط بات کو صحیح اور صحیح بات کو غلط سمجھ جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس بات کو غلط جانے اس کو دُنیا کی شرم یا اعتراض کے خوف سے صحیح کہے جائے۔ مصلح یا مجدّد کو علومِ مروّجہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی اسبات کی ہے کہ حق بات کے کہنے میں لومتہ لائم سے نہ ڈرے کیونکہ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو صداقتیں محققین کی تحقیقات میں موجود ہیں اور تقلید نے اُن کی طرف سے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، اُن کو علی الاعلان ظاہر کرتا ہے۔

سرسیّد میں ابتدا سے وہ تمام خاصیتیں جو ایک مصلح یا مجدّد یا ریفارمر میں ہونی ضرور ہیں، موجود تھیں۔ اُن کی عمر کا بہت بڑا حصہ حق کی تلاش میں گذرا، کبھی صوفیّت کا رنگ چڑھا کبھی وہابیّت کا زور شور رہا، کبھی غیر مقلدی کی لے بڑھی اور آخر کو تمام جستجو اور تلاش اس نتیجے پر آکر ختم ہوگئی کہ الاسلام ھو الفطرۃ والفطرۃ ھو الاسلام۔ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسیّد کے مذہبی خیالات میں اس قدر تبدیلیوں کا ہونا اُن کے متلوّن مزاج ہونے کی دلیل ہے مگر یہ اُن کی نادانی ہے۔ حق بات تک ہمیشہ اسی طرح تدریج رسائی ہوتی ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ نے پہلے ستارے کو پھر چاند کو اور پھر سورج کو اپنا رب سمجھا تب اس نتیجے پر تک پہنچے کہ "انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین۔" محمد مصطفےٰ صلعم کو اگر وہ عقبات پیش نہ آتے جو حق تک پہنچنے سے پہلے پیش آتے ہیں تو قرآن میں آپ کی نسبت یہ ارشاد نہ ہوتا کہ "وَوَجدَکَ ضَالاًّ فَھَدٰی" جب انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہو تو اور لوگ جو طالبِ حق ہیں، جب تک کچھ دنوں اِدھر اُدھر ڈانواں ڈول نہ پھریں، کیونکر ایک ہی جست میں منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں؛ ہاں جو لوگ تقلید کے دائرے سے قدم باہر رکھنا نہیں چاہتے اور جن کا یہ قول ہے کہ "اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ" اُن کو کچھ دشواری نہیں ہے انھوں نے جس لیک پر اگلوں کو چلتے دیکھا ہے اُسی پر آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال اگر سرسیّد مشرقی تعلیم کی اُس حد سے آگے بڑھ جاتے جس پر اُن کی تعلیم آکر ٹھہر گئی تو تقلید کے پھندے سے تا زیست اُن کا چھٹکارا ہونا دشوار تھا۔ پس علوم مروّجہ کی تکمیل بجائے اس کے کہ اُن کے کام میں کچھ مدد دیتی، وہ تمام قدرتی قابلیتیں جو اُن کی طبیعت میں رکھی گئی تھیں بالکل فنا کردیتی اور جس دلیری اور آزادی سے اُنھوں نے ریفارمیشن کا کام انجام دیا، اُس کا حوصلہ اُن میں مطلقاً باقی نہ رہتا۔

وہ ایک خط میں جو انھوں نے ۱۲۸۹ھ میں سیّد مہدی علی خاں کو لکھا تھا لکھتے ہیں "میرے پیارے

مہدی! میں ہمیشہ آپ کو کہا کرتا ہوں کہ جو خراب اثر مشرقی طریقۂ تعلیم کا انسان کے دل اور طبیعت پر ہوتا ہے، اس سے آپ کبھی ایمن نہ رہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کو امیِّ محض رکھنے میں کیا حکمت تھی؟ یہی حکمت تھی کہ نیچرل فیض جو اندرونی چشموں کا جاری رہتا ہے اُس کو کوئی بیرونی چیز مزاحم نہ ہو اور جو کچھ باہر نکلے خالص بے میل ہو۔ پس ہمیشہ نیچر کے سرچشمے کے جاری رکھنے پر متوجہ رہا کریں اور جس علم کی نسبت کہا گیا ہے کہ "العلم حجاب الاکبر" اس کے پیرو ہرگز نہ ہو دیں۔"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص مذہبی خیالات کی اصلاح کا دعوےٰ کرے اُس میں مذہبی تقدس جو علمائے دین کا شعار ہے، ضرور ہونا چاہیئے۔ پس سرسید جیسا دُنیا دار آدمی، جو نماز روزہ تک کا پابند نہ ہو، اس منصب جلیل کے کیونکر لائق ہو سکتا ہے؟ سو اس اعتراض کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکے کہ مذہبی تقدس جو ہمارے علمائے دین کا شعار ہے، اگر سرسیّد کو یہ درجۂ عالی حاصل ہو جاتا تو مسلمانوں کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کرنے کی اُن کو فرصت ملنی دشوار تھی، کیونکہ اُن کی تمام عمر کسی مسلمان فرقے کا رد لکھنے اور کسی کو کافر اور کسی کو فاسق بنانے اور طبقاتِ دوزخ کے تقسیم کرنے میں گذر جاتی اور اگر بالفرض اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا سچا جوش بھی اُن کے دل میں ہوتا تو بھی وہ اس قابل نہ ہوتے کہ اسلام کی کچھ حمایت کر سکیں، یا مسلمانوں کے مصائب کا کچھ تدارک کر سکیں۔ یعنی اس بات کا سمجھنا اُن کی طاقت سے باہر ہوتا کہ اسلام اور اہلِ اسلام کو کن مشکلات کا سامنا ہے اور اُن مشکلات کا کیونکر مقابلہ ہو سکتا ہے؟ کیوں کہ مذہبی تقدس کی پہلی شرط یہ ہے کہ دُنیا اور اہلِ دُنیا کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں۔

بات یہ ہے کہ مذہبی تقدس اور مشائخ وعلماء کی زی میں رہنا اور زہاد وعباد کی سی زندگی بسر کرنا اُن لوگوں کے لئے ضرور ہے جو مذہبی پیشوا کہلاتے ہیں، جیسے واعظین جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں یا مشائخ و اہل اللہ جو تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ خود اُن صفات کا عمدہ نمونہ نہ بنیں جو اوروں میں پیدا کرنی چاہتے ہیں تو اُن سے لوگوں کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ برخلاف اُس شخص کے جو محض قوم کی اصلاحِ معاش کا ارادہ رکھتا ہو، اُن کو تنزل کے گڑھے سے نکالنا اور اُن کے تنزل کے اسباب اور ترقی کے موانع دریافت کرنے چاہتا ہو۔ حکمران قوم کو جو اُس کے ہم مذہبوں کی نسبت غلط فہمی ہو اُس کو رفع کرنا چاہتا ہو، علمی دنیا میں جو خیالات مذہب کی نسبت پھیل رہے ہوں اُن سے آگاہی حاصل کرنے کی فکر میں ہو، ایسا شخص جب تک گوشۂ عزلت سے نکل کر دُنیا کے بیچوں بیچ زندگی بسر نہ کرے اور عمر کا ایک

بہت بڑا حصہ اُس کے نشیب و فراز اور گرم و سرد کی آزمائش میں نہ گزارے اور حاکم و محکوم دونوں کے خیالات سے واقف نہ ہو وہ کیونکر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے ؟

یہی سبب ہے کہ ہمارے مقدس علما - جو دُنیا سے الگ تھلگ رہنے کے سبب دُنیا کے حالات سے بے خبر ہیں، اُن کی تحریریں جو اس آزادی اور نکتہ چینی کے زمانے میں اُنھوں نے مذہب کے متعلق لکھی ہیں یا لکھتے ہیں، وہ بجائے اس کے کہ غیر قوموں کے دل میں اسلام کی نسبت حسنِ ظن پیدا کریں اُلٹی دین کے مضحکہ کا باعث ہوتی ہیں - پس اس زمانے میں مذہبی مصلح، جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاحِ معاش اور اسلام کی حقیقت دُنیا پہ ظاہر کرنا ہو، اس شخص کے سوا جو دنیا داری کے لباس میں زندگی بسر کرے اور دُنیا کے حالات سے باخبر ہو دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ایک مصلح مذہب میں اس مشہور مقولے کے موافق کہ "اُنظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" مقتضائے عقل یہ ہے کہ بجائے افعال کے زیادہ تر اس کے اقوال کو دیکھا جائے، مع ذالک ہم سرسیّد کے افعال اور اخلاق و عادات میں وہ خوبیاں پاتے ہیں جو بڑے بڑے مشائخ و اہل اللہ میں نہیں دیکھی گئیں اور جن کو ہم آگے چل کر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔ بلاشبہ وہ آخر عمر میں بسبب فربہی مفرط اور کہن سنی کے نماز روزے کے پابند نہ رہے تھے۔ لیکن اپنے قصور کا اعتراف کرتے تھے جس کی نسبت کہا گیا ہے۔ "الاعتراف یہدم الاقتراف" حج اور زکوٰۃ کی اُن میں کبھی استطاعت نہیں ہوئی اور قرض روپیے کہ جس طرح کہ اُنھوں نے لندن کا سفر کیا اس طرح سفرِ حج کرنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔

بیسیوں عیب، جو بڑے بڑے دیندار وں اور پرہیز گاروں میں دیکھے گئے ہیں، اُن سے یہ شخص بالکل پاک تھا اور اُمّت کی خیر خواہی جس میں مخبرِ صادق نے تمام دین کو حصر کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ "اَلدِّینُ النَّصِیحَۃُ" اُس میں تمام قوم سے سبقت لے گیا تھا۔ اُس نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اس کے لئے زہد و تقدّس کی نہیں بلکہ عقل اور راستبازی کی ضرورت تھی جس کی نسبت عمر فاروقؓ نے فرمایا ہے کہ لَا تَنْظُرُوا اِلیٰ صَلٰوتِہٖ وَلَا صِیَامِہٖ وَلٰکِنْ اُنْظُرُوا اِلیٰ عَقْلِہٖ وَصِدْقِہٖ" (یعنی کسی کے نماز روزے پر نظر نہ کرو بلکہ اس کی عقل اور سچائی کو دیکھو)

مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف

سرسیّد نے جن مسائل میں علمائے سلف سے اختلاف کیا ہے وہ دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جن میں

جمہورِ علمائے اہلِ سنّت ان کے خلاف ہیں مگر محققینِ اہلِ اسلام میں سے اور لوگ بھی اُس طرف گئے ہیں۔ دوسرے وہ جن میں سرسیّد بظاہر منفرد معلوم ہوتے ہیں اور یہ دوسری قسم کے اختلافات زیادہ تر قرآن کی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہیں۔

دونوں قسم کے مذکورۂ بالا اختلافات کا منشاء، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ ہرگز نہ تھا کہ سرسیّد کوئی نیا فرقہ قائم کرنا اور خود اس فرقے کا سرگروہ بننا چاہتے تھے، بلکہ یہ تمام اختلافات محض اِس بات پر مبنی تھے کہ آج کل جو اعتراضات اسلام پر مخالفینِ اسلام کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں، یا جو شکوک و شبہات تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔ اسی لئے ہم اُن تمام اختلافات کو اس عنوان کے ذیل میں درج کرنا چاہتے ہیں مگر جن دلائل پر یہ اختلافات مبنی ہیں اُن کو سرسیّد کی تصنیفات میں دیکھنا چاہیئے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر مسئلۂ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سرسیّد نے لکھا ہے وہی صحیح ہے اور ہر ایک اختلاف میں انھیں کی رائے صائب ہے لیکن چونکہ انھوں نے موجودہ زمانے کی ضرورتوں کے موافق ایک جدید علمِ کلام کی بنیاد ڈالی ہے اس لئے جو لوگ دینِ اسلام کے دوست ہیں اور اُس کو ہر قسم کے اعتراضات اور شکوک و شبہات سے پاک جانتے ہیں اُن سے امید ہے کہ سرسیّد کے مندرجہ ذیل اختلافات کو صرف اس نظر سے کہ وہ جمہورِ علمائے اہلِ سنّت کے خلاف ہیں، ناقابلِ التفات نہ سمجھیں گے بلکہ ہر ایک اختلاف پر جو دلائل سرسیّد نے قائم کئے ہیں اُن پر نہایت بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ غور کریں گے۔ اُن کا فرض ہے کہ ہر ایک مسئلۂ مختلف فیہ کے متعلق اوّل اس بات پر غور کریں کہ جس اعتراض یا شبہ کے رفع کرنے کی غرض سے اُنھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے، وہ فی الواقع اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس کو رفع کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جمہور سے اختلاف کئے بغیر وہ اعتراض یا شبہ رفع ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تیسرے جس طریقے سے سرسیّد نے اُس کو رفع کرنا چاہا ہے اُس طریقے سے اُس کا رفع ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ امید ہے کہ اگر ان تینوں باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے گا تو اسلام کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوں گے۔

اِس وقت تمام علمی دُنیا میں مذہب کی صداقت کا معیار یہ امر قرار پایا ہے کہ جو مذہب حقائقِ موجودات اور اصولِ تمدّن کے برخلاف ہو وہ مذہب سچا نہیں ہو سکتا۔ اِس معیار نے جو نتائج مذاہب کے حق میں پیدا

کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ تمام قومیں جو علمی اور تمدّنی ترقی کی طرف متوجہ ہوئی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مذہب سے دست بردار ہوتی جاتی ہیں۔ عیسائیوں نے بائیبل کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا اور فی الواقع اگر وہ بائیبل کے احکام یا نصیحتوں پر کاربند رہتے تو ترقّی کے میدان میں اُن کا قدم رکھنا ناممکن تھا۔ برہمو سماج والوں نے دیدوں میں سے فقط ڈھائی اچھر پریم کے لیے ہیں اور باقی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ آریہ سماج والے ویدوں کا جو مطلب بیان کرتے ہیں اُس کو نہ سناتن دھرم کے ہندو تسلیم کرتے ہیں اور نہ یورپ کے بڑے بڑے سنسکرت دان اور وید کے محقّق صحیح جانتے ہیں۔ پس درحقیقت انھوں نے بھی وید سے اپنے تئیں آزاد کر لیا ہے۔ سرسیّد کا یہ دعوےٰ ہے کہ دنیا میں جتنی کتابیں الہامی مانی جاتی ہیں اُن میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں نہ کوئی چیز حقائقِ موجودات کے خلاف ہے اور نہ تمدّن اور حسنِ معاشرت کی مانع۔ پس مسلمان عالموں کا اِس بات پر غور کرنا کہ جو کچھ سرسیّد نے اسلام کی حمایت کی غرض سے لکھا ہے اُس کی اِس زمانے میں فی الواقع ضرورت تھی یا نہیں اور اگر تھی تو سیّد کی تحریرات سے وہ ضرورت رفع ہوتی ہے یا نہیں؟ کچھ کم ضروری نہیں ہے۔

اب ہم اُن اختلافات کا خلاصہ لکھتے ہیں جن میں دیگر محقّقین اہلِ اسلام بھی سرسیّد کے ساتھ شریک ہیں۔

(۱) اجماع حجّتِ شرعی نہیں ہے (۲) قیاس حجتِ شرعی نہیں ہے (۳) تقلید واجب نہیں ہے۔ (۴) قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کہ مَا نَنسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنسِہَا قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اُس کی بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے (۵) قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیّر و تبدّل واقع نہیں ہوا، وہ جس طرح اور جس قدر نازل ہوا تھا اُسی قدر زمانۂ نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیّر و تبدّل کا ہونا یا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا تواردہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع و مفتریٰ ہیں (۶) صحاحِ ستّہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو جب تک کہ اصولِ علمِ حدیث کے موافق اُن کی جانچ نہ کی جائے قابلِ وثوق نہیں سمجھنا چاہیے (۷) شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے، اُس سے کوئی وجودِ خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان میں جو نفسِ امّارہ یا قوّتِ بہیمیہ ہے وہ

مراد ہے (۸) طیورِ منخنقہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے۔
(۹) چونکہ خبرِ واحد میں احتمالِ صدق و کذب باقی رہتا ہے اس لئے جو اعتراض اخبارِ احاد کی بنا پر اسلام کی نسبت کئے جاتے ہیں اسلام اُن کا جوابدہ نہیں ہے (۱۰) سوا اُن کفار و مشرکین کے جن کا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ "انما ینہاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاہروا علیٰ اخراجکم ان تولوہم" تمام کفار و مشرکین سے دوستی و موالات کرنا جائز ہے۔ (۱۱) عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں تحریفِ لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ اُن کا اوّل سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلّم ہے۔
(۱۲) ہر شخص اُن مسائل میں، جو قرآن یا حدیثِ صحیح میں منصوص نہیں ہیں آپ اپنا مجتہد ہے (۱۳) حضرت ہاجرہؑ جو اسمٰعیلؑ کی ماں ہیں وہ، جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رقیون بادشاہِ مصر کی بیٹی تھیں اور رقیون نے اُن کو صرف تربیت کے لئے حضرت سارا کے ساتھ کر دیا تھا۔ (۱۴) وضع و لباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہے (۱۵) قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا، جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی تائید کے لئے کیا ہے، مقصدِ شارع کے برخلاف ہے کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلے کو استنباط کیا جاتا ہے، اُن آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے، ورنہ آنحضرتؐ مسئلہ مذکورہ کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضبناک ہو کر یہ نہ فرماتے کہ "ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت" (۱۶) معراج اور شقِ صدر دونوں رویا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں کیا مسجدالحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک اور کیا مسجدِ اقصیٰ سے آسمانوں تک (۱۷) اگرچہ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہے اسی طرح اُس سے بالاتر مخلوقات جس کا ہم کو علم نہیں، موجود ہو، لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوتے ہیں اُن سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خداتعالیٰ نے جو مختلف قویٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مادّے میں ودیعت کئے ہیں، جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوّتِ جذب و دفع و امثال ذالک انھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸) آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصّہ جو قرآن میں بیان

ؔ یعنی خدا تم کو منع نہیں کرتا مگر اُن لوگوں کی دوستی سے جو تم سے دین کی بابت لڑے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے پر اوروں کی مدد کی ۱۲

ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرائے میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات
اور قوتِ بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی ہے اُس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی اور بھی متعدد
تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں (۱۹) معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا (۲۰) قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی
معجزے کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے (۲۱) آیہ الذین اٰتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناء
ھم" میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے وہ، جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں آنحضرتؐ کی طرف عائد
نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ ابنِ عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویلِ قبلہ کے معاملے کی طرف
پھرتی ہے جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اُس کے بعد کیا گیا ہے (۲۲) آیۂ میراث سے وصیت کا حکم جو
آیۂ وصیت میں والدین اور دیگر ورثہ کے لئے تھا، منسوخ نہیں ہوا، پس جو وصیت وارث کے حق میں کی
جائے وہ نافذ ہے (۲۳) جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیہ "وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین"
کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں بعض دیگر علماء فدیہ کی اجازت کو خاص کر معمر لوگوں کے
لئے مخصوص سمجھتے ہیں، مگر سرسید کے نزدیک یہ حکم عموماً اُن سب لوگوں کے لئے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو،
خواہ بڈھے ہوں اور خواہ جوان - لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے (۲۴) جس ربا
یعنی سود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے اُس سے اُسی قسم کا ربا مراد ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب
میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سودخواروں اور بنیوں میں، جن کا پیشہ سودخواری ہے،
پائی جاتی ہے۔ مگر اس سے اُس منافع کی حرمت، جو پرامیسری نوٹوں پر لیا جاتا ہے ثابت نہیں ہوتی۔
اس کے سوا کسی گورنمنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لئے روپیہ قرض لے اُس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت
کا کسی رفاہِ عام کے کام کے لئے چندہ جمع کرنا، اس روپے کا سود میں لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہِ عام
کے کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔ (۲۵) قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرتِ عیسیٰؑ کا
زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہو (۲۶) شہدا کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ
ہیں، اِس سے اُن کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابلِ تقلید چھوڑنا مراد ہے نہ یہ کہ وہ
درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں (۲۷) صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے
اُس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل نرسنگھے یا سنکھ یا ترئی و قرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے
کہ جس طرح تُرہی کی آواز پر لشکر جمع ہو جاتے ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے بعث و حشر واقع ہوگا۔
(۲۸) خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے

وہ سب بطریقِ مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے جیسے بعث و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے، درحقیقت یہ (۲۹) قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے، اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ خدا تعالےٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا اور اسی لئے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلق زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ "وَمَا مَسَّنَا مِن لُغُوبٍ" کیونکہ شارع کا مقصد حقائقِ اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قدح کرنا نہیں ہے بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تمکن ہوں اُن کا زائل کرنا ہے (۳۰) قرآن میں جابجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلے سے، کسی کو ٹڈی اور دیگر حشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی عذاب سے اور کسی کو کسی عذاب سے برباد کرنا بیان ہوا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوتے تھے بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب واقع ہوتے ہیں اور انبیاء کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوتے ہیں اگر وہ خیالات مقاصدِ نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ انھیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں (۳۱) خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے نہ دل کی آنکھوں سے (۳۲) قرآنِ مجید میں جو جنگِ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اُس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا (۳۳) صفاتِ باری تعالےٰ عین ذات ہیں، نہ غیرِ ذات نہ لاعین و لاغیر جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے (۳۴) حضرت عیسیٰؑ کا بن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا (۳۵) کوئی امر عادتِ الٰہی یا قانونِ طبیعی کے خلاف کبھی وقوع میں نہیں آتا (۳۶) قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب کے من عند اللہ ہونے میں شک ہو تو اُس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ - اِس سے جیسا کہ اکثر اہلِ اسلام خیال کرتے ہیں یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم

نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرا نشین بدوؤں اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لئے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے (۳۷) نبوّت کا ملکہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "النبیّ نبیٌّ ولو کان فی بطن اُمّہٖ" وہ ماں کے پیٹ سے نبی پیدا ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قوائے فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں اسی طرح ملکۂ نبوّت بتدریج ترقی پاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اُس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اُس کا مقتضا ہوتا ہے اور جس کو عرفِ عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی لئے جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی ایلچی یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اُسی کے دل سے اُٹھتی ہے اور اُسی پر گرتی ہے (۳۸) قرآن سے جنّات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلے سے پیدا ہوتے ہیں، اور اُن میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ ثابت نہیں ہوتا (۳۹) انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قصّے جو قرآن میں بیان ہوتے ہیں اُن میں جس قدر باتیں بظاہر قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں وہ سب درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسّرین اہل اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے اُن کے معنی ایسے بیان کئے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہیں۔ (۴۰) طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اُسی قوم اور اُسی ملک میں محدود تھا جس پر حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے تھے (۴۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت کے وقت حضرتِ سارا کی عمر اُس حد کو نہیں پہنچی تھی جب کہ عادۃً اولاد کا ہونا غیر ممکن ہے۔

اگر سرسیّد کی تصنیفات کو بالاستیعاب اوّل سے آخر تک دیکھا جائے تو غالباً مذکورۂ بالا مسائل کے سوا اور مسائل میں بھی بہت سے اختلافات نکلیں گے مگر یہ سب اختلافات ایسے ہیں جن میں سرسیّد منفرد نہیں ہیں بلکہ ہر ایک مسئلے میں کم یا زیادہ لوگ اکابرِ علمائے اسلام میں سے سرسیّد کے ساتھ متفق الرائے ہیں، جیسے امام غزالیؒ، امام رازی، امام الحرمین، قاضی ابن رشد، شیخ اکبر، شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی کو اُن سب بزرگواروں کے نام اور اُن کے اقوال دیکھنے ہوں تو سرسیّد کی تصنیفات میں اور مولوی سیّد مہدی علی خاں کے مضامین میں جو زیادہ تر تہذیب الاخلاق کی سب سے پہلی جلدوں میں اور کسی قدر اخیر زمانے کی جلدوں میں شائع ہوتے ہیں، دیکھ لے۔ اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جو معجزے کو دلیلِ نبوّت نہیں سمجھتے۔

خرقِ عادت کا واقع ہونا محال سمجھتے ہیں، قرآن میں آنحضرتؐ کے کسی معجزے کا ذکر ہونا تسلیم نہیں کرتے، آیاتِ قرآنی جو بظاہر انبیائے بنی اسرائیل کے معجزات پر دلالت کرتی ہیں اُن کو ماوّل سمجھتے ہیں، عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا تسلیم نہیں کرتے، ملائکہ سے قوائے عالم اور شیطان سے انسان کی قوتِ بہیمیہ و سبعیہ مراد لیتے ہیں۔ جن کے وجود سے، جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، انکار کرتے ہیں۔ نبی پر متعارف فرشتوں کی وساطت سے وحی کا آنا تسلیم نہیں کرتے، قرآن کو محض باعتبارِ فصاحت و بلاغت کے معجزہ نہیں مانتے، شہدا کو درحقیقت زندہ اور کھاتے پیتے نہیں سمجھتے، مبدا و معاد کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اُس کو مجازی معنوں پر محمول کرتے ہیں۔ طیورِ منخنقہ اہلِ کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لئے حلال جانتے ہیں، قرآن میں نسخ کے قائل نہیں ہیں۔ غرض کہ جس قدر سرسید کے اختلافات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں اُن میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ لوگ محققینِ اہلِ اسلام میں سے سرسید کے ہم زبان نہ ہوں۔ ہاں چند اختلاف سرسید نے علمائے سلف سے ایسے بھی کئے ہیں جن میں ظاہرا وہ منفرد معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ سلف میں سے کوئی اُس طرف نہیں گیا اور وہ اختلاف یہ ہیں۔

(۱) اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لئے موقوف کر دیا ہے اور آیہ منّ و فدا جو سورۂ محمدؐ میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے (۲) دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے "الدعاء ھو العبادۃ" پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس مطلب کا جس کے لئے دعا کی جاتی ہے، حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں (۳) آیت یا آیاتِ بینات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جابجا آتے ہیں، اُن سے وہ احکام یا مواعظ و نصائح مراد ہیں جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انبیاء پر نازل فرماتے ہیں، نہ کہ معجزات جیسا کہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے (۴) حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا۔ یہ دونوں قول غلط ہیں بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لئے قرآن میں مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کے الفاظ واقع ہوئے ہیں جس سے یہ مراد ہے کہ موت مصلوب کرنے سے مقصود تھی وہ واقع نہیں ہوئی (۵) اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت کر سکے گا تو اس کو ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت نہیں ہے (۶) سارق کے لئے قطعِ ید کی سزا جو قرآن میں بیان

ہوتی ہے لازمی نہیں ہے کیوں کہ اگر لازمی ہوتی تو فقہا اُس کو مالِ مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سارق کو صرف قید کی سزا نہ دی جاتی (۷)، قرآن میں جن اور اجنہ کے الفاظ سے چھپے ہوئے یا پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے (۸) سورۂ فیل (الم ترکیف) میں جن الفاظ سے اصحابِ فیل پر ابابیل کا کنکریاں پھینکنا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرضِ چیچک سے استعارہ ہے جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرضِ چیچک عرب میں اسی سال نمودار ہوا ہے جب کہ ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی (۹) حضرت موسیٰؑ اور حضرتِ عیسےٰؑ اور تمام انبیائے سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلافِ قانونِ فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے یدِ بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا، فرعون اور اُس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰؑ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلّی کا ہونا گوسالۂ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، من وسلوےٰ کا اترنا، یا عیسےٰؑ کا گہوارے میں بولنا، خلقِ طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ، اُن کی تفسیر میں جو کچھ سرسیدؔ نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسّر نے نہیں لکھا (۱۰) قرآنِ مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے۔ ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ پس جو کلام غیر مقصود ہے اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہوسکتا مثلاً کفار کے رحمتِ الٰہی سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "لا تفتح لھم ابواب السماء" چونکہ اصل مقصود اُن کے حرماں کا بیان ہے اور اس کو اس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اس لئے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں استدلال نہ ہوسکے گا (۱۱) شریعتِ اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں ایک اصلی اور دوسرے محافظِ احکامِ اصلی، جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکامِ اصلی ہیں جن میں کوئی حکم ایسا نہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہو اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکامِ اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں۔ پس اُن کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانونِ فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں لیکن چونکہ دونوں لازم وملزوم ہیں اس لئے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے باقی جس قدر احکام اس سے متعلق ہیں مثلاً وضو اور قیام وقعود ورکوع وسجود اور استقبالِ قبلہ وغیرہ یہ سب اُس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہوسکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجالانا ضروری ہے۔

ریفارمیشن کی مخالفت

اگرچہ مذہب کے متعلق رائے ظاہر کرنے کی موجودہ گورنمنٹ کی طرف سے آزادی تھی پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اوّل تو مذہبی خیالات ایسی چیز ہیں کہ جس طرح اُن کا یقین کسی دلیل سے پیدا نہیں ہوتا اسی طرح وہ کسی دلیل سے زائل بھی نہیں ہوتا۔ اس کے سوا اسلامی سلطنتوں میں اگرچہ غیر قوموں کے مذہب سے بہت ہی کم تعرّض کیا گیا مگر خود مسلمانوں کو مذہبی آزادی جیسی کہ چاہیئے کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ جس ملک میں جو فرقہ برسرِ حکومت ہوا اُس ملک میں ہمیشہ اُسی فرقے کے مذہب نے رواج پایا۔ باقی تمام فرقے مضمحل و متلاشی ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آزادیِ رائے بالکل معدوم ہو گئی اور تقلید کی بدترین غلامی تمام قوم کا شعار بن گئی۔ پس ایک ایسی آواز جس سے کبھی کسی کے کان آشنا نہ ہوئے تھے اُس کو مسلمان کیونکر بغیر نفرت اور کراہت کے سُن سکتے تھے۔

دوسرے آزادیِ رائے ایک ایسی چیز ہے کہ جب دفعتہً کسی غیر تربیت یافتہ قوم کو حاصل ہوتی ہے تو اختلافِ آرا جو آزادی کو لازم ہے اُس قوم میں ہمیشہ مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آزادی اُن کو اختلاف کرنا سکھا دیتی ہے مگر بسبب تربیت یافتہ نہ ہونے کے وہ اختلاف اور مخالفت میں کچھ فرق نہیں کر سکتے۔ وہ جس رائے سے اختلاف کرتے ہیں اُن کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ یا اُس کو توڑ دیں یا خود ٹوٹ جائیں۔ مسلمانوں نے چونکہ انگریزی سلطنت میں آزادی کا نیا نیا سبق پڑھا ہے اس لئے جو بات اُن کی رائے یا عقیدے کے خلاف یا اُن کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اُس سے ہمیشہ ایسا اختلاف کرتے ہیں جو آخر کو منجر بہ مخالفت ہو جاتا ہے۔

ایک اور عام سبب مخالفت کا خاص کر مسلمانوں میں قومی تنزّل ہے جس کے سبب سے ہمیشہ گری ہوئی قوموں میں خود غرضی، بغض، حسد، جہالت وغیرہ خود بخود بڑھ جاتے ہیں۔ لوگ عموماً لڑائی جھگڑے مول خریدنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر مخالف پارٹیاں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی مخالفت ہے کہ اگر سرسید ریفارمیشن کا کام اختیار نہ کرتے اور مذہبی امور میں ایک حرف بھی جمہور کے خلاف زبان سے نہ نکالتے بلکہ عام انگریزی اسکولوں کے نمونے پر ایک مدرسہ قائم کر دیتے تو بھی مخالفت سے ہرگز نہ بچ سکتے تھے۔ جب ندوۃ العلما جو خاص کر دینی تعلیم اور دینی اغراض کے لئے اکثر علمائے اسلام کے اتفاق سے قائم ہوئی ہے مخالفت سے نہ بچی تو اور کسی کو اُس سے بچنے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو کوئی اسلامی انجمن، کوئی اسلامی مدرسہ اور کوئی مسلمانوں کی عام بھلائی کا کام آج کل ایسا نہیں کیا جاتا جس کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ پس سرسید کو مخالفت سے کسی طرح

مقرر تھا۔

اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات کی نسبت اُسی وقت بدگمانی شروع ہوگئی تھی جب کہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کر دیا تھا، مگر جب کہ انھوں نے "تبیین الکلام" کی پہلی جلد شائع کی تو اس بدگمانی کو زیادہ ترقی ہوئی۔ سید مہدی علی خاں جو آخر کو سرسید کی ریفارمیشن کے سب سے بڑھ کر مددگار ہوئے، اُن کو تبیین الکلام کا دیباچہ دیکھ کر ایسا جوش آیا کہ باوجود جان پہچان نہ ہونے کے اُسی جوش وخروش میں انھوں نے سرسید کے دیباچۂ مذکور کے برخلاف ایک طول طویل خط لکھ کر بھیجا۔ سرسید نے نہایت نرم الفاظ میں یہ جواب لکھا کہ "اب تقلید کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عقل وہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔" اس کے بعد جب سرسید کے پاس علی گڑھ جانا ہوا اور اُن کے مکان پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں تو دل میں خدشہ تو تھا ہی، یہ سمجھے کہ جدھر سرسید نماز پڑھ رہے ہیں یہ قبلہ کا رُخ نہیں ہے۔ جب وہ نماز پڑھ چکے تو اپنا شبہ ظاہر کیا۔ سرسید نے یہ آیت پڑھی "اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" جب اس پر خوب بحث ہوچکی تو سرسید نے کہا میں نے اس کوٹھی کو ٹھیک قبلہ رُخ بنایا ہے۔ پھر کمپاس لگا کر اُن کو اپنے کہنے کا یقین دلایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سرسید کی سچائی کا نقش اُن کے دل میں بیٹھا۔

جب سرسید نے غازیپور میں مدرسہ قائم کیا اگرچہ وہاں مسلمانوں کی طرف سے کچھ مخالفت نہیں ہوئی مگر پادریوں نے سخت مزاحمت کی اور مسٹر پیسٹ جج غازیپور اور کرنل گریہم ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کے سوا ضلع کے تمام افسر پادریوں کے طرفدار ہوگئے مگر آخر کار سرسید کامیاب ہوئے اور مدرسہ قائم ہوگیا۔

جب وہ غازیپور سے بدل کر علی گڑھ میں آئے اور سائنٹفک سوسائٹی اور اُس کا پریس بھی جو اُس وقت تک سرسید کا پرائیوٹ چھاپہ خانہ تھا اُن کے ساتھ علی گڑھ میں منتقل ہوگیا اور سوسائٹی کا مکان بھی تیار ہوگیا تو سوسائٹی نے باقاعدہ اپنا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے الفنسٹن ہسٹری آف انڈیا کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں ہونے لگا اور اُس کے اجزا چھپ چھپ کر ممبروں کو تقسیم ہونے لگے۔ مصنف نے مسلمانوں کی سلطنت ہند کا حال شروع کرنے سے پہلے جہاں اسلام کا آغاز اور عرب میں آنحضرت صلعم کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا وہاں آپ کی نسبت (عیاذاً باللہ) پیغمبر باطل کا لفظ لکھا تھا۔ اردو میں بھی اُس کا اسی طرح ترجمہ بے کم وکاست کیا گیا، مگر سرسید نے جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور اُس کے دیباچے سے اور کرنل کینڈی کی کتاب سے اور نیز تاریخ طبری سے چند مقام جن سے مصنف کے قول کی تردید ہوسکتی تھی فٹ نوٹ میں نقل کر دیئے

تھے۔ مگر اُن نوٹوں سے مسلمانوں کی ناراضی کم نہیں ہوئی۔ جب یہ حصّہ چھپ کر ممبروں کے پاس پہنچا، تو مولوی سمیع اللہ خاں نے اس امر پر کہ پیغمبر کے لفظ کے ساتھ باطل کیوں ترجمہ کیا گیا، سخت مخالفت کی اور ایک تحریر جس میں (بقول سرسیدؔ کے) اُن کے کفر و ارتداد پر اسی لفظ کے ترجمہ ہونے سے استدلال کیا گیا تھا، اخباروں میں شائع کرائی۔ اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو شخص سوسائٹی میں شریک ہو وہ کافر ہے چنانچہ اکثر مسلمان بزرگوں نے سوسائٹی کی ممبری سے استعفا دے دیا۔

اگرچہ ممکن تھا کہ ترجمے میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا مگر سرسیدؔ کا مقصد مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنا تھا کہ عیسائی اسلام اور بانیٔ اسلام کی نسبت کیا خیالات رکھتے ہیں اور اب اپنے مذہب کے طعنوں سے کان بند کر لینے کا وقت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ غیر قومیں جو کچھ اسلام کے برخلاف کہتی ہیں اُس سے اطلاع حاصل کی جائے اور اُن کی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے یا اُن کے تعصبات کی قلعی کھولی جائے۔ اخیر دم تک اُن کی یہی رائے رہی کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مسلمان مخالفوں کے اعتراضوں اور طعنوں اور بدزبانیوں سے بے خبر رہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں میں جو ایک نیٹو کرسچن نے ایک سخت کتاب موسوم بہ امہات المومنین چھاپ کر مسلمانوں کو مفت تقسیم کی تھی اکثر ذی علم مسلمانوں نے ناگواری کے سبب اُس کو فوراً جلا دیا لیکن سرسیدؔ نے اُس کی جلد بندھوا کر اُس کو اوّل سے آخر تک دیکھا اور فوراً اُس کا جواب لکھنا شروع کیا جس کو مرض الموت نے افسوس ہے کہ ختم نہ ہونے دیا۔

قبل لندن جانے سے پہلے جب انھوں نے ایک رسالہ احکامِ طعامِ اہلِ کتاب پر لکھ کر شائع کیا تو عموماً اُن کو کرسٹان کا خطاب دیا گیا اور جا بجا اس کے چرچے ہونے لگے۔ جب ولایت کے سفر میں چند روز باقی رہ گئے تو انھوں نے اس خیال سے کہ انگریزی طریقے پر کھانا کھانے سے بخوبی واقفیت ہو جائے، یہ معمول باندھ لیا تھا کہ مسٹر سمائتھ جو بنارس میں ایک سوداگر تھے اور سرسیدؔ کی کوٹھی سے اُن کی کوٹھی ملی ہوئی تھی، ایک دن شام کا کھانا یہ اُن کے گھر پر جا کر کھاتے تھے اور ایک دن وہ اِن کے گھر پر آ کر کھاتے تھے۔ سرسیدؔ کہتے تھے کہ "اتفاق سے انہیں دنوں میں مولوی سید مہدی علی خاں مرزاپور سے بنارس میں مجھ سے ملنے کو آئے۔ رات کا وقت تھا اور میرے ہاں کھانے کی باری تھی۔ ہم دونوں میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مہدی علی آ پہنچے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مولوی مہدی علی نے ایک مسلمان کو اس طرح ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا تھا۔ سخت نفرت ہوئی اور باوجود میرے ہاں مہمان ہونے کے کھانا نہ کھایا اور کہا میں کھا چکا ہوں۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس وجہ سے

کھانا نہیں کھایا میں نے کہا کہ اگر آپ کو یہ طریقہ ناپسند ہو تو دوسرا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے سوچا کہ شرعاً تو ممنوع نہیں ہے صرف عادت کے خلاف دیکھنے سے نفرت ہوتی ہے آخر قبول کر لیا اور سب سے پہلی دفعہ دن کا کھانا میرے ساتھ میز پر کھایا۔ دن تو اس طرح گذر گیا مگر رات کو یہ مشکل پیش آئی کہ رات کا کھانا مسٹر سماتیہ کے ہاں تھا میں نے اُن سے پوچھا کہ اگر آپ کو وہاں کھانے میں تامل ہو تو یہاں انتظام کیا جائے۔ انھوں نے پھر اسی خیال سے کہ شرعاً ممنوع نہیں، اقرار کر لیا کہ میں بھی وہیں کھاؤں گا۔ چنانچہ رات کو وہیں کھانا کھایا پھر ایک آدھ روز بعد مرزاپور واپس چلے گئے۔ الہ آباد میں ان کے ایک دوست کو یہ معلوم ہو گیا۔ انھوں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یہ خبر سچ ہے؟ مولوی مہدی علی نے سارا حال مفصل لکھ کر بھیجا۔ انھوں نے وہ خط بجنسہٖ ہمارے ایک نامہربان دوست کے پاس جو اٹاوہ میں رونق افروز تھے بھیج دیا۔ انھوں نے تمام شہر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ مہدی علی کرسٹان ہو گئے۔ مولوی صاحب کے گھر کے پاس ہی ایک پینٹھ لگا کرتی تھی ہمارے شفیق نامہربان نے اُس گنوار دل میں جا کر خط کا مضمون ایک ایک آدمی کو سُنایا اور تمام پینٹھ میں منادی کر دی کہ بھائیو! افسوس ہے مولوی مہدی علی کرسٹان ہو گئے۔ جو سُنتا تھا افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سیدؔ احمد خاں پر لعنت کرے۔"

اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر حلال خور نے کمانا، سقے نے پانی بھرنا اور سب لگے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ گھر والوں نے اُن کو لکھا کہ تمہاری بدولت ہم پر سخت تکلیف گذر رہی ہے تم جلدی آؤ اور اس تکلیف کو رفع کرو۔ انھوں نے ایک طُول طویل خط انھیں بزرگ کو جنھوں نے یہ افواہ اڑائی تھی حلّتِ طعامِ اہلِ کتاب کے باب میں لکھا اور پھر خود اٹاوہ میں آئے اور سب کو سمجھایا کہ میں کرسٹان نہیں ہوں جیسا پہلے مُسلمان تھا ویسا ہی اب ہوں۔ غرض بڑی مشکل سے لوگوں کا شبہ رفع کیا۔

جب سرسیدؔ لندن جانے لگے کسی نے یہ مشہور کیا کہ مکّہ کے بدلے لندن کے حج کو جاتے ہیں اور کسی نے کہا کہ لندن جا کر ٹکسالی کرسٹان ہو کر آئیں گے۔ غرض جو جس کے دل میں آیا سو کہا مگر سرسیدؔ نے جو کچھ دل میں ٹھان لیا تھا اُس پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور تاریخِ معیّن پر بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا کہہ کر جہاز میں سوار ہو کر لندن روانہ ہو گئے۔ راہ میں وہ دریائی سفر کے حالات اور جہاز کے واقعات لکھ کر وقتاً فوقتاً سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کو بھیجتے جاتے تھے۔ اسی کے ضمن میں انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ "جہاز میں باورچی اور جانور ذبح یا صاف کرنے والا انگریز ہے، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جو بڑے جانور

ہیں اور جن میں خون زیادہ ہے جیسے بھیڑ بکری مینڈھا وغیرہ، اُس کو تو وہ ہمیشہ گردن کی شہ رگ میں آرہ یا چھری مار کر ذبح کرتے ہیں کیوں کہ اُن کے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز یا حرام ہے یا اُس کے اخراج کا رواج ہے اور پرندوں کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ پرندوں میں مثل چوپاؤں کے دم مسفوح نہیں ہے اور اُن کی مثال دریائی جانوروں جیسی ہے پس اُن کا ذبیحہ صرف اُن کا مار ڈالنا ہے۔ اس لئے پرندوں کو ذبح نہیں کرتے بلکہ گردن توڑ کر مار ڈالتے ہیں" چونکہ اہل کتاب کا ذبیحہ مطلقاً جس طرح کر وہ کرتے ہیں مسلمانوں کو اپنے مذہب کے موافق کھانا جائز ہے اس لئے سرسیدؔ نے لکھا تھا کہ "میں نے اور میرے ساتھیوں نے اُن دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھاتے۔" والحمد للہ الذی جعل دیننا یسرًا ولا عسرًا والصلوٰۃ والسلام علیٰ صاحب الشریعۃ والسھلۃ الھدی" اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے تمام ترک اور مصر و شام کے مسلمان جو عیسائی قوموں کے جہازوں میں سفر کرتے ہیں وہ بھی عموماً اسی طرح عیسائیوں کے ساتھ انھیں کے باورچیوں کے ہاتھ کا صاف یا ذبح کیا ہوا اور انھیں کے ہاتھ کا پکایا ہوا بے تکلف کھاتے ہیں۔

جب یہ خبر ہندوستان میں پہنچی تو مخالفین کو ایک اور ہتھیار سرسیدؔ پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا۔ عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مروڑی مرغی کھانے کو انھوں نے سیدؔ کے کافر ہونے کا بہت بڑا ثبوت قرار دیا کیوں کہ قرآن مجید کی رو سے منخنقہ حرام ہے پس جس شخص نے قرآن کے حکم سے انحراف کیا اس کے کافر اور مرتد ہونے میں کیا کلام ہے۔

پھر لندن سے جو تحریر سرسیدؔ کی آتی تھی اور سوسائٹی کے اخباروں میں چھپتی تھی اُس پر عام اخباروں میں برابر اعتراضوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ ان کی ایک تحریر میں یہ فقرہ تھا کہ "ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ تربیت وشائستگی میں وہ نسبت رکھتے ہیں جو ایک وحشی بدصورت ایک لائق اور خوبصورت آدمی کے ساتھ رکھتا ہے"۔ اس پر مدت تک اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ ہوتے رہے اور عام مجلسوں میں بہت دن تک اس کا چرچا رہا چنانچہ انھیں دنوں میں ایک جلسے کی کیفیت جو بتقریب دعوت صاحبزادہ عبید اللہ خاں فیروز جنگ مولوی سیدؔ مہدی علی خاں کے مکان پر منعقد ہوا تھا اور جس میں صاحبزادہ موصوف اور مولوی صاحب اور دیگر شرکائے جلسہ کے درمیان خوب مباحثہ ہوا تھا، سوسائٹی کے اخبار میں مفصل چھپی تھی۔

جب یہ تمام نکتہ چینی سے بھرے ہوئے اخبار سرسیدؔ کے پاس لندن میں پہنچے۔ تو انھوں نے ایک

مضمون جس کا عنوان "عذر از طرفِ گنہگار سیّد احمد" تھا سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجا جس میں اوّل تمام وطن کے نکتہ چینوں کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انھوں نے میرے عیبوں سے مجھے آگاہ کیا اور آخر میں اہلِ وطن سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ "وہ دن آنے والا ہے کہ تم میرے ان لفظوں کو جنہیں اب گالیاں سمجھتے ہو سوہالیاں سمجھو گے ... اے یارانِ وطن ؎

"رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی"

شکوہ و شکایت ہو چکے، بس اب گلے مل لیجئے اور اپنے ملک کی بھلائی پر متوجہ ہو جیئے، اپنے ملک کے بچوں کی تربیت کا بندوبست کیجئے اور جو جو الزام ہمارے ملک پر ہیں ان کو مٹائیے دنیا میں اپنے ملک کو تربیت یافتہ اور شائستہ کر کے دکھلائیے اور جیلے حوالوں کو اٹھا رکھیے۔"

جب اس پر بھی اہلِ وطن کی مخالفت کم نہ ہوئی اور اخباروں میں برابر مخالفانہ مضامین چھپتے رہے تو انھوں نے ایک تحریر جس کا عنوان "عرضداشت بخدمتِ اہلِ وطن" تھا، سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس کی ابتدائی سطروں سے کسی قدر اُس مخالفت کا اندازہ ہوتا ہے جو اُس وقت تک ہندوستان کے مختلف اطراف سے ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کام اور کوششوں کا ذکر کرتے ہوتے لکھتے ہیں: "بس جو میرا گناہ ہے وہ بجز اپنے ہموطنوں کی عموماً اور اسلام کی خصوصاً خیرخواہی کے سوا اور کچھ نہیں ؎ نیست یارانِ طریقت عیر ازیں تقصیرما۔ اگرچہ میری اس دلسوزی کو میرے ہموطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ الٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی، مگر چونکہ میری دلسوزی اپنے ہموطنوں سے یا ہم قوموں سے کسی صلے کی توقع پر نہ تھی۔ بلکہ اُس کا اجر خدا سے لینا ہے اس لئے میرے ہموطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی مجھ کو ناگوار نہیں گذری اور خدا نے مجھ کو اپنے ارادے پر مستحکم رکھا۔ نہ پرانے دوستوں کی باتیں بُری معلوم ہوتی ہیں، نہ نئے شفیقوں کی تشنیع رنج دیتی ہے، نہ کانپور کی مہیب آواز سے رنج ہوتا ہے، نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے، نہ الہ آباد اور آگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں، نہ مراد آباد اور رامپور کے فتوے اور دہلی کے اہلِ جبہ و خانقاہ و حاجیانِ حرمین شریفین کی گفتار و رفتار دل کو دکھاتی ہے۔ عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی والحمد للہ علی ذالک۔"

معلوم ہوتا ہے کہ سرسیّد نے جو بڑے بڑے منصوبے باندھے تھے اُن پر خاص کر مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفتوں کے ہونے کا اُن کو کامل یقین تھا اور ولایت سے وہ اُن مخالفتوں کے جھیلنے کے لئے تیار ہو کر

آئے تھے۔ وہ ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو اخبار شعلۂ طور کانپور کی مخالفانہ تحریر کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں "جو مضمون کہ اُس میں لکھا گیا آپ نے پڑھا ہوگا اور امید ہے کہ اور بہت کچھ لکھا جائے گا، اگرچہ ایسی باتوں سے کبھی دل کو ملال ہوتا ہے جو مقتضائے بشریت ہے مگر فی الفور رفع ہو جاتا ہے اور دل کو صرف دو خیالوں سے تسلّی ہوتی ہے اوّل تو اس خیال سے کہ آج تک کوئی نیکی چاہنے والا ایسا نہیں ہوا جس کے مقابل میں کوئی نہ کوئی مخالف نہ کھڑا ہوا ہو۔ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیم، موسیٰؑ، عیسٰےؑ، محمدؐ رسول اللہ، خلفائے اربعہؓ، محی الدین جیلانیؒ، مجددِ الفِ ثانیؒ، محمد اسماعیل دہلویؒ و علیٰ ہذا القیاس۔ پس میں تو اُن کی جوتیوں کی برابر بھی نہیں ہوں۔ میری مخالفت پر کمر باندھنی کچھ بڑی بات نہیں ہے۔ دوسرے اس خیال سے کہ میں دیکھتا ہوں جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے دن دون نیکی بڑھتی گئی ہے۔ پس اگر میرا کاروبار اور میری نیّت سچی اور نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اُس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا اور اگر وہ نیک نہیں ہے اور میں غلطی سے اُس کو نیک خیال کر رہا ہوں تو بلاشبہ ٹوٹ جائے گا اور مخالف جو اس صورت میں ضرور ہے کہ نیکی پر ہوں گے کامیاب ہوں گے اور ایسی حالت میں مجھ کو بھی اُن کی کامیابی پر خوشی کرنی ہوگی، نہ اپنی تدابیر کے ٹوٹنے اور اپنے دھوکے میں پڑے ہونے کا رنج۔"

اس خط اور نیز ان کے دیگر خطوط سے، جو ولایت سے انھوں نے مولوی صاحب ممدوح کو لکھے، معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اپنی سچائی پر اور اُس کی وجہ سے اپنی کامیابی پر پورا پورا بھروسا تھا اور لوگوں کی مخالفت کی اُن کو مطلق پروا نہ تھی۔ ایک خط میں خطباتِ احمدیہ کی نسبت مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "بعد چھاپہ کے چند نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ تا دانم کہ مخدومم چہ میگوید؟ خدایا مخدومِ من مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند باک نیست زیرا کہ ایں معاملۂ مرا بانست نہ با مخدومِ من مہدی۔ لیکن محبتِ من از و و محبتِ او از من کم مگردان۔ اے خدا دانندۂ رازہائے پوشیدہ درونِ سینہا تو میدانی کہ من با تو و با دینِ حقۂ اسلام دادۂ توجہ میکنم وچہ اعتقاد دارم؟ پس اگر مرا محبوبِ من مہدی لامذہب یا کافر گوید یا سمیع اللہ و امداد العلی مرتد داند مرا چہ باک؟ تو یرمن مہربان باش۔"

الغرض جب سرسیّد لندن سے واپس آئے اور الہ آباد میں پہنچے تو اُن کو معلوم ہوا کہ اضلاعِ شمال مغرب اور دہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوتے ہیں کہ کوئی سیّد احمد خاں سے نہ ملے اور نہ اُن کے ساتھ کھانا کھا دے اور جو ایسا کرے گا وہ دائرۂ اسلام اور جماعت اہلِ اسلام سے خارج ہو جائے

گا۔ ہم نے سُنا ہے کہ اسی مضمون کا ایک خط نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم رئیس لوہارو کے پاس بھی، جو سرسید کے بڑے گاڑھے دوست تھے، دہلی میں پہنچا تھا۔ انھوں نے خط پڑھ کر کہا کہ "خدا مارے یا چھوڑے سید احمد کافر ہو یا مسلمان، مجھ سے تو نہ ہو سکے گا کہ میں سید احمد خاں سے نہ ملوں اور اُن کے ساتھ کھانے اور کھلانے سے پرہیز کروں۔" سرسید کی زبانی معلوم ہوا کہ ولایت سے آنے کے بعد بہت دن تک اکثر لوگ اُن کے ساتھ کھانے سے پرہیز کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ بیمار اچھے ہونے لگے، پرہیز ٹوٹتا گیا یہاں تک کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے ساتھ کھانا، جیسا کہ ظاہر ہے اب ایک عام بات ہو گئی ہے، وہی لوگ جو میز اور کرسی اور چھری اور کانٹے کے نام سے بدکتے تھے اب انگریزوں کو اپنے گھر بلا کر اور خود اُن کے ہاں جا کر اُسی طریقے سے اُن کے ساتھ کھانا کھانا فخر سمجھتے ہیں اور کوئی شخص اُن کو کرسٹان نہیں جانتا۔

لیکن مذکورہ بالا مخالفتوں کو بمقابلہ اُس طوفانِ عظیم کے، جو آگے چل کر اُٹھنے والا تھا، محض ایک چھیڑ چھاڑ اور نوک جھوک سمجھنا چاہیئے۔ جونہی سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور کالج کے قائم کرنے کے لئے کوشش شروع کی، مخالفت کی گھٹا چاروں طرف سے امنڈ گھمنڈ کر اٹھی۔

مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رُعب ہونے کے علومِ دینیہ سے بھی آشنا تھے؛ ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھپور۔ اگرچہ دونوں صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضدِ حقیقی تھے یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محالِ عادی معلوم ہوتا تھا، باوجود اس کے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہمزبان اور متفق الکلمہ تھے یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں اُن کا منبع انھیں دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔ اگر اُن کی مخالفت کا باعث مذہبی جوش و حمیتِ اسلامی ہوتی تو اُن کا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح اُن کی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ایک اور وجہ اُن کی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے اور اُن میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لئے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ اُن کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا تھا۔

پھر بہت سے دیسی اخباروں نے جب دیکھا کہ سرسید سے بہت سے مسلمان عموماً بدگمان اور متنفر ہوتے

جانتے ہیں تو انھوں نے اپنے اخباروں کی گرم بازاری اسی میں دیکھی کہ جہاں تک ممکن ہو کوئی پرچہ ایسا نہ نکلے جس میں سرسیدؔ اور اُن کے اعوان و انصار پر اعتراضوں کی بوچھاڑ نہ ہو۔ بعض مولوی جو زمانے کے انقلاب سے نہایت کس مپرسی حالت میں تھے انھوں نے سرسیدؔ کی عام مخالفت سے اس طرح فائدہ اٹھانا چاہا کہ اُن کی تصنیفات کا رد لکھنے پر کمر باندھی اور فی الواقع اس سے اُن کو بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ اُن کی کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہو گئیں اور کئی کئی بار اُن کے چھپنے کی نوبت آئی۔

الغرض سرسیدؔ کے خیالات اور اُن کی تحریرات کے برخلاف مستقل کتابیں اور رسالے لکھے جانے لگے۔ رسالہ طعام اہلِ کتاب کی رد میں مولوی امداد العلی نے امداد الاحتساب لکھی، مولوی محمدؐ علی نے مزیل الاوہام نام ایک رسالہ شایع کیا، تہذیب الاخلاق کے توڑ پر خاص خاص اخبار اور رسالے جاری ہوتے، کانپور سے نور الآفاق، اور نور الانوار اور مراد آباد سے لوحِ محفوظ نکلا، آگرے سے تیرھویں صدی شائع ہوا۔ امداد الآفاق شہابِ ثاقب اور تائید الاسلام وغیرہ اضلاع شمال مغرب سے اور اشاعۃ السنہ پنجاب سے شائع ہوئے، سرسیدؔ کو ملحد، لامذہب، کرسٹان نیچری، دہریہ، کافر، دجال اور کیا کیا خطاب دیئے گئے۔ اُن کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مُہریں اور دستخط کرائے گئے۔ یہاں تک کہ جو لوگ سرسیدؔ کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے اُن کی بھی تکفیر ہونے لگی۔ سرسیدؔ کے نام گالی اور دُشنام کے بھرے ہوئے گمنام خط چاروں طرف سے آنے لگے اور ان گمنام خطوں کا سلسلہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے کم و بیش اخیر تک جاری رہا۔ سرسیدؔ نے ان نالائق خطوں میں سے ایک آدھ خط راقم کو بھی دکھایا ہے اور ایک خط جب کہ منشی سراج الدین احمد سرسیدؔ کی لائف لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ سرسیدؔ کے پاس آیا تھا اور اُن کے پاس سرسیدؔ نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ اس کو نہایت جلی حرفوں میں میری لائف میں درج کر دینا۔ چنانچہ وہ خط منشی صاحب کے مسوّدات میں ہم کو دستیاب ہوا ہے جس میں اوّل سے آخر تک نہایت مغلّظ گالیاں جو رذیل سے رذیل آدمی کی زبان پر بھی نہیں آ سکتیں، بھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ سرسیدؔ کی یہ خواہش تھی کہ وہ خط بجنسہٖ اُن کی لائف میں درج کیا جاتے مگر ہماری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اُس ملعون تحریر کو سرسیدؔ کی لائف میں نقل کر کے قوم کی نالائقی تمام دُنیا پر ظاہر کریں۔

چونکہ سرسیدؔ کے مخالفوں کی عام تحریریں اور رسالے اور کتابیں اور میگزین اور اخبار زیادہ تر کذب و افترا اور تہمت و بہتان اور معاندانہ کج بحثیوں سے بھرے ہوتے تھے، اس لئے سرسیدؔ جہاں تک ہو سکتا تھا، کسی کا جواب نہیں دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی جواب دینے سے منع کرتے تھے مگر اوّل اوّل جب کہ مخالفوں نے

سرسیدؔ اور اُن کے بعض دوستوں کی نسبت غلط افواہیں اڑانی شروع کیں اور لوگوں کو مجبور کیا کہ یا تو ان باتوں کا جواب دیجئے ورنہ سمجھا جائے گا کہ آپ کی نسبت مخالفوں کے الزمات سب صحیح ہیں اور نیز ان تحریر دل سے چندے کے رک جانے کا بھی اندیشہ تھا اس لئے کبھی کبھی سرسیدؔ اور مولوی سیدؔ مہدی علی نے تہذیب الاخلاق میں اُن کے جواب لکھنے پر قلم اٹھایا ہے۔ از انجملہ سرسیدؔ کا مضمون "دافع البہتان" اور سیدؔ مہدی علی کا مضمون "تکفیرِ مسلمان" اور "سوال وجواب" خصوصیت کے ساتھ دیکھنے کے لائق ہے۔

"دافع البہتان" سرسیدؔ کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے مولوی علی بخش خاں مرحوم سبارڈینیٹ جج گورکھپور کی کتاب تائیدالاسلام کے جواب میں لکھا تھا۔اس مضمون کو سرسیدؔ نے ذیل کے فقرے پرختم کیا ہے:۔

"جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سیدؔ الحاج (یعنی مولوی علی بخش خاں) نے کیوں ایسے سخت اور محض غلط بہتان مجھ پر کئے ہیں؟ بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیدؔ الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے، قریب اُسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ اُنھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کرلیں، حج کے بعد تو سب پاک ہی ہوجاویں گے۔ جیسے کہ بعض آدمی جب مسہل لینا چاہتے ہیں تو خوب بدپرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسہل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب سیدؔ الحاج کو معلوم کرنا چاہیئے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہوگئے ہوں، اور شبلی وجنید کے مرتبے پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پہ کئے ہیں، جب تک میں ہی نہ معاف کروں، معاف نہیں ہوسکتے پس مقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ حج دوم احمد کا احرام باندھیئے اور گناہوں کی معافی چاہیئے ورنہ روزِ جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہوجائے گا۔"

ایک اور مضمون سرسیدؔ نے انہیں مخالفتوں کے ہجوم کے زمانے میں لکھا تھا جس کا عنوان "حال خود دیارانِ خود" ہے۔یہ مضمون بھی نہایت لطیف اور دلچسپ ہے جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"ہمارے اور ہماری قوم کے حال پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ❊ جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

پُرانے دِل بجھنے تو ہم کو بُرا کہتے کہتے ٹھنڈے ہوگئے ہیں اور لیجئے نئے دل جوش پر ہیں اور ہم کو بُرا کہنے پر

نہایت تیز زبان مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے، ہم کو وہی جوشِ محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے اُن کی دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے، اُن کے غصّے سے ہم کو رنج نہیں، اُن کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے ہم کو پچھلوں کے حالات سے اور خود اپنے دادا محمدؐ رسول اللہ صلعم کے حالات سے بالکل تسلّی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھی ہے اور اپنی قوم کی بہتری و بہبودی میں کوشش کی ہے اُن کو دنیا کے ہاتھ سے اور بالتخصیص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؟ کوئی سولی دیا گیا، کوئی آرے سے چیرا گیا، کوئی جلاوطن کیا گیا، پس ہم کو جو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھا اُس کا کروڑواں حصّہ بھی ابھی نہیں ہوا۔ ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم نے ہم سے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، بہت کیا تو یہ کیا کہ دو چار خط گمنام دشنام کے لکھ بھیجے ہم نے شکر کیا کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگڑا اور اُن کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس سے زیادہ کسی کو غصہ آیا اور کوئی اخبار نویس بھی اتفاق سے اُن کا دوست ہوا یا دو تیفر اور ایک کاٹھ کی کل اُن کے ہاتھ میں ہوئی تو انھوں نے اپنے دل کے غصّے کو جھوٹ سچ باتیں چھاپ کر یا چھپوا کر ٹھنڈا کیا ہم تو اس پر بھی راضی ہیں مگر اُس دن کا ہم کو افسوس ہے جب کہ وہ لوگ خود اپنی باتوں پر افسوس کریں گے اور سمجھیں گے جو سمجھیں گے۔

"ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیوں کہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزمان محمدؐ رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں، کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسا ہمارے جدِ امجد ابراہیم اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمدؐ رسول اللہ کی نبوّت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔

مگر طرفہ یہ ہے کہ ہم کو کرسٹان بھی کہتے ہیں اور ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہو گئے اور ایک گرجا میں جا کر بپتسمہ یعنی اصطباغ لیا۔ ہم کو اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ علانیہ جھوٹ بولتے اور جھوٹ چھاپنے میں کچھ شرم و غیرت و حیا نہیں آتی۔ قومی ہمدردی

جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے خدا نے ہماری قوم کے دل سے کیسی مٹا دی ہے۔ اُس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپ دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بہ لحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوتا، مگر جو رنج و غم اور افسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہیں۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخٰسرین۔

مولوی امداد العلی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیج کر سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کئے تھے اُن میں سے ایک استفتا اس مضمون کا تھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال و افعال ہوں وہ مسلمان ہے یا نہیں؟ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہے اُس میں چندہ دینا اور اُس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے یا نہیں؟ اور تیسرا اُسی تاریخِ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت تھا جس میں مصنّف نے آنحضرتؐ کی نسبت اپنے عقیدے کے موافق سخت اور نا ملائم الفاظ لکھے تھے۔ یہ تمام فتوے اور استفتے مولوی امداد العلی نے اپنے ایک رسالے کے آخر میں جس کا نام "امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجوابِ پرچۂ تہذیب الاخلاق" ہے چھاپ کر اس رسالے کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اُس کی ایک جلد ہماری نظر سے بھی گذری ہے، اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سُنّی کیا شیعہ، کیا مقلّد کیا غیر مقلّد، کیا وہابی کیا بدعتی، سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاص کر سُنّی مولویوں میں سے اکثر نے بہت شرح اور بسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔ از انجملہ دلّی اور لکھنؤ کے دو سب سے بڑے عالموں کے جواب میں سے کچھ کچھ فقرے بطور نمونہ کے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب مرحوم دہلوی لکھتے ہیں "در سنوحِ ایں سانحۂ ایمان زدا اے و وقوعِ ایں داہیۂ ہوش ربا و ظہورِ ایں معاملۂ نحیعت افزا و حدوثِ ایں حادثۂ الحاد افشا کے تعبیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلبہ کی اور اپنے مالِ معصوم کو غیر معصوم کرنا اور رسم بایہ ہونا اُس خوش عقیدہ کے کہ جس کا حالِ بد مآل اس سوال میں مذکور ہے، بالکل باطل اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محلِ تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ اعوذ باللّٰہ

من الحورِ بعد الکور۔ بل بالکل عاطل بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم، اور ایسے محل میں ساعی ہونا ہیمہ اور حطب بننا لازم الحاصل معاونت ایسے غارتِ ایمان اور مال کی اور للّٰہ سمجھنا اپنے مال کا خیالِ خام ہے۔ سُنّی نے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمالِ صالحہ کو مٹاتا ہوں۔ پس مرد دیندار بلکہ تمامی سُنّی و شیعی و خارجی و سائرِ ہنود و تمامی سکانِ اہلِ زمین پر واجب اور متحتم ہے کہ ایسے کلامِ واہی اور ایسے عقیدہ واہی پر عقیدہ اپنا نہ جماویں بلکہ ہر فرد ہر مذہب کا اس شخص کو ہادمِ بنائے اپنے مذہب کا بوجھے اور اس امرِ لیوچ پر دل نہاد نہ ہووے اور اپنے دل میں اس کا انجام سوچے کہ کیا جال بچھایا ہے۔"

مولوی عبدالحی صاحب مرحوم لکھنوی جو علمائے فرنگی محل میں نہایت نام آور تھے، مفصلہ عبارت میں تحریر فرماتے ہیں "وجودِ شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اُس کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں اور وجودِ آسمان منصوصِ قرآنی ہے، منکر اُس کا مبتلائے وسواسِ شیطانی ہے، حرمتِ منخنقہ طیور منصوصِ کلامِ ربِّ غفور ہے، اور سلف سے تا خلف اتفاق اس پر ماثور ہے، انکار اس کا موجبِ گمراہی و فجور ہے۔ مذہبِ نیچر خدا جانے کیا بلا ہے، ہر متشرع اور متدین کو اُس کے قبول سے اِبا ہے ہر مسلمان کو حق جلّ شانہٗ اتباعِ شریعتِ محمدیہ پر قائم رکھے اور مذہب نیچر اور مشرب بدتر سے محفوظ رکھے۔ جو شخص کہ اعتقادات اُس کے فاسدہ ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص مخرّبِ دینِ ابلیسِ لعین کے وسوسہ سے صورتِ اسلام میں تخریبِ دینِ محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مدرسۂ جدیدہ انہدامِ شریعت اُس کی منظورِ نظر ہے جو چیزیں کہ اُس کے نزدیک موجبِ تہذیب ہیں اہلِ سنت کے نزدیک باعثِ تخریب ہیں فالحذر الحذر یا ایہا المسلمون والہرب الہرب یا ایہا المومنون۔" ان تمام فتووں کا جواب اور جن عقائد و اقوال پر سرسید کی تکفیر کی گئی ہے اُن کا ثبوت محققینِ اہلِ اسلام کی تصنیفات اور اُن کے کلام سے مولوی سید مہدی علی خاں نے اُن دو مضمونوں میں جو "تکفیرِ مسلماناں" اور "سوال وجواب" کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں اسی زمانے میں چھپے تھے اور نیز دیگر مضامین میں بوجہ اِستفتا دیا ہے اور سرسید کی تصنیفات میں بھی اُن کے جوابات متفرق طور پر مل سکتے ہیں، اس لئے اُن تمام استفتاؤں اور فتووں اور اُن کے جوابات کا اس مقام پر نقل کرنا کچھ ضرور نہیں ہے مگر سرسید کے دو ایک لطیفے جو مخالفوں کی نسبت تحریر کی رو میں ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

لطیفہ ۔ جس زمانے میں سرسید ولایت میں تھے اُن کے پاس اخبار شعلۂ طور کانپور میں مولوی سید امداد العلی کا ایک مضمون سرسید کے خلاف چھپا ہوا پہنچا تھا۔ اس میں تاریخ الفنسٹن کا وہی ترجمہ جس پر آخر کار سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لکھا گیا بجنسہٖ نقل کر کے صاحبِ مضمون نے لکھا تھا کہ "جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے۔" سرسید ولایت سے ایک خط میں مولوی مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں "دیکھو دشمنی آدمی کو ایسا اندھا کر دیتی ہے اُسی اخبار (شعلۂ طور) میں تاریخِ ہندوستان کے مضمون کو نقل کر کے بشدّ و مد لکھا ہے کہ جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے، حالانکہ خود بھی اُسی عبارت کو لکھتے ہیں، پھر مجھ میں اور اُن میں کیا فرق ہے؟ صرف اتنا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور انھوں نے اُردو سے۔"

یہ نرا لطیفہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس فتوے کے موافق جو مفتی سعد اللہ صاحب نے اِسی ترجمے کی بابت سرسید کی نسبت دیا ہے، مولوی امداد العلی بھی تکفیر کے مستحق ٹھیرتے ہیں، کیونکہ مفتی صاحب اپنے فتوے کی تائید میں شفا سے قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ "ایک شخص نے امام مالک سے پوچھا کہ اُس شخص کا کیا حکم ہے جو کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے؟ امام مالکؒ نے حکم دیا کہ ان الفاظ کے بولنے والا کافر ہے اُس کو قتل کر ڈالو۔ اُس نے کہا حضرت میں نے تو دوسرے شخص کا قول نقل کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا "ہم نے تو تجھی سے سنا ہے" **لطیفہ**: پھر جب کہ سرسید ولایت سے آگئے اور تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا۔ اُس وقت مولوی امداد علی نے سرسید کے پاس ایک اشتہار سالہ چھپا ہوا بھیجا جس میں اسی کی دھمکی دی گئی تھی درج تھا، کہ مفتی سعد اللہ صاحب کا فتوے تکفیر میں جناب سید احمد خاں کی، جو ترجمہ تاریخ پر مرتب ہوا ہے، راقم کے پاس موجود ہے۔ معلوم نہیں کہ سید احمد خاں کے حواریین اُس فتوے پر بھی ایمان رکھتے ہیں یا نہیں" سرسید تہذیب الاخلاق میں اس دھمکی کی نسبت لکھتے ہیں "پہلے تو ہم گھبرائے کہ یہ مفتی سعد اللہ صاحب[1] کون ہیں؟ یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دلّی میں دیکھا ہے؟ اور یہ وہی مفتی سعد اللہ صاحب ہیں، جنھوں نے لکھنؤ میں ایک نیک بخت مسلمان آلِ رسولؐ ابنِ علی اولادِ نبی

---

[1] مفتی سعد اللہ صاحب ہندوستان کے ایک مشہور عالم تھے جن کا قدیم وطن مراد آباد تھا۔ جس زمانے میں سرسید کی آمد و رفت مفتی صدر الدین خاں مرحوم دہلوی کے مکان پر بہت زیادہ تھی غالباً اُسی زمانے میں مفتی سعد اللہ صاحب بطور طالب علموں کے دلی میں وارد تھے اور مفتی صدر الدین خاں سے پڑھتے تھے۔ جب یہ تمام علومِ عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تو لکھنؤ میں جب کہ غالباً امجد علی شاہ زندہ تھے، اُن کو مذہبِ اہلِ سنّت کے اِفتا کا معزز عہدہ مل گیا تھا اور اس وقت سے واجد علی شاہ کے اخیر زمانے تک اُسی عہدے پر مامور رہے۔ اسی زمانے میں وہاں ایک بہت بڑا واقعہ (باقی)

کے کفر اور قتل کا فتویٰ دے کہ عشرۂ محرم میں اُن کا سر ہنومان گڑھی سے نیزے پر چڑھا کہ لکھنؤ میں لانا چاہا تو ہمارا دل ٹھنڈا ہو گیا اور سمجھے کہ آلِ رسول کے قتل و کفر پہ فتوے دینا اُن کا قدیمی پیشہ ہے۔"

اگرچہ مولوی امداد العلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کرنے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی تھی، دلّی، رام پور، امروہہ، مراد آباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے ساٹھ عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتووں پر مہریں اور دستخط کیے تھے، گویا ہندوستان کے تمام اہلِ حل وعقد کا اس حکم پہ اجماع ہو گیا تھا، صرف خدا کی طرف سے اُس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی پوری کر دی، انھوں نے غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ معظمہ میں جا کر مذاہبِ اربعہ کے مفتیوں کے سامنے دو استفتے عربی زبان پیش کیے جن میں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے۔

" آپ کیا فرماتے ہیں اُس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجودِ خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس سے مراد قوتِ بہیمیہ ہے جو نفسِ انسان میں ہے اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اُس سے قویٰ کا مطیع ہونا مراد ہے اور اِبیٰ وَ استکبر سے عدمِ اطاعتِ قوتِ بہیمیہ مراد ہے جو آدمی کی اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ سے انکار کرنا، اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُن سے فضائے بسیط یا سیّارات مراد ہیں، اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے آیۂ اِمّا منّاً بعد و اِمّا فداءً سے اور یہ آیت نازل ہوئی ہے بعد فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہے جو قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہے، اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے سے انکار کرتا ہے اور انکار کرتا ہے شقِ صدر آنحضرتؐ کا اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹے ہوتے پرند حلال ہیں۔ پس ایسے شخص کے باب میں کیا حکم ہے؟"

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۴۷) مولوی سید امیر علی صاحب کے قتل کا گذرا تھا۔ ہنومان گڑھی میں ہندوؤں نے ایک مسجد کو ڈھا کر مندر بنانا چاہا تھا اور اہلِ دربار کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا تھا۔ سید امیر علی کچھ جمعیت لے کر وہاں ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کو پہنچے۔ چونکہ سید امیر علی سُنّی المذہب تھے اس لئے نائب نے مفتی سعد اللہ سے اس بات کا فتوے لکھوا لیا کہ فوج بھیج کر سید امیر علی کو اس ارادے سے روکا جائے اور اگر وہ نہ مانیں تو اُن کو قتل اور اُن کی جمعیت کو پراگندہ کر دیا جائے، چنانچہ سید امیر علی شہید کیے گئے۔

اس استفتے کے جواب میں مذاہبِ اربعہ کے چاروں مفتیوں[1] نے جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں علیحدہ علیحدہ عبارت لکھی ہے اور ان چاروں صاحبوں کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ "یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے خدا اس کو سمجھے۔ واجب ہے اولی الامر پر اس شخص سے انتقام لینا۔ اس کو تنبیہ کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے پھر اگر باز آوے تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اُس کی تادیب کرنی چاہیے اگر وُلاۃِ اسلام میں کوئی صاحبِ غیرت ہو۔ نہیں تو خدا اُس کو سمجھے اور اُس کی ضلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دے گا۔" اس کے بعد سید محمد کتبی حنفی مدرسِ حرمِ شریف اور مولانا رحمت اللہ مرحوم ہندی مہاجر مکہ معظمہ نے چاروں مفتیوں کے جوابوں کی تصویب کی ہے۔

پھر مولانا علی بخش خاں مدینہ منورہ گئے ہیں اور اسی قسم کا استفتا شیخ محمد امین بالی مفتیِ احناف کی خدمت میں پیش کیا ہے، اُن کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ "جو کچھ دُرِ مختار اور اُس کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا اباحتی ہے کیوں کہ منخنقہ کا کھانا مباح تبلاتا ہے اور اہلِ مذہب (حنفی) کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی، پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اُس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اُس کا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لیے اور وُلاۃِ امر پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔"

دوسرے استفتے کا ملخص یہ ہے کہ "اُس مدرسے کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہلِ اسلام کے اخلاق مہذب نہ ہوں گے جب تک کہ وہ ستہ مزورہ میں یورپ کے فلاسفۂ جدید کی پیروی نہ کریں گے اور یہ کہ تمام علومِ دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدوّن کیے ہیں، بے فائدہ ہیں، اس لیے ضرور ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علومِ جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہلِ یورپ کے طریقے پر ستہ ضروریہ سکھائے جائیں اور کتبِ دینیہ میں سے ایسے مضامین انتخاب کیے جائیں جو فلسفۂ جدیدہ کے خلاف نہ ہوں اور جب لوگوں نے اُس پر اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا اور اُس کی

[1] یعنی شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ عبداللہ سراج مفتیِ حنفیہ اور احمد بن زین دحلان مفتیِ شافعیہ اور محمد بن عبداللہ بن حمید مفتیِ حنابلہ اور حسین بن ابراہیم مفتیِ مالکیہ ۱۲

اعانت سے انکار کیا تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آؤں گا مگر مدرسے کا جو انتظام ہوگا وہ مجلسِ شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا۔ حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اُسی کے گروہ کے ہیں اور اُن کی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہیں۔ پس ایسی حالت میں آیا مسلمانوں کو اُس کی اعانت کرنی جائز ہے یا نہیں، بینوا و توجروا۔"

اس کا جواب بھی حرمینِ شریفین کے مفتیوں نے الگ الگ لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اُس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اُس کے بانی سے اور اُس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص پر جس میں حمیّتِ اسلامی ہو واجب ہے اس مدرسے کی مخالفت جہاں تک کہ قدرت ہو، اور ادنےٰ درجہ یہ ہے کہ دل سے اُس کا مخالف ہو۔"

حسنِ اتفاق سے جس زمانے میں یہ فتوے مولوی علی بخش خاں حرمینِ شریفین میں وہاں کے علماء اور مفتیوں سے لکھوا رہے تھے حافظ محمد حسین نام ہندوستان کے ایک بزرگ وہاں موجود تھے جو حج اور زیارت کے ارادے سے وہاں گئے تھے۔ اُدھر تو مولوی علی بخش خاں نے عرب سے آکر مذکورۂ بالا فتوؤں کی ہندوستان میں منادی کرنی شروع کی اور اِدھر اُس نیک دل مسلمان نے باوجودیکہ سرسیّد سے مطلق شناسائی نہ تھی ایک طول طویل مضمون سرسیّد کی تکفیر کی تردید میں اُنھیں دنوں میں اخبار کوہِ نور لاہور میں چھپوایا جو تہذیب الاخلاق میں نقل کیا گیا تھا اور جس کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرنے مناسب سمجھتے ہیں۔

وہ علمائے حرمینِ شریفین کے فتوؤں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "فتوے لکھنے لکھانے کا جو حال یہاں ہے (یعنی ہندوستان میں) وہی وہاں (یعنی حرمینِ شریفین میں) ہے جس مضمون سے چاہا فتوے لکھ لیا جس سے دستخط کرانے ہوئے جو چاہا سمجھا کر دستخط کرالئے، جیسے عالم یہاں ہیں ویسے ہی وہاں ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ ان کی زبان ہندی ہے اُن کی عربی وہاں جو ہندوستانی اہلِ سنّت وجماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں ایک بدعتی، دوسرے وہابی، جو بدعتی ہیں وہ وہابیوں کو کافر کہتے ہیں جو وہابی ہیں وہ بدعتیوں کو بُرا کہتے ہیں:

جب بدعتیوں کا وار چل جاتا ہے وہابیوں کو نکلوا دیتے ہیں۔ جب وہابی غالب ہو جاتے ہیں بدعتی چپ ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں بدعتیوں کا وار چل رہا ہے سیّد احمد خاں صاحب حرمینِ شریفین میں بھی مشہور ہیں، اکثر ہندوستانی اور بعض عرب اُن کے نام اور اُن کے خلافِ واقع حال سے واقف ہیں۔ وہاں مشہور ہے کہ

سیدّ احمد خاں لندن گئے تھے وہ انگریزوں سے اقرار کر کے آئے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو جہاں تک ہوسکے گا، کرسٹان کریں گے اور دینِ اسلام سے پھیریں گے۔ اب وہ اپنے اقرار کے موافق مسلمانوں کو بہکا کر دینِ اسلام سے پھیرتے اور نئے نئے عقائد سکھلاتے ہیں۔ یہ جو فتوے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے بھی اُن کا فتنہ بڑھ کر ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ظاہر میں مسلمان رہ کر اور دینِ اسلام کے نام سے وعظ و نصیحت کر کے عیسائی کرتے ہیں۔ جس کسی نے سیدّ احمد خاں صاحب کا یہ حال سُنا۔ وہ اُن سے نفرت کرنے لگا اور بُرا جاننے لگا۔ جب اس سے واقعی حال کہا گیا کہ سیدّ احمد خاں ایسے آدمی نہیں ہیں، پکے مسلمان ہیں، ظاہر اور باطن میں یکساں ہیں، مسلمانوں کو مسلمان رکھنا چاہتے ہیں، قرآن کے معنی جو ہیں وہی کہتے ہیں حدیث کو معتبر جانتے ہیں، جو حدیث نہیں ہے اس کو بے اعتبار سمجھتے ہیں، اہلِ کتاب کے ذبیحے کو قرآنِ مجید کے موافق حلال کہتے ہیں، سوُد اور شراب کو حرام سمجھتے ہیں۔ انسانوں سے انسانیت کی وجہ سے قرآنِ مجید کے مطابق دوستی رکھنی اور ہر ایک کی بھلائی چاہنی موجب ثواب جانتے ہیں، نہ شیطان اور آسمان کے منکر نہیں مقر ہیں، صورت اور طرح میں جو بعض عالموں نے بیان کی ہے اُن کے ہمزبان ہیں؟ اکثروں کے ساتھی نہیں، امام کو امام جانتے ہیں پیغمبر نہیں مانتے، مفسّر کو مفسّر مانتے ہیں۔ العامی نہیں جانتے، مجتہد کو مجتہد کہتے ہیں خاتم المجتہدین نہیں سمجھتے، ہر وقت اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ مسلمان کی دین و دُنیا درست ہو، ہزاروں روپے اپنے خرچ کرتے ہیں۔ دل و جان سے ہر وقت اسی کے خواستگار ہیں۔ اپنا جان و مال مسلمانوں کے واسطے وقف کر رکھا ہے، چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا میں مالدار ہو جائیں اور دین میں ایماندار۔ یہ سُن کر وہ سیدّ احمد خاں کی تعریف کرنے لگا۔ ہندوستانی نے کہا بہت اچھے آدمی ہیں اور عرب نے کہا طیّب۔ جناب مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر جب تک مکہ معظمہ میں رہے ان کو یہی شغل رہا۔

جب مدینہ منورہ میں گئے وہاں بھی انہیں فتووں کی فکر رہی، حالانکہ مدّتِ قیامِ مدینہ منورہ کی تھوڑی تھی یعنی آٹھ سات روز کہ ضروری کام اور زیاراتِ طیبّات بھی مشکل سے انجام ہوتے ہیں۔ مولانا صاحب اسی انتظام میں رہے، سوالات کا مسودہ مسجدِ نبوی میں روضۂ مطہرہ کے روبرو ہوا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اکثر ہندوستانی اور عرب سے مولانا صاحب یہی ذکر فرماتے رہتے اور اسی کی بحث ہوتی رہتی۔ مولانا صاحب شہابِ ثاقب اور ایک اور رسالے کی کئی جلدیں لے گئے تھے، وہ بھی وہاں تقسیم فرمائیں۔ سیدّ احمد خاں صاحب کا کفرِ اسلام اور اُن کے کفر کے فتووں کا مدار اُن کا حال بیان کرنے والوں پر منحصر ہے نہ مکہ والے ان کو جانیں، نہ مدینے والے اُن سے واقف۔ اگر کوئی چاہے تو سو فتوے اُن کے اسلام کے حرمین شریفین سے واقعی حال

بیان کر سکے لا سکتا ہے سیدّ احمد خاں صاحب کا اسلام مُسلمانوں کے دلوں پر نسلاً بعد نسلِ کندہ ہوتا چلا جائیگا اور تھوڑے عرصے بعد سیدّ احمد خاں صاحب کے نام کے ساتھ مجتہد و مجدّد کا لفظ لکھنا شروع ہو جائے گا۔ اُن کے اسلام کے ثبوت میں کاغذ اور سیاہی کی مدد ضرور نہیں۔ جو بات کفر کی ہے وہ کفر کی ہے اور جو اسلام کی ہے وہ اسلام کی۔ سیدّ احمد خاں صاحب صرف اس سبب سے کہ حرمینِ شریفین کے عالموں نے اُن کے کفر کے فتوے دے دیئے، کافر نہیں ہو سکتے۔ جیسے یہاں کے عالم ہیں ویسے ہی وہاں کے، صرف زبان کا فرق ہے، انھیں کتابوں سے وہاں والے فتوے لکھتے ہیں، انھیں سے یہاں والے۔"

اسی مضمون میں وہ ایک جگہ ہندوستانی مولویوں کا، جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "دو تین مولانا صاحبوں کے سامنے میں نے سیدّ احمد خاں صاحب کی تعریف کی اور واقعی حال اُن کا بیان کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ فلاں مولانا صاحب یا حکیم صاحب یا منشی صاحب ابھی ہندوستان سے آئے ہیں وہ اس کے خلاف کہتے ہیں، تم ہرگز سید احمد خاں کا کہنا نہ مانو، ورنہ کافر ہو جاؤ گے میں نے کہا بہت اچھا سیدّ احمد خاں صاحب کا کہا نہ مانوں گا، اُن کو بُرا جانوں گا مگر پھر کس کا کہا مانوں؟ آپ کا؟ سو آپ کو بھی تو فلاں مولانا کافر کہتے ہیں، اس کا کیا علاج؟ غرض ہندوستانی عالموں اور جاہلوں کا وہاں بھی یہی خراب حال اور لڑائی ہے۔"

اگرچہ حافظ محمد حسین صاحب نے حرمینِ شریفین کے فتوؤں کی حقیقت اپنے مضمون میں اچھی طرح ظاہر کر دی ہے پھر بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے ساٹھ عالموں کا سر سید کی تکفیر پر اتفاق کرنا اور حرمینِ شریفین کے مفتیوں اور دیگر عالموں کا ان کے ساتھ ہمزبان ہونا بعض ناواقف لوگوں کو سر سید کے مسلمان ہونے کی نسبت شبہ میں ڈالے اور ممکن ہے کہ بعض ناظرینِ کتاب کے دل میں یہ خیال گذرے کہ تیس برس بعد ان ویسے دبائے فتووں کا سر سید کی لائف میں ذکر کرنا گویا اُن کی تکفیر میں از سرِ نو جان ڈالنی ہے، مگر ہمارے نزدیک سر سید کی لائف ناتمام رہتی اگر اُن فتووں کا ذکر اُس میں نہ کیا جاتا۔ درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں ہیں بلکہ سر سید کے اعلیٰ درجے کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں۔ یہ تمغے ہمیشہ انہیں لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں جو دُنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔ امام غزالی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "جس شخص پر لوگ حسد نہ کریں اس کو حقیر جان! اور جس کو کافر اور گمراہ نہ کہیں اُس کو ناچیز سمجھ، الیہ الائمہ علیِ مرتضیٰ" نے جو ایمان کی تعریف بتائی ہے، سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے زمانے

میں اُس کا صحیح مصداق سید احمد خاں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ فرماتے ہیں الایمان ان تؤثر الصدق حیث یضرك علی الکذب حیث ینفعك (یعنی ایمان کے یہ معنی ہیں کہ جب سچ کہنا مضر ہو اور جھوٹ کہنا مفید اُس وقت سچ کو جھوٹ سے مقدم سمجھا جائے) سرسید کو اپنی سچائی کی بدولت صرف مسلمانوں ہی کی مخالفت کا نشانہ بننا نہیں پڑا بلکہ اکثر موقعوں پر محض ملک اور قوم کی خیر خواہی کی بدولت جیسا کہ اُن کی بائیوگرافی جا بجا شہادت دیتی ہے، بڑے بڑے جلیل القدر افسروں اور حاکموں کی خفگی اور حد سے زیادہ ناراضی برداشت کرنی اور بعض اوقات اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا پڑا ہے۔ خدا تعالےٰ نے ایمان کی سچائی کا یہ معیار نہیں بتایا کہ کسی مفتی نے اُس کے کفر کا فتوےٰ نہ دیا ہو بلکہ اُس کا صحیح معیار آزمائش میں پورا اُترنے کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے۔ "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (یعنی کیا لوگ یہ سمجھے ہیں کہ صرف اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور اُن کی آزمائش نہ کی جائے گی) اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس معیار کے موافق سید احمد خاں کا ایمان کامل ٹھیرتا ہے یا اُن لوگوں کا جنھوں نے اُس کو کافر اور واجب القتل ٹھیرایا؟ غدر کے بعد جب کہ مسلمانوں کی حمایت کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا، اور دینِ اسلام امن اور انتظام کا دشمن اور فتنہ و فساد کا بانی خیال کیا جاتا تھا، اس سے زیادہ حمیتِ اسلامی اور جوشِ ایمانی کے امتحان کا وقت اور کون سا ہو سکتا ہے؟ اُس وقت اسی کافرِ واجب القتل کے سوا اسلام اور اہلِ اسلام کی حمایت کے لئے نہ اُن مستفتیوں میں سے کوئی اُٹھا جنھوں نے اُس کے کافر و مرتد ہونے کے فتوے لکھوائے اور نہ اُن مفتیوں میں سے جنھوں نے اُس کے کفر و ارتداد کے فتووں پر آنکھیں بند کر کے مہریں اور دستخط کئے۔

"در ہند چو او یکے و آں ہم کافر
پس در ہمہ ہند یک مسلماں نبود"

بادجود ان تمام مخالفتوں کے سرسید نے اپنے سخت ترین مخالفوں سے جب کہ وہ کفر اور واجب القتل ہونے کے فتوے تمام ملک میں شائع کر چکے تھے، التجا کی کہ مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم جس میں میری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے اُس کا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھ

میں بھیجئے ، میں اس میں کسی طرح کی شرکت نہیں چاہتا۔ اس پر مولوی امداد العلی نے اُن کو لکھا کہ "تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو اور ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں " مگر مولوی علی بخش خاں نے اس شرط پر منظور کیا کہ آپ کی کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کو امورِ مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جائے جس کے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہلِ اسلام کو اطمینان ہے اور جو لوگ مذہبی تعلیم کے واسطے چندہ دیں اُس روپیہ سے سود حاصل نہ کیا جائے اور اُس کی آمدنی جائز صرف مذہبی تعلیم میں خرچ کی جائے ۔ سرسید نے اُن کی تمام شرطیں منظور کر لیں اور ان کو قواعدِ مدرستہ العلوم میں داخل کر دیا اور مولوی صاحب کو لکھا کہ میں عنقریب یہ تمام خط و کتابت ممبرانِ کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کے پاس بھیج کر منظوری حاصل کر لیتا ہوں ۔ اگرچہ بعض ممبروں نے اس بات سے سخت اختلاف کیا کہ کمیٹی خزنتہ البضاعتہ کو تعلیم مذہبی سے کچھ تعلق نہ رہے مگر کثرتِ رائے سے وہی تجویز جو مولوی علی بخش خاں چاہتے تھے منظور ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ اہلِ سنّت کے مشہور دیندار عالموں میں سے بیس بزرگوں کی خدمت میں درخواست کی جائے کہ وہ تعلیم مذہب اہلِ سنّت و جماعت کی کمیٹی کے ممبر انتخاب کریں ۔ البتہ اتنا گناہ ہو گیا کہ مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب کرنے والوں میں بشمولِ مولوی علی بخش خاں علمائے اہلِ سنّت کے بہت سے نام کمیٹی خزنتہ البضاعتہ نے خود تجویز کر دئے اور منجملہ بیس بزرگوں کے دو یا تین ممبر خزنتہ البضاعتہ کے بھی مذہبی کمیٹی کے ممبر انتخاب کرنے کے لئے نامزد کئے گئے ۔ جس وقت مولوی علی بخش خاں کے پاس اس روئداد کی نقل پہنچی ، وہ سخت ناراض ہوئے ۔ آٹھ سو روپے کا چندہ جو انھوں نے مدرستہ العلوم میں دینے کا وعدہ کیا تھا اس کے دینے سے انکار کیا اور مدرستہ العلوم کی مذہبی کمیٹی کے اہتمام وغیرہ سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو گئے ۔ جن دیندار عالموں سے درخواست کی گئی تھی کہ کمیٹی مذہبی کے ممبر انتخاب کریں اُن میں سے اکثر نے جواب تک نہیں دیا اور مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب نے یہ جواب دیا کہ ہرگاہ اس مدرسے میں شیعہ بھی ہوں گے اس لئے ہم شریک نہیں ہوتے ۔

اِن تمام واقعات کی طرف سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں اشارے کئے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جناب حاجی مولوی سید امداد العلی صاحب نے لکھا کہ " تم اپنے افعال و اقوال سے توبہ کرو اور

ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں"۔ اگرچہ اس امر کو اس بات سے جو پیش کی گئی تھی کچھ تعلق نہ تھا، بایں ہمہ میں اُس کو قبول کر لیتا مگر مجھے خیال ہوا کہ اگر ہمارے محبِ قلبی منشی چراغ علی صاحب (جو شیعہ مذہب رکھتے تھے) مجھ سے کہیں کہ "تم ہم سے ہو جاؤ تو ہم شریک ہوتے ہیں" تو پھر میں کیا کروں گا؟ بقول شخصے کہ "گوری کا جوبن چنگیوں ہی میں گیا" بیرانوں ہی تکابوٹی ہوئے گا۔ جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو متعصبانہ جواب دیا اُس سے ہر شخص جس کو خدا نے عقل اور محبت اور حبِ ایمانی دی ہو گی نفرت کرتا ہو گا۔ شیعہ مذہب کی تعلیم کا سلسلہ بالکل علیحدہ ہے، جس سے اہلِ سنت و جماعت کو کچھ تعلق نہیں۔ پس یہ کہنا کیسا بیجا تعصب ہے کہ ہر گاہ اُس مدرسہ میں شیعہ بھی ہوں گے اِس لئے ہم شریک نہیں ہوتے۔ خدا کرے کہ وہ یہ خیال فرماویں کہ ہندوستان میں شیعہ بھی رہتے ہیں، مکہ معظمہ کو سدھاریں مگر افسوس ہے کہ میں سنتا ہوں حج اور طواف میں بھی شیعہ ہوتے ہیں"۔

"افسوس ہے کہ شیعہ و سنی میں اس زمانے میں بہ نسبت اُس زمانے کے جب کہ امام محمد اسمٰعیل بخاری شیعوں سے روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں فرماتے تھے، نفاق اور شقاق بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ مگر حالت زمانے کی ایسی ہے کہ اگر شیعہ اپنے تعصب سے سنیوں کو چھوڑیں اور سنی اپنے تعصب سے شیعوں کو چھوڑیں تو دونوں غارت اور برباد ہو جائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں — دولت میں کم ہیں، علم میں کم ہیں۔ اگر پھر ان میں بھی[1] شیعہ و سنی و خارجی و ناصبی اور وہابی و بدعتی کا تفرقہ پڑے تو بجز برباد اور غارت ہونے کے اور کیا نتیجہ ہے؟ ارے کم بخت متعصبو! تم آپس میں لڑا کرنا اور ایک دوسرے کو کافر کہا کرنا مگر جو بات سب کے فائدے کی ہے اُس میں کیوں ایک دل ہو کر شریک نہیں ہوتے؟ عالمگیر نے ایک عامل کی بد دیانتی کا ذکر تنظیراً کسی دوسرے عامل سے کیا۔ اُس نے عرض کیا "حضور! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں" عالمگیر نے کہا "بلے مگر بوقتِ خوردن ہمہ برابر می شوند" پس اے بزرگو! اس بات میں کیوں تعصب کو کام فرماتے ہو جس میں سب کا فائدہ مشترک ہے"۔

"جناب سید الحاج مولانا حاجی علی بخش خاں صاحب سے جو معاملہ پیش آیا وہ تو طشت از بام ہے۔ اُن

---

[1] خدا کا شکر ہے کہ سر سید کی چیخ پکار سے ہمارے علماء اب اس تفرقے کو مٹانے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ ندوۃ العلماء نے سب فرقوں کو شریک کرنے کا ارادہ کیا ہے، اگرچہ بعض علماء اس کے خلاف ہیں۔ ۱۲

کی اور ہماری تو وہی مثل ہو گئی "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" یعنی وہ ہم کو بدعہد کہتے ہیں ہم اُن کو بدعہد کہتے ہیں۔ بہرحال کسی نے بدعہدی کی ہو، وہ بات جس سے کشیدگی پڑ گئی، اِس قدر ہے کہ تمام امورِ تعلیمِ مذہبی تنہا جنابِ ممدوح کو کیوں نہ سپرد کئے گئے دیگر بزرگانِ دین کو کیوں شریک کیا ؟ وما ھٰذا اِلّا شقاقٌ مبین "

سرسید کی مخالفت اگر محض دینداری اور حمیّتِ اسلامی کی بنیاد پر کی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ اُس کا نہ ہونا تعجب تھا کیونکہ اُس سے پایا جاتا کہ مسلمانوں کو دین و مذہب کی کچھ پروا نہیں رہی۔ چنانچہ اسی خیال سے سرسید اکثر کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میرے مخالف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اسلام کے برخلاف ہوں اور میرے خیالات سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے، پس جو کچھ وہ اپنی دانست میں اس خیال سے کرتے ہیں اُس پر وہ بزرگ تعریف کے لائق ہیں نہ مذمت کے " مگر افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ زیادہ مخالفتیں محض نفسانیت، خود غرضی یا عناد پر مبنی ہوتی تھیں اور اسی لئے بجائے اس کے کہ سرسید کے اقوال جو انہوں نے مذہبی مسائل کے متعلق جمہور کے خلاف لکھے ہیں راست راست بے کم و کاست بیان کئے جاتے، بیسیوں باتیں اُن کی نسبت غلط مشہور کی گئیں۔ اُن کی تفسیر کی نسبت اس بات کو عموماً شہرت دی گئی کہ سید احمد خاں نے قرآن کے تیس پاروں میں سے دس چھانٹ لئے ہیں۔ اور بیس نکال ڈالے ہیں۔ اکثر یہ بھی سنا گیا کہ انہوں نے سورۃ الرحمٰن میں "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ" صرف ایک جگہ رکھا ہے باقی مکرر سمجھ کر سورت میں سے نکال ڈالا ہے۔ حالانکہ وہاں تک تفسیر کی نوبت بھی نہیں پہنچی تھی۔

مولوی علی بخش خاں نے جو ایک کتاب موسوم بہ تائید الاسلام سرسید کے خلاف لکھی تھی اور جس کی بہت سی جلدیں وہ عرب میں شائع کرنے کو لے گئے تھے اُس میں بے شمار عقائد سرسید کی طرف ایسے منسوب کئے ہیں جو بالکل خلافِ واقع ہیں۔ مثلاً یہ کہ مادہ مثلِ ذاتِ باری تعالیٰ ازلی ہے، یا ذاتِ باری تعالیٰ خود مادی ہے یا یہ کہ باوجود قانونِ قدرت کے بعثتِ انبیاء کی ضرورت نہیں، یا یہ کہ جب علومِ جدیدہ یا انگریزی پڑھنے سے معلوم ہو کہ مذہبِ اسلام میں ضعف پیدا ہوگا تو مذہب اسلام کا ترک کر دینا لازم ہے۔

یا یہ کہ نبوتِ انبیائے سابقین یا کتبِ سماویہ کے انکار سے۔ یا معاذ اللہ قرآنِ شریف کے عمداً بول و براز میں آلودہ کرنے یا اُس کے پھینک دینے سے یا حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرانے سے یا معاذ اللہ کسی نبی کو گالی دینے سے۔ یا بہشت و دوزخ و رؤیتِ منت کے انکار سے، مانند دیانت دی، کے انکار سے

آدمی کافر نہیں ہوتا، یا یہ کہ گرمی کے موسم میں رمضان کے تیس روزے فرض نہیں ہو سکتے۔ یا تھوڑی سی شراب جو پکا متوالا نہ کر دے یا اتنا جوا کھیلنا جو بے قید نہ بنا دے حرام نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہ صلوٰۃ سے مراد مطلق دعا پڑھ لینی ہے، اور وہی بواسطے ادائے فرض کے کافی ہے۔ باقی جو ترکیب صلوٰۃ پنجگانہ کی مقرر ہے وہ اصول مخترعہ علماء کا اتباع ہے۔ اسی طرح اور بہت سے اتہامات سرسید کی نسبت کتاب مذکور میں کئے گئے ہیں جن کو سرسید نے اپنے مضمون دافع البہتان میں ایک ایک کر کے لکھا ہے اور ہر ایک کے تحت میں یہ فقرہ لکھتے جاتے ہیں کہ:-

لعنۃ اللہ علیٰ قائلہ و علیٰ معتقدہ"۔

مذہبی عقائد اور اقوال کے سوا اور طرح طرح کے اتہامات اُس خیر خواہِ خلائق پر لگائے جاتے تھے۔ اس بات کا تو سرسید کی وفات تک ہزاروں آدمیوں کو یقین تھا کہ اُنھوں نے اپنا سر دس ہزار روپے کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے، اکثر لوگ سمجھتے تھے کہ بعد مرنے کے انگریز اُن کا سر کاٹ کر لندن لے جائیں گے اور لندن کے عجائب خانے میں رکھیں گے۔

ایک بار یہی سر بیچنے کا تذکرہ سرسید کے سامنے ہوا، اُس وقت راقم بھی موجود تھا۔ اس مرحوم نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ فرمایا کہ "جو چیز خاک میں مل کر خاک ہو جانے والی ہے اُس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دانشمند لوگ اُس کو روپیہ دے کر خریدیں، اُس کے ڈسکشن سے کوئی علمی نتیجہ نکالیں اور اُس کی قیمت کا روپیہ قوم کی تعلیم میں کام آوے، دس ہزار چھوڑ دس روپے بھی اگر اُس کی قیمت میں ملیں تو میرے نزدیک مُفت ہیں"۔

منجملہ اُن بے شمار اتہامات کے جو سرسید پر لگائے جاتے تھے ایک وہ صریح بہتان تھا جو ۱۸۷۶ء میں بمقام بنارس اُن پر لگایا گیا۔ سرسید کے پنشن لے کر علی گڑھ آنے سے چند مہینے پہلے جب کہ حضور پرنس آف ویلز بنارس میں تشریف لائے، اُن کی تشریف آوری کی یادگار میں ایک شفاخانہ بنارس میں بننا تجویز ہوا تھا اور جو کمیٹی یادگار قائم کرنے کے لئے مقرر ہوئی تھی اس کے ایک ممبر سرسید بھی تھے۔ کمیٹی کی درخواست پر میونسپلٹی بنارس نے شفاخانے کے لئے ایک قطعہ زمین دینا تجویز کیا جس میں علاوہ اور کچے گھروں کے ایک چھوٹا سا خام چبوترہ بھی تھا جس کو مسلمانوں نے نماز پڑھنے کے لئے عارضی طور پر بنا لیا تھا۔ میونسپلٹی نے خود اُس میدان کو صاف کرا دیا اور جس طرح اور گھروں کے مالکوں کو کمیٹی یادگار سے معاوضہ دلوایا تھا اسی طرح اُس چبوترے کے معاوضے میں ۳۲ روپے دینے تجویز ہوئے۔ سرسید نے اِس خیال سے کہ یہ قلیل رقم مسلمانوں

کے کس کام آئے گی ۔ ما نواب لفٹننٹ گورنر سے جو اُن دنوں بنارس آئے ہوئے تھے ، عرض کر کے اُسی میدان کے قریب مسجد کے لئے ایک دوسرے قطعہ کے ملنے کی اجازت دلوادی اور شفاخانے کے چندے میں سے ڈھائی ہزار روپیہ مسلمانوں کو دلوا کر وہاں مسجد تعمیر کرادی ۔ بنارس کے مسلمان سرسید کے نہایت شکر گزار ہوئے اور مسجد کے پیشِ طاق پر یہ بیت کندہ کرانی تجویز کی ۔

"در آوانِ سعید و از برائے طاعتِ یزداں — بنا گردید ایں مسجد ز سعیِ سید احمد خاں"

مگر سرسید نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور اِس بیت کے کندہ کرانے کی اجازت نہیں دی ۔

بنارس میں تو یہ کارروائی ہو رہی تھی اور تمام ہندوستان کے دیسی اخباروں میں یہ لکھا جا رہا تھا کہ سید احمد خاں نے شفاخانے کے واسطے مسجد منہدم کرادی ۔ یہ شور و شغب ایک مدّت تک ہندوستان کے نالائق اخباروں میں رہا مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور اصل حال سے اخباروں کو مطلع نہیں کیا آخر سوسائٹی اخبار کے ایڈیٹر نے ایک پرچے میں لکھ دیا کہ ہم اصل حالات دریافت کر کے اپنے اخبار میں چھاپیں گے ۔ سرسید نے ایڈیٹر کی یہ تحریر اخبار میں دیکھ کر اُس کو لکھ بھیجا کہ مجھ پر سے الزام رفع کرنے کے لئے آپ اخبار میں کچھ نہ لکھیں اور اخبار نویسوں کو بکنے دیں ۔ چند روز بعد ایڈیٹر کی شکایت اخباروں میں چھپنی شروع ہوئی کہ جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کیا کیونکہ سرسید سے الزام رفع کرنے کا کوئی پہلو ہاتھ نہ آیا ۔ آخر علیگڈھ اخبار کے ایڈیٹر نے مجبور ہو کر ۲۶ رمئی ۱۸۷۶ء کے پرچے میں تمام حال اوّل سے آخر تک بحوالۂ کاغذاتِ مثل میونسپلٹی بنارس کے تحریر کیا ۔ اب اخباروں میں یہ چھپنا شروع ہوا کہ نہایت افسوس ہے نہ سرسید نے اصل حال سے مطلع کیا اور نہ سوسائٹی اخبار کے ایڈیٹر نے مدت تک اِس واقعہ پر کچھ روشنی ڈالی ۔ تب سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ایک آرٹکل لکھا جس میں تمام اخباروں کے اقوال جو سرسید کے برخلاف لکھے گئے تھے ، نقل کر کے ہر ایک پرچے پر جُدا جُدا ریمارک کئے ہیں ۔ ازاں جملہ اودھ اخبار میں جس کے ایڈیٹر اس وقت مرحوم غلام محمد خاں تپش تھے ، یہ فقرہ چھپا تھا " اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں یہ مضمون نہایت دیر میں چھپا یعنی اُس وقت جب کہ سید صاحب کی بدنامی تمام دُنیا میں مشتہر ہو چکی " اس پر سرسید مرحوم نے نہایت لطیف ریمارک کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں " اس کے عذر میں نہایت ادب سے اپنے شفیق کے سامنے حافظ کا یہ شعر پڑھتا ہوں ۔

در کوئے نیک نامی مارا گذر ندادند — گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

لیکن اگر ہمارے دوست اس فقرہ کو یوں ارقام فرماتے تو شاید لفظ بدنامی کے صحیح معنی ہو سکتے یہ مضمون

نہایت دیر میں چھپا، یعنی اُس وقت جب کہ تمام اخباروں کی بدنامی دنیا میں ہو چکی۔" پھر لکھتے ہیں " ہم کو امید ہے کہ خدا وہ دن بہت جلد لائے گا کہ ہماری قوم بدنامی کے صحیح معنی سمجھے گی اور ہمارے ملک کے اخبار خود اپنی عزت کرنی سیکھیں گے۔

اسی طرح بیسیوں اتّہام سرسیّد پر، مدرستہ العلوم پر، اُس کے طالب علموں پر لگائے جاتے تھے، مدرسہ کی نسبت ایسی خبریں اڑائی جاتی تھیں جن سے لوگوں کے دل میں نفرت پیدا ہو یا اُس کے معاونوں کو رنج اور مخالفوں کو خوشی ہو۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک ننگِ اسلام و اہلِ اسلام نے مشہور کر دیا کہ جس کوٹھی میں ہائی اسکول کی جماعتیں پڑھتی ہیں اُس کی چھت گر پڑی اور بیس تیس طالب علم اُس کے نیچے دب گئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں مگر چونکہ مثل مشہور ہے کہ " اپنا گھٹنا کھولئے اور آپ ہی لاجوں مریئے" ایسی باتیں بیان کرنے سے سوا اس کے کہ اپنی اور اپنی قوم کی نالائقی سارے زمانے میں مشہور ہو اور کوئی نتیجہ معلوم نہیں ہوتا۔

الغرض جب سرسیّد کے کفر و ارتداد اور واجب القتل ہونے کے فتوے اطرافِ ہندوستان میں شائع ہوئے تو اُن کی جان لینے کی دھمکیوں کے گمنام خطوط اُن کے پاس آنے لگے۔ اکثر خطوں کا یہ مضمون تھا کہ " ہم نے اِس بات پر قرآن اٹھایا ہے کہ تم کو مار ڈالیں گے " ایک خط میں لکھا تھا کہ " شیر علی جس نے لارڈ میو کو مارا تھا اُس نے نہایت حماقت کی کہ اگر وہ تم کو مار ڈالتا تو یقینی بہشت میں پہنچ گیا ہوتا۔" ۱۸۹۱ء میں جب کہ سرسیّد کالج کی طرف سے ایک ڈپوٹیشن لے کر حیدر آباد گئے تھے اور حضورِ نظام (خلد اللہ ملکہٗ) کے ہاں بشیر باغ میں مہمان تھے ایک مولوی نے ہمارے سامنے سرسیّد سے یہ ذکر کیا کہ کلکتہ میں ایک مسلمان تاجر نے آپ کے قتل کا مصمّم ارادہ کر لیا تھا اور وہ کسی شخص کو اس کام پر مامور کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کی مجھ کو بھی خبر ہوئی، چونکہ میں علی گڑھ کی طرف آنے والا تھا اُس سے خود جا کر ملا اور اُس سے کہا کہ میں علی گڑھ جانے والا ہوں اور میرا ارادہ سرسیّد احمد خاں سے ملنے کا ہے، جب تک میں اُن کے عقائد اور مذہبی خیالات دریافت کر کے آپ کو اطلاع نہ دوں آپ اس ارادے سے باز رہیں۔ چنانچہ میں علی گڑھ میں آیا اور آپ سے ملا اور بعد دریافت حالات کے اُس کو لکھ بھیجا کہ سیّد احمد خاں میں کوئی بات میں نے اسلام کے خلاف نہیں پائی۔ تم کو چاہیئے کہ اپنے منصوبے سے توبہ کرو اور اپنے خیالِ خام سے نادم ہو۔ معلوم نہیں کہ اُس مولوی کا یہ بیان صحیح تھا یا غلط، مگر سرسیّد نے جو یہ حال سن کر اُس کو جواب دیا وہ لطف سے خالی نہ تھا، انھوں نے

کہا "افسوس ہے کہ آپ نے اُس دیندار مسلمان کو اس ارادے سے روک دیا اور ہم کو ہمارے بزرگوں کی میراث سے جو ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے قتل ہوتے رہے ہیں محروم رکھا۔"

ایک دفعہ خاص علی گڑھ میں کسی نے بذریعہ گمنام تحریر کے سرسیّد کو یہ دھمکی دی کہ اگر آئندہ تم گاڑی میں سوار ہو کر اپنی کوٹھی سے باہر نکلے تو تمہاری خیر نہیں، میں بندوق مارے بغیر ہرگز نہ رہوں گا۔ مگر سرسیّد نے اِن دھمکیوں کا کبھی کچھ خیال نہیں کیا، نہ اُن کی کسی عادت میں فرق آیا اور نہ اُنھوں نے اپنی حفاظت کا کبھی کوئی خاص انتظام کیا۔ سرسیّد کی وفات سے چند مہینے پہلے ایک مخالف گروہ کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ اُن کا ارادہ سیّد کے قتل کرنے کا ہے اور فی الحقیقت اُس گروہ کا جوش اِس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ اُن سے ایسی حرکت کر بیٹھنا کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن سرسیّد کے بعض احباب نے اُن سے کہا کہ آپ سوار ہونا چھوڑ دیں، اور کچھ زائد چوکیدار رات کے پہرے کے لئے کوٹھی پر مقرر ہونے چاہئیں اور ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ کوئی اجنبی شخص بلا اطلاع اور بغیر تفتیشِ حال کے کوٹھی کے اندر نہ آنے پائے۔ سرسیّد یہ باتیں سن کر تعجب کرتے تھے اور ہنستے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے صلاح کار دوستوں کو نادان اور وسواسی سمجھتے ہیں اور ایسا انتظام کرنے کو ایک نہایت سبک حرکت خیال کرتے ہیں، چنانچہ کسی طرح کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کسی کے آنے جانے کی روک ٹوک کی گئی، نہ چوکیدار رکھے گئے نہ سوار ہونا موقوف ہوا۔

۱۸۹۸ء میں جب پہلی بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا منعقد ہونا لاہور میں قرار پایا تو خان بہادر برکت علی خاں جن کی تحریک سے لاہور میں اس جلسے کا ہونا قرار پایا تھا اُن کے ایک مخالف کی طرف سے کانفرنس کی تاریخوں سے ایک دن پہلے ایک نہایت گستاخ تحریر سرسیّد کے نام بھیجی جس میں علاوہ اور نالائق باتوں کے نہایت بُرے لفظوں میں یہ مطلب بھی ادا کیا گیا تھا کہ تم کانفرنس میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا ورنہ جو حال کل رات کو خان بہادر کا کیا گیا ہے اُس سے بدتر تمہارا حال کیا جائے گا۔ سرسیّد نے جو وقت علیگڑھ سے لاہور کی روانگی کا مقرر تھا اُس میں کچھ تبدیلی نہیں کی صرف خان بہادر کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لئے چلنے سے پہلے اُن کو تار دیا، اور جب اُن کی خیریت معلوم ہو گئی فوراً لاہور کو روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچ کر وہ تحریر اُنھوں نے خان بہادر اور سردار محمد حیات کو دکھائی۔ دونوں صاحب اُن گستاخیوں کو دیکھ کر جو سرسیّد کی نسبت کی گئی تھیں شدتِ غیظ و غضب سے از خود رفتہ ہو گئے، کاتب کی نسبت یقین ہو گیا تھا کہ اخبارِ رفیقِ ہند کا ایڈیٹر ہے اور سرسیّد نے خود اس کا خط اچھی طرح پہچان لیا تھا، با ایں ہمہ اس

مرحوم کی خواہش یہ تھی کہ کاتبِ خط کی اِس حرکت سے درگذر کی جائے اور اُس کو کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ خود اس تحریر کے لکھنے سے انکار کرتا تھا، مگر خان بہادر اور سردار صاحب اور دیگر اہلِ پنجاب نے سرسید کی سفارش اُس کے باب میں منظور نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اپنا اخبار جو غالباً بند ہو گیا تھا چند مدت بعد پھر جاری کیا۔ پہلے یہی اخبار سرسید کا حد سے زیادہ طرفدار، مداح و ثناخواں تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۴ء میں جب سرسید نے پنجاب کا سفر کیا اور لاہور میں پہنچے، تو اُسی اخبار میں سرسید کی نسبت ایک لمبی مدحیہ عبارت چھپی تھی جس کے سرے پر یہ شعر لکھا تھا

"مرحبا سیدِ اولادِ نبیِ مدنی　جانِ جاں باد فدایت کہ عجیب زنی"

مگر جب دوسری بار یہ اخبار جاری ہوا تو سرسید کی مخالفت میں تمام اگلے پچھلے مخالفوں سے گوئے سبقت لے گیا۔ وہی شخص جس کی نسبت پہلے "سیدِ اولادِ نبیِ مدنی" لکھا گیا تھا اِس پرچے میں کوئی ایسی بُرائی نہ تھی جو اُس کی طرف منسوب نہ کی گئی ہو اور کوئی آلہ لوگوں کو اُس سے بدظن کرنے کا ایسا نہ تھا جو اس پرچے میں استعمال نہ کیا گیا ہو۔ سرسید کے دوست اُس کی زبان درازیاں دیکھ کر بگڑتے تھے اور اُس کا جواب لکھنے پر آمادہ ہوتے تھے مگر سرسید سب کو منع کرتے تھے اور کسی کو اُس سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "موسم کی آندھی ہے چند روز میں خودبخود فرو ہو جائے گی"۔

اب سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸۹۹ء میں وہ ایک مدت تک بند رہ کر تیسری بار پھر جاری ہوا ہے اور چشمِ بددور اب بھی باوجود اس کے کہ سرسید دُنیا سے رحلت کر چکے ہیں، اپنی وضعداری نباہے جاتا ہے، لیکن اب سرسید کا نام صراحتہً کم لیتا ہے بلکہ جو کچھ سرسید یا اُن کے کاموں کے برخلاف لکھنا ہوتا ہے اُس کو علی گڑھ مشن پر ڈال دیتا ہے۔ مگر ہم خوش ہیں کہ سرسید کی مخالفت کی بدولت اب کی بار اُس میں خودبخود ایک ایسی خوبی پیدا ہو گئی ہے جو ملک کے حق میں نہایت مفید ہے۔ وہ برخلاف اُن اخباروں کے جو ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں، دونوں قوموں میں آشتی اور مصالحت کی بنیاد ڈالتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی یہ پالیسی جیسا کہ اُس کے مخالف خیال کرتے ہیں کسی غرض پر مبنی کیوں نہ ہو ملک کے حق میں بہرحال مفید ہے۔

ایک شخص نے چند اجزا سرسید کی لائف کے نام سے لکھ کر اُن کے پاس بھیجے جس میں بہت سی باتیں خلافِ واقع درج تھیں اور جابجا اُن کی تنقیص کی گئی تھی مگر مؤلف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرسید نے اُس پر یہ ریمارک کر کے اخبار میں چھپوا دیا: "ایک ہمارے شفیقِ غائبانہ نے، جن سے ہم سے ملاقاتِ ظاہری

نہیں ہے، ہماری لائف اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے ہم خود واقف نہیں ہیں۔ ہم اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ رباعی حسبِ حال لکھتے ہیں:۔

اے آنکہ مرا ندیدہ بشناختۂ ‏ ‏ ‏ نادیدہ تصورم چساں ساختۂ

با این دبے مثال مانندیم ‏ ‏ ‏ حقا کہ ندیدۂ و نشناختۂ

سب سے زیادہ سرسید کا ذکرِ خیر پنج اخباروں میں ہوتا تھا جن کے ایڈیٹر اور پروپرائٹر عموماً مسلمان تھے اور گرم بازاری صرف اس بات پر منحصر تھی کہ اپنی قوم کے خیر خواہ اور جاں نثار پر پھبتیاں اڑائیں، اُس کے کارٹون بنائیں، اُس کی ہجو کے اشعار شائع کریں، اُس کی خوبیوں کو عیب بنا کر دکھائیں اور اس طرح نہ صرف آپ کو بلکہ تمام قوم کو جس کے مذاق پر اخباروں کی برائی بھلائی کا انحصار ہے دُنیا میں رسوا اور بدنام کریں۔ سرسید بھی ان اخباروں کے آوازے تو ازے سُنتے اُن کے عادی ہو گئے تھے یہاں تک کہ جس اخبار میں اُن پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تھی اُس کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے۔ چنانچہ تہذیب الاخلاق میں ایک جگہ لکھتے ہیں "ہمارا حال تو اُس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے۔"

اسی طرح سرسید کی تمام تحریریں، جو اُس مخالفت کے زمانے میں تہذیب الاخلاق میں چھپتی تھیں نہایت لطیف اور دل چسپ ہوتی تھیں، ازاں جملہ دو تین فقرے مختلف مقامات سے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں "ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع سہارن پور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی ...... ایک صاحب نے کہا کہ "ہے تو کرسٹان مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اُسی کرسٹان سے ہوگی" یہ نقل سُن کر میں نہایت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہو، تو کرسٹانی خطاب پر ہزار مسلمانی نثار ہے ... صائب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے۔ اُس نے نہایت دلی جوش سے کہا کہ "آں قزساق ہمہ خوش می گوید" صائب کہتا ہے کہ "جیسی عزت مجھ کو قزساق کے لفظ سے حاصل ہوئی اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں" اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کرسٹان کا میرے لئے عزتِ قومی کا باعث ہو"۔

ایک جگہ لکھتے ہیں "حضرات ہماری تو وہی مثل ہے کہ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا، از برادراں دور

وازبیگانگاں نفور، ایک گوشے میں پڑا ہوں، نزدیک و دوُر، یگانہ و بیگانہ سے لعن وطعن سُنتا ہوں، جس طرح بیگانگاں مجھ سے نفرت کرتے ہیں برادرانِ وطن بھی اِلّا ماشاء اللہ اسی طرح متنفر ہیں۔ قصور یہ کہ اپنی دانست میں بھائیوں کا بھلا چاہتا ہوں، اُن کی عام رائے کی مخالفت سے نہیں ڈرتا، بلکہ جو اُن کے بھلے کی ہے وہی کہتا ہوں۔ یہی کم بخت خصلت ہے جس نے مجھ کو اس حال پر پہنچایا ہے"۔

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں ۔" دنیا میں کوئی نہیں رہا، پیر، پیغمبر، زاہد، خدا پرست، نہ فاسق نفس پرست، سب کو گذرنا ہے مگر میں سمجھتا ہوں، بشرطیکہ میری سمجھ کی غلطی نہ ہو۔ کہ حضرت مرزا جانِ جاناں مظہر علیہ الرحمۃ کو بلحاظ اُن نسبتوں کے جو مجھے اُس خانوادہ سے ہیں نانہ سے پردادا کہنا زیبا ہے، اُن کا یہ شعر میری خاکِ مرقد کا کتابہ ہوگا ؎

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

سرسید نے جو لباس وشعار وطرزِ ماندوبود اور طرزِ معاشرت وغیرہ میں تعلیم یافتہ ترکوں کا طریقہ اختیار کیا تھا اور جس سے انگریزوں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا کرنا مقصود تھا، مسلمان تو اُس طریقے کو ناپسند کرتے ہی تھے بلکہ اس کو عیسائی ہو جانے کے برابر سمجھتے تھے مگر تماشا یہ ہے کہ بعض متعصّب اور مغرور انگریز بھی اس سے نہایت ناراضی ظاہر کرتے تھے اور گویا اس بات کا ثبوت دیتے تھے کہ انسانی اخلاق میں منو کے زمانے سے آج تک باوجود اس قدر علمی اور عقلی ترقیات کے ایک ذرہ برابر بھی ترقی نہیں ہوئی اور جو فرق منو نے شودر اور برہمن میں رکھا تھا وہی فرق اس زمانے کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے شائستہ لوگ حاکم ومحکوم میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ فیاض طبع اور کشادہ دل انگریز جو ہندوستان میں رہ کر انگلستان کے اصلی جوہر یعنی آزادی کو کھو نہیں بیٹھتے وہ ان باتوں کا کچھ خیال نہیں کرتے اور ہندوستانیوں سے خواہ وہ کسی لباس میں ہوں ناک بھوں نہیں چڑھاتے مگر تنگدل انگریزوں کو ہرگز گوارا نہیں کہ ہندوستانی جو ہماری جوتیوں کے تلے ہیں وہ ترکش کوٹ پتلون اور ترکی ٹوپی اور انگریزی بوٹ پہن کر ہم سے ملنے کو آئیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بعض اوقات اُن لوگوں کو جو وضع اور لباس میں سرسیّد کی پیروی کرتے تھے سخت مشکلیں پیش آئیں بلکہ خود سرسید اسی روک ٹوک کے سبب بعض یورپین افسروں سے، باوجودیکہ برسوں ایک جگہ رہے، کبھی نہ مل سکے۔ مگر جس بات کو اُنھوں نے اپنے نزدیک بہتر سمجھا کسی کی مخالفت کے خوف سے اس کو ترک نہیں کیا، جیسا سمجھا ویسا ہی کہا اور وہی کیا۔ جب کبھی

اُن کو معلوم ہوُا کہ کسی افسر یا حاکمِ اعلیٰ نے ہندوستانیوں کے یورپین ڈریس پر اعتراض کیا ہے فوراً اخبار میں اُس کا جواب لکھا یہاں تک کہ جب لارڈ ڈفرن نے اسی تبدیلِ وضع کے خلاف ایک عام مجمع میں کچھ تقریر کی اور وہ اخباروں میں چھپی تو سر سید نے ایک نہایت زبردست آرٹکل اس کے برخلاف لکھ کر اپنے اخبار میں شائع کیا اور اس طرح کے بے شمار آرٹکل سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں اُن کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔

جو مسلمان سر سید کے مخالف تھے وہ بھی انگریزوں کی اس مخالفت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولوی امداد العلی اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں "بعض اہالیانِ ہند نے واسطے دھوکا دینے حکامِ وقت کے اپنا طریقۂ مذہبی اور لباسِ ملکی اور وضع قومی چھوڑ کر برخلاف اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں اور ہم پیشوں کے جاکٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا اس مراد سے اختیار کیا ہے کہ ہم کو حکامِ وقت جن کے لباس اور طعام کی یہ وضع ہے، اپنا مخلص اور مطیع اور پیرو جانیں اور اُن کے محکومین ہم کو حکام کا ہمسر، مانند صاحب لوگوں کے سمجھیں۔ سو نتیجہ اُن کے خبثِ طینت کا کہ مکر و دغا ہے یوں ظاہر ہے کہ اکثر حکام سوائے فریبی و دغاباز سمجھنے کے اُن کو اچھا نہیں جانتے اور اُن کی وضع اور چال چلن کو پسند نہیں کرتے۔"

باوجود ان مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھیں سر سید نے جو اُن کے مقابلے میں ابتدا سے خاموشی کا طریقہ اختیار کیا تھا بغیر اشد ضرورت کے کبھی اُس کو ترک نہیں کیا۔ نہ وہ خود جواب دینا چاہتے تھے اور نہ کسی دوست کا اپنی طرف سے جواب دینا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کی بہت سی تحریریں دیکھی گئی ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے دوستوں کو مخالفوں کا جواب دینے سے روکا ہے، بلکہ ایک دفعہ خود راقم کو ایک اسی قسم کی تحریر اخباروں میں چھپوانے پر نہایت شرمندہ کیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کو اپنی سچائی پر کس قدر بھروسا تھا اور کہاں تک وہ سلف کے اِس سچے مقولے پر یقین رکھتے تھے کہ "مَا دَلَّ ذُخِیْ دِلُوا تَفَقَ الْعَالَمُ عَلٰی خِلَافِہٖ"۔

اُنھوں نے ۱۸۶۹ء میں ولایت سے سوسائٹی اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا تھا "رد و قدح پر متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اِس لئے کہ جو بات جھوٹی ہے وہ تھوڑے ہی زمانے میں مثل جھوٹے موتی کے بے آب ہو جاوے گی، خواہ وہ بات خود اُس شخص کی (یعنی میری) ہو اور خواہ اُس کے مخالف کی۔ پس میں نہایت عاجزی سے آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ جو لوگ میری بُرائی لکھیں آپ بلا تکلف اپنے اخبار میں نقل کیجئے، صرف اُس

کی صحت اور عدمِ صحت پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑ دیجئے۔ امید ہے کہ آپ اپنی عنایت سے میری التماس کو قبول فرمائیں گے"۔

لیکن اگر کسی انگریز کا مضمون سرسید کے خیالات یا مدرسۃ العلوم کے خلاف کسی انگریزی اخبار میں چھپتا تھا تو اُس کا جواب دئے بغیر کبھی نہ رہتے تھے اور اکثر ایسے مضامین کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ کے ساتھ چھپوا دیتے تھے، جس زمانے میں اُنہوں نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اکثر یورپین افسر اُن کے مخالف ہو گئے تھے اور جیسا کہ پہلے حصّے میں مذکور ہو چکا ہے کمیٹی نے مدرسے کے لئے جس قطعۂ زمین کے ملنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی تھی، ضلع کے حکّام اُس کا ملنا نہیں چاہتے تھے۔ خصوصاً ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم، اضلاعِ شمال مغرب اور صاحب کلکٹر ضلع علی گڑھ سخت مخالف تھے یہاں تک کہ جو مضمون کسی انگریزی اخبار میں مدرسہ یا بانیٔ مدرسہ کے خلاف چھپتا تھا، سرسید کو انہیں دونوں صاحبوں پر اُس کے لکھنے کا گمان ہوتا تھا۔ چنانچہ انڈین آبزرور مطبوعہ ۱۸۷۲ء میں جو ایک سخت آرٹکل مدرسۃ العلوم اور سرسید بلکہ تمام مسلمانوں کے برخلاف چھپا تھا، اُس پر سرسید کو یہی خیال ہوا کہ ان دونوں افسروں میں سے کسی کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر سرسید نے دو آرٹکل تہذیب الاخلاق میں لکھے جن کا انگریزی ترجمہ ساتھ ہی ساتھ چھاپا تھا۔ اُس میں سے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"انڈین آبزرور مطبوعہ ۲۰ ستمبر ۱۸۷۲ء میں آرٹکل لکھنے والے نے ہم کو (یعنی مسلمانوں کو) سخت متکبر اور متعصب کہا ہے اور یہی سبب ہم کو گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے کم فائدہ حاصل کرنے کا قرار دیا ہے۔ اس آرٹکل کو پڑھ کر اوّل اوّل تو ہم کو بہت تردد اور خوف معلوم ہوا، تردد تو اس بات کا ہوا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے؟ مسٹر ڈی پی آئی[1] کا یا مسٹر سی ایس[2] کا؟ اور خوف اِس بات کا ہوا کہ اگر پچھلے کا ہو تو ایسا نہ ہو کہ وہ کبھی ہمارے ملک کا لفٹنٹ گورنر ہو جائے اور مسلمانوں کی زندگی اُس کے ہاتھ میں پڑ جائے۔ مگر چونکہ اُس آرٹکل کے مضمون اکثر وہ ہیں جو مدّت ہوئی کہ ہم سُن چکے تھے اس لئے ہمارا تردّد اور خوف دونوں جاتے رہے"۔

"مگر ہم کہتے ہیں کہ ہاں ہم (یعنی مسلمان) متکبّر بھی ہیں اور متعصّب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طریقۂ تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے تکبّر اور تعصّب میں بھی خلل نہ آوے اور ہم تعلیم بھی پاویں"۔

"انڈین آبزرور کا آرٹکل لکھنے والا ہم کو طعنہ دیتا ہے کہ" خاص مسلمانوں کے کالج قائم کرنے کے لئے کافرِ دل (یعنی انگریزوں) سے کیوں مدد لی جاتی ہے؟ اور یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر ایسا مدرسہ خود مسلمانوں ہی کی کوشش

---

[1] یعنی ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن ۱۲ [2] یعنی سول سرونٹ

سے قائم ہوگا تو یہ ترقی و بہتری کی دلی خواہش کا ثبوت ہوگا لیکن اگر لارڈ نارتھ بروک صاحب جیسے لوگوں کی سخاوت سے قائم ہوا تو کچھ دلی خواہش کا نشان نہ ہوگا۔ اگرچہ ایسا لکھنا ایک عیسائی کو خصوصاً اُس قوم والے کو جس سے ہم نے مدد مانگی اور جو اپنے تئیں انسان کی خیرخواہ اور سچی دوست سمجھتی ہے زیبا نہ تھا مگر ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ جو کچھ اُس نے لکھا ہے بالکل صحیح اور بالکل سچ ہے اور اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ نہایت نالائق، بے شرم، بے حیا اور تمام دنیا کی قوموں میں ذلیل ہوگی جو اب بھی ایسے طعنے سُن کر اس مدرسہ کے قائم ہو جانے میں دل و جان سے، روپیہ سے اور کوشش سے مدد نہ کرے گی۔

"انڈین آبزرور میں آرٹیکل لکھنے والا ہماری ناقص انگریزی کی ہنسی اُڑاتا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ رنج نہیں کیونکہ یہ جو کچھ ہے انڈین ایجوکیشنل سسٹم کی عمدگی کا ثبوت ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں اور ہمارے ملک کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کی ایسی ہی تعلیم ہے اور صرف ہماری ہی ایسی تعلیم نہیں بلکہ ہزاروں در ہزاروں کی ایسی تعلیم ہے اسی لئے اُس سے بھاگتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔"

پھر دوسرے آرٹیکل میں اُسی انڈین آبزرور والے آرٹیکل کی نسبت ایک جگہ لکھتے ہیں: "سلیکٹ کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان میں یہ سوال بحث میں آیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا اثر ایسا کیوں نہیں ہوتا جیسا کہ انگلستان میں ہوتا ہے؟ سو اس کا جواب انڈین آبزرور کا آرٹیکل لکھنے والا دیتا ہے کہ "ان کو (یعنی مسلمانوں کو گورنمنٹ کی ذات سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سؤر کے بالوں سے ریشم کی تھیلی بنا دے" پس اب ہم اپنی قوم سے پوچھتے ہیں کہ علم کے دیوتا نے ہم کو سؤر کا خطاب دیا، آیا ہم کو اسی خطاب میں خوش رہنا چاہیے یا کوشش کر کے اور اپنی حالت کو درست کر کے دنیا کو بتلانا چاہیے کہ اس خطاب کا مستحق کون تھا؟"

"دوسرا جواب اس سوال کا اُس آرٹیکل لکھنے والے نے یہ دیا ہے کہ "جس شے پر اس کا (یعنی تعلیم کا) اثر ہوتا ہے وہ دونوں ملکوں (یعنی ہندوستان اور انگلستان) میں مختلف ہے گو آلہ دونوں کا ایک ہی ہو، سنگریزہ یا کنکر سے ایک روشن ہیرا یا لعل نہیں بن سکتا" پس اب ہم پوچھتے ہیں کہ آیا ہماری قوم کو سنگریزوں میں اور کنکروں میں پڑا رہنا ہے اور ہر ایک کی ٹھوکریں کھانا اور دشنام سننا ہی پسند ہے یا اپنی حالت میں ترقی کرنے کا کچھ ارادہ ہے؟ یہ سچ ہے کہ جو شخص بدزبانی کسی کی نسبت استعمال میں لاتا ہے وہ خود اولاً اپنے آپ کو ان سو لائنڈ ثابت کرتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس آرٹیکل کا لکھنے والا ہم کو متکبر اور سخت متعصب بناتا ہے۔ حالانکہ وہ ہم سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہم کو اس پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ جو لفظ ہمارے دشمن نے بھی ہمارے حق میں کہے ہوں

اُن سے بھی ہم کو نصیحت پکڑنی چاہیئے"۔

ایک مقام پر اُس آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے "کمیٹی کو مناسب ہے کہ اس امر کی تفتیش کرے کہ آیا اُس قوم (یعنی مسلمانوں) میں کبھی کوئی بڑا فلسفی یا شاعر پیدا ہوا ہے جو ایمان داری کے ساتھ اپنی نسبت خود یہ باتیں بیان کرے جو کمیٹی نے بیان کی ہیں"۔ اگر اس عبارت کا یہ مطلب ہو کہ ہمارے ملک کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے وقت میں (یعنی اُن کے طریقۂ تعلیم کے اثر سے) کوئی شخص ہماری قوم کا ایسا ہوا ہے یا نہیں؟ تو اس کا تو جواب صاف ہے کہ نہیں اور اگر کبھی کے لفظ سے غیر مقید زمانہ مراد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آرٹیکل کے لکھنے والے کو دوبارہ کیمبرج یونیورسٹی میں جاکر ہسٹری آوف فلاسفی اور ہسٹری آوف اورینٹل لٹریچر پڑھنی چاہیئے۔

انڈین آبزرور کے مذکورہ بالا آرٹیکل میں جو سخت الفاظ مسلمانوں کی نسبت استعمال کئے گئے ہیں اور جن کا جواب سرسید کو بھی کسی قدر سختی کے ساتھ دینا پڑا اُن سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۸۷۳ء تک اینگلو انڈینز کے خیالات مسلمانوں کی نسبت کیسے تھے اور وہ مسلمانوں کی قوم کو کس قدر ناقابل اور اُن کی تعلیم کے لئے کوشش کرنے کو کس قدر بے سود اور لاحاصل سمجھتے تھے۔ اور مدرسۃ العلوم کی نسبت کیسے مخالفانہ خیالات رکھتے تھے۔ باایں ہمہ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ آج اُسی قوم کے نام اعلیٰ افسر اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکام اور ارکان سلطنت اس مدرسہ کے صرف مدح و ثنا خواں ہی نہیں بلکہ دل سے اُس کے مددگار ہیں اور اُس کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی نسبت اُن کے وہ خیالات نہیں رہے جو اب سے ستائیس برس پہلے تھے تو ایک عجیب انقلاب معلوم ہوتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ سرسید کی کوشش، حسنِ تدبیر، صبر اور استقلال نے اس قلیل عرصے میں مدرسۃ العلوم اور مسلمانوں کی حالت کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا"۔

سرسیّد کی کامیابی اور اس کے اسباب

سرسید کو اپنے مقاصد میں جو غیر متوقع کامیابی گذشتہ تیس برس کے اندر اندر ہوئی، وہ اس حد سے گذر گئی ہے کہ لوگوں کو باور کرانے کے لئے اُس کا ثبوت دینے کی ضرورت ہو۔ پس بجائے اس کے کہ اُس کا ثبوت پیش کیا جائے اُس کے اسباب کا سُراغ لگانا بہتر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جو امر تیس برس پہلے محال معلوم ہوتا

تھا اُس کا اس قدر جلد وقوع میں آجانا بلا شبہ اُس کے اسباب کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور چونکہ قوم کو ابھی سرسید جیسے بہت سے کامیاب شخصوں کی ضرورت ہے اس لئے امید ہے کہ اُن کی کامیابی کے اسباب کا بیان کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ سرسید کی کامیابی کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ اُنہوں نے جتنے کام کئے وہ سب زمانے کے مقتضا کے موافق کئے اور اس لئے زمانہ خود اُن کی تائید کرنے والا تھا۔ پس اُن کی کامیابی اُسی قدر تعریف کے لائق ہے جیسے اُس تیراک کی تیرائی جو دریا کے بہاؤ پر بے تکان بہتا چلا جاتا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس خیال میں کسی قدر غلطی ہے۔ زمانے کا تقاضا اور چیز ہے اور زمانے کا اقتضا اور چیز۔ بے شک زمانے کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمان اپنی حالت درست کریں، وقت کی ضرورتوں کو سمجھیں اور خوابِ غفلت سے بیدار ہوں مگر اُس کا اقتضا بالکل اس کے برخلاف تھا، اُس کا اقتضا وہ تھا جو ملکہ سبا نے سلیمانؑ کا پیغام سُن کر اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ "اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً" حکمران قوم جب مفتوح ہوتی ہے خواہ فاتح قوم دانشمند اور منصف ہو اور خواہ وحشی اور ظالم، دونوں صورتوں میں اُس کا میلان پستی اور تنزل کی طرف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اس کو درحقیقت گورنمنٹ نہیں گراتی بلکہ وہ آپ ہی اپنے بل میں گرتی چلی جاتی ہے۔ جس چال پر وہ قدیم سے چلی آتی ہے اس کے خلاف دوسری چال چلنا اُس کے لئے ایسا ہی دشوار ہوتا ہے جیسے کسی جسم کا اپنی حیّزِ طبیعی کے خلاف حرکت کرنا۔ مفتوح قوم کو گو کہ اُس کی اقبال مندی کا زمانہ بالکل ختم ہو گیا ہو، مُدت دراز تک اقبال مندی کے خواب برابر نظر آتے رہتے ہیں اور اُس کی امیدوں کا طلسم بدستور بندھا رہتا ہے۔ اُن کو اپنی پستی اور تنزل کا شعور مطلق نہیں ہوتا اور اپنی حالت کی اصلاح کا کبھی بھول کر بھی اُن کے دل میں خیال نہیں گزرتا۔ اگر بالفرض اپنے تنزل پر متنبہ ہوتے ہیں تو اُس کو زمانہ کی ناانصافی اور اپنی حق تلفی پر محمول کرتے ہیں، اپنی نالائقی کی طرف ہرگز منسوب نہیں کرتے۔ اسی بھلاوے میں وہ گرتے گرتے اُس گہرے گڑھے میں جا پڑتے ہیں جہاں سے اُبھرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ وہ کچھ تو ڈیڑھ سو برس سے پست ہونے چلے ہی آتے تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ واقعہ ۱۸۵۷ء نے اُن کو اور بھی نیچے گرا دیا اب اُن کے اُبھرنے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور وہ وقت کچھ دور نہ تھا کہ امریکہ اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی طرح ملک میں اُن کا عدم و وجود برابر ہو جائے۔ پس اگر دنیا فی الواقع عالمِ اسباب ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ

مسلمانوں نے اب تک جو کچھ اپنی پولیٹیکل حالت میں ترقی کی ہے وہ صرف سرسید کی چہل سالہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "غدر کے زمانے میں اور اس کے بعد بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بدلی چھائی رہی۔ اس خوفناک زمانے کے تمام مکروہات اُن کی طرف منسوب کئے جاتے تھے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تعصب (یعنی انگریزوں کا) زیادہ تر بےجا تھا مسلمانوں کو اس کا بہت رنج تھا اور یہ بات اُن کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ بظاہر کسی شخص نے ان کی حمایت کی حامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمّے لیا اور جہاں تک اُس کی قدرت میں تھا، اُس نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر بنا دیا"

تھیوڈور ماریسن اپنے اُس آرٹیکل میں جو سرسید کی وفات کے بعد مئی ۱۸۹۸ء کے کالج میگزین میں چھپا تھا، لکھتے ہیں کہ "غدر سے پہلے اور اُس کے بعد چند سال تک تقریباً تمام انگریز مسلمانوں کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے اور اعتبار کے اعلیٰ عہدوں پر اُن کو ترقی دینے اور ان کی خواہشوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ نہایت نمایاں انقلاب جو فی الحال اینگلو انڈینز کے خیالات میں ظاہر ہوا ہے یہ سرسید ہی کی تلقین کا نتیجہ ہے۔ اُس نے مسلمانوں کے دل میں جہاں نفرت اور بدگمانی تھی وہاں اعتماد اور وفاداری کا درخت لگا دیا اور انگریزوں کو یقین دلا دیا کہ مسلمان وفادار ہیں"

اکیڈمی نام ایک ولایت کا اخبار مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۸۵ء کرنل گریہم کی لائف آف سرسید احمد خاں پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے "کم سے کم اس قدر تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی دنیا کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنا نہیں چاہیئے۔ کروسیڈ کا زمانہ گزر گیا، اب اسلام دوسری جانب جوش کر رہا ہے۔ اگرچہ اولڈ فیشن مسلمان سویلیزیشن کی ترقی کے مخالف ہیں مگر اُن میں ایک آزاد خیال گروہ بھی موجود ہے۔ یہ گروہ صرف ٹرکی ہی میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ اس ملک (یعنی انگلستان) کے لئے جو مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی کا مالک ہے، نہایت ضروری ہے کہ اس امر کی نسبت عمدہ واقفیت حاصل کرے۔ اس سوال کے فیصلے پر کہ آیا اسلام اور شائستگی باہم موافقت رکھتے ہیں یا نہیں، پانچ کروڑ آدمیوں کی آئندہ زندگی کا مدار ہے۔ کیا یہ آبادی (یعنی ہندوستان کے مسلمان) روز بروز مخالف ہوتی جائے گی؟ کیا اس کے سرگروہ جمیر جہالت کے ساتھ کسی جگہ ہمدردی

کریں گے تاکہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں میں جو اور ملکوں میں ہیں، چلے جائیں ؟ اگر ایسا ہے تو انگلستان جس قدر جلد مصائب کے مقابلے کے لئے تیار ہو اُسی قدر بہتر ہے۔ مگر اس معاملے میں کرنل گریہم کی کتاب "سید احمد خاں" نے ایک خفیہ روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جو مغربی خیالات کی ہمدردی کا ایک عجیب و غریب تماشا دکھاتی ہے جو ایک انگریزی زبان سے ناواقف شیخ العرب کے خون نے ظاہر کیا ہے۔"

غرض کہ یہ خیال کرنا ٹھیک نہیں کہ سرسیّد کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اُن کی کوششیں زمانے کے مقتضا کے موافق تھیں، بلکہ اُن کی کامیابی صرف اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جو کوششیں استقلال، دانائی اور راست بازی کے ساتھ کی جاتی ہیں وہ زمانے کے اقتضا پر غالب آسکتی ہیں۔ سب سے بڑا ثبوت اس بات کا کہ زمانے کا تقاضا جب تک کوئی زبردست ہاتھ اُس کی پُشتی پر نہ ہو، کچھ نہیں کر سکتا، یہ ہے کہ مدتِ دراز سے گورنمنٹ ہندوستان میں تعلیم نسواں جاری کرنا چاہتی ہے اور بیس پچیس برس سے تمام تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں میں اس کا جوش پھیلا ہوا ہے، اخباروں اور میگزینوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کا زور شور ہے، بیسیوں ناول اور رسالے اسی باب میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں، جابجا اسی غرض سے کمیٹیاں قائم ہیں، اس سے زیادہ زمانے کا تقاضا اور کیا ہو سکتا ہے؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک جیسی کہ چاہیئے کامیابی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کا کوئی زبردست حامی مثل سیّد احمد خاں کے کھڑا نہیں ہوا۔

ہمارے نزدیک سرسیّد کی کامیابی کا اصل سبب یہ تھا کہ اُن کی ذات میں وہ تمام خصلتیں اور اخلاق بالطبع موجود تھے جو ایک ریفارمر کی ذات میں جمع ہونے ضرور ہیں۔ ریفارمر کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز سچائی اور راستبازی ہے کہ جس بات کو وہ اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھے، اگرچہ ایک زمانہ اُس کا مخالف ہو، اس کے ظاہر کرنے میں کچھ پس و پیش نہ کرے۔ راستبازی کی مثال بعینہٖ ایسی ہے جیسے پختہ کی چنائی جو عین برسات کے موسم میں کی جائے۔ راستباز آدمی کو بلاشبہ بہت سی مخالفتوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور اس لئے اس کی کامیابی میں بہت دیر لگتی ہے۔ مگر جو ردّا ایک دفعہ رکھا گیا، پھر اُس کو جنبش نہیں ہوتی۔ سرسیّد کو اپنی راستبازی کی بدولت بعض اوقات، جیسا کہ اس کتاب میں جابجا بیان ہوا ہے، سخت خطرات پیش آئے ہیں مگر بہت جلد وہ تمام خطرے رفع ہو گئے اور راستی نے اپنا پائدار نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ استقلال جس کی نسبت کہا گیا ہے "الصبر مفتاح الفرج"، وہ بھی بغیر راستبازی کے پیدا

نہیں ہوتا کیونکہ جس کو اپنے کام پر بھروسا نہیں ہوتا وہ کبھی اپنے ارادے پر قائم نہیں رہ سکتا چنانچہ سرسید نے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، سید مہدی علی خاں کو ولایت سے لکھا تھا کہ "جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے۔ پس اگر میرا کاروبار سچا اور میری نیت نیک ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔"

اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ میں سرسید کا رسوخ و اعتبار سب سے بڑھ کر ان کی کامیابی کا باعث ہوا ہے۔ بلاشبہ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اس کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں اس خیال کو ایک خاص حد تک صحیح مانا جا سکتا ہے، مگر جس طرح سرسید کے رسوخ سے اس کی تائید ہوئی ہے، اسی طرح مزاحمت بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔ اسی رسوخ و اعتبار کی بدولت ایک مدت تک سرسید کی نسبت لوگوں کو طرح طرح کی بدگمانیاں رہیں۔ ہزاروں آدمی یہ سمجھتے تھے کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائی یا لامذہب بنانا منظور رکھا ہے اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدے کے لئے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔ اگرچہ اس خیال کا دوسرا جزو صحیح تھا، مگر پہلا جزو اس لئے غلط تھا کہ حالتِ موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔

بہرحال سرسید کے رسوخ سے مدرسے کو یقیناً بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے۔ خصوصاً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ نے سرسید کا حوصلہ ہی نہیں بڑھایا بلکہ ان کے ارادوں میں جان ڈالی ہے اور جتنے لفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب میں اور جتنے وائسرائے کالج کے قیام کے بعد آئے سب نے کالج پر مربیانہ توجہ مبذول رکھی ہے مگر ریفارمیشن کے عظیم الشان کام میں بجائے اس کے کہ یہ رسوخ ممد و معاون ہوا ہو، اس نے اور اُلٹی مزاحمت کی ہے۔ ہر ایک قوم اور خاص کر مسلمانوں کی قوم مذہبی خیالات کا مصلح اگر کسی کو تسلیم کر سکتی ہے تو اسی شخص کو کر سکتی ہے جس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہوں جو مذہبی تقدس کے لئے درکار ہیں نہ کہ ایسے شخص کو جس میں بظاہر اس قبیل کی کوئی حیثیت نہ پائی جائے، بلکہ سرتاسر اس کی زندگی ایک دنیادار آدمی کی سی زندگی ہو۔ خصوصاً سلطنت میں تقرب اور رسوخ پیدا کرنا عام اس سے کہ مسلمانوں کی ہو یا انگریزوں کی، مذہبی تقدس کے بالکل خلاف سمجھا جاتا ہے۔ باوجود اس کے سرسید نے لاکھوں مسلمانوں کے دل میں اپنی اکثر اصلاحیں تہہ نشیں کر دیں۔ پھر کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ گورنمنٹ میں ان کا رسوخ اور نہ

اعتبار مطلقاً ان کی کامیابی کا باعث ہؤا ہے۔

لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا تو بھی اصل سبب اُن کی راستبازی اور سچائی ٹھیرے گی۔ کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹو کا اس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا جب تک کہ اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر تایا نہ گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔

سب سے زیادہ ان کے کاموں میں مدد اور ان کے ارادوں کو تقویت اُن کے دوستوں نے دی ہے اور یہ بھی ایک نتیجہ اُن کی راستبازی اور خلوص کا تھا۔ فی الواقع سرسید کو محض اپنی صداقت اور بے ریا محبت کی بدولت ایسے سچے دوست اور اعوان و انصار ملے جو اُس زمانے میں نادر الوجود اور عجائب روزگار سے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ سرسید کے اعوان و انصار اُن کو اپنا مذہبی پیشوا سمجھ کر ان کے کاموں میں مدد دیتے تھے، سو اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا۔ اُن کے دوستوں اور مددگاروں میں جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اُن کو اپنا مذہبی پیشوا جانتا ہو یا اُن کے تمام اقوال اور تمام رایوں کو تسلیم کرتا ہو۔ سرسید کے بہت سے دوست ایسے بھی تھے جن کو قومی معاملات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ بعض اُن کی کوششوں پر ہنستے تھے اور اُن کی جدوجہد کو رائگاں سمجھتے تھے۔ مگر ہر کام میں مدد دینے کو دل و جان سے حاضر تھے۔ جب چندے کی ضرورت ہوتی تھی، پہلے دوستوں سے مانگا جاتا تھا، پھر اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پسارا جاتا تھا۔ اگرچہ مقام اس بات [illegible] مقتضی تھا کہ ان تمام بزرگوں نے جس ذوق و شوق سے سرسید کے کاموں میں مدد دی ہے اور جس امنگ اور چاؤ سے مدرسۃ العلوم کے چندوں میں شریک ہوئے ہیں اور جو بیش بہا خدمتیں قوم کی اُن سے بن آئیں ان کو مفصل بیان کیا جائے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ سرسید کی آخری تمنا جو پوری نہ ہوئی، یہ تھی کہ ایک کتاب بطور تذکرۂ احباب کے اپنے قلم سے لکھ جائیں، مگر امید ہے کہ جو شخص مدرسۃ العلوم کی ہسٹری لکھے گا وہ اس فرض کو فراموش نہ کریگا، کیونکہ یہ ذکر اسی موقع سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا صرف مددگار ہی نہ تھا بلکہ اس گاڑی کے ہانکنے میں گویا برابر کی جوڑ تھا، اگر اس موقع پر اس کا ذکر قلم انداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بہت بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائے گا۔ اس شخص سے ہماری مراد محسن الملک سید مہدی علی خاں ہیں، جو تمام قوم کے اتفاق سے سرسید کے بعد اُن کے جانشین ہوئے ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جس نے سب سے

پہلے سرسید کو سمجھا، اُن کی سچائی کو پرکھا، ان کے منصوبوں کی تھاہ دریافت کی اور اُن کے مقاصد کی عظمت کا اندازہ کیا۔ ان کا اُس وقت ساتھ دیا۔ جب کوئی ساتھی نہ تھا اور اس وقت مدد دی جب کسی سے مدد کی امید نہ تھی، سرسید ولایت میں خطباتِ احمدیہ لکھ رہے تھے اور سید مہدی علی خاں ہندوستان سے اس کے لئے میٹریل بھیجتے تھے۔ وہ ولایت میں اس کو چھپوا رہے تھے اور یہ ہندوستان سے اس کی چھپائی کے لئے چندہ وصول کر کر کے روانہ کرتے تھے۔
جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند قائم کرنی چاہی اُس وقت اُن پر عجب مایوسی کا عالم تھا۔ جو منصوبے دل میں باندھ رکھے تھے اُن میں سے کسی کے پورا ہونے کی امید نہ تھی۔ سید مہدی علی مرزاپور سے بنارس گئے اور سرسید کی ڈھارس بندھوائی۔ چنانچہ کمیٹی دھوم دھام سے قائم ہوئی۔ جب کمیٹی نے اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مسلمان سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں کیوں نہیں پڑھتے، انعامی رسالے لکھوانے کا اشتہار دیا، سیّد مہدی علی نے نہایت کوشش سے ایک مبسوط ایسا لکھا جو سب رسالوں میں اوّل درجے کا تسلیم کیا گیا اور پانسو کا انعام جس کے وہ مستحق تھے اپنے سے نیچے درجے کے رسالہ لکھنے والے کو دلوایا جب تہذیب الاخلاق جاری ہوا اور سرسید نے ریفارمیشن کا کام علی الاعلان شروع کیا تو سیّد مہدی علی پہلے شخص تھے جنھوں نے نہایت دلیری سے سرسیّد کی تائید میں مضامین لکھنے پر کمر باندھی۔ جو معرز خطاب مولوی اور واعظ سرسید کو دے رہے تھے، سیّد مہدی علی نے بھی ان کا استحقاق پیدا کیا اور کفر کے فتووں کی بوچھاڑ جو اکیلے سرسیّد پر پڑ رہی تھی، آدھی اپنے سر پر لی۔

سرسیّد کی تحریریں اکثر نشتر کا کام کرتی تھیں۔ مگر سیّد مہدی علی کی تحریروں نے مرہم کا کام کیا۔ سرسیّد ہمیشہ مسلمانوں کو نفرین و ملامت کرتے تھے، اگلے علماء کی غلطیاں ظاہر کرتے تھے، جو کچھ اپنی تحقیق ہوتی تھی اکثر بغیر اس کے کہ سلف کے اقوال سے اس پر استشہاد کریں، حوالۂ قلم کر دیتے تھے۔ سیّد مہدی علی نے مسلمانوں کے اسلاف کے کارنامے بیان کر کے قوم کے دل بڑھائے اور جو کچھ سرسید کی تائید میں لکھا مستند اور معتبر کتابوں کے حوالے سے لکھا۔ اُن کے اکثر مضامین بجائے خود بڑے بڑے رسالے ہیں جو نہایت چھان بین اور تلاش کے بعد لکھے گئے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین لکھنے میں باوجود اس کے کہ ان کی صحت ہمیشہ نازک حالت میں رہی ہے وہ اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ سرکاری کام میں حرج واقع ہونے لگا۔ سُنا ہے کہ ان کے بالادست افسر کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے سرسیّد کو لکھا کہ مہدی علی کو سمجھاؤ وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ مجبوراً ان کی نسبت رپورٹ کرنی پڑے گی۔

مدرستہ العلوم کو جو مالی مدد انہوں نے اپنی جیب سے اور اپنی کوشش سے پہنچائی، اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ سرسید سے کیا مدرسے کے انتظام کے متعلق اور کیا مذہبی مسائل کے متعلق، وہ اکثر اختلاف کرتے تھے مگر مخالفت کبھی نہیں کی۔ ہمیشہ سرسید کا دل ہاتھ میں رکھا اور مدرسے کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ سرسید کی رائے کا ہر حال میں اتباع کیا جائے۔ اگر سرسید نے ان کی رائے کے خلاف بھی کسی تجویز پر زور دیا اس کو بھی طوعاً کرہاً منظور کر لیا اور یہ سمجھا کہ اگر اُن کی رائے فی الواقع غلط ہے تو اس کا تدارک ممکن ہے۔ لیکن اگر مزاحمتوں کے سبب مدرسے کے کام سے اُن کا جی چھوٹ گیا تو اس کا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا۔

حیدر آباد سے آکر انہوں نے علیگڑھ ہی میں رہنا اختیار کیا اور بہت سے عملی کام مدرسے کے متعلق انجام دیئے، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو ترقی دینے کی تدبیریں کیں اور اس کی طرف مسلمانوں کو خاص توجہ دلائی۔ اور خود ہر ایک اجلاس میں نہایت مفید لکچر اور اسپیچیں دیں۔ پھر بمبئی میں جا کر وہاں کے مسلمانوں کو مدرسہ اور کانفرنس کی طرف متوجہ کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے کانفرنس کو بمبئی میں بلایا مگر سرسید کے کبر سن کے سبب وہاں کانفرنس کا منعقد ہونا موقوف رہا۔ سرسید کی وفات سے پہلے وہ پھر علی گڑھ میں آئے اور ان کے اخیر دم تک وہیں رہے اور اس آخری رفاقت میں بھی دوستی اور محبت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی قومی خدمات میں ان سے ظہور میں آئی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اس مرحوم کے بعد کوئی شخص محسن الملک سے زیادہ ان کی جانشینی کے لئے مناسب نہ تھا۔ انہوں نے اپنی صحت اور طاقت سے بڑھ کر چندہ جمع کرنے میں کوشش کی اور توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔

باوجود ان تمام خدمات کے اپنے ہر ایک کام کو ہمیشہ سرسید ہی کی طرف منسوب کیا اور اپنے تئیں ایک مشین سے زیادہ کچھ نہ سمجھا۔ اٹاوہ کے ایڈریس میں جب لوگوں نے اُن کی قومی خدمات کی تعریف کی، انہوں نے اس کے جواب میں صاف صاف کہہ دیا کہ ان خدمات کو میری طرف منسوب کرنا تہمت ہے، اس تعریف کا سید احمد کے سوا کوئی مستحق نہیں۔ سرسید کے بعد ان کا جانشین بننے کی جہاں تک ہم کو معلوم ہے ان کو مطلق خواہش نہ تھی مگر تقریباً تمام ٹرسٹی، تمام کالج اسٹاف، تمام کالج سٹوڈنٹس، صوبے کے تمام اعلیٰ حکام اور افسر جو کالج کے بہی خواہ تھے، تمام ڈیلیگیٹ جو پچھلے سال بمقام لاہور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے تمام مسلمان اخبار اور عموماً تمام مسلمان جن کو قومی معاملات سے دلچسپی تھی، سب اس بات پر متفق تھے کہ ان کو کالج ٹرسٹیز کا سکرٹری بنایا جائے۔ اس لئے ان کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ اس جوئے کو اپنے کندے پر رکھیں۔

الغرض سرسید کو ایسے دوستوں کا ملنا جن کا نواب محسن الملک کو ایک عمدہ نمونہ سمجھنا چاہیئے، ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا اور یہ محض ان کی راستبازی اور قوم کی سچی ہمدردی کا نتیجہ تھا کہ ایسے ایسے مرغِ زیرک خود بخود آکر جال میں پھنس جاتے تھے اور اس زمانے پر جو آزادی میں گذرا تھا افسوس کرتے تھے جیسا کہ نظیری نے کہا ہے۔

"نالہ از بہرِ رہائی نکند مرغ اسیر   خورد افسوسِ زمانے کہ گرفتار نبود"

ایک اور خداساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان جنھوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی اور اس لئے انگریزی تعلیم اور انگریزی خیالات کو خیر مقدم کہنے کے لئے تیار بیٹھے تھے، سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جیسے پیاسا پانی پر دوڑتا ہے۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کہ مدرستہ العلوم کو مالی مدد پہنچائی بلکہ سچ یہ ہے کہ سرسید اور ان کے کاموں کی کسی صوبے نے عام طور پر ایسی قدر نہیں کی جیسی پنجاب والوں نے کی۔ کالج میں انہوں نے ہر ایک صوبے سے زیادہ لڑکے تعلیم کے لئے بھیجے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انہوں نے سب سے زیادہ دلچسپی ظاہر کی، سرسید کی ہر قسم کی اصلاحیں انہوں نے سب سے زیادہ قبول کیں اور قوم کی بھلائی کے کاموں میں سب سے بڑھ کر انہوں نے سرسید کی تقلید اختیار کی۔ یہاں تک کہ ان کو زندہ دلانِ پنجاب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ انہوں نے ہندوستان کے اور حصوں کی طرح سرسید کو مسلمانوں کی صرف دنیوی ترقی کا خواستگار مگر دین کا مخرب نہیں ٹھیرایا بلکہ ان کو دنیا اور دین دونوں کا سچا خیر خواہ اور خیر اندیش سمجھا۔ حق یہ ہے کہ قومی خدمات کی جو داد قوم کی طرف سے سرسید کو ملنی چاہیئے تھی اس کا حق پنجاب کے مسلمانوں کے برابر کسی صوبے سے ادا نہیں ہو سکا اور جو تقویت برٹش گورنمنٹ کی امداد اور حضور نظام کی فیاضی اور بعض دیگر ریاستوں کے عطیوں سے ہوئی، پنجاب کے عام مسلمانوں نے اس سے کچھ کم تقویت سرسید کو نہیں پہنچائی۔

سرسید کی کامیابی کے اسباب میں اگر کالج اسٹاف کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی ناانصافی ہوگی، خصوصاً یورپین اسٹاف کے بعض ممبروں نے باوجود غیر قوم اور غیر مذہب ہونے کے کالج کے انتظام اور اس کی ترقی اور فروغ دینے میں درحقیقت سرسید کے دست و بازو کا کام کیا ہے۔ انہوں نے صرف اپنے منصبی فرائض پر جن کے لئے وہ بلائے گئے تھے۔ بس نہیں بلکہ سرسید کے خاص مشن میں جس پر کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی، معتدبہ حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کالج کو گورنمنٹ اور مسلمانوں کا معتمد علیہ بنایا

اور اس کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا کیا جس کی وجہ سرسید کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی طرف سے بالکل مطمئن اور فارغ بال ہو گئے۔ انہوں نے اپنے اقوال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی درماندہ قوم کے سچے خیر خواہ اور ان کی ترقی کے دل سے آرزومند ہیں مگر در حقیقت یہ سب نتیجہ اسی مرحوم کی راستبازی اور صاف دلی کے تھے۔ اگر یورپین اسٹاف پر پورا پورا اعتماد نہ کرتے اور کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی باگ ڈور ان کے حوالہ نہ کر دیتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ یورپین پروفیسر اپنے معمولی فرائض سے ایک انچ آگے بڑھنے کا ارادہ کرتے۔

اگر سرسید کی ذات میں صرف راستبازی ہی کی صفت ہوتی اور اس کے ساتھ فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نہ ہوتی تو شاید ان کی کامیابی میں زیادہ دیر لگتی۔ بلکہ ممکن تھا کہ ان کو اپنی کوشش کا پھل اپنی زندگی میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر خوش قسمتی سے ان کے ظرف میں زہر و انگبین دونوں موجود تھے۔ گو ان کی راست گوئی نے بہت سے لوگوں کو بدکایا، مگر فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی نے ایک زمانے کو ان کی طرف جھکا دیا۔ انہوں نے ابتدا سے اخیر تک جس کام کے لئے چندہ کھولا، اس میں سب سے پہلے خود سبقت کی اور اپنی بساط اور حیثیت سے مراتب بڑھ کر دیا۔ وہ ایک بانیٔ مدرسہ کی نسبت اپنے ایک دوست کو ولایت سے لکھتے ہیں۔ "افسوس کہ آپ نے اپنی تقریر میں یہ نہ فرمایا کہ خود بانی نے جو فضل الٰہی سے اپنے شہر کے تمام مسلمانوں سے زیادہ ذی مقدور ہیں، کس قدر روپیہ دیا، اس وقت البتہ آپ کی لعنت ملامت محتاجانِ شہر پر جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں، درست و بجا ہوتی۔ میں سوسائٹی کے لئے سب سے بھیک مانگتا ہوں مگر دس ہزار کئی سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا ہے۔ پس ایسی حالت میں اگر میں آپ سے سو روپے دینے کو کہوں تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

اس کے سوا عزم و حزم اور دلیری، جو ہر کامیابی کی جڑ ہے اور وہ دنیا کے تمام کامیاب شخصوں میں ہمیشہ دیکھی گئی ہے سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت بڑھ کر تھی۔ وہ مشکل سے مشکل کام کو جب ضروری سمجھ لیتے تھے بغیر تردد اور تذبذب کے اس کو فوراً کر بیٹھتے تھے اور جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے تھے پھر کبھی اس میں پس و پیش نہ کرتے تھے۔ اس کے سوا ان میں اور اکثر خصوصیتیں ایسی تھیں جن کے بغیر کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام دنیا میں انجام نہیں پا سکتا جیسے مستعدی، جفاکشی، فرائض کی پابندی، حزم و احتیاط وغیرہ۔

ایک اور خداداد قابلیت ان کی فصاحت بیان تھی جس میں سچی ہمدردی کے جوش نے کششِ مقناطیسی پیدا کر دی تھی اور چھاپے کی آزادی نے اس کے لئے ہر ایک میدان کو صاف کر دیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا اور گورنمنٹ کی طرف سے زبانوں پر مہر لگی ہوتی تو سرسید کو اس طرح

کھلے بندوں اپنی رائیں ظاہر کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر یہ بات فراموش کرنی نہیں چاہیئے کہ جس وقت انہوں نے رسالہ "اسبابِ بغاوت" لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کیا وہ ایک ایسا نازک وقت تھا کہ اُس وقت کسی کو آزادانہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت نہ تھی چنانچہ کسی قدر اُن کو اتنی جرأت . . . . اور دلیری کا خمیازہ بھگتنا بھی پڑا یعنی بعض جلیل القدر انگریز اُن کے سخت مخالف ہو گئے جس سے کچھ دنوں وہ مارشل لا کی زد میں رہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آزادی کا زمانہ نہ ہوتا تو بھی شاید یہ چشمہ اُبلے بغیر نہ رہتا۔

سرسیّد میں مختلف لیاقتوں کا جمع ہونا

ایک شریف اور لائق انگلش مین نے جب کہ سرسید زندہ تھے، ہمارے سامنے اُن کا ذکر کرتے وقت یہ کہا تھا کہ یورپ میں بلاشبہ ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو کسی خاص علم یا فن یا صنعت میں فردِ کامل ہیں اور جن کا نظیر ایشیا میں ملنا مشکل ہے لیکن ایسے جامع حیثیات اشخاص جیسے کہ سید احمد خاں ہیں وہاں بھی کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔" اسی طرح الہ آباد میں ایک عام جلسے کے موقع پر ایک لائق اور فاضل پنڈت نے یہ الفاظ[1] کہے تھے کہ "ہم مسلمانوں سے دولت میں زیادہ ہیں، تعلیم میں زیادہ ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں مگر افسوس ہے کہ ہم میں کوئی سید احمد خاں نہیں ہے، بلکہ اگر ہم بیس بھی مل کر ایک ہو جائیں تو بھی سید احمد خاں کے برابر نہیں ہو سکتے۔"

فی الحقیقت یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں ہے کہ جس شخص کو تعلیم و تربیت کے زمانے میں سکول کی ہوا تک نہ لگی ہو اور جس نے چالیس برس کی عمر تک تعلیم میں کسی قسم کا تجربہ حاصل نہ کیا ہو وہ تعلیمی معاملات میں ایسا امتیاز پیدا کرے کہ علمی دنیا میں اس کو مسلمانوں کی تعلیم کا پروفیٹ خیال کیا جائے یا جس شخص نے ایک ایسی سوسائٹی میں ہوش سنبھالا ہو جہاں دو سو برس سے کسی نے پالیٹکس کا خواب تک نہ دیکھا تھا وہ بغیر اس کے کہ کسی پولیٹکل خدمت پر مامور ہو انگلش گورنمنٹ میں ایک رکنِ سلطنت خیال کیا جائے یا جو شخص مذہبی تعلیم میں متوسطے سے بھی کم درجہ رکھتا ہو۔ اور جس نے علومِ جدیدہ کا ایک حرف کسی استاد سے نہ پڑھا ہو وہ مذہب اور سائنس میں مصالحت کرانے کا بیڑا اُٹھائے اور اسلام میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔ اسی طرح اور مختلف لیاقتیں جو اس شخص کی ذات میں جمع تھیں اُن میں سے ایک بھی ایسی نہیں معلوم ہوتی جو تعلیم یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو۔

اگرچہ سرسید کی تمام لیاقتوں کا اصل مخرج اُن کی غیر معمولی قابلیت اور استعداد تھی مگر ان کی قابلیت کو قوت سے فعل میں لانے والی زمانے کی ضرورتیں اور اُن ضرورتوں کا پورا پورا احساس اور قوم

---

[1] خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے اپنی ایک تحریر میں یہ قول نقل کیا ہے۔

میں ضرورتوں کے رفع کرنیوالوں کا قحط تھا جس نے سرسید کو اُس معمار کی طرح جو تعمیر کے لئے آپ ہی اینٹیں پکائے آپ ہی مسالہ تیار کرے، آپ ہی پاڑ باندھے. آپ ہی ٹوکری ڈھوئے، آپ ہی نقشہ بنائے اور آپ ہی عمارت چُنے، یک سرو ہزار سودا کا مصداق بنا دیا تھا. دنیا میں عموماً کام کرنیوالے لوگ الگ ہوتے ہیں اور سوچنے والے الگ. ایک مصنّف مشکل سے معماری و سنگ تراشی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے. عمدہ لکھنے والے اکثر عمدہ بولنے والے نہیں ہوتے، مذہبی تحقیقات میں مصروف رہنے والوں کو ملکی معاملات سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے. مگر جہاں سب چیزوں کی ضرورت ہو اور ایک کے سوا کوئی اُس ضرورت کا احساس کرنیوالا نہ ہو وہاں سب کام اُسی ایک کو کرنے پڑتے ہیں یہی وجہ تھی کہ سرسید کبھی ایک کام پر ہاتھ ڈالتے تھے. کبھی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے. ایک زمانے میں انہوں نے اردو ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا پھر اُسی زمانے میں اردو لٹریچر کی تاریخ لکھنے کے لئے میٹریل جمع کیا اُس سے پہلے وہ صوبہ شمال مغرب میں ایک عظیم الشان یتیم خانے کی بنیاد ڈالنے والے تھے. انگریزی زبان سے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ کرنے کے لئے انہوں نے بڑے سامان کئے تھے. اگرچہ یہ سب کام ادھورے رہے. مگر ان باتوں سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں قومی ضرورتیں ایک شخص کے سوا دوسروں کو محسوس نہیں ہوتیں وہاں ایک فرد واحد کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے

بہرحال اس میں شک نہیں کہ سرسید کی فطرت میں مختلف بلکہ متضاد کاموں کے کرنے کی قابلیت تھی جس کی نسبت مسٹر آرنلڈ نے سرسید کی وفات کے بعد اپنی اسپیچ میں بمقام لاہور یہ الفاظ کہے تھے کہ "دنیا میں بڑے آدمی اکثر گذرے ہیں مگر ان میں ایسے بہت کم نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اور لیاقتیں جمع ہوں وہ (یعنی سرسید) ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، تعلیم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹشن، مصنف اور مضمون نگار تھا." اس لئے ہم چاہتے ہیں بقدر ضرورت ان کی چند نمایاں لیاقتوں کا اس عنوان کی ذیل میں جدا جدا ذکر کریں۔!

پالٹکس

اگرچہ بظاہر سرسید کے پولٹیکل ورکس میں چند تحریروں اور اسپیچوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا مگر در حقیقت جیسا کہ اُن کی بائیوگرافی سے ثابت ہوتا ہے ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ انہوں نے لکھا یا کہا یا کیا سب کا بیشتر حصہ مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کی اصلاح سے علاقہ رکھتا ہے اُس شخص نے نہ انگریزی تعلیم پائی تھی جس کے بغیر انگریزی طرز حکومت

کا ذہن نشین ہونا قریب ناممکن کے تھا اور نہ ملک میں کوئی نظیر کسی ایسے پولیٹشین کی دیکھی تھی جس کی تقلید کچھ کام آتی اور نہ گورنمنٹ کی کسی ایسی خدمت پر مامور تھا جہاں ملکی معاملات کا کچھ تجربہ حاصل ہوتا باوجود اس کے اس نے اپنی مآل اندیشی اور سلیم طبیعت سے خود ہی اس مسئلے کو حل کر لیا اور ایک ایسا پولیٹیکل کورس اختیار کیا جو بالکل صحیح اور بے خطا تھا۔

وہ سلطنتِ مغلیہ کے ایک قدیم متوسل گھرانے کا ممبر تھا اور خود دار الخلافہ کی خاک سے پیدا ہوا اور قلعۂ معلّٰی کے سائے میں نشو و نما پائی اس لئے یہ ایک نیچرل بات تھی کہ فاتح کی حکومت کو وہ ایک ناگواری کی نظر سے دیکھتا مگر اس کی عقل اس کی طبیعت پر غالب تھی اس لئے قومی تعصبات اُس کو مغلوب نہیں کر سکے اُس نے دیکھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا اُٹھ جانا کوئی اتفاقی یا غیر متوقع امر نہ تھا بلکہ فی الحقیقت اُن میں حکمرانی کی لیاقت باقی نہیں رہی تھی اور اُن کا دور پورا ہو چکا تھا اور اس لئے ضروری تھا کہ ہندوستان پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو اُس نے انگریزی طرزِ حکومت کو نہایت غور سے دیکھا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کے حق میں جہاں مختلف مذہب اور مختلف نسل کی قومیں آباد ہیں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں جو بتیس دانتوں میں زبان کی مانند ہیں، کسی قوم کی حکومت انگریزی حکومت سے بہتر نہیں ہو سکتی پس بجائے اس کے کہ اُس نے برٹش حکومت کو ناگواری کی نظر سے دیکھا ہو اُس کو مسلمانوں کی حکومت کا نعم البدل سمجھا اور اس کی خیر خواہی کو ملک اور قوم کی خیر خواہی کا ایک سب سے عمدہ ذریعہ خیال کیا۔

وہ جس قدر انگلش قوم کی دانشمندی اور شائستگی سے واقف تھا اُس سے زیادہ اُس کی ملکی اور جنگی طاقت سے باخبر تھا اس کو غدر کے نازک موقع پر جب فی الواقع سلطنت کے ارکان متزلزل ہو گئے تھے اور بڑے سمجھدار آدمیوں کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی تسلط پھر قائم ہوگا۔ اگرچہ اپنی جان کے بچنے کی بہت کم امید تھی مگر انگریزی تسلط کے جلد از سرِ نو قائم ہو جانے کا پورا یقین تھا۔ اُن کے ایک دوست جو اُس وقت بجنور میں تھے اُن کا بیان ہے کہ "عین اُس بدامنی کے وقت، جبکہ تمام روہیلکھنڈ میں کوئی یورپین یا یورپشین باقی نہ تھا، سیّد احمد خاں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کم و بیش ایک سال بعد تمام ملک میں انگریزی تسلط بدستور قائم ہو جائے گا اور گورنمنٹ کے بے شمار خیر خواہوں میں کسی کے چہرے سے وہ اطمینان اور استقلال ظاہر نہ ہوتا تھا جیسا کہ سرسیّد کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔" ہم پہلے حصے میں لکھ چکے ہیں کہ سرسیّد نے جبکہ تمام ضلع بجنور میں نواب محمود خاں کی دوہائی پھر رہی تھی۔ نواب کے منہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ انگریزی عملداری جانے والی نہیں ہے آپ ملک گیری کا خیال دل سے نکال ڈالیں اور جبکہ سرسیّد کا اثاث البیت اور کتابیں اور سب کچھ بجنور میں لٹ چکا تھا اور جان کے لالے پڑے ہوئے تھے وہ تاریخ سرکشی بجنور کے لئے نہایت اطمینان کیساتھ میٹریل جمع کرتے جاتے تھے اور

روزانہ تمام حالات قلمبند کرتے تھے اور تمام تحریریں جو کہ وہ نواب یا چودھریوں کو لکھتے تھے یا جو ان کے پاس سے وصول ہوتی تھیں یا وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے سب بہم پہنچا کر اپنی کتاب میں درج کرتے تھے۔ ایسا اطمینان، سوا اُس شخص کے جو ملکی معاملات میں پرانا تجربہ کار ہو یا جس کی رائے ایسے امور میں فطرۃً سلیم واقع ہوئی ہو دوسرے کو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

سرسیّد کی پولیٹیکل قابلیت پر اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ اس نے غدر کے بعد اینگلو انڈین اخباروں اور اینگلو انڈین افسروں کی عام رائے کے برخلاف اپنی کتاب اسباب بغاوت میں نہایت زور و شور کے ساتھ اس بات کی تردید کی کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ایک ملکی بغاوت تھی یا اس کی بنیاد برٹش حکومت کے خلاف کسی عام سازش پر تھی اور اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہوا کہ اس سرکشی کا اصل باعث محض سپاہیوں کی عدول حکمی تھی جس نے رفتہ رفتہ اُن عام غلط فہمیوں کے سبب جو گورنمنٹ کی نسبت ملک میں پھیلی ہوئی تھیں ملکی بغاوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُس نے جو اسباب ان غلط فہمیوں کے بتلائے ان پر پارلیمنٹ میں مدت تک مباحثے رہے اور آخر کار اُن میں اکثر بالاتفاق تسلیم کیے گئے، یہاں تک کہ گورنمنٹ نے ان کا فوراً تدارک کیا

سرسیدنے اس کتاب میں گورنمنٹ پر بہ نسبت نیشنل کانگرس کے کچھ کم نکتہ چینی نہیں کی مگر سرسیّد کی نکتہ چینی کئی باتوں میں کانگرس سے مختلف تھی۔ سرسیّد نے جو الزامات گورنمنٹ پر عائد کیے تھے ان کی اطلاع گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ کے سوا کسی متنفس کو نہیں ہوئی اور کانگرس نے جو الزام گورنمنٹ پر لگائے ان کی تمام ملک میں منادی کی گئی۔ سرسیّد نے رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں دور کرنے میں کوشش کی اور کانگرس نے غلط فہمیاں پھیلانے میں۔ سرسیّد نے ان باتوں کی خواہش کی جن سے تمام ملک کا فائدہ متصور تھا اور کانگرس نے زیادہ تر اُن باتوں پر زور دیا جن سے صرف تعلیم یافتہ جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سرسیّد کی تمام خواہشوں میں گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی مصالح ملحوظ رکھی گئی تھیں اور کانگرس کی اکثر خواہشیں گورنمنٹ کی مصالح ملکی کے برخلاف تھیں۔ اسی لئے سرسیّد کی اکثر شکایتوں کا جو کہ اس نے بنفسِ واحد اپنی طرف سے پیش کی تھیں، فوراً تدارک کیا گیا اور کانگرس کو باوجودیکہ وہ تمام ملک کی قائم مقامی کا دعویٰ کرتی ہے آج تک ایک بات[1] کے سوا جس کی بنیاد قانونی کونسل میں بھی سرسیّد کی تحریک سے ۱۸۶۱ء میں پڑ چکی تھی کسی بات میں نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی چنانچہ اخبار سینٹ جیمس گزٹ میں سرسیّد کی کتاب پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ " ہمارے نزدیک سیّد احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ ہوا ہے بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوش

---

[1] یعنی لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کا بذریعہ الکشن کے ممبر ہونا ۱۲

اور اُس کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔"

ایک اور ثبوت سرسید نے اپنی پولٹیکل قابلیت کا ۱۸۷۱ء میں اُس وقت دیا جبکہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "اور انڈین مسلمانز" نے ہندوستان سے لے کر انگلستان تک تمام حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ کے لئے بدگمانی کا بیج بو دیا تھا۔ وہ تیرہ برس سے برابر اس کوشش میں تھے کہ جو بے اصل شکوک و شبہات حکمران قوم کے دل میں مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں اُن کو رفع کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو انگریزوں اور مسلمانوں میں صفائی اور خلوص اور دوستانہ میل جول کو ترقی دی جائے مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب اُن غلط فہمیوں کو اور تقویت دینے والی اور گویا کہ سرسید کی تیرہ برس کی کوشش کو برباد کرنے والی تھی۔ اگرچہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، سرسید کو اُس وقت کالج کی ابتدائی مشکلات کا سامنا تھا اور وہ رات دن اسی اُدھیڑ بُن میں مصروف رہتے تھے باوجود اس کے کتاب مذکور کو شائع ہوتا تھا کہ اُنھوں نے سب کام چھوڑ کر اُس پر ریویو لکھا اور پایونیر میں اُس کو چھپوانا شروع کیا اس ریویو نے ڈاکٹر ہنٹر کی غلطیاں اور مسلمانوں کے مذہب سے اُن کی ناواقفیت انگریزوں کے دل میں تہہ نشین کر دی اور اس غلط خیال کو کہ اسلام بغاوت کی تعلیم دیتا ہے اور وہابی مسلمان گورنمنٹ کے لئے خطرے کی چیز ہیں اُن کے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اُس نے اس غلط فہمی ہی کو رفع نہیں کیا بلکہ ضمناً یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایسی نازک حالت میں، جیسی کہ اُس وقت ہندوستان کی حالت تھی ایسی تحریریں شائع کرنا جو حاکم و محکوم میں تفرقہ ڈالنے والی، حاکموں کے غصے کو مشتعل کرنے والی اور محکوم قوم کو مایوس کرنے والی ہوں، سراسر مصالح ملکی کے برخلاف ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کا ریویو نکلنے کے بعد ڈاکٹر ہنٹر نے اس مضمون کے متعلق پھر سانس تک نہیں نکالی اور انگریزی اخباروں سے بجائے اس کے کہ سرسید کی تردید کرتے، نہایت شد و مد کے ساتھ ان کی تائید کی اور اُس ہیجان کی حالت میں جو حکمران گروہ میں عموماً پھیلی ہوئی تھی سرسید کے ریویو کا نکلنا نہایت غنیمت سمجھا گیا۔

اگرچہ سرسید کی مذکورہ بالا تحریروں سے ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کے حق میں بہت عمدہ نتائج پیدا ہوئے لیکن اُن کی اعلیٰ درجے کی پولٹیکل قابلیت کا بھید درحقیقت اینگلو اورنٹیل کالج میں چھپا ہوا ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ چیز مسلمانوں کو پولٹیکل بے وقعتی سے نکالنے والی اور گورنمنٹ میں اُن کا اعتبار زیادہ کرنے والی اور گورنمنٹ کو ہندوستان کی چھ کروڑ رعایا کی طرف سے مطمئن کرنے والی ہو سکتی ہے تو وہ یہی محمڈن کالج ہو سکتا ہے، اسی لئے پایونیر نے لکھا تھا کہ "سرسید احمد خاں جو ایک دور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا، اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید، بارآور اور نہایت زبردست پولٹیکل طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس نے

موجودہ صدی کے اخیر رُبع میں ہندوستان کی اسلامی دُنیا کو متحرک کر دیا تھا" اور اسی بنا پر لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں نے ان کی وفات کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجے کی پولٹیکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا تھا اور اِسی وجہ سے مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ نے کالج کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ "وہ ایک خالص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پولٹیکل جوش پھیلانے والا ہے" اور اسی واسطے سر آکلنڈ کالون نے اپنی اسپیچ میں اُن تدبیروں کی نسبت جو سر سید نے رسالہ اسبابِ بغاوت میں رعایا اور گورنمنٹ کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لئے بتائی تھیں، یہ الفاظ کہے تھے کہ "انہیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انہیں خیالات کی دُوسری صورت علی گڑھ کالج ہے۔"

سر سید کا سب سے اخیر کام ملکی معاملات کے متعلق مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہونے سے روکنا تھا جس کا مفصل حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور جس کے اعادے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ مگر ہم کو اُن کی ایک بیش بہا تحریر دستیاب ہوئی ہے جو انہوں نے لندن میں ایک بڑے عالی مرتبہ انگریز کو کسی وقت لکھ کر بھیجی تھی اور جس سے ملکی معاملات کے متعلق اُن کی اصلی رائے ظاہر ہوتی ہے۔ اُس چٹھی کے چند فقرے اس مقام پر نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں جن سے سر سید کا ایک بہت بڑا اسٹیٹسمین ہونا ثابت ہوتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ "میں مسلمان ہوں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔ انہیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔ اہلِ عرب اِس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں، کوئی اور اُن پر حکومت کرے۔ اس وقت تک اہلِ عرب آزاد ہیں اور اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں، اونٹ چراتے ہیں، جَو پر زندگی بسر کرتے ہیں، اونٹنیوں کا دُودھ پیتے ہیں اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔

"ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام پر مجھے پُورا اور پکا یقین ہے۔ وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اُس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اِسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہو جانے کسی شخص کے اُس کی جائداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہو جائے کیونکہ کتنی ہی زیادہ

جائداد کیوں نہ ہو وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً بہت سے حصّوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ پس میں دونوں طرح کیا بہ لحاظِ مذہب اور کیا بہ لحاظ خون کے ریڈیکل ہوں۔

لیکن ہمارا مذہب، جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کئے، اُس نے اور باتیں بھی سکھلائی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہو جائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے، انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، ملک میں امن قائم رکھتی ہے اور ہماری جان اور مال کو محفوظ رکھتی ہے جیسا کہ انگریزی سلطنت ہندوستان میں کرتی ہے۔ تو اُس حالت میں ہم کو اُس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہیئے۔ دوسرے یہ وہ ریڈیکل اصول جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں اُن پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہیئے جب کہ زمانے کی حالت اُن کے عمل میں لانے کے موافق ہو نہ کہ اُس حالت میں جب کہ زمانے کے حالات اُن کے موافق نہ ہوں، مثلاً جب کہ اُن کے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آئے یا اُس کو کمزور اور ضعیف کر دے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کنسرویٹو ہوں، خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل، سب اس اصول کو قبول کریں گے۔"

یہی خیالات جو اس تحریر میں درج ہیں، سرسید نے کانگرس کی مخالفت کرنے سے پانچ برس پہلے ممبری کونسل کے زمانے میں لارڈ رپن کے سامنے اپنی اسپیچ میں جیسا کہ پہلے حصّے میں بیان ہو چکا ہے اُس وقت ظاہر کئے تھے جب کہ کونسل میں سلف گورنمنٹ کے قانون کا مسودہ پیش تھا۔ اُس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ریپرزنٹیٹو اصول کو اُسی حالت میں پسند کرتے تھے جب کہ اُس کے جاری کرنے سے ملک میں سوشل اور پولیٹیکل خطرات کے پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ پس جو لوگ اُن کی پچھلی تحریروں کو حال کی تحریروں کے خلاف سمجھتے ہیں یہ اُن کی سمجھ کی غلطی ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں قومی اختلافات کا خیال زیادہ تر اُن کو اُس وقت پیدا ہوا جب کہ ۱۸۶۷ء میں مسلمانوں کے خلاف شمال مغرب کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کی طرف سے نہایت سرگرمی کے ساتھ اس باب میں کوشش شروع ہوئی کہ تمام سرکاری دفتروں اور کچہریوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کی جگہ ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ پھر جس قدر ہندوؤں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مخالفتیں ظہور میں آتی گئیں، اسی قدر وہ خیال زیادہ پختہ ہوتا گیا اور آخر کار اُن کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اس قابل نہیں ہے کہ اُس میں ریپرزنٹیشن کے اصول پر عمل درآمد ہو سکے۔

اوّل اوّل وہ گورنمنٹ کی خود مختاری کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۶ء میں جب کہ انہوں نے علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی، اُس موقع پر اُن کی اسپیچ کے ابتدائی الفاظ یہ تھے "میں تم سے اُس طوائف الملوکی کے زمانہ کا ذکر نہیں کرتا جو اٹھارھویں صدی میں تھا، بلکہ میں آپ کو اُس تاریخانہ زمانے کی یاد دلاتا ہوں جب کہ ہندوستان ایک سلطنتِ شخصیہ کی حکومت میں تھا، ایک بادشاہ یا راجہ کہ رعایا مخلوقِ خدا پر حکمران تھا، اُس کی حکومت، بہ نسبت اس کے کہ کسی قانونِ عقلی یا نقلی کے تابع ہو، زیادہ تر اُس کی مرضی، خوشی، طبیعت اور غیظ و غضب کی تابع ہوتی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے اپنے مسلمان بادشاہوں کی تعریف میں یہ کلمے بہت سُنے ہوں گے کہ "مالکِ رقاب الامم" حالانکہ بادشاہ یا گورنمنٹ کو ایسا کہنا درحقیقت اُس کی نسبت تمام دنیا کی برائیوں کا منسوب کرنا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ تم میں سے اکثر ایسے ہوں کہ اب تک اُس پُرانے زمانے کو یاد کرتے ہوں مگر جب کبھی تمہارا دل انصاف اور اخلاق کی طرف توجہ کرے گا تو تم خود اُس زمانے کے نقصانوں اور اُس وقت کی حکومتوں کی برائیوں کا اقرار کروگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس زمانے کی حکومتیں نہ مسلمانوں کی شرع کے مطابق تھیں اور نہ ہندوؤں کے دھرم شاستروں کے مطابق بڑا اصول اُن وقتوں کی حکومتوں کا یہ تھا کہ جو زبردست ہو وہ کمزور پر غالب رہے اور جس طرح چاہے زیادتی اور جبر اور غضب سے صرف اپنے عیش و آرام کے لئے زیردستوں کے حقوق پر تصرف کرے۔ پس ایسی حکومتوں کو بجز اُن غاصب شخصوں کے جن کا کام اُس وقت میں بنا ہوا تھا، اور کون پسند کر سکتا ہے۔"

سرسید کی یہ باتیں صرف زبانی ہی نہ تھیں بلکہ غدر کے بعد انہوں نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا تھا کہ جہاں انتظامِ ملک کا مدار قانون پر نہیں بلکہ زیادہ تر حکام کی زبان پر ہو وہاں رہنا وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے، کیونکہ غدر کے بعد جب کہ قسمت دہلی صوبۂ شمال مغرب سے نکال کر صوبۂ پنجاب کے ساتھ ملحق کی گئی، انہوں نے دہلی کی سکونت فوراً ترک کر دی اور اپنے تمام بڑے بڑے کاموں کا مرکز علی گڑھ کو قرار دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۶۶ء میں جب کہ سر ڈونلڈ مکلوڈ صاحب لفٹننٹ گورنر صوبۂ پنجاب نے دہلی میں دربار کیا جس میں سرسید کو بھی علی گڑھ سے بلایا گیا تھا تو سرسید سے پرائیویٹ ملاقات کے وقت صاحبِ ممدوح نے اس بات کی سخت شکایت کی کہ تم نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں جاکر قائم کی اور اپنے قدیم وطن دہلی کو اُس کے فوائد سے محروم رکھا۔ سرسید نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو جیسی کہ وہ اب ہے، ایک

ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ سمجھتا ہوں اور اسی لئے جب کہ قسمتِ دہلی پنجاب میں شامل ہو گئی، میں دہلی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اسی کے قریب قریب انھوں نے ۱۸۶۹ء میں ڈی فٹز پیٹرک صاحب سے جو دِلّی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اور آخر کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہوئے، انگلستان جاتے ہوئے جہاز میں تقریبہ کی تھی جس کا ذکر انھوں نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک دن پنجاب کے انتظام کی بھلائی بُرائی کا ذکر آگیا، میں نے کہا ہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزار درجہ بہتر ہے، لیکن شاید پنجاب کے لوگ اُس سے خوش ہوں کیوں کہ اُن کو آگ (یعنی سکھوں کی عملداری) میں سے نکال کر دھوپ میں بٹھایا ہے، مگر ہم لوگ اُس کو پسند نہیں کرتے۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہاں اور سزائیں اہلِ دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع کو دی گئیں منجملہ اُنہیں سزاؤں کے ایک یہ بھی سزا ہے کہ دہلی اور اُس کے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا اور بے قانونی ملک بنا دیا گیا۔"

اس کے بعد وہ سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ "حقیقت میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں جو ہزاروں برائیوں کے ساتھ اگلے زمانے کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں اور جن سے اُن برائیوں کا علاج ہوتا تھا۔ جو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ ہست اب اُس کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ جیسی کہ قدیم سے تھی، زیادہ تر مفید ہوگی وہ نہایت غلطی میں ہیں۔"

لیکن آخر کار اُن کو یقین ہو گیا کہ جب تک مثل انگلستان کے ہندوستان کی تمام قومیں مل کر ایک قوم نہ ہو جائیں جو قریب ناممکن کے ہے، اُس وقت تک ایک خالص کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ ہندوستان کی حالت کے مناسب ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جو اسپیچ انھوں نے قانونِ سیلف گورنمنٹ پر لارڈ رپن کے عہد میں کی تھی اُس میں اُنھوں نے نہایت مدلّل طور پر اس مطلب کو بیان کیا تھا اور دراصل مقصد اس اسپیچ کا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یہ تھا کہ تمام ہندوستان کے لوکل بورڈوں میں دو ثلث ممبر الکشن سے اور ایک ثلث نومنیشن سے مقرر کئے جائیں۔ کیونکہ لارڈ رپن اضلاعِ متوسط کے سوا باقی صوبوں میں کُل ممبر الکشن سے مقرر کرنا چاہتے تھے۔ مگر آخر کار جیسی کہ سرسید کی رائے تھی وہی قاعدہ تمام صوبجات کے لئے مقرر ہوا جو اضلاع متوسط کے لئے قرار پایا تھا اور اسی قاعدے کی بدولت تمام بورڈوں میں کم و بیش مسلمان ممبروں کی صورت آج تک دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ خاص خاص مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر اُن کی شکل نظر نہ آتی۔

اگرچہ اکسٹرا اسسٹنٹی اور منصفی کے لئے پنجاب میں مقابلے کا امتحان نیشنل کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے جاری ہو چکا تھا اور جس وقت سر سید نے کانگریس کے خلاف لکھنؤ میں اسپیچ دی اس وقت جو نتائج اس قاعدے سے مسلمانوں کے حق میں مترتب ہونے والے تھے وہ ظہور میں نہیں آئے تھے مگر سر سید نے اُسی وقت اُس نقصان کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا جو اس قاعدے سے مسلمانوں کو پہنچنے والا تھا چنانچہ پنجاب میں باوجودیکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد ہندو قوموں سے بہت زیادہ ہے ۱۸۸۳ء سے ۹۳ء تک اکسٹرا اسسٹنٹی میں منجملہ ۲۵ کے صرف سات مسلمان کامیاب ہوئے اور منصفی میں منجملہ ۲۱ کے ایک مسلمان بھی کامیاب نہیں ہوُا۔ اور اگر دونوں عہدوں کا مدار محض مقابلے کے امتحان پر ہوتا اور کچھ عہدے نومنیشن کے ذریعہ سے مقرر نہ کئے جاتے تو منصفوں میں اب تک شاید ہی کوئی مسلمان نظر آتا اور اکسٹرا اسسٹنٹی پر شاذ و نادر مسلمان باقی رہ جاتے۔ علیٰ ہذا القیاس وائسرائے کی قانونی کونسل میں اگر نومنیشن کا اختیار گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں نہ رکھتی تو ایک مسلمان کو بھی کونسل کی شکل دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ اسی قسم کے خیالات تھے جن کی وجہ سے سر سید نے مسلمانوں کو نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے روکا اور اسی لئے اُنھوں نے قانون سیلف گورنمنٹ کے مسودے پر اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان کی حالت مثل انگلستان کے نہ ہو جائے جہاں عیسائیوں کو یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ تامل نہیں ہوتا اُس وقت تک انگلستان سے ریپرزنٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں بڑی بڑی مشکلات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

پولیٹکل ایجیٹیشن کی نسبت سر سید کی یہ رائے تھی کہ اُس کے بد اثر سے کوئی گورنمنٹ خواہ وہ ریپبلک ہو یا پارلیمنٹری اور یا مانرکی، محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ری پبلک گورنمنٹ میں اُس کا لازمی نتیجہ بشرطیکہ ایجیٹیشن کو پوری قوت حاصل ہو جائے، پریذیڈنٹ کی تبدیلی ہے اور پارلیمنٹری گورنمنٹ میں وزراء کی تبدیلی اور اگر وہ گورنمنٹ مانرکی ہے تو اس کا اثر بیدرد گورنمنٹ تک پہنچتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایجیٹیشن کرنے والے اس کو تبدیل نہیں کر سکتے تو کم سے کم اُس کی تبدیلی کی خواہش اُن کے دل میں ضرور ہوتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ گورنمنٹ ظاہر ہے کہ نہ ری پبلک ہے اور نہ پارلیمنٹری اور اس لئے اس کو بجز ایک شائستہ اور مہذب مانرکی ہونے کے جو ملک میں امن رکھنا اور رعایا کے حقوق کو انصاف اور نیک دلی سے فیصل کرنا چاہتی ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پس ایک ایسی گورنمنٹ کی پالسی کے برخلاف جیسی کہ ہندوستان کی گورنمنٹ ہے، اگر کوئی ایجیٹیشن پھیلایا جائے اور اُس میں کامیابی نہ ہو تو غور کرنا

چاہیئے کہ رعایا کا خیال کس طرف مائل ہوگا؟ کیا ان کا خیال اس طرف مائل ہوگا کہ کونسل تبدیل ہو جائے یا موجودہ گورنر جنرل کی جگہ کوئی دوسرا گورنر جنرل بھیجا جائے؟ ہرگز نہیں بلکہ خود گورنمنٹ سے ناراضی کا پھیلنا اُس کا نتیجہ ہوگا۔ اگرچہ ناراضی پھیلانے والے گورنمنٹ کے تبدیل کرنے پر کچھ قابو نہ رکھتے ہوں، مگر گورنمنٹ سے ناراضی کا پھیلنا خود گورنمنٹ کے لئے اور رعایا کے لئے شدید نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

سر سیّد ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "سلطنت شخصی ہو یا جمہوری، ایک امر میں دونوں کا اصول ایڈمنسٹریشن متحد ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی گورنمنٹ کو جس طرح ہو سکے قائم اور مضبوط رکھنا سب سے مقدم اور سب سے بڑا انصاف ہے اور اُس کے بعد رعایا کے واجبی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ پہلے امر کے متعلق ایک مہذّب سلطنت یا سلطنتِ جمہوری بھی وہی کرتی ہے جو ایک نامہذّب سلطنت یا شخصی سلطنت کرتی ہے۔ کوئی نظیر دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ ایسے وقت میں ایک مہذّب یا جمہوری سلطنت نے وہ نہ کیا ہو جو ایک نامہذب یا شخصی حکومت نے کیا ہو۔"

ان کا قول تھا کہ ان بادشاہوں میں سے جو ظالم کہلاتے ہیں دو ایک کے سوا جو درحقیقت مجنون تھے، کسی بادشاہ نے ظلم کرنے کے ارادے سے ظلم نہیں کیا۔ بلکہ صرف اس خیال سے کیا کہ ویسا کئے بغیر ان کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان کے اس خیال اور اندازے میں غلطی ہو۔

اُن کی رائے تھی کہ گورنمنٹ کا اچھا یا بُرا ہونا درحقیقت کوئی اصلی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اصلی چیز رعایا کا بُرا یا اچھا ہونا ہے۔ اگر رعایا اچھی اور شائستہ ہے تو گورنمنٹ کو خواہ مخواہ شائستہ بننا پڑتا ہے اور اگر رعایا شائستہ نہیں ہے تو گورنمنٹ کو بھی ویسا ہی بننا پڑتا ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو اُن کی بڑی نصیحت یہی تھی کہ انگریزی حکومت میں عزت سے رہنا چاہتے ہیں تو تعلیم اور سویلزیشن میں ترقی کریں اور عزت حاصل کرنے سے پہلے اُس کا استحقاق پیدا کریں۔

اُن کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لئے انگلش گورنمنٹ سے بہتر گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "گو ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انھوں نے یہاں کی حکومت بزور حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اُس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی۔ سو اسی ضرورت نے

ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔"

انہوں نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا ہے کہ "میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور اُن کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔"

اگرچہ سر سید کو مسلمانوں نے عموماً اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا لیکن شاید ہندوستان میں ایسا ایک مسلمان بھی نہ ہوگا جو ملکی معاملات میں اُن کو قوم کا لیڈر نہ سمجھتا ہو اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ سر سید کی ایک آواز پر، بہ استثنائے معدودے چند، ہندوستان کے تمام مسلمان کیا سُنّی کیا شیعہ کیا وہابی، کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا اَن پڑھ، کیا وہ لوگ جو اُن کی پالسی میں گِنے جاتے ہیں اور کیا وہ جماعتِ کثیر جو ہر بات میں اُن کی مخالفت کرتے تھے سب نے بالاتفاق نیشنل کانگرس سے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سر سید احمد خاں کے نزدیک اُن کا اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لکھوکھہا مسلمانوں نے اُن کاغذوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے اظہار کے لئے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔

تعلیم

سر سید نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کی غرض سے جو غیر معمولی کوششیں کی ہیں اُن کی تفصیل پہلے اور دوسرے حصے میں کافی طور پر بیان ہو چکی ہے۔ یہاں ہم صرف اُن بڑی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے تعلیمی معاملات میں اُن کی عالی دماغی، حسنِ تدبیر اور اصولِ اشاعتِ تعلیم سے ایک قدرتی مناسبت پائی جاتی ہے

تعلیم کے مسئلے پر کبھی نظامِ تعلیم (ایجوکیشنل سسٹم) کے لحاظ سے اور کبھی طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے اور کبھی دیگر حیثیتوں سے بحث کی جاتی ہے۔ مگر سب سے مقدم اور مہتم بالشان حیثیت جس سے تمام حیثیتیں متفرع ہوتی ہیں، یہ ہے کہ کسی قوم میں ایک اجنبی اور غیر مانوس تعلیم جاری کرنے کی کیا سبیل ہے؟

جو قوم ہزار برس سے زیادہ عرصے سے ایک ایسی تعلیم کی پابند چلی آتی ہو جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل جُل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کر لی ہو، اُس قوم میں ایک نئی قسم کی تعلیم کا جاری کرنا جو مضامینِ تعلیم اور ذریعۂ تعلیم دونوں کے لحاظ سے بالکل اوپری اور غیر مانوس

ہو، بعینہ ایسا ہے جیسے کسی قوم میں جو اپنے مذہب کی سخت پابند ہو، ایک نئے مذہب کو جاری کرنا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۸۳۵ء میں جب گورنمنٹ نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تو مسلمانوں کے ایک جمِ غفیر نے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، بذریعہ عرضداشت کے یہ شکایت پیش کی کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے اس واقعہ سے گیارہ برس پہلے جب کہ گورنمنٹ نے اُن کے لئے سنسکرت کالج قائم کرنا چاہا تو اُس سے ناراضی ظاہر کی اور انگریزی کالج قائم کرنے کے لئے گورنمنٹ سے اصرار کیا، کیونکہ اوّل تو اُن کے ہاں مذہبی تعلیم صرف برہمنوں کے خاص خاص افراد میں محدود تھی اور باقی تمام ہندو قوم مسلمانوں کے عہد میں دنیوی ضروریات کے لئے ایک غیر قوم کی زبان سیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ دوسرے جیسا کہ سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب انڈیا میں لکھا ہے، نہ ہندو مذہبی تعلیم کے خواہشمند تھے اور نہ اُن کا مذہب ایسا تھا جس کی تعلیم ہو سکے۔

بہر حال مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا جاری کرنا ایک نہایت مشکل کام قریب ناممکن کے تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۲ء سے جب کہ کورٹ اوف ڈائرکٹرز کے ایک نامور ممبر چارلس گرانٹ نے ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کی صلاح دی تھی، اُس وقت تک جبکہ ۱۸۷۰ء میں سر سید نے کمیٹی خواستگارِ ترقیِ تعلیم مسلمانان قائم کی، گورنمنٹ کی تمام تدبیریں اور تمام کوششیں جو ہندوستان میں بغرضِ اشاعتِ تعلیم کی گئیں، مسلمانوں کے حق میں بے سود ثابت ہوئیں۔ علاوہ طرح طرح کی ترغیبوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے تعلیم کی اشاعت کے لئے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں، بعض مسلمانوں کے چند معقول اوقاف گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھے جن کو وقف کرنے والوں نے تعلیم کے لئے مخصوص کیا تھا، جیسے بنگال میں محسن فنڈ اور اضلاعِ شمال مغرب میں نواب فنڈ، مگر اُن سے بھی زیادہ تر غیر قومیں مستفید ہوتی رہیں۔ باوجودیکہ ۱۸۵۷ء میں ہائی ایجوکیشن کے لئے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں مگر ۱۸۷۵ء تک تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوئیٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجوئیٹس کے مشکل سے اتنی ہو گی جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔

سر سید کو ۱۸۵۸ء میں جب کہ وہ بجنور سے مراد آباد بدل کر گئے، تعلیم کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اُس زمانے سے لے کر اُس وقت تک جب کہ کالج نے نمایاں ترقی کر لی، اُن کے تمام کاموں میں جو تعلیم کے

متعلق اُنہوں نے انجام دیے ایک خاص ترتیب پائی جاتی ہے جس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے ابتداء ہی میں وہ تمام مشکلات جو وقتاً فوقتاً پیش آنے والی تھیں اور ہر ایک مشکل کے ساتھ اُس کا حل بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ سب سے پہلے اُن کو تعلیمی معاملات پر خود غور کرنا اور تعلیم کے متعلق کسی قدر تجربہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اول اِسی غرض سے دو اسکول پبلک چندوں سے قائم کئے جن سے لوگوں کو اُس دلچسپی کا جو ان کو بہ نسبت سرکاری مدرسوں کے اپنے پرائیویٹ اسکولوں کے ساتھ بالطبع زیادہ ہوتی ہے، بخوبی اندازہ ہو گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر مسلمانوں[1] کو کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے تو خاص کر اُسی کالج سے ہو سکتی ہے جو قومی چندے سے قائم کیا جائے۔ اس کے بعد سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور یہ خیال کیا کہ شمالی ہندوستان کے باشندے، کیا ہندو اور کیا مسلمان، انگلش لٹریچر اور مغربی علوم کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں، پس تا وقتیکہ دیسی زبان کے ذریعے سے اُن میں یورپین سائنس اور لٹریچر کا مذاق پیدا نہ کیا جائے، اُس وقت تک انگریزی تعلیم کا ذوق و شوق اُن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی مقصد کے لئے اُنہوں نے علاوہ کتابوں کے ترجمہ کرانے کے سوسائٹی سے ایک اخبار نکالا جس میں بے شمار علمی اور لٹریری مضامین انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے اور جس نے فی الواقع اُردو لٹریچر کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور انگلش لٹریچر کی عظمت ہزاروں کے دل میں جو سلیم الطبع تھے، تہ نشین کر دی۔ پھر زیادہ تجربہ اور زیادہ بصیرت حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے ولایت کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر کیمبرج یونیورسٹی اور اُس کے تمام انتظامات کو خود جا کر دیکھا اور اُس کے مقابلے میں جو نقص ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں معلوم ہوئے ان پر ایک پمفلٹ لکھ کر انگلستان ہی میں شائع کیا، کیونکہ سر سید کا اصل مقصد جو پورا نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں واپس آ کر ایک محمڈن یونیورسٹی

---

[1] سنہ ۸۴ء میں جب کہ سر سید پہلی ہی بار چندے کے لئے لاہور گئے ہیں اُس وقت اُنہوں نے راقم کے سامنے بابو نوبین چندر سے ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تھا کہ "صرف اِسی خیال سے کہ یہ کالج خاص مسلمانوں کے لئے اُنہیں کے روپے سے قائم کیا جاتا ہے ایک طرف تو مسلمانوں میں اور دوسری طرف اُن کی ریس سے ہندوؤں میں توقع سے زیادہ جوش پیدا ہو گیا ہے۔" اور پھر خان بہادر برکت علی خاں سے پوچھا کہ کیوں حضرت اگر یہ قومی کالج نہ ہوتا تو آپ ہماری مدارات اِسی جوش و محبت کے ساتھ کرتے؟ اُنہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہرگز نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر سید اپنے کام کے شروع ہی میں اِس قومی فیلنگ سے بخوبی واقف تھے ۱۲

قائم کرنے کا تھا اور اس لئے ضرور تھا کہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں جو نقص تھے اُن کو ظاہر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں ایک جُدا یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت ثابت ہو، پھر ہندوستان میں پہنچتے ہی اُنھوں نے ایک طرف تو کمیٹی خواستگارِ ترقیِ تعلیمِ مسلمانان قائم کی جس کی تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں سے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو جگانے کے لئے ایک ماہواری رسالہ جاری کیا جس نے چند روز میں ایک مردہ قوم میں حرکت پیدا کر دی۔

جب کالج قائم کرنے کا ارادہ ہوا اُس وقت ان کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا تھا۔ اولاً مسلمانوں سے جو قومی چندوں کے مفہوم سے ناواقف اور تعلیم سے متنفر بلکہ اُس کے مخالف تھے، چندہ وصول کرنا تھا پھر جو موقع کالج کے لئے تجویز کیا گیا تھا وہ چند اضلاع کے بارعب مسلمان رئیسوں اور تعلقہ داروں سے گھرا ہوا تھا جن میں سے بعض کالج کمیٹی کے ممبر بھی تھے اور ایک ایسے کام کی طرف سے جس کو بہت سے ذی وجاہت مسلمان مِل کر کرنا چاہتے تھے اور جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی گورنمنٹ کو مطمئن کرنا سب سے مقدم کام تھا۔ جس قطعہ زمین پر کالج کی بنیاد رکھنی منظور تھی وہ نزدلی زمین تھی جہاں ایک زمانے میں سرکاری چھاؤنی رہ چکی تھی اور اکثر حکام اور افسر نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمین مسلمانوں کو دی جائے۔ مسلمان جن کی اولاد کی تعلیم کے لئے کالج قائم کیا جاتا تھا وہ تعلیم کے خرچ سے زیادہ کسی خرچ کو فضول اور بیکار نہیں سمجھتے تھے اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال تھا کہ کالج کی وقعت پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں جہاں تک ہو سکے جلد پیدا کی جائے کیونکہ جو بڑا منصوبہ سرسید نے اُس کے لئے اپنے دل میں باندھ رکھا تھا وہ بظاہر اُن کی زندگی میں پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا اور مسلمانوں میں کسی سے یہ امید نہ تھی کہ سرسید کے بعد کالج کی وقعت اور اُس کا اعتبار ایک انچ آگے بڑھا سکے۔

سرسید نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب آئے۔ چندہ توقع بلکہ وہم و گمان سے بھی زیادہ وصول کر لیا۔ گورنمنٹ کو کالج کی طرف سے مطمئن ہی نہیں کیا بلکہ اُس کا مربّی اور سرپرست بنا دیا۔ کالج کے لئے وہی زمین جس کا ملنا قریب ناممکن کے ہو گیا تھا، گورنمنٹ سے حاصل کی، مسلمانوں کو تعلیم میں اپنے بوتے اور طاقت سے بڑھ کر خرچ کرنا سکھا دیا، یہاں تک کہ وہ ولایت کی تعلیم کے مصارف بہ کشادہ پیشانی برداشت کرنے لگے۔ کالج کی عالیشان عمارتوں اور عمدہ اسٹاف اور بورڈنگ ہاؤس کے انتظام سے اس کی وقعت بہت جلد پبلک اور گورنمنٹ کی نظر میں پیدا کر دی۔ الغرض جو کچھ سرسید نے

مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق پچیس برس کے قلیل عرصے میں کر دکھایا وہ ایک ایسا عظیم الشان کام تھا جو پچیس برس پہلے بالکل محال معلوم ہوتا تھا۔

ابتدائی کارروائیاں جو سرسید نے بطور بنیاد اور اساس اشاعتِ تعلیم انگریزی کے کیں خواہ اُن کو اتفاقی سمجھو اور خواہ یہ خیال کرو کہ وہ بہت سوچ سمجھ کر کی گئی تھیں، سب ایسی ضروری معلوم ہوتی ہیں کہ بغیر ان کے شاید اصل مقصد تک پہنچنا سخت دشوار ہوتا۔ سرسید نے جو چند موقعوں پر سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کو اپنی رائے کی غلطی کی طرف منسوب کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یورپین علوم کی اشاعت بذریعہ دیسی زبانوں کے ملک کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اس سے بعض لوگ سچ مچ یہ سمجھ گئے ہیں کہ سوسائٹی کا قائم کرنا محض بے سود تھا اور یہ کہ سرسید نے اپنی اس غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد انگریزی تعلیم کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہے۔ مگر یہ اُن کی سمجھ کی غلطی ہے۔ سرسید کا جو خیال انگریزی تعلیم کی نسبت اخیر زمانے میں تھا، وہی خیال اُن کا اُس وقت تھا جب کہ مراد آباد میں انھوں نے ورنیکلر سکولوں کے خلاف اپنی رائے انگریزی اور اردو میں لکھ کر شائع کی تھی اور وہی خیال اُس وقت تھا جب کہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہوئے کچھ بہت دن نہ گذرے تھے۔ اور انھوں نے گورنمنٹ کی اس تجویز کی سخت مخالفت کی تھی کہ بجائے کلکتہ یونیورسٹی کے ورنیکلر یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اِسی طرح ترجموں کی ضرورت کو جیسا کہ وہ سوسائٹی کے قیام کے وقت ضروری اور لابدی سمجھتے تھے اُسی طرح اخیر دم تک اُس کو ضروری اور ملک کی عام تعلیم کو اُس کے بغیر ناممکن سمجھتے رہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ درجے کی انگریزی تعلیم کی جگہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم اور لٹریچر کی تعلیم دینے کو وہ ملک کے حق میں کچھ بھلائی نہیں سمجھتے تھے اور اِسی لئے جب سے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ گورنمنٹ بجائے انگلش ہائی ایجوکیشن کے مشرقی علوم کی تعلیم دینا اور مغربی علوم کو بذریعہ دیسی زبانوں کے شائع کرنا چاہتی ہے، اُس وقت سے وہ اپنی ہر ایک تحریر میں ورنیکلر زبانوں کے ذریعے سے علوم کی تعلیم دینے پر سخت اعتراض کرتے تھے اور انگلش ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کو ملک کے حق میں مضر بتاتے تھے۔

جس زمانے میں سرسید نے سوسائٹی قائم کی اُس وقت اِدھر تو مسلمان انگریزی کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور اُدھر انگریزی تعلیم کی ضرورت کا لوگوں کو یقین دلانا مشکل تھا۔ کیونکہ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی۔ ادنیٰ سے اعلیٰ عہدے کے لئے جو اُس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتا تھا، خاص کر شمالی ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔ کمپنی کی عملداری کو گئے ہوئے چند روز گذرے تھے اور

ہندوستانیوں کو عملی طور پر اس بات کا یقین نہیں دلایا گیا تھا کہ وہ اعلیٰ اعلیٰ ملکی عہدوں میں حکمران قوم کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں پھر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، یورپین سائنس اور لٹریچر کی عظمت جب تک کہ انگریزی سے عمدہ عمدہ علمی اور لٹریری مضامین دیسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع نہ کئے جائیں، کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کہ یہ حالت تھی تو کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں میں انگلش ہائی ایجوکیشن کی اشاعت سے پہلے سوسائٹی کا قائم کرنا اور ترجموں کا شائع کرانا بے سُود یا غیر ضروری تھا۔

بیشک ہائی ایجوکیشن کی حمایت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے اور اسی بنا پر شمس العلما مولانا شبلی نے "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں اسی غلطی کا جس کو سرسید چھ سات برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں[1] جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔

---

[1] مولانا نے اس بات پر کہ جس طرح عباسیوں نے یونانی سے عربی میں ترجمے کرائے تھے اُس طرح ہم مغربی علوم انگریزی سے اُردو میں ترجمہ نہیں کرا سکتے، پہلی دلیل یہ لکھی ہے کہ لاکھوں روپیہ جو خلفائے عباسیہ نے ترجمہ پر خرچ کیا وہ اب غیر ممکن ہے مگر یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ گزشتہ تیس چالیس برس میں بغیر اس کے کہ سلطنت نے ترجمے کا اہتمام اپنے ذمہ لیا ہو، جس قدر علمی اور لٹریری مضامین اور کتابیں انگریزی سے دیسی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں، اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ کسی طرح خلفائے امویہ و عباسیہ کے عہد کے ترجموں سے کم نہ ہوں گے۔ دوسری دلیل ان کی یہ ہے کہ اُس زمانے میں علوم محدود تھے اور ترقی رُک چکی تھی جس قدر کتابیں ترجمہ کرا لی گئیں گویا یونانیوں کے علوم پر احاطہ کر لیا گیا۔ مگر اس زمانے میں نہ علمی ترقی کی انتہا ہے۔ اور نہ کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہی دلیل غالباً سرسید نے بھی کسی موقع پر بیان کی ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جس طرح اب علوم اور کتابیں غیر محدود ہیں، اسی طرح ہندوستان میں ترجمہ کے وسائل بھی غیر محدود ہیں۔ عباسیوں نے صرف چند یہودی عیسائی اور مجوسی نوکر رکھ کر ترجمے کرائے تھے کیونکہ یونانی زبان کی تعلیم کو کبھی مسلمانوں میں عام رواج نہیں ہوا بخلاف ہندوستان کے جہاں انگریزی کی تعلیم عام طور پر جاری ہے اور کاپی رائٹ کے قانون نے ہر تعلیم یافتہ کے دل میں ترجمہ کرنے کی امنگ پیدا کر دی ہے، پھر ہر ایک علم کی تمام کتابیں

اگر مولانا کو یہ اصلی رائے معلوم ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انہوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ضرور ہے۔

شاید اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک ریفارمر کی شان اور اس کی حالت عام آدمیوں کی شان اور اُن کی حالت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ وہ جس بات کو قوم کے لئے ضروری سمجھتا ہے اُس کی تائید کرتے وقت اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ میں پہلے کیا کہہ چکا ہوں اور کیا کر چکا ہوں۔ وہ اس

بقیہ نوٹ صفحہ (۵۸۵) ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر علم کے چند نامور مصنفوں کی کتابوں کا ابتداء میں ترجمہ کرلینا کافی ہے۔ پھر جتنی صدیاں یورپ کی علمی ترقیات میں صرف ہوئی ہیں اور جتنی مدت میں انگریزی زبان نے ترقی کی ہے اور جس قدر عرصے میں مغربی علوم مدوّن ہوئے ہیں کم سے کم اُس سے نصف مدت کی مہلت ہندوستان میں اُن کے ترجموں کے لئے ملنی چاہیئے نہ یہ کہ جتنے دنوں تک سائنٹفک سوسائٹی ترجمے کا کام کرتی رہی ہے اتنی مدت میں تمام مغربی علوم و فنون کے دیسی زبانوں میں منتقل ہونے کی توقع کی جائے۔ تیسری دلیل اُنہوں نے یہ لکھی ہے کہ جب یونانی سے عربی میں ترجمے ہوئے اُس زمانے میں عربی تمام ممالک میں حکومت کرنے والی زبان تھی اور کسی قوم نے اُس زبان میں علوم کو ترقی نہیں دی جو اُن پر حکومت کرنے والی نہ تھی۔ یہ دلیل بھی تقریباً اسی تقریر کا اعادہ ہے جو سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں کی تھی۔ بلاشبہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی محکوم قوم نے علوم کو اپنی زبان میں ترقی دی ہو، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آئندہ بھی ایسا وقوع میں نہیں آسکتا۔ حکومت کے اصول بدلنے سے دنیا کے تمام حالات بدل گئے۔ شائستہ سلطنتوں کی رعایا اب وہ کام کرسکتی ہے جو خود سلطنتیں نہیں کرسکتیں۔ پہلے تمام رفاہ عام کے کام خود سلطنتوں کو کرنے پڑتے تھے اور رعایا کو خواہ وہ رعایا بادشاہ کی ہم قوم ہو اور خواہ غیر قوم، ان کاموں سے کچھ سروکار نہ ہوتا تھا مگر اب وہ کام خود رعایا کرتی ہے۔ وہ درس گاہیں اور یونیورسٹیاں اور ہسپتال قائم کرتی ہے، ملکوں میں مذہب کی اشاعت کرتی ہے، علمی تحقیقات کے لئے علماء کے قافلے اطرافِ عالم میں بھیجتی ہے ترجموں کے ذریعے سے غیر قوموں کے علوم اپنے ملک میں پھیلاتی ہے، ریلیں جاری کرتی ہے، دُنیا کی خبریں بہم پہنچا کر ملکوں میں شائع کرتی ہے غرض کہ ملک کے اندرونی انتظام اور بیرونی حملوں کی مدافعت کے سوا سب ملک کی بھلائی کے کام رعایا کرسکتی ہے۔ بیشک ہندوستان کی رعایا حالتِ موجودہ میں بہت سے بڑے بڑے رفاہ کے کام مثل انگلستان کی رعایا کے نہیں کرسکتی۔ مگر طرزِ حکومت اُن کو آہستہ آہستہ سب باتیں سکھاتی جاتی ہے۔ چنانچہ جس قدر قومی رفاہ کے کام ہندوستان کی رعایا نے اس صدی کے اخیر میں کئے ہیں ہندوستان کی تاریخ میں ہرگز اُن کی مثال نہیں مل سکتی۔ پس اس زمانے کے حالات کو زمانہ گزشتہ کے حالات پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ ح۔

بات کو کہ اُس کی پہلی کارروائی غلط ثابت ہو یا اُس کے افعال و اقوال کو لوگ متناقض سمجھیں نہایت بہتر جانتا ہے بہ نسبت اس کے کہ جو امر اس کے نزدیک سردست قوم کے حق میں ضروری ہے اُس میں کسی طرح کی فروگذاشت ہو جائے۔
یہی وجہ تھی کہ سرسید نے اپنے اصلی اور قدیم خیالات کو جو کہ وہ ہندوستان کے پالٹکس کی نسبت رکھتے تھے، اخیر زمانے میں صرف اس بنا پر بدل دیا کہ وہ خیالات مسلمانوں کی پولٹکل حالت کے موافق نہ تھے، یہاں تک کہ نیشنل کانگرس کے بانی مسٹر ہیوم جو سرسید کے قدیم دوست تھے اُن سے ناراض ہو گئے اور انگلستان میں اُنھوں نے ہندوستان کے ایک شریف مسلمان سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا کہ "مجھ کو نیشنل کانگرس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب "اسبابِ بغاوت" کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا مگر میں نہیں جانتا کہ اب اُس کو کیا ہو گیا۔
سرسید کو جس وقت قوم کی بھلائی کا خیال پیدا ہوا، اُس وقت مسلمانوں کی حالت پر یہ مثل صادق آتی تھی کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" اُن میں صدہا باتیں اصلاح طلب اور اُن کے متعلق صدہا مشکلات حل طلب تھیں۔ اگر سرسید جزئیات کی اصلاح یا حل کرنے کا ارادہ کرتے تو عمر بھر میں ایک کام کے پورا کرنے سے بھی عہدہ برآ نہ ہوتے۔ اُنھوں نے تمام خرابیوں کی اصلاح اور تمام مشکلات کا حل اس بات میں دیکھا کہ قوم میں تعلیم کی اشاعت کی جائے مگر قومی تعلیم و تربیت خود ایک عظیم الشان کام تھا جس کے لئے صدیاں درکار تھیں اس لئے اُنھوں نے خیال کیا کہ سب سے مقدم مسلمانوں کو پولٹکل بے وقعتی سے نکالنا اور ملک کی حکومت میں جس قدر حصہ لینے کا گورنمنٹ نے اُن کو بحیثیت ہندوستان کی رعایا ہونے کے حق دیا ہے اُس کا اُن میں استحقاق پیدا کرنا ہے جو بغیر اس کے، کہ قوم میں ایک متناسب تعداد ہندوستان اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے گریجوئٹس کی پیدا ہو جائے کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے سوا تمام ترقیات کی جڑ خیالات کی ترقی اور دماغی تربیت ہے جس کے لئے انگلش لٹریچر کی اعلیٰ درجے کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔
پس جس بات کو اُنھوں نے ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم میں مخل سمجھا اُس کی ہمیشہ مدافعت کرتے رہے۔ اسی بنا پر وہ جس طرح اورینٹل تعلیم اور ورنیکلر تعلیم کے مخالف تھے، اسی طرح جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، وہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کے بھی اُس صورت میں سخت مخالف تھے کہ اُس سے لٹریری تعلیم کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ وہ درحقیقت ہندوستانیوں کے لئے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کی وجہ بھی وہی ہائی ایجوکیشن یا لٹریری تعلیم کی حمایت تھی جس کی نسبت اُن کو خیال ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ اُس کو بتدریج موقوف کرنا چاہتی ہے۔

اِسی اصول پر کہ جو سب سے اہم اور ضروری چیز ہے صرف اُسی پر سر دست اکتفا کرنا چاہیئے سرسید نے جس قدر کوشش کی وہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے اور لڑکیوں کی تعلیم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اُن کو تعلیم نسواں کا مخالف تصوّر کیا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک اصل سبب تعلیم نسواں کی طرف توجہ نہ کرنے کا یہ تھا کہ اوّل تو جب سے اُن کو مسلمانوں کی سوشل ریفارم کا خیال پیدا ہوا اُس وقت سے اخیر دم تک وہ فیمیل سوسائٹی سے بالکل علیحدہ رہے۔ غدر سے چند روز بعد اُن کی بی بی کا انتقال ہو گیا اور دہلی کی آمد و رفت بالکل موقوف ہو گئی۔ اگرچہ زنانہ سوسائٹی کی حالت سے وہ بے خبر نہ تھے مگر جو فیلنگ خود اُس سوسائٹی میں رہ کر اور ہر وقت آنکھ سے اُن کی حالت دیکھ کر ایک ذکی الحس آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے وہ صرف سُنی سنائی یا کبھی کبھی کی دیکھی ہوئی باتوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اُن کے خاندان کی فیمیل سوسائٹی کی حالت بہ نسبت اکثر مسلمان خاندانوں کے بہت شُدہ تھی۔ اُن کے خاندان کی عورتوں سے میری اکثر رشتہ دار عورتوں کو ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اُن کے اخلاق و عادات اور لیاقت اور سنجیدگی کی حد سے زیادہ تعریف کرتی ہیں۔ خود سرسید نے ایجوکیشن کمیشن میں اور اپنی متعدد اسپیچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا حال بیان کر کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمان عورتیں عموماً جاہل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مراۃ العروس پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اُس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا۔ اُس کو دیکھ کر سرسید کو نہایت رنج ہوا تھا اور وہ اُس کو مسلمان شرفا کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے۔

لیکن سب سے بڑا مانع تعلیم نسواں پر متوجہ ہونے کا یہ تھا کہ اُنہوں نے اُس کی دشواریوں کا بخوبی اندازہ کر لیا تھا اور اُن کے نزدیک ابھی وہ وقت بہت دور تھا کہ مسلمان شرفا کی لڑکیوں کی تعلیم کا ایک باقاعدہ اور قابلِ اطمینان انتظام کرنا ممکن ہو۔ چنانچہ انگلستان جاتے ہوئے جب مس کارپنٹر[1] سے اُن کی ملاقات ہوئی اور اُنہوں نے ایک کتاب جس میں ہندوستانیوں کی رائیں اور چٹھیاں مس صاحبہ کی

---

[1] یہ ایک شریف لیڈی برسٹل کی رہنے والی ڈاکٹر کارپنٹر کی بیٹی تھیں جنھوں نے ہندوستانی عورتوں کی جہالت کا حال سُن کر ہندوستان کا ارادہ اِس غرض سے کیا تھا کہ ہندوستانی عورتوں کی تعلیم میں کوشش کریں۔ اسباب واپس انگلستان کو جاتی تھیں۔ ۱۲

کوششوں کی نسبت درج تھیں، سرسید کے سامنے اس غرض سے کہ وہ بھی اپنی رائے تعلیم نسواں کے متعلق اُس میں لکھ دیں، پیش کی تو سرسید نے اُس میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی تھی جو اُن کے سفرنامے میں درج ہے -

"مجھ کو بڑو دہ دخانی جہاز میں جب کہ میں لندن کو جاتا تھا، مس کارپنٹر صاحبہ سے ملاقات حاصل ہونے کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔ جب سے میں نے اُن کا نام اور اُن کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورات کے سُنا تھا میں بہت مشتاق اُن کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمتِ غیر مترقبہ اُن کی ملاقات ہو گئی

" اُن کی عالی ہمّتی اور بلند نظری اور تہذیب اخلاق اور نیک نیّتی کا ثبوت خود وہی مضمون ہے جو اُنھوں نے اختیار کیا ہے، یعنی اُس گروہ کی تعلیم میں جس کو خدا تعالےٰ نے مرد کے لئے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا ہے اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لئے مرد کا مددگار کیا ہے، کوشش کرنا، درحقیقت یہ مضمون اور اُس پر اُن کی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش ہونی گو وہ کسی طرح پر ہو، نہایت اچھی ہے کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوئی ہے تو وہ خود کامیاب ہوگی اور اگر اُس میں غلطی ہے تو اُس سے امید ہے کہ اوروں کو اُس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی۔ جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش بغیر کسی غلطی کے شروع ہوگی اور ٹھیک ٹھیک نیک نتیجے تک پہنچے گی -

"نیک کام پر کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اس لئے کہ وہ اُن لوگوں کی عادات و رسم و رواج کے مخالف طریقے پر جن کی بھلائی کے لئے کوشش کی جاتی ہے، قائم کی گئی ہیں، برباد ہو گئی ہیں۔ حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے اور خود اُس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ بننا ہے خدا نے یوشع کے لئے سورج کا تھم جانا کہا، حالانکہ شاید وہ غلط تھا، کیونکہ اگر وہ واقع بھی ہوا تو شاید زمین کا تھم جانا صحیح ہوتا، مگر خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جو اس زمانے میں تھی، رعایت کی۔ پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اُس حکمت کو توڑ دیں گے اور خود اپنے لئے نقصان کا سبب ہوں گے -

"بہرحال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارپنٹر صاحبہ کی کوشش کامیاب ہو اور ہندوستان میں

کیا مرد اور کیا عورت سچائی اور علم کی روشنی سے، جو دونوں اصل میں ایک ہی روشن ضمیری حاصل کریں۔"

سر سید کی اس تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے تھے، مگر ہندوستانیوں کے اور خاص کر ہندوستان کے شریف مسلمانوں کے رسم و رواج، الف و عادات اور مذہبی اوہام و خیالات سے اس کو اس قدر بعید جانتے تھے کہ سر دست اس میں کوشش کرنے کو بے سود اور رائگاں سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے بارہا اپنی اسپیچوں میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے لوگوں کو اس بات کا شبہ ہو گیا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے بالکل مخالف ہیں۔ یہاں ہم ان کی خاص کر اس اسپیچ کا جو انہوں نے ۱۸۸۴ء میں بمقام گورداسپور خاتونانِ پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں لکھ کر دی تھی اور جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی اسپیچ تھی جس میں شریف ہندو، مسلمان اور عیسائی عورتوں کو مخاطب کیا گیا تھا، خلاصہ نقل کرتے ہیں۔ ایڈریس[1] میں سر سید کی ان کوششوں کی شکرگزاری کے بعد جو کہ وہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے کر رہے تھے، اشارۃً اس بات کا بھی ذکر تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم پر بھی اسی طرح توجہ کریں۔ سر سید نے اس کے جواب میں کہا:

"اے میری بہنو! آج کی رات میرے لئے شبِ قدر سے کم قدر کی نہیں ہے، جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی ہے وہ میرے لئے ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکرگزار ہوں۔

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم[1] کی مستورات کی بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ ہماری قوم کے مردوں نے اپنے باپ دادا کی بزرگی کو خاک میں ملا دیا ہے مگر خدا کے فضل سے تم میں ہمارے باپ دادا کے بزرگ نشان بدستور موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم مردوں میں شبلی اور جنید موجود نہیں ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ تم میں ہزاروں لاکھوں رابعہ بصری موجود ہیں۔

"تمہاری نیکی، تمہاری بردباری، تمہاری محبت، ہر قسم کی مشکلات کی برداشت اور اس پر صبر، بچوں کی پرورش، گھر کا انتظام ہمارے فخر کا باعث ہے۔ اگر کوئی قوم تمام دنیا میں اپنے تئیں کسی کا فخر دے سکتی ہے تو ہم اپنی قوم کی مستورات کو دنیا کی قوموں پر فخر دے سکتے ہیں یہ ہمارا فخر تمہارے ہی سبب سے ہے۔

---

[1] یہ ایڈریس دراصل مسلمان عورتوں کی طرف سے جس کی بانی مبانی سردار محمد حیات خاں بہادر کی بیگم صاحبہ تھیں دی گئی تھی مگر اس کے نیچے بعض ہندو اور عیسائی عورتوں کے بھی دستخط تھے۔ ۱۲

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے اُن کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے ہے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے کی کوشش کرو، وہی طریقہ تمہارے لئے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا"

اس کے بعد سر سید نے پرانا طریقۂ تعلیم نسواں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور پھر یہ کہا:

"اے میری بہنو! تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہو گئی ہو اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہو گئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ ان سچے واقعات نے میرے دل میں بہت کچھ اثر کیا ہے۔ میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت تمہارے لڑکوں کے لئے کر رہا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے ہے۔

"میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری دادیاں، نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں۔ مردوں کو جو تمہارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں، زمانے کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اُس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔

"تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو، اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو، اخلاق میں نیکی اور نیک دلی رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو برتاؤ میں لاؤ، گھر کا نظام اپنے ہاتھوں میں رکھو، اپنے گھر کی مالک رہو۔ اُس پر مثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک وزیر زادی کے منتظم رہو۔ اپنی اولاد کی پرورش کرو۔ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا سا بنا دو۔ خدا پرستی، خدا ترسی، ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو، یہ تمام سچی تعلیم نہایت عمدگی سے اُن کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیاں، نانیاں پڑھتی تھیں جیسی وہ اُس زمانے میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانے میں مفید ہیں۔ پس اِس زمانے کی نامفید اور نامبارک کتابوں کی تم کو کیا ضرورت

ہے۔" ہاں یہ بات سچ ہے کہ تمہارے خاندانوں کے مردوں کی نالائقی اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے تم کو ملے ہیں اور جن کا انسانیت کی رُو سے تمہارا حق ہے، برباد ہو گئے ہیں۔ وہ حق تم کو پھر واپس دلانے کی یہی تدبیر ہے کہ تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کی جائے۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے، وہ مغصوبہ حقوق از خود بے مانگے تم کو واپس ملیں گے۔"

آخر میں سرسید نے ہندو اور عیسائی خاتونوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "اے میری ہندو اور عیسائی بہنو! تم نے جو اپنی محبت اور وطنی یگانگت سے اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ اس ایڈریس میں اور اس امداد میں جو مدرستہ العلوم کے غریب طالب علموں کو دی گئی ہے شرکت کی، وہ ایک نمونہ تمہاری محبت اور یگانگت کا ہے۔ میں دل سے اُس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں کہ تم پر بھی خدا کی برکت ہو اور ہر طرح کی ترقی اور خوشی تم کو نصیب ہو۔ آمین۔"

اس اسپیچ سے صاف ظاہر ہے کہ سرسید اُس وقت تک جب تک کہ لڑکوں میں تعلیم عام نہ ہو جائے، لڑکیوں کے لئے ضروری مسائل مذہبی کی تعلیم کافی سمجھتے تھے۔ مگر اُن کی اسپیچ میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اُنہوں نے جو صرف لڑکوں کے تعلیم یافتہ ہو جانے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اُس سے مغصوبہ حقوق بن مانگے از خود واپس مل جائیں گے۔ اُن کی یہ امید پوری ہوتی نظر آتی ہے یا نہیں؟ اگرچہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے کہ تعلیم یافتہ نوجوان عورتوں کے حقوق پہچانیں، اُن میں تعلیم کی کمی سے جس قدر عقل یا سمجھ یا اخلاق کی کمی ہے، اُس کو اسی طرح برداشت کریں۔ جس طرح اُن کے اسلاف برداشت کرتے آئے ہیں، اُن سے جب تک کہ قوم میں تعلیم نہایت محدود ہے، اُن باتوں کی توقع نہ رکھیں۔ جو یورپ کی ایک تعلیم یافتہ لیڈی سے رکھنی چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تربیت سے بجائے تحمل و برداشت اور سلوک و درگذر اور قومی حمیت اور رقتِ جنسیت کے یہ سبق سیکھتے ہیں کہ تمدن اور معاشرت کے جس درجہ پر اہلِ یورپ کو صدیوں اور قرنوں کے بعد پہنچنا نصیب ہوا ہے۔ اُن کو یونیورسٹی کی سند پاتے ہی اُس کے خواب نظر آنے لگتے ہیں اور مستثنیٰ صورتوں کے سوا ہر تعلیم یافتہ نوجوان کو یہ تمنا معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو لندن یا پیرس کی کسی لیڈی سے شادی کریں اور اگر یہ امر اُن کی قدرت سے باہر ہو تو غالباً وہ ایک مشن اسکول کی تعلیم پائی ہوئی نیٹو کرسچن عورت کو قوم کی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے جو باقاعدہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ نہ ہو، بہتر اور افضل سمجھیں گے۔ پس جب کہ یہ حالت ہے تو اُن سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی عورتوں کے مغصوبہ حقوق واپس

دیں گے۔ اُن کا بڑا اسلوک اپنی قوم کی ہم کفو لڑکیوں کے ساتھ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ سرے سے اُن کے حقوق کا بوجھ ہی اپنے ذمے نہ لیں بلکہ اُن کو بدستور جاہل اور ناتربیت یافتہ لڑکوں کے لئے چھوڑ دیں۔ اگرچہ ابھی تک سوسائٹی کے دباؤ نے بہت کچھ اُن کے جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن آخر کار ایک طرف کی تعلیم اور دوسری طرف کی جہالت قوم کے حق میں یقیناً بُرے نتائج پیدا کرے گی۔

مذہبی تحقیقات

مذہب کے متعلق جو کچھ سرسید کی مذہبی خدمات اور ریفارمیشن کے بیان میں لکھا گیا اُس سے یا تو اُن کوششوں کا دکھانا مقصود تھا جو اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور حمایت میں اُن سے ظہور میں آئیں یا اُس دلیری اور جرأت کا بیان کرنا تھا، جو اُنھوں نے اپنی مذہبی تحقیقات کے اعلان کرنے میں ظاہر کی۔ ہم اُن کی مذہبی تحقیقات کے متعلق ایک دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ کرنا ممکن ہو کہ اس شخص میں مذہبی عقدوں کے حل کرنے اور اُن پیچیدگیوں کو سلجھانے اور مذہب کو حقائقِ محققہ پر منطبق کرنے کی کس قدر قابلیت تھی؟ نہ وہ واعظ تھا نہ مفتی، نہ فقیہ تھا نہ محدث، نہ معانی و بیان کا ماہر تھا نہ منطق و فلسفہ کا مدعی، باوجود اِس کے زمانۂ حال کے شبہات جو لوگوں کے دل میں اسلام کی نسبت پیدا ہوتے تھے، اُن کا حل کرنے والا تمام ہندوستان میں صرف یہی شخص تھا جس کی تحریریں مجروح دلوں پر مرہم کا کام کرتی تھیں۔ اُس کے پاس اطرافِ ہندوستان سے اسلام کی نسبت بیسیوں حل طلب سوالات صرف اس وجہ سے آتے تھے کہ موجودہ علمائے اسلام اُن کا شافی جواب نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سے خطوط جو سرسید نے اس قسم کے سوالات کے جواب میں لکھے ہیں بعض احباب کے بھیجے ہوئے اِس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ بعض خطوں کے جواب تہذیب الاخلاق یا انسٹیٹیوٹ گزٹ وغیرہ کے ذریعہ سے شائع ہوئے ہیں اور بعض[1] اُس مرحوم نے ہمارے سامنے لکھ کر لوگوں کو بھیجے ہیں۔ اکثر

---

[1] ایک صاحب نے جن کا نام احمد بابا مخدومی تھا، غالباً لاہور سے ۱۸۹۶ء میں سرسید کے پاس یہ سوال بھیجا تھا کہ قرآن مجید میں حضرت یحییٰؑ کی نسبت "برًّا بوالدیہ" اور حضرت عیسیٰؑ کی نسبت "برًّا بوالدتی" آیا ہے۔ اگر فی الواقع عیسیٰؑ کا کوئی باپ ہوتا تو اُن کا قول بوالدتی کی جگہ بوالدیّ نقل کیا جاتا۔ اگرچہ سرسید نے تفسیر میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے مگر خاص کر اس شبہے سے کچھ تعرض نہیں کیا۔ اُنھوں نے جواب میں یہ چند سطریں لکھ بھیجیں "جنابِ مخدومی! حضرت عیسیٰ نے تمام لوگوں

(باقی اگلے صفحے پر)

لوگ دُور دُور سے قصد کرکے اِسی غرض سے سرسید کے پاس آتے تھے اور اپنے شبہات بیان کرتے تھے اور مطمئن ہو کر واپس جاتے تھے۔ اسی طرح مرحوم کے پاس بہت سے لوگ شکریہ کے خط بھیجتے تھے کہ آپ کی تصنیفات سے ہم کو یہ اور یہ فائدے پہنچے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۵۹۳) میں ابنِ مریمؑ کر کے مشہور تھے اس شہرت کے سبب قرآن مجید میں بھی اُن کو ابنِ مریمؑ سے تعبیر کیا ہے۔ بہت لوگ اسی طرح اپنی ماں کے نام سے مشہور ہوتے ہیں۔ پس قرآنِ مجید میں جس طرح ابنِ مریمؑ کہا گیا ہے برابر ابالدقی بھی کہا ہے اس لفظ سے یہ سمجھنا کہ اُن کا کوئی باپ نہ تھا صحیح نہیں ہے۔ کیا سادات کو جو بنی فاطمہ کر کے مشہور ہیں آپ بن باپ کے پیدا ہوا خیال کرتے ہیں؟ والسلام ۔۱۲۔

[1] مولوی سید ممتاز علی بی۔ اے کے دل میں جب کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اسلام کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہو گئے تھے۔ انہوں نے سرسید کو جو اُس وقت بتقریبِ ممبریٔ کونسل کلکتہ میں تھے اپنے شبہات لکھ بھیجے۔ اُس وقت سرسید اُن کو نہیں جانتے تھے مگر انہوں نے فوراً اُن کو خط لکھا کہ خط و کتابت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا تم چند روز کے لئے کلکتہ چلے آؤ اور ریل کے کرایہ کی ضرورت ہو تو میں بھجوا دوں۔ وہ فوراً کلکتہ چلے گئے اور چند صحبتوں میں اُن کے تمام شبہات زائل ہو گئے ۔۱۲۔

[2] اِنہیں خطوں میں سے ایک خط ہمارے سامنے سرسید کے نام شیموگہ علاقۂ مدراس کے اہلِ اسلام کی جماعت کی طرف سے جس پر سید احمد نامی شیموگہ اور شیخ بابن محمدن مشنری شیموگہ اور چار اور معزز مسلمانوں کے دستخط تھے پہنچا تھا جس کو ہم نے سید صاحب سے مانگ لیا تھا۔ اُس میں سے چند فقرے ہم اُنہیں کی عبارت میں نقل کرتے ہیں: "جناب کی تفسیر ہر ایک مسلمان کے دل پر ایسی روشنی ڈالتی ہے جیسی اندھیری رات پر آفتاب کی۔ اس تفسیر سے ہم کو بہت بڑا فائدہ یہ ملتا ہے کہ ایک تحصیل شدہ مولوی اور ایک اُردو خواں ہر دو کو برابر سمجھاتی ہے جس کو عقل سے کچھ بھی تعلق ہے وہ بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس تفسیر کے پڑھنے وسُننے سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے اور دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام فطرت کے مطابق ہے۔ ہم آج تک مذہبی باتوں میں عقل کو دخل نہیں دیتے تھے اور کبھی یہ نہیں خیال میں آیا کہ اس بری بات کیوں کر ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ تو ضرور سمجھے تھے نصاریٰ کے (یعنی نصاریٰ کے) تین خدا یا مِل کر ایک ہونا غیر ممکن ہے۔ بدستور ہنود کے ایک شخص کو تین منہ اور دو سے زیادہ کئی ہاتھ اور آدمی کو ہاتھی کا سر لگائے جانا یہ سب غلط (یعنی عیسائیوں اور ہندوؤں کے ہاں جو ناممکن باتیں مانی جاتی ہیں۔ اُن کو تو ہم غلط جانتے تھے) مگر دینی غیر ممکن بکہ

(باقی اگلے صفحے پر)

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سرسید نے جس قدر اختلافات مذہبی مسائل میں علمائے سلف سے کئے ہیں، اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن میں اور لوگ بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے محض اگلے محققین کی تقلید سے ان اختلافات پر مبادرت کی ہے۔ اوّل تو جس مقصد سے اگلے محققین نے جمہور سے اختلاف کیا ہے وہ مقصد سرسید کے مقصد کے ساتھ متحد نہ تھا۔ سرسید کے تمام اختلافات کا اصل مقصد اسلام کی طرف سے معترضین کے اعتراضات یا متشککین کے شبہات کا رفع کرنا تھا بخلاف اگلے محققین کے جن کے اختلاف کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جو اعتراضات آج کل مذاہب پر وارد کئے جاتے ہیں، اُن سے اُن بزرگوں کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ دوسرے جن لوگوں نے سرسیّد کی طرزِ تصنیف کو بہ نظرِ غور دیکھا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ وہ جب تک کسی مسئلے کی نسبت خود اپنی رائے قائم نہ کر لیتے تھے اُس وقت تک کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے۔ پھر اگر کسی مصنّف کا قول اُن کے موافق نکل آتا تھا تو اُس کو بھی اپنی رائے کی تائید کے لئے لکھ دیتے تھے ورنہ صرف اپنی رائے لکھ دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب اُن کی تحریر چھپ کر شائع ہو چکی اُس وقت حسنِ اتفاق سے کسی محقّق کا قول سرسیّد کی رائے کا مؤید اُن کے کسی دوست کو معلوم ہوا اور اُس نے یا تو سرسیّد کو اُس سے مطلع کر دیا اور یا بذریعہ تحریر کے کسی میگزین یا اخبار میں چھپوا دیا۔ اصل یہ ہے کہ سرسیّد کو مذہبی تحریرات میں جس قدر اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا تھا اُسی قدر دُوسرے مصنّفوں کی کتابوں سے مدد ملنے کی اُن کو توقع نہ تھی اور اس لئے وہ خود کتابوں کی طرف وہ بہت کم رجوع کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی تصنیفات میں کتابوں کے حوالے جتنے کہ ہونے چاہئیں تھے اُن سے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں اُن میں زیادہ تر ایسے ہیں جو اُن کے سوا اور لوگوں نے تلاش کر کے بہم پہنچائے ہیں۔ اس کے سوا بہت سے مقامات اُن کی تصنیفات میں ایسے موجود

بقیہ صفحہ ۵۹۴) اُس سے زیادہ تعجب انگیز باتیں ہمارے ... واعظین کی گھڑت ہم کو دکھائی دی۔ الحمدللہ اس حق گو تفسیر کی بدولت ان روحانی مہلک بیماریوں کو آج غسلِ صحت ملا... مسلمانوں کے پاک دلوں میں وہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کعبہ میں بتاں۔ اب ان کا یک بیک دور ہو! خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے ہم اس احسان کے بدلے اپنی کھال کی جوتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرے کا معاوضہ نہ ہوگا۔"

ہیں جن میں اگرچہ اُنھوں نے سلف کے اقوال سے اپنی رائے پر استشہاد کیا ہے، مگر جب اُن کے اقوال کے مجمل اور غیر شافی بیان کو سرسید کے مدلّل اور شافی بیان کے مقابلے میں دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں اس قدر فرق معلوم ہوتا ہے کہ مشکل سے اُن اقوال کو سرسید کی رائے کا مآخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے ہم بے شمار تحقیقاتیں سرسید کی مذہبی تصنیفات میں ایسی اچھوتی پاتے ہیں جن کو بظاہر اس چودھویں صدی کے محقق سے پہلے کسی کے قلم نے مس نہیں کیا اور بہت سے اُرنجنل خیالات اور اُرجنیل رائیں دیکھتے ہیں جن کو اُس کی اوّلیات کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے مذہب کی سچائی کا یہ معیار قرار دیا کہ اُس کی تعلیم میں کوئی بات فطرتِ انسانی یا فطرۃ اللہ کے خلاف نہ ہو اور اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا دعویٰ کیا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اُترتا۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ نبی کی عظمت اور بزرگی اس میں نہیں ہے کہ اُس سے معجزات اور پیشین گوئیاں صادر ہوں بلکہ اُس کی تمام عظمت اور تمام بزرگی اس میں ہے کہ جب منکرین اُس سے معجزہ طلب کریں تو اُن کو یہ جواب دے کہ "اِنّما الآیات عند اللہ" اور "سبحان ربی ھل کنت الا بشراً رسولا" اُسی کا ذہن سب سے پہلے اس نکتے تک پہنچا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا جس کو مخالفین آپ کی نبوّت کے عدم ثبوت کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں، یہی سب سے بڑی دلیل آپ کی سچائی اور نبی برحق ہونے کی ہے۔ اسی نے سب سے پہلے بتایا کہ قرآن میں سب سے بڑی وجہ اعجاز یہ ہے کہ اس کی تعلیم فطرت انسانی کے مطابق اور جاہل و عالم اور وحشی و شائستہ سب کی سمجھ اور ہر زمانے کی حالت کے مناسب ہے اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ اپنے دعوے کا ثبوت اس حد تک پہنچا دیا جس سے زیادہ مذہبی مسائل کا ثبوت ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

اسی نے سب سے پہلے اس بات کو دریافت کیا کہ اسلام جو مدّتِ دراز سے غیر قوموں میں مطعون و متہم چلا آتا ہے، اس کے مختلف اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے مسلمان خاقانوں اور کشور کشاؤں کی بے اعتدالیوں کو ایک نتیجہ اسلام کی تعلیم کا قرار دیا ہے اور اس کو مسلمانوں کے کردار کا جوابدہ تصوّر کیا ہے، حالانکہ اسلام ہر ایک طعنے اور ہر ایک اعتراض سے اُس وقت تک بالکل بری ہے جب تک کہ خود اُس کی تعلیم میں کوئی بات قابل گرفت کے نہ پائی جائے۔

اُسی نے سب سے پہلے اسلام پر سے عیسائی قوموں کا یہ الزام رفع کیا کہ وہ شائستگی اور سویلزیشن کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور مسلمان جب تک مسلمان ہیں دنیوی ترقیات میں حصہ نہیں لے سکتے تھے

اُسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی غزوہ اور کوئی سریہ اس ارادے پر مبنی نہ تھا کہ کفار کو تلوار کے زور سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ جس قدر چھوٹی یا بڑی لڑائیاں آپ کے عہد میں کفار کے ساتھ ہوئیں اُن کا اصل مقصد امن کا قائم کرنا اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے موانع کو دور کرنا تھا اور اُسی نے نہایت روشن دلیلوں سے اس امر کا ثبوت دیا کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں لوگوں کو جبراً مسلمان کرنے کا حکم ہو، بلکہ بے شمار آیتیں اس کے برخلاف صاف صاف دلالت کرتی ہیں کہ دین میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس نکتے کو ظاہر کیا کہ اپنی مذہبی آزادی کے برقرار رکھنے کے لیے دین کے دشمنوں سے لڑنا اور اُن کے ظلم و تعدی کا انتقام لینا یہی فطرتِ انسانی کا مقتضا ہے۔ جس پر انسان عمل درآمد کر سکتا ہے نہ یہ کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی سامنے کر دینا، کیونکہ نہ اس پر کبھی پہلے عمل ہوا ہے اور نہ آیندہ ہو سکتا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے نصِ قرآنی سے ثابت کیا کہ اُن کفار و مشرکین کے سوا جو مسلمانوں سے محض دین کی بابت لڑیں، اُن کو جلاوطن کریں اور اُن کے برخلاف لوگوں کی مدد کریں، کسی مشرک یا کسی کافر کتابی یا غیر کتابی کے ساتھ دوستی کرنا، اُن سے میل جول رکھنا اور صفائی و خلوص سے ملنا دینِ اسلام کی رُو سے منع نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے فقہا کی اس غلطی کو پکڑا کہ ہر ملک مسلمانوں کے لیے یا دارالاسلام ہے یا دارالحرب اور ہر کافر حربی ہے یا ذمی، کیونکہ ہجرتِ اُولیٰ میں جب مسلمان نجاشی کی پناہ میں جا کر رہے تو اُس وقت ایبے سینیا پر نہ دارالاسلام کا اطلاق ہو سکتا تھا نہ دارالحرب کا اور ایبے سینیا کے عیسائیوں پر نہ اہلِ حرب کا اطلاق صحیح تھا نہ اہلِ ذمہ کا۔ اور اسی طرح جن ملکوں میں آج مسلمان عیسائی سلطنتوں کے محکوم ہیں اور مذہبی امور میں اسلامی سلطنتوں سے بھی زیادہ آزاد ہیں اُن ملکوں کو بھی نہ دارالحرب کہہ سکتے ہیں نہ دارالاسلام اور عیسائی حکمرانوں کو اہلِ حرب کہہ سکتے ہیں نہ اہلِ ذمہ۔

اُسی نے سب سے پہلے نصِ قرآنی سے استدلال کیا کہ اسلام نے برخلاف شرائعِ سابقہ کے

اسیرانِ جنگ کے قتل کرنے یا غلام بنانے کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قرآن سے یہ مسئلہ استنباط کیا کہ اگر مسلمان کو اس بات کا احتمال بھی ہو کہ وہ متعدد ازواج میں عدالت نہ کر سکے گا تو اس کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ جورو کرنی جائز نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کا ثبوت دیا کہ طلاق کے مسئلے میں یہودیوں کے ہاں افراط ہے اور عیسائیوں کے ہاں تفریط اور اعتدال صرف اسلام میں ہے اور بس۔

اُسی نے سب سے پہلے رسولِ خدا صلعم کا نسب نامہ عدنان سے لے کر اسمٰعیل علیہ السلام تک زمانۂ حال کے اصولِ مسلّمہ کے موافق صحیح کر کے دکھایا اور مخالفین کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ آنحضرتؐ کا بنی اسماعیل میں سے ہونا ثابت نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنّفوں کی اس غلط فہمی کو رفع کیا کہ مکّہ کے قریب اسمٰعیلؑ کا آباد ہونا محض بناوٹ اور افسانہ ہے اور بوسۂ حجرِ اسود، طوافِ کعبہ، اشہرِ حرم کی تعظیم اور مکّہ و منا و عرفات میں جو مناسک ادا کیے جاتے ہیں اُن میں سے کسی بات کو حضرت ابراہیم کے اصول سے تعلق نہیں ہے بلکہ بُت پرستی کے اصول جو جنوبی عرب میں جاری تھے اُن سے تعلق ہے۔ اُس نے نہایت روشن دلیلوں اور تاریخی شہادتوں اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی نظیر بنی اسحٰق یا بنی اسرائیل میں موجود نہ ہو۔

اُسی نے سب سے پہلے عیسائی مصنّفوں کے اس اعتراض کو دفع کیا کہ قومِ عاد کا قومِ نوح کے بعد اُن کا جانشین ہونا جیسا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے، صحیح نہیں ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے قدیم جغرافیوں کی شہادت اور بائبل کے حوالوں سے ثابت کیا کہ فاران کا لفظ جو حضرت موسیٰؑ اور حبقوق نبیؑ کی بشارت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرت صلعم کی نبوّت پر استدلال کرتے ہیں، اُس سے وادیٔ حجاز مراد ہے نہ وہ مقامات جن کو بعض عیسائی مصنّفوں نے مسلمانوں کے برخلاف فاران کا مصداق قرار دیا ہے۔

اُسی نے سب سے پہلے اُن عظیم الشان فائدوں کو بیان کیا جو دیگر مذاہب کو اور خاص کر دینِ عیسوی کو اسلام کی اشاعت سے پہنچے۔

اُسی نے سب سے پہلے دینِ اسلام اور مغربی علوم میں مصالحت کی بنیاد ڈالی اور اسی غرض سے کم و بیش دو تہائی قرآن کی تفسیر لکھی اور ایسے اصول مقرر کئے جن کے بموجب آیندہ نسلیں اُس کے اس دشوار کام کو پورا کر سکیں اور اگر اُس سے تفسیرِ قرآن میں کوئی لغزش ہوئی ہو تو انہیں اُصول کے موافق اس کی اصلاح کر سکیں۔

اُسی نے سب سے پہلے اس بات کو سمجھا کہ اسلام کے لیے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ قرآن کی جن آیتوں کے معنی علمائے سلف نے بہ پاسِ ادب، یا بخوفِ خرقِ اجماع، یا بہ سبب عدمِ ضرورت، یا اس وجہ سے کہ ممالکِ اسلامیہ میں علمائے اسلام کو پوری پوری مذہبی آزادی نہ تھی، صاف صاف بیان نہیں کئے اور خاص خاص صورتوں کے سوا تمام الفاظِ قرآنی کو اُن کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے، اب بھی اُن کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے، بلکہ ضرور ہے کہ جو الفاظ در حقیقت بطورِ مجاز و استعارہ و تمثیل کے استعمال کیے گئے ہیں اُن کے اصلی معنی بیان کیے جائیں اور جو شبہات اُن کے حقیقی معنی مراد لینے سے پیدا ہوتے ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔

اگرچہ مذہبی تحقیقات کا خدا داد ملکہ جو سرسید کی طبیعت میں ودیعت تھا اُس کا ثبوت اُن کی ہر ایک تحریر میں، جو غدر کے بعد اُن کے قلم سے نکلی نمایاں طور پر پایا جاتا ہے، مگر تفسیر القرآن جس میں گویا نئے علمِ کلام کی بنیاد قائم کی گئی ہے، سب سے عمدہ نمونہ اُن کی تصنیفات کا ہے اور اس کا اندازہ اُس سیدھے سادے اور عام فہم طریقے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اس تفسیر میں بمقابلہ علومِ جدیدہ کے اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو طریقہ دین کی حمایت کا بمقابلہ یونانی فلسفہ کے ہمارے قدیم متکلمین نے اختیار کیا تھا وہ اس زمانے میں کچھ بکار آمد نہیں رہا یہاں تک کہ جو مصنفین اس زمانے میں اُس طریقے پر کاربند ہوتے ہیں اُن کی تصنیفات سے تعلیم یافتہ لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی اور جو شبہات مذہب کی نسبت اُن کے دل میں خطور کرتے ہیں وہ بدستور کھٹکتے رہتے ہیں۔

آج کل ممالکِ عثمانیہ میں رسالہ حمیدیہ کی بہت شہرت ہے جو طرابلس کے مشہور عالم شیخ حسین آفندی نے ۱۳۰۶ھ میں وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی اصلاح کی غرض سے لکھا ہے اور جس پر شام کے بارہ جلیل القدر عالموں نے اور روم و شام و مصر کے بہت سے نامور اخباروں نے لمبی لمبی

تقریظیں اور ریویو لکھے ہیں۔ چونکہ ممالک مذکور میں کسی مسلمان عالم کی یہ مجال نہیں کہ سلف کی تقلید کے دائرے سے قدم باہر رکھ سکے اس لیے مصنفِ موصوف کا طریقۂ استدلال زیادہ تر انہیں اصول پر مبنی ہے جو قدیم متکلمین نے یونانی فلسفے کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔

مثلاً اس زمانے کے نئے اکتشافات میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ سورج اور تمام ثوابت و سیارات جو قدیم خیالات کے موافق آسمانوں میں جڑے ہوئے تسلیم کئے جاتے تھے درحقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ سب ایک فضائے ممتد میں، جس کی وسعت غیر متناہی ہے، جابجا بکھرے ہوئے ہیں اور بذریعہ کشش کے جو منجملہ قوانینِ قدرت کے ایک زبردست قانون ہے، اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کبھی اُس حد سے تجاوز نہیں کرتے اور کوئی ایسا کرہ جو تمام عالم پر محیط ہو مثل آسمان یا عرش و کرسی وغیرہ کے اس فضا میں موجود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اب تھیوری کی حد سے نکل کر سائنس کے درجے کو پہنچ گیا ہے جس پر تمام یورپ اور امریکا کے ہیأت دانوں کا اتفاق ہے۔ اگرچہ حکمائے اسلام میں سے ابوبکر بن العربی کی بھی یہی رائے تھی مگر چونکہ اُس وقت تک کشش کا قانون معلوم نہیں ہوا تھا اس لیے وہ رائے سائنس کے درجے کو نہیں پہنچی تھی۔ چونکہ قرآن مجید میں سبع سموات اور عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنت و جہنم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بظاہر اس نئی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں اور جن سے بڑے بڑے کُرّوں کا اور ایسے اجسامِ عظیمہ کا جو زمین اور آسمان سب پر محیط ہیں اس فضا میں موجود ہونا سمجھا جاتا ہے اس لیے مصنف رسالہ حمیدیہ نے اُس کا یہ جواب دیا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہمارے اوپر سات آسمانوں کا پیدا کرنا اور اُن کے اوپر کرسی اور کرسی کے اوپر عرش کا پیدا کرنا اور جو کچھ کہ ہوا یا آیندہ ہوگا اس کے ثبت کرنے اور لکھنے کے لیے لوح و قلم کا پیدا کرنا اور انسان کے اعمال کی جزا و سزا کے لیے بہشت و دوزخ کا پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ جیسا کہ نصوصِ شرعیہ میں وارد ہوا ہے ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تحتِ قدرت کاملۂ باری تعالیٰ داخل نہ ہو پس جب تک کسی دلیل قاطع عقلی سے یہ ثابت نہ ہو کہ ان میں سے کوئی چیز بالفعل موجود نہیں ہے یا ان کا موجود ہونا محالات سے ہے اُس وقت تک کوئی وجہ نہیں کہ اُن کے وجود کا انکار کیا جائے۔

ہم یہاں اس امر سے بحث کرنا نہیں چاہتے کہ ان چیزوں کے عدمِ وجود یا عدمِ امکان پر کوئی دلیل قاطع عقلی موجود ہے یا نہیں لیکن ہمارے نزدیک اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں کے مذہبی

خیالات کی اصلاح کی غرض سے مصنف موصوف نے یہ کتاب لکھی ہے اُن کے دل کا کانٹا ایسے بیانات سے نہیں نکل سکتا۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ممالکِ اسلامیہ میں علانیہ ایسی تصنیفات پر چون وچرا نہ کی جائے۔ لیکن جن لوگوں نے علومِ جدیدہ کی تعلیم پائی ہے اور تعلیم نے اُن پر اپنا پورا پورا اثر بھی کیا ہے ایسے جوابوں سے اُن کے دل کی خلش کا مٹنا دشوار ہے کیونکہ جن باتوں کو وہ مثل بدیہیاتِ اوّلیہ کے یقینی سمجھے ہوتے ہیں اُن کا یقین محض احتمالات سے زائل نہیں ہو سکتا۔

مگر جو طریقہ سرسیّد نے ایسے شبہات کے رفع کرنے کا اختیار کیا ہے وہ بالکل شارع کے اس اصول کے موافق ہے کہ "کلموا الناس علےٰ قدر عقولھم" کیونکہ اُس سے جہاں تک کہ دیکھا گیا ہے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خاطر خواہ تشفی ہو جاتی ہے اور قرآن کے بیان میں شک و شبہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ سرسیّد کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کا بہ لفظہٖ کلامِ الٰہی ہونا مسلّم ہے، اسی طرح یہ بھی مسلّم ہے کہ وہ انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے پس جس طرح انسان کے کلام کے معنی لگائے جاتے ہیں اسی طرح خدا کے کلام کے معنی لگائے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ انسان کبھی الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہے اور کبھی مجازی معنوں میں، پس قرآن کے الفاظ سے بھی کہیں حقیقی معنی مراد لیے جائیں گے اور کہیں مجازی معنی۔ بڑے بڑے جلیل القدر عالموں اور محققوں نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ قرآن میں انسان کی عقل اور سمجھ کے موافق جو علمی ترقی سے پہلے اُس کی اصل خلقت میں ودیعت تھی خطاب کیا گیا ہے، پس جو کچھ مبداؤ معاد کے متعلق قرآن میں بیان ہُوا ہے ممکن نہیں کہ اُن الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے کیونکہ جس طرح انسان کی سمجھ خدا کی ذات وصفات واسماء وافعال کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے اسی طرح واقعات بعدالموت اُس کے فہم کی رسائی سے وراءالورا ہیں اور کوئی لفظ یا الفاظ انسان کی زبان میں ایسے موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے اُن حقائق و معارف کو کماحقہٗ تعبیر کیا جا سکے۔ پس عرش و کرسی اور لوح و قلم اور جنّت و جہنّم اور اسی طرح تمام الفاظ جو مبداؤ معاد کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہوئے وہ بطور مجاز و استعارہ کے اطلاق کئے گئے ہیں نہ بطور حقیقت کے۔ اسی طرح جو خیال عام انسانوں کا آسمان اور زمین اور ستاروں کی نسبت تھا اُسی کے موافق قرآن میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ آسمان کو مثل ایک چھت یا سائبان کے زمین پر چھایا ہوا تصوّر کرتے تھے سو اُنہیں کی سمجھ کے موافق فرمایا "وجعلنا السّماء سقفاً

محفوظا" وہ زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا جانتے تھے سو اُنہیں کے خیال کے مطابق کہا" والارض فرشناھا" وہ ستاروں کو آسمان میں جڑا ہوا تصوّر کرتے تھے سو اُنہیں کے تصوّر کے موافق فرمایا "انا زیّنا السّمآء الدنیا بزینۃ الکواکب" کیونکہ اصل مقصود آسمان اور زمین اور ستاروں کی حقیقت بیان کرنا نہ تھا بلکہ مصنوعات کی عظمت سے جس طرح پر کہ وہ اُس کو تسلیم کئے ہوئے تھے، صانع کی عظمت و جلال کا تصوّر دلانا اور اُس کی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا۔

یہ ایک نہایت مختصر اور ناکافی خلاصہ ہے اُن تحریروں کا جو سر سیّد نے اس قسم کے شبہات رفع کرنے کی غرض سے تفسیر کے مختلف مقامات میں بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہیں۔ اگر کسی کو زیادہ تفصیل دیکھنی منظور ہو تو وہ تفسیر کی جلدوں کو اور اُن کے رسالۂ اصول التفسیر کو مطالعہ کرے۔

یا مثلاً مصنّف رسالۂ حمیدیہ نے آنحضرت صلعم کی نبوّت پر خوارق عادات یعنی معجزات سے استدلال کیا ہے اور جو کچھ معجزے کے متعلق علمِ کلام کی کتابوں میں لکھا ہے اُسی کو زیادہ صفائی کے ساتھ اپنی عبارت میں ادا کیا ہے۔ اگرچہ خرقِ عادت کو دلیلِ نبوّت گرداننے پر قدیم سے ردّ و قدح ہوتی چلی آئی ہے یہاں تک کہ خود اہلِ اسلام میں سے بعض محققین نے نہایت زبردست دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ معجزہ کسی طرح دلیلِ نبوّت نہیں ہو سکتا، مگر اس میں شک نہیں کہ جمہور متکلمین قدیم سے خرقِ عادت کو دلیلِ نبوّت کہتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں وہ تمام دلیلیں جو خرقِ عادت کے ممکن ہونے یا اُن سے نبوّت کے ثابت ہونے پر قائم کی جاتی تھیں سب بے کار ہو گئی ہیں۔ ہر شخص جس نے زمانۂ حال کے علومِ طبعیہ کی تعلیم پائی ہے اور اُن کو اچھی طرح سمجھا ہے، وہ دل سے اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ قوانینِ قدرت کبھی نہیں بدلتے اور اسباب و مسبّبات میں کبھی تخلف واقع نہیں ہوتا۔

سب سے بڑا شبہ متکلمین کے استدلال پر یہ وارد ہوتا ہے کہ مثلاً جو معجزات آنحضرت صلعم کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اُن میں سے کسی معجزے کی نسبت یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے دعوتِ اسلام کرتے وقت یا اس وقت جب کہ آپ سے معجزے طلب کئے گئے منکرین کو کوئی معجزہ دکھایا ہو۔ بلکہ برخلاف اس کے قرآن سے بخوبی ثابت ہے کہ جب کبھی کفّار کی طرف سے معجزے طلب کرنے میں اصرار ہوا تو آپ نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ "انما الاٰیات عند اللہ" یا "سبحان ربّی ھل کنت الا بشرًا رسولا" یا "لو ان عندی ما تستعجلون بہ لقضی الامر بینی و بینکم"

یا "ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر و بشیر لقوم یومنون" حالانکہ نبوت کا ثبوت اگر معجزے پر منحصر ہوتا تو کفار کو عند الطلب معجزہ دکھانا ضرور تھا۔ بعینہٖ ایسا ہی انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر معجزات حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، اُن میں سے کوئی معجزہ عند الطلب نہیں دکھایا گیا بلکہ برخلاف اس کے متی باب ۴ و ۱۲ و ۲۶ و ۲۷ اور مرقس باب ۸ و ۱۴ و ۱۵ اور لوقا باب ۲۲ و ۲۳ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سے بارہا معجزے طلب کئے گئے مگر آپ نے اُن کے دکھانے سے انکار کیا۔

نیز مصنفِ موصوف نے قدیم متکلمین کی طرح آنحضرتؐ کے معجزات کی نسبت یہ بھی لکھا ہے کہ آپ سے خوارقِ عادات کا وقوع میں آنا تواترِ معنوی کی حد کو پہنچ گیا ہے اور جو بات تواتر سے ثابت ہو اس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانے میں تواتر کو اُسی حالت میں مفید یقین مانا جاتا ہے جب کہ روایت میں کوئی مضمون دلیل قاطع عقلی یا قانونِ قدرت کے خلاف مندرج نہ ہو۔

بہر حال کسی نبی کی نبوت کے ثبوت میں اُس کے خوارقِ عادات کو پیش کرنا، جیسا کہ قدیم متکلمین کا دستور تھا، اس زمانہ میں کچھ بکار آمد نہیں رہا بلکہ کسی نبی کی نسبت یہ ثابت ہونا کہ اُس نے خوارقِ عادات دکھانے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، یہی بڑی دلیل اس کی سچائی کی سمجھی جاتی ہے۔

سرسید نے برخلاف جمہور متکلمین کے خرقِ عادت کے واقع ہونے سے انکار کیا ہے اور اس دعوے کی تائید میں کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا قاضی ابنِ رشد اندلسی کی ایک لمبی تقریر اُن کی کتاب "الکشف عن مناہج الادلۃ فی عقائد الملۃ" سے نقل کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بعد تسلیم کرنے اس بات کے کہ خدا موجود، مرید، متکلم، قادر اور مالکِ عباد ہے اور وہ رسول بھیجا کرتا ہے اور اُن سے معجزات بھی صادر ہوا کرتے ہیں، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن سے معجزے صادر ہوتے ہیں وہ خدا کے رسول ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر جہاں آنحضرتؐ کے معجزات پر بحث کی ہے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تفہیمات سے اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ شقِ قمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے، بلکہ علاماتِ قیامت میں سے ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے "اقتربت الساعۃ وانشق القمر" اور خدا تعالیٰ نے اُن معجزات میں سے (یعنی آنحضرت کے معجزات میں سے) اپنی کتاب میں کچھ ذکر نہیں کیا اور نہ کہیں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اُس کے بعد خود سرسید نے ایک نہایت مفصّل اور شافی بحث فطرتِ انسانی پر اور اس بات پر کی ہے کہ انسان اپنی فطرت کی رُو سے ہدایت کرنے والوں کا محتاج ہے۔ اور اسی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو گروہ کسی شخص کو دین یا شریعت کا ہادی سمجھتا ہے اُس کو جب تک انسانیت کے درجے سے وراء الوراء نہیں ٹھہرا لیتا اس کے دل کو صبر نہیں آتا، یہاں تک کہ اُس کو خدا اور خدا کا بیٹا تک کہنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور کم سے کم یہ کہ اُس میں ایسے اوصاف اور معجزات اور کرامتیں ثابت کرتا ہے جن سے وہ باوجود انسان ہونے کے نوعِ انسان سے بالاتر سمجھا جائے۔ معمولی واقعات جو عادتِ الٰہی کے مطابق ہوتے رہتے ہیں جب اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں تو وہی اُس کی کرامتیں اور معجزے قرار پا جاتے ہیں۔ اگر ایک عام آدمی کسی کو بددعا دے کہ تجھ پر بجلی گرے اور اتفاق سے وہ بجلی ہی سے مارا جائے تو کسی کو کچھ خیال نہیں ہوتا لیکن اگر وہ بددعا کسی ایسے شخص نے دی ہو جس کے تقدّس کا خیال لوگوں کے دلوں میں ہو تو اُس کی کرامت یا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ ... انسان میں بعض ایسی قوتیں ہیں جو خاص طریقہ مجاہدہ سے قوی ہو جاتی ہیں اور کسی میں بمقتضائے خلقت قوی ہوتی ہیں اور اُن سے ایسے ایسے امور ظہور میں آتے ہیں جو اُن لوگوں سے ظہور میں نہیں آسکتے جن کی قوتیں مجاہدہ سے یا بمقتضائے خلقت ویسی قوی نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ سب امور اُسی طرح واقع ہوتے ہیں جیسے تمام کام بمقتضائے فطرتِ انسانی وقوع میں آتے ہیں مگر وہ امور بھی ان مقدس شخصوں کے معجزے یا کرامات سمجھے جاتے ہیں۔ پھر بہت سی عجیب باتیں ان بزرگوں کی نسبت ایسی مشہور ہو جاتی ہیں جن کی درحقیقت کچھ اصل نہیں ہوتی مگر جن کی طرف وہ منسوب کی جاتی ہیں اُن کی عقیدت کے سبب سے بلاتحقیق اُن پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ اسی سبب انبیاء علیہم السّلام کے اکثر کاموں کو بطور خوارقِ عادات کے بیان کیا گیا ہے اور بہت سی باتیں اُن کی طرف ایسی منسوب کی گئی ہیں جن کا کچھ ثبوت نہیں۔ انتہیٰ ملخصًا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "انہیں غلط خیالات کے سبب لوگوں نے انبیاء سے انکار کیا ہے چنانچہ قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود نے انبیاء کے انکار کرنے کی یہی وجہ بیان کی "ان انتم الا بشر مثلنا اور انہیں غلط خیالات کی وجہ تھی کہ مشرکین عرب بھی آنحضرت صلعم سے معجزوں کے طلبگار ہوتے تھے کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں ان کے پاس فرشتے آتے؟ کیوں نہیں ان کے پاس خزانہ اتارا گیا؟ کبھی کہتے تھے کہ یہ تمام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں، یعنی انسانوں

سے زیادہ کوئی بات ان میں نہیں ہے۔ کبھی آسمان سے پتھر برسوانے چاہتے تھے۔ کبھی آسمان کا ٹکڑا ٹوٹ کر گرنے کی خواہش کرتے تھے۔

اس کے بعد سرسید نے سورۂ کہف، سورۂ اعراف، سورہ بنی اسرائیل اور سورۂ عنکبوت کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں آنحضرتؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ معجزہ یا علمِ غیب کے تجھ سے متوقع ہیں، اُن سے کہہ دے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک بشر ہوں مثل تمہارے جس کو وحی سے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے اور بس اور کہہ دے کہ میں بغیر خدا کی مشیت کے نہ اپنے تئیں نفع پہنچا سکتا ہوں نہ نقصان اور اگر میں غیب کا علم رکھتا تو کثرت سے بھلائیاں حاصل کر لیتا اور بُرائی مجھ کو چھوتی بھی نہیں، میں کچھ نہیں ہوں سوا اس کے کہ مومنوں کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا اور بس۔ اور کہہ دے کہ پاک ہے میرا رب میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک انسان خدا کا بھیجا ہوا اور کہہ دے کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں۔ میں کچھ نہیں ہوں مگر ایک علانیہ ڈرانے والا۔

ان آیتوں کے نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت صلعم کے پاس جو کہ افضل الانبیاء والرسل ہیں، معجزہ نہ ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین (علیہم السلام) کے پاس بھی کوئی معجزہ نہ تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے وہ درحقیقت معجزات نہ تھے بلکہ ایسے واقعات تھے جو مطابق قانونِ قدرت کے واقع ہوئے تھے۔ خاتم النبیین (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے جو اس بات کو کھول دیا اور چھپا کر نہیں رکھا اُس کا اعلیٰ سبب یہ تھا کہ بڑا جزو اسلام کا ... ... جس کی وجہ سے آپ خاتم النبیین ہوئے وہ صرف تکمیلِ تلقینِ توحیدِ ذاتِ باری تھی جو توحیداتِ ثلاثہ میں منحصر ہے، یعنی توحید فی الذات توحید فی الصفات اور توحید فی العبادۃ۔ انبیاء میں معجزات کا (علی المعنی المتعارف) یا اولیاء اللہ میں کرامات کا یقین کرنا گو کہ اعتقاد کیا جائے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت اُن میں دی ہے) توحید فی الصفات کو نامکمل کر دیتا ہے۔ کوئی عزت، کوئی بزرگی، کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام اور بانیٔ اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ اُس نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اور بغیر کسی دھوکا دینے کے اور بغیر کسی کرشمہ و قوت کا دعوے کرنے کے صاف صاف لوگوں کو بتا دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں، میرے دل میں جو وحی ڈالی ہے اُس کی تم کو تلقین کرتا ہوں۔ صلی اللہ علی محمد خاتم النبیین وحبیب رب العلمین"۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ خوارقِ عادات جو عموماً انبیاؑ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں سرسید اس کی وجہ یہ نہیں سمجھتے کہ اُن کی نبوت کا یقین لوگوں کو فی الواقع اُن کے خوارقِ عادات دیکھنے سے ہوا تھا بلکہ اُس کے نزدیک انسان کی فطرت کا مقتضا یہی ہے کہ انبیاء اور اولیاء اور تمام مقدس لوگ جن سے اُن کو عقیدت ہوتی ہے، اُن کی معمولی باتیں بھی اُس کو معجزہ اور کرامت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی مطلب کو وہ آگے چل کر دوسری طرح بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ انبیاء پر ایمان لانا بسبب ظہورِ معجزات باہرہ کے ہوتا ہے مگر یہ خیال محض غلط ہے۔ انبیاؑ پر یا کسی ہادیِ باطل پر ایمان لانا بھی انسانی فطرت میں داخل اور قانونِ قدرت کے تابع ہے۔ بعض انسان از روئے فطرت کے ایسے سلیم الطبع پیدا ہوتے ہیں کہ سیدھی اور سچی بات اُن کے دل میں بیٹھ جاتی ہے، وہ اس پر یقین کرنے کے لئے دلیل کے محتاج نہیں ہوتے باوجودیکہ وہ اُس سے مانوس نہیں ہوتے مگر اُن کا وجدان صحیح اُس کے سچے ہونے پر گواہی دیتا ہے۔ اُن کے دل میں ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اُس بات کے سچ ہونے پر اُن کو یقین دلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو انبیائے صادقین پر صرف اُن کا وعظ و نصیحت سُن کر ایمان لاتے ہیں، نہ معجزوں اور کرامتوں پر۔ اسی فطرتِ انسانی کا نام شارع نے ہدایت رکھا ہے مگر جو لوگ معجزوں کے طلبگار ہوتے ہیں وہ کبھی ایمان نہیں لاتے اور نہ معجزوں کو دکھانے سے کوئی ایمان لا سکتا ہے۔ خود خدا نے اپنے رسولؐ سے فرمایا "اگر تو زمین میں ایک سرنگ ڈھونڈ نکالے یا آسمان میں ایک سیڑھی لگائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے" اور ایک جگہ فرمایا کہ "اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی بھیج دیں اور اس کو وہ اپنے ہاتھوں سے بھی چھو لیں، تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو علانیہ جادو ہے"۔ پس ایمان لانا صرف ہدایت (فطرت) پر منحصر ہے جیسے کہ خدا نے فرمایا "اللہ یھدی من یشآء الی صراطٍ مستقیم"، ہادیِ باطل پر جو لوگ ایمان لاتے ہیں (یا ہادیِ برحق کی بات قبول نہیں کرتے) اُن کے دل میں بھی غالباً اسی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُس کا سبب کبھی اُن کی فطرت ہوتی ہے جو کجی کی طرف مائل ہے اور سیدھی طرف مائل ہی نہیں ہوتی، اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے "من یشآء اللہ یضللہ ومن یشآء یجعلہ علیٰ صراطٍ مستقیم" اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ دینِ آبائی کا اور سوسائٹی کا ایسا بوجھ اُن کی طبیعتوں پر ہوتا ہے کہ سیدھی بات کے دل میں گھسنے کی جگہ ہی نہیں رہتی اور کبھی یہ ہوتا کہ متعصب بالطبع ہو کر اُس بات پر غور نہیں کرتے اور اسی کی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ "فمن یرد اللہ ان یّھدیہ

یشرح صدرہ للاسلام و من یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء کذلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون"

پھر اسی معجزے کی بحث میں سر سید نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر معجزے سے، جیسا کہ شاہ ولی اللہ اور بعض دیگر محققین نے لکھا ہے، یہ مراد ہے کہ وہ بغیر موجود ہونے اسباب کے ظہور میں نہیں آتا تو ہم ایسے امر کے واقع ہونے سے انکار نہیں کرتے مگر نبی کے ساتھ اُس کے مخصوص ہونے اور غیر نبی سے اُس کے ظہور میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور اگر اُس سے جیسا کہ جمہورِ متکلمین قائل ہیں کوئی امر خارقِ عادت جو قوانین قدرت کے برخلاف ظہور میں آئے مراد ہے تو ہم اُس کے انکار پر مجبور ہیں، نہ اس لئے کہ حکماء و فلاسفہ اُس کو کسی وجہ سے ناممکن سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ قرآن ہم کو صاف صاف ہدایت کرتا ہے کہ قوانینِ قدرت کبھی نہیں بدلتے۔ جیسا کہ خدا تعالےٰ نے سورۂ قمر میں فرمایا کہ "انا کل شیء خلقناہ بقدر" اور رعد میں فرمایا "و کل شیء عندہ بمقدار" اور فرقان میں فرمایا "خلق کل شیء فقدرہ تقدیراً" اور روم میں فرمایا "لا تبدیل لخلق اللہ" اور ملائکہ میں فرمایا "فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا و لن تجد لسنۃ اللہ تحویلا" اور سورۂ فتح میں فرمایا "سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل و لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" اور بنی اسرائیل میں فرمایا "قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ (ای طریقتہ التی جبل علیہا)" یہ تمام آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کوئی شے اپنے اندازے سے، جو خدا تعالےٰ نے اُس کے لئے مقرر کیا ہے، نہ بڑھ سکتی ہے نہ گھٹ سکتی ہے اور خدا کی بنائی ہوئی خلقت میں تبدیلی ممکن نہیں اور خدا کی سنت (یعنی عادت) نہ بدل سکتی ہے اور نہ دگرگوں ہو سکتی ہے اور ہر کوئی اُسی طریقے پر چلتا ہے جو اُس کی جبلت میں رکھا گیا ہے۔ انتہیٰ ملخصاً۔

بہرحال معجزہ جن معنوں میں کہ وہ عموماً بولا جاتا ہے، سر سید کے نزدیک نہ اُس کا وقوع میں آنا ممکن ہے اور نہ نبی کی تصدیق اُس پر موقوف ہے۔ اُن کے نزدیک نبی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس کی تعلیم تمام طبقاتِ ناس کی سمجھ کے موافق اور جاہل اور حکیم اور خدا پرست اور نفس پرست سب کو ایک نتیجے پر پہنچانے والی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمائے الٰہی اور انبیائے ربانی دونوں ایک سا کام کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ حکما صرف اُن چند لوگوں کو تربیت کر سکتے ہیں جن کا دل و دماغ تربیت پا چکا ہے، برخلاف اس کے انبیاء تمام کافۂ انام کو تربیت کرتے ہیں جن کا

بہت بڑا حصّہ محض ناتربیت یافتہ، جاہل، وحشی، جنگلی، بدوی بے عقل اور بد دماغ ہوتا ہے اور اسی لئے انبیاء کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ان حقائق و معارف کو جن کو تربیت یافتہ عقل بھی مناسب غور و فکر تامل سے سمجھ سکتی ہے، ایسے الفاظ میں بیان کریں کہ تربیت یافتہ دماغ اور کوڑ مغز دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید میں جو بے مثل چیز ہے وہ یہی ہے کہ اس کا طرزِ بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ کے موافق ہے اور باوجود اس قدر اختلاف کے دونوں نتیجہ پانے میں برابر ہیں۔ انہیں آیات کی نسبت (یعنی جن آیتوں میں جنّت اور حور قصور وغیرہ کا بیان ہے) دو مختلف دماغوں کے خیالات پر غور کرو۔ ایک تربیت یافتہ دماغ خیال کرتا ہے کہ بہشت وغیرہ کا جن الفاظ سے بیان ہوا ہے اُن سے بعینہ وہی اشیاء مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ درجے کی خوشی و راحت کو فہمِ انسانی کے لائق تشبیہ میں لاتا ہے۔ اس خیال سے اُس کے دل میں ایک بے انتہا عمدگی نعیم جنّت کی اور ایک ترغیب اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے کی پیدا ہوتی ہے اور ایک کوڑ مغز مُلّا یا شہوت پرست زاہد سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت ان گنت حوریں ملیں گی، شرابیں پیئں گے، میوے کھائیں گے، دودھ اور شہد کی ندیوں میں نہائیں گے اور جو دل چاہے گا مزے اڑائیں گے، وہ بھی اس لغو و بیہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے اور جس نتیجے پر پہلا پہنچا تھا۔ اُس پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور کافۂ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے پس جس شخص نے قرآن مجید کی ان حقائق پر جو فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کیا اُس نے درحقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا اور اس نعمتِ عظمیٰ سے بالکل محروم رہا۔

اس طریقۂ استدلال میں جو کہ سرسید نے اسلام کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اختیار کیا ہے اور شیخ حسین آفندی کے طریقے میں جو رسالہ حمیدیہ میں اختیار کیا گیا ہے، یہ فرق ہے کہ شیخ کے استدلال سے زیادہ تر وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن پر نئی تعلیم نے کچھ اثر نہیں کیا اور جن کے دل ہر قسم کے شکوک و شبہات سے خالی ہیں، مگر جس جماعت کی تشفّی کے لئے وہ کتاب لکھی گئی ہے اُن پر اُس کا منتر کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جو طریقہ سرسید نے اپنی تفسیر میں اسلام کی حقیقت ثابت کرنے کا اختیار کیا ہے، اگرچہ پُرانے خیالات کے مسلمان جن کے لئے درحقیقت یہ تفسیر نہیں لکھی گئی، اُس کی کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے لیکن نئے خیالات کے لوگ جو اس تفسیر کے مخاطبِ صحیح ہیں، وہ اُس سے خاطر خواہ تشفّی پاتے ہیں۔

آج کل ہندوستان میں مذہبی آزادی کا یہ حال ہے کہ ہر شخص جس مذہب پر اور جس مذہبی تصنیف پر چاہے اعتراض کر سکتا ہے ۔ باوجود اس کے سرسید کی مذہبی تصنیفات پر جس قدر اعتراضات آج تک سُنے گئے ہیں وہ سب قدیم خیالات کے مسلمانوں کی طرف سے سُنے گئے ہیں، کسی نئے تعلیم یافتہ مسلمان نے اُن پر نکتہ چینی نہیں کی ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اکثر مذہب کی طرف سے ایسے بے پروا ہیں کہ وہ کسی مذہبی تصنیف کے مخالف یا موافق لکھنے کو ایک فضول بات سمجھتے ہیں اور بہت بڑا حصہ اس گروہ کا وہ لوگ ہیں جو اس بات کے سمجھنے کی لیاقت ہی نہیں رکھتے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسلام کے خالص اصول کے موافق صحیح ہے یا نہیں، مگر با ایں‌ہمہ نئے خیالات کے مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دینِ اسلام کے دلدادہ ہیں، قرآن اور حدیث کو بخوبی سمجھتے ہیں اور جو کچھ مذہب کے متعلق آج کل لکھا جاتا ہے، اس پر نکتہ چینی کرنے اور رائے دینے کی کافی لیاقت رکھتے ہیں ۔ ان لوگوں میں سے بھی کسی نے، سوا اس کے کہ بعض جزئیات میں سرسید سے اختلاف کیا ہو، اُن اصولوں کے تسلیم کرنے سے جن پر تفسیر مذکور کی بنیاد رکھی گئی ہے انکار نہیں کیا۔

سرسید نے جن اصول پر قرآن کے معنی بیان کیے ہیں اُن میں ظاہرا کوئی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جس پر کچھ گرفت ہو سکے، مگر اس میں شک نہیں کہ بہت سی آیتوں کے معنے بیان کرنے میں جن اصول کی اُن کو پابندی کرنی چاہیے تھی ان کی پابندی نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے بعض آیات کی تفسیر میں سرسید کے بعض ہم خیال آدمی اُن کے ساتھ متفق نہیں ہیں ۔

مثلاً سرسید جس طرح کہ آنحضرت صلعم کے معجزات کا قرآن میں مذکور ہونا تسلیم نہیں کرتے اسی طرح اُن کے نزدیک انبیائے سابقین کے معجزات کا بھی قرآن میں کچھ ذکر نہیں ہے اور اس لیے انھوں نے انبیائے سابقین کے ہر ایک ایسے واقعہ کو جو ظاہرا کسی امرِ خارقِ عادت پر دلالت کرتا ہے، قانونِ قدرت کے مطابق ثابت کرنے میں کوشش کی ہے ۔ مگر اُن کے بعض ہم خیال، باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت ؐ کے معجزات کا قرآن میں مذکور نہ ہونا تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کوئی امر قانونِ قدرت کے خلاف وقوع میں نہیں آسکتا، مگر اُن کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ انبیائے سابقین کے اکثر واقعات اگرچہ نفس الامر میں موافق قانونِ قدرت کے واقع ہوئے ہوں، مگر قرآن مجید میں بطور خوارقِ عادات کے، جیسا کہ عرب کے اہلِ کتاب اعتقاد رکھتے تھے، بیان کیے گئے ہیں ۔ اور اُن کے نزدیک قرآن کی یہ طرزِ بیان ہرگز اُس کی سچائی کے برخلاف نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اور دلائل کے تو خود سرسید نے متعدد

آیتوں کی تفسیر اس اصول کے مطابق کی ہے کہ قرآن میں بہت سی باتیں بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ فی الواقع صحیح ہیں یا نہیں، محض لوگوں کی معمولی سمجھ اور اُن کے اعتقاد کے موافق بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ اصول درحقیقت انہوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ بالغہ سے اخذ کیا ہے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ "شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو وہ قاتی علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی، اُن سے خطاب کیا ہے۔" اور دوسری جگہ اسی کتاب میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "انبیا کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اُن کی معمولی سمجھ اور عقل سے بڑھ کر، جس پر کہ وہ مجبول ہوئے ہیں، کلام نہ کریں۔"

اسی اصول کے موافق سر سید نے اُس آیت کی تفسیر کی ہے جس میں زمین و آسمان کا چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے اور جس پر "سائنس کا یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ دنیا چھ دن سے زیادہ عرصے میں پیدا ہوئی ہے۔ اُن کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ اس سے کسی حقیقت یا کسی خبر کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ توریت میں بھی چونکہ اس موقع پر "چھ دن" کا لفظ واقع ہوا تھا اور عرب کے تمام اہل کتاب اور دیگر قومیں جو اہلِ کتاب سے میل جول رکھتی تھیں سب کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا چھ دن میں بنی ہے اس لئے شارع نے اسلام کا اصل مقصد، یعنی خدا کی الوہیت اور توحید کا یقین دلانا، مخاطبین کی سمجھ کے موافق ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ "ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوات والارض فی ستۃ ایام"

چونکہ سر سید کے قول کے موافق بزرگوں اور مقدس لوگوں کی طرف خوارقِ عادات کا منسوب کرنا انسان کی فطرت کا مقتضا ہے یہاں تک کہ اُن کی اکثر معمولی باتیں بھی معجزات یا کرامات تصور کی جاتی ہیں اور خاص کر انبیائے بنی اسرائیل کے قصے جو عرب کے اہلِ کتاب میں مشہور تھے اُن میں بہت سی باتیں بطور خوارقِ عادات کے مشہور چلی آتی تھیں اور قرآن میں اُن قصوں کا بیان کرنا مقصود بالذّات نہ تھا بلکہ اُن میں جو باتیں مخاطبین کی ہدایت اور تہذیبِ نفس میں دخل رکھتی تھیں صرف اُن کا مجملاً ذکر کرنا منظور تھا اس لئے یہ ایک لازمی بات تھی کہ انبیائے بنی اسرائیل کے قصوں میں جس قدر کہ قرآن مجید میں بغرض روحانی تعلیم کے اخذ کیا جائے وہ انہیں پیرایوں میں بیان کیا جائے جو اہلِ کتاب کے دلوں پر مثل علوم متعارفہ کے نقش ہو رہے تھے۔ کیونکہ قرآن کا اصل مقصد اُن نصیحتوں کا بیان کرنا تھا جو اُن قصوں سے استنباط ہوتی تھیں نہ کہ اُن قصوں کی نسبت انیسویں صدی عیسوی کی سائنٹفک تحقیقات کا بیان

کرنا۔ ہاں بلاشبہ قرآن کا جو خاص کر توحید کی تکمیل کے لیے نازل ہوا تھا، یہ کام تھا کہ خرقِ عادت کا غلط خیال جو توحید فی الصفات کا منافی تھا، اُس کی غلطی ظاہر کر دے۔ سو اُس نے نہایت تصریح کے ساتھ مستقل طور پر، نہ کہ انبیائے بنی اسرائیل کے واقعات کے ضمن میں، اُس کی غلطی کو ظاہر کر دیا اور خود خاتم النبیین کی زبان حق ترجمان سے بکرات و مرات علی رؤس الاشہاد کہلوا دیا کہ "انما الآیات عند اللہ و انما انا نذیر مبین"۔

الغرض باوجود ان جزئی اختلافات کے، جو سرسید کے اسکول کے بعض اشخاص بعض آیتوں کی تفسیر میں اُن کے ساتھ رکھتے ہیں، ظاہرا اُن اُصول کو سب تسلیم کرتے ہیں، جن پر اس تفسیر کی بنیاد رکھی گئی ہے اور غالباً مستثنیٰ مقامات کے سوا جن کو ہم کسی دوسری تحریر میں بیان کریں گے، جو کچھ کہ سرسید نے زمانہ حال کے مسائل کلامیہ کی نسبت لکھا ہے، اس کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس زمانہ کی اسلامی فتوحات میں شمار کرتے ہیں۔ خصوصاً وحی اور اُس کے نزول کی تحقیق، نبوت کی حقیقت، قرآن کے معجز ہونے کا بیان، جنت و دوزخ اور اس کے نعیم و آلام کی حقیقت، آدم کے بہشت سے نکالے جانے کی تحقیق، معجزے کی بحث، ملائکہ اور شیطان کی بحث، جبریل و میکائیل کی حقیقت، ناسخ و منسوخ کی بحث، سمتِ قبلہ کی تحقیق، حضرت عیسےٰ کے بن باپ پیدا ہونے کی تحقیق، شہدا کو زندہ سمجھنے کی تحقیق، قطع ید سارق کے مسئلے کی تحقیق، نفخ صور اور وزنِ اعمال کی تحقیق، روح اور اس کے باقی رہنے کی بحث، آخرت اور قیامت کا بیان، خدا کے ساتھ موسیٰ کے کلام کرنے اور کوہِ طور پر تجلی ہونے کی بحث، دیدارِ الٰہی کی بحث، بدر و حنین کی لڑائی میں فرشتوں کے آنے کی تحقیق، طوفانِ نوح کی بحث، حضرت یعقوب کے نابینا ہونے کے بعد بینا ہونے کی تحقیق، معراج اور شق صدر کے مسئلے کی تحقیق اور اسی قسم کی اور بہت سی تحقیقاتیں اور بحثیں خاص کر توجہ کے لائق ہیں۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں قرآن کے وہ سربستہ اسرار ظاہر کیے ہیں جن کے اعلان کرنے کی ممانعت قدیم سے ہوتی چلی آئی ہے، مگر اس باب میں اُنہوں نے جو عذر کیے ہیں وہ بھی ملاحظہ کے قابل ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر کی تیسری جلد میں علامہ ابن رُشد کی ایک لمبی تقریر کا خلاصہ نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مسائلِ غامضہ جو جمہور کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں اُن کو ایسے لوگوں کے سامنے جو اُن کے اہل نہیں ہیں، بیان کرنے والا کافر ہے اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی نص کی تاویل کرتا ہے سو ظاہر ہے کہ اُس کا مقصد ظاہری معنوں کو باطل کرنے اور تاویلی

معنوں کے ثابت کرنے کا ہوتا ہے۔ پس جب کہ عام آدمیوں کے نزدیک ظاہری معنے باطل ہو گئے اور تاویلی معنے اُن کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ نص اصول دین سے علاقہ رکھتی ہے تو ظاہر ہے کہ کفر تک نوبت پہنچ جائے گی۔ پس عام لوگوں کو سمجھا دینا چاہیئے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں، خدا ہی اُن کی حقیقت خوب جانتا ہے۔ انتہیٰ ملخصاً۔

اس تقریر پر سرسید لکھتے ہیں کہ "نتیجہ اس تقریر کا یہ ہے کہ کوئی بات بھی شریعت کی جو بیانِ حقیقت یا تاویلات کی قسم سے ہو، سوائے راسخین فی العلم کے کسی کے سامنے بیان نہ کی جائے۔ جس قسم کے لوگوں کو ابنِ رشد نے راسخین فی العلم میں قرار دیا ہے اس زمانے میں تو ایسا شخص کوئی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانے میں بھی دو ایک کے سوا کوئی نہ تھا۔ پس ضرورتاً لازم آتا ہے کہ تمام مقدم باتیں شریعت کی بطور ایک معما و چیستان یا مثل راز فری میسن کے غیر معلوم رہنی چاہیئیں۔

"اگر ہمارا مذہب اسلام ایسا ہو کہ اُس کے اصول لوگوں کو نہ سمجھا سکیں جو اُن کو سمجھنا چاہتے ہیں، یا اُن لوگوں کی تشفّی نہ کر سکیں جن کے دل میں شبہات پیدا ہوئے ہیں، بلکہ اُن سب کو اس پر مجبور کریں کہ ان باتوں کو اسی طرح مان لو تو ہم اپنے مذہب کی صداقت فی نفسہٖ اور بمقابلہ دیگر مذاہبِ غیر حق کے کیونکر ثابت کر سکتے ہیں۔ ایک عیسائی کہتا ہے کہ "تثلیث کا مسئلہ کہ تین تین بھی ہیں اور ایک بھی ہیں، ایک الٰہی مسئلہ ہے۔ اس پر بے سمجھے یقین کرنا چاہیئے" پس اگر ہم مذہبِ اسلام کے بہت سے مسئلوں کی نسبت ایسا ہی کہنا قرار دیں تو کیا وجہ ہے کہ اُس کی تکذیب اور اِس کی تصدیق کریں۔"

اس کے بعد اُن کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں عالم اور جاہل سب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں، دوسرے وہ جو ہر ایک بات کی دلیل طلب کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ جاہل ہوں یا عالم، کسی بات کا بغیر دلیل یقین نہیں کرتے۔ اس دوسری قسم کے لوگوں سے (جو اس زمانے میں بہت کثرت سے ہیں) یہ کہنا کہ تم راسخین فی العلم میں سے نہیں ہو لہٰذا مذہب کی ہر ایک بات کو بلا دلیل تسلیم کر لو اور اسی پر یقین رکھو، کس طرح اُن کے دل کو تشفّی دے سکتا ہے؟ کیونکہ یقین کوئی اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ اضطراری شے ہے کہ جب تک وہ شبہ رفع نہ ہو جس نے یقین میں خلل ڈالا ہے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس ضرور ہے کہ ہر ایک امر قابلِ بیان کی حقیقت اور قابل تاویل کی تاویل اُن کے سامنے بیان کی جائے اور اس صورت میں جو لوگ اُن باتوں کے بیان

کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بیان نہیں کرتے، وہ اُسی دلیل سے کافر قرار پاتے ہیں جس دلیل سے کہ ابنِ رُشد نے ان چیزوں کے بیان کرنے والوں کو کافر بنایا ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ "فرض کرو اُن متشکلین کو اس قدر لیاقت نہیں ہے کہ وہ اُن حقیقتوں اور تاویلوں کو سمجھیں مگر اتنی بات تو اُن پر ثابت ہوگی کہ اُس کے لئے دلیلیں اور اُس کی صداقت کے ثبوت کے لئے وجوہات اور اُس کی حقیقت کے لئے بیانات ہیں گو ہم اُن کو سمجھ نہیں سکتے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُن کے سمجھانے کا جو فرض ہم پر تھا اُس کو تو بلاشبہ ہم ادا کر دیں گے۔ بہت لوگوں نے پیغمبروں کی نصیحتوں کو نہیں سمجھا مگر پیغمبر اس خیال سے کہ وہ اُن کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں نصیحتوں کے سمجھانے سے باز نہیں رہے بلکہ طرح طرح سے سمجھایا اور کوشش کی کہ اُن کو اُن کے سمجھنے کے لائق کریں۔"

اس خوف سے کہ ان لوگوں کے نزدیک جب ظاہر معنی باطل ہو جائیں گے اور اصل حقیقت یا تاویل کے سمجھنے کے لائق نہ ہونے کے سبب وہ اُس کو نہ سمجھیں گے تو اصولِ شرع سے منکر ہو جائیں گے اور کفر تک نوبت پہنچا دیں گے، ہم کو حقیقت اور صداقت کے بیان سے باز نہیں رہنا چاہیئے۔ اگر یہ الزام صحیح ہو تو قرآن مجید بھی باایںہمہ خوبی اس الزام سے بری نہیں رہ سکتا۔ خود خدا تعالےٰ فرماتا ہے "یضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا"

ابنِ رُشد نے اپنی تقریر میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان باتوں کا بیان کرنا خاص کر اُس حالت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہے جب کہ اصولِ شریعت میں تاویلات فاسدہ ہونے لگیں جیسا کہ ہمارے (یعنی ابنِ رشد کے) زمانے میں لوگوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے۔ اس تقریر پر سرسیّد یہ ریمارک کرتے ہیں کہ "تاویلات فاسدہ بھی اگر ہوں تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں اس لئے کہ جو چیز غلط ہے اُس کی غلطی بہت دیرپا نہیں ہو سکتی، دوسروں کو اُس کی غلطی بیان کرنے کا اور غلط کو صحیح کرنے کا موقع ملتا ہے اور اگر وہ بیان ہی نہ کی جائے تو سچ بات کے ظاہر ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں آسکتا۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جب کہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں، علم ایک نہایت محدود فرقے میں تھا جس کو وہ اپنے خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اور تمام لوگ اعلےٰ و ادنےٰ علوم کے ادنیٰ ادنیٰ مسائل سے بھی بے بہرہ تھے اور اُن کے دل شبہات و تشکیکات سے پاک تھے اور یہی باعث ہوا کہ اُن علماء نے ایسی رائے قائم کی

تھی۔ مگر وہ زمانہ گیا، علوم و حکمت اب اس قدر عام ہو گئی کہ ایک بہت حصّہ دنیا کا اُس سے واقف ہو گیا۔ طفلِ دبستان اپنے مکتب میں ارسطو اور افلاطون کی غلطیوں کا جہاں جہاں انہوں نے کی ہیں، ذکر کرتا ہے۔ ہزاروں آدمی ہر شہر و قصبہ میں ایسے موجود ہیں جو خود کچھ نہیں جانتے مگر بہت سے مسائل علوم و حکمت کے سُن سُن کر کان آشنا ہو گئے ہیں، اور اکثر الناس وہ ہیں جن کے دل شبہات و تشکیکات سے مملو ہیں۔ اس زمانے میں جو اہلِ علم ہیں ان کا ایمان بھی حلق کے نیچے تک نہیں ہے۔ مُنہ سے کہتے ہیں کہ جو کچھ قرآن و حدیث میں آیا ہے اُس پر یقین کرنا چاہیئے مگر دل میں شبہات بھرے پڑے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یقین کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ ہونے سے ہوتا ہے۔ پس اب زمانہ ہے کہ جو کوئی بقدر اپنی طاقت کے ان تمام حقائق اور تاویلات کو نہ کھولے اور لومۃِ لائم سے نڈر ہو کر اگلے علماؒ کی اُن غلطیوں کو جو اُس زمانے کے نامکمل علوم اور نامکمل تحقیقات کے سبب حقائق کے بیان اور قرآن مجید کی تفسیر میں راہ پا گئی ہیں عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے، وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ومن یفعل ذلک فھو یؤدی حق اللہ وحق دینہ وحق اھل دینہ وقومہ واللہ المستعان۔

سوشل ریفارم

اگرچہ ہندوؤں میں اس صدی کے آغاز سے وقتاً فوقتاً ایسے اولوالعزم آدمی اُٹھتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح پر کمر باندھی ہے جیسے راجہ رام موہن رائے، بابو کیشپ چندر سین، ایشر چندر ودیا ساگر، سر پیش چندر بھٹا چارج، رام تنو لاہیری؛ سوامی دیانند سرستی وغیرہ وغیرہ، مگر مسلمانوں میں ظاہرا دو شخصوں کے سوا کہ دونوں دلّی کی خاک سے اُٹھے، کسی نے اس کام پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسمٰعیل اور دوسرے سیّد احمد خاں۔ گو کہ زمانے کے اقتضا سے مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے جاتے ہیں جن کو قوم کی سوشل خرابیاں محسوس ہونے لگی ہیں مگر اتنی جرأت کسی کو نہیں ہوتی کہ تمام قوم کے خلاف کسی بڑی رسم یا رسمیت کو ترک یا کسی اچھی بات کو اختیار کیا جا سکے۔ سر سیّد نے اپنی تحریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اکثر لوگ ہیں جو بہت سی رسموں کو بُرا جانتے ہیں مگر اُن کو

---

[۱] سر سیّد کے اس بیان میں کسی قدر تسامح ہے ہمارے نزدیک یہ مطلب اُن کو اس طرح ادا کرنا چاہیئے تھا کہ نڈر ہو کر اُن باتوں کو جن کے بیان کرنے کا اب سے پہلے کبھی وقت نہیں آیا تھا اور اس لئے ہمارے قدیم مفسرین ان کے بیان کرنے سے ساکت رہے تھے عام طور سے سب کے سامنے بیان نہ کرے، وہ اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر ہے" ۱۲

چھوڑ نہیں سکتے اور بہت سی باتوں کو اچھا جانتے ہیں مگر اُن کو اختیار نہیں کرتے۔ بعضے تو یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ مداخلت کرے تو قرار واقعی اصلاح ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم بدنامی سے بچیں اور گورنمنٹ بدنام ہو اور بعضے کہتے ہیں کہ برادری کا اتفاق ہو تو کام چلے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "لوگ اصلاح اور ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں۔ ... مگر میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح کا خیال ہو اس کو چاہیئے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اُس رسم کو توڑے یا اُس میں اصلاح اور ترقی کرے۔ بیشک تمام قوم اُس کو بُرا کہے گی اور نکّو بنائے گی، مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے۔ اور جس طرح کہ اوّل وہ ہدفِ تیرِ ملامت ہُوا تھا، انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلحِ قوم شمار کیا جائے گا۔"

بلاشبہ جس شخص میں قوم کے برخلاف کسی کام کے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی وہ کسی قوم کا مصلح بننے کی لیاقت نہیں رکھتا۔ سرسیّد میں یہی چیز تھی جس نے اُن کو اِس منصبِ جلیل کے لائق بنایا تھا۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ کسی شخص نے حلّتِ طعامِ اہلِ کتاب کے باب میں سرسیّد کی ایک تحریر دیکھ کر لکھا تھا کہ "کاش ہم سیّد صاحب کو اپنے قول کے موافق عمل کرتے ہوئے بھی دیکھیں۔" سرسیّد نے فوراً اس کے جواب میں لکھا کہ "نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اُس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔"

جو کام سرسیّد کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے اور جن کا کرنا نہ کرنا خود اُن کے اختیار میں تھا اُن میں رسم و رواج کی پابندی کو اُنھوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا۔ شادی غمی اور تیج تہوار میں جو فضول رسمیں قوم میں جاری ہیں سرسیّد کے گھر میں کہیں اُن کا نام و نشان نہ تھا۔ اُنھوں نے اُس بیٹے کا نکاح جو ہائی کورٹ کا جج تھا دلّی میں جا کر ایسا چُپ چپاتے کر دیا کہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا کسی کو خبر تک نہیں ہوئی اور اس خوشی میں بجائے اس کے کہ تورہ بندی یا دعوت وغیرہ میں زرِ خطیر خرچ کیا جاتا ایک مناسب رقم مدرسۃ العلوم کی نذر کر کے تقریب کو ختم کر دیا۔ پوتے کی بسمہ اللہ میں علی گڑھ سے دلّی جانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور نہ کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس تقریب میں وطن سے بُلایا۔ جب کانفرنس کا جلسہ ختم ہو چکا۔ اُسی قومی مجمع میں بسم اللہ پڑھی گئی اور حاضرین کو معمولی شیرینی تقسیم ہونے کے بعد پانسو روپیہ مدرسے کی نذر کیا گیا۔

سرسید کی کوشش سے جو نمایاں انقلاب مسلمانوں کی سوشل حالت میں ہوا وہ اُس مغائرت اور نفرت کا دور ہونا تھا جو انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مثل سمندر کے حائل ہو رہی تھی۔ حالانکہ دینِ اسلام اہلِ کتاب کے ساتھ دوستی اور میل جول رکھنے، اُن کا کھانا اور ذبیحہ کھانے، اور اُن کے ہاں شادی کرنے کی صاف صاف اجازت دیتا تھا اور تمام ممالکِ اسلامیہ میں اُن کے ساتھ یہی برتاؤ دیکھا اور سُنا جاتا تھا باوجود اس کے ہندوستان کے مسلمان مثل ہندوؤں کے اُن کی ہر ایک چیز سے اجتناب کرتے تھے، اُن کے ہاں کی پکی ہوئی چیز کو نجس جانتے تھے اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے کو عیسائی ہو جانے کے برابر خیال کرتے تھے، جس کا سبب کچھ تو ہندوؤں کی تقلید تھی جن سے صدہا رسمیں اور عادتیں ہندوستان میں اکثر مسلمانوں نے سیکھی تھیں اور کچھ قومی تعصبات تھے جو ایک مدت تک مفتوح قوم کو نیچرل طور پر فاتح قوم کے ساتھ رہنے ضرور ہیں مسلمانوں کی یہ نفرت اور کراہت اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس باب میں جو کچھ شریعت کا حکم ہے اُس کو عوام الناس کے سامنے صاف صاف بیان نہیں کر سکتے تھے اور اگر کوئی عالم ایسی جرأت کر بیٹھتا تھا تو اُس کی بات کو کوئی تسلیم[1] نہیں کرتا تھا۔ اور اُس کی عزت سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ ایک اور وجہ سے بھی علما مسلمانوں کو انگریزوں کے میل جول سے مانع آتے تھے۔ اُن کو خوف تھا کہ حاکم و محکوم قوم کا میل جول، خاص کر اُس صورت میں کہ حکمران قوم اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم ہو، ضرور ہے کہ محکوم قوم کو حاکموں کے مذہب کی طرف مائل کرے۔

الغرض غدر سے پہلے مسلمان عموماً انگریزوں کی مخالطت سے اور ہر ایک بات میں اُن کے ساتھ تشبہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی وجہ نفرت کی نہ تھی۔ لیکن غدر کے بعد انگریز بھی مسلمانوں سے کھچنے لگے اور دونوں قوموں کا جمع کرنا مثل اجتماع نقیضین کے محال ہو گیا۔ مگر سرسید کو خوب یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی پولٹکل حالت کی اصلاح کے لئے جس طرح اُن میں مغربی تعلیم کا پھیلانا ضروری ہے

---

[1] معتبر ذریعے سے سُنا گیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانے میں ایک شریف مسلمان مولوی نے جو میاں دوآب کے کسی ضلع میں منصف یا صدرامین تھے ایک روز کسی یورپین حاکم کے بنگلے پر اُس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ یہ خبر فوراً مشہور ہو گئی، مولوی صاحب کی برادری نے اُن کو ذات سے خارج کر دیا۔ انہوں نے ہر چند اہلِ برادری کے سامنے آیتیں اور حدیثیں پڑھیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ مولوی کے مخالف اور کچھ موافق دہلی میں شاہ صاحب سے مسئلہ پوچھنے کو آئے۔ جب شاہ صاحب کے مدرسے کے دروازے پر پہنچے تو شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین

اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اُن کے اور حکمران قوم کے سوشل تعلّقات کو ترقی اور استحکام دینا ضرور ہے۔ جب تک دونوں قوموں میں دوستانہ معاشرت اور میل جول پیدا نہ ہوگا اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے اصلی خیالات سے آگاہی حاصل نہ ہوگی اُس وقت تک آپس میں صفائی اور خلوص اور اعتبار پیدا نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطعِ نظر مسلمانوں کی مخالفت کے انگریزوں کی طرف سے بھی بہت سی کاوٹیں نظر آتی تھیں۔ سب سے بڑا عذر انگریزوں کو یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ جن کے ہاں عورتوں کے پردہ کا رواج ہے، کسی طرح ہمارا دوستانہ میل جول نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ سرسیّد اس کا یہ جواب دیتے تھے کہ مسلمان جس طرح اپنی عورتوں کو غیر قوموں کے مردوں سے چھپاتے ہیں۔ اُسی طرح اپنے مسلمان دوستوں اور دُور کے رشتہ داروں سے بھی چھپاتے ہیں۔ مگر اس سے باہمی دوستی اور یگانگت میں کچھ فرق نہیں آتا، پھر کیا وجہ ہے کہ پردہ کی پابندی سے ہماری اور انگریزوں کی دوستی اور سوشل تعلّقات میں فرق آئے۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول ہونا غیر ممکن ہے جن میں سے ایک قوم میں عورتوں کا زنانہ سوسائٹی میں شریک ہونا اُس کے باعثِ عزت سمجھا جائے اور دوسری قوم میں باعثِ شرم لیکن باوجود ایسے سخت موانع کے سرسیّد نے اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ سرسیّد کی کوشش نے انگریزوں میں مسلمانوں کے ساتھ کہاں تک موانست پیدا کی ہے؟ اور اُن کی دیرینہ آرزو اِس باب میں کس حد تک پوری ہوئی ہے؟ اور اگر سرسیّد کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱۶ دیکھو۔ اندر سے نکلتے تھے اُن لوگوں نے پہلے اُنہیں سے مسئلہ پوچھا۔ شاہ رفیع الدین نہایت صاف گو اور آزاد طبع آدمی تھے۔ اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جنہوں نے مولوی کو ذات سے خارج کیا۔ اُنہوں نے جھک مارا اُس نے کوئی کام شرع کے خلاف نہیں کیا۔ مگر کسی نے اُن کا کہنا نہیں مانا اور بڑے صاحب کے پاس پہنچے اُنہوں نے صورتِ حال سُن کر ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ اُس مولوی نے ایسا کام کیا ہے کہ قریب کُفر کے پہنچ گیا ہے۔ جو لوگ مولوی کے مخالف تھے وہ یہ سُن کر خوش ہو گئے مگر اس کے طرفداروں نے پُوچھا کہ حضرت وہ اب کسی طرح مسلمان بھی ہو سکتا ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ کُفر کے قریب پہنچ جانے سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا اس لئے وہ اسلام سے خارج نہیں ہُوا مگر احتیاطاً اُس کو پانچوں کلمے اور آمنت باللہ پڑھواؤ اور قدم شریف کا پانی پلواؤ اور پھر برادری میں شامل کر لو۔ اگر شاہ صاحب اس انداز پر تقریر نہ کرتے تو غالباً اُن کا کہنا بھی کوئی نہ مانتا اور ان مولوی کو برادری میں شامل نہ کیا جاتا ۱۲

اُنہوں نے ۱۸۸۳ء میں ایک موقع پر مسٹر بلنٹ ممبر پارلیمنٹ کے سامنے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی"۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سوشل معاشرت اور اُن کا سوشل برتاؤ جو غدر کے بعد تک انگریزوں کے ساتھ تھا اُس میں جس قدر انقلاب گذشتہ تیس برس میں ہُوا ہے اگر سرسیّد کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو اُس کے لئے ایک صدی بھی مُشکل سے کافی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی اِس بات کا فیصلہ کرنا باقی ہے کہ طریقِ معاشرت میں انگریزوں کی تقلید کرنا کہاں تک ہماری حالت کے مناسب ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ سرسیّد نے مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت کو قومی تعصبات کی بیڑی اور مُلکی رسم و رواج کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا ہے اور وہ اِس قابل ہو گئے ہیں کہ جس بات کو اپنے حق میں قرینِ مصلحت جانیں اُس کو اختیار کریں اور جس بات کو مضر سمجھیں اُس کو ترک کریں۔

اگرچہ سرسیّد نے مسلمانوں کی باہمی معاشرت کی اصلاح کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں کی بلکہ اُن کی سوشل حالت جو انگریزوں کے ساتھ تھی زیادہ تر اُسی کی اصلاح پر توجہ کی ہے لیکن درحقیقت اُنہوں نے مذہبی خیالات کی اصلاح اور مغربی تعلیم کی اشاعت سے قومی سوسائٹی کی عام اصلاح کا بیج بو دیا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مسلمانوں میں بہت سی سوشل خرابیاں تو ہندوستان میں رہنے اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہیں اور بہت سی غلط مذہبی خیالات کی بُنیاد پر قائم ہوئی ہیں اور بعض نے دیگر وجوہ و اسباب سے وجود پکڑا ہے اور ان تمام خرابیوں کی تعداد اِس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اُن کی اصلاح کے لئے ایک طُول طویل زمانہ اور بہت سے مصلح درکار ہیں۔ اِس لئے بجائے اس کے کہ وہ جُزئیات کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے۔ اُنہوں نے جہاں تک کہ ممکن تھا مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح میں جو تمام اصولوں کی جڑ ہے، کوشش کی۔ سب سے پہلے اُنہوں نے مذہبی خیالات و اوہام کو ضروری سمجھا کیونکہ جن باتوں کو لوگ غلطی سے مذہب پر مبنی سمجھ لیتے ہیں اُن کا چھوٹنا قریب ناممکن کے ہو جاتا ہے۔ دُوسرے سب سے بڑا ذریعہ خیالات کی اصلاح کا مغربی تعلیم کی اشاعت تھی جس نے یورپین اقوام کو حسنِ معاشرت میں تمام دُنیا پر فائق کر دیا ہے سو اُس کی اشاعت میں جو کارِ نمایاں اُنہوں نے کئے وہ سب پر ظاہر ہیں۔

تصنیف و تالیف | اگرچہ سرسیّد کی طبیعت ایسی ہمہ گیر واقع ہوئی تھی کہ جو کام اُن کو پیش آتا تھا،

اُس میں وہ ایسی دلچسپی ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہی اُن کا خاص کام اور ضروری غرض تھا۔ کالج کی تعمیر، بجٹ کی تیاری، جلسوں کا اہتمام، مہمانوں کی مدارات، چندے وصول کرنے کی تدبیریں، غرضکہ ہر ایک کام کو وہ یکساں ذوق وشوق اور یکساں دلبستگی کے ساتھ انجام دیتے تھے مگر خود اُن کا یہ بیان تھا کہ جیسا تصنیف وتالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا اور کسی کام میں نہیں لگتا اور فی الواقع، جیسا کہ دیکھا گیا ہے، رنج میں، خوشی میں، صحت میں، بیماری میں، خلوت میں اور جلوت میں اس مشغلہ سے اُن کا جی نہیں اُکتاتا تھا۔ گرمی کی دوپہروں میں، جبکہ ایک صبح خیز آدمی ضرور آرام لینا چاہتا ہے، یہ شخص ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف پایا جاتا تھا۔ بیماری کی حالت میں اُن کو کبھی نہیں دیکھا کہ دوپہر کو پلنگ پر جا کر کمر سیدھی کی ہو۔ بارہا ایسا اتّفاق ہوتا تھا کہ علالت یا کسی اور وجہ سے رات کو نیند اچاٹ ہو گئی اور اُنہوں نے میز کرسی پر بیٹھ کر کسی مضمون کے لکھنے میں صبح کر دی۔ جہاں اور لوگ بیماری کی راتیں لوگوں کو جگا کر یا قصّے کہانیاں سُن کر یا ہائے وائے کر کر بسر کرتے ہیں، یہ شخص اِس جانکاہ اور دماغ سوز فکر سے دِل بہلاتا تھا۔

جس زمانہ میں سرسیّد نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی اُس زمانہ کا حال اُن کے قدیم دوست محمد سعید خاں اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں اُن دنوں میں اکثر اُن کے ساتھ رہا ہوں۔ سرسیّد نے اس زمانے میں رات کو پلنگ پر سونا قطعاً ترک کر دیا تھا۔ چونکہ اُس وقت تک کرسی کی نشست کی عادت نہ تھی فرش ہی پر چاروں طرف کتابیں پھیلی رہتی تھیں اور کتابوں کے بیچ میں اُن کی نشست رہتی تھی۔ کبھی کبھی بات چیت کے لئے مجھے بھی پکڑ بٹھلاتے تھے، نہ خود سوتے تھے اور نہ مجھے سونے دیتے تھے، باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور تفسیر بھی لکھتے جاتے تھے اور اِس غرض سے کہ نیند نہ آئے بار بار خود بھی چائے پیتے تھے اور مجھے بھی پلواتے تھے۔ جب نیند کا بہت ہی غلبہ ہوتا تھا وہیں کسی کتاب پر سر رکھ کر گھنٹا آدھ گھنٹے سو رہتے تھے اور پھر اُٹھ کر لکھنے لگتے تھے، اِسی طرح ساری رات گذر جاتی تھی۔

سرسیّد کے دماغ میں تصنیف وتالیف کے متعلّق دو خاصیتیں عجیب وغریب تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف آدمیوں اور مختلف کاموں کے ہجوم میں اُن کے خیالات مُنتشر نہ ہوتے تھے۔ اُن کے دفتر کا بڑا کمرہ، جہاں وہ بیٹھ کر کام کرتے تھے، صبح سے شام تک وہاں ہر قسم کے لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ہر وقت دوستوں اور مُلاقاتیوں اور ماتحت کام کرنے والوں کا مجمع رہتا تھا۔ اِسی مجمع میں جہاں کُ

اور سب کام کرتے تھے تصنیف و تالیف کا دُشوار گزار مرحلہ بھی وہیں طے کیا جاتا تھا مُشکل سے مُشکل مضامین جو اکثر جمہور کی رائے اور مذہبی خیالات کے برخلاف ہوتے تھے۔ اور جن میں قدیم عُلما اور مصنفین پر نُکتہ چینی کرنے کی ضرورت اور غور و خوض کرنے کی سخت حاجت ہوتی تھی۔ اُن کے لئے بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وُہ خیالات کے مجتمع کرنے کے لئے کسی علیحدہ کمرے میں جا کر بیٹھے ہوں یا اور لوگوں کو اپنے پاس سے اُٹھا دیا ہو یا اُن کے پاس بیٹھنے سے تنگ دل ہوئے ہوں یا لوگوں کے اُٹھ جانے کے انتظار میں مضمون لکھنا مُلتوی کر دیا ہو۔ بے شک جب کوئی مہمان باہر سے آتا تھا، یا کسی دوست سے مدّت کے بعد مُلاقات ہوتی تھی یا کسی اور خاص وجہ سے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ وُہ لکھنا پڑھنا بند کر دیتے تھے مگر ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ حاضرین کے ہجوم کے سبب اُن کے خیالات پراگندہ ہو گئے ہوں اور اس لئے اُنہوں نے مضمون لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ احباب جمع ہیں۔ اور آپس میں دلچسپ بحثیں یا ہنسی چہل کی باتیں کر رہے ہیں۔ جن سے خواہی نخواہی ایک کامی آدمی کا دھیان بٹ جاتا ہے۔ مگر یہ شخص بدستور اپنے مضمون کی اُدھیڑ بُن میں مُستغرق ہے۔ کبھی لکھتا ہے اور کبھی سوچتا ہے اور دوستوں کے حرف و حکایت سے مطلق خبر نہیں ہوتا، ہم یہ نہیں کہتے کہ اوروں کے لئے مجمعِ عام میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کرنا غیر ممکن ہے بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ مذہب کو انیسویں صدی کے سائنس پر منطبق کرنا یا کسی مذہبی مسئلہ کی نسبت جمہور کے برخلاف رائے قائم کرنا ایسی غیر مطمئن حالت میں سیّد احمد خاں کے سوا دُوسرے شخص کا کام نہ تھا۔

دُوسری خاصیّت شاید اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز تھی۔ جب مصنّف کسی ایسے مضمون پر قلم اُٹھاتا ہے۔ جس کو اُس سے پہلے کسی نے لکھا ہو اور جو ترتیب کے لباس سے اب تک عاری ہو (جیسی کہ عموماً سر سیّد کی مذہبی تحریریں ہوتی ہیں) تو اُس کے ذہن میں خیالات کا ایک بے ترتیب اور غیر منتظم انبار رہتا ہے جس کا مرتب اور منتظم کرنا اور ہر ایک پوائنٹ کو اُس کے مناسب موقع پر رکھنا اُس مصنّف کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا دُشوار کام ہے، کہ مصنّف کو اکثر اوقات کئی کئی دفعہ ترتیب بدلنی اور بار بار کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے، سر سیّد جب کسی مضمون کو خود لکھنا یا کسی پیش دست سے لکھوانا شروع کرتے تھے (اگرچہ کیسا ہی مُشکل اور طُولانی مضمون ہو) یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے

تمام پوائنٹس سلسلہ وار اپنے اپنے محل اور موقع پر اُن کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، صرف الفاظ کا لباس پہنانا باقی ہے چنانچہ مُستثنے حالتوں کے سوا کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس ترتیب سے اُنہوں نے کوئی مضمون لکھنا شروع کیا ہو اُس کو بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے اُسی چال سے آخر تک نہ پہنچا دیا ہو۔ اِس مطلب کے زیادہ دلنشین ہونے کے لئے ناظرین مندرجہ ذیل مثال پر غور کریں۔

سرسیّد نے معراج کے مسئلہ کا بیان اپنی تفسیر کی چھٹی جلد میں ۱۴۱ صفحہ پر لکھا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اِس مسئلہ پر زمانۂ حال کی ضرورت کے موافق نہ پہلے کسی نے ایسا لکھا ہے اور نہ آئندہ اِس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون کے لکھنے کی جو کیفیت ہم کو معلوم ہوئی اُس کو سُن کر اور پھر اِس مضمون کی وسعت کو دیکھ کر نہایت تعجّب ہوتا ہے۔ مولوی سیّد وحید الدین سلیم جنہوں نے تفسیر کے لکھنے میں کئی سال تک برابر سیّد کو مدد دی ہے اُن کا بیان ہے کہ "جب تفسیر کی نوبت سورۂ بنی اسرائیل تک پہنچی اور سیّد صاحب نے معراج کے مسئلہ پر مفصّل بحث کرنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے کہا کہ "جس قدر روایتیں صحاح اور دیگر کتُب حدیث میں معراج اور شقِ صدر کے متعلق اور اس باب میں صحابہ کے اختلاف کے متعلق وارد ہوئی ہیں اور عقل و نقل کے تناقض کی صورت میں جو رائیں اور اقوال علما کے ہیں اُن سب کو آپ اِس طرح پر کتابوں میں سے اِنتخاب کر کے نقل کر لیں کہ ایک ایک صفحہ پر اُن کو لکھتے جائیں اور دُوسرا صفحہ کورا چھوڑتے جائیں"۔ میں نے کتابیں دیکھنی شروع کیں اور بے شمار روایات و اقوالِ علماء جو کہ سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں درج ہیں، موافق ہدایات کے نقل کر کے سیّد صاحب کے سامنے پیش کیں۔ میں سمجھتا تھا کہ جب مَیں تمام روایتیں اور اقوال نقل کر لوں گا اُسوقت سیّد صاحب اُن کو دیکھ کر معراج کے مسئلہ پر لکھنا شروع کریں گے۔ مگر میرا یہ خیال غلط تھا۔ انہوں نے اُس مضمون کو اُس ترتیب پر جو اُن کے ذہن میں تھی بجائے خود اُسی وقت لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب کہ مجھ کو روایات وغیرہ کے نقل کرنے پر مامور کیا تھا۔ وہ مسوّدہ کے ہر ایک صفحہ پر کہیں کہیں کچھ عبارت لکھتے تھے اور کہیں سفید ہی چھوڑتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ مَیں ابھی اپنا کام پُورا کرنے نہ پایا تھا کہ جو کچھ اُن کو لکھنا تھا وہ سب لکھ چکے اور اس مضمون کو کچھ کم ڈیڑھ سَو صفحوں پر ختم کر دیا۔ جب مَیں اُن بے شمار روایتوں اور اقوال کا دفتر لے کر پہنچا تو

اُنہوں نے وہ تمام کاغذات لے کر اُن کو قینچی سے کُترنا اور اُن ٹکڑوں کو جا بجا سفیدیوں پر لئی سے چپکانا شروع کیا یہاں تک کہ تمام پرچے جن کا شمار بتانا مُشکل ہے۔ جہاں جہاں اُن کا موقع تھا چپکا دیئے اور مسوّدہ کاتب کو صاف کرنے کے لئے دے دیا۔ جب تمام مسوّدہ صاف ہوچکا اور مَیں نے اُس کو اوّل سے آخر تک پڑھا تو مضمون کی ترتیب اور انتظام اور تمام روایات و اقوالِ علما کو اپنے اپنے موقع پر چسپاں دیکھ کر میرے ہوش جاتے رہے۔" وہ کہتے ہیں کہ سرسیّد کو مسوّدہ لکھتے وقت اِن روایات کے مضمون سے اِس کے سوا کچھ علم نہ تھا کہ جب مَیں کتابوں میں روایتیں تلاش کر رہا تھا، اُس وقت جس قسم کے اختلافات اُن میں پائے جاتے تھے اُن کا ذکر بالاجمال سرسیّد کے سامنے ہوتا رہتا تھا صرف اِس قدر واقفیت پر اُنہوں نے تمام مضمون کا خاکہ اپنے ذہن میں کھینچ لیا تھا اور ہر ایک روایت کا موقع اور محل جہاں جہاں کہ ہونا چاہیئے تھا قرار دے لیا تھا۔

اگرچہ یہ دونوں خاصیّتیں جو ہم نے سرسیّد کی مصنّفانہ قابلیّت کے متعلق بیان کیں، فی نفسہٖ عجیب ہیں مگر اُن سے سوا اُس شخص کے جو اُن کی طرزِ تصنیف کو بہ نظرِ غور دیکھتا رہا ہو دُوسرا واقف نہیں ہوسکتا۔ اب ہم ایک تیسری خاصیّت کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کو ہر سمجھدار آدمی جو اُن کی تصنیفات کو دیکھے گا یقیناً تسلیم کرے گا اور اِس سے ہماری مراد **قوّتِ استدلال** ہے۔ ظاہر ہے کہ سرسیّد کی بعض پولٹیکل اور اکثر مذہبی تحریریں ایسی ہیں جن میں اُنہوں نے ایک جماعتِ کثیر یا جمہورِ اہلِ اسلام سے اختلاف کیا ہے، باوجود اس کے اُن کو اپنے دعوے کے اثبات میں خلاف توقع اکثر ایسی کامیابی ہوئی ہے جیسی کہ ایک مسلم الثّبوت رائے کی تائید کرنے والے کو ہونی چاہیئے۔

اسبابِ بغاوت میں جو کچھ اُنہوں نے لکھا وہ تمام اینگلو انڈینز بلکہ شاید تمام انگلش نیشن کی رائے کے برخلاف تھا اور اِسی لئے اُس کا مارشل لا کے دَور دَورہ میں شائع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے جس دھڑلے سے کہ اُس کا بہت بڑا حصّہ منوا یا گیا اور جو کام کہ اُس نے اعیانِ سلطنت کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتائج اُس پر مترتّب ہوئے اُس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس قدر مدلّل اور موجّہ لکھا گیا تھا اور اُس میں کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔ اِسی طرح ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو ایک ایسے خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لئے لکھا گیا تھا جو عموماً مدبّرانِ سلطنت کے دل میں جما ہُوا تھا اور جس کو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب نے

اور بھی زیادہ پُختہ کر دیا تھا۔ لیکن اِس ریویو کے شائع ہونے سے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے اُس خیال کی غلطی علی العموم سب پر ظاہر ہو گئی۔

جس وقت کہ سرسیّد نے غلامی کے مسئلہ پر جمہورِ اہلِ اسلام کے برخلاف رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مولوی سیّد مہدی علی خاں نے اُن سے کہا کہ تم اِس باب میں ایک حرف بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسا نہیں لکھ سکتے جو اصولِ اسلام کے موافق صحیح ہو۔ لیکن جب انہوں نے سرسیّد کا ابطالِ غلامی کا مضمون تہذیب الاخلاق میں اوّل سے آخر تک پڑھا تو اُن کو ماننا پڑا کہ اسلام نے فی الواقع ہمیشہ کے لئے غلامی کا استیصال کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ سرسیّد نے تہذیب الاخلاق میں ایک موقع پر صاف صاف لکھ دیا ہے کہ جن مسائل میں ہم اور سیّد مہدی علی متفق ہیں۔ اُنہیں میں سے ایک یہ ہے کہ "اسلام میں رقیّت[1] نہیں ہے۔

مسلمانوں کا جہاد کا مسئلہ جو تمام عیسائی دُنیا میں اُنگشت نما تھا اور جس سے بڑھ کر کوئی بے رحمی اور ناخدا ترسی کا کام نہ سمجھا جاتا تھا، اُس کا مقابلہ، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں سرسیّد نے انجیل کے اس مشہور اخلاقی حکم سے کیا ہے۔ کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دُوسرا گال بھی اُس کے سامنے کر دے"، اور نہایت عام فہم طریقہ سے ثابت کیا ہے کہ فطرتِ انسانی کے موافق اور قابلِ عملدرآمد جہاد کا حُکم ہے جو قرآن میں آیا ہے نہ کہ انجیل کا وہ اخلاقی حُکم جو قرآن کی تعلیم پر اعتراض کرتے وقت مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور جس پر نہ آج تک کبھی عمل ہُوا ہے نہ آیندہ ہونے کی امید ہے۔

اِسی طرح سرسیّد کی تصنیفات میں بے شمار مقامات ایسے نکلیں گے جو بادی النظر میں ممتنع الثبوت معلوم ہوتے ہیں مگر جب اُن دلائل پر نظر کی جاتی ہے جو سرسیّد نے اُن کے ثبوت میں پیش کی ہیں تو مخالفوں کو بھی بشرطیکہ تعصّب سے خالی ہوں، تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں معلوم ہوتا۔

ہمارے نزدیک مصنّفوں میں سرسیّد کا جو درجہ خاص کر مذہبی تصنیف و تالیف کے لحاظ سے قرار پا سکتا ہے اُس کا ٹھیک اندازہ کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا، کیونکہ اِس وقت کچھ لوگ اُن کے حد سے زیادہ معتقد ہیں جن کو اُن کی تصنیفات میں کوئی لغزش یا خطا نہیں معلوم ہوتی۔ اور بہت بڑا گروہ اُن کے مُنکروں اور مخالفوں کا ہے جن کو اُن کی مذہبی تحریروں میں

[1] غلامی ۱۲

کفرو الحاد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ پس جب تک یہ دونوں گروہ موجود ہیں اُن کی تصانیف کے باب میں بغیر حیف ومیل کے رائے دینے کی کسی سے امید نہیں ہوسکتی۔

اِس کے سوا اوّل تو مسلمانوں کے خیالات میں عموماً یہ بات جمی ہوئی ہے کہ اعلےٰ درجہ کی مذہبی تصنیفات کے لئے ضرور ہے کہ وہ عربی یا کم سے کم فارسی زبان میں ہوں۔ اُردو زبان میں کیسے ہی محققانہ مضامین لکھے جائیں اور کیسے ہی بلند خیالات ظاہر کئے جائیں اُن کے نزدیک وہ اُردو کی معمولی کتابوں سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ دُوسرے جن لوگوں نے تقلید کے دائرے سے نکل کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ اُن کی تصنیفات ہمیشہ علمائے دین کے حلقوں میں ایک مدت تک مردُود و مطرود رہی ہیں۔ لیکن چونکہ حق کبھی نہ کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا اِس لئے آخر کار لوگ اُن کے حسن وقبح کی چھان بین کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اور اُنہوں نے صواب کو خطا سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا ہے اور باوجود اُن کی غلطیاں ظاہر ہونے کے جن سے کسی محقق کا کلام محفوظ نہیں رہ سکتا، جس درجہ کے وہ مُستحق تھے وہ درجہ اُن کو دیا گیا ہے۔

طرزِ تحریر سرسیّد کی طرزِ تحریر پر کچھ ریمارک کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر مُشکل بھی ہے۔ ضرورت تو ظاہر ہے کیونکہ بیوگرافر اگر بالفرض اپنے ہیرو کی تمام کلی وجزئی حیثیات پر بحث نہ کرسکے تو کم از کم اُس کی نمایاں اور مسلّم لیاقتوں کو دکھائے بغیر اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ پس سرسیّد کی طرزِ تحریر جس نے تیس۳۰ بتیس۳۲ برس کے عرصہ میں اُردو لٹریچر کا رُخ پھیر دیا اور مسلمانوں کے پولٹیکل، سوشل اور مذہبی خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کردیا، اُس کے بیان سے کیونکر خاموش رہا جاسکتا ہے اور مُشکل اِس لئے ہے کہ جس تحریر میں یہ تاثیر اور یہ کرشمہ تھا اُس کو ہم اُن متعارف خوبیوں سے جو مشرقی لٹریچر میں کلام کی عمدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں، بظاہر معرا پاتے ہیں۔ پس اِس بات کا دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ جو تحریر تشبیہات واستعارات سے، صنائع لفظی ومعنوی سے، شاعرانہ نزاکتوں سے اور فاضلانہ ومُنشیانہ تراش خراش سے خالی نظر آتی ہے۔ اُس میں وہ کیا چیز تھی جس نے تھوڑی سی مدت میں ایسے غیر متوقع نتائج پیدا کردیئے۔ لیکن چونکہ سرسیّد کی بائیوگرافی لکھنے کا مُشکل کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے اِس لئے چار و ناچار ہم کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور ہے۔

سرسیّد کی ابتدائی تحریریں غالباً سیدالاخبار[1] میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں۔ جس کو اُن کے بڑے بھائی۔ سیّد محمد خاں نے ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء میں اُس وقت جاری کیا تھا جبکہ سرسیّد کی عُمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ اگرچہ اُس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اُنہوں نے متعدد کتابیں اور رسالے مذہب اور تاریخ کے متعلق لکھے اور اُن میں سے بعض کتابیں (جیسے آثارالصنادید) بدرجۂ غایت مقبول اور مشہور بھی ہوئیں لیکن طرزِ تحریر میں اُس وقت تک کوئی ایسی صریح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی جس کے لحاظ سے سرسیّد کو اُردو لٹریچر میں کسی ممتاز حصّہ کا مُستحق کہا جا سکے۔

البتّہ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ عبارت کی سادگی اور بے ساختگی جو سرسیّد کی تحریر کی عام خاصیّت ہے، وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تحریروں میں بھی، جبکہ تصنّع اور تکلّف انشاپردازی کا زیور سمجھا جاتا تھا، برابر پائی جاتی ہے اور آثارالصنادید کا سب سے پہلا اڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلّف پایا جاتا ہے؛ وہ جیسا کہ سرسیّد خود اقرار کرتے تھے مولانا صہبائیؔ کا لکھا ہُوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ گو اُس وقت طبعِ سلیم کے اقتضا سے خود سرسیّد کی طرزِ تحریر سیدھی سادی تھی مگر سوسائٹی کے اثر سے یقیناً سادی عبارت لکھنے کو وہ خود حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے اُنہوں نے اِس بات کو گوارا نہ کیا کہ جن عمارتوں کی تحقیقات نہایت جانکاہ کوشش سے انجام کو پہنچائی ہے، اُن کا حال اپنی سیدھی سادی عبارت میں جو اُس وقت خود اُن کی نظر میں کم وزن معلوم ہوتی تھی، تحریر کریں، مگر اس اڈیشن کے شائع ہونے کے بعد وہ بہت جلد اِس غلطی سے متنبّہ ہوئے اور اُس کو دوبارہ اپنے سیدھے سادے نیچرل اسٹائل میں لکھ کر شائع کیا جس کا فرنچ میں ترجمہ ہو کر فرانس میں چھپا۔

نہایت صحیح اور سچّا مقولہ ہے کہ "اذا اراد اللہ شیئاً ھیّأ اسبابہٗ"۔ چونکہ سرسیّد سے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام ظہور میں آنا تھا اِس لئے خدا تعالےٰ نے اُن کی ذات میں وہ تمام خاصیّتیں جمع کردی تھیں جو ایک ریفارمر میں ہونی ضرور ہیں۔ انہیں خاصیّتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ ابتدا سے تحریر یا تقریر میں تصنّع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے

[1] چونکہ سیّد احمد کا عُرف اُس زمانہ میں سیّد تھا اور اُن کے بھائی کو اُن سے بہت محبّت تھی اِس لئے اخبار کا نام اُن کے عرف کے لحاظ سے سیّدالاخبار رکھا تھا ۱۲

اور گرییر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے جو اوّل اوّل دلّی میں اپنے گرد
شعرا کا جمگھٹا دیکھ کر اُن کی دیکھا دیکھی شعر کہنا شروع کیا تھا۔ بہت دن نہ گذرے کہ وہ
اُن تکلفاتِ لایعنی سے جو شاعری کے لئے لازم ہیں اور حقائق نگاری میں مخل ہوتے ہیں۔
ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو گئے۔ اُنہوں نے سیرتِ فریدیہ میں اپنے بچپن کا حال لکھا ہے کہ
اُن کے نانا نے جب کہ وہ بوستاں پڑھتے تھے، اُن کا سبق سُنا۔ سبق میں وہ شعر بھی تھا
جس کا پہلا مصرع یہ ہے "طمع را سہ حرف ست ہر سہ تہی" اُنہوں نے اس کا ترجمہ کیا کہ "طمع کے
تین حرف تینوں خالی" نانا نے تین دفعہ ڈِکا اور بہت خفا ہوئے مگر یہ وہی معنی کیے گئے،
چونکہ محاورہ کے موافق ترجمہ یہی فصیح تھا اِس لئے گرییر کا مطلق خیال نہ آیا۔ جو حال اُن کا اُس
بچپن کے زمانہ میں تھا وہی اخیر دم تک باقی رہا۔ وہ تحریر یا تقریر کی رو میں گرییر کی کچھ
پروا نہ کرتے تھے، وہ اُن قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد
تھے وہ اُن غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح الفاظ پر ترجیح
دیتے تھے اُن کی زبان دلّی کی بول چال میں محدود نہ تھی بلکہ جو لفظ جو جُملہ بے اختیار قلم سے
ٹپک گیا وہی اُن کی زبان اور وہی بول چال تھی، غالباً اُنہوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے
وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ اہلِ زبان بولتے ہیں یا نہیں؟ اور کسی فقرہ کو لکھ کر پھر یہ نہ
دیکھا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اِس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں؟

یہ خاصیت جس کو ہم نے بیان کیا ایک سچّے ریفارمر کے کلام میں ایسی ہی ضروری ہے
جیسی سچائی اور راستبازی، وہ مثل شاعروں اور انشا پردازوں کے اپنے کلام کی بُنیاد الفاظ
کی شُستگی اور ترکیبوں کی برجستگی پر نہیں رکھتا بلکہ اُس بے قرار آدمی کی طرح جو گھر میں آگ لگی
ہوئی دیکھ کر ہمسایوں کو بے تابانہ آگ بجھانے کے لئے پکارتا ہے، ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو
گھبراہٹ کی حالت میں بے ساختہ انسان کے مُنہ سے نکل جاتے ہیں۔ وہ واقعات پر تشبیہ و
استعارہ کے پردے نہیں ڈالتا بلکہ اُن کی ننگی تصویر کھُلّم کھُلّا سب پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ الفاظ و
قواعد کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اور قواعد کو اپنے جذبات کا محکوم رکھتا ہے۔

الغرض سرسیّد نے خیالات کے ظاہر کرنے میں بناوٹ اور تصنّع کو کبھی دخل نہیں دیا جس

سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابتدا میں مطلب نگاری شروع کی تھی غدر کے زمانہ تک جو کہ تقریباً بیس برس کا زمانہ ہوتا ہے اپنے اُسی سیدھے سادے اور نیچرل اسٹائل میں ہر قسم کی تحریریں کیا کتابیں کیا مضامین اور کیا مقدمات کے فیصلے اور تجویزیں، برابر لکھتے رہے، اِس بیس سال کی مشق و مہارت نے جو کہ ایک انداز پر متصل جاری رہی، ضرور ہے کہ اُن کی قلم میں ہر مطلب کے ادا کرنے اور ہر پیچیدہ مضمون کے سُلجھانے کی ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی ہوگی، کیونکہ نیچرل قویٰ سے جب اُن کے مُقتضا کے موافق برابر کام لیا جاتا ہے تو اُن سے اکثر فوق العادۃ کرشمے ظہور میں آتے ہیں مگر ابھی وقت نہیں آیا تھا جب کہ اس سیدھی سادی تحریر کے اصلی جوہر کُھلنے والے اور اس ٹھنڈی آگ کے شعلے بلند ہونے والے تھے۔

غالباً اس بات پر سب کا اتفاق ہوگا کہ تحریر یا تقریر کا اصل مقصد لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے مگر اس امر میں سب کی رائے مختلف معلوم ہوتی ہے کہ اثر کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اِسی ایک مقصد کے لئے کوئی الفاظ میں تراش خراش اختیار کرتا ہے اور کوئی سادگی، کوئی کلام کی بُنیاد متانت اور سنجیدگی پر رکھتا ہے اور کوئی مزاح و ظرافت پر، کوئی سوچ سوچ کر علمی اصطلاحیں اور فاضلانہ ترکیبیں استعمال کرتا ہے اور کوئی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرے بہم پہنچاتا ہے۔ اسی طرح کوئی کسی ڈھنگ پر چلتا ہے اور کوئی کسی طریقہ پر۔ مگر حق یہ ہے کہ کلام کی تاثیر کو اِن باتوں سے کچھ علاقہ نہیں۔

جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ　　　چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بے شک کلام کے مؤثر ہونے کے لئے اُس کا سادہ اور بے تکلف ہونا ضرور ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو کلام سادہ اور بے تکلف ہوگا وہ مؤثر بھی ضرور ہوگا۔ کلام کیسا ہی سادہ اور بے تکلف ہو، جب تک کہ متکلّم کا دِل آزادی اور سچائی سے بھرا ہُوا نہ ہو، کبھی مؤثر نہیں ہو سکتا۔ جس طرح تلوار کا کاٹ درحقیقت اُس کی باڑھ میں نہیں بلکہ سپاہی کے کرتبی ہاتھ میں ہے اِسی طرح کلام کی تاثیر اُس کے الفاظ میں نہیں بلکہ متکلّم کی سچائی اور اُس کے نڈر دل اور بے لاگ زبان میں ہے۔ وہی الفاظ جو ایک سچے اور دلسوز ناصح کی زبان سے نکل کر لوگوں کے دلوں پر تیر و سناں کا کام کرتے ہیں ممکن نہیں کہ ایک نمائشی واعظ کی زبان پر اُن میں کچھ بھی اثر باقی رہے

سچّے ناصح کے لعن طعن میں جو اثر ہوتا ہے وہ جھوٹے واعظ کی بشارتوں میں نہیں ہوتا۔ سرسید کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت اُن کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھا۔

باوجودیکہ مسلمان صدہا سال سے نہ صرف مذہب میں بلکہ علوم و فنون میں، لٹریچر میں رسم و رواج میں، اخلاق و عادات میں، طریقِ معاشرت میں، غرضکہ ہر چیز میں اگلوں کی لکیر پر فقیر چلے آتے تھے اور کوئی ایسی بات جس سے کبھی اُن کے کان آشنا نہ ہوئے ہوں، ہرگز سُننی نہیں چاہتے تھے مگر سچ میں وہ کرشمہ ہے کہ تاریکی میں بھی وہ چمکے بغیر نہیں رہتا۔ جو شخص سب سے پہلے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر اور سوسائٹی کی رکاوٹوں کو برطرف کر کے قوم کی اصلی بھلائی کے خیالات صاف صاف ظاہر کرتا ہے گو کہ وہ قوم کے مذاق اور الف وعادت کے کیسے ہی برخلاف ہوں، اُن میں عجیب قسم کی کشش ہوتی ہے کہ اُن کے سُننے کے لئے کیا موافق اور کیا مخالف سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور دونوں فریق مختلف طور پر اُن سے متاثر ہوتے ہیں، پہلا اُن کو حق سمجھ کر بے چون وچرا قبول کرتا ہے اور دُوسرا اُن میں مقبولیت کے آثار نمایاں دیکھ کر خائف ہوتا ہے کہ مبادا یہ خیالات تمام قوم میں شائع ہو جائیں۔ سرسید کی تحریر میں یہی چیز تھی۔ جس نے اُن سیدھے سادے اور معمولی لفظوں میں جادُو کا سا اثر پیدا کر دیا تھا اور تمام قوم میں ہل چل ڈال دی تھی۔

مگر اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سرسید کی تحریر جو بظاہر متعارف لفظی خوبیوں سے خالی معلوم ہوتی تھی درحقیقت اُس میں لفظی خوبیاں نہ تھیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جب عُمدہ اور پاکیزہ خیالات ایسے صاف اور معنی خیز لفظوں میں بیان کئے جاتے ہیں کہ لفظوں کے ساتھ ہی ساتھ معنی بھی ذہنوں میں اُترتے جاتے ہیں تو خیالات کی خوبی ناظرین کو الفاظ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی بلکہ محاسن لفظی خیالات کی شکوہ میں دب جاتے ہیں۔ اِس کے سوا جب مصنّف کی ہمّت محض عمدہ خیالات کے پھیلانے پر مقصود ہوتی ہے تو اُس کے بیان میں محاسن لفظی کی اُسی قدر گنجائش ہوتی ہے جس قدر کہ ہر مقام کا مُقتضا ہوتا ہے اور اس لئے وہ عبارت میں اِس قدر گھُل مل جاتے ہیں کہ جب تک بہ نظرِ غور نہ دیکھا جائے، عام بیان اُن سے سادہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ سرسید کی تحریر میں لفظی خوبیاں ایسی اُجاگر نہیں معلوم ہوتیں جیسی دیگر مصنّفین کے کلام میں معلوم ہوتی ہیں ورنہ صنائع لفظی کے سوا اُس میں تمام محاسنِ لفظی ومعنوی موجود ہیں، تشبیہیں بھی ہیں، استعارے

بھی ہیں، کنائے بھی ہیں، تمثیلیں برجستہ اور تلمیحیں نہایت لطیف ہیں، بذلے اور لطیفے حد سے زیادہ دلکش اور دلفریب ہیں، کہاوتیں اور اشعار برمحل جا بجا نظر آتے ہیں مگر اس قبیل کی جو چیز ہے اُس میں ایسا بے ساختہ پن پایا جاتا ہے کہ گویا بے قصد و بے ارادہ مصنّف کے قلم سے ٹپکی ہے۔

مگر جو چیز کہ سر سیّد اور دیگر مصنّفوں اور مضمون نگاروں میں مابہ الامتیاز ہے، وہ قدرتِ بیان ہے جس کے ثبوت کے لئے خود اُن کی مختلف تحریروں کا دیکھ لینا کافی ہے۔ مصنّف کی قدرتِ بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہر ایک مضمون کو اُسی پیرایہ میں بیان کر سکے جو اُس مضمون کی حالت کے مناسب ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جُدا ہوتا ہے جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اُس ڈھنگ پر تاریخ یا بائیوگرافی نہیں لکھی جاتی، جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے تشبیہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے مگر کسی سررشتہ کی سالانہ رپورٹ، یا کسی مقدمہ کے فیصلے، یا کسی پبلک جلسہ کی روئداد میں اس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں ہوتی۔ اسی لئے کہا گیا ہے "ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد"، مگر جہاں تک دیکھا جاتا ہے۔ ہر مصنّف پر اُس کی طبیعت کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا اور یا جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے اُس کو اُسی خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ مثلاً بعضوں کا قلم حُسن و عشق کے میدان میں خوب دوڑتا ہے، پس یا تو وہ ایسے مضمون پر قلم ہی نہیں اُٹھاتے جس میں حُسن و عشق کی چاشنی نہ ہو اور یا جو مضمون لکھتے ہیں اُس کو اُسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض کی طبیعت پر استعارہ اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ سیدھے رستے سے بھی چکّر کاٹے بغیر نہیں گذرتے، بعضے ہر ایک مضمون میں ظرافت کی چاشنی دینی چاہتے ہیں۔ اگرچہ نفسِ مضمون اُس سے اِبا کرتا ہو۔ غرض کہ جس مصنّف یا مضمون نگار کو دیکھئے اُس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔

مگر سر سیّد کی تحریروں کو ہم اِس عام قاعدہ سے مُستثنےٰ پاتے ہیں، اُن کی ہر قسم کی بیشمار تحریریں کیا تاریخی، کیا علمی، کیا مذہبی، کیا اخلاقی، کیا سوشل، کیا پولٹکل، کیا فیشل اور کیا لیگل، علیگڑھ گزٹ، تہذیب الاخلاق، تصانیفِ احمدیہ، سالانہ رپورٹوں، عدالت کے فیصلوں،

جلسوں کی روئدادوں اور پرائیویٹ خطوں وغیرہ میں موجود ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک شاخ میں وہی پیرایۂ بیان پایا جاتا ہے جو اُس کے لئے موزوں اور مناسب ہے حالانکہ مصنّف کو خود خبر نہیں کہ کس مضمون کے لئے کونسا پیرایۂ بیان موزوں ہے مگر تحریر کی قدرتی قابلیّت بغیر قصد وارادہ کے قلم کو اُسی راہ پر ڈال دیتی ہے جس پر اُس کو چلنا چاہیئے۔ جس طرح پہاڑ کی رَو رستے کے موڑ توڑ اور پیچ وخم کے ساتھ رُخ بدلتی چلی جاتی ہے۔ اِسی طرح ہر مقام کے مُقتضا کے موافق تحریر کا رنگ خود بخود بدل جاتا ہے اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کی سی روانی ہے تو مذہبی اور پولٹکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیراکی کا سازور ہے۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلہ میں ظرافت وخوش طبعی، نصیحتیں نشتر سے زیادہ دلخراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہیں، غُصّہ مہربانی سے زیادہ پُرلطف ہے اور نفرین آفریں سے زیادہ خوش آیند۔ وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کُہنہ مشق جج کے ہاتھ میں اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکرٹری کے ہاتھ میں۔

یہاں ہم ایک نہایت معمولی مثال کے ذریعہ سے ناظرین کو اس بات کا خیال دلانا چاہتے ہیں کہ اس شخص کے قلم میں ہر ایک مطلب کو اُس کے مناسب پیرایہ میں بیان کرنے کی کس قدر قابلیّت تھی۔

سرسیّد نے تہذیب الاخلاق کے ایک آرٹکل میں آدم کی سرگذشت ایک قصّہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے، وہاں اُس موقع پر جبکہ آدم نے محض تنہائی اور سنّاٹے کے عالم میں حوّا کو یکایک اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے پایا اور اُس سے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی۔ خُدا کے شکر کے چند الفاظ فرضی طور پر آدم کی زبان سے اِس بات کا تصوّر دلانے کے لئے لکھے ہیں۔ کہ آدم کا اُس غیر مترقّبہ خوشی اور اُس کے وجد وذوق میں کیا حال ہُوا ہوگا؟ اور انسان کی اُس ابتدائی اور نیچرل حالت میں جبکہ زبان میں لفظ موجود نہ تھے۔ کس قسم کے بول خدا کے شکر میں اُس کی زبان سے نکلے ہونگے؟ اور کیسے سیدھے سادے لفظوں سے اُس نے خدا کو پکارا ہوگا؟

گویا آدم کہتا ہے کہ "جب میں نے اپنے ہم جنس (یعنی حوّا) کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہُوا دیکھا تو میں بہت خوش ہُوا اور تالیاں بجا کر خوب اُچھلا اور خوب کُودا، اور اوپر کو دیکھ دیکھ کر ایک

بڑی ہستی کا خیال کرکے خوب گیت گائے اور نہایت ذوق وشوق میں یوں چلّایا "او، ! او ! اے او، ! ارے او ! ارے وہ جو ہے ! ارے وہ جو ہے ! ارے وہ جو رہے گا ! ارے وہ جو رہے گا ! ارے وہ جو تو ہی ہے ! ارے وہ جو تو ہی ہے ! میرا شکر لے" اُس انجان جانب کار نے میرا شکر لیا، اب تم سب اُسی برکت کے پھل پھول ہو" اگرچہ بادی النظر میں یہ مثال بہت کم وزن اور حقیر معلوم ہوگی مگر موقع کا تصوّر کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو حالت ان لفظوں سے ظاہر ہوتی ہے اُس کے بیان کرنے کے لئے ان سے بہتر الفاظ ملنے کس قدر مُشکل تھے۔

دوسرے مُشکل سے مُشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مطلب کو اس طرح سلجھا کر ادا کر جانا کہ جو مضمون لفظوں میں سماتا نظر نہ آتا ہو وہ ایسی خوبی سے ادا ہو جائے جیسے انگوٹھی پر نگیں جڑ دیا اس لحاظ سے جو قُدرت سرسیّد کے قلم میں دیکھی گئی ہے وہ فی الواقع نادرالوجود تھی۔ قرآن مجید میں بے شمار مقامات ایسے ہیں کہ سرسیّد کی تفسیر دیکھنے سے پہلے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن مقامات کے معنی اُس اُصول کے موافق قرار دیئے جا سکیں جس کے مطابق سرسیّد نے تمام قرآن کی تفسیر کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ مگر تفسیر دیکھنے کے بعد مُستثنےٰ مقامات کے سوا کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جس کی تفسیر اُسی اصول کے موافق پوری نہ اُتر گئی ہو۔ اگرچہ اس کی مثالیں قرآن کی تفسیر میں جابجا موجود ہیں مگر ایک نہایت بدیہی مثال آدم کے قصّہ کا بیان ہے۔ اِس قصّہ کی نسبت جو کہ قرآن مجید میں مذکور ہے اگرچہ علمائے سلف میں سے بھی بعض محقّقین نے یہی لکھا ہے کہ یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا بیان بطور تمثیل کے کیا گیا ہے مگر علمائے سلف اِس رمز کی طرف ایک مُجمل اشارہ کرکے آگے بڑھ گئے ہیں کسی نے قصّہ کی تمام جُزئیات کو تمثیل کے قالب میں ڈھال کر نہیں دکھایا۔ سرسیّد نے اوّل تہذیب الاخلاق میں اسی مضمون کو ایک فرضی قصّہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور پھر تفسیر میں بہ حیثیت ایک مفسّر کے تمام قصّہ کے جزئیات کو انسان کی فطرت اور اُس کے قویٰ پر ایسی خوبی سے منطبق کیا ہے کہ اُن سے پہلے کسی سے یہ کام بن نہیں آیا۔ بس صرف اسی مضمون کو تہذیب الاخلاق یا تفسیر میں دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اِس شخص کو بذریعہ تحریر کے مُشکل مُشکل عُقدوں کے سُلجھانے پر کس قدر قُدرت تھی۔

تیسرے واقعات و حالات کے حسن و قبح کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ جو بُرائیاں بسبب اِلف و

عادت کے دلوں میں کھُب گئی ہوں اُن کی بُرائی اور جو خوبیاں سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھُپ گئی ہوں اُن کی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔ یہ کمال بھی جو سرسیّد کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے دوسری جگہ آج تک نہیں دیکھا گیا اور اُس کی مثالیں خاص کر تہذیب اخلاق کی قدیم اور جدید جلدوں میں بکثرت موجود ہیں۔

مثال ا | مثلاً وہ آرٹکل میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا طریق اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ "ہندوستان میں مُسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی وہی طریق ہے، جو ہندوؤں کا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں اور مُسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں۔ اِسی طرح مُسلمان بھی قابوں اور رکابیوں اور غوریوں اور تشتریوں اور پیالوں میں سب طرح کا کھانا اور سب قسم کی روٹی اور ہر طرح کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے اور اچار مربّے کی پیالیاں سیتلا کے پوجاپے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اور اُس ایک دسترخوان پر کوئی فیرینی کلمۂ شہادت کی اُنگلی سے اور کوئی (دست بخیر) چاروں اُنگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے، کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے۔ کسی نے بورانی کے پیالے کو مُنہ سے لگا کر سٹرپا بھرا اور یہ کہ کر کہ واللہ بڑی تیز ہے۔ اوہ اوہ کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور نچچوری ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں نکلی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اِس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اُس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور بیسن سے دانت رگڑنے اور زبان پر وہ اُنگلیاں رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کیا ہے۔ اور آور بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ اُن ہاتھ مُنہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکات ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو اُن لوگوں کی کریہہ آواز سُننے اور زرد زرد ہلدی ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکلنے اور بلغم کے لوتھڑے تھُو تھُو کر کے چلپچی یا تاش میں تھوک دینے اور بتاشے کی طرح اُس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پرواہ ہے نعوذ باللہ منہا!!"

مثال ۲۔ (۱) مثلاً ایک آرٹکل میں بے تہذیب آدمیوں کی بحث و تکرار کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ "جب کُتّے آپس میں مِل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بُری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چِر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ داڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اِس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اِس کی کمر میں، اُس کا کان اِس کے مُنہ میں اور اِس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں، اس نے اُس کو کاٹا اور اُس نے اِس کو پچھاڑا۔ جو کمزور ہُوا دُم دبا کر بھاگ نکلا۔

"نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح پر تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مِل بیٹھتے ہیں، پھر دِھیمی دِھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دُوسرا بولتا ہے واہ! یوں نہیں، یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ! تم کیا جانو، وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رُخ بدل جاتا ہے آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چِر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اُڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں آستین چڑھا ہاتھ پھیلا اُس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اُس کی مٹھی میں۔ لپا ڈُگی ہونے لگتی ہے، کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غرّاتے ہوئے ایک اُدھر چلا گیا اور ایک اِدھر اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہُوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے اور سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

"جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اُسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ

---

(۱) یہ مضمون اصل میں انگریزی سے لیا گیا ہے مگر سرسیّد کا اس میں بہت کچھ تصرّف ہے جس کے سبب سے وہ بہ نسبت اصل کے بہت زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے ۱۲

جاتی ہے، کہیں تو تکرار تک نوبت آجاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتّوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتّوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

مثال ۳ یا مثلاً ایک آرٹکل میں جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی میں کوشش کرنا اُن کی دنیا اور دین دونوں کی خیر خواہی کا کام ہے، ایک موقع پر لکھتے ہیں "اب دوسری طرح پر غور کرو اور ایک خیالی دنیا بناؤ اور یہ تصور کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے، سب مفلس اور نانِ شبینہ کو محتاج ہوں (جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ان بدعقلیوں اور بدفہمیوں اور بدنصیبیوں کے سبب جو زمانۂ حال میں اُن کے خطوطِ پیشانی سے پڑھی جاتی ہیں عنقریب ہونے والا ہے) اور دربدر بھیک مانگتے پھریں اُن کی اولاد جاہل اور نالائق چور اور بدمعاش ہو، واعظین کو جو محض ریاکاری اور مکاری ہی سے دنیا کماتے پڑے پھرتے ہیں، کوئی ٹکا دینے والا یا لقمۂ تر کھلانے والا نہ رہے۔ جنابِ حضرت پیرجی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کر اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ اُن پر مقرر کرتے ہیں اور ہر سال اس کی تحصیل میں مصروف ہیں، اُن کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدرا اور شمس بازغہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں، اُن کو کوئی چار پیسے کو نوکر رکھنے والا نہ رہے (جیسا کہ اب بھی یہی حال موجود ہے کہ اچھے اچھے مولوی ٹکے ٹکے کو مارے پھرتے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا) تو اس وقت دین کا کیا حال ہوگا۔"

"مگر اس کے ساتھ یہ بھی تصور کرنا چاہیئے کہ پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے، خدا ملے یا نہ ملے، اُس کو بھرنا چاہیئے، تو ایسی حالت میں مسلمانوں کو پیٹ بھرنے کی کچھ تو فکر کرنی چاہیئے ہوگی۔ سو اُس کا خیال بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر چھپتری ڈھو رہے ہیں، کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں، کسی پہاڑ پر لکڑیاں چُن رہے ہوں گے، کسی کا گھوڑا مل رہے ہوں گے اور جو ایسے پکّے دیندار نہیں ہیں اُن کی نسبت کچھ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ کیا کریں گے، معلوم نہیں کہ اُس سے جیل خانے اور جزائرِ تو آباد بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسا رونق پاویں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیئے کہ دین اسلام کی کیا شان ہوگی؟ اور اُس وقت ہم سلام کریں گے اور پوچھیں گے کہ کیوں جناب قبلہ و کعبہ! ہم جو مسلمانوں میں دنیوی ترقی و تہذیب و تربیت و شائستگی میں کوشش کرتے تھے وہ ہمارا

امرِ معاش میں[1] منہمک ہونا اور اس کی ترغیب دینا اور امرِ معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا تھا یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سراسر معاد کا تھا؟

"خدا تعالیٰ نے مذہب اسلام کو عین حکمت بنایا ہے، اُس کی بھلائی چاہنے والے کو ضرور ہے کہ وہ بھی حکیم ہو، نہ مکّار اور دغا باز۔ اور حکیم کا یہ کام ہے کہ جو مرض دیکھتا ہے اُس کی دوا کرتا ہے اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امورِ معاش و تمدن و معاشرت اور علم کی ابتری و خرابی کے سبب روز بروز خراب و ذلیل و حقیر و برباد ہوتے جاتے ہیں اور واعظ و مولوی اور پیرجی خدا و رسول کے دشمن اُن کو روز بروز برباد و تباہ کرتے جاتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں کہ ہم بخوبی یقین کرتے ہیں کہ مسلمان یقینی اپنے مذہب پر پختہ ہیں، خدا کو ایک جانتے ہیں، رسول کو برحق سمجھتے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ فرض جانتے ہیں، ادنیٰ ادنیٰ آدمی ضروری نماز روزے کے مسئلے جانتا ہے، یا ہر طرح پر اُس کے جاننے کا سامان یا موقع موجود ہے، آیا مذہب اسلام کے دوستدار کا یہ کام ہے کہ اپنے تئیں پیرجی یا حضرت صاحب یا مولوی صاحب کہلانے اور دغا بازی سے دنیا کمانے کے لئے اِنہیں باتوں کا جن کی ضرورت نہیں ہے، بیٹھا ہوا وعظ کہا کرے؟ یا جن کی ضرورت درحقیقت مسلمانوں کو اور خود اسلام کو ہے اُس کی تدبیر و کوشش کرے۔

"افسوس خدا ہاتھ نہیں آتا، جنابِ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلّم موجود نہیں ہیں، ورنہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر اُن کے سامنے لے جاتا اور کہتا او خدا! او اے جنابِ رسولِ خدا! تم مجھ میں اور ان میں محاکمہ کرو اور بتاؤ کہ کون تمہارا دوستدار ہے؟ میں گنہگار؟ یا یہ دیندار؟ اور انشاء اللہ تعالیٰ اگر خدا سچ ہے اور قیامت درست ہے تو یہ معرکہ ہونا ہے۔ لیکن باایں ہمہ اگر کوئی مباہلے پر آمادہ ہو تو میں مباہلے کو موجود ہوں۔"

مثال ۱۲ | یا مثلاً شرعی حیلے جو فقہ کے فتاووں میں گناہ سے بچانے یا گناہ پر دلیر کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں اُن کی مذمت پر سرسید نے ایک آرٹکل ظریفانہ سوال و جواب کے

---

[1] جب کالج قائم کرنے کی تدبیریں شروع ہوئیں اور تہذیب الاخلاق جاری ہوا اُس وقت ایک آرٹکل علی گڑھ گزٹ میں کسی نے شائع کیا تھا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ جو قومیں امرِ معاش میں منہمک ہوگئی ہیں وہ دین سے بالکل غافل اور دست بردار ہوگئی ہیں۔ سید صاحب نے یہ آرٹکل اُسی کے جواب میں لکھا تھا (۱۲)

پیرایہ میں تہذیب الاخلاق میں لکھا ہے۔ جس کا عنوان ہے "انشاء اللہ" ہم اس آرٹیکل کو بجنسہٖ اِس مقام پر نقل کرتے ہیں:-

کافر کافر

کیوں حضرت کافر کیوں؟

تم نے کیا کہا؟

میں نے کہا "انا مومنٌ انشاء اللہ"

کافر کافر! یوں کہو "انا مومنٌ حقاً" اس جگہ انشاء اللہ کا لفظ نہیں کہتے، ایسے موقع پر یوں بولنا کفر ہے۔

پھر حضرت کس جگہ کہتے ہیں:-

قسم سے بچنے، وعدہ پورا نہ کرنے، بے گناہ دھوکا دینے، جھوٹ بولنے اور جھوٹا نہ ہونے میں۔

حضرت پھر تو انشاء اللہ خوب اوزار ہے۔ کیا سارا دن کاربنائو اسی مسئلے پر ہے؟

ہاں جو پرہیزگار، مولوی، عالم، شرع پر چلنے والے ہیں، گناہوں سے بچنا چاہتے ہیں، وہ ہمیشہ اس پر خیال رکھتے ہیں۔

حضرت میں تو نہیں سمجھتا۔

فقہ پڑھی ہو، اصولِ فقہ کو جانا ہو، عالموں کی صحبت اُٹھائی ہو تو جانو، جاہل کندۂ ناتراش نہ پڑھے نہ لکھے جانو تو کیا جانو؟

حضرت آپ ہی سمجھا دیجئے۔

ارے میاں! اِن کے معنی تو اگر، شائے کے معنی چاہا، اللہ کے معنی تو اللہ کے ہیں ہی، مگر وہ فاعل واقع ہُوا ہے جس کے معنی نے کے ہوتے ہیں اب سب کو ملاؤ تو یہ معنی ہوئے "اگر چاہا اللہ نے" اب دو مسئلے فقہ کے اور سمجھ لو۔ اگر کوئی امر کسی پر مشروط ہو اور بسبب نہ پورے ہونے شرط کے ادا نہ کیا جائے تو کچھ گناہ لازم نہیں آتا" اذا فات الشرط فات المشروط" ایک مسئلہ ہوا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خالق جمیع افعال عباد

[1] گویا ایک مولوی یا فقیہ کا ایک جاہل آدمی سے خطاب ہے اور اُس نے جو یہ لفظ کہا ہے کہ انا مومنٌ انشاء اللہ اس پر اُس کو کافر بتاتا ہے۔ (۱۲)

کا خدا ہے۔ پس جب ان دونوں مسئلوں کو ملا کر انشاء اللہ کے معنوں کو دیکھو تو پھر انشاء اللہ کہنے کے بعد کچھ گناہ نہیں رہتا۔

حضرت! میں مسئلے کو تو بخوبی سمجھ گیا، مگر اب تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ گناہ کیونکر نہیں رہتا؟ کیا وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے اُلٹ جاتا ہے؟؟

جاہل! اور کیا؟ ہماری جیب میں ایک گھڑی ہے۔ ہمارے دوست کو اُس کی ضرورت ہے، جب اس نے ہم سے مانگی ہم نے کہا کہ ہمارے گھر میں کوئی گھڑی ہی نہیں۔ اُس نے کہا قسم تو کھاؤ۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے گھر میں کوئی گھڑی نہیں۔ ہمارے گھر میں ایک اشرفی رکھی ہے۔ ہمارے دوست نے ہم سے اشرفی مانگی، ہم نے کہا ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں: اس نے کہا قسم کھاؤ، ہم نے کہا خدا کی قسم ہمارے پاس کوئی اشرفی نہیں۔ کیوں۔ سچ بات ہوئی کہ نہیں؟ بات ہی بات میں گناہ اُلٹ گیا کہ نہیں؟ یہ تو باتیں ہی باتیں ہوئیں، روپے پیسے سود بٹے کے معاملے میں بھی لفظوں ہی کے اُلٹ پھیر سے گناہ اُلٹ جاتا ہے۔ تولہ بھر سونا سولہ روپے کی قیمت کا ہم سے قرض لو، سود سے بچنے کو کہہ لو کہ بیس تولہ چاندی لیں گے۔ سولہ تولے چاندی ہیں وہی تولہ بھر سونا آیا اور چار تولے چاندی سود میں بچ رہی اور سود نہ ہوا۔ کھوٹا سونا جس میں ذرا سا تانبے کا میل ہو، قرض دو اور اسی وزن کے برابر کھرا سونا لے لو۔ مال تو زیادہ کا ہاتھ لگ گیا اور سود نہ ہوا، مکان گروی رکھو، راہن سے کہلوا لو کہ سکونت ہیں تو بجلی کی کرایہ کا فائدہ ہوا اور سود نہ ہوا، گاؤں گروی لو مثلاً ہزار روپے کو جس میں دو سو روپے سالانہ کا فائدہ ہو، راہن سے اسی روپے سال دینے کے اقرار پر پٹا لکھوا لو اور گاؤں پر قبضہ کر لو۔ کل منافع تحصیل کرو، ایک سو بیس روپے سال سود کے پٹے کے نام سے بچے کہ نہیں؟ اور سود نہ ہوا؟

حضرت! کیا یہ ہوتا ہے؟

خدا کی قسم سب کرتے ہیں، جتنے مقدس، خدا پرست، وہابی، نیم وہابی، مقلد حنفی، زمیندار، تعلقہ دار ہیں سب کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مولویوں نے فتوے دے دئیے ہیں۔

اب سمجھے کہ لفظوں کے اُلٹ پھیر سے گناہ پلٹ گیا کہ نہیں کہ؟ اجی ابھی ہمارے پاس زکوٰۃ کا روپیہ لائیے اور ہم مستطیع ہوں، ابھی گھر میں جا کر بیوی سے کہہ آویں کہ ہم نے اپنا کل مال تم کو ہبہ کیا، اب مفلس ہو گئے کہ نہیں؟ باہر آویں اور زکوٰۃ کا روپیہ لے لیں۔ باتیں ہی تو ہیں، ان باریکیوں کو سمجھنے

کے لئے علم درکار ہے

بھلا حضرت یہ تو ہوا، انشاء اللہ والی بات رہ گئی اُس کو بھی کسی مثال سے سمجھا دو۔

ارے میاں یوں سمجھو کہ ہم نے تمہارا دل خوش کرنے کو تم سے کہہ دیا کہ ہم کل تمہارے ہاں آویں گے انشاء اللہ۔ ہمارا ارادہ آنے وانے کا کچھ نہ تھا یوں ہی کہہ دیا تھا، جب نہ گئے تو معلوم ہوا کہ خدا نے نہیں چاہا! اسی وعدے کو مشروط کہا تھا اذا فات الشرط فات المشروط بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا۔ کبھی تم عدالت میں گواہی دینے بھی گئے ہو؟

ہاں صاحب! ایک دفعہ گیا تھا، میں نے تو جو سچ تھا وہ کہہ دیا تھا، مگر میرا بھائی مقدمہ ہار گیا۔ میں کیا کرتا، وہاں ایک کالی مخمل کی گول چنٹ دار ٹوپی پہنے ہوئے گوری رنگت کا مسلمان مولوی کرسی پہ بیٹھا تھا، اُس نے قسم دی کہ سچ کہنا، میں جھوٹ بولنے سے ڈر گیا، سچ کہہ دیا۔

ہاں فقہ نہ جاننے سے عالموں کی صحبت نہ اُٹھانے سے یہی تو نتیجہ ہوتا ہے۔ ارے جب اُس مولوی جج نے قسم دی تھی کہ سچ بولنا تو تُو نے کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا انشاء اللہ، اگر وہ جج نام کا مولوی تھا اور فقہ نہ جانتا تھا تو پکار ہی کر انشاء اللہ کہہ دیا ہوتا اور اگر وہ مولوی تھا اور ٹھٹیرے ہٹیرے بدلائی آن پڑی تھی تو پکار کر کہا ہوتا کہ خدا کی قسم سچ بولوں گا اور جھٹ پٹ دل میں کہہ گیا ہوتا انشاء اللہ، مگر یہ خیال رکھا ہوتا کہ سانس نہ ٹوٹنے پائے ورنہ انشاء اللہ کا جوڑ ٹوٹ جاتا، پھر چاہتے وہ کہہ دیتے، ذرا بھی جھوٹی قسم کھانے کا گناہ نہ ہوتا۔

حضرت! باتیں تو آپ نے خوب بتائیں مگر میں حیرت میں ہو گیا۔ اب تو رخصت ہوتا ہوں اور کسی سے بھی تحقیق کروں گا، میرا دل دھکڑ پکڑ رہا ہے۔

تم جس مولوی سے چاہے پوچھنا، یہی بتائے گا۔ کہو میں ابھی ہدایہ، شرح وقایہ، درِ مختار، بحر الرائق نہر الفائق اور بڑے بڑے معتبر فتاووں سے ہر ایک جزئی کی روایت نکال دُوں اور تم نے وہ فتاویٰ بھی دیکھا ہے؟ جو پرانے خاندانی مولویوں اور قاضیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ میں اِس وقت اُس کا نام بھول گیا ہوں یاد آ جائے گا تو بتا دُوں گا۔ اس میں ہر ایک مسئلے کی نسبت دو روایتیں لکھی ہیں ایک میں جائز حلال اور دوسری میں ناجائز حرام لکھ رکھا ہے۔ پھر جونسی روایت کے مطابق چاہا فتویٰ لے لیا، بہت ہوا روپیہ دو روپیہ فتوے کے نام سے

نہیں اور کسی نام سے کبھی کبھی دیتے رہے کیوں؟ بات کی بات میں گناہ پلٹ گیا کہ نہیں؟ مگر اس زمانے میں جو کم بخت مقلدین فلاسفہ ملاحدہ نکلے ہیں وہ تو مذہبِ اسلام کی جڑہ کاٹتے ہیں۔ یا اللہ کیا مشکل پڑی ہے!! تھوڑی دُور چلے تھے کہ ایک پیر مرد متبرک صورت سفید ریش ملے، جانا کہ یہ بھی کوئی مولوی ہیں، پکار کر کہنے لگے کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ بھائی! کیا کوئی مذہبی مسئلہ ہے؟ بولے حضرت! ہاں مذہب کا مسئلہ ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ بھائی! نہ میں مولوی نہ مولوی کی دُم، مجھ سے اور مذہبی مسئلوں کے پوچھنے سے کیا واسطہ! کسی مولوی سے جاکر پوچھو، اِسی شہر میں بہت سے مولوی ہیں۔ یہاں سے دس پندرہ کوس پر نامی نامی قصبے ہیں، وہاں مولویوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں، وہاں جاکر پوچھو!

نہیں حضرت! میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ کا نام بھی تو مشہور رہے۔

ارے میاں! شیطان کا نام تو مجھ سے بھی زیادہ مشہور رہے، ابھی ویسی شہرت تو مجھ کو ہوئی بھی نہیں، میں نیچری مشہور ہوں، مُلا مولوی نہیں ہوں، مجھ سے مت پوچھو!

حضرت! اگر مولوی ملاؤں سے دِل کو تسکین ہوتی تو آپ تک کیوں آتے؟ جب دل ہی کو تسکین نہ ہو تو مولوی ملاؤں کو کیا کریں؟ پھر آپ نیچری ہوں یا بنیچری بے پوچھے تو دل مانتا نہیں خدا کے واسطے بتا ہی دو!

اچھا صاحب پوچھو کیا پوچھتے ہو، مگر میں کسی فتاوے وتاوے کو نہیں جانتا، خدا کی کتاب اور خدا کے فتاوے[2] کو جو سب کی آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا ہے، جانتا ہوں جو کہوں گا، اسی سے کہوں گا۔

---

[1] یہاں تک مولوی اور اس کے جاہل مخاطب کی گفتگو تھی، اس کے بعد گویا آرٹکل لکھنے والا کہتا ہے کہ اس جاہل کا مقابلہ راہ میں نیچریوں کے کسی سرگروہ سے ہو گیا پھر اُن دونوں کے سوال وجواب ہیں (۱۲)

[2] خدا کے فتاوے سے مراد فطرتِ انسانی ہے جس میں حسن وقبح اشیاء کا علم ودیعت کیا گیا ہے اور جس کی طرف مخبرِ صادق نے اس حدیث میں اشارہ کیا ہے کہ "اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَلَوْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ" اور جو لوگ اس فتاوے کے موافق عمل کرتے ہیں وہ مفتیوں کے فتووں سے مستغنی ہیں، چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم رئیسِ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے پاس ایک موضع گروی تھا بہت مدت کے بعد مالک نے اُس کو چھڑانا چاہا، ہرچند کہ رہن نامہ میں تمام منافع موضع مرہونہ کا مرتہن کو معاف ومباح کر دیا گیا تھا اور فکِ رہن کے وقت مالک بخوشی کل زرِ رہن ادا کرنا چاہتا تھا اور مفتیوں نے بھی اباحت کا فتویٰ دے دیا تھا مگر اُس مرحوم مغفور نے یہی حدیث پڑھی کہ اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ وَلَوْ اَفْتَاکَ الْمُفْتُوْنَ

بہت اچھا آپ اُسی سے فرمایئے گا، میں پوچھتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ کو جانتے ہیں؟ خوب جانتا ہوں، ہماری دِلّی کے رہنے والے تھے بڑے شاعر تھے، ذرا مزاج میں ظرافت تھی اُن کے یہ اشعار مجھے یاد ہیں، پہلے مصرعے میں شاید کچھ لفظ ادل بدل ہو گئے ہیں ۔

مولوی کہتے ہیں ہم کو تُو نے کیوں رُسوا کیا
کیا گنہ کیا جرم کیا تقصیر ہم نے کیا کیا
واسطہ، باعث، سبب، موجب، جہت کچھ بات بھی
رازِ وہ کمبخت کیا تھا میں نے جو افشا کیا
کیا کہا، کِس سے کہا، کس نے سُنا، کب کس گھڑی
کِس جگہ کِس وقت، کِس دم آپ کا چرچا کیا

حضرت میں آپ سے انشاء اللہ خاں شاعر کا حال نہیں پوچھتا۔ انشاءاللہ کے لفظ کی نسبت حکم شرع کا پوچھتا ہوں کہ کس مراد اور کس مطلب سے اور کس مقام پر اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے ؟

یہ کہو، ذرا مجھ کو خدائی فتاوے نیچر دیکھ لینے دو۔ اس میں تو یہ لکھا ہے کہ تم کو کسی کام کی نسبت نہ یہ کہنا چاہیئے کہ میں کل کروں گا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر خدا چاہے تو میں کل کروں گا۔ خدا بسبب علۃ العلل ہونے کے ہر کام کو خواہ انسان کرے یا حیوان اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس لئے انسان کو بھی لازم ہے کہ ہر چیز کو خدا سے متعلق کرے، پس جس بات پر انشاء اللہ کا لفظ کہا جاتا ہے تو انشاءاللہ کے لفظ سے اس بات پر تعلیق ہوتی ہے اور وعدے کو زیادہ استحکام ہوتا ہے، سُننے والے کو کامل الیقین ہو جاتا ہے کہ وعدہ کرنے والے نے خدا پر اس وعدے کی تعلیق کی ہے تو ضرور اُس کو پورا کرے گا۔ اگر تم نے کسی سے وعدہ کیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا اور اس کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا اور نہیں گئے تو صرف وعدہ خلافی کا گناہ ہوا اور اگر اُس کے ساتھ انشاء اللہ بھی کہا اور پھر نہ گئے تو تین گناہ ہوئے ایک وعدے کا، دوسرا اس بات کا کہ جس سے وعدہ کیا تھا اُس کو پورا کرنے کا زیادہ یقین دلایا اور

پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ۔ اور جس قدر محاصل اس موضوع سے وصول ہوا تھا سب زرِ رہن میں سے مجرا دے کر باقی روپیہ راہن سے لے لیا (۱۲)

وعدہ پورا نہ کیا، تیسرا اس بات کا کہ خدا کو ضامن دیا اور اس کے نام کی عزت کا بھی کچھ ادب نہ کیا۔ اگر کسی بات پر قسم کھا کر انشاء اللہ کہا ہو تو قسم کھا کر گناہ سے نہیں بچتے، بلکہ دُگنا گناہ ہوتا ہے، قسم توڑنے کا، خدا کے ساتھ تعلیق کر کے اس کا ادب نہ کرنے کا، جب قسم کھائی کہ سچ کہوں گا اور ظاہر میں یا دل میں انشاء اللہ کہہ لیا اور پھر جھوٹ بولے تو تین گناہ ہوئے۔ جھوٹ بولنے کا، قسم توڑنے کا، خدا پر تعلیق کر کے اُس کا ادب نہ کرنے کا۔

جس بات کا وعدہ کیا جاتا ہے جب مصمّم اور نہایت مضبوطی اور سچی نیت سے اس کے پُورا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اُس وقت اُس کے ساتھ لفظ انشاء اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم کسے ایک مولوی سے کہا کہ میں تم کو انشاء اللہ دس روپے دُوں گا تو اُس کے یہ معنی ہوئے ضرور بے شک تم کو دس روپے دُوں گا۔

حضرت! اپنے وعدوں کی نسبت تو مولوی بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ وعدہ نفل نہیں رہتا، بلکہ بحکم نصوصِ صریحہ مثل زکوٰۃ اور نذر معین کے واجب ہو جاتا ہے، مگر اور جگہ کہتے ہیں کہ نہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوتا ہے، نہ قسم ٹوٹنے کا گناہ ہوتا ہے اور انشاء اللہ کو ایک سپر بناتے ہیں جو ہر ایک حربے سے بچا لیتی ہے۔ حضرت! خدا مارے یا چھوڑے ان مولویوں نے جو اسلام بنا رکھا ہے اگر وہی اسلام ہے تو میرا اسلام، اس سے نیچری ہی اچھے جو سچائی کو اسلام بتاتے ہیں۔"

اگرچہ یہ تمام آرٹیکل ظرافت کے پیرائے میں لکھا گیا ہے مگر اس میں جس قدر مسائل فقہا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اُن میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو فقہ کے فتاووں میں موجود نہ ہو۔ اِسی قسم کے فتووں کی نسبت کہا گیا ہے کہ "استفت قبلك ولو افتاك المفتون" اور ایسے ہی حیلوں کی نسبت جب علی مرتضیٰؓ سے پوچھا گیا کہ ما الحِیلَۃ؟ تو آپ نے فرمایا "تَرْكُ الحِيلَةِ"

مثال نمبر ۵ | یا مثلاً وہ امام غزالی کے ایک رسالہ کے ریویو میں اہلِ دنیا اور مشائخ و علماء کی نسبت ایک مقام پر لکھتے ہیں۔[1] "اس مقام پر امام صاحب نے دو قسم کے لوگوں کا حال لکھا ہے

---

(۱) یہ وہ مقام ہے کہ امام غزالی نے اپنے رسالہ "التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ" میں دو قسم کے لوگوں کا حال لکھا ہے۔ ایک

(باقی اگلے صفحے پر)

ایک ان کا جو اسرارِ ملکوت اور کفر و ایمان کی حقیقت سمجھنے کے قابل ہیں (یعنی اہلِ دین) اور دوسرے وہ جو ناقابل ہیں (یعنی اہلِ دنیا) اور دونوں کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ مگر یہ مقام کسی قدر زیادہ تشریح کے قابل ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس مقام پر امام صاحب نے جو دوسری قسم کے لوگوں کے حال سے بحث کی ہے (یعنی اہلِ دنیا کے حال سے) اُن میں وہ لوگ جو علانیہ اہلِ دُنیا کہلاتے ہیں، داخل نہیں ہیں۔ اہلِ دنیا سے میری مراد ان دنیا داروں سے نہیں ہے جن کو اہلِ دنیا بھی الدُّ الخصام سمجھتے ہیں بلکہ اُن سے مراد ہے جنہوں نے دنیا کو بغیر کسی بے ایمانی اور دغا بازی کے اختیار کیا ہے۔ دنیا میں بحیثیت دنیا دار اپنی عزت، اپنا نام، اپنی شہرت، اپنا آرام، اپنی حشمت چاہتے ہیں، زہد و تقویٰ، علم و اتقا، صبر و قناعت کے ذریعے سے دنیا و آخرت میں تفوق کی خواہش انہوں نے ظاہر نہیں کی۔ انہوں نے ایمان میں سے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر دل سے یقین کیا ہے، وہ خدا کی ذات کو بے نقص اور رسولؐ کو بے عیب سمجھتے ہیں۔ وہ کسی ایسی بات کو جس میں ان کی دانست میں خدا پر کوئی نقص آتا ہو اور رسول پر کوئی عیب لگتا ہو، نہیں مانتے، گو وہ کسی نے کہی ہو اور کسی نے لکھی ہو اور گو کہنے والے اور لکھنے والے کے نزدیک اس سے کوئی نقص نہ آتا ہو اور عیب نہ لگتا ہو، اور گو بالفرض درحقیقت وہ بات کوئی نقص یا عیب کی نہ ہو مگر اس وجہ سے کہ وہ اس کے ناقص اور معیوب ہونے پر یقین رکھنے میں گو وہ غلطی پر ہوں، خدا اور رسول کی شان سے اس کو بعید سمجھتے ہیں اور اس لئے اُس پر یقین نہیں کرتے۔ غرضکہ ان کو خدا کے تقدس اور رسولؐ کی منزلت پر ایسا یقین ہے کہ کسی دوسرے کی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ پھر وہ کوئی کیوں نہ ہو۔

"اعمال میں سے فرائض کو حق سمجھنا اور جس طرح پر ہو سکے اُن کو ٹوٹا پھوٹا مسلسل یا گنڈے دار ادا کرنا اور اُس میں کوتاہی کو اپنی شامتِ اعمال سمجھنا، اور اس پر تأسف کرنا، دل کو بدی اور بدنیتی، کینہ اور فساد و بغض و حسد سے پاک رکھنا، کسی کے ساتھ دغا بازی نہ کرنا، کسی کا مال نہ مار کھانا، کسی کو ایذا و تکلیف نہ پہنچانا، ہر ایک کے ساتھ محبت

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ) اہلِ دنیا جنھوں نے ہوائے نفس کو اپنا خدا، سلاطین کو معبود اور درہم و دینار کو اپنا قبلہ، حبِ جاہ کو اپنی شریعت اور اہلِ دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دیا ہے اور اس لئے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی میں تمیز نہیں کر سکتے۔ دوسرے اہلِ دین جن کا دل دنیا کی میل کچیل سے پاک ہے، کامل ریاضت سے مجلّیٰ ہے، خدا کی یاد سے منور ہے وغیرہ وغیرہ اور اس لئے وہ کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو بخوبی تمیز کرتے ہیں۔ سرسید نے امام صاحب کے برخلاف اہلِ دنیا کے ایک خاص گروہ کو مستثنیٰ کر کے دنیا داروں کی برات کی ہے اور پھر اہلِ دین کی خبر لی ہے۔

اور سچی دوستی سے پیش آنا، سب کی بھلائی چاہنا، سب کے ساتھ ایمانداری سے معاملہ کرنا اور رکھنا اختیار کیا ہے
" دنیا تو گویا اُن کا مقصد ہی ہے ان باتوں کے سوا اُنہوں نے دنیا ہی دنیا کو پکڑا ہے، روپیہ کے ایمانداری سے پیدا کرتے
ہیں، اپنی محنت و مشقت سے روٹی کمانے میں بے انتہا کوشش کرتے ہیں، روپیہ کماتے ہیں، عمدہ عمدہ مکانات بناتے ہیں،
دنیا میں عزت و ترقی و حشمت حاصل کرتے ہیں، باغ بناتے ہیں اور اُس کے پھلوں اور میووں کی سیر سے خوش ہوتے ہیں۔
میوے کھاتے ہیں، گھوڑوں پر چڑھتے ہیں، عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنتے ہیں اور اچھے سے اچھے کھانے کھاتے ہیں۔ قالینوں کے
فرش کو جوتیوں کے تلے بچھاتے ہیں۔ تمام عیش و آرام جو کہ انسان عمدہ اخلاق اور شائستگی کے ساتھ کر سکتا ہے، کرتے ہیں؛
خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو جس لئے اُس نے پیدا کیا ہے، برتتے ہیں اور کام میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا نے
ہم کو دیا ہے ہم کیوں نہ برتیں اور کیوں مصیبت بھگتیں۔ اگر خدا کو ان سے ہمارا عیش و آرام مقصود نہ تھا تو اُن کو
پیدا ہی کیوں کیا تھا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اُن کو برتیں اور عیش اڑائیں، مگر زیادتی نہ کریں۔ کیونکہ جس طرح کے
استعمال کے لئے وہ بنائے گئے ہیں اگر اُس طرح پر استعمال نہ کریں تو نمک حرام اور چور ہوں گے نہ شریف دنیادار۔
وہ نہ دعوئ دینداری کرتے ہیں، نہ کسی کے پیشوا بننا چاہتے ہیں نہ اپنے تئیں تابع سنت کہلوانا پسند کرتے ہیں، نہ
پیر و مرشد، نہ منبر پر واعظ بننا چاہتے ہیں نہ استفتاء کے مفتی، سیدھی طرح سے خدا کے بندے، رسول کی اُمت ہیں۔
خدا کے دیے ہوئے عیش و آرام میں مست رہتے ہیں۔ پس ایسے لوگ تو امام صاحب کی بحث سے خارج ہیں۔

ہاں جو کچھ اس مقام میں امام صاحب نے لکھا ہے وہ اُن لوگوں کی نسبت لکھا ہے جو جبہ و عمامہ دار ہیں
دنیا چھوڑ دین کی راہ چلتے ہیں۔ دن رات قال اللہ و قال الرسول میں بسر کرتے ہیں، دین ہی دین پکارتے ہیں۔
دین ہی کا اوڑھنا اور دین ہی کا بچھونا بناتے ہیں، دنیا داروں نے جس قدر مختصر اچھے دین کے اختیار کئے تھے
اُن دینداروں نے اُسی قدر مختصر باتیں دنیا کی اختیار کی ہیں اور جس قدر وہ دنیا کے حاصل کرنے میں مشغول تھے
اُسی قدر یہ دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں گویا پہلے فرقے کے بالکل برعکس ہیں۔ اسی مقدس فرقے کا، خدا
ان سے پناہ میں رکھے، امام غزالی صاحب نے ذکر کیا ہے۔ بیشک جب یہ فرقہ کریلا اور نیم چڑھا ہو جائے
یعنی ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور دراہم و دنانیر کو اپنا قبلہ اور حب جاہ کو اپنی شریعت
اور اہلِ دول کی خدمت کو اپنی عبادت قرار دے تو وہ کبھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز نہیں کر سکتا
فما قالہ الغزالی فھو حق لاریب فیہ۔

مگر وہ دوسرا فرقہ بھی نہایت ہی خوف ناک ہے جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ

ان کا دل[1] دنیا کے میل کچیل سے پاک ہے کامل ریاضت سے مجلّی ہے ۔ خدا کی یاد سے منوّر ہے فکر کی شیرینی سے شیریں ہے، شریعت کی پابندی سے مزیّن ہے، مشکوٰۃِ نبوّت سے روشنی لیتا ہے، جلا دار آئینہ کی مانند ہے اس کا نور شیشے کی ہانڈی میں بے آگ سُلگتا ہے، نور کے چکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں" ہاں یہ سچ ہے کہ اس فرقے نے ہوائے نفس کو اپنا خدا اور سلاطین کو اپنا معبود اور دراہم و دنانیر کو اپنا قبلہ نہیں بنایا ۔ مگر خود ہوائے نفس نے ان کو اپنا خدا اور خود سلاطین نے اپنا معبود اور دراہم و دنانیر نے اپنا قبلہ بنایا ہے، پھر ان کو بنانے کی کیا حاجت تھی ۔

"جس وقت کہ پیر صاحب یا مولوی صاحب کے گرد اُن کے معتقدین کا حلقہ ہوتا ہے اور حجرِ اسود کی مانند اُن کے دستِ مبارک کے بوسہ دینے کو لوگ دوڑتے ہیں تو اُن کا دستِ مبارک یمین الرحمٰن سے بھی بالا دست ہو جاتا ہے ۔ مولوی صاحب، حضرت صاحب کی آواز کا چاروں طرف سے اُن کے کان میں آنا، چاؤشانِ کسریٰ و کیقباد کی آواز سے بھی قوی اثر اُن کے دل پر ڈالتا ہے ۔ مسکینی اور انکساری اُن کو آسمان پر چڑھاتی جاتی ہے، اس لئے وہ اور زیادہ مسکین اور منکسر ہوتے جاتے ہیں سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اِس لئے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں ۔ دنیا سے نفرت اُن کو دنیا دلاتی ہے اِس لئے وہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں ۔ بے طمعی حاجت سے زیادہ بغیر محنت کے درہم و دنانیر دلاتی ہے، اس لئے وہ زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں ۔ اُن کی ہر ایک بات پر لوگ آمنّا و صدّقنا کہتے ہیں ۔ اس لئے اُن کے دل میں دوسرے کی بات کی حقارت جمتی جاتی ہے ۔ ہاتھوں کو چومتے چومتے ہر ایک مشکل کی حل کو دعائیں منگواتے منگواتے، ہر ایک مسئلے کا فتویٰ دیتے دیتے ایک اور بیماری اُن میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب برائی بھلائی، دوزخ و بہشت کفر و ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگتے ہیں ۔ کسی کو کافر بنا دیتے ہیں اور کسی کو مرتد ۔ کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو بہشت ۔ کبھی خازنِ جنت ہیں اور کبھی مالکِ جہنم ۔ خدا کے نور کے دل میں بھڑکنے کے خیال سے ظلمت پر ظلمت میں پڑتے جاتے ہیں یہ تمام باتیں مل ملا کر حضرت کو ایک ایسا شخص بنا دیتی ہیں جو پھول پھلا کر کپا ہو جاتا ہے ۔ نہ کان رہتے ہیں جو کچھ سنیں، نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ دیکھیں، نہ منہ رہتا ہے جو حق بات کہیں ۔ جو سرور اور دلی آسائش اور دل کے پھولنے سے جو مزا اس فرقے کو آتا ہے نہ کسی دنیا دار کو میسر ہوتا ہے، نہ کسی دولت مند کو اور نہ کسی صاحبِ تخت و سلطنت کو ۔ پس اس فرقے سے بھی کفر کی ظلمت اور ایمان کی روشنی کو تمیز

---

[1] یہ اقوال امام صاحب کے رسالے سے لئے گئے ہیں جو اس جملے پر ختم ہوتے ہیں کہ "نور کے چکارے اُن کے دل سے نکلتے ہیں"

کرنے کی توقع نہیں ہے الّا ماشاء اللہ۔ کوئی آفت انسان کے لئے اس سے زیادہ نہیں ہے جب کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں نیک ہوں۔ کوئی گمراہی انسان کے لئے اس سے زیادہ نہیں ہے جب وہ جانتا ہے کہ میں پابندِ شریعت ہوں۔ وہ زبان سے اپنے تئیں گنہگار کہتا ہے مگر اُس کا دل اُس کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ اس کہنے کو بھی وہ ایک نیکی اور تعلّی سمجھتا ہے۔ اپنی چال ڈھال شریعت کے موافق بناتا ہے، مگر اس کا دل روز بروز سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ ازار کے دو انگل نیچے ہوتے، داڑھی کے لمبی یا ایک مشت و دو انگل ہوتے، کپڑے کو نجاست سے پاک کرتے، پانی کے پاک ناپاک ہونے پر دن رات بحث کرتا ہے۔ لمبے لمبے فتوے لکھتا ہے۔ مگر دل کو نجاستوں سے پاک کرنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ اکل حلال اور صدق مقال پر لمبے لمبے وعظ کہتا ہے مگر جب کوئی لقمۂ تر آجاوے تو جھٹ نگل جاتا ہے اور اگر کبھی اُگل دیتا ہے تو اِس امید پر کہ اِس سے بھی لقمۂ تر تر آوے گا۔ یہی باتیں تھیں جن کے سبب حضرت عیسیٰؑ نے فریسیوں اور صدوقیوں کو یعنی شریعت پر چلنے والے یہودیوں کو ملامت کی۔ یہی لوگ اس کے مصداق ہیں کہ "یلعنھم اللّٰہ و یلعنھم اللاعنون۔ عمدہ زندگی وہی ہے جو سیدھی سادی ایک دنیادار کی سی ہو۔ پھر خواہ وہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ قال رسول اللہ صلعم۔ "مَا ادری مایفعل بی ولا بکم۔"

اگرچہ سرسیدنے، جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں، اُردو زبان اور اُردو لٹریچر کو طرح طرح سے مدد پہنچائی ہے، مگر جو بے بہا مدد خاص کر اُن کے لٹریری ورکس سے اُردو لٹریچر کو پہنچی ہے اُس کے لحاظ سے اُن کو فادر آف اُردو کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ اگرچہ سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لائق لائق مصنف، مترجم اور مضمون نگار ملک میں موجود ہیں، جو نئے نئے خیالات اور نئے نئے اسلوبوں سے اُردو کو سرمایہ دار کر رہے ہیں، لیکن ہر شخص کی طرزِ تحریر میں کہ وہ فی نفسہٖ کیسی ہی عمدہ اور اعلیٰ درجے کی ہو یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ عام تحریروں کو اپنی سطح پر لے آئے۔ بعضے اسٹائل ایسے اچھوتے اور شارع عام سے ایسے بعید ہوتے ہیں کہ اور لوگ اُن کا تتبع کرنے کی دسترس اپنے میں نہیں پاتے اور بعضے ایسے سپاٹ اور سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں کہ اُن کی طرف کسی کی توجہ مائل نہیں ہوتی اور اس لئے دونوں قسم کے اسٹائلوں کا عام لٹریچر پر کوئی معتدبہ اثر نہیں ہوتا۔ سرسید کی طرزِ تحریر میں یہی خصوصیت تھی کہ اُس کی لطافت اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے اور اس کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی لکھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا تھا اگرچہ بیان کی قدرت اور اُس کا زور اور تاثیر جو اس شخص کی خاص تحریروں میں پائی جاتی ہے وہ تو اُسی کے دل و دماغ کا حصّہ

تھا، دوسرے کی تحریر میں اس کا ڈھونڈنا لاحاصل ہے۔ مگر جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ آج عام تحریروں میں دیکھی جاتی ہے اور جس قدر آرٹیکل نگاری کا سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے اور جہاں تک اہلِ قلم میں ہر قسم کے معاملات میں آزادانہ رائے زنی اور نکتہ چینی کا حوصلہ پیدا ہوا ہے، اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو یہ سب اسی ایک قلم کی آوازِ بازگشت ہے اور اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو اخبارات سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار نکلنے سے پہلے ملک میں جاری تھے اُن کا مقابلہ اُن اخباروں کے ساتھ کیا جائے جو اس کے بعد جاری ہوئے اور جو اخبار یا میگزین تہذیب الاخلاق سے پہلے جاری ہوئے تھے اُن کا موازنہ اُن اخباروں یا میگزینوں سے کیا جائے، جو اس کے بعد شائع ہوئے۔ اِس مقابلے سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اردو اخباروں نے ان پرچوں سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔ اگرچہ سرسید کی دیگر تصانیف سے بھی اُردو لٹریچر کو بہت کچھ مدد پہنچی ہے، مگر سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق نے خاص کر اُس میں ترقی کی روح پھونکی ہے۔ کیونکہ اُن کے مضامین جلد جلد شائع ہوتے تھے اور مہینے میں کئی کئی دفعہ پبلک کی نظر سے گذرتے تھے اور یہ سلسلہ تیس برس تک برابر جاری رہا۔

بیشک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں پرچوں میں سرسید کے سوا اور بھی بہت سے لکھنے والے تھے خصوصاً سید مہدی علی خاں قدیم تہذیب الاخلاق میں گویا سرسید کے برابر کے شریک تھے اور اِس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جو لٹریری فوائد ان پرچوں سے مترتب ہوئے اُن کو صرف سرسید کی تحریرات سے منسوب کیا جائے۔ لیکن چونکہ یہ سب لوگ سرسید کے قدم بہ قدم چلنے والے اور انہیں کے انشائی کی پیروی کرنے والے تھے، اس لئے اگر ان فوائد کو صرف سرسید کی تحریروں سے منسوب کیا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

چونکہ اس مقام کو ہم تہذیب الاخلاق کے نتائج کے ذکر میں مفصل بیان کر چکے ہیں، اس لئے یہاں اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اُن کو فارسی نظم و نثر لکھنے کا بھی شوق رہا ہے اگرچہ فارسی زبان میں جیسا کہ وہ خود بیان کرتے تھے، انہوں نے معمولی کتابوں کے سوا جو مکتبوں میں پڑھائی جاتی تھیں کوئی اعلیٰ درجے کی کتاب نہیں پڑھی تھی مگر جن مجلسوں اور صحبتوں میں اُن کا ابتدائی زمانہ گذرا تھا ان میں دن رات فارسی نظم و نثر کا چرچا رہتا تھا۔ مولانا صہبائی سے ان کی دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے ابتدا میں وہ سرسید ہی کے مکان پر ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں کے ہاں بھی ان کا ایک پھیرا ہر روز ہوتا تھا جہاں صہبائی اور شیفتہ اور مومن وغیرہم کا مجمع رہتا تھا۔ مرزا غالب کو وہ چچا کہتے تھے

اور مرزا اُن پر بزرگانہ شفقت کی نظر رکھتے تھے۔ نواب ضیاءالدین خاں اُن کے نہایت گاڑھے دوست تھے اور یہ سب لوگ فارسی نظم و نثر میں کمال رکھتے تھے۔ اِس لئے ضرور تھا کہ فارسی لٹریچر پر اُن کی توجہ مائل ہو۔ مگر باوجودیکہ یہ سب لوگ بیدلؔ یا ابوالفضل یا جلالائے طباطبا یا اور مشہور نازک خیال نثاروں کی پیروی کرنے والے تھے، لیکن ظاہرا سرسید نے فارسی نثر میں بھی مثل اُردو کی سادگی سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ اگرچہ اُن کی ابتدائی تحریریں، ایک رسالے کے سوا جو مسئلہ تصورِ شیخ کے بیان میں ہے، دستیاب نہیں ہوئیں۔ مگر غدر کے بعد کی جو بعض تحریریں ملی ہیں اُن میں ویسی ہی سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی اُن کی اُردو تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ انہیں جملہ ایک وہ فارسی لکچر ہے جو انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرتے وقت کلکتہ کی مجلس مذاکرہ علمیہ میں پڑھا اور جو ان کے لکچروں کے مجموعے میں چھپ گیا ہے۔ اس کے سوا اُن کا ایک اور فارسی خط منشی سراج الدین احمد کے مسودات میں ہم کو ملا ہے جو اُن کو حیدرآباد میں دستیاب ہوا تھا اور جو سرسید نے ۱۳؍ اگست ۱۸۸۱ء کو حاجی سید محی الدین خاں رضوی کے نام ان کے خط کے جواب اور پندرہ سو روپے چندہ کے شکریے میں لکھا تھا، چونکہ یہ خط کہیں نہیں چھپا ہے اِس لئے اس کے تلف ہو جانے کے خیال سے ہم اس کو بجنسہٖ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"مخدوما و مطاعا! نامہ یافتم و متحیّر گشتم۔ خواندم و برخواندم، بلند پائگیِ نویسندہ اش را خود آں نامہ نشاں میداد تحیّر دراں بود کہ مخاطبِ آں کیست؟ بغلط خود را دانستم و باز گشتم کہ آنچہ دراں نامہ مرقوم است سزاوارِ ہمچو منے دامن آلودہ، کمترین مخلوقے، ہیچ میرزے، گم کردہ راہے نمیتواند شد۔ خیر آنکہ اوصافِ حمیدہ و اخلاقِ پسندیدۂ شما شخصِ خیالیٔ خود را یا خود اوصافِ خود را مخاطب ساختہ باشد۔ سخنے دیگر قرار دادن نمی توانم و اگر ازیں فروتر آیم و خود را مخاطبِ آں دانم حاشا کہ بدونِ اختیارِ مذہبِ وحدتِ وجود ایں چنیں توانم دانست، تا کہ من کہ حجابِ خودم از میان برخیزم و تفاوتِ من و تو و تو و من از میان برافتد و ہمہ آنچہ نوشتہ اید خود شما مصداقِ آں باشید و للہ درّ من قال

"تو خود حجابِ خودی، احمد از میاں برخیز"

"راست فرمودہ اند کہ "رضویّت ذریعۂ یک گوہری است نہ وسیلہ ییک جہتی" مگر الحمدللہ کہ با ما و شما یک گوہری و یک جہتی ہر دو محقق است، گو ایں نسبت ہائے من با شما باعثِ ننگ و عارِ شماست و ما را سببِ عزت۔ خدا داند کہ محبت پیشہ ام و بجز محبت در کشتِ سینہ ام نہ کشتہ اند۔ الطاف و عنایت شما را شکر گذارم و بایں محبت جاں نثار۔ مبلغ یک ہزار و پانصد روپیہ سکۂ انگریزی کہ بجہتِ تعمیر بورڈنگ ہاؤس مرحمت فرمودہ اند رسید۔ قوم را عزت افزود، و دلم را تقویت داد و ساعدِ سعیٔ ما را قوت بخشید۔ سپاسِ آں ازیں قوم

ناسپاس دشوار. مگر اجرکم علی اللہ صلہ آں کافی ست من شکریۂ آں عطیہ بجا می آرم در وقتے می آید، و آں
دور نیست کہ تمام قوم ما خلفاً شاں نسلاً بعد نسلٍ بہ شکر گذاریِ ہمچو شما بزرگاں کہ در صلاح و فلاحِ قوم از قدم
و قلم و درم دریغ نہ فرمودہ اند، رطب اللسان و عذب البیان خواہد بود۔"

"آنچہ بر حالِ زارم دل سوختہ اند و حسرت فرمودہ، ممنونِ احسانِ شما، مگر ہیچ جائے دل سوختن و حسرت
نمودن نیست۔

حسنِ شہرت عشق رسوائی تقاضا میکند　　جرمِ معشوق و گناہِ عاشقِ بیچارہ نیست

اگر قوم ما را چشمِ بصیرت بودے و مآلِ کار خود فہمیدے ما و شما ایں کوشش و کشاکش ضرور نہ بودے ہرگاہ،
حال این ست پس از اں قوم بجز بدگوئی و افترا پردازی و نافہمی و از ما بجز صبر و تسلیم و رضا دیگر چہ توقع بود۔
انصاف را از دست ندہیم و باکسی بدظنی روا نبدارم۔ دوستانِ دشمن نمائے من بد نیستند، حق بجانبِ شاں ہم
ست، چو آنہا سخنے می شنوند و راہے می بینند کہ گاہے از خود شاں نشنیدہ و ندیدہ بودند۔ دیرینہ غلطی ہائے ما
رفتہ رفتہ استحکامِ آیاتِ قرآنی بہم رسانیدہ بلکہ از اں ہم مستحکم تر گشتہ۔ پس کسے کہ ایں اغلاط را وانماید چگونہ از غیظ
و غضبِ شاں مصئون و از سب و شتمِ شاں مامون تواند شد۔ آنہا از معارضاتِ طبیانِ علل دیگر کہ بر ایں غلط ہائے
دیرینہ ما وارد ساختہ آں را بہ اسلام نسبت می دہند، واقف نیستند، و از اں مشکلات کہ باعتبارِ علومِ جدیدہ و
تحقیقاتِ جدیدہ بر اصولِ مقررۂ اسلافِ ما از فقہا و محدثین و مفسرین واقع میشود نہ بر اصلِ اسلام اطلاع ندارند۔
بگوشِ شاں و بگوشِ اسلافِ شاں بتقابلِ سخن ہائے خود شاں بجز کلمۂ آمنا و صدقنا صدائے دیگر نہ رسیدہ۔ یک گونہ
خلفشارے در عہدِ خلفائے عباسیہ بسببِ تراجمِ فلسفۂ یونان بہم رسیدہ بود، علمائے اسلام بمدافعتِ آں برخاستند
تعجب ایں کہ ہم خود معترض بودند و ہم خود مجیب، مخالفے بمقابل نہ داشتند، خود گفتند و خود شنیدند و دانستند کہ فتح یافتند۔
قبول می کنم کہ فتح یافتند مگر حالا نہ آں مدعیان اند و نہ آں دعویٰ، نہ آں جام ست نہ آں ساقی، نہ آں بادہ ست نہ آں
مینا خود آں فلسفہ از پا درافتادہ است و آں جام و مینا شکستہ، بنائے نو بر اساسِ نو بپا شدہ۔ پس کسے کہ دعویٔ
اسلام دارد و اسلام را حق میداند و غلط را در آں امکان نمی پندارد، چگونہ آں غلط ہا را باور کند و اسلام و اسلامیان
را رسوا سازد۔ پس ایں دو انکار آں و آں ما در تکفیر ایں معذور اند، و ایں امریست کہ فطرتِ انسانی انسان را بر آں
مجبور نمی سازد۔ بر ایں رہبری یعنی دلیل ما را واجب و لازم ست کہ ہمہ مکفران و لاعنینِ خود را معذور داریم، و از
سب و شتمِ شاں رنجیدہ نہ شویم و صدق و صفا را پیشۂ خود داریم و ہمہ را معاف کنیم تا از مواخذۂ عقبیٰ و داوریٔ داورِ

بے ہمتا ہم امین باشند۔ امّا مخالفت وافترا نسبت بہ مدرسۃ العلوم کہ کارِ صلاح وفلاحِ قومی ست عفوِ آں بہ اختیارِ من نیست کہ حقوقِ عباد برگردنِ شاں ست۔ او شاں دانند وخدائے شاں قل کفیٰ باللہ بینی وبینکم شہیدا یعلم ما فی السمٰوات والارض والذین اٰمنوا بالباطل وکفروا باللہ اولٰئک ھم الخاسرون۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

العبد المفتقر الی اللہ الصمد

سیّد احمد

کبھی کبھی وہ اُردو تحریروں میں بھی ایک آدھ فقرہ فارسی کا لکھ دیتے تھے جو لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ سیّد مہدی علی خاں نے اُن کو ولایت سے خط بھیجا ہے جس میں کسی موقع پر سرسیّد کی طرف خطاب کر کے یہ مصرع لکھا ہے "آں کہ بیابت خلقیست تماشائی" اُس کے جواب میں سرسیّد جب کہ ہندوستان میں اُن پر لعن وطعن کی بھرمار ہو رہی تھی، اُن کو لکھتے ہیں "در مصرعۂ اوّل کہ خطاب بہ من فرمودہ اند اگر بجائے لفظ دیدارت احوالت بودے نہایت مناسبِ حالِ من بودے "آں کہ بہ احوالت خلقیست تماشائی" اگر غم است ہمیں قدر است کہ نمی دانم خدائے من تماشائے کدام احوالِ من می کند۔ انّہ ھو الغفور الرحیم۔

گناہِ من ار نامدے در شمار ترا نام کے بودے آمرزگار!

اے خدائے من! اے رحیم وغفورِ من! اے محبوب ومطلوبِ من! خلق را بگذار ہرچہ خواہد تماشائے من کند تو مرا نیک تماشا کن۔

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من

آہ چہ گفتم وکجا رفتم خدائے من از من جدا نیست، مرا گذاشتن نمی تواند، پس چرا پریشاں شوم چرا اندیشہ کنم، حمد وثنائے اُو ہرایم کہ عین حمد وثنائے خود ست، منصور انا الحق گفت پایہ بلند داشت، من ہرف الحق گویم او خدا از من بشنود مستجاب کن "

فارسی میں بھی سرسیّد کی قلم اُسی آزادی سے چلتی تھی جیسے اُردو میں۔ وہ اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ کوئی لفظ اہلِ زبان کے محاورے کے خلاف نہ لکھا جائے لیکن اصل مطلب بہت صفائی اور بے تکلّفی سے ادا کر جاتے تھے۔ مثلاً جس طرح اردو میں اے حرف ندا کی جگہ او کا لفظ خاص خدا کے لئے استعمال کرتے تھے اسی طرح فارسی میں بھی یہی لفظ بول جاتے تھے۔ اُردو میں تو اتنی گنجائش بھی تھی کہ نہایت

بے تکلف اور لنگوٹیے یار کو او کہہ کر پکار سکتے ہیں مگر فارسی میں کہیں بھی او کا لفظ اے کی جگہ استعمال نہیں کرتے۔
اسی طرح اور بھی بعض الفاظ ان کی فارسی تحریروں میں محاورے کے خلاف نظر آتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مطلب کو وہ جس طرح اُردو میں بے تکلف ادا کر سکتے تھے اسی طرح فارسی میں کر سکتے تھے۔

پبلک سپیکنگ

پبلک سپیکنگ (یعنی مجمع عام میں اسپیچ یا لیکچر دینا) یہ بھی منجملہ اُن اوصاف کے ہے جو سرسید اور اُن کے معاصرین میں مابہ الامتیاز تھے۔ مشہور ہے کہ تین چیزیں تین چیزوں کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ قوتِ نظری قوتِ عملی کے ساتھ، ذہن حافظے کے ساتھ اور تحریر تقریر کے ساتھ یعنی سوچنے والے اکثر کام کرنے والے نہیں ہوتے، اسی طرح ذہین آدمی قوی الحفظ کم ہوتے ہیں اور اسی طرح جن کی قلم میں زور ہوتا ہے اُن میں قوتِ گویائی نہیں ہوتی۔ مگر یہ عجیب وغریب شخص جیسا سوچنے والا تھا ویسا ہی بولنے والا تھا۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

سرسید کی تقریر کی نسبت یہ ریمارک کیا گیا ہے کہ اُن کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی قوتِ تقریر تھی اور جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ تحریر کا اثر مدت کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور صرف محدود آدمی اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ بخلاف تقریر کے کہ اُس کا اثر آنِ واحد میں بجلی کی طرح تمام سامعین کے دلوں میں دوڑ جاتا ہے۔ تحریر ہر شخص پر جو اس کو پڑھتا ہے فرداً فرداً اثر کرتی ہے اور اس لئے وہ اثر ایک سے دوسرے میں سرایت نہیں کرتا، مگر تقریر کا اثر تمام مجلس پر دفعۃً اور واحدۃً پڑتا ہے اور اس لئے تمام حاضرین ایک دوسرے کی حالت سے متاثر ہوتے ہیں۔ تحریر میں اثر کرنے والے صرف الفاظ اور معانی ہوتے ہیں اور تقریر میں ان کے ساتھ سپیکر کا لب ولہجہ، اُس کی طرزِ ادا، اُس کی آواز کا سوز وگداز اور اس کے اعضاء وجوارح کی حرکات بھی شامل ہوتی ہیں اور اس کا تماشا ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

سرسید نے پنجاب کا پہلا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا تھا جب کہ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے پورے تین برس گذر چکے تھے، اُس وقت راقم بھی لاہور میں موجود تھا۔ بلاشبہ جس گرمجوشی کے ساتھ اہلِ لاہور نے سرسید اور اُن کے ہمراہیوں کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا تھا اور جس چاؤ اور امنگ اور فیاضی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ اُن معزز مہمانوں کی مدارات کی گئی اور جس شوق سے بیرونجات کے لوگ سید صاحب کی آمد آمد سن کر لاہور میں آئے اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ فی الواقع تہذیب الاخلاق نے سرسید اور اُن کے کام کی عظمت کا نقش عموماً اہلِ پنجاب کے دل پر بٹھا دیا ہے۔ مگر ۲۹ دسمبر کو جو لیکچر کہ سید صاحب نے راجہ دھیان سنگھ کے

دیوان خانے میں جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا، اُس کا سماں مجھ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتے کا سا عالم تھا۔ کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا جو زار وقطار نہ روتا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اگر میرا قیاس غلط نہ ہو تو میرے نزدیک جو اثر تہذیب الاخلاق نے تین برس میں اہلِ پنجاب پر کیا تھا، اُس لیکچر نے دو تین گھنٹے میں اس کو دو چند کر دیا۔ خصوصاً مندرجہ ذیل الفاظ نے تمام حاضرین کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔ انہوں نے کہا۔

"اے بزرگانِ پنجاب! میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں، مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اُس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوہڑے، چمار، قلی، کافر، بُت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اُس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اُس کا بنانے والا یا اُس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ کیا آپ صاحب مجھ بدبخت نامہ سیاہ کی شامتِ اعمال سے اپنی تمام قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلٍ ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحب میری حالت کو بدتر جانتے ہو اس سے عبرت پکڑو اور برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کرو۔"

یہی الفاظ جو اس وقت معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اُس موقع پر جب سر سید کے منہ سے نکلے تھے ان میں کچھ اور ہی جادو بھرا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں لفظوں اور معنوں کے سوا کچھ اور چیز بھی ہوتی ہے جو تحریر میں نہیں ہوتی۔

---

(۱) ایک صاحب جو غالباً نارمل سکول لاہور میں ہیڈ ماسٹر تھے اور سو، ڈیڑھ سو سے زیادہ تنخواہ نہیں پاتے تھے انہوں نے پانسو روپیہ چندے کی فہرست میں لکھا تھا۔ (۲) ۔ (مولانا حالی کا یہ اشارہ مولانا صلاح الدین احمد کے والد مولوی احمد بخش صاحب کی طرف ہے)

سرسید کے اخیر زمانے میں کسی لائق یورپین نے ان کے لیکچروں پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اگر یہ سچ ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ اچھا وہی ہے جس کا انجام اچھا ہو، تو جو کامیابی سرسید کو بذریعہ اپنی لاثانی فصاحت کے حاصل ہوئی ہے اُس سے اُن کی نیک دلی اور اسلامی حیثیت کامل طور پر ثابت ہوتی ہے۔ ان کے لیکچروں نے عجیب و غریب اثر کیا ہے اور اس فصاحت کے بحرِ ذخار نے انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے اس کا پورا پورا اندازہ کرنے کے لئے تھوڑی دیر کو قوم کی اس دردناک حالت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ لینا کافی ہے جب کہ سرسید کی فصاحت و بلاغت نے ان لکچروں کی صورت میں اپنا متن شروع کیا۔

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ "وہ (یعنی سرسید) ایک پیدائشی اوریٹر ہیں۔ جب وہ اپنے خاص مقصد کے متعلق جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو اُن کی طرزِ تقریر مسٹر گلیڈسٹن سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں اُن کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیر ہو جاتا ہے اور یہ تمام درد و غم کی علامتیں ان کے سامعین پر بجلی کی طرح اثر کرتی ہیں۔"

قومی اور ملکی مجمعوں میں سپیچ یا لیکچر دینے کا طریقہ قدیم زمان، روما اور عرب میں برابر جاری تھا اور زمانۂ حال میں فرانس، انگلینڈ اور امریکہ میں نہایت ترقی پر ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہندوستان میں انیسویں صدی سے پہلے کہیں اس کا سراغ پایا نہیں جاتا اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب تک سلطنت کی طرف سے رعایا کو ہر قسم کے خیالات اور رائیں ظاہر کرنے کی آزادی نہیں ہوتی، کسی ملک میں عمدہ اوریٹر یا سپیکر پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جب سے برٹش گورنمنٹ نے اس ملک میں آزادی کا سایہ ڈالا ہے یہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جن میں سے بعض بنگالی لیڈروں نے پبلک سپیکنگ میں بڑی شہرت حاصل کی ہے لیکن جہاں تک سنا گیا ہے ان لوگوں کی تمام اوریٹری اور فصاحت انگریزی زبان پر منحصر ہے گویا جو سڑک برک پٹ اور فاکس وغیرہم تیار کر گئے ہیں، آنکھیں بند کر کے اُسی سڑک پر پڑ لئے ہیں، اپنی زبان میں کوئی داغ بیل نہیں ڈالی۔ سید احمد خاں پہلا شخص ہے جس نے اپنی ملکی زبان میں پبلک سپیکنگ کی راہ نکالی ہے۔ نہ وہ انگریزی جانتا تھا جس میں بڑے بڑے اوریٹروں اور فصیحوں کے لکچروں اور اسپیچوں کے نمونے موجود تھے اور نہ ان اصول و قواعد سے واقف تھا جو یورپین زبانوں میں اس فن کی تکمیل کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اور نہ اپنی زبان میں کوئی ایسی مثال دیکھی تھی جس سے اس راہ میں

کچھ مدد ملتی۔ جس طرح اُس کے تمام اوصاف فطری اور پیدائشی تھے اسی طرح اسپیکنگ کی لیاقت بھی محض خداداد تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اسپیچ یا لیکچر کے لکھنے، یا پہلے سے اُس کے تیار ہونے کا بالکل محتاج نہ تھا۔ ہم پہلے حصّے میں جہاں انگلستان کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے، لکھ چکے ہیں کہ سٹوئین سوسائٹی آف سول انجینیرس کے سالانہ جلسے میں جہاں انگلستان کے متعدد ڈیوک اور لارڈ اور بڑے بڑے انجینیروں کی تقریریں ہو چکیں، سرسید نے ایک ایسے فن کے متعلق جس سے وہ محض ناآشنا تھے ایسی برجستہ تقریر کی کہ تمام اہلِ جلسہ اُس کی داد دیتے دیتے تھک گئے اور اس تقریر کرنے کا خیال ان کو اس وقت پیدا ہوا جب جلسے کے اختتام پر پریذیڈنٹ نے اُن کے آنے کا شکریہ اور خوشی ظاہر کی اور اس کا جواب دینا ضرور ہوا۔

جو لیکچر کہ سرسید نے ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا وہ سب سے بڑی شہادت ان کے پیدائشی اور اسپیکر ہونے کی ہے۔ لاہور کے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے سرسید کی منظوری کے بغیر پروگرام میں لیکچر دینے کی تاریخ چھپوا دی تھی اور سرسید چند وجوہ سے جن کا ذکر سفرنامۂ پنجاب میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، مذہب پر لیکچر دینا ہرگز نہیں چاہتے تھے مگر لوگوں کے اصرار سے اُن کو مجبوراً ماننا پڑا۔ لیکن نہ اُن کو زیادہ غور کرنے کی مہلت ملی اور نہ کچھ لکھنے کی نوبت آئی۔ کیونکہ ملاقاتیوں کا صبح سے رات کے دس بجے تک برابر تانتا بندھا رہتا تھا۔ باوجود اس کے جب اس طول طویل لیکچر کو دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح بغیر قلمبند کئے ایسی عمدگی اور حسنِ ترتیب کے ساتھ ایسے پیچ در پیچ اور نازک مطالب کو یوں سلجھا کر بیان کیا ہوگا؟ کیونکہ وہ کوئی معمولی وعظ نہ تھا۔ بلکہ ان تمام شبہات کا جواب دینا تھا جو سرسید کے مذہبی خیالات کی نسبت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھے یا ان دلائل کا بیان کرنا تھا جن سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اسلام کی سچائی کا یقین ہو۔ یا اُن ضرورتوں کا ذکر کرنا تھا جنھوں نے سرسید کو تفسیرِ قرآن لکھنے پر مجبور کیا اور ان سب باتوں کے بیان کے لئے بہت کچھ غور و فکر اور مہلت درکار تھی۔ سفرنامۂ پنجاب کے مؤلف سید اقبال علی لکھتے ہیں کہ "مجھ کو سید صاحب سے اکثر ملنے اور بات چیت سننے کا اتفاق ہوا ہے میں نے اس قدر مؤثر کلام ان کا بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔"

یہ تو اس لیکچر کا حال ہے جو مذہب پر دیا گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ عجیب وہ پولیٹکل لیکچر تھا جو نیشنل کانگرس کے خلاف انھوں نے لکھنؤ میں دیا تھا۔ ہم نے سنا ہے کہ اس کا خیال اُن کو چند گھنٹے پہلے

ہوا تھا۔ باوجود اس کے وہ ایسا جامع اور مدلل اور پُر زور تھا کہ اُس کے بعد ہزاروں تحریریں اور تقریریں اس باب میں اس کے موافق اور مخالف ہوئیں مگر اُس کے آگے سب ہیچ تھیں۔

افسوس ہے کہ سرسید کی بہت سی اسپیچیں اس سبب سے کہ اردو زبان کے لئے شارٹ ہینڈ (یعنی مختصر نویسی) کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا تلف ہو گئیں، ورنہ جس قدر ان کی اسپیچیں اخباروں میں چھپی ہوئی موجود ہیں، اسی قدر بلکہ شاید ان سے بھی کچھ زیادہ ایسی ہوں گی جو قلمبند نہیں ہوئیں۔ بارہا لوگوں نے اُن سے چاہا کہ آپ اپنی اسپیچ پہلے لکھوا لیا کریں اور جلسے میں اُس کو پڑھ دیا کریں۔ مگر خاص خاص حالتوں کے سوا انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ لکھی ہوئی اسپیچ کا جلسے میں پڑھنا مجھے وبال معلوم ہوتا ہے، طبیعت کی آمد رُک جاتی ہے اور جوش اور ولولہ باقی نہیں رہتا۔ سفرنامہ پنجاب میں ان کی جس قدر اسپیچیں اور لیکچر چھپے ہوئے ہیں ان میں ایک بھی غالباً ایسا نہیں جو انہوں نے لکھ کر پڑھا ہو۔ سب برجستہ اور برمحل زبانی تقریریں کی گئی تھیں جو سید اقبال علی کی حیرت انگیز زود نویسی کے سبب قلمبند ہو گئیں، ورنہ یہ بھی سب تلف ہو جاتیں۔

سرسید کی سب سے زیادہ زوردار اور مؤثر وہ اسپیچیں ہوتی تھیں جو کسی پبلک جلسے میں اپنی رائے کے خلاف بہت سی تقریریں سن کر نہایت جوش کی حالت میں بے ساختہ ان کے منہ سے نکلتی تھیں خصوصاً تعلیمی معاملات میں ان کی رائے یا پالیسی کے خلاف کسی جلسے میں تقریریں ہوتی تھیں تو خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہو یا ایجوکیشن کمیشن کا، یا سینٹ کی مجلس ہو یا سنڈیکیٹ کا جلسہ ہو اس وقت عنانِ صبر ان کے ہاتھ میں نہیں رہتی تھی۔ ان کی آواز سے تمام ہال گونج اٹھتا تھا اور فریقِ مخالف اُن کے رعب میں دب جاتا تھا۔ مگر باوجود اس قدر جوش و خروش کے اُن کی تقریر کبھی تہذیب و شائستگی کی حد سے متجاوز نہ کرتی تھی۔ بے شک اپنے قومی جلسوں میں وہ اکثر مسلمانوں کو نفرین و ملامت کرتے تھے مگر اس میں دل سوزی اور ہمدردی کا پہلو اس قدر غالب ہوتا تھا کہ نفرین و ملامت کسی کو ناگوار نہ ہوتی تھی۔

وہ فرمائشی لیکچر دینا اور فرمائشی اسپیچ کرنی بالکل نہیں جانتے تھے اور وقت کی راگنی کے سوا کوئی راگنی نہ گا سکتے تھے۔ کبھی کبھی جو بعض اشخاص اُن کو کسی ایسی تقریر کرنے پر جس کا اُن کی طبیعت میں کچھ جوش نہ ہو مجبور کرتے تھے اور سرسید کو اُن کی خاطر بھی عزیز ہوتی تھی تو وہ بادلِ ناخواستہ صرف اُن کی ہٹ دھرمی پوری کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مگر جو تقریر وہ کرتے تھے اُس میں کچھ جان نہ ہوتی تھی۔

سرسید کی طبیعت کا جوشیلا پن جیسا کہ اُن کی اسپیچوں سے ثابت ہوتا ہے ایسا اور کسی چیز سے ثابت نہیں ہوتا۔ اسپیچ کرتے وقت جہاں کہیں ایسا موقع آجاتا تھا اُن سے طبیعت کا ابال ضبط نہ ہو سکتا تھا۔ لاہور میں جو آخری دفعہ ان کا جانا ہوا اور وہاں کسی موقع پر تقریر کرتے وقت ان کو جوش آیا اُس وقت ان کی حالت ایسی متغیر ہوگئی کہ وہ فوراً خاموش ہوکر بیٹھ گئے اور اس روز کھانے کی طرف مطلق رغبت نہیں ہوئی۔ ہم نے سنا ہے کہ ڈاکٹر نے اُن کی یہ حالت دیکھ کر سخت ممانعت کر دی تھی کہ آپ پبلک جلسوں میں اب تقریر کرنی چھوڑ دیں ورنہ جان کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے مختصر تقریروں کے سوا کہیں کوئی لمبی اسپیچ نہیں دی۔

سرسید میں وہ تمام اوصاف جمع تھے جو ایک اوریٹر میں ہونے ضروری ہیں۔ اُن کا حافظہ فطرۃً نہایت قوی تھا، گو آخر عمر میں بسبب کبر سن کے نسیان پیدا ہو گیا تھا، مگر بچپن اور جوانی اور کہولت کے زمانے کے واقعات اور معلومات سب از بر تھے اور اس لئے ان کی جنرل انفورمیشن نہایت وسیع تھی اور چونکہ واقعات سے نتائج استخراج کرنے کا اعلیٰ درجے کا مادہ خدا نے دیا تھا، اس لئے ان کی معلومات میں اور بھی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر ایک معاملے کی نسبت جو کہ اُن کو پیش آتا تھا، خواہ وہ مذہب سے متعلق ہو، خواہ رسم و رواج اور معاشرت و اخلاق سے، خواہ پالٹکس سے اور خواہ تعلیم سے، وہ ایک مستقل اور غیر مذبذب رائے اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور اس لئے کسی معاملے پر ان کو زیادہ غور کرنے کی بہت ہی کم ضرورت ہوتی تھی اور اگر کبھی ایسی ضرورت ہوتی تھی تو ذہن بہت جلد نتیجہ تک پہنچ جاتا تھا۔ تصور کی قوت کا یہ حال تھا کہ تقریر کرتے وقت تمام پوائنٹس جو ان کو اپنی اسپیچ میں بیان کرنے منظور ہوتے تھے گویا سب مسلسل اور ترتیب وار ان کے ذہن میں موجود ہوتے تھے اسی لئے ہم نے نہیں دیکھا کہ جس طرح عام سپیکر ایک پرچے پر کچھ نوٹس قلمبند کر لیتے ہیں اور تقریر کے وقت ہر ایک پوائنٹ پر اُسی ترتیب سے گفتگو کرتے ہیں۔ سرسید نے کبھی ایسا کیا ہو۔ ان کو بہ نسبت ایک کاغذ کے پرچے کے اپنی ذہنی ترتیب پر زیادہ بھروسہ تھا۔ اس کے سوا چہرے کی بناوٹ جو کہ وجاہت اور ہیبت و وقار کی بولتی تصویر تھی اور آواز کی گونج جس میں جوش کے وقت شیر کی گرج محسوس ہوتی تھی، یہ دو بڑے معاون اُن کے بیان کی تاثیر کے تھے۔ پھر زبان پر پوری قدرت اور ہر مطلب کے دلنشیں کرنے کا خداداد سلیقہ اور عین وقت پر مناسب الفاظ کا سوجھ جانا اُن کی خصوصیات میں سے تھا۔ مگر سب سے بڑی چیز جو اُن کو دیگر سپیکروں سے علانیہ ممتاز ٹھیراتی ہے وہ قومی ہمدردی کا سچا جوش اور ولولہ تھا جس کے سبب جو بات منہ سے نکلتی تھی وہ دل سے اٹھتی تھی اور دل ہی میں جا کر بیٹھتی تھی۔

سرسید کی سحر بیانی خاص کر اُن لکچروں اور اسپیچوں سے زیادہ ثابت ہوتی ہے جو انھوں نے مدرسہ کے قیام کی ابتدائی کوششوں کے وقت مختلف مقامات میں دی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ قوم اور قومیت کے اصلی مفہوم سے محض ناواقف تھے اور قومی کاموں میں مدد دینا جب کہ اُس سے ثوابِ اُخروی کی توقع نہ ہو، محض فضول جانتے تھے اور اس لئے انگریزی تعلیم میں جس کو وہ خلافِ مذہب سمجھتے تھے، مدد ملنے کی ان سے ہرگز توقع نہ تھی۔ اُن کو اس بات کا یقین دلانا قریب ناممکن کے تھا کہ قوم کی خدمت کرنا بعینہٖ اپنی اور اپنے خاندان کی مدد کرنا ہے۔ وہ اس بات سے محض بے خبر تھے کہ انگریزی تعلیم کو قومی ترقی میں کیا دخل ہے۔ اور سرکاری نوکری کے سوا اُس سے تجارت و صنعت اور تمدن اور معاشرت میں کیا مدد ملتی ہے۔ اُن کو اس بات کا سمجھانا نہایت مشکل تھا کہ دین کا اعزاز اور دین کی ترقی بغیر دنیوی ترقی کے ناممکن ہے۔ دولت مند اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہم کو اپنی اولاد کی تعلیم کی کیا ضرورت ہے اور متوسط اور ادنیٰ درجے کے لوگ سرکاری مدارس کو اُن کی تعلیم کے لئے کافی سمجھتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی ضرورت تو عام ذہنوں سے اس قدر بعید تھی کہ اب تک بھی مستثنیٰ شخصوں کے سوا لوگ اُس کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ گورنمنٹ کالجوں اور سکولوں کو چھوڑ کر خاص قوم کے لئے روپیہ سے کالج قائم کرنے کی ضرورت اور مصلحت سے سب بے خبر تھے۔

یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے خیالات اُس ابتدائی حالت میں عام مسلمانوں کے ذہن سے محض اجنبی اور ناآشنا تھے جن کا لوگوں کے ذہن نشین کرنا خاص کر اُس شخص کو جس کی طرف سے قوم میں عموماً بدگمانی پھیلی ہوئی ہو حد سے زیادہ دشوار تھا۔ جن باتوں کو سمجھانے کے لئے آج کل کی اسپیچوں میں صرف اجمالی اشارے کافی ہوتے ہیں اُس وقت اُن کو الف بے تے سے شروع کرنے اور اصل مقصد سے پہلے لمبی لمبی تمہیدیں اٹھانے کی ضرورت تھی۔ باوجود اس کے سرسید نے جس صفائی سے ان تمام خیالات کو اپنی ابتدائی اسپیچوں میں بیان کیا ہے اس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ جو باتیں لوگوں کے ذہن سے اس قدر بعید تھیں اُن کو ایسی خوبی سے سمجھایا ہے کہ کوئی بات اجنبی نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا بھولی ہوئی باتوں کو ایک شخص یاد دلا رہا ہے اور جو نقش دھندلے ہو گئے تھے اُن کو اجال رہا ہے۔ ان اسپیچوں پر بالکل اس شعر کا مضمون صادق آتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بنی ریڈنگ کے جلسے میں اُس نے اِس بات کے سمجھانے کو کہ دولت مندوں کی اولاد کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے رئیسوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اے رئیسو اور اے دولت مندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کی بری حالت ہو مگر ہمارے بچوں کے لئے سب کچھ ہے۔ یہی اُن لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لئے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔"

ایک دوسری اسپیچ میں اس مطلب کو اس طرح بیان کیا ہے "نواب خلیل اللہ خاں شاہجہانی کا نام آپ لوگوں نے سنا ہوگا۔ اُن کے پڑوتے کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ لوگوں کے پاؤں داب نے آتا تھا اور دو چار پیسے لے جاتا تھا۔ تغلق آباد میں جس قدر گھسیارے آباد ہیں۔ جو سارا دن گھاس کھود کر شام کر دیتے ہیں، میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد میں سے ہیں۔ دنیا میں گزرے ہوئے زمانے کے واقعات سے ہم کو عبرت اور نصیحت پکڑنی چاہیئے۔ دیکھو ہوشیار ہو۔ یہی حال ہماری قوم کا ہونے والا ہے۔ کوئی آثار بھلائی اور بہتری کے اُن میں نہیں دکھائی دیتے، بلکہ برخلاف اس کے تنزل اور ادبار کی علامتیں موجود ہیں۔"

ایک اور موقع پر رئیسوں کو بورڈنگ ہاؤس میں اولاد کے رکھنے کی ضرورت اس طرح سمجھائی ہے "اے صاحبو! تعلیم و تربیت کی مثال کمہار کے آوے جیسی ہے کہ جب تلک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چُنے جاتے اور ایک قاعدہ دان کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے وہ کبھی نہیں پکتے۔ پھر اگر تم چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکا لو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ تم خیال کرو کہ جناب ملکۂ معظمہ وکٹوریہ کو کس قدر دولت و حشمت اور سلطنت اور اختیار حاصل ہے۔ ان کے بعد اسماعیل پاشا خدیو مصر کو دیکھو کہ کیا کچھ دولت و حکومت ان کو حاصل ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی اولاد کی پوری تعلیم اپنے گھر پر نہیں کر سکتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضور پرنس آف ویلز فرزندِ ارجمند ملکۂ معظمہ اور ولی عہد ہند و انگلینڈ یونیورسٹی آکسفورڈ کے ایک طالب علم ہیں اور جس زمانے میں کہ میں لندن میں تھا میں نے اپنی آنکھ سے حسن پاشا خدیو مصر کے فرزند کو دیکھا کہ یونیورسٹی آکسفورڈ میں تعلیم پاتے تھے۔ لباس شاہی اور تاج خسروی سے یہ والا قدر شاہزادے طالب علمی کے لباس کو اور چوکونیا سلیٹ ٹوپی کو جو اس یونیورسٹی میں طالب علموں کے لئے مقرر ہے زیادہ معزز سمجھتے تھے۔"

ایک دوسرے موقع پر تعلیم کے اخراجات کی ضرورت اس طرح جتائی ہے "آہ کیا افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے عزیز بیٹے کی بسم اللہ میں ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہو اس خوشی میں کہ ہمارا بیٹا پڑھنا شروع کرنے کے لائق ہوا۔ مگر اس جگہ کے بنانے اور قائم کرنے کی کچھ فکر نہیں کرتے جہاں وہ پڑھے اور تمہاری اُس خوشی کو جو

قبل از وقوع تم نے اس کو فرض کر لیا ہے، پورا کرے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بغیر بوئے ہم کھیتی کے کاٹنے کی توقع کرتے ہیں اور جس غلطی میں پڑے ہیں اُس کی درستی کی کچھ فکر نہیں کرتے۔"

ایک موقع پر قومی امداد کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے یہ تمثیل بیان کی ہے۔ "انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر کے بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا، پاؤں نے کہا کہ میں کیوں کر چل کر غذا بہم پہنچاؤں؟ ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو منہ تک پہنچائیں؟ آنکھوں نے کہا کہ ہم اُس میں کے بال مکھی کیوں دیکھیں؟ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا مذا ہونا میں کیوں سونگھوں؟ منہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں؟ سب آپ آپ کو ے کر چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جُوں توں گزر گئے، پھر تو پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ ہاتھ کانپنے لگے، منہ ہلنے کی طاقت نہ رہی۔ آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا، تب تو سب گھبرائے کہ یہ کیا ہوا۔ اس وقت عقل کے پاس گئے اُس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ تم نے جانا کہ دُوسرے کے کام سے ہم کو کیا مطلب ہے؟ حالانکہ وہ حقیقت میں تمہارا ہی کام تھا اور اُس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ اسی طرح سمجھو کہ اگر ہر ایک ضلع کے مسلمان یہ خیال کریں کہ دوسرے ضلع کے کالج میں مدد کرنے سے ہم کو کیا فائدہ ہے تو نہایت بڑی غلطی اور حقیقت میں اپنا ہی نقصان ہے۔"

ایک اور جگہ گورنمنٹ مدراس نے جو تحقیقات وہاں کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی اُس کا ذکر کرنے وقت انھوں نے کہا کہ "اُس چیٹھی میں ترچناپلی کے مسلمانوں کا یہ حال مندرج ہے کہ "خاص مانع ترقی تعلیم مسلمانانِ ترچناپلی اُن کا افلاس ہے جس میں بہت سے مسلمان مبتلا ہیں۔ گو وہ مفلس ہیں مگر مغرور ہیں۔ جب میں نے ریمی صاحب چیٹھی نے مسلمانوں کے لڑکوں کو بلا فیس اسکول میں داخل کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ کپڑے اُن کے پاس نہیں ہیں اور بغیر کپڑا پہنے وہ نہیں آسکتے۔ غریب سے غریب مسلمان ہرگز اپنے لڑکوں کو ویسے آدھے ننگے پن کی حالت میں باہر نہ آنے دے گا جیسے کہ بڑے دولت مند ہندو اپنے لڑکوں کو مدرسوں میں بھیج دیتے ہیں۔"

اے عزیزو! اب اس سے زیادہ کون سی بدبختی اور بدنصیبی ہے جس کے مسلمانوں پر آنے کی تم راہ دیکھتے ہو؟۔ اگرچہ ہم ان غریب محتاج بھائیوں کی غیرت پر فخر کرتے ہیں اور وہ جو اپنی عزت اور شرم کا لحاظ کرتے ہیں حد سے زیادہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ پاک خون جو مسلمانوں کی نسل میں ابراہیم خلیل اللہ سے چلا آتا ہے اُن میں بھی ہے، مگر ان کی مصیبت پر دل لرز جاتا ہے اور ہم کو اپنی زندگی تلخ معلوم ہوتی ہے اور تمام عیش و آرام خاک میں مل جاتا ہے اور رکون

تم میں سے ایسا ہے کہ ایسی دردناک حالت اپنی قوم کی سُنے اور اُس کا دل نہ بھر آئے ؟ اے بھائیو! ان تمام واقعات سے میں اُن لوگوں کو جو اپنی اولاد کی اور اپنی قوم کی تربیت کی کچھ پروا نہیں کرتے، خبردار کئے دیتا ہوں کہ دیکھو کیا ہوا!! اور سمجھو کہ آئندہ کیا ہوگا!!

اسی طرح سرسید نے اپنی ابتدائی اسپیچوں میں طرح طرح سے قومی تعلیم کی طرف لوگوں کو متوجّہ کیا ہے۔ یوروپ کی تمام ترقیات کی جڑ تعلیم کو قرار دے کر اس کی ترغیب دی ہے۔ کہیں تمام ہندوستانیوں کو متفق ہو کر خود اپنی تعلیم کا بوجھ اٹھانے کی تاکید کی ہے۔ کہیں ہندوستان کے اُمراء کی فیاضی کا یوروپ کے دولتمندوں کی فیاضی سے مقابلہ کر کے اُن کو حقیقی فیاضی کے مفہوم سے خبردار کیا ہے۔ کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اسلاف کی علمی ترقیات کا ذکر کر کے اُن کو غیرت دلائی ہے اور جہل و بے علمی کی حالت میں سلف کے علم و فضل پر فخر کرنے کی مذمت کی ہے، کہیں علوم قدیمہ کا علوم جدیدہ سے مقابلہ کر کے علومِ جدیدہ کی ضرورت ثابت کی ہے۔ غرض کہ جو کچھ زمانۂ حال کے سپیکر تعلیم کے متعلق عام مجمعوں میں بیان کرتے ہیں اُس میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہوگی جس کی بنیاد سرسید نے اپنے مشن کے آغاز کی اسپیچوں میں نہ ڈالی ہو اور گو کہ اب وہ عام اسپیچوں میں معمولی باتیں معلوم ہوتی ہوں، مگر سرسید کی ابتدائی اسپیچوں میں وہ عام ہندوستانیوں کے لئے بالکل نئی تھیں اور ایسی اہم اور ضروری تھیں کہ آج تک تمام سپیکر اسی بنیاد پر عمارت چُنتے چلے جاتے ہیں۔

شکل و شمائل، اوضاع و عادات، اخلاق و خصائل اور مذہب

شکل و شمائل سرسید کے چہرے کی بناوٹ اور بدن کی ترکیب اور تمام ہیأتِ مجموعی ایسی واقع ہوئی تھی کہ صرف ان کی صورت دیکھنے سے باطنی عظمت کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ جس نے کبھی ان کو نہ دیکھا ہو وہ بھی بغیر کسی قسم کے تعارف کے جب پہلی ہی بار اُن کو دیکھتا ہوگا تو ضرور ایک گریٹ مین تصوّر کرتا ہوگا۔ یہ بات مشہور ہے کہ خودداری اور تمکنت اور کسی چیز کو دیکھ کر تعجب ظاہر نہ کرنا اور اپنے تئیں لئے دیئے رہنا انگریزوں کی قومی خصلت ہے۔ مگر ایک دوست کا بیان ہے کہ سرسید جب نینی تال گئے ہیں تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ جس وقت ان کا جھپّان ہوٹل میں پہنچا اکثر انگریز مسافر جو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، اپنے اپنے کمرے سے ان کے دیکھنے کو باہر نکل آئے اور

جب تک سرسید اپنے کمرے کے اندر نہیں گئے۔ نہایت تعجب سے ان کو برابر دیکھتے رہے۔

کرنل گریہم نے ان کے چہرے کو شیر ببر سے مشابہ لکھا ہے۔ اس تشبیہ کو عموماً پسند اور تسلیم کیا گیا ہے بمبئی گزٹ میں کرنل گریہم کی کتاب پر جس کے اول میں سرسید کی تصویر چھاپی گئی ہے، ریویو کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ کتاب شروع کرنے سے پہلے ہم سید احمد کی طرف ایک لطف انگیز دل کی کشش پاتے ہیں، تصویر کیا ہے؟ گویا ایک شیر پُر رعب و باہیبت صورت کا بہادر اور دلیر ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ ہم حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ اُس قدیم جنگ جوئی کے زمانے میں اس شخص کا کیا پیشہ ہوتا جب کہ مسلمانوں کی بہادری نے منجملہ انسانی ضروریات کے قوم کی تعلیم کی ضرورت کا خیال ان کے دل میں نہیں پیدا ہونے دیا۔" ہم کہتے ہیں کہ اس کا جب بھی یہی پیشہ ہوتا جو اب تھا۔ وہی بہادری اور اولوالعزمی جو اگلے زمانے میں ملکوں کو فتح کراتی تھی یا لوٹ مار سکھاتی تھی وہی اب دلوں کو فتح کراتی ہے اور جہل و تعصب کو تاخت و تاراج کرتی ہے۔

سرسید کو جو صریح فوقیت اور امتیاز باعتبار جسمانی اور دماغی قابلیت کے اپنے عام ہمجنسوں میں تھا، یہ ایک عمدہ شہادت اس بات کی ہے کہ جو پیوند یا ازدواج دو اجنبی خاندانوں میں متحقق ہوتا ہے اُس سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سرسید کے پردادا ہرات کے سادات میں سے تھے جو شاہجہاں یا عالمگیر کے عہد میں ہندوستان میں آئے تھے اور ان کی ننھیال کے لوگ کشمیر سے بعنوانِ تجارت سلطنتِ مغلیہ کے اخیر زمانے میں اس ملک میں وارد ہوئے تھے۔ پس دونوں خاندانوں میں اوپر سے کوئی قرابت یا رشتہ نہ تھا، صرف دوستی اور ملاقات کے سبب جو سرسید کے دادا اور نانا میں تھی، ان کے والدین کا ازدواج وقوع میں آیا تھا۔ اب خواہ اس کو حسنِ اتفاق سمجھو اور خواہ نواب دبیر الدولہ کی دانشمندی کا نتیجہ قرار دو کہ انہوں نے اپنی بیٹی کے لئے ایسا بر انتخاب کیا جس کے صلب سے ایسا عجیب و غریب شخص پیدا ہوا۔

حلیہ

سرسید کا حلیہ یہ تھا، رنگ سرخ و سفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں، بھویں جدا جدا، آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بہت بڑی، ناک نسبتہً چہرے کی شان کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹی، کان لمبے، گلے میں دائیں جانب رسولی[1] جو ہمیشہ داڑھی میں چھپی رہتی تھی۔ چہرے کی ہیئت مجموعی باوجود عیوبِ

---

[1] سرسید کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی جس کی نسبت ان کا بیان تھا کہ حضرت شاہ غلام علی کی ہمت اور توجہ سے بالکل اچھی ہوگئی تھی۔

اور پُر رعب ہونے کے دل کش۔ جسم بہت فربہ، قد لمبا، مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ تھا۔ ہڈی چکلی، ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا نہایت قوی اور زبردست اور متناسب۔ بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من۔ عنفوانِ شباب میں رسولی نہ تھی اور بدن بھی زیادہ فربہ نہ تھا۔ بڑھاپے کی وجاہت دلالت کرتی تھی کہ جوانی میں بہت خوبصورت ہوں گے۔

اگرچہ سرسید کا چہرہ خاموشی اور فکر کے وقت نہایت عبوس اور ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا مگر بقول کرنل گریہم کے گفتگو کے وقت اس سے مسرت اور زندہ دلی اور گرم جوشی ٹپکتی تھی۔ جس طرح اخلاق میں مطلق تصنع نہ تھا، اسی طرح بات چیت میں بالکل بناوٹ نہ تھی۔ زبان دلی کی تھی مگر لب و لہجہ دلی کا سا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ محض سیدھے سادے طور پر عام فہم بول چال میں وہ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔ زبان قینچی کی طرح جلدی نہیں چلتی تھی اور نہ زیادہ محاورے یا لغت زبان پر آتے تھے۔

جب کسی نئے آدمی سے پہلی ملاقات ہوتی تھی تو وہ اور لوگوں کی طرح بات چیت کرنے کی تقریبیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں نکالتے تھے۔ اگر دوسرا کوئی بات پوچھتا تو جواب دے دیتے، ورنہ خاموش بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات اِس برتاؤ سے ناواقف آدمی ان کو مغرور سمجھتے تھے، مگر وہ کسی کی بدگمانی کے خیال سے اپنا نیچر نہیں بدلتے تھے۔

اوضاع و عادات

ولایت جانے سے پہلے اُن کا لباس ہندوستانی وضع کا رہا۔ مگر جب ولایت کا ارادہ کیا تو مسٹر مٹن نے جو ان کے دوست تھے، انگلستان سے اُن کو لکھا کہ یہاں آؤ تو ترکی لباس پہن کر آنا۔ اگر یہاں ہندوستانی لباس میں آئے تو یہاں کے لوگ تماشا بنا لیں گے۔ بظاہر انہوں نے اسی وجہ سے ترکی لباس اختیار کیا تھا مگر درحقیقت، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ تبدیلِ لباس کا ایک بہانہ تھا۔ وہ پہلے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک قومی لباس کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کر چکے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ترکی لباس سے بہتر کسی لباس کو نہیں سمجھا تھا۔

یورپین طریقے پر بود و باش رکھنا، کوٹھی، بنگلوں میں آبادی سے الگ رہنا، میز کرسی لگا کر کھانا کھانا انہوں نے ولایت جانے سے پہلے ہی اختیار کر لیا تھا۔ قطعِ نظر اس کے کہ یہ طریقہ انگریزوں کے میل جول کا ایک ذریعہ تھا۔ بڑا فائدہ اس سے یہ تھا کہ وہ ہندوستانی سوسائٹی میں رہ کر کوئی بڑا کام ہرگز انجام نہ کر سکتے تھے۔

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں ہوش سنبھالتا ہے اس کی رسموں اور طریقوں سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ ان میں اصلاح کی ضرورت اس کو کبھی محسوس نہیں ہوتی اور اگر بعض کو محسوس ہوتی ہے تو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ ان کو چھوڑ دیں یا ان میں کچھ تبدیل کر سکیں مگر سرسید کی طبیعت اس قاعدے سے مستثنیٰ تھی اور ایسی طبیعت والوں کی بدولت انسان وحشی چوپایوں کی حالت سے اس درجے تک پہنچا ہے۔ غدر کے بعد جب سے کہ ان کا میل جول انگریزوں کے ساتھ زیادہ ہوا، وہ اپنے ہاں کے طریقِ خورد و نوش کو ناپسند کرنے لگے اور اس کو بتدریج بدلنا شروع کیا۔ چنانچہ اوّل اوّل وہ عرب کے طریقے کے موافق فرش پر بیٹھ کر اور ایک چوکی پر جو زمین سے چند انچ اونچی ہوتی ہے کھانا رکھ کر کھاتے تھے۔ مگر ولایت سے واپس آنے کے بعد وہ میز کرسی پر کھانے لگے۔

مہمانداری

دوستوں اور مہمانوں سے ان کا دسترخوان بہت کم خالی ہوتا تھا۔ جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا وہ کھانا کھاتے وقت بشاش نہیں معلوم ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے اس دن ان کے گھر عید ہوتی تھی۔ اگرچہ مہمانوں کی خاطر و مدارات ان کی جبلّی خصلت تھی، مگر جب سے علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بنا اس وقت سے ان کا گھر مہمان سرا بن گیا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ ان کے ہاں کوئی مہمان نہ ہو۔ رات کے کھانے پر ان کے ہاں اکثر پُرلطف صحبت ہوتی تھی، مذہبی، علمی، تاریخی اور سوشل ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ ہنسی اور چہل کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ کھانوں میں زیادہ تعدّد اور تلوّن نہیں ہوتا تھا۔ مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا مل جاتا تھا خوشی سے بغیر ناک منہ چڑھائے سیر ہو کر کھا لیتے تھے۔ فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خربوزے نہایت مرغوب تھے۔ سنا ہے کہ پہلے خوراک زیادہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی۔ البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ پاؤ سیر دودھ دونوں وقت بلاناغہ پی لیتے تھے۔ پان زردہ کھانے اور حقہ پینے کی بہت عادت تھی، مگر ولایت جاتے وقت پان کھانا یک قلم ترک کر دیا تھا اور بجائے حقہ کے سگریٹ پینے لگے تھے۔

مسکرات سے پرہیز

کسی قسم کی مسکّرات کا تمام عمر میں انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ مرنے سے نو دس برس پہلے ایک دفعہ وہ سخت بیمار پڑے تھے، ڈاکٹر نے کوئی ہلکی سی شراب ان کے لئے تجویز کی، ان کے ایک دوست نے ان سے ڈاکٹر کی تجویز کا ذکر کیا، انہوں

نے شراب پینے سے انکار کر دیا اور مومن کا یہ شعر پڑھا -

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن   آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ " جب وہ (سرسید) لندن میں تھے ایک دفعہ ڈیوک آف آرگائل کے ہاں ڈنر پر بلائے گئے۔ جب شراب سامنے آئی تو انہوں نے کہا " میں نوح کی شراب نہیں پیتا، آدم کی شراب (یعنی پانی) پیتا ہوں "

صحت جسمانی

اگرچہ آخر عمر میں سرسید بتقاضائے سن بیمار رہنے لگے تھے لیکن اس سے پہلے اُن کی صحت ہمیشہ نہایت عمدہ رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں صحیح المزاج ہونے کے سبب اُن کو دوا ٹھنڈائی پینے کا بہت کم اتفاق ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ اگر دوا ذرا بدمزہ ہوتی تو وہ اس پیرانہ سالی میں بھی بچوں کی طرح ناک منہ چڑھائے بغیر نہیں پیتے تھے۔ عفت و پرہیزگاری اور محنت اور کھانے پینے میں مناسب احتیاط ان سب باتوں نے اُن کے مزاج کو اور بھی زیادہ اعتدال پر رکھا۔ بینائی اخیر تک عمدہ رہی، اگرچہ عینک لگانے کی عادت ہو گئی تھی مگر دن ہو یا رات لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف مثل جوان آدمیوں کے کرتے تھے۔ البتہ نسیان بڑھ گیا تھا۔ دانت بھی جھڑ گئے تھے چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت دشواری سے ہوتا تھا۔ کسی جلسے میں کھڑے ہو کر اب وہ چار منٹ سے زیادہ تقریر نہیں کر سکتے تھے۔ باوجود اس کے تصنیف اور تحریر کا کام جو بمنزلۂ ضروریہ کے ہو گیا تھا، اخیر دم تک برابر جاری رہا۔

میلے تماشوں سے نفرت

اگرچہ بچپن اور عنفوانِ شباب میں ان کو میلے تماشوں کا بہت شوق تھا۔ مگر جب سے بھائی کا انتقال ہوا تھا یہ شوق گویا بالکل جاتا رہا۔ صرف علمی تماشوں میں مثل سرکس یا تھیئٹر وغیرہ کے کبھی کبھی شریک ہو جاتے تھے۔ بایں ہمہ تھیئٹر کو ہندوستان کے حق میں نہایت مضر خیال کرتے تھے۔

ظرافت

ظرافت اور خوش طبعی ان کی جبلت میں داخل تھی۔ مگر جس طرح اُن کی اور باتوں میں بناوٹ نہ تھی، اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی میں مطلق تصنع نہ تھا۔ تحریر میں، تقریر میں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی اُن کو سوجھ جاتی تھی۔ اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہو ان سے ضبط نہ ہو سکتی تھی۔ مگر ایک امر کے بیان کرنے کا خدا نے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد سے متجاوز نہ ہونے پاتی تھی۔ زیادہ تر اُن کو ظرافت اور شوخی ان لوگوں کے مقابلے میں سوجھتی تھی، جو ان کی تکفیر یا تضلیل کرتے تھے وہ اُن کو کافر یا

مرتد کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے تھے اور یہ اس طرح پر اپنے دل کا بخار نکال لیتے تھے۔ پادریوں سے بھی ان کا دل بہت دُکھا ہوا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی بالمشافہ اُن سے بھی نوک جھوک ہو جاتی تھی۔

ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے۔ کسی اسٹیشن پر دو انگریز ان کی گاڑی میں آ بیٹھے۔ ایک ان میں سے پادری تھا۔ اُس کو کسی طرح سے معلوم ہو گیا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے۔ سرسید سے کہا۔

"مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا۔ میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا" سرسید نے کہا "میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنی چاہتے ہیں؟" اس نے کہا "خدا کی" سرسید نے کمال سنجیدگی سے کہا "میری تو کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لئے میں اُن کو نہیں جانتا" پادری نے متعجب ہو کر کہا "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے؟" انھوں نے کہا "مجھی پر کیا موقوف ہے جس سے ملاقات نہ ہو اس کو کوئی بھی نہیں جانتا"۔ پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا کہ "آپ اُس کو جانتے ہیں؟" پادری نے کہا "نہیں میں اُس سے کبھی نہیں ملا۔" سرسید نے کہا "پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اُس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو نہ مجھ کو اس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُس کو میں کیوں کر جان سکتا ہوں" پادری یہ سُن کر خاموش ہو رہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے۔ پھر سرسید سے اُس نے کوئی بات نہیں کی، اگر تقریر کا سلسلہ آگے چلتا تو اُس کو معلوم ہو جاتا کہ خود اس کے عقیدے کے موافق خدا ایسا ہی ہونا چاہیئے جس کے ساتھ ملنا جلنا کھانا پینا، یعنی وہ بعینہٖ انسان کی طرح ہو سکے۔

ایک دفعہ دلّی کے مشنری کالج اور علی گڑھ کالج کا میچ تھا اور دلّی سے کالج کے دو پروفیسر جو پادری تھے یہ میچ کھیلنے کے لئے اپنے طلباء کو ساتھ لے کر علی گڑھ آئے تھے، سرسید نے اُن کو ڈنر پر بلایا۔ جب کہ مسٹر بک بھی ان کے ہمراہ تھے۔ کھانے کے بعد پادری صاحب سرسید سے مخاطب ہو کر بولے کہ "بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے کالج میں مذہبی تعلیم بھی ہوتی ہے، کیونکہ سچا مذہب ہی ایسی چیز ہے جو انسان میں نیکی پیدا کرتا ہے۔" پادری صاحب اسلام کو تو جس کی تعلیم علی گڑھ کالج میں ہوتی ہے سچا مذہب کہہ ہی نہیں سکتے تھے، لامحالہ اُن کی مراد عیسائی مذہب سے تھی اور عیسائی مذہب کی بدولت جس قدر دنیا میں خونریزی ہوئی ہے اس کی مثال کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ سرسید نے پادری صاحب کی تقریر سُن کر کہا کہ "دنیا میں مذہب سے زیادہ کوئی بدتر چیز اور تمام برائیوں اور جرائم کا مخزن نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس قدر ظلم اور بے رحمیاں اور قتل اور خونریزیاں دنیا میں صرف مذہب کے سبب سے ہوئی ہیں وہ ایک طرف اور جو جرائم شیطان نے کرائے

ہیں وہ ایک طرف رکھے جائیں تو بھی مذہبی جرائم اور برائیوں کو غلبہ رہے گا۔" پادری صاحب یہ جواب سن کر چپ ہو گئے اور مسٹر بک سے مکان پر آکر کہا کہ میں نے تو اس شخص کو بڑا متعصب سنا تھا مگر اب معلوم ہوا یہ بالکل غلط تھا۔

بعض اوقات سرسید کسی مسئلے کی نسبت اپنے عقیدے کا اظہار ظرافت کے پیرائے میں ایسے طور پر کر جاتے تھے کہ بظاہر ایک ہنسی کی بات معلوم ہوتی تھی، مگر درحقیقت وہ ان کی اصلی رائے اس مسئلے کی نسبت ہوتی تھی۔ جس زمانے میں وہ بنارس میں تھے اُن کا ایک آرٹیکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہل سنت سمجھتے ہیں حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک سید صاحب جو بنارس میں ملازم تھے اس آرٹیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی اُن سے ملنے کو آئے۔ پہلے کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سرسید سے اس آرٹیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے "کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفہ اوّل کی خلافت کیونکر ثابت ہوگی؟" سرسید نے کہا "حضرت! نہ ہوگی تو اُن کی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑے گا۔" وہ یہ سن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ پانی کچھ مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے۔ "کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت جب کہ کچھ لوگ خلیفۂ اوّل کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیرؑ کا، اگر آپ اس وقت ہوتے تو کس کے لئے کوشش کرتے؟" سرسید نے کہا "حضرت! مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لئے کوشش کرتا؟ مجھ سے جہاں تک ہو سکتا، اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو بسوے کامیاب ہوتا۔" یہ سن کر اُن کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن گھر کا رستہ لیا۔

بظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس پیرائے میں انہوں نے اپنی اصلی رائے مسئلۂ خلافت کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اُن کے نزدیک جیسا کہ انہوں نے اپنی تحریرات میں جابجا ظاہر کیا ہے، کوئی شخص خاتم النبیینؐ کے بعد من حیث النبوۃ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا تھا اور اس لئے وہ کسی کی خلافت کے ماننے یا نہ ماننے کو ضروریاتِ دین میں سے نہیں سمجھتے تھے، بلکہ خلافت کو محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے اور اسی بنا پر جو کچھ خلفاء نے اپنے اپنے عہد میں کیا، اس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھیراتے تھے۔

سرسید کے لطیفے خاص کر ان آرٹیکلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں معترضین و مخالفین کا ذکر خیر یا اُن کی طرف خطاب ہے اور سب سے زیادہ اُن کے پرائیویٹ خطوں اور رقعوں میں نظر آتے ہیں جو وہ اپنے خاص اور بے تکلف دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھتے تھے۔

ایک دفعہ جب کہ راقم بھی علی گڑھ میں سرسید کے مکان پر ٹھیرا ہوا تھا، خان بہادر مولوی سید فریدالدین احمد سب آرڈنٹ جج کا رقعۂ دعوت سرسید کے نام آیا۔ رقعے کے خاتمے پر انہوں نے اپنا نام اس طرح لکھا تھا

"جانی فرید" (یعنی گنہگار فرید) سرسید نے جو اُس کا جواب لکھا۔ اس کے عنوان پر وہی الفاظ جو مولوی صاحب نے اپنی نسبت لکھے تھے، لکھ دیئے یعنی "جانی فرید"

اس قسم کے ہزاروں چٹکلے سرسید کی پبلک اور پرائیویٹ تحریروں میں ملتے ہیں جن کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ لطائف ونوادر کا مرتب ہو سکتا ہے۔ مگر اس شخص کی زندگی ایسے مہتم بالشان واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ ان کا سمیٹنا بیوگرافر کی طاقت سے باہر ہے چہ جائے کہ اُس کے لطائف و نوادر کا جمع کرنا اور اس شعر کا مصداق بننا کہ۔

"بخوں آلودہ دست و تیغ، غازی ماندہ بے تحسین   تو خواہی۔ زیب اسپ و زینت برگستواں بینی"

سرسید کی شوخیٔ طبع جیسی جوانی اور کہولت کے زمانے میں تھی، ویسی ہی بڑھاپے میں اخیر عمر تک رہی۔ مرنے سے چار برس پہلے جب کہ انھوں نے تیسری بار تہذیب الاخلاق جاری کیا، اُس کے اشتہار کے ساتھ جو انھوں نے ایک چھوٹا سا آرٹکل بطور تمہید کے لکھا تھا اُس کے آخر میں لکھتے ہیں "گو ہمارا دل کیسا ہی ٹوٹا ہوا ہو مگر امید ہے کہ اب کا تہذیب الاخلاق اگر پہلے سے اچھا نہ ہوگا۔ تو برا بھی نہ ہوگا۔ اور اگر وہ مکاتباتِ دلچسپ بھی تہذیب الاخلاق میں چھپنے لگے جو ہم میں اور نواب محسن الملک مولوی مہدی علی میں بعض مسائل کی نسبت ہونے والے ہیں اور جن سے قصہ آدم یاد آجائے گا اور کبھی سید احمد کو حکم ملے گا کہ مہدی علی کو سجدہ کر اور کبھی مہدی علی کو حکم ہوگا کہ سید احمد کو سجدہ کرو۔ تب تو تہذیب الاخلاق نہایت ہی دلچسپ ہو جائے گا اور خدا نہ کرے۔ کہ اُن دونوں میں سے کوئی یہ کہے کہ " خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ " ط

مطالعہ

مطالعہ کی عادت ابتدا سے اُن کی رفیق رہی۔ جس زمانے میں وہ فتحپور سیکری میں منصف تھے اُس وقت مولانا نورالحسن مرحوم آگرہ میں منصف تھے۔ سرسید کی اُن سے نہایت گہری دوستی تھی۔ مطالعہ کے وقت کتاب کے مشکل مقامات جو سمجھ میں نہ آتے تھے، اُن کے سمجھنے کے لئے ہر اتوار کو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فتحپور سے آگرے میں مولانا کے پاس آتے تھے۔ کئی برس تک بلاناغہ اُن کا یہی دستور رہا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا گھوڑا ادھر سے ایسا آشنا ہو گیا تھا کہ ایک بار آگرہ سے چھوٹ کر فتحپور اپنے تھان پر پہنچ گیا تھا۔

سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اُٹھانے کے لئے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے جیسا کہ مدرس اور طلبا کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملے اور ترکیب پر غائر نظر کرتے ہیں بلکہ ان کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جو بات کتاب میں اُن کے کام کی ہوتی تھی۔ اس پر

پنسل سے نشان کر دیتے تھے اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام کا ہوتا تھا اُس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کے فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا چسپاں کر دیتے تھے۔ جو مہتم بالشان سوالات ملک میں دائر و سائر ہوتے تھے۔ اگر اُن کے متعلق کوئی عمدہ مضمون کسی اخبار میں نظر پڑ جاتا، اُس کو زیادہ غور سے دیکھتے تھے اور ہر ایک سوال کے متعلق اپنی ایک مستقل رائے قائم کر لیتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت سمجھتے تھے تو اس پر چھوٹا یا بڑا آرٹکل لکھ کر چھپنے کو بھیج دیتے تھے۔ جو مضمون اُن کے خلاف اخباروں میں چھپتے تھے، اُن کو بہت شوق اور توجہ سے دیکھتے تھے اور اکثر حاضرین کو بھی سناتے تھے۔ انگریزی اخباروں کی بعض خبریں یا نوٹس یا کوئی ضروری آرٹکل کسی انگریزی داں سے پڑھوا کر سن لیتے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی اس کا ترجمہ کرا لیتے تھے۔

کتابیں اکثر اُن کے مطالعہ میں مذہبی دیکھی گئی ہیں۔ تصنیف کی حالت میں صرف بقدرِ ضرورت یا تو کتاب خود دیکھ لیتے تھے اور یا کوئی دوسرا شخص مقامِ مطلوب نکال کر ان کو دکھا دیتا تھا۔ اگر کوئی لطیف بات مضمونِ کتاب کے خلاف یا اُس کی مؤید یا اُس کے متعلق ذہن میں آجاتی اُسی وقت اُس پر کچھ لکھا اور اخبار میں چھپنے کو بھیج دیا۔

غدر کے بعد سے پریس ہمیشہ اُن کے ہاتھ تلے رہا۔ اس لئے یہ عادت ان کی طبیعتِ ثانی بن گئی تھی کہ مضمون لکھنے کے بعد جب تک وہ شائع نہ ہو جاتا، اُن کو چین نہ پڑتا تھا۔ یہی حال کتاب کی تصنیف کا تھا۔ اِدھر ایک پوائنٹ ختم ہوا اور اُدھر چھپنے کے لئے بھیجا گیا۔ مسوّدے پر بار بار نظر ڈالنا اور زیادہ کاٹ چھانٹ کرنا ان کا دستور نہ تھا۔ البتہ مسوّدہ صاف کرنے کے لئے وہ کاتب کو دے دیتے تھے اور جب صاف ہو جاتا تو کتابت کی تصحیح کے ارادے سے اُس کو ایک نظر دیکھ لیتے تھے۔

تصنیف کی حالت

تصنیف کی حالت میں جب کوئی مشکل مقام پیش آجاتا اور زیادہ غور کی ضرورت ہوتی تو وہ تنہا ہوتے یا مجمع میں، بالکل اُس میں مستغرق ہو جاتے، چہرہ عبوس ہو جاتا تھا، ہنسی یا تبسم پاس نہ آتا تھا۔ لوگ آپس میں باتیں کرتے مگر اُن کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کبھی ایسے موقع پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے اور جب تک طبیعت راہ نہ دیتی برابر اُسی خیال میں منہمک رہتے۔ جب عقدہ حل ہو جاتا فوراً چہرے پر بشاشت آجاتی۔ اگر اس وقت کوئی مخاطبِ صحیح پاس ہوتا تو بعض اوقات اپنا سانحہ اُس کے رُوبرو بیان کرتے اگر اور لوگ بھی اُس کو پسند کرتے تو خوش ہوتے، اگر کوئی اعتراض ہوتا تو اس پر بحث کرتے یا خاموش ہو جاتے۔ مگر فوراً تسلیم کبھی نہ کرتے تھے۔

خطوں کا جواب دینا

خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔ جو خط کہ پانی پت سے علیگڑھ بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اس کا جواب لکھا جائے تو تیسرے دن وہاں سے

جواب آجاتا ہے ، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب کبھی چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو جبکہ اُن کا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا تو دیکھنا چاہیئے کہ اپنے خاص دوستوں اور ہمسروں اور ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ البتہ مدرسے وغیرہ کے متعلق جو خط لکھنے ہوتے تھے وہ اکثر پیشدست لکھتا تھا اور وہ خود بتلاتے جاتے تھے لیکن جو فضول تحریریں لوگ اُن کے پاس بھیجتے تھے اُن کا کچھ جواب نہ دیتے تھے ۔ جس خط کا جواب لکھ چکتے اس کو فوراً چاک کر ڈالتے تھے کبھی انہوں نے کسی تحریر کو اس خیال سے کہ اُس کو الزام دینے یا شرمندہ کرنے کا موقع رہے، اپنے پاس دستاویز بنا کر نہیں رکھا۔ جب کسی خالص و مخلص دوست کی زیادہ بیماری کی خبر آئی تو جب تک صحت نہ ہوتی وہ تار پر تار یا خط پر خط بھیجتے رہتے ۔ جو خط کہ وہ اپنے بے تکلف اور خالص و مخلص دوستوں کو لکھتے تھے ان کا انداز تحریر فی الواقع ایسا دلکش اور دلنشین ہوتا تھا کہ اگر اس کو جادو یا افسوں یا سحر کا عمل کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا ۔ افسوس ہے کہ کہ اب تک کسی نے اُن کے خطوط جمع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی ، اگرچہ امید نہیں ہے کہ اُن کا دسواں حصّہ بھی اب فراہم ہو سکے ۔ لیکن جس قدر دستیاب ہوں ان کا جمع کرنا نہایت ضرور ہے ۔ وہ ایک ایسا مجموعہ ہوگا جو غیروں کو اپنا بنانا اور وحشیوں کو رام کرنا سکھائے گا ۔ وہ سچی دوستی اور سچی محبت کا نمونہ ہوگا وہ آئندہ نسلوں کو یاد دلائے گا کہ ہمارے اسلاف کیسے بے ریا اور کیسے محبت والے ہوتے تھے ! کس طرح دوستوں کا دل اپنی مٹھی میں رکھتے تھے اور کیونکر ان کے دلوں کا شکار کرتے تھے ۔

جب وہ ولایت سے ہندوستان آنے کو ہیں انہوں نے مولوی مہدی علی خاں کو اپنے آنے کی اطلاع دی ہے ۔ اُس میں لکھتے ہیں کہ " چوتھی پانچویں کو الٰہ آباد پہنچ کر آپ کے دیدار فرحت آثار سے مشرف ہوں گا اور آپ کے قدموں کو مثل نعلین بوسہ دوں گا ۔ اگرچہ آپ کے قدم میرے ناپاک لبوں سے ناپاک ہو جائیں گے مگر امید ہے کہ آپ مرمت سے دھولیں گے ۔ خنزیر خود ناپاک ہے مگر جس پاک چیز کو وہ مس کرے دھونے سے پھر پاک ہو سکتی ہے ۔

" افسوس میں نے غلطی کی جو اپنے تئیں خنزیر سے تشبیہہ دی ، وہ تو مجھ سے بہت اعلیٰ ہے ، خدا نے اس کو یاد کیا ہے ، مجھے تو سوائے مہدی علی کے اور کوئی یاد بھی نہیں کرتا ۔ "

اس کے بعد مولوی مہدی علی کی تحریرات جو اخبار میں کچھ سرسید کے موافق اور کچھ مخالف چھپی ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " جو جو مقام مجھ کو اُس میں کھٹکتے ہیں (یعنی جو میرے خلاف ہیں) اُس سے میرا دل عجیب طرز پر خوش ہوتا ہے جیسے کوئی سوداگر یہ دیکھے کہ ایک نہایت بیش بہا بے نظیر ہاتھی اُس کی اُوگی میں آن پھنسے اور وہ یقین کرے کہ اب وہ نکلنے والا نہیں ۔ " یہ ایک معمولی مثال ہے اُن محبت آمیز باتوں کی جو سرسید کی دوستانہ تحریروں میں عموماً دیکھی جاتی ہیں

اور اس بات کی تصدیق سید مہدی علی خاں سلمہم اللہ خود کریں گے کہ وہ فی الواقع سید کی اڑگی میں پھنسے تھے یا نہیں۔ اور پھنس کر اس میں سے نکلنے کا ان کو موقع ملا یا نہیں؟

محنت و جفاکشی

محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ قطع نظر اس کے کہ ابتدا سے اُن کو کام کرنے کی عادت رہی اُن کے قویٰ میں فطرتاً مشکلات کے برداشت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہراً ان کی غیر معمولی ذہانت بھی اُن کی دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ بچپن میں جیسا کہ خود سرسید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے وہ باعتبارِ ذہانت و جودت کے اپنے ہم چشموں میں کچھ زیادہ امتیاز نہ رکھتے تھے۔ مگر چونکہ انہوں نے اپنے تمام قویٰ سے جو خدا تعالیٰ نے اُن کے نفس میں ودیعت کئے تھے پورا پورا کام لیا تھا اور اس لئے اُن کے ذہن اور حافظہ اور عقل سب کو جِلا ہو گئی تھی کہتے ہیں کہ نیوٹن اسکول میں کچھ ذہین لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جب اُس سے بڑے بڑے کارنمایاں ظاہر ہوئے اور اُس سے لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اتنی نئی باتیں کیوں کر نکالیں تو اُس نے یہی جواب دیا کہ "میں استقلال کے ساتھ برابر غور کرتا رہا" محنت سے ایسے بڑے بڑے کام ظہور میں آئے ہیں کہ بعض حکماء کو شبہ ہو گیا ہے کہ آیا ذہانت بغیر محنت کے فی نفسہٖ کوئی چیز ہے یا نہیں۔؟

بہرحال سرسید کے تمام قوائے عقلیہ کو جِلا کرنے والی اور اُن کو ترقی کے اعلیٰ درجے پر پہنچانے والی ان کی دائمی محنت اور متصل غور و فکر اور استقلال تھا۔ سید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ "جس زمانے میں سید صاحب دِلّی سے رہتک بدل کر گئے ہیں، میں بھی اُن کے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے جن کو دلّی سے ہمراہ لے گئے تھے، سبق پڑھتے تھے۔ بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرحِ جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ پڑھنے کے لئے گیا تھا۔ مگر اس رفتار سے ان کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلّی چلا آیا۔ سبق کے بعد وہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر قیلولہ کرتے تھے، پھر کچہری جاتے اور شام تک کچہری کرتے۔ وہاں سے آکر شام کے کھانے اور نمازوں سے فارغ ہو کر سو رہتے، کوئی تین ساڑھے تین گھنٹے سوتے تھے۔ اس کے بعد ہمیشہ بلاناغہ اٹھ بیٹھتے اور صبح تک برابر مطالعہ کرتے تھے۔ جب تک میں رہتک میں رہا۔ اُن کا یہی قاعدہ دیکھا"۔

یہ تو اُس زمانے کا حال ہے جب سرسید کی عمر ۳۶ برس کی تھی اس سے آٹھ نو برس بعد مراد آباد اور غازی پور میں بھی جبکہ وہ تبیین الکلام لکھتے تھے، اُن کی محنت کا حال جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اسی کے

قریب قریب تھا۔ ولایت میں خطباتِ احمدیہ کے لکھنے میں انہوں نے ڈیڑھ برس برابر ایسی محنتِ شاقہ کی جس سے آخر کار اُن کے پاؤں میں ایک مرض پیدا ہوگیا جو اخیر دم تک زائل نہیں ہوا۔ اُن کے پاؤں اور پنڈلیاں سوج جاتی تھیں اور تلووں میں درد ہو جاتا تھا۔ مہینے مہینے دو دو مہینے برابر یہ تکلیف رہتی تھی۔ چند روز کو افاقہ ہو جاتا تھا، پھر وہی شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔ باوجود ان مشکلات کے انہوں نے خطباتِ احمدیہ کو ولایت ہی میں پورا کیا اور وہیں چھپوایا۔

جس زمانے میں وہ سائنٹفک سوسائٹی کا مکان بنوا رہے تھے، سخت گرمی کا موسم تھا، شام تک لو چلتی تھی، وہ کچہری سے آکر گھر کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سیدھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور ظہر و عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں پڑھتے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں بیان کرتے تھے کہ اکثر مجھے بھی وہ ساتھ لے جاتے تھے۔ میرا گرمی اور لو کے مارے بُرا حال ہوتا تھا مگر وہ بے تکلف سارا دھوپ اور لو اور گرمی کا وقت وہیں راج مزدوروں میں بسر کرتے تھے۔

اخیر زمانے میں جو کہ شیخوخت کا زمانہ تھا، اُن کی محنت جوانی اور کہولت کے زمانے سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ وہ اُس پیادہ سیّاح کی طرح جو سردسیر ملک میں سیاحت کے لئے داخل ہو، جُوں جُوں آگے بڑھتے جاتے تھے اُسی قدر اُن کی چال زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ اُن کا اِس عارفانہ مقولے پر پورا پورا عمل تھا کہ "ضاعف فی الکبر ھمتک فان وقتک قد دنیٰ وعما قلیل تدعیٰ" (یعنی بڑھاپے میں اپنی ہمت دوچند کر کیونکہ تیرا وقت قریب آپہنچا ہے اور عنقریب تیری بلاوا ہونے والی ہے)

وہ تقریباً ہمیشہ صبح کے چار بجے سے شام کے آٹھ بجے تک برابر جاگتے اور مختلف کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ دوپہر کو سخت بیماری کے سوا کبھی پلنگ پر جا کر نہ لیٹتے تھے۔ اگر کبھی رات کو نیند نہ آتی اور دن کو نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو بھی وہ اپنی نشستگاہ سے نہیں اٹھتے تھے، جو ایسا ہی نیند کا خمار ہوا تو وہیں کرسی یا تکیے کے سہارے سے ذرا کمر سیدھی کر لیتے تھے۔ اگر اس میں کبھی آنکھ لگ گئی تو ذرا سی آہٹ سے فوراً کھُل جاتی تھی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے چونکہ بڑھاپے اور زیادہ فربہی کے سبب وہ اپنے میں پھُرتی اور چالاکی کی قابلیت نہیں دیکھتے تھے اس لئے جن کاموں میں پھُرتی کی ضرورت ہوتی تھی اُن کے لئے بہت پہلے سے تیار ہو جاتے تھے۔ ریل کے وقت سے دو دو گھنٹے پہلے جا بیٹھتے تھے، کسی ڈنر یا دعوت یا جلسہ یا دربار میں جانا ہوتا تو وقتِ معیّن سے بہت پہلے تیار ہو بیٹھتے تھے۔ کسی حاکمِ اعلیٰ کو ایڈریس دینی ہوتی تھی۔ تو دس دس بارہ بارہ روز پہلے سب کام لیس رکھتے تھے بغرض کہ

ہر ایک کام کی تیاری وہ اس وقت سے شروع کرتے تھے جب کسی کو اس کا سان گمان نہ ہوتا تھا۔

تصنیف وتالیف کے علاوہ جوان کا ایک لازمی مشغلہ تھا، مدرسے کے متعلق تمام اہم اور ضروری کام یا تو خود اپنی ذات سے کرتے تھے یا اپنی نگرانی میں اپنے پیش دستوں سے لیتے تھے مثلاً مدرسے کی سالانہ آمدنی اور خرچ کا بجٹ بنانا اور اُس کا خلاصہ گورنمنٹ میں بھیجنے کے لئے مرتب کرنا، سالِ تمام کی رپورٹ لکھنی، ہر دوسرے تیسرے مہینے ایجنڈا تیار اور اُس کے تمام کاغذات چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنے اور اُن کو ووٹ بھیجنے کے لئے اکثر کئی کئی دفعہ تقاضے کے خط لکھنے، پھر ہر ایک جلسے کی روئداد لکھ کر اور چھپوا کر ٹرسٹیوں کے پاس بھیجنی، گورنمنٹ سے، سررشتۂ تعلیم سے، طالب علموں کے مربیوں سے، بینک سے اور ٹرسٹیوں سے وقتاً فوقتاً خط وکتابت کرنا، روزانہ آمدنی اور خرچ کو روزنامچہ میں درج کرنا، عمارتوں کے نقشے تجویز کرنے اور ان کے موافق ہر ایک عمارت کو اپنی نگرانی میں تیار کرانا، اُن کے لئے ہر قسم کا سامان اور مسالہ اپنی رائے اور تجویز سے منگوانا، ہر ایک عمارت کے لئے مناسب کتبہ یا تاریخ تجویز کرنی اور اُس کو اپنے اہتمام میں کندہ کرانا، تیار شدہ عمارتوں کی تابمقدور خبر رکھنی اور ان کے نقصانات کا تدارک کرنا، کالج اور تعمیر کے اخراجات کے لئے چندہ جمع کرنے کی نت نئی تدبیریں سوچنی اور ان تدبیروں کے موافق عمل درآمد کرنا اور اخبار اور خطوط کے ذریعے سے چندے کی تحریک کرنا۔ اگر روپیہ بہم نہ پہنچے تو قرض سے مدرسہ کا کام چلانا۔ کالج یا بورڈنگ ہوس کے انتظام کے متعلق جب کوئی شکایت گذرے تابمقدور اُس کے تدارک کی فکر کرنا اور جب کوئی مناسب یا ضروری تجویز منظور ہو جائے اُس کے پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر عمل میں لانا، جو اخبارات جو اطراف وجوانب سے آتے تھے اُن سب پر ایک نظر ڈالنا اور بعض انگریزی اخباروں کو کسی اپنے پیش دست سے پڑھوا کر سننا۔ ہمیشہ قوم کے اہم معاملات سے جو اخباروں میں درج ہوتے تھے، نوٹس لینا اور اپنے اخبار میں اُن پر بحث کرنا اور بعض ضروری کا ترجمہ انگریزی میں کرا کر کبھی اپنے اخبار اور کبھی کسی معتبر انگریزی اخبار میں شائع کرانا۔ ہفتہ میں دوبار اخبار کے پروفوں کا خود صحیح کرنا، اپنی یا دوستوں کی کتابیں جو فروخت کی غرض سے مدرسے کے فائدے کے لئے ہمیشہ چھپتی رہتی تھیں یا کانفرنس کی رپورٹیں اور لیکچر یا کالج کا بجٹ یا رپورٹ سالِ تمام یا ٹرسٹیوں کے اجلاس کی روئدادیں غرض کہ جو کچھ اُن کے اہتمام میں چھپتا تھا، سب کی کاپیوں یا پروفوں کا اصل سے خود مقابلہ کرانا اور آپ ان کی تصحیح کرنا اور اپنے سامنے اُن کے پیکٹ بنوا کر مطبع میں بھیجنا۔ مدرسہ کی تجارتی کتابوں کے خود اشتہار چھپوا کر اُن کو آپ فروخت کرنا اور اُن کا حساب کتاب رکھنا۔ کالج کے متعلق تمام حساب کتاب کے رجسٹروں، بجٹوں، رپورٹوں اور روئدادوں وغیرہ کی اور کالج لائبریری کے متعلق اورئینٹل زبانوں کی

کتابوں کی جلدیں بندھواکر الماریوں میں اپنے سامنے احتیاط سے رکھوانا۔ یوریپین حاکم اور افسر اور ارکانِ سلطنت جو اکثر کالج کے ملاحظے کو آتے رہتے تھے ان کی مدارات اور استقبال و مشایعت کا خود انتظام کرنا، اُن کے دربار کے لئے ہال کو خاص اپنے اہتمام میں آراستہ کرانا، اُن کے واسطے ایڈریس تیار کرنا اور اس کو انگریزی میں ترجمہ کرانا اور چھپوانا اور پھر ایڈریس اور اس کا جواب اور تمام جلسے کی کارروائی کو اخبار کے ذریعے سے شائع کرنا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر خواہ اس کا اجلاس علی گڑھ میں ہو اور خواہ کسی دوسرے شہر میں، سب کام چھوڑ کر آٹھ دس روز تک برابر اس کی کارروائی اور انتظام میں ہر وقت مصروف رہنا؛ یہ اور اسی قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے کام یہ شخص اس ضعیفی کے زمانے میں سرانجام کرتا تھا۔ اگر ان تمام کاموں سے قطع نظر کی جائے اور صرف چندہ جمع کرنا اور اس کی تدبیریں سوچنے ہی کے کام پر غور کی جائے تو یہی ایک ایسا کام تھا کہ اگر دوسرا شخص اسی کام کو اپنے ذمے لے لیتا تو پھر وہ اور کسی کام کا نہیں رہ سکتا تھا، تعمیرات کا کام بھی آسان کام نہ تھا۔ جس کے لئے کم سے کم ایک لائق اور سیر رکھنے کی ضرورت تھی، مگر سر سید نے یہ بوجھ بھی اپنے سر دھر لیا تھا۔ یہاں تک کہ سات آٹھ لاکھ کی عمارت صرف اپنی تجویز اور اپنے اہتمام سے بنوا ڈالی۔

باوجود ان تمام بکھیڑوں کے وہ اپنی خاص طرز کی تصنیف کا نہایت کٹھن اور دشوار گزار مرحلہ بھی انہیں مشغلوں کے ضمن میں طے کرتے تھے۔ دوستوں کے بے شمار خطوں کے جواب اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، مہمانوں کی حالت کے موافق اُن کی آسائش کا انتظام کرتے تھے، اُن کے لانے کے لئے مختلف اوقات میں ریلوے سٹیشن پر سواری بھیجتے تھے اور جب تک اُن کا قیام رہتا تھا ہر وقت اُن کا خیال رکھتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ جو مستعدی اور ہمت اور ہر ایک بات کی خبرداری اور ہر ایک فرض کی نگہداشت اس شخص میں بڑھاپے میں دیکھی گئی ہے۔ وہ کسی توانا اور تندرست نوجوان میں بھی نہیں پائی جاتی اور یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ ایک محض ناواقف شخص بھی صرف اُس کے روزمرہ کے کام دیکھ کر اس قدر ضرور سمجھ سکتا تھا کہ اس شخص کی خلقت معمولی آدمیوں کی خلقت سے جداگانہ تھی۔ متنبی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وَاِذَا کَانَتِ النُّفُوسُ کِبَارًا　　تَعِبَتْ فِی مُرَادِهَا الْاَجْسَامُ

(یعنی جب نفوسِ انسانی اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں تو اعضائے انسانی اُن کے ارادے پورے کرتے کرتے تھک جاتے ہیں)

باوجود اس قدر مصروفیت اور کاموں کی کثرت کے اُن کی زندہ دلی نہایت تعجب خیز تھی۔ وہ جہاں تک

ممکن ہوتا تھا رنج اور افسردگی کو کبھی پاس نہ آنے دیتے تھے اور خانگی بکھیڑوں اور خرخشوں سے تا بمقدور الگ تھلگ رہتے تھے۔ جس طرح اُن کے باپ گھر کے تعلقات سے آزاد تھے، اسی طرح سرسید اپنے پرائیویٹ معاملات سے بہت ہی کم سروکار رکھتے تھے اور یہی اثر اُن کی اولاد میں پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قومی کاموں کے متعلق کوئی کیسا ہی معقول عذر کرے اور مکروہاتِ خانگی کے سبب کیسی ہی مجبوری بیان کرے وہ ہرگز نہ سنتے تھے اور جب تک سب کام چھوڑ کر اُن کی فرمائش پوری نہ کی جاتی وہ کسی عذر کو قابلِ سماعت نہ سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے، ہنسی، دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے۔ بچوں سے، بوڑھوں سے، جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے، انگریزوں سے اور ہندوستانیوں سے بشرطیکہ دل ملا ہوا ہو اور کسی طرح کی مغائرت نہ ہو، ہنسی اور چہل کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہی زندہ دلی تھی جو اُن سے سخت محنت کراتی تھی اور تکان اور ماندگی اور ملال وکلال کو کبھی پاس نہ آنے دیتی تھی۔ اگرچہ جس زمانے میں ہم نے اُن کو دیکھا ہے، اُن کی ہنسی اور چہل صرف باتوں میں رہ گئی تھی، مگر جیسا کہ سنا گیا ہے، ابتدا میں ان کی شوخیاں صرف بات چیت ہی میں محدود نہ تھیں۔ کرنل گریہم جو ان کے قدیم دوست تھے لکھتے ہیں کہ "وہ اس قدر خوش طبعی اور تمسخر کرتا ہے جس قدر کہ کوئی آدمی کر سکتا ہے" کبھی رات کے وقت ایک رسّی سے سانپ سانپ کہہ کر حاضرین کو ڈرا دینا، کبھی نہایت بھیانک اور ڈراؤنی آواز سے اونگھنوں کو چونکا دینا، کبھی کسی سوتے ہوئے کی چھاتی پر چڑھ کر اُس پر اپنا سارا بوجھ ڈال دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں جن میں سے بعض بیان نہیں کی جا سکتیں، اُن کے دوستوں سے سُنی گئی ہیں۔

بعض اوقات اُن کے ماتحت یا ملازم جن سے بے تکلفی تھی۔ اُن کو ایسا جواب دیتے تھے جس سے انہیں شرمندہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر وہ کبھی بُرا نہ مانتے تھے۔ بلکہ خوب قہقہے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم نے اس امر کے متعلق ایک دلچسپ نقل بیان کی، وہ کہتے تھے کہ "حافظ عبد الرحمٰن جو ۲۵ برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ دہلی میں بھی اُن کے ساتھ تھے۔ اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلتِ تنخواہ کے سبب اُن کو اپنے پاس رکھتے تھے۔ اُن سے اکثر ہنسی چہل کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، حافظ جی اپنی ترقی کے لئے اکثر کہا کرتے تھے مگر چونکہ ترقی کی گنجائش نہ تھی، سید صاحب ہنسی سے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ تمہارا خط اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیونکہ تم بدصورت ہو اور بدصورت کبھی خوشنویس نہیں ہو سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہہ ہیں، آپ کا خط کیوں اچھا نہیں؟ سید صاحب نے کہا۔ میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے اس واسطے میں بھی بدصورت ہو گیا ہوں۔ بس میرا خط کیونکر اچھا ہو سکتا ہے۔"

ایک دن سید صاحب نے حافظ جی سے کہا بھلا صاحب! اگر تم بادشاہ ہو جاؤ تو مجھے کیا عہدہ دو؟ حافظ جی نے وہ تمام سلوک جو سید صاحب اُن کے ساتھ کرتے تھے بیان کئے کہ میں آپ کی بڑی خاطر کروں، دونوں وقت آپ کو اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں رات کو آپ کا پلنگ اپنے پلنگ کے برابر بچھواؤں اور چھاں کروں اور چنیں کروں۔ سید صاحب نے کہا ان باتوں کو جانے دو، یہ بتاؤ کہ مجھے عہدہ کیا دوگے؟ حافظ جی نے ذرا رُوکھی صورت بنا کر کہا حضرت! میں مجبور ہوں چونکہ آپ کا خط اچھا نہیں اس لئے کوئی عہدہ نہ دے سکوں گا۔ سید صاحب اور ہم سب لوگ یہ گرم فقرہ سُن کر پھڑک گئے اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔" غرضکہ سرسید نے تابقدور کبھی رنج اور غم کو پاس نہیں آنے دیا۔ بیرونجات میں، آبادی میں، جنگل میں، جہاں کہیں ہوئے انہوں نے اپنی خوشی اور دل لگی کا کچھ سامان ضرور مہیا کر لیا۔

وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہاں تک کہ جو وحشت بچوں کو بڈھے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھی وہ ان میں باقی نہ رہتی تھی۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کو، اپنے بیٹوں کو اور اخیر عمر میں پوتے کو اپنے سے ایسا مانوس رکھا کہ مائیں بھی بچوں کو اپنے ساتھ ایسا مانوس نہیں رکھ سکتیں۔ ان کا برتاؤ ان سب کے ساتھ بالکل ایسا رہا جیسا یار دوستوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد آباد میں ان کے بھتیجے کو کنکوے لڑانے کا شوق حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ سرسید چاہتے تھے کہ یہ دست جاتی رہے۔ مگر اس پر جبر کرنا گوارا نہ تھا۔ ناچار ہو کر ایک دن کہا کہ بھئی آج تمہاری پتنگ بازی کی ہم بھی سیر دیکھیں گے۔ شام کو جب کہ پیچ پڑ رہا تھا اور دونوں طرف سے ڈھیل دی جا رہی تھی آپ بھی وہاں پہنچے اور ہاتھ بڑھا کر چلتی ڈور کو تھام لیا اور جب پیچ کٹ گیا تو پکار پکار کے کئی دفعہ کہا "ہم ہارے ہم ہارے" یہ دیکھ کر فریق ثانی کا جوش کم ہو گیا۔ دوسرے دن کوئی ادھر سے پتنگ لڑانے کو نہ اٹھا اور پتنگ بازی کا خاتمہ ہوا۔

سرسید کی ذہانت بھی جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ان کی لگاتار ... متصل دماغی ریاضت کا ایک نتیجہ تھا۔ ایک یورپین مصنف نے لکھا ہے کہ "میں ایسے بہت سے لوگوں سے ملا ... ہوں جو بڑے ذہین مشہور تھے لیکن آخر کو معلوم ہوا کہ وہ اصل میں بڑے محنتی تھے۔" سرسید کی ذہانت کی نسبت ایک انگریز نے سید محمود سے کہا کہ "تمہارے باپ کا دماغ کیا ہے گویا ٹائپ کے حرفوں کی الماری ہے۔ جس طرح اُس الماری میں جس حرف کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتا ہے۔ اسی طرح ہر سوال کا جواب اُس کے دماغ میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔" فی الواقع سرسید کے انتقالِ ذہنی کا یہی حال تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ہر ایک ضروری سوال پر جو ملک

میں دائر و سائر ہوتا تھا بجائے خود غور کر کے اس کی نسبت ایک پختہ رائے قائم کر لیتے تھے اور اِس لئے جب وہ سوال معرضِ بحث میں آتا تو اُن کو اُس کا جواب دینے میں زیادہ تامل کرنا نہیں پڑتا تھا اور یا یہ کہ دماغی ریاضت اور برابر غور و فکر کرنے کی عادت نے اُن میں یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اکثر سوالات کی نسبت ادنیٰ تامل سے ایک سنجیدہ اور معقول رائے ظاہر کر سکتے تھے۔

ہر حال یہ تمام نتیجے دائمی غور و فکر اور نورِ فطرت کے روشن رکھنے اور آپ اپنی تعلیم کرنے کے تھے۔ تقلید کی عادت، خواہ اُمورِ مذہبی میں ہو، خواہ مسائلِ علمی میں اور خواہ معاملاتِ دینی میں، انسان کو کبھی اپنے اوپر بھروسا اور اعتماد کرنے نہیں دیتی۔ وہ ہمیشہ بچّوں کی طرح جو چلنے میں اوروں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، ہر معاملے میں دوسروں کا منہ تکتا رہتا ہے۔ سرسید کو زمانے کی ضرورتوں نے اوّل مذہبی تقلید سے نجات دی جس سے اُن کو مذہبی مشکلات میں اپنی طبیعت پر زور ڈالنے اور اپنی رائے اور سمجھ پر تکیہ کرنے کی ضرورت اور عادت رہی، پھر رفتہ رفتہ یہ عادت اُن کی طبیعتِ ثانی ہو گئی اور ہر قسم کے سوالات پر غور کرنا اور سوچنا اور اپنی مستقل رائے قائم کرنا اُن کا وتیرہ ہو گیا اور اس طرح اُن کے قوائے عقلیہ بتدریج جلا پاتے رہے۔

سرسید کی غیر معمولی ذہانت اور بے نظیر جینیس کا سب سے بڑا ثبوت اُن کی مذہبی تحقیقات یا وہ تدبیریں ہیں جو اُن سے مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے اور اُس کو ترقی دینے میں ظاہر ہوئیں اور جن کا ذکر اس کتاب میں بقدرِ ضرورت اپنے اپنے موقع پر ہو چکا ہے اور اگر کسی کو اُن کی عالی دماغی کی مجسّم چیز دیکھنی ہو تو سید محمود کو دیکھ لینا کافی ہے۔ جن کی نسبت مسٹر وائٹلی سٹوکس لیگل ممبر لیجسلیٹو کونسل وائسرائے کشورِ ہند نے کونسل میں یہ الفاظ کہے تھے "نہایت نامور باپ کا نامور بیٹا"[1]

ہم یہاں صرف اُن کے بعض لطیف خیالات کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُن کی طبیعت میں ایک خاص مناسبت فنونِ لطیفہ کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

---

[1] یہ وہ مشہور اور نامور لیگل ممبر کونسل قانونی وائسرائے کشورِ ہند ہے جو ۱۰ برس کونسلِ ہند میں اوّل سیکرٹری اور پھر قانونی ممبر رہا۔ اینگلو انڈین کوڈ ۱۸۸۳ء میں اُن کا یہ فقرہ درج ہے کہ "مجھ کو استفسارات کے زیادہ ذریعے ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلے ہوئے ہیں جو انڈین لاء رپورٹ میں ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۳ء تک چھپے ہیں، یہ ایسے فیصلے ہیں جو اہلِ ہند کے رسوم و خیالات ہی پر روشنی نہیں ڈالتے بلکہ عموماً (اگر میرا یہ کہنا گستاخی نہ ہو) اپنے لاجکل استدلال اور قابلیت کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں اور ان میں سے کسی فیصلے کے پڑھنے سے بہ نسبت اُن فیصلوں کے زیادہ لطف اور زیادہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو موتوسامی ایار ہندو اور سید محمود مسلمان کے ہیں۔ جن قوموں میں ایسے مقنن پیدا ہوئے ہوں اُن کے لئے کوئی قانونی اصول ایسا باریک اور دقیق نہیں ہو سکتا جو اُن کو دشوار معلوم ہو اور کوئی طریقۂ عمل دساعتہ قانونی ایسا پیچیدہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے فہم سے باہر ہو۔ ۱۲

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ منجملہ اُن بے شمار تدبیروں کے جو چندہ وصول کرنے کے لئے انھوں نے وقتاً فوقتاً اختیار کیں، ایک تدبیر نواب مختار الملک مرحوم کی خدمت میں اُس تصویر کا بھیجنا تھا جس میں مسلمانوں کی حالت کو ایک تباہ شدہ جہاز کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اور مدرستہ العلوم کو ایک کشتی کی شکل میں دکھایا تھا جو جہاز والوں کو اُس تباہی سے نکالنے کے لئے جہاز کی طرف آ رہی تھی۔ اس تصویر کی مفصل کیفیت پہلے حصے میں بیان ہو چکی ہے، یہاں صرف یہ جتانا ہے کہ سرسید کا ذہن کیونکر اس خیال کی طرف منتقل ہوا۔ انہیں دنوں میں مدرستہ العلوم پر ایک نظم لکھی گئی جس میں ایک یہ شعر بھی تھا۔

دُور سے اُمید نے جھلکی سی اِک دکھلائی ہے ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے

ظاہرا سرسید کو اِس تصویر کے بنوانے کا خیال اِسی شعر کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا، کیونکہ یہ نظم اُس تصویر کے بھیجنے سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ مگر شاعر کا خیال ایک عقیم اور غیر منتج خیال تھا۔ جس میں اس سے زیادہ کوئی کرشمہ نہ تھا کہ ایک معقول شے (یعنی تعلیم) کو ایک محسوس چیز (یعنی سفینۂ نجات) کے ساتھ تشبیہ دی گئی تھی۔ لیکن جو مضمون سرسید نے اُس سے استنباط کیا اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جیسا بیان ہو چکا ہے، نواب مختار الملک کے دل میں جن کو اُس وقت تک قومی معاملات سے چنداں دلچسپی نہ تھی کالج کی محبت کا بیج بویا گیا، جو رفتہ رفتہ ایک گھنا اور سرسبز اور سایہ دار درخت ہو گیا۔

اِسی قسم کی دوسری مثال وہ بکس تھا جس میں سرجان اسٹریچی کو ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت کالج کمیٹی کی طرف سے ایڈریس دیا گیا تھا اور جس کو سرسید نے خاص اپنی تجویز سے بنوایا تھا۔ اِس بکس پر اُن جانوروں کی تصویریں کھدوائی گئی تھیں جن کے نام پر زمانۂ جاہلیت میں عرب کے نام رکھے جاتے تھے اور اس لئے عرب کے بہت سے قبیلے انہیں ناموں سے مشہور تھے، جیسے قرش یا قریش (وہیل مچھلی) ثعلب (لومڑی) کلب (کتا) جمل (اونٹ) اسد (شیر) ذئب (بھیڑیا) وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان سب تصویروں کے منہ سے بجائے سانس کے ایک ایک تار نکالا گیا تھا اور یہ سب تار ایک مقام پر جا کر منتہی ہوئے تھے، جہاں انگریزی لفظ میں یہ مطلب ادا کیا گیا تھا کہ ہم سب قبیلے متفق اللفظ سرجان اسٹریچی کا شکریہ تہ دل سے کرتے ہیں۔" اور اس سے گویا تمام مسلمانوں کی شکر گذاری کا اظہار مقصود تھا۔

اِسی قبیل سے کھجور اور اونٹ کی تصویر ہے جو سب سے پہلے سرسید نے انگریزی خطبات احمدیہ کے ہر ایک خطبے کے سرے پر ولایت میں چھپوائی تھی اور جو عرب کی خصوصیات میں شمار ہونے کے سبب ایک علامت دین اسلام کی قرار دی گئی تھی۔ اِس میں سے کھجور کی علامت ہم نے پچھلے دنوں میں ایک چینی تشتری پر بنی ہوئی دیکھی تھی جس سے خیال ہوتا تھا کہ شاید اسی کتاب کو دیکھ کر ولایت کے کسی کارخانے دار نے یہ مارک اُن ظروف کے لئے اختیار کیا ہے جو ممالکِ عرب میں بھیجے جاتے ہیں۔ اور اِسی قبیل کا وہ نشان ہے۔ جس میں ہلال اور صلیب کو جو تاجِ قیصری

میں بنی ہوئی ہے ایک جگہ جمع کرکے مدرسۃ العلوم کے کتبوں اور اس کے کتب خانوں کی کتابوں پر ثبت کیا گیا ہے اور جس سے اسلام اور کرسچینٹی کی مصالحت اور تاجِ قیصری کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کا اظہار مقصود ہے ۔

ایک اور مثال سرسید کے انتقالِ ذہنی کی سن نبوی کا بجائے سن ہجری کے قرار دینا اور تہذیب الاخلاق کا سال ماہِ شوال سے شروع کرنا ہے۔ ظاہراً سرسید سے پہلے سن نبوی کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں گذرا جس زمانے میں کہ سرسید آئینِ اکبری کی تصحیح کرتے تھے اُس میں ایک جگہ سن ہجری کی نسبت ابوالفضل کا یہ قول اُن کی نظر سے گذرا تھا کہ "ازیں سن بوئے ناکامی مے آید" یعنی یہ سن آنحضرت صلعم اور تمام مہاجرین کی اُن مصائب کو یاد دلاتا ہے جن کے سبب اُن کو وطنِ مالوف چھوڑنا اور مکّے سے مدینے کو ہجرت کرنا پڑا۔ اُس زمانے میں سرسید نے ابوالفضل کے اُن الفاظ سے بہت بُرا مانا تھا اور اس کے حاشیے پر قائل کی نسبت لعنت یا اس کا کوئی اور مترادف لفظ لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ابوالفضل کے اُسی بے ادب جملے سے اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تہذیب الاخلاق کا سال تاریخِ بعثت سے شروع کیا جائے کیونکہ درحقیقت اسلام میں کوئی واقعہ آنحضرت صلعم کی بعثت سراپا برکت کے برابر عظیم الشان نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ یہ امید نہیں ہے کہ جو سن تیرہ سو برس تک مسلمانوں میں متداول رہا ہو اُس کی جگہ کوئی دوسرا سن قائم ہو سکے مگر اس نظر سے کہ سن نبوی تاریخِ بعثت ختم المرسلین کو یاد دلاتا ہے اگر مسلمان کم سے کم سیَر اور اسماء الرجال کی کتابوں اور قومی میگزینوں وغیرہ میں سن ہجری کے ساتھ سن نبوی بھی لکھا کریں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

اسی طرح سب سے پہلے سرسید ہی نے اُس غلطی کو محسوس کیا تھا جو سن فصلی اور سن عملی میں فرق نہ کرنے سے سرکاری دفتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اور جیسا کہ ہم پہلے حصّے باب ۲ میں بیان کرچکے ہیں، تاریخ بجنور میں انہوں نے اُن مشکلات کو گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا جو اس غلطی سے لازم آتی تھیں اگرچہ وہ تاریخ ۵۷ کے ہنگامے میں تلف ہوگئی تھی مگر ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء میں جو سرکلر گورنمنٹ نے اُس غلطی کے تدارک کے لئے جاری کئے ان سے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اُسی تحقیقات کا نتیجہ تھا جو سرسید نے تاریخ بجنور میں درج کی تھی ۔

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے اُن کے ذہن کی جودت اور بلند پروازی پائی جاتی ہے مگر یہاں بطور نمونہ کے اسی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔

اخلاق اور خصائل

سب سے زیادہ گراں وزن اور جامع الفاظ جو کسی کی تعریف میں بولے جاسکتے ہیں اس کے سوا خیال میں نہیں آتے کہ فلاں شخص اپنے درجے کا دل و دماغ رکھتا ہے

لیکن اکثر ان الفاظ کا استعمال اپنے محل پر نہیں ہوتا کیونکہ لیاقت جو دماغ سے علاقہ رکھتی ہے اور نیکی جو دل سے علاقہ رکھتی ہے، یہ دونوں اکثر ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں۔ مگر سرسیّد میں جس طرح بعض دیگر متضاد لیاقتیں جمع تھیں اسی طرح اُس کو خدا تعالیٰ نے دل اور دماغ دونوں اعلیٰ درجے کے عنایت کئے تھے، یہاں تک کہ اُس کی نسبت یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس میں نیکی زیادہ ہے یا عقل لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے اُس کی رایوں میں تو شاید خطا کی گنجائش ہو مگر اُس کے اخلاق سراسر اُس سے بالکل پاک معلوم ہوتے تھے اسی لئے مسٹر بک نے اس کے مرنے کے بعد اپنی اسپیچ میں کہا تھا "گو اس کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں مگر اُس کے اخلاق اُن سے بھی بڑے تھے"

ایک حکیم کا قول ہے کہ جو شخص بدکاری سے پاک ہو، معاملات میں منصف ہو، بات کا پکا ہو، ماتحتوں پر مہربان ہو، محنتی ہو، صاحب استقلال ہو، اور بڑے بڑے کاموں پر دلیری کے ساتھ مستعد ہو وہ شریف ہے" اس تعریف میں اگر فیاضی کی صفت اور بڑھا دی جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ سرسیّد کے حق میں جامع و مانع ہو گی جو اختیار کہ یہ شخص محض اپنی اخلاقی طاقت سے ہزاروں غیر شخصوں کے دلوں پر رکھتا تھا وہ کسی کو اپنے گھر کے آدمیوں پر بھی حاصل نہیں ہوتا جس قدر اس کے دوست اور ملنے والے تھے، سب اُس کے ثنا خواں اور مداح تھے، سب اُس سے محبت رکھتے تھے، سب کو اس پر اعتبار تھا اور سب کو اس کا دنیا سے اُٹھ جانا ایسا ہی شاق گزرا تھا جیسے کسی خاندان کے ممبروں کو اپنے مربّی اور سرپرست کا مر جانا شاق گزرتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی شخص کے حسن اخلاق کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑی دلیل اُس کی اخلاقی عظمت کی وہ غیر معمولی کامیابی تھی جو اس کو اپنے مقاصد میں ہوئی، کیونکہ لیاقتیں کیسی ہی اعلیٰ درجے کی ہوں جب تک اُن کے ساتھ اعلیٰ درجے کے اخلاق نہ ہوں کچھ کام نہیں آسکتیں۔

اُس نے تقریباً ساٹھ برس اپنی عمر کے پبلک لائف میں بسر کئے جن میں سے اخیر کے تیس برس ایسی حالت میں گزرے کہ ایک زمانہ اُس کی عیب جوئی کی گھات میں رہا اور دوست اور دشمن سب کو اُس کے ادنےٰ ادنےٰ کام دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مخالفین کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس سے سرسیّد کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے اور مدرسہ کی اعانت منقطع ہو جائے۔ باوجود اس کے کسی کو ایسا موقع نہیں ملا کہ اس کے کیرکٹر پر کوئی معقول گرفت کرتا یا اُس کے چال چلن میں کوئی نقص نکالتا سوا اس کے کہ اُس کو کافر و ملحد و نیچری کرسٹان کہہ کر دل ٹھنڈا کیا گیا اور اس پر وہ الزام لگائے گئے جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہ تھا۔ کسی سے کچھ بن نہ آیا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ رباعی

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ — کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت — لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اگرچہ انسان کے اخلاق کی تھاہ دریافت کرنی نہایت مشکل ہے مگر معاملات کی کسوٹی اور مخالفوں کی چھان بین ایسے دو معیار ہیں کہ سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کیے بغیر نہیں رہتے۔ اگر سرسید کی سچائی میں رائی برابر بھی فرق پایا جاتا تو مخالف اس کو پربت بنا دیتے مگر چند صریح تہمتوں کے سوا اس کا دامن اخیر دم تک ہر ایک داغ اور دھبے سے پاک رہا۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک نے ٹھیک لکھا تھا کہ "علم بالانساب اگرچہ علم مظنون ہے مگر اس شخص کے بارے میں تو اس کے نسب کی تصدیق کرتے ہیں۔"

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں انہیں کے ساتھ کچھ کچھ کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں مگر جہاں تک کہ ہمیں معلوم ہے وہ اُن عیوب سے جو انسان کی خساست اور رذالت پر دلالت کرتے ہیں یقیناً پاک تھا۔ اُس کے اخلاق کا اُس کے ہمنشینوں اور جلیسوں پر اثر پڑتا تھا، اُس کو دیکھ کر قومی خدمات کا جوش دلوں میں پیدا ہوتا تھا، اُس کی جفاکشی اور مستعدی اوروں کو جفاکش اور مستعد بناتی تھی، اُس کی سچائی اور ہمت اور استقلال عمدہ ترین ناصح تھے جو اُس کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو وہ اپنے ہائی کیریکٹر سے قوم میں عمدہ اخلاق کا بیج بو گیا ہے۔

اگرچہ سرسید کی زندگی کے واقعات سے جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں، اُن کے اخلاق کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے مگر یہاں ہم اُن خاص خصلتوں کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کو ان کی کامیابی میں بہت بڑا دخل معلوم ہوتا ہے اور جو ان کے تمام افعال و حرکات و سکنات میں ایسی نمایاں تھیں کہ اُن سے شاید ہی اُن کا کوئی دوست اور ملنے والا انکار کر سکے۔

راستبازی

اوّلاً راستبازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راستباز آدمی میں ہونے ضرور ہیں جیسے صدق، مودت، حمیت، دلیری اور آزادی وغیرہ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "اگر سچائی کسی مجسم شکل میں ظاہر ہوتی تو ضرور شیر کی صورت میں ظاہر ہوتی۔" اس قول کی تصدیق جیسی سرسید کو دیکھ کر ہوتی تھی شاید ہی کسی دوسری صورت سے ہوتی ہو۔ اس نے محض اپنی راستبازی کی بدولت ایک عالم کو اپنا مخالف بنایا مگر جس بات کو سچ جانا اُس کے کہنے

میں کبھی تامل نہیں کیا۔ جس بات پر دل سے یقین کر لیا اُسی کے موافق کہا اور ویسا ہی کیا۔ جس بات میں ملک یا قوم کی بھلائی سمجھی اُس کے کہنے اور کرنے میں کسی کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ یہ ممکن ہے کہ سرسیدؔ سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو مگر جہاں تک کہ اُن کی طبیعت اور جبلّت کا اندازہ ہو سکتا تھا یہ بات نہایت مستبعد معلوم ہوتی تھی کہ انہوں نے اپنے کانشنس کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔

وہ جب کوئی بات کسی اپنے دوست سے سچائی کے خلاف سرزد ہوتی دیکھتے تھے تو اُن کو نہایت رنج ہوتا تھا اور اکثر وہ اس کو متنبہ کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اُن کا ایک دوست جو اخبار کا اڈیٹر تھا، اُس کے اخبار میں چند خط ایک عورت کے نام سے چھپے تھے۔ جب وہ پرچہ سرسیدؔ کی نظر سے گزرا تو انہوں نے اُس کو لکھا کہ کیا آپ کو یقین دلی ہے کہ وہ خط درحقیقت کسی عورت کے لکھے ہوئے ہیں؟ اگر ایسا یقین نہیں ہے تو کیا یہ کانشنس کے برخلاف نہیں ہے کہ جس بات کو تم صحیح نہیں سمجھتے اُس کو بطور سچ کے ظاہر کرو؟ میری نصیحت یہ ہے کہ ہر ایک کام میں تم اپنے دل کو ٹٹولو کہ جو کچھ تم کہتے ہو یا کرتے ہو آپ کا دل اُس کو سچ جانتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتا اور اُس کو سچ کے طور پر بیان کیا تو خلاف کانشنس بلکہ خلاف ایمانداری کے کام کیا۔ آپ مجھ کو معاف کیجئے گا، بسبب اس کے کہ آپ سے محبت ہے یہ کڑوی نصیحت کی ہے۔"

جب اُن کے اڈیٹر دوست نے اس نصیحت کا شکریہ لکھا تو اس کا جواب اُنہوں نے اس طرح لکھا ہے" میں اس خیال سے کہ آپ میری کسی تحریر کا بُرا نہ مانیں گے جو میرے دل میں آتا ہے لکھ بھیجتا ہوں، خصوصاً اپنے خاص دوستوں کی نسبت میری خواہش ہے کہ ہر اخلاق میں وہ اعلےٰ درجہ پر ہوں اور سب اخلاق سے مقدم سچائی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے آپ کو سچا جانیں، اور یہ سچائی جیسی کہ قول سے متعلق ہے ویسی ہی فعل سے بھی متعلق ہے۔ ایسی ہی پرائیوٹ خطوط سے اور ایسی ہی اخبار سے۔"

اُن کے ایک نہایت عزیز اور خاص دوست کو ایک زمانے میں ایسے افسر سے سابقہ پڑا تھا، جو نماز پڑھنے پر تعرض کرتا تھا اور اس امر کی اطلاع اُنہوں نے سرسیدؔ کو بھی کی تھی۔ اُن کو اسی باب میں سید صاحب لکھتے ہیں" بھائی کل میں سارے دن متردّد رہا کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔

آج خط آیا اور حال معلوم ہُوا۔ گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا، دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں، ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے، مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا، نہایت لُچرپنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامتِ اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا، یہ بات سُنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سُنی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے۔ جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامتِ اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا، اور گڑگڑانا اور حضور رخصت ہی دیں تنخواہ کاٹ لیں، کہنا واہیات تھا۔ تڑاق سا فی استعفیٰ دے دینا تھا۔ صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ کہ آپ کی، کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسّر ہوتی، نہ ملتی مر جاتے؛ نہایت اچھا ہوتا۔ والسّلام۔"

سرسیّد نے ایک موقع پر دلّی کے ایک نہایت مقدّس عالم سے، جو اپنے شاگردوں اور معتقدوں کو رفعِ یدین کی تاکید کرتے تھے مگر خود کبھی ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے، کہا کہ "حضرت نہایت تعجب کی بات ہے کہ آپ باوجود مقتدائے دین ہونے کے صرف طعن و ملامت کے خوف سے جس بات کو دل سے حق جانتے ہیں، اُس کے موافق کبھی عمل نہیں کرتے۔ ہم ہزاروں گناہ کرتے ہیں اور دنیا کے مکروہات میں پھنسے ہوئے ہیں، مگر جو بات حق معلوم ہوتی ہے اُس کے کرنے میں ایک لمحہ توقف نہیں کرتے اور لوگوں کے طعن و ملامت سے نہیں ڈرتے۔" سرسیّد کے کہنے کا اُن کو ایسا اثر ہُوا کہ انھوں نے اسی روز جامع مسجد میں علی الاعلان رفعِ یدین کیا۔ لیکن معلوم نہیں کہ وہ ہمیشہ اس پر قائم رہے یا نہیں۔

اس شخص نے اگر سچ پوچھئے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اردو لٹریچر میں سچائی اور آزادی کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کے کہنے میں کسی کی طعن و ملامت سے نہ ڈریں۔ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے پہلے جو لوگ عام رائے کے خلاف کوئی بات کسی اخبار میں لکھنا چاہتے تھے، اس میں کبھی اپنا نام ظاہر نہ کرتے تھے، اس نے تہذیب الاخلاق میں مضمون لکھنے کی یہ شرط قرار دی کہ جو لوگ ٹی کی اوجھی شکار کھیلنا اور اپنا نام پبلک پر ظاہر کرنا نہیں

چاہتے، اُن کا مضمون اُس میں درج نہ ہوگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ لوگوں کی جھجک نکلنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ ہر شخص اپنے نام سے کھُلم کھُلا اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا اور بڑے بڑے لائق اور ذی علم اور دین دار لوگ صدہا مضمون عام رائے کے برخلاف اپنے نام سے شائع کرنے لگے۔

بعضے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرسید نے جو قرآن کی تفسیر میں اکثر آیات کے معنی جمہور کے خلاف بیان کیے ہیں، اس پر اُن کو خود یقین نہیں ہے بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ قرآن پر سائنس کی رو سے کوئی اعتراض وارد نہ ہو۔ یہ حال سرسید کو بھی معلوم ہوا، اُنھوں نے نہایت جوش میں آکر کہا کہ "اگر دینِ اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام کو ترک کر دیتا"، وہ سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں، اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔"

اُس نے اپنی راستی اور صاف گوئی سے صرف اُن مسلمانوں ہی کو مخالف نہیں بنایا جو پُرانے خیالات رکھتے تھے اور جن سے کسی طرح موافقت کی امید نہ تھی بلکہ جو بات اُس کو حق معلوم ہوئی اُس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دُنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں میرے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے یا نہیں۔ نیشنل کانگرس کے خلاف لکچر دینے سے پہلے تمام تعلیم یافتہ ہندو بنگالہ سے کشمیر تک سرسید کو ملک کا سچا خیر خواہ جانتے تھے، اُن کی نہایت تعریف کرتے تھے، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ اُن کی قدر کرتے تھے، اخباروں میں اُن کی نسبت مدحیہ آرٹکل چھپتے تھے، اپنی قومی مجلسوں کی طرف سے ان کے سامنے ایڈریس پیش کرتے تھے، پبلک اسپیچوں میں اُن کا ذکرِ خیر کرتے تھے۔ سرسید کو معلوم تھا کہ اگر کانگرس کے خلاف ایک حرف بھی کہا تو کم سے کم تعلیم یافتہ ہندو تاطبۃً مخالف ہو جائیں گے مگر جب اُن کو پختہ یقین ہو گیا کہ کانگرس کی اکثر خواہشیں ناممکن الوقوع اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں مضر ہیں اور مسلمانوں کا اُس میں شریک ہونا پولٹکل خطرات کا باعث ہوگا، اُنھوں نے نہایت زور شور سے مسلمانوں کو اُس کی شرکت سے روکا اور کانگریشین گروہ کی ناراضی کا کچھ خیال نہ کیا۔ بنگالیوں نے اُن کو خود غرض اور اینگلو انڈینز کا خوشامدی اور ٹائم سرور سب کچھ کہا۔ صدہا آرٹکل بنگالی اخباروں میں اُن کے خلاف چھپے گئے۔ کے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب جو حضور ملکہ معظمہ قیصرِ ہند نے اُن کو عنایت فرمایا، اُس کو بنگالیوں نے کانگرس کی مخالفت کرنے کا صلہ قرار دیا۔ مسٹر ہیوم جو سرسید کے

دوست تھے وہ اُن سے سخت بدگمان ہو گئے۔ بعضے ریجوکیٹڈ مسلمان بھی اُن کی سلرٹ سے کھٹک گئے، مگر سرسید نے کسی بات کی کچھ پروا نہیں کی اور جہاں تک ممکن تھا مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے نہیں دیا۔

سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گزرتی تھی کہ اُن پر راستبازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کیونکہ یہ شخص فی الواقع راستبازی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔ جس زمانے میں وہ ولایت میں تھے اُنھوں نے ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر جو اُس وقت یہاں جاری تھا، ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا تھا جس میں ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر بہت کچھ نکتہ چینی کی تھی۔ ازانجملہ ایک دیہاتی مدرسے کی نسبت جس کا اُنھوں نے ہندوستان میں خود معائنہ کیا تھا، یہ لکھا تھا کہ مکانِ مدرسہ میں گائے بندھی ہوئی تھی اور مدرس اور لڑکے سب غیر حاضر تھے۔ وہ جب ہندوستان میں پہنچا تو سر ولیم میور جو اس وقت شمالی مغربی اضلاع میں لفٹننٹ گورنر تھے، اُن کی نظر سے بھی گزرا۔ چند روز بعد اُنھوں نے ایک پبلک اسپیچ میں کہا کہ میں نے ضلع میں دورہ کرتے ہوئے کافی طمانیت حاصل کی ہے کہ تعلیم کی حالت عمدہ ہے اور اس محنت اور کوشش کے نشان ظاہر ہیں جو سید احمد خاں کے نتایج کے [illegible] ہے۔

یہ اسپیچ مع اردو ترجمہ کے اخبار میں چھپ کر ولایت پہنچی اور سرسید کی بھی نظر سے گزری۔ ترجمہ کے الفاظ سے وہ یہ سمجھے کہ سر ولیم میور نے مجھ پر دروغ گوئی کا الزام لگایا ہے۔ اُن کو نہایت رنج ہوا اور جب ہندوستان میں واپس آئے تو الہ آباد میں ہز آنر سے مل کر نہیں گئے سیدھے بنارس چلے گئے۔ ہز آنر کے پرائیویٹ سکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام بنارس میں پہنچی جس میں لکھا تھا کہ نواب لفٹننٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوتے ہیں اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں۔"

سرسید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی۔ یہ چٹھی ۷ نومبر کی تھی۔ سر ولیم نے نویں نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے:-

"مائی ڈیر سید احمد! آپ کی ساتویں نومبر کی چٹھی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف

واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہوگا۔ میں اُن نتائج[1] سے جو آپ نے نکالے ہیں، اب بھی اختلاف رکھتا ہوں۔ مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا۔

"مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے فوراً مجھ کو براہ راست کیوں نہ لکھا۔ آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے کہ گویا آپ نے اس قدر اعتبار اور بھروسہ مجھ پر نہ کیا جس کی میں آپ سے اُمید کرتا تھا۔ اور شاید اُمید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔

"مسٹر ریملی نے اُردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لمحہ بھی کبھی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا۔ اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ چونکہ اس معاملے کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا، میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اس کے شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔

"کیپٹن ملنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجہ بالا خط و کتابت کے حوالے سے لکھیں گے۔ اس وقت میں صرف اِتنا کہوں گا کہ میں آپ کے بیٹے کے لیے عُمدہ حالات سُننے سے نہایت خوش ہُوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہنچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہوں گا۔"

سرسید نے اس چٹھی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ "آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ میرے دل پر سے اُٹھ گیا۔"

کرنل گراہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "سرولیم نے سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی کہ میری چٹھی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں۔ اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑی تلاش سے وہ چٹھی ملی۔"

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بیشک ایسی طبیعت اور ایسے رتبے کے ہندوستانی، جیسے کہ سرسید تھے، بہت کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہے پر صوبے کے گورنر سے ناراضگی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ ان کی دل جوئی کی گئی۔ مگر ہندوستانی شرفاء میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے

---

[1] سرسید نے اپنے پمفلٹ میں ایک دیہاتی مدرسے کے معائنہ سے جہاں گائے بندھی ہوئی اور مدرس اور طلبہ غیر حاضر تھے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدارس کی یہ حالت ہے مگر سرولیم میور اس نتیجہ کو صحیح نہیں سمجھتے تھے اور نیز یہ کہ جس گاؤں کے مدرسے کا اُنہوں نے پمفلٹ میں حوالہ دیا تھا اُن کا وہ بیان غلط تھا۔ ۱۲

جو محض اپنی منود کے لئے حکام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا جیسی کہ سر ولیم کی تحریر سرسید کے نام تھی، نہایت سُبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گزرا۔ جب سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحبِ ممدوح کو اُس کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اُن کے دل میں عنایت اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علی گڑھ کی طرف سے ایامِ غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے، اس لئے وہ افتتاح کی رسم میں ان کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اُنہوں نے سرسید سے کہا کہ "اس جلسے میں اگر عنایت اللہ خاں شریک ہوں گے تو ہم نہیں آنے کے" سرسید نے کہا۔ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی سے سوسائٹی کی امداد کی ہے اور جو اس کا پریذیڈنٹ بھی ہے اُس کو شریک نہ کیا جائے" اُنہوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہ کیا کہ عنایت اللہ خاں مرحوم کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم کی جائے آخر مسٹر بریلی نے جو علی گڑھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سرسید کے دوست تھے بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو راضی کیا اور اُن کو عنایت اللہ خاں کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنی پڑی۔ سرسید کا اس باب میں اصرار کرنا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ اُن کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خاں کو ہر ایک الزام سے پاک صاف جانتے تھے۔

جن یوروپین افسروں نے ابتداء میں مدرستہ العلوم کی مخالفت کی تھی یا اُس کے لئے سرکاری زمین ملنے میں مزاحم ہوئے تھے، سرسید نے اُن سے پرائیویٹ طور پر ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور کبھی اُن کے ساتھ ظاہرداری کا برتاؤ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ہم نے سُنا ہے کہ جب حضور سر جان اسٹریچی ہندوستان سے ولایت کو جانے لگے اور کالج کمیٹی علیگڑھ کی طرف سے اُن کو ایڈریس دینا قرار پایا تو جو مسودہ ایڈریس کا انعقادِ جلسہ سے پہلے سرسید نے لکھ کر جناب ممدوح کے ملاحظہ کے لئے بھیجا تھا اُس میں خلل انداز ہوئے تھے۔ اگرچہ جناب ممدوح کے ایما سے آخر کار وہ شکایت آمیز الفاظ سرسید کو مسودے میں سے نکالنے پڑے مگر سرسید نے ہز آنر سے صاف صاف کہہ دیا کہ جس طرح ہم اپنے محسنوں کا احسان نہیں بھول سکتے اسی طرح نامہربان افسروں کی شکایت ہمارے دل سے فراموش نہیں ہو سکتی۔

سرسید نے یوروپین ڈریس جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے محض انگریزوں کی تقلید سے اختیار نہیں

کیا تھا، بلکہ زیادہ تر اُس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومی لباس اُن کی ہموطن قوموں سے مختلف ہونا چاہیئے، اور چونکہ مصر و قسطنطنیہ و ایران اور اکثر ممالکِ اسلامیہ میں مسلمان ٹرکش ڈریس یا اُس کے قریب قریب پہنتے ہیں، اس لئے انہوں نے خود ترکی لباس اختیار کر کے اپنی قوم کے لئے ایک مثال قائم کی تھی۔ باوجود اس کے کہ اُن کو اس فیشن کے سبب اکثر مواقع پر سخت مشکلات پیش آئیں مگر انہوں نے جو وضع مسلمانوں کے لئے مناسب سمجھ کر اختیار کی تھی، اُس سے کبھی سر مو تجاوز نہیں کیا۔ دلّی میں دربارِ قیصری کے موقع پر جب کہ حضور نظام کو کالج کمیٹی کی طرف سے سپاسنامہ دیا گیا، سرسید اُس کو خود صرف اس وجہ سے پیش نہ کر سکے کہ وہاں جوتا اتار کر جانا ضرور تھا۔ چنانچہ کمیٹی کے اور ممبروں نے سپاسنامہ پیش کیا اور سرسید اُن کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ بنارس کے کمشنر مسٹر پی کارمیکل سے وہ جوتا پہن کر آنے کی شرط پر ملے، حالانکہ کمشنر موصوف جوتا اُتروائے بغیر کسی ہندوستانی کو اپنے بنگلے میں نہ آنے دیتے تھے۔ مسٹر واٹسن جب تک علی گڑھ میں کلکٹر رہے ہم نے سُنا ہے کہ سرسید کبھی اُن سے نہیں ملے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ سید احمد خاں جوتا اُتار کر اُن کے کمرے میں جائیں، مگر اُنہوں نے اِس کو منظور نہیں کیا۔ نواب کلب علیخاں مرحوم رئیس رام پور کے ہاں صرف چندے کی غرض سے وہ اُس وقت گئے تھے جب کہ مدرسہ نہایت بے سروسامانی کی حالت میں تھا۔ اور امداد کی نہایت اشد ضرورت تھی۔ نواب صاحب کے دربار کا قرینہ یہ تھا کہ وہ خود ایک پلنگڑی پر بیٹھے رہتے تھے اور جو شخص ملنے جاتا تھا اُس کو فرش پر دوزانو بیٹھنا پڑتا تھا۔ ہم نے سُنا ہے کہ سرسید نے جب تک کرسی پر بیٹھنے اور جُوتا پہننے کی اجازت حاصل نہیں کر لی وہاں جانے کا ارادہ نہیں کیا۔

سرسید جیسے خود راستباز تھے، اسی طرح راستبازوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہتک گئے ہیں اُس وقت خان بہادر منشی غلام نبی خاں مرحوم رئیس میرٹھ وہاں نوکری کے اُمیدوار تھے۔ پھر چند روز بعد وہ نائب سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہو گئے تھے اُس وقت حسنِ اتفاق سے رہتک میں چند لائق اور ذی علم اہلکار سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں موجود تھے جن کی سرسید کے ہاں آمد و رفت تھی۔ خان بہادر نے اُن سے یہ خواہش کی کہ مجھے سید صاحب سے ملا دو۔ اُنہوں نے کہا بہت اچھا مگر وہ لامذہب[1] ہیں۔ یہ فقہاء کی اصطلاح سے ناواقف تھے اُنہوں

[1] مذہب کا لفظ جو آجکل دین کے معنی میں بولا جاتا ہے فقہا کی اصطلاح میں اُس کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک امام کے طریقے کو مذہب کہتے ہیں اور اِسی لئے وہ لامذہب اُس کو کہتے ہیں جو کسی خاص امام کے طریقے کا پابند نہ ہو۔ ۱۲

نے یہ سمجھا کہ سید صاحب قید اسلام سے آزاد ہیں۔ ایک دن سید صاحب اور دیگر اہل کار ایک جگہ جمع تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ سب نے سید صاحب کو امام بنایا۔ منشی غلام نبی خاں چونکہ نہایت کھرے اور سچے آدمی تھے اُن کو تعجب ہوا کہ ان لوگوں نے ایک لامذہب (یعنی غیر مسلم) کو کس طرح امامت پر کھڑا کر دیا۔ جونہیں سر سید نے نیت باندھی انہوں نے الگ چادر بچھا کر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ سر سید نے نماز ہی میں یہ معلوم کر کے نیت توڑ دی اور منشی صاحب سے کہا کہ آپ نماز پڑھائیے۔ اُنھوں نے کہا میں امامت کی لیاقت نہیں رکھتا لیکن آپ اپنا مذہب[1] مجھے بتلائیں اُس وقت اگر میرا دل ٹھکے گا تو میں خود آپ کا مقتدی بنوں گا، ورنہ مجھے معاف فرمایئے گا۔ سید صاحب نے کہا میں شافعی مذہب رکھتا ہوں۔ منشی صاحب نے کہا تو بسم اللہ میں آپ کے پیچھے بڑی خوشی سے نماز پڑھوں گا۔ آخر سر سید ہی نے نماز پڑھائی۔

یہ واقعہ منشی صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور کہتے تھے کہ "اس موقع پر میری یہ صفائی دیکھ کر سید صاحب مجھ پر حد سے زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ باوجودیکہ اُس وقت اُن کے ایک ادنیٰ ماتحت اہل کار کی حیثیت رکھتا تھا جس روز میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا، وہ بلا تکلف میرے مکان پر تشریف لے آتے تھے حالانکہ ان کی عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہ تھی، باوجود اس کے اُنھوں نے گری صاحب جنٹ مجسٹریٹ رہتک سے ایک نہایت نازک موقع پر میری سفارش کی۔ دوسری دفعہ جو وہ ایک مہینے کے لئے رہتک بدل کر گئے تو مکان علیحدہ کرایہ کو نہیں لیا۔ بلکہ صرف اس نظر سے کہ وہاں کے لوگوں کی نگاہ میں میری وقعت زیادہ ہو میرے ہی غریب خانے پر آکر اُترے اور مہینہ بھر تک وہیں قیام کیا۔ پہلی دفعہ جب وہ علیحدہ مکان میں رہتے تھے ایک روز میں سخت بیمار ہو گیا تھا جس سے پیشاب اور پاخانہ بند ہو گیا۔ مجھے نوکر ہوئے چند روز گزرے تھے اور میری تنخواہ صرف تیس روپئے ماہوار تھی اور ایک آدمی کے سوا کوئی نوکر نہ تھا۔ غرضیکہ عجیب بیکسی کی حالت تھی۔ صدر امینی کے ناظر نے جو میرے مکان کے قریب رہتا تھا میرے حال کی اطلاع پا کر سید صاحب کو رات کے نو بجے جا خبر کی۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سید صاحب یونانی حکیم صاحب کو ساتھ لئے چلے آتے ہیں اور ہوسپٹل اسسٹنٹ کو جیلخانے سے لانے کے لئے آدمی بھیج کر آئے

[1] دین نہیں بلکہ آئمہ اربعہ میں سے کسی امام کا طریقہ "مذہب"۔

ہی تھوڑی دیر میں ڈاکٹر بھی آگیا مگر حکیم کو دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ اگر ان کے علاج سے فائدہ نہ ہو تو مجھے پھر اطلاع دی جائے اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ اتفاق یہ کہ حکیم صاحب کے علاج سے کچھ نفع نہ ہوا۔ سید صاحب نے ڈاکٹر کو پھر بلایا اور رات کے دو بجے اُس نے آکر جلاب دیا، یہاں تک کہ صبح کی نماز کے وقت جا کر مجھے اجابت ہوئی اور میری تکلیف بالکل رفع ہو گئی۔ سید صاحب تمام رات میرے سرہانے پر جاگتے رہے اور جب مجھے افاقہ ہو لیا تو صبح کی نماز پڑھ کر اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔ جس شفقت اور بزرگانہ عنایت کے ساتھ انھوں نے میری تیمارداری میں وہ رات بسر کی اُس کو میں تمام عمر فراموش نہ کروں گا۔"

منشی صاحب کہتے تھے کہ "دلی میں مولوی امام بخش صہبائی نے سید صاحب سے پوچھا کہ تم نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی جو اس پر اس قدر مہربان ہو۔ سید صاحب نے کہا "کچھ نہیں صرف اتنی بات ہے کہ جیسا میں سِڑا ہوں ایسا ہی وہ سِڑا ہے۔"[1]

جس زمانے میں کہ سر سید انگلستان میں تھے اور ان کی آزادانہ تحریریں جو ہندوستان میں آکر بذریعہ سوسائٹی اخبار کے شائع ہوتی تھیں ان پر چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑتی تھی، ان دنوں میں مولوی سید مہدی علی خاں اُن کو برابر ممانعت کے خط بھیجتے تھے کہ ایسی تحریریں یہاں نہ بھیجنی چاہئیں۔ ایک دفعہ انھوں نے گردن مروڑی مرغی کا ذکر نہایت صفائی اور آزادی سے لکھ بھیجا۔ جس پر یہاں بہت لے دے ہوئی اور مولوی صاحب ممدوح نے اپنے خط میں اس تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں سر سید نے ان کو ایک لطیف تحریر بھیجی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "جن لفظوں میں میں نے غیر ذبح کی ہوئی مرغی کھانے کا ذکر لکھا اور جن سے آپ کو افسوس ہوا اس کا عذر کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر ہندوستانی طور پر، نہ شرعی طور پر توبہ کرتا ہوں۔ افسوس کہ مجھے ایسے الفاظ لکھنے نہ آئے جن سے آپ کو افسوس نہ ہوتا۔ برائے خدا معاف کیجئے۔ جب میں وہ الفاظ لکھ رہا تھا تم میرے دل میں اور میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تم ناپسند کرو گے۔ بھائی! تم یہ بات پسند کرتے ہو کہ میں جُھوٹا کروں اور اس کو اس لئے چھپاؤں

[1] چونکہ سچا آدمی مصلحت اندیش نہیں ہوتا اور اپنے کھرے پن سے لوگوں کو اپنا مخالف بنا لیتا ہے۔ اس لئے انھوں نے آپ کو اور منشی صاحب کو سڑا یعنی دیوانہ فرما دیا۔

کہ لوگ بُرا نہ کہیں ؛ ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں سے ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا، جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے، جو بات کہتے ہیں سُن لیتا ہے، جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے، ایسا پیچھے چمٹا ہے کہ نہ جہاز میں چھوڑے نہ زمین پر چھوڑے، نہ رات کو الگ ہو، نہ دن کو الگ ہو نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس جب میں نے نہایت سچے دل اور دُرست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈر کرتا میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں نہ روایت شاذہ سے۔ والیٔ مصر کے ساتھ بعض علماء مصر بھی تھے، سب انگریزوں کے ساتھ غیر ذبح کئے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔ بہرحال میں اس پیا گفتگو نہیں کرتا۔ شاید میں غلطی پر ہوں صرف معافی چاہتا ہوں۔"

محبت و صداقت | دوسرے محبت اور اُلفت کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لئے انکے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بدرجۂ غایت پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو ایک دوسرے دوست کی نسبت جس سے کچھ شکر رنجی ہو گئی ہے لکھتے ہیں: "وہ دوستی و محبت کے معاملات و برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ کسی پر وہ عاشق نہیں ہوئے، کسی سے انھوں نے دل نہیں لگایا ان کو مزہ دوستی اور محبت کا مطلق معلوم نہیں۔ سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ خدا کی دوستی کا مزا جانتا ہے نہ انسان کی دوستی کا، اور نہ محبت کے لائق ہے۔"

ایک اور خط میں سید مہدی علی کا مضمون گردن مروڑی مرغی کے برخلاف اخبار میں دیکھ کر ان کو لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "آپ نے جو کچھ میرے مُردار مُرغی کھانے کی نسبت اخبار میں لکھا آپ یقین کیجئے کہ اس نے عجب لُطف مجھ کو دیا ہے۔ پہلے مجھے یہ تو بتاؤ کہ دولتِ عشق مجازی بھی تم کو نصیب ہوئی ہے یا نہیں؛ کیونکہ بغیر اس کے آدمی میں اور مٹی میں کچھ فرق نہیں ہے۔"

کنبے کی محبت | انسان کی محبت سب سے پہلے اپنے کنبے کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک نیچرل تعلق ہے۔ کسی کا قول ہے کہ "جس کے دل میں اپنے کنبے کی محبت نہیں اُس کو کسی سے بھی محبت نہیں۔" سرسید کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ ان کو بیس برس نہیں بھولا۔ سُنا ہے کہ اُن کے عزیز اُن کے سامنے بھائی کا ذکر اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کا داغ تازہ ہو جائے گا۔ بہت مدت کے بعد اُن کی بھتیجی کے مُنہ سے باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا۔ سرسید کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ گویا

آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہے۔

بھائی کے مرنے کے بعد انھوں نے صغیر سن بھتیجے کو اس طرح پرورش کیا جیسے مائیں اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہیں۔ باوجودیکہ بھاوج زندہ تھیں، بھتیجے کو کبھی اپنے سے جُدا نہیں کیا۔ سفر اور حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ مدتوں اپنے ساتھ ایک پلنگ پر سُلایا۔ اور ہر طرح سے اس کی دلداری اور دلجوئی کی غدر میں جب سارا کنبہ دلّی میں تھا اور آپ بجنور میں تھے، اس وقت بھی بھتیجا ان کی جان کے ساتھ تھا۔

جب سرسید کی بی بی کا انتقال ہوا اُس وقت اُن کی عمر کچھ اوپر چالیس برس کی تھی اور تین صغیر سن بچے جن کی پرورش اور رکھ رکھاؤ اکیلے باپ سے ہونا سخت دشوار تھا، موجود تھے۔ ہر چند دوستوں نے سمجھایا کہ دوسری شادی کر لو تا کہ اپنی زندگی بھی آسائش سے گزرے اور بچوں کی پرورش میں بھی آسانی ہو مگر محبت اور وفاداری نے ہرگز اجازت نہ دی۔ اُن کے ایک دوست کا بیان ہے، کہ میں ہمیشہ ان کو دوسرے نکاح کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ وہ سن کر ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ ایک دن وہ برآمدے میں ٹہل رہے تھے، میں نے پھر وہی ذکر چھیڑا، انھوں نے دردناک لہجے میں کہا کہ "محمود کی ماں کہاں سے آوے گی"، پھر میں نے یہ ذکر کرنا چھوڑ دیا۔"

جب وہ انگلستان گئے تو وطن سے بیٹی کی سخت بیماری کا تار پہنچا۔ اُنھوں نے فوراً وہاں سے تار دیا کہ اگر ہمارے پہنچنے تک اس کے بچنے کی اُمید ہو تو ہم واپس ہندوستان آنے کو تیار ہیں۔ مگر دوسرا تار اس کے مرنے کا پہنچا جس سے ان کو ایسا سخت صدمہ ہوا کہ جب تک ولایت میں رہے غمگین اور افسردہ خاطر رہے اور جب ولایت سے واپس آئے تو دلّی جانے کو ہرگز جی نہ چاہتا تھا۔ باوجودیکہ ان دنوں میں دیوانی کی بڑی تعطیل تھی۔ صرف ایک دو روز دلّی میں ٹھیرے اور ساری تعطیل علی گڑھ، مرزاپور اور بنارس میں بسر کی۔

---

[1] سرسید کی بی بی جیسا کہ معتبر ذریعوں سے سُنا گیا ہے۔ فی الواقع ایسی نیک سرشت اور لائق بیوی تھی جس کے بعد سرسید کا دوسرا نکاح کرنا بہ نسبت نہ کرنے کے زیادہ تعجب انگیز ہوتا وہ بھی اُسی نانا کی نواسی تھی جس کے سرسید نواسے تھے اور اس لئے نیکدلی اور عالی حوصلگی دونوں میاں بیوی میں یکساں پائی جاتی تھی۔ سرسید کے بعض احباب کا بیان ہے کہ اگر کبھی سرسید کی غیبت میں ان کے مکان پر جانا ہو گیا ہے تو ہماری ویسی ہی مدارات ہوئی ہے جیسی ان کی موجودگی میں ہوتی تھی، ہم کو یہ بالکل معلوم ہوتا تھا گویا سید صاحب خود مکان پر موجود ہیں۔"

اپنی والدہ کے ساتھ جیسی ان کو دل بستگی تھی ایسی بہت ہی کم سنی گئی ہے اور جیسی کہ وہ جوانی میں ماں کی اطاعت کرتے تھے اور ان کے غصے اور خفگی کی برداشت کرتے تھے۔ اس طرح بچے بھی اپنے ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھ کو ماں کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا کہ بھائی کے مرنے کا ہوا تھا۔ کیونکہ غدر کے مصائب کا زمانہ تھا اور ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو میں پہلے مر جاؤں اور میرے بعد والدہ کی زندگی تلخی اور سختی میں گزرے۔ انھوں نے مرنے سے چند سال پہلے میرٹھ میں جہاں ان کی والدہ مدفون ہیں ایک پبلک اسپیچ میں اپنی ماں کا ذکر کیا معاً ان کا دل بھر آیا اور اس بڑھاپے میں ان کو ماں کے ذکر پر روتا دیکھ کر لوگ متعجب ہو گئے۔ بھائی کے نواسوں کو نہایت شفقت کے ساتھ انھوں نے سرپرستی کی اور ان کو اعلیٰ درجے کی تعلیم دلوائی۔ اپنے خالہ زاد بھائی کے نواسوں کو انھوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے پاس رکھا اور جب تک وہ انگلستان نہیں گئے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

وطن کی محبت اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت اور موانست ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسے وطن کے ساتھ جیسے کہ دلی ہے جہاں پردیسی بھی آ کر زمین پکڑ لیتے ہیں۔ مگر سرسید کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ان کو دلی کی منصفی سے دوسری جگہ ترقی پر بھیجتے تھے اور وہ وہاں سے ہرگز نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ تو وہ زمانہ تھا کہ دلی میں چند خاندان نام و نمود کے باقی تھے۔ اور ہر قسم کے اہلِ کمال اور اہلِ ہنر زمانے کی بساط کے مطابق وہاں موجود تھے۔ قلعہ کا چراغ اگرچہ ٹمٹما رہا تھا مگر گل نہ ہوا تھا۔ سرسید کو جو زندہ دل سوسائٹی وہاں میسر تھی دوسری جگہ اس کے ملنے کی امید نہ تھی۔ مگر غدر کے بعد جب وہاں کے مسلمان بالکل مٹ گئے اور دلی ایک قالب بے روح رہ گئی اب اسی حبِ وطن کا یہ تقاضا ہوا کہ جن آنکھوں سے اس کی بہار دیکھی تھی، انھیں آنکھوں سے اس کی خزاں کیونکر دیکھی جائے۔ گو بظاہر سرسید نے دلی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی تھی، مگر آدم کو بہشت چھوڑنے کا بھی اتنا ہی افسوس ہوا ہوگا جتنا کہ سرسید کو دلی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ ان کے آرٹیکلوں میں یا اسپیچوں اور لیکچروں میں یا پرائیویٹ خطوط میں جہاں کہیں دلی کا ذکر آ گیا ہے ان کا دل امڈے بغیر نہیں رہا۔

وہ اپنی کتاب راہِ سنت پر ریمارک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں، کجا وہ مجلسیں، کہاں ہے آزردہ کہاں وہ شیفتہ

اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علماء و صلحاء صرف یاد ہی یاد ہے۔"

ایک اور آرٹیکل میں جہاں اُردو اخباروں کا ذکر کیا ہے، وہ یوں لکھتے ہیں "اس اُجڑے شہر کے اخباروں کا بھی جس کا نام لیتے دل بھر آتا ہے ہم دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے وطن کے اخبار ہم سے اس لئے ناراض ہیں کہ مدرسۃ العلوم دہلی میں کیوں نہ مقرر ہوا؟ بھائی کہاں ہے وہ دلی اور کہاں ہیں وہ دِلی والے؟ جو نقش کہ مٹ گیا اس کا اب نام کیا لینا ہے۔ مرثیہ پڑھا کرو اور دِلی والوں کو یاد کیا کرو۔"

جس زمانے میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں تجویز ہو رہا تھا اُنھوں نے اپنے ایک دوست کو یہ لکھا تھا کہ آپ کی سب کوششیں اور تدبیریں اور خیالات بے سُود ثابت ہوں گے، نہ دہلی میں کوئی انتظام کرنے والا ہے اور نہ دہلی اِس لائق رہی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں پر، مسلمانوں کے گھروں پر، مسلمانوں کے محلّوں پر اب تک نحوست برستی ہے۔ ان کی طبیعت، ان کے اخلاق، راہ و رسم، سوشل حالت ایسی تبدیل ہو گئی ہے کہ جب کبھی دِلی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کی باتیں سُن کر متعجب ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں؟ خدا نے دِلی سے سب کچھ چھین لیا۔ ذالک تقدیر العزیز العلیم۔

سر سید کی طبیعت میں ایک خاص صفت تھی جو بڑے بڑے کاموں کا بوجھ اُٹھانے والوں میں ہونی نہایت ضروری ہے۔ وہ دل بجھانے والی اور ہمت توڑنے والی تقریروں سے ہمیشہ دُور دُور اور الگ بھاگ رہنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو جس قدر قومی اور ملکی اور مذہبی خدمات انھوں نے انجام دی ہیں اُس کا عشرِ عشیر بھی ان سے سرانجام نہیں ہو سکتا تھا۔ سید حامد مرحوم کے انتقال کا صدمہ ان پر نہایت سخت ہوا تھا۔ دو وقت اُنھوں نے بالکل کھانا نہیں کھایا اور پندرہ بیس روز تک ان کی حالت نہایت نازک رہی مگر جس وقت بیٹے کا دم نکلا اور کہرام مچا وہ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ کے مکان پر چلے گئے اور جب تک لوگ ان کو دفن کر کے نہ آئے چپ چاپ وہیں بیٹھے رہے اور پھر جو اُس روز سے علیگڑھ گئے ایک آدھ بار سے زیادہ پھر کبھی جا کر گھر کی صورت نہ دیکھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے دِلی کا غم بھلانے کے لئے دِلی کی بود و باش ہی ہمیشہ کے لئے ترک کر دی تھی۔ ان کے بعض ہم وطن کہتے ہیں کہ اگر دِلی سے کچھ اُنس ہوتا تو دِلی چھوڑ کر علی گڑھ میں

مدرسۃ العلوم قائم نہ کرتے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر بنی اُمیّہ کو بغداد سے اُنس ہوتا تو وہ اُندلس میں جا کر اپنی سلطنت قائم نہ کرتے۔ دلّی جو سیکڑوں برس مسلمانوں کا دارالحکومت رہا اور اس لئے پُرانے خیالات اور قومی و مذہبی تعصبات کا مرکز تھا۔ وہاں سرسیّد کے منصوبوں کا پُورا ہونا بلا شبہہ ایسا ہی مشکل کام تھا جیسا مکّہ میں اسلام کا نشوونما پانا۔

اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سرسیّد کے دل میں قوم کی بھلائی کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش زیادہ تر دلّی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا۔ فتح دہلی کے بعد جس وقت وہ میرٹھ سے اپنی ماں اور خالہ کی خبر لینے کو دلّی میں پہنچے تو انھوں نے تمام شہر کو بالکل ویران پایا۔ یہاں تک کہ جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے پیاسوں کے لئے پانی کی ضرورت ہوئی تو ایک صراحی پانی کے لئے ان کو خود قلعہ میں جانا پڑا۔ جس دوست یا عزیز کا حال دریافت کیا اُس کو مقتول سُنا یا مفقود۔ جس قلعہ میں سلاطین کے عیش و عشرت کے سامان دیکھے تھے، اُس کے درو دیوار سے خون کی بو آتے دیکھی۔ اگرچہ اُس وقت ہزاروں ایسے بھی تھے جو مرگ انبوہ کو جشن سمجھتے تھے مگر سرسیّد جیسے ذکی الحس آدمی کے لئے یہ انقلاب ایک تازیانہ تھا۔ دلّی کا وہ سناٹا دیکھ کر ایک ایسی چوٹ ان کے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ زخم اور آخر کار ناسور بن گئی مسلمانوں کی تعلیم کا خیال بھی اگر سچ پوچھیے تو دلّی کی ہی حالت دیکھ کر اُن کے دل میں پیدا ہوا۔ غدر سے پہلے جیسے دلّی کے لوگ دنیا کے حالات سے بے خبر تھے ایسے شاید ہی کسی دوسری جگہ کے لوگ ہوں۔ سرسیّد کہتے تھے کہ ایک دفعہ جو میں رہتک سے کسی تعطیل میں دلّی آیا تو وہاں کے ایک مُعزّز آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں گئے تھے اور جب میں نے رہتک کا نام لیا تو انہوں نے تعجب سے کہا کہ کیا رہتک بھی انگریزوں کی عملداری میں ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ دلّی کے اکثر پڑھے لکھے آدمی ہر ایک مجسٹریٹ کو مٹکاف کہتے تھے۔ کیونکہ پہلے مجسٹریٹ کا نام مٹکاف تھا۔"

دوستوں کے ساتھ برتاؤ | جو برتاؤ سرسیّد کا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانے کے دوستوں سے بالکل نرالا تھا۔ جہاں تک اُن کا حال دیکھا گیا اُن کی خوشی بلکہ ان کی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا کام اور دوستوں کی مُلاقات۔ اُن کو شاید ہی کبھی ویسی خوشی ہوتی ہو جیسے اپنے خالص اور مُخلص دوستوں سے مل کر ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع دوستوں کو زندگی کا ایک عنصر سمجھتے تھے، اُن کا اُس مقولے پر پورا پُورا عمل تھا کہ "اگر ساری دُنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست

مل جائے تو ارزاں ہے۔" باوجودیکہ دن بھر میں کوئی گھنٹہ بلکہ کوئی منٹ کام سے خالی نہ ہوتا تھا اور ایسے شخص کو تنہائی زیادہ پسند ہونی چاہیے، بااینہمہ دوستوں سے کبھی ان کا جی نہ اُکتاتا تھا۔ ابتدائی مُلاقاتوں میں وہ بہت روکھے پھیکے معلوم ہوتے تھے۔ ناواقف آدمی ان کو پہلی بار دیکھ کر نہایت عبوس اور خشک مزاج سمجھتا تھا مگر جس قدر زیادہ ان سے ربط بڑھتا جاتا تھا اسی قدر اس مقولہ کی تصدیق ہوتی جاتی تھی کہ الرغبة الی الکریم تحببک و تقربک منه و ترفع بحجاب الحشمة بینک و بینه[1]۔ کرنل گریہم لکھتے ہیں کہ میں اُس کو (یعنی سرسید کو) ایک چوتھائی صدی سے جانتا ہوں، میرا اُن کا تعلق بمنزلہ ایک رشتہ دار کے ہے نہ کہ بطور ایک دوست کے۔ جتنی زیادہ اُن کی میری واقفیت بڑھتی گئی اُسی قدر اُن کی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوتی گئی۔"

سرسید اپنا دشمن تو شاید ہی کسی کو سمجھتے ہوں مگر جن کو وہ اپنا دوست جانتے تھے وہ بھی تعداد میں کچھ کم نہ تھے۔ قوم کی عام خیرخواہی نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کے دل میں اُن کی جگہ کر دی تھی۔ انہیں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کی دوستی یارانہ کے درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اپنی اور ان کی چیز میں کچھ فرق نہ سمجھتے تھے۔ سرسید کا گھر اُن کا ہوٹل یا سرائے تھا اور ان کا دل سرسید کی مٹھی میں تھا۔ وہ جب اور جس قدر چاہتے اُن کے نام بغیر پوچھے چندہ لکھ دیتے تھے اور ان کو طوعاً یا کرہاً قبول کرنا پڑتا تھا۔

دوستی کے متعلق ایک کتاب میں یہ حکایت لکھی ہے کہ "ایک روز امام محمد باقرؒ نے اصحاب سے کہا کہ تم میں کوئی ایسا شخص ہے کہ دوست کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جس قدر نقدی کی ضرورت ہو اُس میں سے نکال لے؟ سب نے عرض کیا "لا واللہ یا ابن رسول اللہ" آپ نے فرمایا "بس تو تم میں کوئی دوستی کے لائق نہیں ہے" مگر سرسید کا حال اپنے دوستوں کے ساتھ اور اُن کے دوستوں کا حال سرسید کے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا کہ ایک دوسرے کی جیب سے جو چاہتے نکال سکتے تھے۔

سرسید کے دوستوں میں سے اُن کے ایک نہایت عزیز دوست خرچ میں کبھی اعتدال اور میانہ روی سے تجاوز نہیں کرتے مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سرسید نے اُن سے چندہ مانگا ہو اور انہوں نے انکار کیا ہو۔ وہ اپنی جبلی عادت کے موافق بطور ظرافت کے کہا کرتے ہیں کہ قومی ہمدردی تو ہم کو معلوم نہیں کس چیز کو کہتے ہیں۔ ہاں مگر سید احمد خاں کی زبان میں عجب جادو تھا کہ جہاں روپیہ دو روپیہ دینا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ وہاں اُن

---

[1] یعنی کریم النفس آدمی کی طرف جس قدر جھکو گے اُس سے زیادہ میل جول ہوگا اور مغائرت دور ہوتی جائے گی۔

کے ایک اشارے پر آنکھ بند کر کے سینکڑوں پوجیا تے تھے۔

سرسید ایک آرٹکل میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ اس طرح پر متواتر امداد کی درخواست کرنے سے شرم آتی ہے مگر ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں ہونے دیتی۔ ہم نے بھی اس مقولے پر عمل کرنا اختیار کر لیا ہے کہ "خانۂ دوستان بروب و درِ دشمنان مکوب" جس امر کی ضرورت ہوتی ہے دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں اور کچھ شرم نہیں کرتے۔ اور حق یہ ہے کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے مانگیں؛ لیکن ان کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔ ایک دوست پر کالج کے کسی فنڈ کا چندہ کسی قدر باقی تھا ہم نے اُن سے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہے اس کو بیباق کر دو۔ اُنہوں نے کہا بیباقی کا تو آپ نام نہ لیجئے جب تک زندگی ہے بیباقی تو نہ ہوگی، آج اس چندے کی باقی ہے کل دوسرے چندے کی، اسی طرح باقی دار مرجاؤں گا، پس بیباقی تو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی مگر جس قدر روپیہ چاہو لے لو۔"

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ درحقیقت یہی حال ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لئے چندہ نہ مانگتے ہوں۔ مگر ہمارے دوست بھی ہمارے اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں ؎

"گر مکرر ز لبت بوسہ گرفتیم مرنج   سرخیٔ لعل لبت بیں کہ چہ زیبا بودست"

انہیں دوستوں میں سے بعض کے ساتھ نہایت بے تکلفی تھی۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے سرسید کو کہہ بیٹھتے تھے۔ اُن پر لَے دے اور ردّو اعتراض کرتے تھے، اُن کے مذہبی خیالات اور رایوں پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، اُن سے ہر قسم کی ہنسی اور چہل کی باتیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ سرسید کی جھڑکیاں کھاتے تھے اور خفگیاں سہتے تھے مگر نہ کبھی سرسید کو ان سے ملال ہوتا تھا اور نہ خفگی یا جھڑکی کا بُرا مانتے تھے۔ اُن کے حسبِ حال یہ شعر تھا۔

؎ "تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب   بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد"

جب کسی دوست کی طرف سے کوئی ایسی بات ظہور میں آتی تھی جس سے مغائرت کا خیال پیدا ہوتا ہو۔ تو اُن کو یہ امر نہایت شاق گزرتا تھا۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کا بیان ہے کہ میں رہتک سے میرٹھ جاتا تھا، جب دلی پہنچا تو ایک دوست کے مکان پر ٹھیرا ہُوا، وہاں میں نے سُنا کہ سید صاحب بجنور سے آئے ہوئے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا، اُنہوں نے فوراً میرا اسباب فرودگاہ سے منگوا لیا: اور فرمایا کہ پانچ چار روز تم کو یہاں ٹھیرنا پڑے گا، پھر ہم تم یہاں سے ساتھ چلیں گے۔ میں ٹھیر گیا۔ اُنہوں شہر کے مشاہیر سے مجھ کو ملوا لیا، اتفاق

سے محمد بخش خاں صدر الصدور میرٹھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ میرٹھ تک مجھے بھی اپنی گاڑی میں شریک کر لینا۔ سید صاحب نے اُن کو لکھ بھیجا کہ میری گاڑی میں منشی غلام نبی شریک ہیں، اس لئے آپ کی گنجائش نہیں۔ مجھے شرکت کے لفظ سے یہ خیال گزرا کہ نصف کرایہ گاڑی کا مجھے دینا پڑے گا۔ غرض کہ میں سید صاحب کے ساتھ دلی سے میرٹھ کو روانہ ہوا۔ راہ میں اپنی نالائقی سے میں نے نصف کرایہ سید صاحب کے سامنے پیش کیا، اُنھوں نے نہایت غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے اپنی اس کمینہ حرکت سے ایسا انفعال ہوا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ آخر مجھ کو معافی مانگنی پڑی اور پھر کرائے کے باب میں اُن کے سامنے دم نہیں مارا۔ اسی طرح اُنھوں نے ایک دوست کو کسی قدر روپیہ کا چک بھیجا مگر اُس نے واپس کر دیا اور لکھا کہ میں یہ روپے نہ لوں گا۔ اس کے لئے مجھ سے بہتر مصرف موجود ہیں۔ سر سید نے اس کا جواب لکھا کہ "آپ کا عنایت نامہ پہنچا جس میں چیک مرسلہ کا ذکر تھا۔ اُس کو پڑھ کر میں تم پر نہایت خفا ہوا جو محبت و یکجہتی مجھ کو تم سے ہے، وہ اس لائق نہ تھی کہ تم ایسے کلمات لکھتے جو ایک غیر شخص کو لکھنے زیبا ہیں۔ خبردار اس قسم کے خیالات ہمارے ساتھ ہرگز مت کرو۔ اگر تم رقم مرسلہ کو کام میں نہ لاؤ گے تو نہایت آزردگی ہوگی اور یقین ہوگا کہ تم یکجہتی نہیں سمجھتے، اب دوبارہ اس باب میں نہ لکھنا۔"

جس دوست کے ساتھ سر سید کی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی وہی اکثر موردِ عتاب رہتا تھا۔ مگر اُس عتاب کی قدر وہی خوب جانتے تھے جو اُس کے مورد ہوتے تھے۔ خان بہادر مولوی سید زین العابدین خاں جن پر سب سے زیادہ خفگی اور ناراضی رہتی تھی، وہی آج سب سے زیادہ سر سید کو یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں اور دنیا میں کسی دوست یا عزیز کو ویسا غمخوار اور غمگسار نہیں پاتے۔ سر سید کا ایک خط ہاتھ لگا ہے جو اُنھوں نے علالت کی حالت میں اپنے پیشدست سے لکھوا کر خان بہادر کو رام پور بھیجا تھا۔ نہ اُس میں عرفی شوق و آرزو کا اظہار ہے نہ جدائی کی معمولی شکایت ہے۔ مگر اُس کے ہر ہر لفظ سے محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں "مکرمی زینو! ابھی تمہارا خط پہنچا، کچھ شبہ نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا ہے، تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے، مگر مجھ کو تمہارے چلے جانے سے جو رنج ہے، وہ لکھا بھی نہیں جا سکتا۔ زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے کہ اس کو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمہارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا۔ صبح کو اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد

[1] خان بہادر ہمیشہ بلاناغہ صبح کے چار بجے سر سید کی کوٹھی پر آتے تھے اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں ٹھیر کر ہوا خوری کو جاتے تھے۔ یہ اس جملے کی ملاقات کی طرف اشارہ ہے ۱۲۔

آنکہ ہوست اے کہ ہرگز فراموشت نکنم کا نقشہ ہو گیا ہے۔"

نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ "میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں۔ میری اُن سے پہلی ملاقات ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی، اُس وقت سے آج تک ایک بات بھی اُن میں ایسی نہیں دیکھی جس کو بُرا کہہ سکوں۔ اس شخص کی سی سچی محبت اور وضعداری دُنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔ البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے اس قدر محبت ہو سکتی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا نے ڈال دی ہے۔"

اسی محبت کی کشش تھی کہ محسن الملک نے حیدرآباد سے آکر وطن مالوف کی طرف رُخ نہیں کیا بلکہ علی گڑھ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اور کبھی ایک دو دن سے زیادہ اٹاوہ میں جاکر قیام نہیں کیا اور اگر حفظ صحت کا خیال اُن کو مجبور نہ کرتا تو غالباً سرسید کی زندگی میں علیگڑھ کو چھوڑ کر کبھی بمبئی نہ جاتے۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے۔

"درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را"

سرسید کی خفگی اور غصے میں جو کشش تھی وہ کسی کی مہربانی اور عنایت میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ سید مہدی علی کو ہمیشہ اُن کے عتاب آمیز خط جاتے تھے چنانچہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "مہدی علی کو سوائے غصہ اور خفگی کے کبھی کچھ نہیں ملا" باوجود اس کے سید مہدی علی کا معاملہ اُن کے ساتھ شمع و پروانہ کا ساتھا الہ آباد کے جلسہ کانفرنس میں جس ذوق و شوق اور وجد کی حالت میں اُنہوں نے اپنا لکچر دیتے وقت تمام حاضرین کے سامنے سرسید سے خطاب کیا تھا وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگا، خصوصاً اُس وقت کا سماں کبھی دل سے فراموش نہ ہوگا جب کہ اُنھوں نے سرسید سے مخاطب ہو کر یہ اشعار پڑھے تھے ؎

دلبرانِ ماہ پیکر دیدہ ام	در جمالت چیز دیگر دیدہ ام
ایں چہ نورست اینکہ تاباں از توہست	ہفت کوکب نور افشاں از تو ہست
تو مکمل از کمالِ کیستی	مظہرِ نورِ جمالِ کیستی!

سرسید نے ایک آرٹکل میں جو غالباً محبت پر لکھا ہے مسٹر پٹلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "انسان کو دشمن کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ رکھنا چاہیئے کہ اُس کو دوست بنا لینے کا موقع رہے اور دوست سے اس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے کہ اگر کبھی وہ دشمن ہو جائے تو اُس کے ضرر سے بچنے کی جگہ باقی رہے۔" اس قول کو نقل کر کے وہ

خود لکھتے ہیں کہ " اس کا پہلا حصہ جو دشمن کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ہے وہ تو نہایت عمدہ ہے، مگر پچھلی بات جو دوست کے ساتھ برتاؤ برتنے کی ہے اُس میں سمجھ کی کچھ بھی بات نہیں بلکہ نری مکاری ہے۔ ایسے برتاؤ سے انسان زندگی کی بہت بڑی خوشی سے محروم رہتا ہے اپنے دلی دوستوں سے بھی دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ بعضے دوست دشمن ہو جاتے ہیں اور دوست کے بھید کو کھول دیتے ہیں مگر دینا اُنہیں کو دغا باز اور بُرا کہتی ہے، دوست پر بھروسا کرنے والے کو ناسمجھ نہیں کہتے۔ ہاں البتہ دوستوں کے منتخب کرنے میں بڑی سمجھ چاہیئے۔"

سرسید نے جو کچھ لکھا ہے یہ خاص اُن کے دلی خیالات تھے اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُن کا ہمیشہ اسی کے موافق عمل درآمد رہا۔ وہ بے شک زود آمیز اور زود پیوند نہ تھے بلکہ اِس شعر کے حقیقی مصداق تھے ؎

" نہ عیب تست کہ بیگانہ وار مے گزری ۔۔۔۔ کہ ہر کہ روز گسل نیست دیر پیوند ست "

مگر جب کسی سے دل مل جاتا تھا پھر خواہ وہ شخص ہندو ہو یا عیسائی یا یہودی یا مسلمان اُس سے کسی طرح کی مغائرت اور بیگانگی باقی نہ رہتی تھی۔ اُنھوں نے اپنے پوتے سید مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بمقام علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے بعد تمام ممبروں اور وزیٹروں کے سامنے ایک تقریر کی تھی جس کے آخر کے چند فقرے یہاں نقل کرنے مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا " اے حضرات! گو میں نے اس وقت اپنی قوم ہی کا گیت گایا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور برادرانہ محبت نہیں ہے ہماری قوم خراب حالت میں ہے۔ اِس لئے اُسی کا گیت گایا جاتا ہے۔ ورنہ اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی اپنے عزیزوں سے۔ اس وقت اس کے علانیہ دو ثبوت موجود ہیں۔ ایک یہ کہ سید محمود اور مسٹر راس سے نہایت دوستی اور برادرانہ اور عزیزانہ محبت ہے، جب سید محمود پیدا ہوا تو مسٹر راس اور ان کی میم صاحبہ نے موافق انگریزی رسم کے جو نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے، اپنا نام اُس مولود مسعود کو دیا اور ہم نے نہایت خوشی سے اُن کا نام اُن کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے اُس کا نام رسؔ مسعود قرار پایا۔"

"دوسرا نمونہ راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ ایس۔ آئی کی طرف نہایت جوشِ محبت کے ساتھ اشارہ کرکے کہا، ہمارا یہ ڈارٹی منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنی بغل میں بٹھائے ہوئے ہے

اُن کو میں اپنا معتزر اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود اُن کو چچا کہتے ہیں اور سید راس مسعود دادا راجہ۔ پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں کرتے۔"

سرسید جس کو دوست سمجھ لیتے تھے اُس کی طرف سے فی الواقع اُن کا دل ایسا صاف ہو جاتا تھا کہ اُس کی نسبت برائی کا کبھی تصور بھی نہ آتا تھا۔ کسی کی شکایت یا سعادیت یا دراندازی اُن کو دوست سے، جب تک کہ علانیہ اور متواتر اُس سے دوستی کے خلاف باتیں سرزد نہ ہوں، بدگمان نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ جب کسی کی نسبت اُن کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ دوست نہیں پھر اُس سے مطلق تعلق باقی نہ رہتا تھا۔ ظاہرداری کا ملنا فی الحقیقۃ اُس شخص کو نہ آتا تھا۔ اُن کے حال پر بعینہ یہ شعر منطبق ہوتا تھا ؎

مرنجاں دلم راکہ ایں مرغِ وحشی ــــــ نہ بامے کہ برخاست مشکل نشیند

وہ سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میں تو اُس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت خیال کرے کہ اُس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی ہوگی۔ میں تو دوست کے گالی دینے اور بُرا کہنے کو بھی دوستی پر عمل کرتا ہوں اور درحقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے، مگر جب کہ حقیقت میں خلاف محبت اور دوستی کے کوئی بات ہو تو پھر شیشۂ محبت، جو نہایت نازک ہے، کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دوستی سخت چیز ہے کہ ہتوڑوں اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی، مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اُس سے نسبت نہیں۔ ایک ادنےٰ سی خلافِ محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور جس قدر محبت زیادہ بڑھتی جاتی ہے، اُس کی نزاکت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔"

سرسید کو کسی دوست نے لکھا کہ فلاں دوست سے بھی آپ چندہ طلب کریں۔ اُس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ "جو ملال اُن کی طرف سے میرے دل میں ہوا ہے وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جائے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اُس نگاہ سے جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔ گل جائے وہ زبان جو وہ کہے جو اُس کے دل میں نہیں ہے، ٹوٹ جائے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔"

اُن کا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتہ و قرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔ وہ ولایت سے سید

چودھری علی خاں کے نام کے خط میں مولوی زین العابدین خاں کی نسبت لکھتے ہیں " جس قدر آپ نے مولوی زین العابدین کی محبت کا میری نسبت ذکر لکھا ہے در حقیقت وہ بہت کم ہے۔ اُس کا قدر ناشناس میں ایمان کو جیسا کہ وہ ہے میں ہی خوب جانتا ہوں۔ اب آپ کو میری طبیعت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ہے۔ رشتے و ناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔"

اگرچہ سرسید ہر ایک معاملہ میں نہایت آزادانہ خیالات رکھتے تھے مگر دوستی کے معاملات میں بڑے کنسرویٹو معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے خالص و مخلص دوستوں سے اُسی قسم کی توقعات رکھتے تھے جیسے اگلے زمانے کے وضع دار با وفا دوستوں کے حالات سننے میں آئے ہیں۔ قطع نظر پرائیویٹ باتوں کے پبلک معاملات میں بھی جو زیادہ مہتم بالشان ہوں، اُن کی یہ خواہش معلوم ہوتی تھی کہ دوست اُن کی رائے کے مؤید ہوں اور اگر کوئی دوست اُن کی رائے سے اختلاف کرتا تھا تو اُن کو حد سے زیادہ ملال ہوتا تھا۔

جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال ہوا وہ اپنے ہر ایک دوست سے اس بات کے متوقع تھے کہ اُن کے کام میں دل سے مدد دیں۔ جن قدیم دوستوں نے توقع کے موافق تعلیمی معاملات میں اُن کو مدد نہیں دی اُن کے ساتھ وہ ربط و ضبط جو قدیم سے چلا آتا تھا قائم نہ رہا اور نئے دوست جو ان معاملات میں اُن کے مددگار تھے اُن کو وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھتے تھے۔ خان بہادر برکت علی خاں کی نسبت اُن کو آخر دم تک یہ تمنا رہی کہ کالج میں ایک ممتاز مکان اُن کی یادگار میں بنایا کرائیں۔ سردار محمد حیات خاں کو اپنا قوتِ بازو سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر رنما حسین [illegible] سید محمود، حسن خاں وزیر پٹیالہ، مولوی چراغ علی اور میر ظہور حسین کے مرنے کا اُن کو ایسا رنج ہوا تھا کہ اپنے کسی عزیز کے مرنے کا بھی کسی کو اُس سے زیادہ صدمہ نہیں ہو سکتا۔ نواب انتصار جنگ بہادر اگرچہ وہ ٹرسٹی بل کے اختلاف کی وجہ سے کسی قدر آزردہ ہو گئے تھے مگر چونکہ مدرسے کی امداد اُن کی برابر ایک آدھ کے سوا کسی نے نہیں کی اس لئے وہ ملال چند روز بعد بالکل جاتا رہا تھا اور اُن کی ویسی ہی جگہ دل میں ہو گئی تھی جیسی قدیم سے چلی آتی تھی۔ نواب عماد الملک کو اُن کی نیکی اور راستبازی اور علم و فضل اور مدرسۃ العلوم کی حقیقی خیر خواہی اور خیر اندیشی کی وجہ سے وہ ایسا ہی عزیز رکھتے تھے جیسے سید محمود کو اور اُن کی نسبت یہ کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں بلکہ ایک نورِ مجسم ہے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد کی نسبت

ایک ناواقف آدمی نے اُن کے سامنے بطور شکایت کے کہا کہ باوجود اس قدر مقدور ہونے کے اُنھوں نے قومی تعلیم میں کچھ مدد نہیں دی۔ سرسید نے بدمزہ ہو کر اُن کے چندوں کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسے میں دیتے رہے تھے اور جو مقبولیت اور رونق ان کے لکچروں سے ایجوکیشنل کانفرنس کو ہوئی اُس کا ذکر کر کے کہا کہ یہ شخص ہماری قوم کے لئے باعثِ فخر ہے اُس کی نسبت پھر ایسا لفظ زبان سے نہ نکالنا۔ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ جنہوں نے کالج کے چندوں کے سوا سوسائٹی کے مقاصد میں اپنے ترجموں سے بے نظیر امداد دی تھی اور سید زین العابدین، امیر تراب علی، سید مہدی علی، مولوی مشتاق حسین، راجہ جے کشن داس، حاجی اسمٰعیل خاں اور مرزا عابد علی بیگ کو وہ مثل اپنے اعضاء و جوارح کے سمجھتے تھے۔ الغرض یہ شخص دوستی و محبت کے باب میں اس عربی شعر کا حقیقی مصداق تھا۔

وَاِذَا رَأَیْتَ صَدِیْقَہٗ وَشَقِیْقَہٗ لَمْ تَدْرِ اَیُّھُمَا ذَوُو الْاَرْحَامِ

(یعنی تو اُس کے دوست اور سگے بھائی کو دیکھ کر یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ بھائی کونسا ہے اور دوست کونسا)

نوکروں کے ساتھ تعلق | اسی جبلّی مہر و محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور لگے بندھوں کو تا بمقدور عمر بھر اپنے ساتھ نباہنا چاہتے تھے۔ جس شخص کے قدم اُن کے ہاں جم گئے پھر نہ وہ اُس کو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ اُن سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی شکایت کرتا تھا تو اُس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اُن کے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے اُن سے بارہا شکایت کی مگر وہ کسی طرح اُن کے دل سے نہ اُترا۔ ہمیشہ اُن کا معتمد علیہ اور سفر و حضر میں اُن کے ہمراہ رہا۔ آخر انہیں کی رفاقت میں مر گیا۔ اُس کے بعد اُس کے چھوٹے بھائی کو داروغگی ملی جس کی آوارگی اور بدچلنی حد سے گزر گئی تھی۔ مگر وہ بھی آخر دم تک اُن سے نہ چھوٹ سکا۔

حافظ عبدالرحمٰن مرحوم جو سید محمود کے بچپن کے اُستاد تھے، ۴۵ برس سرسید کے ساتھ رہے اور وہیں اُن کا خاتمہ ہوا۔ مرتے وقت اُنھوں نے سید محمود اور سرسید کو بلایا۔ جب دونوں کو دیکھ لیا فوراً روح پرواز کر گئی۔ سرسید کو اُن کے مرنے کا ایسا قلق ہوا کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا اور کئی دن تک اُن کے مرنے کا رنج و الم رہا۔ منشی ذوالفقار جو اُن کے بنک کا حساب کتاب لکھتا تھا اُس کے مرنے کا بھی اُن کو کچھ کم صدمہ نہیں ہوا۔ اسی طرح کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص

کا خمیر مہر و محبت سے ہوا تھا۔

فراخ حوصلگی | سیر چشمی اور فراخ حوصلگی بھی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ اُنھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لئے کوئی جائداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اُس کو یا اپنی ضروری آسائش اور سچی عزت اور نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا، یا کنبے کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اُٹھایا۔ وہ ۳۷ برس سرکاری ملازمت میں رہے اور اس عرصے میں سو روپیہ سے لے کر آٹھ سو روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے رہے۔ جب تک سید محمود ہائی کورٹ کے جج رہے، ایک ہزار ماہوار باپ کو دیتے رہے۔ نوکری کے بعد آخیر دم تک چھ سو ماہوار پنشن کی آمدنی رہی، مگر کبھی اُن کی آمدنی خرچ کو مکتفی نہیں ہوئی۔ اُن کے ایک معزز رشتہ دار کا بیان ہے کہ "جب دلی کی منصفی سے اُن کو ترقی کے ساتھ باہر بھیجنے لگے تو اُن کی والدہ نے جو اُن کی طبیعت اور خصلت سے خوب واقف تھیں، صرف اس خیال سے جانے نہیں دیا کہ جس قدر زیادہ آمدنی ہوگی اسی قدر زیادہ خرچ بڑھ جائے گا، پھر اپنا گھر چھوڑ کر باہر جانے سے کیا فائدہ"۔

ابتدا سے اُن کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر اُن کے دل میں اُٹھی اُس پہ روپیہ صرف کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انھوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔ جس کتاب کی اُن کو تلاش ہوئی اگر وہ بیس گنی قیمت پر بھی ملی تو اُس کو لئے بغیر نہیں چھوڑا۔ ریاضی کے متعلق آلات جمع کرنے کا اُن کو شوق ہوا صدہا روپیہ اُس میں صرف کر ڈالا۔ کسی تصنیف کے لئے میٹریل جمع کرنے میں، کسی کتاب کے چھپوانے کے اہتمام میں، کسی سوسائٹی یا انجمن یا مدرسہ قائم کرنے میں وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت زیادہ خرچ کرتے رہے، ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزری مگر کبھی حقِ تصنیف سے کچھ فائدہ نہیں اٹھایا اور کبھی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کرائی۔ اُن کی کتابیں اور مضامین جس کا جی چاہتا تھا چھاپ لیتا تھا اُنھوں نے کبھی کسی سے تعرض نہیں کیا۔

جب تک مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ ثواب کے معمولی کاموں میں بہت شوق سے شریک ہوتے تھے۔ محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ "بجنور میں غدر سے پہلے تین مسجدوں

کے بننے میں اُنھوں نے کافی مدد دی۔ موضع بینسو یہ جو بجنور اور دلّی کے رستے میں پڑتا تھا وہاں ایک سرائے تھی جس میں سرسیّد آتے جاتے کھانا کھانے کے لئے ٹھیرا کرتے تھے۔ اُس سرائے میں بھٹیاروں نے ایک مسجد بنانی شروع کی تھی، اُس مسجد کی ابھی بُنیادیں ہی بھری گئی تھیں کہ دو بھٹیاروں کو وہاں کے برہمنوں نے مار ڈالا اور اس لئے مسجد کی تعمیر بند ہوگئی۔ سرسیّد نے اُس کی تعمیر ناتمام دیکھ کر کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا اور کچھ دلّی سے اپنے رشتہ داروں، مردوں اور عورتوں سے وصول کر کے اُس کو پورا کر دیا۔ پھر خاص بجنور میں بکر قصابوں نے ایک مسجد کی بُنیاد ڈالی تھی، اُس کے بنوانے میں بھی اُنھوں نے بہت مدد دی، اگرچہ وہ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ غدر ہو گیا۔ غدر کے بعد سرسیّد نے فوراً اُس کی تعمیر جاری کرائی اور اس کو مکمل کرا دیا۔ اسی طرح کاندھلہ میں ایک مسجد مولوی مظفر حسین مرحوم و مغفور بنواتے تھے۔ سرسیّد نے روپیہ بھیجنا چاہا، مولوی صاحب نے کہا کہ تمہاری تنخواہ کا روپیہ مسجد میں نہیں لگایا جا سکتا۔ سرسیّد نے رجسٹری کی آمدنی میں سے وہاں کئی سو روپیہ بھیجا۔" مگر جب وہ خیالات بدل گئے تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، سہارنپور کی جامع مسجد کے لئے جب اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ "میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔"

مستحقوں کی امداد اور دستگیری کرنے کی بھی اُن کی نسبت بے شمار مثالیں سُننے میں آئی ہیں، خصوصاً غدر کے بعد جبکہ مُسلمان شرفا کے صدہا خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ اُن کے دوست محمد سعید خاں کہتے تھے کہ "مراد آباد میں جو شکستہ حال اشراف صورت مُسلمان اُن کے مکان کے برابر سے گزرتا اُس کو خود بُلا لیتے تھے اور علیحدہ لے جا کر اُس کا حال دریافت کرتے تھے اور ایسے طور پر اُس کے ساتھ سلوک کرتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔" اُن کے ایک معزز اور ثقہ دوست کی روایت ہے کہ "مدت تک غدر کے بعد اُن کا یہ حال رہا کہ اپنی تنخواہ میں سے صرف بقدرِ اخراجاتِ ضروری لے کر باقی کل روپیہ دلّی میں تقسیم کرنے کے لئے بھیج دیتے تھے۔ بعض اشخاص غدر کے آفت رسیدہ لوگوں کے ساتھ سرسیّد کا یہ برتاؤ دیکھ کر بہ تصنع اپنے تئیں مفلوک اور مصیبت زدہ ظاہر کرتے تھے اور سرسیّد اُن کے اصل حال سے واقف ہونے کے بعد بھی اُن کے ساتھ اسی طرح سلوک کرتے تھے۔" محمد سعید خاں صاحب کا بیان ہے کہ "مراد آباد میں جب کہ نواب لفٹنٹ گورنر کا دربار ہونے والا تھا اور لوگ اطراف و جوانب سے دربار میں شامل ہونے کو آئے ہوئے تھے، ایک شخص بظاہر معقول اور سفید پوش سیّد صاحب کے مکان

پر آئے اور اُن کو الگ لے جا کر کہا کہ میں دربار میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا، مگر میرا آدمی اسباب لے کر بھاگ گیا اور میں بالکل بے سروسامان رہ گیا ہوں۔ سرسید نے اُن کو معقول خرچ دیا اور کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی نواح کا رہنے والا ہے اور اسی طرح لوگوں کو جُل دے کر ہاتھ کھاتا ہے۔ تین چار روز بعد وہ پھر تشریف لائے اور کچھ اور طلب کیا۔ سید صاحب نے پھر کچھ خرچ دیا اور کھانا بھی ساتھ کھلایا۔ غرض کہ تین دفعہ دربار ہونے سے پہلے وہ اُن کے پاس آیا اور ہر دفعہ اس کو کچھ دیا اور کھانا اُسی طرح ساتھ کھلایا۔"

اُس زمانے میں سرسید کو یہ خیال تھا کہ سینکڑوں شریف اور خاندانی افلاس میں مبتلا ہیں اور جس حیلے سے روٹی ملتی ہے، حاصل کرتے ہیں۔ مگر جب سے اُنھوں نے مدرسۃ العلوم قائم کیا اُن کا حال بالکل اس کے خلاف تھا۔ وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے اور بجائے اس کے کہ شخصی امداد کو کوئی کارِ خیر سمجھتے ہوں، اُس کو ایک قسم کی معصیت جانتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کی امداد کرنا اُن کو ہمیشہ کے لئے دریوزہ گر بنانا ہے۔ اسی لئے اُن کی تمام فیاضی اور داد و دہش قوم کی تعلیم میں منحصر ہو گئی تھی۔ جس درشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اُس پر ڈور دبک کرتے تھے، اس کو دیکھ کر ناواقف آدمی اُن کو سخت بداخلاق اور بدمزاج تصور کرتا تھا۔ مگر وہ اُن کا غصہ اور ڈور دبک کرنا سراسر مصنوعی ہوتا تھا۔ اُن کا یہ قول تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کرنے کے لئے بداخلاق بننا نہایت ضرور ہے۔

سرسید کی جوانمردی اور فیاضی صرف داد و دہش ہی میں محدود نہ تھی بلکہ اُن کی مثال ایک پھلدار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے، اپنے سائے سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ غدر کے بعد اُنھوں نے اکثر بے گناہ مسلمانوں کی جن کی نسبت حکام کو اشتباہ ہو گیا تھا، صفائی کرائی۔ بعض شخص جو فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ کے خوف سے باغیوں کی فوج میں شامل ہو گئے تھے، مگر درحقیقت بے گناہ تھے، اُن کو بطور خود وہاں سے بُلا کر اُن کی تحقیقات کرائی اور اُن کی بریت پر خود گواہی دے کر اُن کو بری کرایا۔ مراد آباد کے مسلمانوں کو بعض ناخدا ترس ہندوؤں کے شر سے بچایا جو محض مذہبی تعصب کے سبب اُن کو پھانسیاں دلوانے پر کمر بستہ تھے۔ بعض مسلمان جو سرکاری فوج کے ہاتھ سے دلّی پر حملہ ہونے کے وقت بے قصور مارے گئے تھے اُن کے درماندہ وارثوں کی

پنشنیں مقرر کرائیں۔ مولانا عالم علی مرحوم مرادآبادی کی صفائی کرانے میں جو کوشش سرسید نے کی وہ ہم پہلے کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں۔ غرض کہ اس شخص نے مسلمانوں کو کیا من حیث القوام اور کیا من حیث الافراد فائدہ پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کی۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ اس شخص کا تھا، اُس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر علی گڑھ میں مقیم ہوئے مزدوروں کی مزدوری اور گاڑیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ ہوگیا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو اُن کی توقع اور حوصلے سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جہاں کہیں اُن کا رہنا ہُوا یہ لوگ اُن کے نہایت شکر گذار اور ثناخواں رہے۔ ان کے ایک دوست کا بیان ہے "میں بنارس میں اُن سے ملنے گیا تھا، دریا پر پہنچا تو شام ہوگئی تھی اور کشتی کی آمد و رفت بند ہو گئی تھی۔ ہر چند ملاحوں سے کہا کہ کشتی لگا دو، مگر اُنھوں نے نہ مانا۔ لیکن جب ان کو معلوم ہُوا کہ جج صاحب کے ہاں جانے والے ہیں فوراً کشتی لگادی اور مجھے پار اُتار دیا۔ کشتی سے اُتر کر میں نے ملاحوں کو کچھ دینا چاہا، مگر اُنھوں نے کچھ نہ لیا اور یہ کہا کہ سرکار (یعنی سرسید) ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں، ہم اُن کے مہمان سے ہرگز کچھ نہ لیں گے" ایسا ہی ایک واقعہ ریل کے مزدوروں کا سُنا ہے جو سرسید کے نام پر بلا مزدوری کام کرتے تھے۔

سالم نام ایک یہودی صنعائی یمن کا رہنے والا غازی پور میں سرسید کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لئے پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسید نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لوگے؟ اُس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے۔ سرسید نے کہا میں تم کو پچاس روپیہ مہینا دُونگا، مجھے عبرانی سکھاؤ۔ سرسید کے ایک دوست کہتے تھے کہ اُس نے خوشی کے مارے بڑھ کر سرسید کی داڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسید نے اُس کو نوکر رکھ لیا، مگر چونکہ وہ مُسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لئے اُس کو بقدر ضرورت دیتے رہے اور اُس کی

لہ مولانا صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین کا ایک خط ہمارے سامنے تھا جو سرسید کے نام آیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ "مولانا امام بخش صہبائی مرحوم جو اس عاجز کے نانا تھے ایام غدر میں اُن کے بے گناہ قتل ہونے پر سالی حضرت نے جناب نانی صاحبہ و دیگر پسماندگاں کا وظیفہ سرکار انگریزی سے مقرر کرا دیا تھا۔ جب تک نانی صاحبہ زندہ رہیں بدستور وظیفہ ملتا رہا۔ بندہ نے والدین سے سُنا تھا کہ جو احسانات آنجناب کے اس خاندان کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہیں۔"

باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو کئی سو روپیہ جو اُس کا چڑھا ہوا تھا حساب کر کے حوالے کر دیا۔

جس زمانے میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلّی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی اُن کے ساتھ پڑھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جب سید صاحب چند روز کے لئے قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے لگے تو اُنہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلیئے۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیونکر جا سکتا ہوں؟ ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھ سے پڑھتی ہے، ان کو کس پہ چھوڑ کر جاؤں؟ اُنھوں نے کہا سب طلبہ کو بھی ساتھ لے چلیئے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے؟ سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے پینے کا تو فکر کیجئے نہیں، خدا رازق ہے، لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کر دوں گا اور اس سے میری آئندہ ترقی رُک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے اُن کے ساتھ ہو لئے اور جب تک رہتک رہنا ہوا سب خرچ سید صاحب کے ذمہ رہا۔

سرسید کی اس قسم کی فراخ حوصلگی کی مثالیں بے شمار ہیں جن کی تفصیل کی اس کتاب میں گنجائش نہیں۔ اگرچہ یہ خصلت عام مسلمانوں کے حق میں ان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے کیونکہ اب مسلمان بغیر کفایت شعاری کے صفحۂ ہستی پر قائم نہیں رہ سکتے، مگر سرسید کی حالت عام مسلمانوں سے بالکل مستثنےٰ تھی۔

در حقِ اُو مدح و در حقِ تو ذم　　در حقِ او شہد و در حقِ تو سم

سرسید اگر گھر کے انتظام اور نون تیل لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور قومی اور مذہبی خدمات جو اُنھوں نے گذشتہ چالیس برس میں سرانجام کیں وہ کون کرتا؟ اُنھوں نے لمبے کاموں کے لئے جو ہندوستان میں اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی اُن کو بالکل عادت نہ تھی، دس بارہ لاکھ سے کم روپیہ وصول نہ کیا ہوگا! اگر وہ کفایت شعاری کو کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسوں میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے گھر کو نہایت بے سر و سامان نہ بنا لیتے تو علی گڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا

تھا۔ اگر وہ ہزارہا روپیہ اپنے پاس سے صرف کر کے اطرافِ ہندوستان میں چندے کے لئے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفر خرچ کمیٹی کے ذمے ڈالتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈھتے تھے، کیونکر اپنا وقار قائم رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ یورپین طریقے پہ ہائی لائف نہ رکھتے تو ہندوستان کے ارکانِ سلطنت کو اپنے کاموں کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتے تھے۔ شمس العلما مولانا نذیر احمد نے سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے۔ کہ اونچے درجے کے انگریزوں کی طرح ماند و بود کرتے ہیں، گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں، ان کے ہم نوالہ ہیں۔ جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیئے کہ سید کو چار و ناچار قبیلوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے۔ اور وہ بڑے چالاک جنیز نہیں سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو کوئی اعلیٰ درجے کا انگریز یا اعلیٰ درجے کا ہندو اُن کی طرف رُخ نہ کرے اور ایسی موٹی اسامیاں دام میں نہ آئیں تو چندے کی بھاری بھاری رقمیں کن سے ہاتھ لگیں۔"

بہرحال اس باب میں سرسید کی ایک خاص حالت تھی اگر کوئی دوسرا شخص بھی گھر بار لٹا کر قوم کو اسی طرح فائدہ پہنچا سکے تو وہ بلاشبہ قوم کا سرتاج ہے اور بیشک روپیہ صرف کرنے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا۔ مسٹر سموئیل اپنی کتاب سلف ہلپ میں لکھتے ہیں کہ "وہ جو شخص اپنے روپے سے لوگوں کو نفع نہیں پہنچاتا وہ ذلیل آدمی ہے۔ جوانوں کو خیال رکھنا چاہیئے کہ جوانی کی کفایت شعاری کہیں بڑھاپے میں جا کر خست نہ بن جائے اور جو کام (یعنی کفایت شعاری) پہلے فرضِ اعظم تھا، وہی گناہِ عظیم نہ بن جائے۔"

اگرچہ سرسید کی زندگی برابر آسودگی کے ساتھ گزری اور اُن کی حیثیت ایک متوسط الحال شریف ہندوستانی کی حیثیت سے بہت زیادہ رہی۔ مگر خدا تعالیٰ نے اُن کا حوصلہ بمقابلہ اُن کی حیثیت کے زیادہ فراخ اور وسیع و بلند پیدا کیا تھا، اس لئے اُن کی آمدنی کبھی اُن کے اخراجات کو کافی نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ مقروض رہنا ایک لازمی سی بات ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو جو مقروض ہو گئے تھے، اس طرح لکھتے ہیں "دَینے کی پریشانی بلاشبہ بہت رنج دہ ہے جس کے مزے سے میں خوب واقف ہوں بہت کم مسلمان ہوں گے جو اس رنج میں مبتلا نہ ہوں، مگر میں تو اپنے دل کو اس طرح تسلی دے لیتا ہوں کہ مقروض ہونا بھی خدا کی رحمت ہے۔ میں اس حدیث پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ "صاحبُ المالِ کافرٌ" جس پر حضرت ابوذر غفاری کا یقین اور عمل تھا۔ کافر کے لفظ سے کیا مراد ہے، اس بحث کو چھوڑ دو، جو اس کی مراد ہو وہ ہو لیکن

ہم ابو ذہ تو بن نہیں سکتے مگر خدا کی رحمت ہے جو اُس نے ہم کو مقروض رکھ کر کفر سے بچایا ہے۔ پس میرے دل کی تسلی کو تو یہ خیال کافی ہے۔" معلوم نہیں کہ سرسید کو اس حدیث کے یقین نے مال جمع کرنے سے باز رکھا تھا یا جب مال جمع نہ ہو سکا تب اس حدیث پر یقین ہُوا؟ درحقیقت یہ اُن کا حسن بیان تھا جس سے مخاطب کو تسلی دینا مقصود تھا ورنہ روپیہ پیسے کی محبت سرے سے اُن کی سرشت ہی میں نہیں پیدا کی گئی تھی اور وہی اثر ان کی اولاد میں موجود تھا کہ باوجود معقول آمدنی کے ہمیشہ مقروض اور تہیدست رہے۔

سرسید کے ایک دوست ایک زمانے میں اُن کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب مہینا ختم ہُوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر اُن کے دکھانے کو لے گیا۔ سرسید نے کہا "بس مجھے دکھانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ یونہی چلنے دو، میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہوگا۔" حق یہ ہے کہ جو شخص رات دن اوروں کی صلاح و فلاح کی فکر میں رہے گا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہو سکتا ہے۔ ولیم پٹ جو اُن لوگوں میں سے تھا جنھوں نے انگلستان کو انگلستان بنایا ہے، اُس کی نسبت لارڈ مکالے نے لکھا ہے کہ "نہ اُس کے بیوی تھی نہ بچے نہ محتاج رشتہ دار تھے اور نہ اسراف کی عادت، باوجود اس کے جب وہ مرا تو قوس اوف کامنس کو اُس کا قرضہ ادا کرنے کے لئے چار لاکھ روپیہ منظور کرنا پڑا۔ اگر وہ ہفتے میں پندرہ منٹ بھی انتظام خانگی کے لئے صرف کرتا تو ان تمام اخراجات کا معقول انتظام ہو جاتا۔ اس کے نوکروں کی لوٹ نہایت حیرت انگیز تھی۔ ایک ہفتے میں صرف گوشت کا بل ساڑھے بارہ من کا تھا اور اسی کے قریب مرغ مچھلی اور چائے کا۔"

اگرچہ سرسید بمقابلہ وزیر اعظم انگلستان کے ایک نہایت غریب اور کم حیثیت آدمی تھے۔ مگر خانگی انتظام کے متعلق اُن کی بے اعتنائی نسبتہً ولیم پٹ سے کچھ کم نہ تھی، صرف اتنا فرق تھا کہ ولیم پٹ کو یقین تھا کہ جس سلطنت کی بہتری کے لئے وہ آخر دم تک کوشش کرتا رہا وہ اس کا قرضہ ادا کرنے کی متکفل ہوگی مگر غریب سید کو چار لاکھ تھوڑے چار سو کا بھی ادا کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا اور اسی لئے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، جس طرح کہ اُس نے وارثوں کے لئے کوئی جائداد نہیں چھوڑی اسی طرح قرضے کا بوجھ کسی پر نہیں ڈالا۔ اگر بالفرض کچھ تدبہ تلیل کسی کا دینا باقی رہ گیا ہوگا تو سید کی پولیٹیکل پنشن جو اُن کے بعد ایک نسل تک جاری رہنے والی ہے اس قرضے کے لئے کافی سے بہت زیادہ ہے۔

ایک دوست نے سرسید کے ایک رشتہ دار کا یہ مقولہ بیان کیا کہ سید احمد خاں نے اگرچہ ناجائز طور پر کبھی ایک خرمہرہ نہیں لیا۔ مگر اُن کی تنخواہ اور رجسٹری اور پولیٹیکل پنشن کی اس قدر آمدنی تھی کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتے اور فضول خرچ میں روپیہ برباد نہ کرتے تو آج اُن کی اولاد کے برابر کے دلّی میں بہت ہی کم صاحب جائداد نظر آتے۔ میں یہ سُن کر چُپ ہو رہا اور سعدی شیرازی کا یہ شعر دل ہی دل میں پڑھتا رہا۔

اے کہ آگاہ نۂ حالتِ درویشاں را   تو چہ دانی کہ چہ سودا وسرست ایشاں را

انتقام کا خیال نہ ہونا

مخالفوں اور دشمنوں کی برائیوں کا تحمّل کرنا اور کبھی ان سے انتقام لینے کا ارادہ نہ کرنا یہ بھی سرسید کے اُن اوصاف میں سے تھا جو اُن کی ذات کیساتھ مخصوص تھے۔ اس شخص کے صرف اقوال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اُس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ برائی کا بدلہ لینا تو درکنار اُس کو کسی کی برائی یاد بھی نہیں رہتی تھی۔ بلاشبہ محمدن کالج کی بدخواہی یا جن اصول پر سرسید نے اُس کو قائم کیا تھا اُن میں رخنہ ڈالنا اُس کو حد سے زیادہ ناگوار گزرتا تھا۔ مگر جن لوگوں کی بُرائیاں اُس کی ذات تک محدود تھیں اور کالج تک ان کا علانیہ طور پر کچھ اثر نہ پہنچتا تھا، اُن کی نسبت قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی بُرائیاں اس کو محسوس بھی ہوتی تھیں یا نہیں؟

حکایاتِ لقمان میں ایک حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک مچھر بیل کے سینگ پر آبیٹھا اور یہ سمجھ کر کہ بیل پر میرا بوجھ پڑا ہوگا، اُس نے کہا کہ اگر میرا بوجھ تجھ پر شاق گزرا ہو تو کہہ دے تاکہ میں اُڑ جاؤں۔ بیل نے کہا اے نادان مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تو مجھ پر بیٹھا بھی ہے یا نہیں۔ چہ جائیکہ تیرے بیٹھنے سے مجھ کو کچھ تکلیف ہوئی ہو۔ بعینہٖ یہی حال لوگوں کی برائی کے مقابلے میں اُس شخص کے تحمل اور حوصلے کا تھا۔

اُن کے ایک دوست راوی ہیں کہ " مرادآباد میں جبکہ سرسید وہاں صدرالصدور تھے، محکمہ صاحب جج کے ایک ہندو کلرک کو سرسید سے کچھ رنجش تھی۔ وہ اکثر گمنام عرضیاں اُنکی شکایت کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا۔ ایک بار جبکہ پولیس کا نیا انتظام ہوا تھا، اُس نے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدرِ اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے اور اُن کے گھر میں اس کی لاش موجود ہے، فوراً تلاشی لی جائے۔ اُسی دفعہ پولیس کا عملہ اُن کے مکان پر چڑھ آیا۔ سرسید نے مکان میں پردہ کرا

دیا اور تلاشی لی گئی۔ مگر چونکہ وہ محض اتہام تھا کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سرسید کو اس کا رنج ہوا۔ مراد آباد کا کوتوال اس جرم میں کہ بغیر موجودگی مدعی کے تلاشی لی گئی برخاست کیا گیا۔ سرسید اور اُن کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہو گیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی لکھی مگر سرسید نے اس کی کچھ پروا نہیں کی۔ جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیحدہ ہو گیا تو ایک موقع پر جب کہ سرسید کے ایک معزز یوروپین دوست کسی اعلیٰ عہدے پر ترقی پا کر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھیرے تھے اُن کو ایک لائق انگریزی داں کی ضرورت ہوئی۔ چونکہ سرسید اس کلرک کی انگریزی لیاقت سے واقف تھے، انہوں نے اسی کی سفارش کی اور اُس کے گھر سے بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اس کو دو سو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھ کر لے گئے۔ "جو صاحب اس حکایت کے ناقل ہیں یہ کہتے تھے کہ مدت کے بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سید احمد خاں کے ساتھ برائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ مگر اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دو سو کا نوکر رکھوا کر بھیج دیا! اس نے کہا کہ۔ سید احمد خاں ایک ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اس کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے، اس کی نجات ہو جائے "

جب رفیق ہند میں سرسید کے خلاف نہایت سخت سخت آرٹیکل شائع ہونے لگے اور منشی سراج الدین اڈیٹر سرمور گزٹ نے اُس کا جواب لکھنے پر قلم اُٹھایا تو سرسید ان کو لکھتے ہیں: میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۸ جنوری پڑھا، بلا شبہ میں آپ کی محبت کا جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے ممنون اور احسانمند ہوں اور آپ کو اس تحریر کی نسبت جو اس پرچے میں ہے، بوجہ جوشِ محبت معذور سمجھتا ہوں۔ مگر جانے دو، جو جس کا دل چاہے کہے ہمارا کیا بگڑتا ہے؛ اگر ہمارے بُرا کہنے سے اُن کا دل خوش ہوتا ہے، خوش کر لینے دو۔ تم بھی اُس بُرا کہنے سے خوش ہو، کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں نے وہ خط[1] جناب خان بہادر برکت علی خانصاحب کے پاس بھیج دیا اگر اُن کا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔۔ تم میرے ساتھ محبت رکھتے ہو اور اس کا بھی تم کو یقین ہے کہ جو لوگ میری نسبت عیب لگاتے ہیں وہ مجھ میں نہیں ہیں؛ تو تمہارے خوش رہنے کے لئے اور مجھ کو خدا کا شکر کرنے

---

[1] یہ اس گمنام خط کی طرف اشارہ ہے جو لاہور کے جلسہ کانفرنس واقع [illegible] میں جانے سے ایک دن پہلے علی گڑھ میں سرسید کے نام آیا تھا اور جس میں یہ سخت لفظ لکھے تھے کہ "اگر تم لاہور میں آئے تو تمہاری داڑھی جوتے سے مونڈی جائے گی اور جو حال کل سر بازار تمہارے دوست یعنی (خان بہادر) کا کیا گیا ہے اُس سے بدتر تمہارا حال کیا جائے گا" ۱۲

کے لیئے کہ وہ عیب اُس شخص میں جس کو تم دوست رکھتے ہو نہیں ہے، کافی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خوشی کی بات ہے، پس بُرا کہنے والوں کی بُری بات کا بھی پہلو نکالو اور خوش رہو۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔

جب منشی سراج الدین نے اس کا جواب لکھا تو پھر سرسید نے اُن کو اسی مضمون کے متعلق دوسرا خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھتے ہیں: "ہم کو خدا نے دُنیا میں اِس لیئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ بُرا کرنے والے کی بُرائی سے ہم کو کیا کام ہے؟ ہم کو اپنا دل، اپنا کام، اپنی زبان اُجلی رکھنی چاہیئے۔ بُرائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں اُن کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے۔ اگر وہ بُرائی ہم میں ہے اُس کے دُور کرنے میں کوشش لازم ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ وہ بُرائی ہم میں نہیں ہے۔ بُرا کہنے والے کی نسبت خیال ہی نہیں چاہیئے کہ کون ہے؟ دُنیا میں ہے بھی یا نہیں؟ پس یہی آرام و آسائش کا طریقہ ہے۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دُنیا میں آرام سے رہو یہی طریقہ اختیار کرو۔ میں یقین کرتا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہ . . . صاحب کی طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہے کہ اُن سے بھلائی یا سچائی کی توقع نہیں، کچھ ہی کرو آزار ہی پہنچے گا۔ پس گلہ کیا ہے؟ کیا تم دُنیا کے بچھوؤں سے گلہ کرتے ہو؟ اور کیا وہ کسی کی دُشمنی سے ڈنک مارتے چلتے ہیں؟ پس اُن کے حال سے بحث مت کرو، لوگوں کا جیسا دل چاہے ویسا اُن کے ساتھ برتاؤ کریں۔ اگر ہم سے معافی چاہتے ہیں، ہمارا اُس نے کیا گناہ کیا؟ کیا میری داڑھی منڈ گئی؟ آپ آکر دیکھ لیں بدستور ہے، بلکہ جَو دو جَو بڑھ گئی ہوگی۔ مجھے تمام عمر افسوس رہیگا کہ میں نے وہ خط کیوں برکت علی خاں صاحب کے پاس بھیج دیا؟ اگر خاں صاحب ممدوح کی نسبت اُس میں متوحش بات نہ بھی ہوتی تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔ خیر! جو ہو گیا اُس پر افسوس سے کیا فائدہ ہے

"میرے نزدیک منشی . . . . کی کسی بات کے درپے ہونا نہیں چاہیئے۔ خدا کی دُنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے، ہر ایک اپنا کام کرتا ہے، تم اپنا کام کرو، مگر جان لو کہ تمہارا کیا کام ہے؟ نیکی، بھلائی اور اپنے کام سے مطلب، دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں۔ جس سے دل کا بُرا ہو اس سے مت ملو، کیونکہ اُس سے مل کر خوشی نہ ہوگی، یا منافقانہ طریقہ پر ظاہرداری کرنی پڑے گی۔ نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے آرام ہے، اِسی طرح اُن کی باتوں کی پروا نہ کرنے میں بالکل آرام ہے۔"

اگرچہ سرسید فطرۃً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض اُن کی

سرشت میں داخل تھا مگر اُن کی ابتدائی روک ٹوک اور حُسنِ تربیت سے یہ تمام ملکات ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ راسخ ہو گئے تھے۔ اُسی نیک اور عاقل ماں نے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بُروں کی بُرائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلہ ہی لینے کا خیال ہو تو اُس بڑے اور زبردست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اُسی نے لڑکپن میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی کرنا خود آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔ اُسی تعلیم و تلقین کا یہ نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اُس کے واجب القتل ہونے کے فتوے حرمین میں جا کر لکھوائے، جنھوں نے اس کو کافر و ملحد و کرسٹان اور دجّال ٹھیرایا، جنھوں نے گمنام خطوں میں اس کو گالیاں لکھ کر بھیجیں اور قتل کی دھمکیاں دیں، اُن کی نسبت اُس نے علی رؤس الاشہاد یہ کہا کہ "میں اپنے کسی بھائی سے کسی ہمجنس سے نہ دنیا میں بدلہ لینا چاہتا ہوں نہ قیامت میں، میں نہایت ناچیز مگر اس رسولؐ کی ذرّیت میں ہوں جو رحمۃ للعالمین ہے۔ میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا اور تمام لوگوں کو جنھوں نے مجھ کو بُرا کہا جنھوں نے مجھ پر اتہام کیا یا آیندہ کہیں اور کریں سب کو معاف کروں گا۔"

فی الحقیقۃ اچھی ماں اولاد کے حق میں خدا کی رحمت ہے جو اُس میں عمدہ اخلاق کی بُنیاد ڈالتی ہے اور بُرائیوں کا رُخ نیکی کی طرف پھیر دیتی ہے۔ سرسید کے بچپن اور جوانی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت غیظ و غضب پر مجبول ہوئی تھی مگر ماں کے حسنِ تربیت نے گویا اُن کی ماہیت بالکل بدل دی تھی۔ اُن کے رشتہ داروں کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں نے بیٹے کو کبھی کسی ماما یا نوکر پر بھی سختی یا بدزبانی نہیں کرنے دی اور اگر کبھی کوئی ایسی حرکت اُن سے صادر ہو گئی تو اُن کو ایسی سزا دی گئی جو عمر بھر فراموش نہ ہو۔ چنانچہ ایک بار جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ایک نوکر پر زیادتی کرنے کے جُرم میں اُن کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اور کئی دن کے بعد جب انھوں نے نوکر سے قصور معاف کرا لیا تب گھر میں آنے کی اجازت ملی۔ اگرچہ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے مگر جبلت نہیں بدل سکتی، لیکن عمدہ تربیت جس طرح گھوڑے کی توسنی اور سرکشی کو چالاکی سے بدل دیتی ہے اسی طرح انسان کے غیظ و غضب کو اولوالعزمی اور دلیری کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے اور وہی چیز جو پہلے درندوں کی خصلت معلوم ہوتی تھی، اب بڑے بڑے عظیم الشان ارادوں کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ سرسید میں یہ انقلاب نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ ان کا جبلّی غیظ و غضب فی الواقع ہمجنسوں کی حمایت اور جوش ہمدردی،

کے ساتھ بدل گیا تھا۔ ان کو پرائیویٹ معاملات میں سوا اس کے کہ کبھی کبھی نوکروں پر دودھ کا سا اُبال آ جاتا تھا بہت ہی کم غصے ہوتے دیکھا ہے۔ جو کچھ ان کا غصہ اور افسوس تھا وہ قوم کی غفلت اور نااہلی یا نالائقی پر تھا یا ان کی تباہی و بربادی پر یا قومی کاموں کی مخالفت اور مزاحمت پر یا قوم کے بے جا تعصبات اور ان کی پولیٹیکل بے وقعتی پر۔

ممکن ہے کہ بمقتضائے بشریت کسی کی طرف سے ان کے دل میں کچھ رنج ہو مگر ان کے ظاہر حال اور قول و فعل سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی اس شخص کو کبھی کا ذکر برائی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ اس کو لوگوں کے سامنے علانیہ گالیاں دیتے تھے۔ ان کا نام بھی وہ ہمیشہ ادب کے ساتھ لیتا تھا۔ اس کے دل کی صفائی کا سب سے بڑا گواہ اس کا اخبار تھا جو پچیس برس جاری رہا مگر کبھی کسی کی مذمت یا برائی اس میں نہیں لکھی گئی۔ وہ جس طرح اپنے اخبار کو چھیڑ چھاڑ اور ہزل و حرف گیری و کج بحثی سے پاک رکھتا تھا۔ اسی طرح اپنے اخبار نویس دوستوں کو ان لغویات سے بچنے کی نصیحت کرتا تھا۔ وہ ایک اخبار کے ایڈیٹر کو لکھتا ہے جس میں بطور رنج اخباروں کے کسی کا ہزل آمیز خط چھپ گیا تھا "کیا آپ کا اخبار بھی مثل دیگر نالائق اخباروں کے نامہذب ہونے کو ہے؛ نہایت افسوس اور کمال درجہ افسوس ہے کہ مضمون مذاق نوشتہ۔۔۔۔ آپ کے اخبار مورخہ ۲۰ اپریل میں چھپا ہے۔ آپ کا اخبار روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیال اس طرف رجوع تھا۔ کیا اس کا ارادہ ہے کہ اپنی تمام عزت و قدر کھو دے۔"

اسی ایڈیٹر کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں، بدگو کے ساتھ اگر بدگوئی کی تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ میری نسبت لوگ کیا کیا کچھ نہیں لکھتے؛ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا؛ ہندوستانی ریاستیں ہندوستان میں غنیمت ہیں۔ ہمیشہ ان کے ساتھ دوستانہ برتاؤ چاہیے۔"

ایک دفعہ منشی سراج الدین احمد ایڈیٹر سرمور گزٹ نے اپنے اخبار میں ریاست بہاولپور کی شکایت لکھ دی کہ وہاں سے علی گڑھ کالج کے لئے کچھ چندہ نہیں پہنچا۔ سرسید نے فوراً ان کو متنبہ کیا اور لکھا کہ "سرکار بہاولپور نے دو دفعہ ہزار ہزار روپیہ کالج کے لئے اور چند روز ہوتے کہ ایک ہزار روپیہ واسطے تعمیر مسجد کے مرحمت کیا ہے۔ چونکہ اس کی اطلاع آپ کو ضروری تھی اس لئے فی الفور یہ مختصر نیازنامہ

روانہ کرتا ہوں۔"

الغرض اس کے تمام جذبات اور تمام پیشن ایک قومی ہمدردی کے جوش میں بالکل جذب ہو گئے تھے اس کا غصہ تھا تو قوم کے لئے، شکایت تھی تو قوم کے لئے، حرص و طمع تھی تو قوم کے لئے اور خود غرضی تھی تو قوم کے لئے، اپنے لئے کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

خود غرضی کا الزام

سرسید پر اکثر خود غرضی کا الزام لگایا گیا ہے۔ بیشک خود غرضی کو اگر زیادہ وسیع معنوں میں لیا جائے تو ایک لحاظ سے ان کو خود غرض کہا جا سکتا ہے جو عظیم الشان کام انہوں نے قوم کی ترقی کے لئے اختیار کیا تھا اور جس کے بغیر وہ قوم کی حالت کا درست ہونا غیر ممکن سمجھتے تھے۔ بلا شبہ ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمان یک دل و یک جان ہو کر اپنی تمام ہمت، طاقت اور استطاعت اس کام کے پورا کرنے میں صرف کر دیں اور جب تک اس کو منتہائے ترقی تک نہ پہنچا لیں دوسرے کام کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ یہاں ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ ان کی یہ خواہش ممکن الوقوع تھی یا نہیں؟ اور آیا فی الواقع جیسا کہ وہ سمجھتے تھے، مسلمانوں کی بھلائی کا صرف یہی ایک رستہ تھا کہ سب مل کر ان کے کام میں مدد کریں؟ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اگر اسی کا نام خود غرضی ہے تو ہم کو اپنی قوم کی بہبودی کے لئے ایسے بہت سے خود غرضوں کی ضرورت ہے، اور ہم امید کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں ایسے دس بیس بلکہ دو چار خود غرض بھی اور پیدا ہو جائیں تو ساری قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔ دنیا میں ایسے نیک آدمیوں کی کچھ کمی نہیں ہے جو ہر ایک کے کام میں مدد دیتے اور ہر ایک گاڑی میں کندھا لگانے کو موجود رہیں، مگر ایسے افراد صدیوں اور قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو تمام دنیا کو اپنا معاون و مددگار بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ان کو اپنے کام کی بڑائی کا ایسا یقین ہوتا ہے کہ اس کو تمام دنیا کے کاموں سے مقدم جانتے ہیں اور چونکہ اور لوگ بھی جوں جوں ان کے کام کی حقیقت کھلتی جاتی ہے، اس کو ویسا ہی یقین کرتے جاتے ہیں، اس لئے ان کے دل میں اپنے کام کی عظمت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

حبِ جاہ کا الزام

بعض اصحاب یہ بھی فرماتے ہیں کہ سید احمد خاں نے جو کچھ قوم کی خیر خواہی کے پردے میں کیا، اس سے محض اپنی ناموری اور شہرت اور گورنمنٹ میں اعزاز حاصل کرنا مقصود تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حسرت میں مرے جاتے ہیں کہ ہم کو بھی ویسی ہی ناموری اور اعزاز حاصل

ہو جائے۔ مگر چونکہ اس کا استحقاق نہیں رکھتے اس لئے کبھی اپنی مراد کو نہیں پہنچتے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت چاہنے سے عزت حاصل نہیں ہوتی بلکہ عزت کے لائق کام کرنے سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ قوم کی خیر خواہی کی آڑ میں اپنی شہرت اور اعزاز چاہتے ہیں نہ ان سے قوم کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ خود ان کو شہرت اور عزت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص سچے دل سے قوم کی بھلائی کے کام کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ اپنی شہرت و عزت کا خواہاں ہو، وہ قوم کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور خود بھی شہرت و عزت حاصل کرتا ہے کہ فَوِّضْ مدحكَ وذمَّكَ إلى أفعالِكَ فإنّها تمدحُكَ بِصِدقٍ إن حسنت وتذمُّكَ إن أسأت۔

جو لوگ سرسید کی نسبت ایسے پست خیالات رکھتے ہیں۔ ان کے جواب میں اس سے زیادہ کہنا فضول ہے جو نواب عماد الملک نے سرسید کی دعوت کے جلسے میں، جو نظام کلب حیدرآباد میں ۱۸۹۱ء میں منعقد ہوا تھا، کہا تھا کہ کاش مسلمانوں میں سید احمد خاں کے سوا کوئی دوسرا شخص ایسا ہی پیدا ہو جائے۔ جو اپنی ناموری اور شہرت کے خیال سے قوم کے لئے ایسے مفید کام کر کے دکھا دے جیسے کہ اس شخص کے ہاتھ سے سرانجام ہوئے ہیں۔

اپنی رائے پر وثوق

منجملہ اور بڑے بڑے اوصاف کے ایک وصف جس کو سرسید کے تمام کارہائے نمایاں کی بنیاد سمجھنا چاہیئے، ان میں یہ تھا کہ اُن کو اپنی ہر ایک رائے پر خواہ مذہبی مسائل سے متعلق ہو اور خواہ کسی اور معاملے سے ہمیشہ ایسا وثوق معلوم ہوتا تھا کہ کسی دلیل یا برہان یا مخالف پارٹی کی جارحیّ سے اس میں تزلزل آنے والا نہیں۔ اسی لئے ان کو عموماً خود رائے اور ہٹیلا کہا جاتا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُن کی ہر ایک رائے جس میں ان کو اصرار ہوتا تھا، ہمیشہ صائب اور غلطی سے پاک نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر ان کو اپنی رایوں پر ایسا وثوق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، نہ ہوتا تو جو بڑے بڑے کام ان سے بن آئے ان میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ انہوں نے قوم کی بھلائی کے لئے جتنے کام اٹھائے وہ سب قوم کے خیالات سے بالاتر اور ان کی سمجھ سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ ولایت میں، جیسا کہ اُن کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے وہ اپنے منصوبوں سے سید مہدی علی خاں کے سوا اپنے اور دوستوں کو بہت کم مطلع کرتے تھے، کیونکہ کسی سے یہ امید نہ تھی کہ اُن کی رائے سے اتفاق کرے گا اور اُن کی ہمت

بند ہو جائے گا۔ پھر جب ہندوستان میں آ کر اُنہوں نے اپنے منصوبے علی الاعلان پورے کرنے کا ارادہ کیا تو جیسا کہ اُن کو خیال تھا، ہزاروں مخالف کھڑے ہو گئے اور جہاں تک ہو سکا اُن کے کاموں میں کھنڈت ڈالی۔ باوجود اس کے ہر ایک کام میں اُن کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ مخالفتیں روز بروز کم ہوتی گئیں اور آخر کار اُن کے کام نہایت عظمت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ اگر اُن کی رائیں متزلزل ہوتیں اور اُن کو اپنی تجویزوں اور منصوبوں پر کامل وثوق نہ ہوتا تو کیونکر ایسے کاموں پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہو سکتی تھی، جن کا سارا زمانہ مخالف ہو اور کیونکر ان کی کوششیں اس درجے تک کامیاب ہو سکتی تھیں۔ پھر جس قدر اُن کی تجویزیں اور منصوبے پورے ہوتے گئے اور جس قدر لوگوں کی مخالفت بیجا اور ناواجب ثابت ہوتی گئی، اسی قدر اُن کو اپنی رایوں پر زیادہ وثوق ہوتا گیا اور اپنی ہر ایک رائے پر اُن کا اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ اب چاہیے اس خصلت کو اُنکی خود رائی، ہٹیلے پن کے ساتھ تعبیر کرو اور چاہیے یہ سمجھو کہ دنیا میں جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں اور جن سے مخلوق کو عظیم الشان فائدے پہنچے ہیں وہ سب ایسے ہی قوی اور مضبوط دل والے تھے کہ جو ارادہ کرتے تھے اس پر ثابت قدم رہتے تھے اور جو منصوبہ باندھتے تھے اس کو پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ اُن کی رائیں مستقل اور غیر متزلزل ہوتی تھیں، وہ اپنی غلط رایوں پر بھی ویسا ہی اصرار کرتے تھے۔ جیسا صحیح رایوں پر کیونکہ وہ اُنہیں رایوں کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے۔

باایں ہمہ اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ اُن کو اپنی رایوں پر تھا وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے۔ جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے؟ ہر چند کہ اُن کے دوست اُن تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔ کالج کے متعلق بھی اخیر زمانے میں اُن سے بعض امور ایسے سرزد ہوئے جن کو لوگ تعجب سے دیکھتے تھے، مگر درحقیقت ان میں سے کوئی بات بھی تعجب کے قابل نہ تھی۔ جو حیرت انگیز کامیابی باوجود سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے سرسید کو اپنے مقاصد میں ہوئی اُس کا لازمی نتیجہ تھا کہ آخر عمر میں جو کہ قویٰ کے انحطاط اور فتور کا زمانہ تھا۔ اُن کو اپنی اصابتِ رائے پر جتنا کہ چاہیے تھا اُس سے زیادہ اعتماد ہو جائے اور وہ اپنی عقل اور سمجھ کو خطا اور غلطی سے پاک سمجھنے لگیں۔ اس کے سوا اخیر عمر کے صدمات نے بھی اُن کے دل و دماغ پر کچھ کم اثر نہیں کیا تھا۔ قطع نظر اس کے انسان

کا منتہائے کمال یہ ہے کہ اُس میں عیب کم اور خوبیاں زیادہ ہوں، نہ یہ کہ وہ عیبوں سے بالکل پاک ہو۔ پس سرسید میں باوجود بے شمار خوبیوں اور حیرت انگیز اوصاف کے اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا بجائے اس کے کہ اُن کے اخلاقی نقص کی دلیل ہو، اُن کے اعلیٰ درجے کی اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دلالت کرتا ہے۔ گویا شاعر نے سرسید ہی کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

"شَخَصَ الْأَنَامُ إِلَى كَمَالِكَ۔ فَاسْتَعِذْ مِنْ شَرِّ أَعْيُنِهِمْ بِعَيْبٍ وَاحِدٖ"

یعنی تیرے کمالات دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئی ہیں سو اُن کی نظرِ بد سے بچنے کے لئے کسی عیب کی پناہ لے"

مذہب

سرسید کی مذہبی خدمات و اصلاحات اور مذہبی تحقیقات کے متعلق جو کچھ اُن کی تصنیفات سے ثابت ہوا، بقدرِ ضرورت بیان ہو چکا ہے۔ یہاں ہم اُن کے وہ مذہبی خیالات دکھانے چاہتے ہیں جو انہوں نے اپنے پرائیویٹ خطوں میں یا کسی پبلک تقریر میں ظاہر کئے ہیں اور جن سے اُن کے دل کی اصلی کیفیت اور اصلی واردات منکشف ہوتے ہیں، کیونکہ تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے، وہ بعد غور و خوض کے تمام پہلو اور جوانب دیکھ کر لکھا جاتا ہے اور جہاں تک مصنّف کے امکان میں ہوتا ہے وہ اپنی تصنیف کو کم سے کم اُن لوگوں کی نکتہ چینی سے بچانے میں ضرور کوشش کرتا ہے جن کو وہ اپنے نزدیک مخاطبِ صحیح جانتا ہے۔ برخلاف اس کے پرائیویٹ خطوط جو وہ اپنے محرم اور ہمراز دوستوں کو لکھتا ہے اور پبلک تقریریں جن میں سوچنے اور غور کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اُن سے اُس کے دل کی ننگی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور اُس کے دلی خیالات روزِ روشن کی طرح سب پر ظاہر ہوتے ہیں۔ پس مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مذہبی خیالات جو کھُلے ڈُلے طور پر انہوں نے اپنے رازدار دوستوں کو لکھے ہیں یا کسی پبلک جلسے میں بے ساختہ اور بداہتہً ظاہر کئے ہیں یا جو ایسے ہی کسی اور طریق سے ہم تک پہنچے ہیں اس عنوان میں کسی قدر ترتیب کے ساتھ بیان کئے جائیں۔

حقیقتِ اسلام کا یقین

جہاں تک کہ سرسید کے اقوال اور افعال اور خیالات سے استدلال ہو سکتا ہے اُن کو دینِ اسلام کی حقیقت پر ایسا یقین معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا۔ اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات اور مذہبی عقائد مسلمانوں کے خاص فرقے کے خیالات اور عقائد کے تابع نہ تھے مگر اُن کا ایک عقیدہ بھی شاید ایسا نہ نکلے گا جو اصولاً کسی نہ کسی اسلامی فرقے کے عقیدے سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اُن کو اہلسنت کی قدیم اصطلاح کے موافق زیادہ سے زیادہ مبتدع کہا جا سکتا ہے جیسا کہ اکثر اکابرِ اسلام کو کہا گیا ہے۔ لیکن اُن کی نسبت کافر یا ملحد یا نیچری یعنی نیچرلسٹ کہنا اُسی قسم کا

پنہاں ہے کہ ہر زمانے اور ہر ملک اور ہر مذہب کے محققوں اور مصلحوں پر کیا گیا ہے۔

اُنہوں نے جو لکچر ۱۸۸۴ء میں بمقام لاہور اسلام پر دیا تھا اُس میں اپنے عقائد صاف صاف بیان کئے تھے۔ اِس لئے اوّل ہم اُس لکچر کے چند مقامات اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ لیکن ہر ایک عقیدے کے ساتھ جو کچھ اُنہوں نے بطور دلیل کے بیان کیا ہے اُس کو اُن کے لکچر میں دیکھنا چاہیئے۔

اوّل اُنہوں نے کہا کہ "میں ایک جاہل آدمی ہوں نہ مولوی ہوں نہ مفتی، نہ قاضی اور نہ واعظ نہ میری یہ خواہش ہے کہ کوئی شخص گو وہ میرا کیسا ہی دوست ہو، وہ میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ اُن باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان ولی اور روحانی اُمور سے متعلق ہیں اور جن کو مذہب کہتے ہیں، وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسُولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسُولِ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم پر جن کا ازلی مذہب خدا ابداً لآباد تک قائم رکھے اور ضرور قائم رکھے گا کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے، ختم ہو گیا۔"

توحید

پھر کہا "کہ وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے وہ خدا کی توحید ہے۔ جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اُس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ یہی رکنِ اوّل اور رکنِ اعظم اسلام کا ہے اور باقی ارکان اس کے تحت ہیں اور اس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں، جیسے کسی خاص دوا کی معجون ہو اور اُسی کے ساتھ اُس کے اجزاء بھی ملے ہوئے ہوں۔ خدا کو واحدِ مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین کرنا اسلام ہے اور جو اُس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔"

پھر کہا کہ "خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اُسی وقت یقین ہو سکتا ہے جب اس کی ذات اور صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں اور اسی کے استحقاقِ عبادت پر جو اس کو لازم ہے پُورا پورا یقین ہو، اُس کی ذات کا یقین، تو اُس کے موجود بالذّات ازلی و ابدی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے پر یقین ہوتا ہے اُس کی صفات کا یقین اُس کے مانند صفات کا کسی دوسرے میں نہ ہونے پر یقین کرنا ہے۔ تمام صفتیں جو خدا سے منسوب کی جاتی ہیں، عالم، رحیم، حیّ اور مثل ان کے اور جو اُن کا مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے اور جن میں اوروں کا اشتراک بھی بوجہ ناقص مقصود ہوتا ہے اُس مفہوم سے اور اُس اشتراک سے بھی خدا کی صفات کو مبرا اور منزّہ ماننا اُس کی صفات پر یقین ہوتا ہے۔ اُس کے استحقاقِ عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شے سوا خدا کے مستحقِ عبادت نہیں جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ ہاں ایسے شخص کی نسبت جو صرف خدائے واحد کو مانتا

ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں۔

رسالت محمدی ہونے کے لئے ضرور ہے کہ ہم اُس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو مانا اور اُس کی صفات کو پہچانا یقین کریں۔ خود عقل ہی ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ جس سے ہم کو ہدایت ہوئی ہے کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے ہادی ہونے پر یقین نہ کریں۔ اسلام جس کو میں نے ایسے استحکام سے سچا بتایا اُس کی ہدایت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ پس اُس کی تصدیق بالضرور دوسرا رکن اسلام کا ہے جو پہلے رکن سے منفک نہیں ہو سکتا:

"اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہے جو شخص خدا کو مانتا ہے اور وحدہٗ لاشریک جانتا ہے اور اُس پر یقین رکھتا ہے اور کسی نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تصدیق نہیں کرتا اُس کی نسبت یہ کہنا کہ محمدی نہیں یا مرادف معنی سے کہ یہ کہنا کہ وہ مسلمان نہیں، بالکل صحیح ہے بلکہ اس کو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحد نہ کہنا اسلام کے اصول کی رُو سے درست نہیں۔ موحدینِ محض کے مخلد فی النار ہوتے یا نہ ہونے پر قدیم سے علماء میں بحث چلی آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مخلد فی النار رہوں گے،

کوئی کہتا ہے کہ بعد عذاب کے نجات پائیں گے۔ اس بحث کو انہیں عالموں کے لئے چھوڑ دو اور ہم کو اپنے حبیب کے اس قول پر رہنے دو کہ "علیٰ رغم انف ابی ذر[1]"

فرائضِ منصوصہ پھر کہا کہ "وحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے ساتھ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ۔ ان فرائض کو ادا نہ کرنے والے کو ہم گنہگار اور ان کے منکر کی نسبت وہی کہیں گے جو رسالت کے منکر کی نسبت کہا ہے کہ وہ محمدی نہیں یا بمعنی مرادف مسلمان نہیں۔ اُس کے مخلد فی النار ہونے یا نہ ہونے کی وہی بحث پیش آجاتی ہے جو ابھی موحد محض کی نسبت میں نے بیان کی۔"

شرک فی النبوۃ پھر کہا کہ "شرک کی بحث جو کہ اسلام کا پورا دشمن ہے اور جس کے ساتھ اسلام جمع ہی نہیں ہو سکتا، بہت بڑی ہے، مگر میں اس وقت ایک شمّہ اس کا بیان کروں گا۔ جس طرح خدا کو اپنی ذات وصفات میں وحدت ہے اسی طرح رسول کو تبلیغ احکام یا احکام شریعت کے

---

[1] یہ اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے ابوذر غفاری سے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوذر سے فرمایا۔ ما من عبد قال لا الٰہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذٰلک الا دخل الجنۃ "انہوں نے یہ سن کر تین بار ازراہ تعجب یہ الفاظ عرض کئے کہ "وان زنی وان سرق" اور آپ نے فرمایا کہ وان زنی وان سرق اور تیسری دفعہ اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ علیٰ رغم انف ابی ذر ۱۲

قرار دینے میں وحدت ہے اور کسی کو اس میں شرکت نہیں پس جو شخص رسول کے سوا کسی اور شخص کے
احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب العمل سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اسی
کی تابعداری کو باعثِ نجات یا ثواب سمجھتا ہے، وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو میں شرک فی النبوۃ
سے تعبیر کرتا ہوں۔ خدا نے یہود و نصاریٰ دونوں کو اسی بات پر ملزم ٹھیرا کر فرمایا "اتخذوا احبارھم
ورھبانھم اربابا من دون اللہ" پس اس طرح پیروی ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیتی ہے۔ میری

ائمہ مجتہدین

اس تقریر سے آپ یہ تصور نہ کریں کہ میں آئمہ مجتہدین کے برخلاف رائے رکھتا ہوں۔
نہیں، میں ان کو امت کا سرتاج اور ان کے اجتہادوں اور اختلافوں کو باعث رحمت سمجھتا ہوں۔

مقلدین

یہ بھی آپ خیال نہ کریں کہ میں ان کے پیرو مقلدین کو برا کہتا ہوں یا تقلید کو برا جانتا ہوں
مگر اس قدر ضرور سمجھتا ہوں کہ مقلدین کے بعض افعال اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ انہوں نے
اپنی غلطی سے نہ کہ ان کی تقلید سے اُن کو ارباباً من دون اللہ تک پہنچا دیا ہے جو لوگ اس مسئلہ تقلید کے برخلاف

غیر مقلدین

ہیں اور عدمِ تقلید کے مسئلے کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے اجرا میں کوشش کرنی چاہتے
ہیں ان کی بھی میں عزت کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا مقصود ایک ہے اور دونوں
خدا اور رسول کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں فرقوں کے سبب باہم رنج و عداوت پیدا ہوئی
ہے۔ یہ شیطان کے وسوسے ہیں جو گروہ اسلام کو متفرق کرنے اور قوت کو ضعیف کرنے کی
فکر میں ہیں۔ حقیقت میں اسلام لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنا اور اس پر دل سے
یقین رکھنا اور سب کلمہ گویوں کو بھائی سمجھنا ہے۔ باہمی اختلاف کی وجہ سے اسلام
کے مجمع کو متفرق کرنا اصولِ اسلام کے برخلاف ہے اور اس برکت کی ناشکری
ہے جو خدا نے دی ہے اور جس کو فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ کے لفظوں
سے تعبیر کیا ہے۔"

نبوت پر استدلال

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مندرجہ ذیل تقریر کی "ایک ایسے شخص نے
جو ریتیلے کنکریلے ملک میں پیدا ہوا، جو چھوٹی عمر میں یتیم ہو گیا، جس نے کسی دار العلم
میں تعلیم پائی نہ سقراط اور بقراط اور افلاطون کے مسائل کو سنا، نہ کسی استاد کے سامنے تعلیم کو بیٹھا، نہ حکما اور نہ
فلاسفروں اور پولیٹیکل و مارل سائنس کے عالموں کی صحبت اٹھائی، بلکہ چالیس برس اپنی زندگی

کے ناتربیت یافتہ اور بداخلاق اونٹ چرانے والوں میں بسر کیے۔ چالیس برس تک بجز ایسی قوم کے جو بت پرستی اور باہمی جنگ و جدال میں مبتلا تھی اور چوری اور زناکاری پر عورت و مرد کو فخر تھا اور کسی کو نہیں دیکھا، وہ دفعتہً اپنی تمام قوم کے برخلاف اٹھا، چاروں طرف سے وہ بت پرستی میں گھرا ہوا تھا، مگر اس نے کہا تو یہ کہا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ اس نے صرف یہ کہا ہی نہیں بلکہ تمام قوم سے بھی جو سینکڑوں برس سے لات و منات و عُزّیٰ کو پوجتی آتی تھی یہی کہلوا دیا۔ ان تمام بداخلاقیوں اور رسوم و رذیل عادتوں کو تمام قوم سے مٹوا دیا۔ بتوں کو زمین پر گروایا۔ ان کو توڑوایا اور خدا کے نام اور خدا کی پرستش کو تمام عرب کے جزیرہ نما میں بلند کیا۔ وہ جزیرہ جو ابراہیم و اسماعیل کے بعد سے ہزاروں ناپاکیوں سے ناپاک ہو گیا تھا، پھر اس کو اس کی اصلی پاکی اور دین ابراہیم کی بزرگی تک پہنچا دیا۔ چالیس برس بعد کس نے یہ نور اس کے دل میں ڈالا؟ جس نے نہ صرف جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو روشن کر دیا۔"

"اس نے لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم کے بعد جو احکام دین کے اور اخلاق کے لوگوں کو بتائے کیا کوئی فلاسفر اس سے زیادہ بتا سکتا تھا جو اس اُمّی نے بتائے؟ صرف بتائے ہی نہیں بلکہ اپنے پاک دل، اپنی پاک زبان کے اثر سے لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیئے، یہ کام وہ تھا جو نہ کسی فلاسفر سے ہو سکتا تھا نہ کسی مقتدر سلطان سے۔

پھر کیا چیز اس بچے میں تھی جس نے جزیرۂ عرب کو بلکہ تمام دنیا کو خدائی کا کرشمہ دکھلا دیا، کوئی سخت سے سخت دہریہ اور لامذہب بھی اگر ایسے شخص کو معاذ اللہ نبی نہ مانے گا تو اس کو یہ ماننا تو ضرور پڑے گا کہ اگر بعد خدا کے کوئی دوسرا شخص بزرگ ہے تو یہی ہے۔ روحی فداک یا رسول اللہ پس جو شخص نبوت کی حقیقت کو سمجھ لے گا، تو امکان سے خارج ہے کہ محمد رسول اللہ کی تصدیق نہ کرے۔"

اعجازِ قرآن

پھر قرآن کے معجز ہونے پر مندرجہ ذیل تقریر کی "قرآن مجید جو تیرہ سو برس سے معجز یقین کیا جاتا ہے میں بھی معجز مانتا ہوں مگر ہمارے قدماء نے صرف ایک اوپری دلیل اس کے معجز ہونے کی قرار دی تھی، یعنی فصاحت اور کلام کی عمدگی اور وہ بھی اس وجہ سے کہ آج تک کسی بشر سے نہ کسی فصیح و بلیغ سے اس کی ایک یا دس آیتوں کے برابر بھی ویسا فصیح کلام نہیں کہا گیا۔ باوجودیکہ ان سے بطور مقابلہ کے کہا گیا کہ اگر کہہ سکتے ہو تو کہہ لاؤ۔ بلاشبہ میں بھی قرآن مجید کو ایسا ہی فصیح و بلیغ تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہے جو غیر معتقد لوگوں میں پیش کی جا سکتی ہو اور ان کے دل کو تسلی دے سکتی ہو۔ میں ایک دلیل رکھتا ہوں جس کو میں اس سے زیادہ مضبوط سمجھتا ہوں؟ وہ دلیل کیا ہے؟ وہ ہدایتیں انسان کے لئے ہیں جو قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔ کوئی اور ہدایت اس کے مثل بے شک نہیں ہو سکتی۔ میں اس کو بھی معجزہ

بلکہ اصلی معجزہ قرآن مجید کا سمجھتا ہوں۔"

قرآن مجید اس زمانے میں نازل ہؤا تھا جو جاہلوں اور ناواقفوں اور ناتربیت یافتہ لوگوں کا زمانہ تھا۔ وہ اُس زمانے کے جاہل لوگوں کی ہدایت کے لئے بھی تھا اور اُن اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ہدایت کے لئے بھی تھا جو اس وقت کی دنیا میں تھے اور جو آئندہ دنیا میں ہونے والے تھے۔ ضرور تھا کہ اس کی ہدایتیں اس طرح پر بیان کی جائیں کہ اس سے ایک صحرائی اونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجے کا حکیم سقراط اور بقراط دونوں برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید ہی صرف ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے اور جس سے مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کو یکساں ہدایت ہوتی ہے۔ ایک جاہل بدو، ایک مقدس مولوی اس کے لفظی معنوں سے جیسی ہدایت پاتا ہے، ایسا ہی ایک فلاسفر انہیں الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفے سے خلاف نہیں پاتا۔ کسی زبان میں فرنچ، لیٹن، عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ میں کوئی ایسی کتاب لکھ دو یا اگلے زمانے کی لکھی ہوئی بتا دو جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین فلسفہ اور حکمت کے بھرے ہوئے ہوں اور پھر نہایت دل کش اور سہل الفاظ میں اور پھر اُس سے جاہل اور عالم عامی اور فلسفی سب کو یکساں فائدہ حاصل ہو اور سب کے دل پہ یکساں اثر ڈالے۔ نہایت ناممکن ہے۔ مگر قرآن مجید ہی ہے جس میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں اور یہی اس کا اصلی اور سچا اور واقعی معجزہ ہے۔ اس کے مسائل جیسے اُس زمانے میں سچے تھے جب کہ زمین ساکن مانی جاتی تھی ویسے ہی اب بھی سچے اور قابلِ تسکین ہیں جب کہ سورج ساکن اور زمین گھومتی مانی جاتی ہے اور یہ حکمت و فلسفہ جو اِس زمانے میں سچی مانی جاتی ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو، جیسے یونانی حکمت اب غلط ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعویٰ کرتا ہوں کہ قرآن مجید ویسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے علم کا نقصان تھا۔"

فرائض منصوصہ

پھر نماز روزہ وغیرہ کی نسبت اس طرح بیان کیا "غیر مشتبہ منصوص مسائل جیسے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہیں اور جو خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرض بتلاتے ہیں، اُن کو میں بھی اسی طرح فرض سمجھتا ہوں جیسے ایک جاہل مسلمان یقین کرتا ہے۔ لیکن جب ان پہ مخالف کا حملہ ہوتا ہے تو ان کی لمیت اور اصلیت بتانی ضرور پڑتی ہے۔ اگر یہ بحث پیش ہو کہ ہاتھ منہ دھونے کو یعنی وضو کو، عبادت سے، جس کا تعلق دل سے ہے، کیا تعلق ہے؟ حدث کے بعد بے محل منہ میں کلی کرنے سے

کیا تعلق ہے؟ نماز کو جو ایک روحانی فعل ہے، اٹھنے بیٹھنے سر نیچا اور سُرین اونچے کرنے سے کیا علاقہ ہے؟ تو بہ مجبوری ہم کو اس کی اصلیت اور نماز کے ارکان کی لمیت پر بحث کرنی ہوگی اور سمجھانا پڑے گا کہ وضو کیوں فرض کیا گیا ہے؟ اور نماز کے ارکان کیوں قرار پائے ہیں "

دینِ اسلام

پھر دین اسلام کی نسبت اس طرح بیان کیا "میرا عقیدہ ہے کہ مذہب اسلام ایک مکمل اور آخری مذہب ہے مجھ کو خدا کے اس قول پر یقین کامل ہے کہ " الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا" مگر جب مفسرین (خدا اُن پر رحمت کرے) اس تکمیل کے یہ معنی بتائیں کہ خدا نے فلاں جانور کو حلال اور فلاں جانور کو حرام بتا کر دین کو کامل کر دیا ہے تو میں اُن سے مخالفت کرتا ہوں گو کہ وہ فخر الدین رازی ہوں یا مُلّا علی نیشاپوری یا اُن سے بڑھ کر اور کوئی، اور اُن بزرگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ جناب اگر یہی معنی تکمیل دین کے ہیں تو سلام! میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر غلط ہے۔ دینِ اسلام خدا کی توحید کے کامل طور پر بتانے سے، اس کے ہر ایک فرع و اصول کو روشن کر دینے سے مکمل ہوا ہے یہی تکمیل دین کی ہے اور اسی تکمیل کے سبب وہ آخری دین ہے اور اسی تکمیل کے سبب قیامت تک بلکہ قیامت کے بعد بھی بغیر تبدیل کے قائم رہے گا۔"

حمایتِ اسلام کی وجہ

پھر لیکچر کے اختتام پر یہ الفاظ کہے کہ "جو تائید اسلام کی میں نے اپنی دانست میں اختیار کی ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور خواہ نخواہ مجھ کو اسلام کی تائید کرنی چاہیئے۔ میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا۔ جو شخص جس مذہب میں پیدا ہوا ہے خاموشی سے اس میں چلے جانا دوسری بات ہے اور اس کی تائید پر مستعد ہونا دوسری بات ہے۔ پچھلی بات اس شخص کو زیبا نہیں ہے جس نے پورا الیقین اس پر غور نہ کر لیا ہو۔ میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کی ہے اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے اور میں اس دلی یقین پر اُس کی تائید کرتا ہوں نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں "

یہاں تک سرسید کی اسی تقریر کا خلاصہ تھا۔ جس میں اُنہوں نے بمقام لاہور اسلام کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کئے تھے۔ اب ہم ان کے بعض پرائیویٹ خطوط سے چند مقالات التقاط کرتے ہیں جو انہوں نے مذہبی خیالات کے متعلق ہم دوستوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوط میں کچھ تو وہ ہیں جو ہم کو منشی سراج الدین

کئے مسودات میں دستیاب ہوئے ہیں اور کچھ ہم نے اور اور ذریعوں سے بہم پہنچائے ہیں۔

حقیقت اسلام کا یقین

اگرچہ سرسید عام لوگوں کے کافر و ملحد کہنے سے کچھ ناراض نہ ہوتے تھے مگر جو لوگ ان کے حالات سے بخوبی واقف تھے اگر وہ ان کی نسبت ایسا خیال بھی کرتے تھے تو ان کو سخت ناگوار گذرتا تھا۔ جب وہ ہندوستان سے ولایت جانے کو تھے ایک خط حکیم غلام نجف خاں مرحوم نے جن کے ساتھ ان کی اور ان کے بڑے بھائی کی دوستی اخوت کے درجے تک پہنچ گئی تھی، ان کے پاس بھیجا تھا، جس میں غالباً اس قسم کی کوئی بات ہوگی کہ ولایت جاکر مذہب کو نہ چھوڑ دینا یا عیسائی نہ بن جانا۔ انہوں نے ولایت پہنچ کر اس کا یہ جواب بھیجا۔

" حامد نے آپ کا عنایت نامہ مجھے دیا تھا۔ میں نے خیال کیا تھا کہ جب میں ولایت سے پھر کر آؤں گا اور آپ سے انشاء اللہ تعالیٰ ملوں گا اسی وقت جواب دوں گا۔ حقیقت میں عنایت نامہ محبت آمیز ہنسی کی بات تھی نہ جواب لکھنے کے لائق۔ اگرچہ میں یقینی سمجھتا تھا کہ آپ کے خیالات وہی قدیم پرانے وقیانوسی ہندوستانیوں کے سے ہیں، حال کے زمانے کی جو باتیں ہیں نہ وہ ذہن میں آتی ہیں اور نہ پسند ہوتی ہیں مگر خاص جس امر کی نسبت آپ نے مجھے لکھا ہے اس کا نہایت تعجب ہے اس لئے کہ میری نسبت اس قسم کے خیالات کی البتہ جاہل ناواقف آدمی کو گنجائش ہوسکتی ہے یا دشمن و حاسد جو کچھ چاہیں خیال کرسکتے ہیں مگر آپ کو اس قسم کا خیال کیوں ہوا۔ شاید بمقتضائے محبت ایسا خیال ہوا ہو۔ اس لئے کہ دوست کو ہمیشہ بُرے بُرے خیالات گذرتے ہیں۔ جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق پر سمجھتا ہوں اس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی داڑھی والوں کو اور ہزار ہزار دانے کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ و مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشدی کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں ان کو بھی نہیں ہے۔ والسلام "

تقلید کی مخالفت

ایک خط میں سید مہدی علی خاں کو لکھتے ہیں۔ " میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔ فرض کرو کہ تقلید چھوڑنے میں میں کسی مسئلے یا عقیدے میں غلطی میں پڑ دل، چنداں نقصان نہیں مسلمان تو رہوں گا۔ جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے وہ کوئی معما اور بدر چاچ کا شعر نہیں جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسین معمائی درکار ہوں۔ خدا فرماتا ہے " ھو الذی بعث فی الامیین

رسولاً منھم" ذرا مہربانی سے قرآن کھول کر ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں یہی لفظ ہیں یا بجائے ان کے یہ الفاظ ہیں۔ "ھُوَ الذی بعث فی الفلسفین رسولاً"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "بھائی جان سنو! اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنے مکنونات ضمیر کو مخفی رکھوں میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید[1] نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لئے اور بہشت میں داخل ہونے کے لئے ائمہ کبار تو درکنار مولوی حشمہ کی بھی تقلید کافی ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہوں کہ بدلائل مباحثہ مجھ کو قائل کر دیا جائے کہ میری یہ رائے صحیح ہے یا غلط ہے؟ اور میں دشمن اسلام ہوں یا مثل ابوبکرؓ اور عمرؓ کے دوست اسلام ہوں؟ آیا میں جو اسلام کو ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ سے زیادہ دوست رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ تو درکنار، ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی بالفرض اگر کچھ غلطی کریں گے تو بھی اسلام میں کچھ نقص نہیں ہو سکتا اور میرا یہ اعتقاد کہ اگر تمام عالم کافر ہو جائے یا تمام عالم فرشتہ ہو جائے تو خدا کی خدائی میں کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوتا، اسی طرح اسلام کے مسائل کا حال ہے کہ اگر تمام مجتہدین صواب پر ہوں یا خطا پر اصلی اسلام کی جو روشنی ہے اس میں کچھ نقص نہیں ہے۔ پس یہ اعتقاد میرا صحیح ہے یا غلط ہے؟"

پھر اسی خط میں لکھتے ہیں "لوگوں نے جو اخباروں میں مجھ کو برا بھلا لکھا اس سے آپ کو غصہ آ گیا۔ معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہوگا؟ مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے؟ میں تو ہدف تیرہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آئے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ شخص اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زیادہ زہر قاتل ہے۔ بلا شبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ کے اربابًا من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے آمین! اور میرے دوستوں کو اور مولوی مہدی علی میرے پیارے دوست کو سب سے پہلے آمین! ثم آمین!! ثم آمین!!!"

---

[1] یہاں تقلید سے مراد سراسر بے سلف کی پیروی کرنا ہے نہ کہ تقلید مصطلح فقہا۔ ۱۲

تعصب ایک اور خط میں لکھتے ہیں "تعصب خود بر خلافِ شریعت ہے ہندوستان کے مسلمان اس میں گرفتار ہیں، خدا کی نامہربانی ان کی طرف رجوع ہے۔ پھر اس کا علاج کیا ہے؟ خدا کے ساتھ لڑائی غیر ممکن ہے۔ دنیا میں جو کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں اور ہر روز چھپتی ہیں اور کچی ہیں ان میں جو حالات مسلمانوں کے لکھے جاتے ہیں ان کو دیکھ کر مرجانے کو دل چاہتا ہے۔ بہت سی باتیں ان میں بلاشبہ سچ ہیں اور در حقیقت ہم نے ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے اسلام کو بدنامی ہے۔ میرے صرف ایک لفظ لکھنے سے کہ "حیوان ہیں" نالائقوں کو اس قدر طیش کھانے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا ہے اور انگریزی اخباروں اور تاریخوں میں جو ادصاف چھپ رہے ہیں اُن سے کسی کمبخت کو غیرت نہیں آتی۔"

اسلام کی حمایت ایک اور خط میں خطباتِ احمدیہ کے بعض مضامین کے متعلق لکھتے ہیں "افسوس صد افسوس ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو ایسی لغو اور مہمل کہانیوں میں ڈال دیا ہے اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اُس کی تحقیقات اور اُس پر غور کیا جائے تو اُس کو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور، مری مرغی کھانے والا بتاتے ہیں۔"

"یاتی من بعدی اسمہ احمد کا نہایت عمدہ بیان مسٹر نگنٹر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور بجنسہ اس آیت کا موجود ہونا انجیل یوحنا میں ثابت کیا ہے اور وہی مشہور لفظ فارقلیط کا ہے۔ مگر جس طرح پر کہ اس کو مسٹر نگنٹر نے ثابت کیا ہے اس کو پڑھ کر مسلمان متعصب مولویوں کو غیرت کرنی چاہیے کہ جو کام اُن کے کرنے کا تھا اس کو ایک غیر مذہب کے منصف شخص نے کیا ہے میں نے اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا، بعینہ مسٹر نگنٹر کی تحریر نقل کر دی ہے۔"

"مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہ ثابت کی ہے کہ نام آنحضرتؐ کا محمدؐ توریت میں موجود ہے چنانچہ عبری توریت میں وہ لفظ اور نشانِ شمائل آنحضرتؐ کے بجنسہ نکالے ہیں مگر افسوس کہ اس پر بھی میں کافر ہوں اور یارانِ بادہ فروش وعظ گو مسلمان!! کیا انھوں نے خدا کو بھی اپنا ہی سا نابینا یقین کیا ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر لوگ مجھ کو بُرا کہتے ہیں اگر خدا مجھے اُس پر صبرِ کامل عطا کرے تو میرے لئے ایک نہایت عمدہ زادِ راہ دوسری دنیا کے لئے ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ ایسا کس کا نصیب جس کو نہایت عمدہ زادِ راہ وہاں کے لئے ہاتھ آئے۔"

طیور منخنقہ اہل کتاب

ایک اور خط میں در باب طیور منخنقہ اہل کتاب کے لکھتے ہیں "جو کچھ عنفقہ آپ کو مجھ پہ در باب گردن مروڑی ہوئی مرغی کے ہے وہ میری گردن پر، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علمائے ترکستان (یعنی ٹرکی) نے بلا کسی تامل کے اس کو جائز کیا ہے۔ تمام ترک جن کی خاک پا ہونے کی بھی ہم کو لیاقت نہیں ہے، سب بے تامل کھاتے ہیں۔ ایک بہت بڑے دیندار عالم نے جو ترکستان (یعنی ٹرکی) سے آیا تھا اور ایسا سخت مذہب ہی تھا کہ باوجود میرے اصرار کے فوٹو گراف کی تصویر کھچوانے سے انکار کیا در باب گردن مروڑی مرغی کے مجھ سے کہا کہ۔ هذا فصور النصارى لاباس لنا فى اكله قد احل الله لنا طعام اهل الكتاب" علاوہ اس کے جو شخص احتیاطاً اس کا مرتکب نہ ہو نہایت عمدہ بات ہے، مگر اس کو مسئلہ شرعی ٹھیرانا اور اس کے مرتکبین کو آکل حرام قرار دینا نہایت مضر اور اسلام کے پاؤں پر بدست خود تیشہ زدن ہے۔ اس فقرے کے معنی آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے، انشاءاللہ عنقریب خدمت عالی میں حاضر ہو کر اس کی تعبیر عرض کر دوں گا۔"

ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ جو شخص منکر خدا ہو وہ بھی جیسے کہ بعض لوگ کہتے ہیں، مہذب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں سرسید لکھتے ہیں "سوائے توحید ذات باری تعالیٰ کے ماننے کے تہذیب نفس انسانی اور شائستگی حاصل نہیں ہو سکتی۔"

فضول مذہبی بحثوں سے اجتناب

سرسید مذہبی مسائل میں اس میدان سے جس کو انہوں نے اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لئے لازم پکڑ لیا تھا، سر مو تجاوز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر کوئی نبوت بلکہ خدائی کا دعویٰ کرتا تو ان کو اس کا رد لکھنے سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ اکثر معترضین کے حملوں یا اعتراضوں کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے اور اپنے دوستوں کو فضول بحثوں سے جن سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑنے کے سوا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہو، ہمیشہ روکتے رہتے تھے اور کبھی کسی ایسے مسئلے سے تعرض نہ کرتے تھے جو ان کے دائرے کی حدود سے باہر ہو۔

ایک شخص نے مرزا غلام احمد قادیانی کی نسبت جن کو صاحب الہام اور مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ ہے ایک طول طویل خط سرسید کو لکھا۔ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں۔ "مخدومی! ہر شخص یہاں تک کہ شہد کی مکھی بھی الہام کا دعویٰ کر سکتی ہے مگر اس کا نتیجہ کیا؟ اور کسی کو کسی کے الہام سے کیا فائدہ اور نقصان پہنچ سکتا ہے؟ نادان ہیں وہ جو ان سے جھگڑا کرتے ہیں۔ والسلام۔"

ایک اور شخص نے مرزا صاحب کے خیالات کی مخالفت میں کچھ لکھنے کا ارادہ سرسید سے ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں "آپ جو رسالہ نسبت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی لکھنا چاہتے ہیں کیا آپ کو بھی کچھ مالیخولیا ہو گیا ہے؟ اس لغو حرکت سے کچھ فائدہ نہیں اور مجھ کو ہرگز اس قدر فرصت نہیں ہے کہ نسبت حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے جو محض غلط روایات پر مبنی ہیں، کچھ لکھوں۔"

منشی سراج الدین احمد نے ان سے دریافت کیا کہ گھر میں تصویر رکھنی کیسی ہے؟ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "ان چیزوں کو موجودہ حالت میں بحث میں لانا مسلمانوں کی ترقی میں ہرج ڈالنا اور ان کو متوحش اور زیادہ متنفر کرنا ہے۔ یہ امور نہایت جزئیات ہیں جن کی بحث سے ترقیٔ تعلیم اور ترقیٔ تہذیب میں ہرج پڑے گا۔ پس اُس کو ہرگز بحث میں نہیں لانا چاہیئے۔ پہلے امورِ معظم اور اصول کو رائج کرنا چاہیئے، تصاویر و تماثیل کے جائز و ناجائز ہونے کے دلائل موجود نہیں اس کی نسبت فیصلہ کرنا اور ناجوازی اور جواز کی وجہ بتانا نہایت دقیق اصول پر مبنی ہے۔ تصاویر کا رواج خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ پس جو بیل کہ چل رہا ہے اس کو آر مارنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔"

کسی نے سرسیّد کو بذریعہ تحریر کے اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب نے آپ کی مصنّفہ کتابوں کو اپنے ایک شاگرد سے جو رئیس اعظم ہے چھین کر آگ میں جلا دیا۔ سرسید اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ "اُس کو (یعنی مولوی کو) اس عمل سے کیا فائدہ ہوا؟ اگر وہ ہمارے مطبع سے بہت سی کتابیں خرید کر جلاتا تو مطبع کو بھی فائدہ ہوتا اور اس کا بھی دل ٹھنڈا ہوتا۔"

مستورات کے پردے کی نسبت ان کی رائے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بالکل برخلاف تھی۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی عورتیں منہ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں۔ ایک دفعہ شاید مولوی عبدالحلیم شرؔر نے اپنے اخبار میں اُن کی نسبت لکھ دیا تھا کہ وہ پردے کے مخالف ہیں۔ اس پر منشی سراج الدّین احمد نے ان سے اس باب میں اُن کی رائے دریافت کی۔ سرسید ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرفدار ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے کبھی اس پر غور کیا۔ مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ کے منہ کو بھی پردے میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرؔر نے میری نسبت غلط لکھ دیا ہے

شاید میں نے کسی کے سامنے کہا ہوگا کہ شرعاً منہ اور ہاتھ پردے میں داخل نہیں ہیں۔ اُن کو چاہیئے کہ وہ خود فقہ کی کتابیں دیکھیں"

ایک دفعہ کسی شخص نے مسئلہ متعہ پر بحث کرتے ہوئے اخبار میں سرسید کی نسبت یہ لکھ دیا کہ اُن کی رائے ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ نے متعہ کیا ہے۔ انہوں نے فوراً اخبار نویس کو لکھا کہ میرا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام یا ائمہ اطہار میں سے کسی ایک نے بھی متعہ کیا ہے۔"

سرسید سے جیسا کہ ہم پہلے کسی موقع پر لکھ چکے ہیں، اکثر لوگ ان مسائل مذہبی کی نسبت رائے پوچھتے تھے جن پر آج کل نئے خیالات کے لوگوں کی توجہ مبذول ہے اور سرسید سب کام چھوڑ کر ایسے سوالات کا جواب فوراً لکھتے تھے۔

وبا سے بھاگنا

کسی نے ان سے پوچھا کہ جہاں وبا ہو وہاں سے دوسری جگہ چلا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اُس کے جواب میں لکھتے ہیں۔" جس شہر میں وبا ہو وہاں سے چلا جانا وبا سے بچنے کو مع اس اعتقاد کے کہ اگر خدا نے اس فعل سے ہمارا وبا سے بچنا مقدر کیا ہے تو بچیں گے اور مقدر نہیں کیا تو باوجود چلے جانے کے نہیں بچنے کے، خلافِ شرع و احکامِ رسول خدا صلعم نہیں ہے۔ مذہب اسلام کا اصول یہ ہے کہ ہر کام کے لئے جو اسباب ہوں اُن اسباب کو فاعل حقیقی نہ سمجھے بلکہ فاعل حقیقی خدا کو سمجھے جو علۃ العلل تمام افعال و واقعات کا ہے۔ جس طرح کہ آدمی امراض میں دوا کرتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ دوا مرض کے لئے مفید ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یقین کرتا ہے کہ اگر خدا نے صحت مقدر کی ہے تو صحت ہوگی، اسی طرح جہاں وبا ہے وہاں سے چلا جانا مثلِ دوا ہے اگر خدا نے بچنا مقدر کیا ہے تو اس دوائے فعل سے فائدہ ہوگا نہیں تو نہیں۔ بخاری میں جو حدیثیں ہیں اُن کا بھی یہی مطلب ہے۔ ایک حدیث میں ہے "فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا" مگر اس حدیث کے الفاظ پورے نہیں، اس کے بعد جو حدیثیں ہیں اُن کے الفاظ پورے ہیں " فلا تخرجوا افرارا منہ " جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھ کر چلا جانا کہ ہم اس سے بھاگ کر بچ جائیں گے ممنوع ہے، کیونکہ اگر اللہ نے مقدر نہیں کیا (یعنی بچنا) تو بھاگ کر نہیں بچ سکتے۔"

"جہاں وبا ہے وہاں داخل ہونا اور وبا کے مقام سے چلا جانا دونوں کی یکساں حالت ہے۔ اگر اسباب کی طرف توجہ ممنوع ہو تو جہاں وبا ہے وہاں جانے کا امتناع غلط ہو جاتا ہے۔ اسی دلیل سے جس دلیل سے کہ ایسے مقام سے چلے جانا ممنوع ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ جب شام کو جا رہے تھے اور معلوم ہوا کہ وہاں وبا ہے تو صحابہ سے صلاح کی اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ مت جاؤ! اس وقت ابو عبیدہ نے کہا۔

أفرارًا من قدر الله" اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے کہا "نعم نفرّ من قدر الله الی قدر الله"[1] پس اس جواب سے ٹھیک مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور یہی جواب اُس شخص کی جانب سے ہوتا ہے جو اس مقام سے جہاں وبا ہے، چلا جائے اور کوئی شخص اُس کو کہے کہ افرارًا من قدر الله تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ نعم نفرّ من قدر الله الی قدر الله۔ پس جب ان تمام حدیثوں اور ان کے الفاظ و مقاصد پر غور کرو تو یہی مطلب و حکم پایا جاتا ہے جو میں نے بطور خلاصہ کے اوّل لکھ دیا ہے۔ یہ بات کہ عزیز اقرباجن کی تیمارداری اس کے ذمہ ہے اور وہ مبتلا ہوں اور وہ وبا کے ڈر سے ان کو چھوڑ جائے، یہ ایک دوسرا گناہ ہے۔ عام بحث سے اس کو تعلق نہیں۔ اس شخص کی نسبت وہ حدیث ہے جو بخاری "اجر الصابر فی الطاعون" میں مذکور ہے"۔

اسلام کا ادب

اسلام اور شعائرِ اسلام کا ادب، قرآن مجید کا ادب اور خدا اور رسول کے نام کی تعظیم سرسید کے دل میں کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے صوفی خوش اعتقاد سے کچھ کم نہ تھی۔ بلکہ بعض موقعوں پر اس سے بھی کچھ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں چند شہادتیں بطور نمونہ کے ذکر کی جاتی ہیں۔

بمبئی کے ایک شخص نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اردو تحریروں میں علاماتِ وقف وہی مقرر کرنے چاہئیں جو قرآن مجید میں لکھے جاتے ہیں۔ سرسید نے اُن کو لکھا "ہم نہیں پسند کرتے کہ جو علامتیں مدت سے قرآن مجید کی تحریر میں مخصوص ہو گئی ہیں وہ اردو تحریر میں مروج کی جائیں اور آیت و مطلق وغیرہ جو خاص اصطلاحات قرآن مجید کی ہیں اور تحریروں پر بولی جائیں۔ گو شرعاً و عقلاً اس میں کچھ قباحت نہ ہو الّا تعظیمًا للقرآن المجید ایسا کرنا ہم پسند نہیں کرتے"۔

خطوں پر جو اکثر لوگ بسم الله الرحمٰن الرحیم یا حامدًا و مصلیًا لکھ دیا کرتے ہیں۔ اس کی نسبت وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم کو نہایت افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی اور نہایت ہی اتقاء اور بحیثیت سنّت پر چلنے کا کام ہے، حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اس کے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے اس قسم کے برتاؤ سے اسلام کی برکت و منزلت اُن کے دل میں نہیں رہی۔ بعوض اس کے کہ اسلام کی باتوں سے اُن کے دل میں نیکی، خضوع اور خشوع پیدا ہو، سختی اور قساوت

---

[1] ہاں ہم تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی جانب ہی فرار کرتے ہیں۔

پیدا ہوتی ہے۔ حدیث نبویؐ کا بھی، جس میں خدا کے نام سے کام شروع کرنے کا حکم ہے یہی منشا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ "کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَبْتَرُ" اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو امر ذی بال یعنی عظمت اور شان والا نہ ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔"

ایک صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کانفرنس کے جلسوں میں تحسین کے موقع پر بجائے تالی بجانے کے سبحان اللہ یا مرحبا یا جزاک اللہ، کہا جایا کرے اور اجلاس کے موقع پر ایک منبر رکھا جایا کرے جس پر کھڑے ہو کر لوگ اسپیچ کریں۔ سر سید نے اس سے سخت ناراضی ظاہر کی اور کہا "ایسے جلسوں میں جیسے کہ ہمارے جلسے دنیوی اغراض کے لئے ہوتے ہیں، ان الفاظ کو استعمال کرنا جو شعائر اللہ میں سے ہیں ان کی ہتک حرمت کرنا ہے اور لاتحلوا شعائر اللہ میں داخل ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ ہم ایک عاشقانہ شعر پڑھیں اور مئے ناب کی خوبی کسی شعر میں باندھیں یا ایک معشوق کے ہجر و وصل اور اس کے خد و خال اور عشوہ و نازِ توبہ شکن کو دلچسپ نظم میں ادا کریں اور سننے والے اس کی تحسین میں ان کلمات کو استعمال کریں جو خاص ربِ واحد معبود غیور نے اپنی عبادت میں استعمال کرنے کے لئے بطور شعائر اللہ مقرر کئے ہیں۔ افسوس کہ جس وقت ہمارے دوست ہم کو نصیحت کرتے ہیں اس وقت ان کو ان الفاظ کی عظمت کا اور ہمارے کاموں کی خسّت کا خیال نہیں رہتا اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنے خسیس اور ذلیل کاموں میں خدا کی عظمت اور اس کے شعائر کی حرمت کو بھول جائیں اور انہیں ذلیل دنیاوی کاموں میں شعائر اللہ کو گڈمڈ کر کے اس کی عظمت کو لوگوں کے دلوں سے کھو دیں۔ کیا ہم کو زیبا ہے؟ کہ اپنے لغو اور ذلیل دنیاوی کاموں میں اس منبر کی جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (بابی انت و امی یا رسول اللہ) کھڑے ہو کر وعظ فرمایا، قرآن مجید لوگوں کو سنایا، خطباتِ روحانی ارشاد فرمائے، صحابہ اور ائمہ علیہم السلام نے اس سنت کو اختیار کیا اور اب ہماری مسجدوں کے لئے مخصوص ہے، جس پر وہی سنت ادا کی جاتی ہے، نقل بنا کر کھڑے ہوں۔ یہی خیالات ہیں جن کے سبب سے لوگ ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن سے ہمارا دل تو کانپ جاتا ہے۔ ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام (توبہ توبہ) منشور محمدی رکھا جاتا ہے۔ کیوں اس کا دل پھٹ نہ گیا اور کیوں اس کا قلم ٹوٹ نہ گیا جو اس نے ان لفظوں کو لکھا۔ ایک اخبار نکالا جاتا ہے جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ نہیں سمجھتا کہ کس مقدس نام کو کس جگہ استعمال کرتا ہے اور اسلام کی عظمت کو دل سے بھلاتا ہے؟ ایک اخبار نکلتا ہے اور مخبرِ صادق رہائے افسوس کس دل

سے اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ کوئی اخبار الصدیق کے نام سے مشہور ہے۔"

ایک دفعہ محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا کہ کانفرنس کے چندہ کی آمدنی جمع رکھنے کو دیا اور کسی غرض کے لئے، ایک شخص امینِ قوم مقرر ہونا چاہیئے۔ سرسید نے یہ مضمون سن کر اور آبدیدہ ہو کر دردناک آواز سے کہا کہ "امینِ قوم تو صرف ایک شخص تھا سو گذر گیا اب کوئی امینِ قوم نہیں ہو سکتا، ہاں اس عہدہ کا نام امانت دارِ قوم ہو سکتا ہے" چونکہ آنحضرتؐ ابتدائے عمر سے عرب میں امین کے لقب سے مشہور تھے اس لئے اس لقب کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر ہونا انہوں نے گوارا نہیں کیا۔

ایک شخص نے سرسید سے استفسار کیا تھا کہ اگر نماز میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ لیا جائے تو آپ کے نزدیک کچھ قباحت تو نہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے یہ لکھ بھیجا "مخدومی نماز میں قرآن مجید بلفظہٖ نہ پڑھنے اور اس کا ترجمہ پڑھ لینے میں بجز اس کے اور کچھ قباحت نہیں کہ نماز نہیں ہوتی۔"

ایک اور شخص نے ان سے دریافت کیا تھا کہ قرآن مجید کا ترجمہ جو آپ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے، اگر قرآن سے علیحدہ چھاپ لیا جائے تو آپ اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا "اول تو یہ بتلاؤ کہ ایسے مردود ترجمے کو خریدے گا کون؟ دوسرے یہ کہ جو ترجمہ تفسیر کے ساتھ کیا گیا ہے وہ نہایت سرسری طور پر ہوا ہے اگر صرف ترجمہ چھاپا جائے تو نظرثانی کا محتاج ہے اس کا اہتمام اس طرح پر کہ صرف اُردو بغیر متن قرآن کے چھاپا ہو ہرگز پسند نہیں ہے، نہ میں اس کی اجازت اپنی زندگی میں دوں گا۔ میں اس کو نہایت گناہ عظیم سمجھتا ہوں، لیکن اگر مع متن قرآن مجید چھاپا جائے تو میں نظرثانی کرنے کی محنت گوارا کروں گا والسلام۔"

تفسیر قرآن لکھنے کی غایت

قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے سرسید کا مقصد جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کے مضامین عام طور پر تمام اہلِ اسلام کی نظر سے گذریں، چنانچہ ایک دفعہ ایک مولوی نہایت معقول اور ذی استعداد ان کے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کی تفسیر دیکھنے کا مشتاق ہوں، اگر آپ مستعار دیں تو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے ان سے کہا کہ آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا صلعم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہو گا؟ انہوں نے کہا "الحمدللہ" پھر کہا کہ آپ حشرونشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر اور جو کچھ قرآن میں قیامت کی نسبت بیان ہوا ہے سب پر یقین رکھتے ہوں گے؟ انہوں نے کہا "الحمدللہ" سرسید نے کہا بس تو

میری تفسیر آپ کے لئے نہیں ہے، وہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو مذکورہ بالا عقاید پر پختہ یقین نہیں رکھتے یا اُن پر معترض یا اُن میں متردد ہیں۔

سرسید نے ایک موقع پر اپنی تفسیر کی نسبت کہا کہ "اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور ایک لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا زمانہ نہ آئے اُس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں، تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سردست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔"

نبی کی محبّت

رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق اور غایت درجے کی ارادت اور سچی محبت معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جس حدیث کا مضمون آنحضرت صلعم کی جلالتِ شان کے منافی ہو، میرے نزدیک وہ یقینی موضوع و مفتری ہے اگرچہ تمام محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہو۔ بعض روایتوں پر جن کے ذریعے سے مخالفوں کو آنحضرتؐ پر طعن کرنے کا موقع ملا ہے، وہ بعض اوقات نہایت غیظ و غضب میں آکر یہ کہہ اٹھتے تھے کہ اگر اس کا راوی میری حکومت میں یہ روایت کرتا تو میں اس پر مفتری کی حد جاری کرتا۔

منشی سراج الدین احمد نواب انتصار جنگ سے روایت کرتے ہیں کہ "سید صاحب کے کفر کا فتویٰ جو مولوی امداد العلی نے علماء کے پاس مہر و دستخط کے لئے بھیجا تھا، جب وہ مولوی سراج احمد مرحوم سنبھلی کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس کو پڑھ کر یہ کہا کہ "میں ایسے شخص کی نسبت کفر کے فتوے پر کیونکر دستخط کر سکتا ہوں جس کو میں نے اپنی آنکھ سے آنحضرت صلعم کے ذکر پر چشم پُرآب اور زار زار روتے دیکھا ہے"

سرسید نے اپنی تفسیر میں ایک موقع پر اپنے چند فارسی اشعار لکھے ہیں جن میں سے دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں، جن سے اُن کے دل کا لگاؤ جو آنحضرتؐ کے ساتھ تھا، ظاہر ہوتا ہے۔

خدا دارم، دلِ بریاں ز عشقِ مصطفےٰ دارم	ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم	ہمہ گفتارِ معشوق ست قرآنے کہ من دارم

جس زمانے میں کہ وہ سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے، انہوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں یہ الفاظ لکھے تھے "مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ

آنحضرت صلعم کی سیرؔ میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھی جاتے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔ حاضر کرو، ما را ہمیں نعمۂ شاہنشہی بس ست۔"

اسبابِ دُنیوی سے بے تعلقی

سر سید کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لئے کوشش کرتے تھے، امراء سے ملتے تھے، حاکمانِ وقت سے میل جول رکھتے تھے اور دنیاداروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، کہا جا سکتا تھا کہ وہ دنیادار ہیں لیکن ان کی حالت پر نظر کرنے سے بہ مشکل اُن کو عرفی معنوں میں دنیادار کہہ سکتے تھے۔ ایک بزرگ کا حال جو بظاہر تعلقات میں گھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے، مگر دل کو کسی چیز سے تعلق نہ تھا، لکھا ہے کہ وہ اپنے اصطبل کے گھوڑے دیکھ رہے تھے، کسی نے طنز کے طور پر کہا کہ جس دل میں خدا ہو اس میں گھوڑے نہیں سما سکتے۔ انہوں نے کہا "ایں میخہا در گل زدہ ام نہ در دل"۔ سر سید کا حال دیکھ کر اس مقولے کی بخوبی تصدیق ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایسے لوگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو باوجود کثرتِ تعلقات کے ہر ایک تعلق سے آزاد ہیں اور جن کی نسبت کہا گیا ہے ؎

پاک ہیں آلائشوں میں۔ بندشوں میں بے لگاؤ رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند پر ٹٹولے کوئی دل اُن کا تو واں سب سے الگ

یہ شخص اپنے فرائض کے سوا جن کو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا، درحقیقت کسی چیز سے تعلق نہ رکھتا تھا باوجود قطعی مایوسی کے جو اس کو مسلمانوں کی طرف سے تھی اور جس کو وہ اکثر پرائیویٹ صحبتوں میں نہایت افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا، اُس کی کوششیں اخیر دم تک برابر جاری رہیں، حالانکہ اُس کو یقین تھا کہ مسلمانوں پر مُردنی چھا گئی ہے اور قومی زندگی کی رمق اُن میں باقی نہیں رہی ہا باوجود اس کے وہ دن رات اُن کی ترقی کی تدبیروں میں مصروف تھا اور جن کاموں کو وہ بے سُود و لاحاصل سمجھتا تھا، اُن میں اُس کی سرگرمی و دلچسپی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر ایک کام میں اُن کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ یہ اسی کی ہمت اور اسی کا حوصلہ تھا۔ جو اس کی ذات پر ختم ہو گیا۔

وہ اپنے نہایت عزیز دوست اور مددگار نیاز محمد خاں رئیس جالندھر کو اُن کے تعزیتی تار کے جواب میں لکھتے ہیں "آپ کا تار ہمدردی کا پہنچا۔ جو دلی محبت اور عنایت آپ کی مجھ ناچیز پر ہے اُس

کا میں صرف شکرگزار ہی نہیں ہوں بلکہ میں بھی اس کو نہایت محبت و قدر سے دیکھتا ہوں۔ اگرچہ سید حامد مرحوم کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا ہے، لیکن خدا نے صبر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ قومی بھلائی کے کام میں زیادہ مصروف ہو۔ کیونکہ وقتِ موت معلوم نہیں ہے اور تو بھی جلد آنے والا اور دنیا اور عزیز قوم کو چھوڑنے والا ہے، پس قومی بھلائی میں زیادہ کوشش کر۔ والسلام"

وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود مال و دولت جمع کرتے ہیں بلکہ وہ وہ شخص تھا جو ایک امید موہوم پر کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے: اپنا دھن تن من سب قوم پر قربان کر گیا۔ اس نے اپنے بڑے فرض کے ادا کرنے کی جلدی میں جس کے لئے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا اپنی ہزاروں روپیہ کی جائداد اور اثاث البیت اور ہزاروں روپے کی کتابیں ٹکے دھڑے کے بھاؤ فروخت کر دیں اور اس کے دل پر ذرا میل نہ آیا۔ اس نے غدر کے بعد لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تعلقہ لینے سے بے پروائی کے ساتھ انکار کر دیا کوئی دو چار بیگہ زمین کے لینے سے بھی اس طرح انکار نہیں کر سکتا۔ وہ اکثر ایسی تنگی کی حالت میں کہ گھر میں خرچ کرنے کو ایک پیسا نہ ہوتا تھا، اپنی ساری تنخواہ خزانے سے منگوا کر مدرسے کی ضرورتوں میں اٹھا دیتا تھا اور جب تک مدرسے کا روپیہ وصول نہ ہوتا تھا آپ قرض دام کر کے گذارہ کرتا تھا جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو بقول مسٹر آرنلڈ کے نہ اس کے پاس رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو، اور جب وہ مرا تو اس کی تجہیز و تکفین کے لئے ایک پیسا گھر میں نہ نکلا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی زاہد، کوئی صوفی، کوئی درویش دنیا سے بے تعلق ہو سکتا ہے؟ اور کیا ہم کو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں کوئی ایسا کافر مل سکتا ہے؟ وَلِلّٰہِ دَرُّ مَنْ قَالَ

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

اگرچہ سرسید کی تمام زندگی دنیاداروں کی وضع میں بسر ہوئی مگر اس میں شک نہیں کہ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا رنگ جو ابتدائے عمر میں ان پر چڑھ گیا تھا وہ نفس واپسیں تک بدستور چڑھا رہا۔ ان کے بعض خوابوں سے ان کی طبیعت کو ایک خاص تعلق طریقۂ نقشبندیہ کے ساتھ پایا جاتا ہے، نیز انہوں نے اپنی اکثر تحریروں میں مشائخِ نقشبندیہ کا ذکر ایسے طور پر کیا ہے جس سے اس تعلق کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ خصوصاً شاہ غلام علی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے چہرے سے ایک رقت آمیز بشاشت ظاہر ہوتی تھی۔ باوجودیکہ مدت سے یہ کوچہ چھٹ گیا تھا۔ وہ

مرنے سے چند سال پہلے زیادہ تر اسی ارادے سے دلی گئے کہ شاہ صاحب کے مزار پہ حاضر ہوں اور ہمیشہ حضرت مجدد کے مزار پر جانے کے لئے سرہند جانے کا قصد رکھتے تھے۔ ایک خط میں سردار محمد حیات خاں صاحب کو لکھتے ہیں "مائی ڈیر حیات! آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ بعد برسات پٹیالہ جانا ہوگا۔ آپ کی ملاقات کو بھی جی چاہتا ہے اور سرہند میں حضرت مجدد کے مزار کی زیارت کا ارادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ ملتان تک آنا ہو جائے۔ ملتان میں کن کن بزرگوں کی زیارت ہے اُن سے اجازت لے لیجئے اور یہ بھی دریافت فرمالیجئے کہ کیا عنایت ہوگا۔"

تصور شیخ کے مسئلے کے متعلق جس پر طریقہ نقشبندیہ میں سالک کی ترقی کا دارومدار ہے، جو خیالات سرسید نے ۱۸۵۲ء میں اپنے رسالہ موسومہ بہ نمیقہ میں ظاہر کئے تھے وہی خیالات وہ اُس کی نسبت اخیر دم تک رکھتے تھے مگر جس طرح وہ اور باتوں میں کسی کے مقلد نہ تھے اسی طرح تصوف میں بھی اُن کے خیالات بالکل آزاد تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بے تعلق رہنا اور جو قوائے خدا تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کئے ہیں، اُن کو اپنے اپنے موقع پر بغیر افراط و تفریط کے استعمال کرنا تمام تصوف کا خلاصہ ہے۔ یہی اُن کا قول تھا۔ اور اسی کے موافق اُن کا عمل تھا۔

وہ ایک دوست کو اُس کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ "سب سے بڑا کام انسان کے لئے دنیا میں یہ ہے کہ دنیا کو برتے اور دل کو اُس سے تعلق نہ ہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں "چیست دنیا از خدا غافل بدن" مگر میرے نزدیک اس میں کسی قدر غلطی ہے۔ خدا سے غافل ہونا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ خود خدا ایسا ہمارے پیچھے پڑا ہے کہ اگر ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوٹتا۔ اسی طرح ہم بھی خدا کے ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ اگر خدا خود چاہے تو ہم کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بھلا دیکھیں تو خدا ہم کو اپنے بندے اور اپنے مخلوق ہونے سے خارج کر دے، خدا کی قدرت سے خارج ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

پس از خدا غافل بدن چہ معنی دارد؟ دنیا ہمارے برتنے کے لئے ہے ہم خوب چین سے اُس کو برتیں مگر دل کو اُس سے تعلق نہ ہو بس یہی سب سے بڑا کام ہے اور یہی تعلق کفر ہے، جس کی نسبت رسولِ مقبول نے فرمایا "صاحب المال کافر"

ایک اور دوست کو جن کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں

"آپ کا عنایت نامہ دردانگیز پہنچا جو رنج آپ کو ہے وہ بلاشبہ ہمدردی کے لائق ہے لیکن امرِ لاعلاج کا یہ علاج نہیں ہے کہ انسان اسی میں غلطاں و پیچاں رہے اور سب کاموں کو جن کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے چھوڑ بیٹھے۔ رضا بقضا جو اہل اللہ کا مقولہ ہے، نہایت عمدہ اور فلسفیانہ ہے حتی المقدور انسان کو اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ میری دانست میں آپ کو اتباع والدہ صاحبہ جن کا حق جمیع امور پر مقدم ہے لازم ہے، آپ اُن کی صلاح کو مان لیں اور شادی کر لیں۔ امید ہے کہ آپ کی حالت موجودہ اور آئندہ درست ہو جائے گی۔ ایک بیوی کی وفات کے بعد دوسری بیوی کرنی کسی طرح اخلاق کے برخلاف نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم کو حضرت خدیجہ کبریٰ سے نہایت محبت تھی، اُن کے بعد آپ نے نکاح فرمایا۔ کون شخص ہے جو کانشنس یا اخلاق میں آنحضرت صلعم سے زیادہ اپنے تئیں قرار دے سکتا ہے؟ تمام حالات و مشکلات جو آپ نے لکھی ہیں وہ سب وارداتِ حالیہ ہیں جو کبھی قائم نہیں رہتیں۔ انسان کو چاہیئے کہ ان وارداتِ حالیہ کو دل سے علیحدہ کر کے سوچے کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔ میری سمجھ میں والدہ صاحبہ کی اطاعت اور ان کو رنج کی حالت میں نہ رکھنا تمام اخلاق اور عبادتوں اور کانشنس کے جذبوں سے افضل ہے۔ والسلام"

بے تعصّبی سرسید کی مذہبی زندگی میں دو ایسی متضاد خاصیتیں پائی جاتی تھیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت ہی کم جمع ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ باوجود اس کے مذہبی تعصبات سے وہ بالکل پاک تھے جس بے تعصبی سے اُنہوں نے فصلِ خصومات کا کام انجام دیا اور جس طرح کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ بحیثیت جج ہونے کے یکساں اور بے طرفدارانہ رہا، اُس کو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ہر قوم اور ہر فرقہ کے لوگوں نے برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال اُن کے برتاؤ کا دوستی و ملاقات اور سوشل معاملات میں تھا اور یہی رنگ اُن مذہبی جھگڑوں کے متعلق تھا جو سُنّی، شیعہ، مقلّد، غیر مقلّد اور ہندو مسلمانوں میں پیش آتے تھے اور پیش آتے ہیں۔ اُن کے نہایت گاڑھے دوست جن کی دوستی اخوّت کے درجے کو پہنچ گئی تھی ہر مذہب اور ہر طریقے کے لوگوں میں موجود تھے جن کے ساتھ اخیر دم تک اُن کی یکجہتی و یکرنگی کا یکساں حال رہا۔ گائے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے، اس کی نسبت وہ صاف صاف

کہتے تھے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لئے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔ اسی طرح وہ شیعوں کی نسبت اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔ "بہت سے شیعہ ہیں جن سے ہم سے نہایت دوستی ہے۔ وہ اپنے گھر میں ہمارے بزرگوں پر تبرا کیا کرتے ہیں، کیا کریں، ہمارا کیا نقصان ہے؟"

ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گائے قربانی کے لئے خرید لی۔ عین بقرعید کے دن نماز عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے یہ سن کر وہ ازخود رفتہ ہو گئے، فوراً سوار ہونے کے لئے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگا دی، یہاں تک کہ وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آئندہ کے لئے قطعی ممانعت کر دی کہ کالج کے احاطے میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔

سرسید نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے، ان سے اس باب میں ان کے اصلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا "میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بیشک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں، ان میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو۔ مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ مجبوری دائے میں اس پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا یقین اس کے جی میں ہے اسی کو وہ اختیار کریگا۔ وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اس کے لئے اور برا ہے تو اس کے لئے، لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے، اس سے کچھ نقصان نہیں آ سکتا۔

یہی وجہ تھی کہ سرسید ہمیشہ پبلک جلسوں میں جہاں ہندو مسلمان جمع ہوتے تھے، دونوں قوموں کو اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کی خیرخواہی و خیراندیشی کی نصیحت کرتے تھے، ایک موقع پر انہوں نے اپنی اسپیچ میں کہا "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے

سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے، ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے ایک کو دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔"

پھر آگے چل کر انھوں نے کہا کہ "قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو ان میں بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو و مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔

ایک اور موقع پر انھوں نے مندرجہ ذیل تقریر کی "میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ان کا (یعنی ہندو مسلمانوں کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے، لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیرِ حکومت ہیں، ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم"

ایک اور اسپیچ میں ان کے یہ الفاظ تھے: "اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔"

اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی

خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانو! اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہے کانڑا۔"

اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے انہوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کئے ان میں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا۔ سوسائٹی کے اخبار میں جو ۳۵ برس اُن کے ہاتھ تلے رہا کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو۔ کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے۔ کبھی کسی ہندو عہدہ دار کی ترقی پر اعتراض یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ برخلاف اس کے ہمیشہ مسلمانوں کو نصیحت کی کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کریں۔ ہمیشہ ہندو لیڈروں اور دیفادمروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنے اخبار میں اور پبلک اسپیچوں میں کیا اور ہمیشہ اُن کے مرنے پر حد سے زیادہ رنج اور افسوس ظاہر کیا۔ یہی حال اُن کی بے تعصبی کا اسلامی فرقوں کے ساتھ تھا اور یہی حال عیسائیوں کے ساتھ۔

اسلامی حمیّت باوجود اس کے اسلامی حمیّت جیسی اس شخص میں پائی جاتی تھی نہ وہ مولویوں اور واعظوں میں دیکھی گئی نہ درویشوں اور صوفیوں میں۔ جب کوئی بیجا حملہ اسلام یا مسلمانوں پر غیر مذہب والوں کی طرف سے ہوا اُس نے فوراً اس کی مدافعت کی۔ نہ اس معاملے میں اس کو اپنی صلح کل کی پالیسی کا پاس ولحاظ تھا اور نہ اس بات کی کچھ پروا تھی کہ فریق ثانی کس رتبے اور درجے کا آدمی ہے۔ حالانکہ وہ ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ اتحاد و اتفاق قائم رکھنا چاہتا تھا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ ہندو اُردو زبان اور فارسی خط کو صرف اس وجہ سے مٹانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے تو اس نے علانیہ اُن کی مخالفت کی اور ولایت جانے سے پہلے دو برس تک برابر اُن تمام سبھاؤں اور مجلسوں اور کمیٹیوں کے برخلاف آرٹکل لکھتا رہا جو بنارس اور الٰہ آباد اور دیگر مقامات میں اردو کی بیخ کنی کے لئے قائم ہوئی تھیں۔ پھر جب ایسے ہی تنگ دلی اور تعصب کے خیالات سے الٰہ آباد یونیورسٹی میں یہ تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کر دی جائے تو اُس نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں بمقام الٰہ آباد اس تحریک کے برخلاف ایک نہایت پرجوش اور زبردست اسپیچ میں ان تمام دلائل کی تردید کی جو فارسی زبان کے خارج کرنے کی ضرورت پر پیش کی گئی تھیں۔

باوجودیکہ وہ انگریزوں کا دوست تھا۔ اور ان میں اور مسلمانوں میں خلوص اور دوستی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر جن انگریزوں نے اسلام کے برخلاف کتابیں لکھیں ان کا مقابلہ اس نے نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ کیا۔ اسی نے سب سے پہلے گورنمنٹ کو اس بات سے آگاہ کیا کہ ملکی اور فوجی افسر اپنے تابعین کو مشنریوں کا وعظ سنوانے کے لئے اپنا رعب وداب کام میں لاتے ہیں۔ جس سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ضلع مراد آباد میں انتظامِ قحط کے موقع پر ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارث بچوں کی بابت جو کشاکشی سرسید اور مشنریوں اور کلکٹر مراد آباد کے درمیان رہی وہ پہلے حصّے میں مفصل بیان ہو چکی ہے۔ اُس نے ایجوکیشن کمیشن کی شہادت میں صاف صاف کہہ دیا کہ مسلمانوں کی عام فیلنگ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے برخلاف ہے۔ پس اگر کہیں کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ اُس نے کمیشن میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ جہاں مشنری اسکول ہیں۔ اگر وہاں کے لوگ اپنی اولاد کو ان اسکولوں میں بھیجنا پسند نہ کریں اور آپ اپنے لئے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں تو گورنمنٹ ان کو گرانٹ اِن ایڈ عطا فرمادے اور اس بات کی خبر رکھے کہ وہاں کے حکام اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے، اپنی حکومت اور رعب وداب کو اُن کے برخلاف عمل میں نہ لادیں۔

اس سے بڑھ کر کوئی شخص اس بات کا مخالف نہ تھا کہ مسلمان اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے مشنری اسکولوں یا کالجوں میں داخل کریں، نہ اس لئے کہ اُس کو عیسائی مذہب سے کچھ تعصب تھا۔ بلکہ صرف اس خیال سے کہ مسلمانوں کو غیرت آئے۔ اور وہ اپنی اولاد کی دینی اور دنیوی تعلیم کا خود انتظام کریں۔ اس نے جو لکچر ۱۸۸۳ء میں بمقام لدھیانہ دیا تھا، اس میں وہاں کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر صاف صاف کہا تھا کہ "بڑے افسوس کی بات ہے کہ لدھیانہ سے شہر میں جو ایک بڑا شہر ہے اور جہاں بہت سے مسلمان آباد ہیں، مشنری اسکول بہت سے ہیں اور مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو کچھ جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ان کو کچھ غیرت نہیں آتی کہ وہ اپنے لڑکوں کا خود کچھ بندوبست کریں۔ وہ کتے کی طرح اپنے لڑکوں کو خیراتی روٹی پر چلاتے ہیں اور ایسے خیراتی اسکولوں میں اپنی اولاد کو تعلیم کے واسطے بھیجتے ہیں اور خود کوئی بندوبست اپنے بچوں کی

تعلیم کا نہیں کرتے"۔

اسی لدھیانہ کے جلسے میں جب وہاں کے مشن اسکول کے ایک مسلمان طالب علم نے سرسید کی تعریف میں کچھ تقریر کی تو اُس کے جواب میں جو کچھ انہوں نے کہا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مشن اسکول کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان کی نسبت کیسے خیالات اور شبہات رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا "تمہارے بیان میں کئی جگہ قوم کا لفظ آیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم قوم نہ ہو۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے۔ وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے۔ جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں، تب ہی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے۔ اور جس پر تم کو مرنا ہے، اُس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ اس کو قائم رکھو گے اور اس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کو بھی عزت ہوگی۔ اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھاویں گی۔"

اگرچہ اسلامی حمیت ہر مسلمان کے دل میں کم و بیش ضرور ہوتی ہے۔ اور ہونی چاہیئے۔ مگر اس باب میں سرسید کے خیالات عام مسلمانوں کے خیالات سے بالکل مختلف تھے۔ جو اعتراض عیسائی لوگ اسلام پر کرتے ہیں یا جو مطاعن رسول خدا صلعم کی نسبت اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں، بعضے مسلمان تو اسی کو کمال دینداری سمجھتے ہیں کہ اُس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ بعضے غیظ و غضب میں آکر ایسی کتابوں کو آگ میں جلا دیتے ہیں اور بعضے گورنمنٹ سے فریاد کرتے ہیں کہ فلاں کتاب میں ہمارے دین یا ہمارے نبی کی توہین کی گئی ہے اس کو گورنمنٹ تلف کرا دے اور آئندہ اس کے چھاپنے کی ممانعت ہو جائے۔ مگر در حقیقت ان باتوں کو مذہبی حمیت سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا ہے کہ مخالفوں کے اعتراضات کا ہمارے پاس اس کے سوا کچھ علاج نہیں کہ ان اعتراضوں سے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لیں یا گورنمنٹ سے فریاد کر کے ایسی کتابوں کو تلف اور ان کی اشاعت بند کرا دیں۔ برخلاف اس کے سرسید کے خیالات اس باب میں یہ تھے کہ مسلمانوں کے لئے اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ عیسائیوں کے اعتراضوں کو لغو و پوچ سمجھ کر ان کی طرف التفات نہ کیا جائے، یا گورنمنٹ میں استغاثہ کر کے اس بات کا ثبوت دیا جائے

کہ مسلمان ان کا جواب دینے سے عاجز ہیں۔ بلکہ اسلامی حمیت کا مقتضا یہ ہے کہ ان کے اعتراضوں کو نہایت ٹھنڈے دل سے اور نہایت صبر و تحمل کے ساتھ دیکھیں اور ان پر غور کریں۔ پھر جو جواب دینے کے قابل ہوں ان کا جواب دیں۔ اور جن میں بدزبانی و بے تہذیبی کے سوا کوئی بات التفات کے قابل نہ ہو اُن کا فیصلہ پبلک کی رائے پر چھوڑ دیں نہ یہ کہ گورنمنٹ کو ان کا جج قرار دیں اور مذہبی مباحثوں میں حکومت کی پناہ ڈھونڈیں تاکہ دنیا پر ظاہر ہو جائے کہ اسلام کی دلیلیں باوجود اُس کے محکوم و مغلوب ہونے کے اب بھی ویسی ہی غالب ہیں جیسی اس وقت تھیں جب کہ اسپین[1] کے عیسائی مسلمانوں کے زوال کے بعد ان کو اس لئے جلاوطن کرتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب دینے سے عاجز آگئے تھے۔

الغرض اگر مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے یقینِ واثق رکھتا ہو، اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کا تعلیم دینے والا، غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد و ظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا، غرض کہ اس کی تعلیم کو نوعِ انسانی کے حق میں سراسر رحمت اور برکت سمجھتا ہو، خدا کے سوا کسی کو مستحق عبادت اور نبی کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو، اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو، مسلمانوں کی عزت چاہنے والا اور اُن کی ذلت پر افسوس کرنے والا ہو، جس بات کو سچ جانے اس کے ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو، معاملات میں راست باز ہو، اور برائی کے عوض میں بھلائی کے سوا کچھ نہ کرے تو شاید سیّد احمد خاں جیسا مسلمان زمانے میں مشکل سے ملے گا۔ لیکن اگر مسلمان سے یہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس لفظ کے حقیقی مصداق وہ لوگ ہیں جو تعصب کو دینِ اسلام کا رکن رکین سمجھتے ہیں، جو ذرا ذرا سے اختلافات پر جماعتِ اسلام کا پراگندہ کرنا اپنا فرض جانتے ہیں، جن کو ائمہ مجتہدین کی تقلید نے قرآن اور حدیث سے مستغنی کر دیا ہے، جو قرآن کو محض تلاوت کرنے کی کتاب اور حدیث کو صرف

[1] سرسیّد نے خطباتِ احمدیہ میں ایک آزاد خیال یورپین مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگرچہ بظاہر مور (یعنی اسپین کے مسلمان) اس وجہ سے جلاوطن کئے جاتے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہ کرتے تھے۔ مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آگئے تھے کہ نادان منک (راہب) یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھے کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک ان کا خیال صحیح تھا۔

سند لینے کی چیز خیال کرتے ہیں، جو احکام ظاہری پر لمبے لمبے وعظ کہتے ہیں، آمین اور رفع یدین کی بحث میں عمریں گزار دیتے ہیں، وضع و لباس میں غیر قوموں کے تشبہ کو محاربہ خدا و رسول کی حد تک پہنچا دیتے ہیں مگر قوم کے اخلاق کی درستی کا جس کی نسبت نبی نے کہا تھا کہ "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" کبھی بھول کر بھی خیال نہیں کرتے، جن کے وعظ و نصیحت سے سوا اس کے کہ مسلمانوں میں افلاس نااتفاقی بغض اور کینے کو ترقی ہو، اہل قبلہ میں ہمیشہ کھٹا پٹی رہے، اسلام مطعون ہو اور قوم کو دنیا میں رہنا مشکل ہو جائے، کوئی نتیجہ پیدا ہوتا نظر نہیں آتا۔ تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان معنوں میں سید احمد خاں کو مسلمان کہنا صحیح نہ ہوگا۔ مگر یہ ویسی ہی مسلمانی ہوگی جس کی نسبت کہا گیا ہے:-

اگر حقیقتِ اسلام در جہاں این ست ہزار خندہ کفر ست بر مسلمانی!

ضمیمجات

جو سرسیّد کی لائف سے متعلّق ہیں

ضمیمہ نمبر ۱

سرسیّد کا نسب نامہ

منقول از خطباتِ احمدیہ مندرجۂ جلد دوم تصانیفِ احمدیہ صفحہ ۴۵

محمد رسول اللہ صلعم

۲- فاطمہ زہرہ — امیر المومنین علیؓ ابن ابی طالب ابن عبد المطلب

۳ امام حسینؑ
۴ امام زین العابدینؑ
۵ امام محمد باقر
۶ امام جعفر صادقؑ
۷ امام موسیٰ کاظمؑ
۸ امام علی موسیٰ رضاؑ
۹ امام محمد تقیؑ
۱۰ سید موسیٰ مبرقع
۱۱ سید ابی عبد اللہ احمد
۱۲ سید محمد اعرج
۱۳ سید محمد احمد
۱۴ سید احمد
۱۵ سید موسیٰ
۱۶ سید احمد

۱۷ سید محمد
۱۸ سید علی
۱۹ سید جعفر
۲۰ سید محمد
۲۱ سید عیسیٰ
۲۲ سید ابو الفتح
۲۳ سید علی
۲۴ سید حسین
۲۵ سید کاظم الدین حسین
۲۶ سید جعفر
۲۷ سید باقر
۲۸ سید موسیٰ
۲۹ سید شرف الدین حسین
۳۰ سید ابراہیم
۳۱ سید حافظ احمد
۳۲ سید عزیز
۳۳ سید دوست محمد

۳۴ سید برہان
۳۵ سید محمد عماد
۳۶ سید محمد ہادی — سید محمد مہدی
سید محمد متقی
سید محمد — سید احمد
سید محمد احمد — ولادت ۵ ذی الحجہ
ولادت ۸ ربیع الاول — ۱۲۳۲ھ مطابق
وفات ۱۲۵۹ھ مطابق — ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء
۹ مئی ۱۸۴۳ء
۳۹ سید حامد — سید محمود
ولادت ۲۴ صفر ۱۲۶۵ھ — ولادت ۱۱ رجب ۱۲۶۶ھ
مطابق ۲۰ جنوری ۱۸۴۹ء — مطابق ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء
۴۰ سید راس مسعود
ولادت ۱۴ جمادی الثانی
۱۳۰۶ھ مطابق
۱۵ فروری ۱۸۸۹ء
روز جمعہ

ضمیمہ ۲

سرسیّد کی تصنیفات کی فہرست

سرسید کی تصنیفات جو کتاب یا رسالہ کی صورت میں شائع ہوئی ہیں تین حصّوں پر منقسم ہو سکتی ہیں ۱۔ مذہبی (اور یہ حصہ باقی دو حصّوں سے بہت بڑا ہے) ۲۔ تاریخی ۳۔ علمی (اور یہ حصہ بہت چھوٹا ہے)

پہلے حصّے میں مندرجۂ ذیل کتابیں ہیں :-

۱۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب مؤلفہ ۱۲۵۸ھ

اِس رسالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کا بیان ہے۔

۲۔ تحفۂ حسن مؤلفہ ۱۲۶۰ھ

یہ ترجمہ ہے تحفۂ اثنا عشریہ کے باب دہم و دوازدہم کا۔

۳۔ کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۲۶۶ھ

یہ رسالہ پیری مُریدی کے طریقۂ مروّجہ کے برخلاف لکھا ہے۔

۴۔ راہِ سُنّت در ردِ بدعت ۱۲۶۷ھ

یہ رسالہ اہلِ بدعت کے برخلاف متبعین سُنّت کی تائید میں لکھا ہے۔

۵۔ نیمقہ در بیان مسئلہ تصوّرِ شیخ ۱۲۶۹ھ

یہ ایک مضمون فارسی زبان میں بطور ایک فرضی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصوّرِ شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبّتِ خُدا و رسُول و انبوبِ رحمتِ الہٰی بتایا ہے۔

۶۔ آغازِ کیمیائے سعادت کے چند اَوراق کا ترجمہ ۱۲۷۰ھ۔

۷۔ تبئین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملّۃ الاسلام مرتبہ ۱۲۷۸ھ

اِس تفسیر کے لکھنے کا منشا سرسیّد کی لائف کے پہلے حِصّہ میں مفصّل بیان کیا گیا ہے۔

۸۔ رسالۂ طعامِ اہلِ کتاب کے مرتبہ ۱۲۸۵ھ

اِس کے لکھنے کی غرض جو کچھ تھی۔ وہ پہلے حِصّہ میں مفصّل مذکور ہے۔

۹ خطباتِ احمدیہ مرتبہ ۱۲۸۷ھ

اِس کا حال پہلے اور دُوسرے حِصّہ میں مفصّل مذکور ہے۔

۱۰۔ تفسیر القرآن مطبوعہ ۱۲۹۶ھ تا ۱۳۰۹ھ۔

۱۱۔ النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی ۱۲۹۷ھ

اِس میں امام غزالی کی کتاب مضنون بہ علی اہلہ اور مضنون بہ علی غیر اہلہ اور منقذ من الضلال اور اقتصاد فی الاعتقاد کے بعض مسائل پر بحث کی ہے۔ جس میں کہیں امام صاحب سے اتفاق اور کہیں اختلاف کیا ہے اور نیز امام صاحب کی کتاب التفرقہ بین الاسلام والزندقہ کا ریویو بھی اِس میں شامل ہے جو تہذیب الاخلاق میں پہلے چھپ چُکا تھا۔

۱۲۔ ترقیم فی قصّۃ اصحاب الکہف والرقیم ۱۳۰۷ھ

یہ رسالہ گویا تفسیر القرآن کا ایک جُزو ہے اِس میں اصحابِ کہف کے قِصّہ کی تفسیر اُسی اصول کے موافق کی ہے۔ جس پر تفسیرِ قرآن لکھی گئی ہے۔

۱۳۔ ازالۃ الغین عن ذی القرنین ۱۳۰۷ھ

یہ رسالہ بھی درحقیقت تفسیر القرآن کا ایک جُزو ہے اور اِس میں بھی وہی اصول

ملحوظ رکھا گیا ہے جس پر تفسیر القرآن لکھی گئی ہے۔

۱۴۔ رسالۂ ابطالِ غلامی مطبوعہ ۱۳۱۰ھ

یہ رسالہ اوّل تہذیب الاخلاق کے کئی پرچوں میں شائع ہُوا تھا۔ اُس کے بعد اس کو سر سیّد نے بطور رسالہ کے علیحدہ چھپوا دیا۔ اِس کا مفصّل حال لائف کے دوسرے حصّہ میں درج ہے۔

۱۵۔ الدعاء والاستجابۃ مطبوعہ ۱۸۹۲ء

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں اجابتِ دُعا کے معنی اِسی اُصول کے موافق بیان کئے ہیں۔ جس پر تفسیر القرآن لکھی گئی ہے۔

۱۶۔ تحریر فی اصول التفسیر مطبوعہ ۱۸۹۲ء

اِس رسالہ میں وُہ تمام اصول بیان کئے ہیں جو تفسیر القرآن میں ملحوظ رکھے گئے ہیں

۱۷۔ تفسیر السمٰوات مطبوعہ ۱۳۱۵ھ

یہ رسالہ اوّل تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں بطور ایک آرٹکل کے چھپ چکا تھا۔ مگر ۱۳۱۵ھ میں سر سیّد نے اِس کو علیحدہ بطور ایک رسالہ کے چھپوا دیا۔ یہ بھی گویا تفسیر القرآن کا ایک جزو ہے اِس میں اُن آیات کی تفسیر جو بظاہر نظام بطلیموسی کے موافق معلوم ہوتی ہیں آج کل کی تحقیقات کے مطابق کی ہے۔

اِن سترہ کتابوں اور رسالوں کے علاوہ مذہب کے متعلق بے شمار آرٹکل اور مضامین جو سر سیّد نے علیگڑھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ خصوصاً سب سے اخیر دفعہ کے تہذیب الاخلاق کی تینوں جلدیں زیادہ تر مذہبی مضامین سے بھری ہوئی ہیں۔ جن کا مقصد تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے اُن شکوک و شبہات کا زائل کرنا ہے۔ جو انگریزی تعلیم سے اِسلام کی نسبت اُن کے دِل میں پیدا ہونے ممکن ہیں۔

دُوسرا حصّہ

تاریخی کتابوں اور رسالہ کا ہے۔ اِس حصّہ میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :-

۱۸- جامِ جم مطبوعہ ۱۸۴۰ء

یہ ایک نقشہ ہے جس میں امیر تیمور صاحب قرآن سے لے کر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مُختلف خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال جن کو سلطنتِ ہند سے تعلق تھا۔ مُختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں بہ زبان فارسی قلم بند کیا ہے۔

۱۹- آثار الصنادید مطبوعہ ۱۸۴۰ء

اِس کتاب کا مفصل حال لائف کے پہلے حصّہ میں مذکور ہے۔

۲۰- سلسلۃ الملوک مرتبۂ ۱۸۵۲ء

اِس کا مفصل حال بھی پہلے حصّے میں مذکور ہے۔

۲۱- تاریخ سرکشی ضلع بجنور مطبوعہ ۱۸۵۸ء۔

۲۲- اسبابِ بغاوتِ ہندوستان مطبوعہ ۱۸۵۸ء

۲۳- ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو مطبوعہ ۱۸۷۲ء واقع لندن۔

۲۴- ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر اعتراضات بہ زبان انگریزی مطبوعہ ۱۸۶۲ء واقع لندن

اِن کتابوں کے سوا سرسید نے ایک تاریخ ضلع بجنور کی غدر سے پہلے نہایت تحقیقات سے لکھی تھی جو گم ہوگئی اور جس کا مفصل حال پہلے حصّے میں بیان کیا گیا ہے ،،

تیسرا حصّہ

علمی تصنیفات کا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل رسالے شامل ہیں:۔

۲۵- تسہیل فی جرالثقیل مؤلفہ ۱۸۴۴ء

۲۶- فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مؤلفہ ۱۸۴۶ء

۲۷- قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین ۱۸۶۵ء

اِس رسالے میں قدیم خیالات کے موافق زمین کی حرکت کو جس کا اب تمام یورپ قائل ہے غلط ثابت کیا ہے۔ لیکن اِس کے لکھنے کے بعد سرسید نے اپنی تحریرات میں جا بجا زمین کی حرکت کو تسلیم کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں اور رسالوں کے علاوہ اُن کی دو کتابیں قانون میں بھی معلوم ہوئی ہیں۔ ایک انتخاب الاخوین جس کا ذکر پہلے حصّہ میں کیا گیا ہے دوسرے ایک اشتہار سے جو سرسید نے ۱۸۴۶ء میں بعہدِ مُنصفی دہلی چھاپ کر شائع کیا تھا۔ معلوم ہُوا ہے کہ انہوں نے ابتدائے ۱۷۹۲ء سے لغایت آخر ۱۸۴۶ء تمام فیصل جات صدر شرقی و صدر غربی کا جو اُس وقت تک ترجمہ نہیں ہوئے تھے۔ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا چنانچہ ۱۷۹۲ء سے ۱۸۱۰ء تک کے تمام فیصل جات اُردو میں تین جلدوں میں مرتب ہو چکے تھے

جن کی قیمت کا اعلان اِس اشتہار کے ذریعے سے کیا گیا تھا پھر معلوم نہیں کہ اور فیصلے ترجمہ ہوئے یا نہیں۔

اِن کتابوں کے علاوہ ان کے بیشمار پولٹیکل اور اخلاقی مضامین علیگڑھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے سے شائع ہوئے ہیں جن سے کئی ضخیم جلدیں مرتب ہوسکتی ہیں +